حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالث ؒ

کے

خطبات و خطابات سے ماخوذ

انوار القرآن

جلد اوّل

سورۃ الفاتحۃ تا سورۃ النساء

حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالثؒ

کے

خطبات وخطابات سے ماخوذ

انوار القرآن

جلد اوّل

سورۃ الفاتحۃ تا سورۃ النسآء

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم   نحمدہٗ و نصلّی علٰی رسولہ الکریم

عرضِ ناشر

حضرت حافظ مرزا ناصر احمد خلیفۃ المسیح الثالثؒ کو قرآن کریم سے غیر معمولی محبت اور عشق تھا۔آپ نے بچپن میں قرآن کریم حفظ کرنے کی توفیق پائی۔قرآن کریم کی تلاوت اور اس کے مضامین پر غوروخوض اورفکروتدبر آپ کا معمول زندگی رہا۔قرآنی معارف اور دقائق کی تلاش میں گہرا شغف رکھتے تھے اورقرآن کریم کے انوار سے اپنے سینہ کومنور کرنے میں عمر بھر ہمہ تن مشغول ومشغوف رہے۔

آپ کی دلی تمنا اورقلبی تڑپ تھی کہ ہراحمدی قرآن کریم کوسیکھنے، تلاوت کا تعہد رکھنے اس کا ترجمہ جاننے اوراس کی تشریح وتفسیر میں منہمک ہوکراس کے انوار کو جذب کرنے والا ہو چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

> ہراحمدی مرداوراحمدی عورت ، ہراحمدی بچہ، ہراحمدی جوان اور ہراحمدی بوڑھا پہلے اپنے دل کونورِقرآن سے منور کرے۔قرآن کریم سیکھے ، قرآن پڑھے اورقرآن کے معارف سے اپنا سینہ و دل بھرلے اورمعمور کرلے۔ایک نورمجسم بن جائے۔قرآن کریم میں ایسا محو ہوجائے ، قرآن کریم میں ایسا گم ہوجائے قرآن کریم میں ایسا فنا ہوجائے کہ دیکھنے والوں کواس کے وجود میں قرآن کریم کا ہی نورنظر آئے اور پھرایک معلم اوراستاد کی حیثیت سے تمام دنیا کے سینوں کوانوارِقرآنی

سے منور کرنے میں ہمہ تن مشغول ہو جائے۔

اے خدا! تو اپنے فضل سے ایسا ہی کر کہ تیرے فضل کے بغیر ایسا ممکن نہیں۔ اے زمین اور آسمان کے نور! تو ایسے حالات پیدا کر دے کہ دنیا کا مشرق بھی اور دنیا کا مغرب بھی، دنیا کا جنوب بھی اور دنیا کا شمال بھی نورِ قرآن سے بھر جائے اور سب شیطانی اندھیرے ہمیشہ کے لئے دور ہو جائیں ..... ہمیں ہمیشہ یہ دعائیں کرتے رہنا چاہیے کہ واقعتاً اور حقیقتاً خدا ہمیں اس بات کی توفیق دے کہ ہم قرآنی انوار میں ایسے گم ہو جائیں کہ سوائے انوارِ قرآنی کے ہمارے وجود میں اور کوئی چیز نظر نہ آئے۔ آمین

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اپنے خطبات اور خطابات میں متعدد مقامات پر قرآنی آیات کی تفسیر فرمائی اور قرآنی معارف کو پیش کیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی ہدایت پر قرآنی تفسیر کے یہ حصے یکجا کر کے ان کو کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کی تین جلدیں ہیں اور پہلی جلد آپ کے ہاتھ میں ہے۔

اللہ تعالیٰ احباب جماعت کو قرآن کریم کے معارف سے کما حقہ استفادہ کرنے کی توفیق دے اور اس اشاعت کے سلسلہ میں جن دوستوں کو کام کرنے کی توفیق ملی ان کو جزائے خیر دے اور ان کے علم میں برکت عطا فرمائے۔ آمین

والسلام

ملک خالد مسعود

ناظر اشاعت

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ　　　　بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فہرست آیات جن کی تفسیر بیان ہوئی ہے

سورۃ النسآء

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تفسیر سورۃ الفاتحۃ

بیان فرمودہ

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آیت ۱ تا ۷ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۞۱

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۞۲ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۞۳ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۞۴
اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۞۵ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۞۶ صِرَاطَ الَّذِیْنَ
اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ۞۷

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد آیات میں یہ بیان کیا ہے کہ اس عالمین کی پیدائش بلاوجہ اور بغیر مقصد کے نہیں .... اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں قرآن کریم کے شروع میں ہی اس بنیادی اصول کی طرف یہ کہہ کر توجہ دلائی تھی کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہ اس عالمین کی ربوبیت ہوئی ہے۔ ربّ کے معنے ہیں پیدا کر کے درجہ بدرجہ مدارج ارتقاء طے کرواتا چلا جانے والا یعنی وہ پیدا کرتا ہے اور وہ خود درجہ بدرجہ مختلف مدارج میں سے گزار کے اس کی جو استعداد ہے اس کو اپنے مخصوص دائرہ استعداد کمال تک پہنچاتا ہے۔ مثلاً گندم کا بیج ہے ہمارے ہزاروں زمیندار بھائی یہاں بیٹھے ہیں وہ گندم کا بیج اپنے کھیتوں میں ڈال کے جلسہ سننے کے لئے آجاتے ہیں۔ اب یہ بھی نہیں کہ خدا کے حکم کے بغیر گندم کا بیج گندم کی فصل کی شکل اختیار کر کے گندم پیدا کرتا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں اپنے بعض بندوں کا تیرے ذریعہ سے پیٹ بھرنا چاہتا ہوں اس لئے تو ایک کی بجائے ستر یا سو یا دوسو

یا استعداد کے مطابق سات سو تک یا اس سے بھی بڑھ کر جیسا کہ قرآن کریم نے بتایا ہے۔ بڑھنا ہے لیکن خدا تعالیٰ کا یہ حکم مختلف دَوروں میں سے اس بیج کو گذارتا ہے پہلے اس کی جڑیں نکلتی ہیں اور زمین کے اندر پھیلنی شروع ہو جاتی ہیں اور جو نئے نئے زمیندار بنتے ہیں ان کو پہلے دن بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے کہ پتہ نہیں اس سے روئیدگی باہر آئے گی یا نہیں اور ہر دوسرے تیسرے دن جب تک وہ باہر نہیں آجاتا جاکے اس مٹی کو کرید کے جسے پنجابی میں پھولنا کہتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ نیچے جڑیں بن رہی ہیں یا نہیں۔ پھر وہ کچھ دنوں کے بعد باہر نکل آتی ہیں۔ جس طرح زرد رنگ کا نحیف کمزور بچہ ہوتا ہے وہ اس کی شکل ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین سے اور پانی سے وہ اپنی غذا کو لیتا ہے اور بڑھتا ہے۔ پہلے پتے نکالتا ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ پتے جب زمین اور سورج کی شعاعوں سے اپنی طاقت حاصل کر لیتے ہیں تو اس سٹاک کو جس میں بعد میں گندم کے دانے لگتے ہیں۔ اس کو یہ طاقت دیتا ہے اور وہ بڑھنی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر سِٹہ نکل آتا ہے اس کو، اور پھر پتے اور اس کا جو سٹاک ہے تنا چھوٹا سا وہ اپنی ساری طاقت بیج کی طرف منتقل کر کے بڑھاپے کی چادر اوڑھ لیتا ہے اور اس کی کمر بعض دفعہ دہری ہو جاتی ہے چہرہ زرد ہو جاتا ہے اور کوئی جان اُن میں نہیں رہتی۔ خون سب خشک ہو جاتا ہے اور دانے موٹے ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ پس ایک لمبا سلسلہ درجہ بدرجہ ترقی کرنے کا ہر چیز میں ہمیں نظر آتا ہے یہ ایک مثال میں نے دی ہے۔

قرآن کریم نے ہمیں فرمایا کہ اس عالمین میں بنیادی طور پر تدریجی ترقی کا اصول قائم کیا گیا ہے۔ اس تدریجی ترقی کا اصول کس لئے قائم کیا گیا ہے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تدریجی ترقی کا اصول اس مقصد کے حصول کے لئے ہے جس مقصد کے حصول کے لئے اس عالمین کو پیدا کیا گیا یعنی عالمین کو پیدا کیا گیا ایک خاص مقصد کے لئے اور اس تدریجی ترقی اور تدریجی ارتقا کا اصول قائم کیا گیا ہے تا کہ وہ مقصد حاصل ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ سورۃ عنکبوت میں فرماتا ہے خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ (العنکبوت:۴۵) کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ سورۃ روم میں فرماتا ہے۔ اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۫ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ (الرّوم:۹) کیا وہ سوچتے

نہیں اور فکر اور غور نہیں کرتے اپنے نفسوں میں کہ اللہ تعالیٰ نے ان آسمانوں اور زمین کو ایک خاص مقصد کے لئے اور ایک مقررہ وقت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ سورۃ احقاف میں فرماتا ہے۔ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى (الاحقاف:۴) کہ اللہ تعالیٰ نے ان آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے اندر اور ان کے درمیان پایا جاتا ہے بلاوجہ اور حکمت کے بغیر پیدا نہیں کیا اور نہ کوئی مدت مقرر کرنے کے بغیر پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اور بہت سے مقامات پر قرآن کریم نے بڑے زور کے ساتھ اس دعویٰ کو انسان کے سامنے پیش کیا ہے کہ اس کائنات کی پیدائش ایک خاص مقصد کے حصول کے پیش نظر کی گئی ہے۔ یہ چاند، یہ ستارے، یہ سورج، اب جب ہمارا علم بڑھ گیا ہے تو ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ بے شمار سورج ہمارے نظامِ شمسی کی طرح اس عالمین میں پائے جاتے ہیں۔ پھر آسمانوں کے متعلق تو بڑا تھوڑا علم ہے۔ کم از کم تھوڑا بہت علم ہم نے حاصل کر لیا ہے کہ بعض ستارے زیادہ روشن ہیں اور بعض کم اور بعض ستارے ہم سے قریب ہیں اور بعض بہت دور یعنی یہ محض فلسفیانہ رنگ میں نہیں بلکہ دوربینوں سے ہم نے یہ پتہ لیا اور ہم نے شعاعوں کے متعلق یہ بھی پتہ کر لیا کہ کتنے لائٹ ایرز میں، یعنی کتنے ایسے سالوں میں کہ جس میں شعاعوں کی ایک سال کی رفتار جو ہے (اسے لائٹ ایرز (Light years) کہتے ہیں) وہ روشنی یہاں تک پہنچی وغیرہ وغیرہ اور اس سے جو علم حاصل ہوا جس سے ہمیں فائدہ پہنچ رہا ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح چاند اور سورج کی روشنی ہماری فصلوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے اندر بعض خاص خصوصیتیں پیدا کرتی ہے اسی طرح ستاروں کی روشنی بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج گندم کا دانہ جس میں مثلاً تعداد تو نہیں یاد، کسی کو پتہ بھی نہیں، گِنا بھی نہیں جا سکتا ہے لیکن مثال دے دیتے ہیں، جس کی پرورش میں ایک ہزار ستاروں نے دودھ پلایا۔ وہ اس دانہ سے مختلف ہے۔ جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے پیدا ہوا تھا اور جس کی پرورش میں صرف نو سو ستاروں کی روشنی کا حصہ تھا۔ عقلاً اس میں اختلاف ہونا چاہیے تھا کیونکہ زیادہ ستاروں کی روشنی پرورش کا باعث بنی تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ یہ جو میں نے ستارے بنائے، پھر زمین بنائی اور پھر میں نے بے شمار چیزیں بنا دیں مختلف انواع کے کچھ حیوان ہیں۔ کچھ نباتات سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ کچھ معدنیات سے تعلق رکھنے والی ہیں وغیرہ وغیرہ اور پھر ہر چیز میں میری جس جس صفت کا جلوہ ہوا ہے چونکہ میری ہر صفت اور اس

کے جلوے غیر محدود ہیں۔ اس چیز کے جو خواص ہیں وہ غیر محدود ہیں۔ تو اتنا بڑا کارخانہ اپنی وسعتوں کے لحاظ سے بھی اور اپنی گہرائیوں کے لحاظ سے بھی بے فائدہ اور بلا مقصد نہیں ہے، کوئی بات میرے سامنے تھی، کوئی مقصد میرے پیش نظر تھا جس کے لئے میں نے اس کارخانہ عالم کو بنایا۔

دوسری صداقت جو قرآن کریم کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ پیدائش عالمین کا جو بھی مقصد ہے اس کا تعلق انسان سے ہے یعنی انسان نے اس مقصد کو پورا کرنا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (البقرۃ:۳۱) کہ اللہ تعالیٰ نے پیدائش عالم کے وقت ملائکہ سے یہ کہا کہ میں ایک ایسی نوع پیدا کرنے لگا ہوں جو میرے خلیفہ اور میرے نائب ہو کر زندگی گزاریں گے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ایک ایسی نسل، ایسی نوع انسانی پیدا کرنے لگا ہوں جن میں یہ استعداد اور قوت رکھی جائے گی کہ وہ میری صفات کا مظہر بن سکیں کوئی خلیفہ اور نائب ایسا نہیں جو اس کی صفات کا مظہر نہ بنے۔

تو اس آیت میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ زمین اور آسمان اور جو اس کے درمیان ہے اس کی پیدائش کا مقصد انسان سے تعلق رکھتا ہے اور انسان کو یہ کہا کہ تم غور کرو کہ اگر پیدائش عالمین کا مقصد تم سے تعلق نہ رکھتا تو پیدائش کی ہر چیز کو تمہاری خدمت میں نہ لگایا جاتا۔ اگر وہ مقصد جو اس عالمین کی پیدائش کا ہے مثلاً ہمارے سورج سے تعلق رکھتا تو ہم غلاموں کی طرح اس سورج کی خدمت کر رہے ہوتے جس طرح خدا چاہتا کہ ہم خدمت کریں لیکن ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ نہ صرف یہ سورج بلکہ دنیا میں جو بے شمار سورج پائے جاتے ہیں سارے کے سارے انسان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور نہ صرف یہ عالمین بلکہ جو ان کا سہارا ہیں یعنی ملائکہ اور ان کی قوتیں وہ بھی انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے بار بار اس طرف متوجہ کیا کہ ہم نے جس چیز کو بھی پیدا کیا تمہاری خدمت میں لگا دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (لقمٰن:۲۱) کیا تم لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اسے تمہاری خدمت پر لگایا ہوا ہے اور اس رنگ میں لگایا ہوا ہے کہ اپنی اس خلق کو تمہاری خدمت پر لگانے کے نتیجہ میں تمہارے لئے جن نعمتوں کے سامان پیدا کر دیئے گئے ہیں انہیں تم شمار

نہیں کر سکتے، انہیں تم گنتی میں نہیں لا سکتے۔ وَ اَسۡبَغَ عَلَیۡکُمۡ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً وَّ بَاطِنَۃً اور تم پر اپنی نعمتیں ظاہری ہوں یا باطنی پانی کی طرح بہا دی ہیں جس طرح سمندر کے پانی کے قطرے نہیں گنے جا سکتے (شائد وہ گنے جائیں لیکن) اس سے زیادہ بڑھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں اور اس کے احسانوں کا شمار نہیں ہے۔ اس سے تمہیں یہ سبق لینا چاہیے اس سے یہ حقیقت تم پر واضح ہونی چاہیے کہ پیدائش عالم کا مقصد انسان سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود لوگوں میں سے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارہ میں بات شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا تو خدا ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو اس کو ہمارے ساتھ کیا غرض؟ اور اس بحث میں ان کے پاس نہ کوئی دلیل ہوتی ہے وَ لَا ھُدًی ۔ نہ صحف سابقہ میں سے کسی آسمانی صحیفے کا ان کے پاس کوئی استدلال ہوتا ہے وَ لَا کِتٰبٍ مُّنِیۡرٍ اور نہ قرآن کریم سے کوئی استدلال وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ تو عقل، پہلی کتابیں جو ان میں سے سچائیاں قائم رہ گئی ہیں اور دنیا کو روشن کرنے کے لئے جو کتاب منیر قرآن کریم میں نازل ہوئی ہیں ان میں سے کوئی پختہ دلیل نکال کر وہ اپنے موقف کی تائید میں بیان نہیں کر سکتے اور اس بات سے وہ انکار کرتے ہیں کہ یہ دنیا کسی مقصد کے پیش نظر پیدا کی گئی ہے اور آخرت پر جو شخص ایمان نہیں لاتا (اور دنیا میں ایسے انسانوں کی بڑی کثرت ہے) اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پیدائش انسانی کی کوئی غرض نہیں۔ ساری دنیا کو، کائنات کو، موجودات کو جو پیدا کیا گیا ہے یہ بے مقصد ہے۔ انسان اس دنیا میں آیا ہے اور مر جائے گا اور ختم ہو جائے گا یہ قصہ ہے۔

اسی طرح سورہ جاثیہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ - قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَغۡفِرُوۡا لِلَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ اَیَّامَ اللّٰہِ لِیَجۡزِیَ قَوۡمًۢا بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ - مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ اَسَآءَ فَعَلَیۡہَا ۫ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ (الجاثیۃ: ۱۴ تا ۱۶)

کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اُس نے تمہاری خدمت پر لگا رکھا ہے اور جو فکر کرنے والی اور تدبر کرنے والی اور غور کرنے والی قوم ہے ان کے لئے اس میں ایک بڑا نشان ہے اور وہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کائنات کی پیدائش اور انسان کی پیدائش کے پیچھے کوئی مقصد ہے۔ اس لئے قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تو مومنوں سے کہہ دے کہ تم اللہ تعالیٰ کی جزا کی اُمید رکھو

کیونکہ ایک مقصد کے پیش نظر تمہیں پیدا کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم اپنی استعداد کے مطابق صفاتِ باری کے مظہر بنو اور جو شخص اپنی استعداد کے مطابق صفات باری کا مظہر بن جاتا ہے وہ منبع مسرت اور خوشیوں کے سرچشمہ سے پرسکون اور خوشحال زندگی حاصل کرتا ہے جس پر کبھی فنا نہیں آتی ہے۔ اس لئے تم اللہ کی سزا سے ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی گرفت کے یہ معنے ہوں گے کہ جو مقصد تم سے وابستہ کیا گیا تھا اس میں تم ناکام ہوئے اور جو خوشیاں تمہارے لئے مقدر کی گئی تھیں ان سے تم محروم ہوئے اور خدا تعالیٰ سے دوری کے نتیجہ میں جو عذاب مقدر کیا گیا تھا اس کے تم حق دار ٹھہرے۔ خود ہی نہیں بلکہ جو سزا سے نہیں ڈرتے اور اپنے ربّ کو نہیں پہچانتے ان کو بھی معاف کریں اور ایسے سامان پیدا کریں کہ ان کی توجہ محبت اور پیار کے ساتھ ان کے ربّ کی طرف پھیری جا سکے اور خود سزا دینے کی طرف متوجہ نہ ہوں اور نہ خدا سے یہ کہیں کہ جلد انہیں سزا دے بلکہ کوشش یہ کریں کہ ایسے لوگ بلکہ ساری دنیا ہی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جائے۔ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَيۡهَا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان لوگوں کو تم اچھی طرح سمجھا دو کہ ہمارا جو یہ مطالبہ ہے کہ ہماری ہدایت کے مطابق ہمارے ارشادات کی روشنی میں مناسب حال نیک اعمال بجالایا کرو فَلِنَفۡسِهٖ اس میں تمہارا فائدہ ہے کیونکہ اسی کے نتیجہ میں تم اس مقصد کو حاصل کر سکتے ہو جو تمہاری زندگی کا مقصد ہے۔

تو دوسری بات قرآن کریم کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس مقصد کے لئے کائنات اور موجودات کی پیدائش ہوئی ہے اس کا تعلق انسان سے ہے اور اس کا یہ تعلق انسان سے ہے کہ وہ اپنی قوتوں اور استعدادوں کے دائرہ کے اندر مظہر صفات باری بن سکے اور اللہ تعالیٰ نے ایسی ہدایتوں کے سامان پیدا کئے ہیں کہ جو شخص اپنی زندگی کے مقصد کے حصول کی کوشش کرے وہ اس میں کامیاب بھی ہو جائے۔ اسی لئے جو بنی نوع انسان کے مختلف اَدوار ہیں اپنے اپنے دائرہ میں جو اس وقت کے انسان کو اس کے کمال تک پہنچانے کے لئے ضرورت تھی اس کے مطابق خدا تعالیٰ نے اس زمانہ کے نبی اُس قوم کے نبی کو ہدایت دے دی اور اس آیت استخلاف میں جو ابھی میں نے پڑھی اس میں جو کہا گیا ہے کہ میں اپنا ایک خلیفہ بنانا چاہتا ہوں اس سے ہمیں یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اگرچہ عام طور پر اس کائنات کو پیدا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی غرض یہ ہے کہ ایک ایسی نوع پیدا ہو کہ جو مظہر صفات باری بن سکے۔ لیکن اصل غرض یہ ہے کہ ایک ایسا وجود پیدا ہو جائے کہ جو اللہ کا مظہر اتم ہو یعنی تمام صفات

باری کا وہ کامل مظہر ہو۔صرف اللہ کی اس صفت کا وہ مظہر نہ ہو کہ وہ ذو انتقام ہے۔خدا تعالیٰ بدلہ لیتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نمایاں طور پر خدا کی اس صفت کا مظہر بنے اور انتقام لینے پر آپ نے زور دیا، یا وہ اللہ کی صرف اس صفت کا مظہر نہ بنے کہ وہ غفور ہے معاف کر دیتا ہے۔جیسے حضرت مسیح علیہ السلام صرف اس صفت کا نمایاں طور پر مظہر بنے اور صفات کا بھی بنے لیکن نمایاں طور پر اس صفت کا مظہر بنے اور یہ کہا کہ اگلا آدمی خواہ بدیوں میں ترقی کرتا چلا جائے تم اس کو معاف کرتے چلے جاؤ اور یہ نہیں بتایا کہ سوچ لیا کرو کہ تمہارے معافی دینے کے ساتھ کہیں وہ اپنی بدیوں میں تو ترقی کر کے اللہ تعالیٰ سے اور بھی بُعد تو نہیں حاصل کر لیتا۔

تو ان آیات سے خصوصاً اس آیت سے کہ میں اپنا ایک نائب اور خلیفہ بنانا چاہتا ہوں اس بات کا پتہ لگتا ہے کہ کائنات کی پیدائش کا اصل اور حقیقی مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا انسان وجود پذیر ہو جو اللہ (اور اللہ کے معنے ہیں مستجمع جمیع صفات کاملہ حسنہ۔وہ ذات جو تمام کامل اور اچھی صفات کی جامع ہے) کا مظہر اتم بن جائے یعنی اس کے اندر بھی ظلی طور پر تمام صفات الٰہیہ جمع ہو جائیں۔

تو اس سے ہمیں تین چیزوں کا پتہ لگا ایک یہ کہ مقصد کا تعلق انسان سے ہے۔دوسرے یہ کہ یہ مقصد یہ ہے کہ بنی نوع انسان اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ پیدائشِ عالم کا یہ مقصد حاصل ہو سکے کہ ایک ایسی نوع پیدا ہو جائے جو صفات باری کی مظہر بننے کی قوت اور استعداد اپنے اندر رکھ سکتی ہو اور ہمیں یہ پتہ لگا کہ اصل اور حقیقی مقصد یہ ہے کہ ایک ایسا انسان کامل پیدا ہو جو اللہ تعالیٰ کا مظہر اتم ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا مظہر ہو تمام صفات کا جو مظہر ہو گا اصولی طور پر وہ اللہ کا مظہر ہو گا۔وہ اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ (البروج:۱۳) کی صفت کا بھی مظہر ہو گا جب گرفت کرے گا تو اس کی گرفت بھی بڑی سخت ہو گی اس میں بھی وہ اللہ تعالیٰ کی صفت کا مظہر ہو گا اور وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ (الاعراف:۱۵۷) کی ایک صفت باری ہے۔جب وہ رحمت کرنے پر آئے گا تو اس میں بھی وہ کامل طور پر اللہ کی اس صفت کا مظہر ہو گا۔جب وہ معاف کرے گا تو لَا تَثۡرِیۡبَ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ (یوسف:۹۳) کا ایسا نعرہ لگائے گا کہ انسانی تاریخ اس کی مثال نہیں پیش کر سکے گی۔جب وہ عزیز ہونے کی صفت کا مظہر بنے گا تو سارا عرب جب اکٹھا ہو جائے گا تو وہ قدرت الٰہی جو اس میں جلوہ گر ہو گی ہوا کے ذروں کی طرح اسے اڑا کے رکھ دے گی۔پس تمام صفات کا وہ مظہر ہو گا۔اس مقصد کے حصول کے لئے ایک

ایسے ہی انسان کامل کی ضرورت تھی ۔(خطاباتِ ناصر جلد اوّل صفحہ ۳۰۵ تا ۳۱۲)

الحمدللہ۔اللہ جس پر قرآن کریم کی رو سے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے ہم ایمان لاتے ہیں وہ تمام تعریفوں کا مستحق ہے کسی چیز یا کسی وجود کی تعریف بنیادی طور پر دو وجوہ سے کی جاتی یا کی جا سکتی ہے۔ایک تو اس کے ذاتی حسن کی وجہ سے اور دوسری اس کے احسان کی قوتوں اور احسان کی صفات کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ حسن حقیقی صرف اس کی ذات میں پایا جاتا ہے سورۃ فاتحہ کو ہی لیں سورۃ فاتحہ میں یہ تعلیم بیان ہوئی ہے اور جس پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ ایک نہایت ہی حسین تعلیم ہے لیکن سورۃ فاتحہ میں جو حسن انسان کو نظر آتا ہے وہ اس سورۃ کا ذاتی حسن نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے کچھ جلووں نے سورۃ فاتحہ کی شکل اختیار کی ہے۔اسی طرح گلاب جو اچھا پرورش یافتہ ہو وہ نہایت خوبصورت شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے لیکن گلاب کی خوبصورتی اور اس کی دل کشی اور اس کا حسن اس کا اپنا حسن نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی بعض اور صفات گلاب کی شکل میں مجسم ہوئی ہیں اور اتنا عظیم حسن گلاب کے اندر پایا جاتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سورۃ فاتحہ گلاب کی شکل میں دکھائی گئی۔

غرض نہ تو سورۃ فاتحہ کا حسن جو ہمارے دلوں کو موہ لیتا ہے اس کا اپنا حسن ہے اور نہ گلاب کے پھول (جو ایک نہایت ہی خوبصورت پھول ہے) کا حسن اس کا اپنا حسن ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے جلوے ہیں جو ایک جگہ ہمیں سورۃ فاتحہ کی خوبصورت شکل میں نظر آتے ہیں اور دوسری جگہ وہی اللہ تعالیٰ کے جلوے گلاب کی شکل میں ہمیں نظر آتے ہیں۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ فاتحہ اور گلاب کی مماثلت کو خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

میں اس وقت اس تفصیل میں جانے کا ارادہ نہیں رکھتا کیونکہ میں مختصراً جو مضمون بیان کر رہا ہوں اس کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے۔بہرحال حسن جہاں بھی اس دنیا میں ہمیں نظر آتا ہے وہ اس چیز کا ذاتی حسن نہیں جس میں وہ اس مادی دنیا میں ہمیں نظر آتا ہے۔دنیا کی مخلوق میں (اور دنیا ساری مخلوق ہے اس میں کوئی استثنا نہیں) خواہ ہماری نظر کسی جگہ پر پہنچے یا ہماری نظر اب تک پہنچی ہو یا ابھی تک ہماری نظر نہ پہنچی ہو یا کبھی بھی ہماری نظر نہ پہنچ سکے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔جو بھی خوبصورتی اور دل کشی اور حسن انسان کو نظر آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات یا اللہ تعالیٰ کی کسی ایک صفت کا کوئی

جلوہ ہے جس نے وہ رنگ اختیار کر لیا ہے مثلاً سورج ہے اس نے ایک جہاں کو روشن کیا ہوا ہے۔ پھر وہ صرف زمین کو ہی روشن نہیں کرتا بلکہ اس نے بعض اور سیاروں کو بھی روشن کیا ہوا ہے۔ چاند کو لے لو وہ سورج سے روشنی لیتا اور پھر اس کو آگے پہنچاتا ہے لیکن یہ روشنی جو سورج میں انسان کو دکھائی دیتی ہے یہ سورج کی اپنی روشنی نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا ہی نور ہے جو اس دنیا کو جو سورج کی دنیا ہے منور کر رہا ہے اور سورج کے پردہ میں منور کر رہا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ہستی انسانی آنکھ کو ظاہراً نظر نہیں آ سکتی۔ اس مادی دنیا میں اسباب کے پردوں میں اس کی صفات انسان کے سامنے آتی ہیں اور اس طرح پر وہ نیک اور پاک اور عقل مند لوگوں کو اپنا چہرہ دکھاتا ہے۔

غرض جہاں بھی کوئی خوبی یا حسن پایا جائے وہ اس چیز کا نہیں ہے جس میں وہ پایا جاتا ہے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا حسن ہے وہ اللہ تعالیٰ کی خوبصورتی ہے اور اس وجہ سے انسان جو غور کرتا اور صحیح لائنوں پر اور صحیح طریقوں پر فکر اور تدبر کرتا اور دعاؤں سے حقیقۃ الاشیاء سمجھتا ہے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ الحمدللہ یعنی سب تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کی ہیں کوئی اور وجود یا ہستی یا شے یا کرہ یا انسان یا درخت یا کوئی اور شکل جس میں کوئی حسن پایا جاتا ہے ان کے اندر حقیقتاً کوئی حسن نہیں پایا جاتا بلکہ یہ حسن اللہ تعالیٰ کا حسن ہے یہ ایک جلوہ ہے خدا کا جو اس شکل میں ہمارے سامنے آ گیا۔

دوسری وجہ تعریف کی احسان بنتا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں بیسیوں یا شاید سینکڑوں دفعہ سنا ہوگا کہ بڑا اچھا ہے فلاں شخص وہ مخلوق کا بڑا ہمدرد ہے یا بڑا اچھا ہے فلاں شخص اور پھر انسان اس کی بڑی لمبی چوڑی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے فلاں موقعہ پر مجھ پر احسان کیا تھا یا بڑا اچھا ہے فلاں شخص۔ اس کا اپنی بیوی کے ساتھ بڑا اچھا سلوک ہے یا بڑا اچھا ہے فلاں شخص کیونکہ وہ اپنے بچوں کی صحیح تربیت کرتا ہے اور انہیں اسلام کا خادم بنانے کی کوشش کر رہا ہے یا بڑا اچھا ہے یہ درخت کیونکہ اس کے پھل بڑے میٹھے ہیں یا بڑا اچھا ہے زمینی ذرات کا یہ مجموعہ۔ دیکھو یہ کس طرح چمکتا ہے کتنا قیمتی ہیرا بن گیا ہے اور اس سے ہم ہزار قسم کے فائدے اُٹھاتے ہیں آگے یہ ہیرا خود ایک محسن ہے بلکہ ہر چیز دوسرے پر احسان کرنے والی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کسی چیز کو لغو پیدا نہیں کیا اس لئے ہر مخلوق محسن کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے لیکن اس میں احسان کی قوت اس کے کسی ذاتی ہنر کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احسان کا کوئی جلوہ وہ شکل

اختیار کر گیا۔ میٹھے پھل دینے والا آم کا درخت یا وٹامن (Vitamin) سے بھرا ہوا کھٹے آم کا درخت (اس کے اپنے فائدے ہیں) اپنی جگہ پر احسان پر احسان کر رہا ہے ہر چیز انسان پر یا تو بلاواسطہ احسان کر رہی ہے یا بالواسطہ احسان کر رہی ہے مثلاً لوسن یا برسیم گھوڑے پر احسان کر رہا ہے کیونکہ یہ گھوڑے کی بڑی اچھی خوراک ہے اور جس وقت گھوڑا مضبوط ہو جاتا ہے تو پھر وہ انسان پر احسان کر رہا ہے کہ وہ اس کی سواری کے کام آتا ہے اور اس کی زینت بنتا ہے یہ ساری احسان کی ہی شکل ہے جو اس کے سامنے آئی لیکن حقیقتاً نہ گھوڑے میں احسان کی طاقت ہے نہ لوسن یا برسیم میں احسان کی طاقت ہے بلکہ وہ خدا تعالیٰ کی کسی صفت کا جلوہ ہے جو ان کے اندر ہمیں نظر آتا ہے اگر اللہ تعالیٰ یہ نہ چاہتا کہ کوئی ایسا چارہ ہو جو گھوڑے کو صحت منداور خوبصورت بنائے تو کوئی چارہ دنیا میں ایسا پیدا نہ ہوتا۔ اگر اللہ یہی چاہتا ہے کہ گھوڑے کو لاغر ہی رکھا جائے اور اسے بدصورت ہی بنایا جائے اور اس میں کوئی اور فائدہ اس کے مدنظر ہوتا یعنی فائدہ تو ہوتا لیکن وہ کسی اور رنگ میں ہوتا اس شکل میں نہ ہوتا تو اس رنگ کا احسان ہمیں نہ گھوڑے میں نظر آتا نہ گھوڑے کے چارہ میں کوئی ایسا احسان نظر آتا جو گھوڑے پر ہو رہا ہے غرض ہر چیز میں اور جہاں بھی اللہ تعالیٰ کا حسن نظر آتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کے احسان کے جلوے بھی ہمیں نظر آتے ہیں اور وہ جلوے اللہ کے ہیں۔ ان چیزوں کے جلوے نہیں ہیں۔

پس چونکہ حسن کا منبع اور سرچشمہ اور حقیقی مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور چونکہ احسان کا حقیقی سرچشمہ اور احسان کی صفات کا حقیقی حقدار اور اپنے اندر ان صفات کو جمع کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی کا وجود ہے اس لئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ سب جگہ جہاں حسن نظر آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا حسن ہے جو ہمیں نظر آتا ہے اور ہر جگہ جہاں ہمیں احسان کے جلوے نظر آتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ کی احسانی صفات کے ہی جلوے ہیں اور کوئی چیز نہیں۔ جب ہم اس حقیقت کو سمجھتے ہیں تو بے اختیار نہ صرف ہماری زبان سے بلکہ ہمارے وجود کے ذرہ ذرہ سے یہ نکلتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (خطبات ناصر جلد دوم صفحہ ۱۰۱۰ تا ۱۰۱۲)

زندہ خدا کی زندہ طاقتوں کا مشاہدہ اس پاک وجود کی صفات کے جلووں کے ذریعہ سے ہوتا ہے جو صفات باری انسان سے تعلق رکھتی ہیں ان کا کامل علم اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ہمیں دیا ہے۔ ان

صفات میں سے چار اُمہات الصفات ہیں یعنی بنیادی صفات باری ہیں جن کا ذکر سورۃ فاتحہ میں آتا ہے۔ رَبّ، رَحْمٰن، رَحِیْم، اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ ان صفات میں سے رَحْمٰن اور رَحِیْم کے متعلق اس وقت میں مختصراً کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

صفت رحمٰن کے جلوے ہمیں دو قسم کے (اصولی طور پر) نظر آتے ہیں ایک وہ احکام وقوانین ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری پیدائش سے بھی پہلے اس عالمین میں اس لئے جاری ہوئے کہ انسان کو اس کے نتیجہ میں فائدہ پہنچے مثلاً اللہ تعالیٰ نے ہماری بقا کے لئے ہماری پیدائش سے بھی پہلے اور ہمارے کسی عمل کے نتیجہ کے طور پر نہیں بلکہ محض رحمانیت کی صفت کے اظہار کے لئے ہوا کو پیدا کیا تا کہ ہم سانس لیں اور زندہ رہیں ہماری غذائی احتیاجوں اور ہمارے جسمانی نظام کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے سورج بنا دیا اور اس کا ایک خاص تعلق زمین سے قائم کیا۔ سورج اور زمین کا باہمی تعلق دن اور رات کو پیدا کرتا ہے اور ہمارے آرام اور ہمارے کام کے سامان اس کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں اگر بارہ مہینے رات ہی رہتی تو انسان اس قسم کی دنیوی ترقیات حاصل نہ کر سکتا جو وہ کر چکا ہے، کر رہا ہے اور کرتا چلا جائے گا اس لئے بھی کہ روشنی کے ذریعہ بہت سے کام کئے جاتے ہیں۔ ہماری ترقی میں روشنی یا سورج کی کرنوں کا بڑا دخل ہے مثلاً سائنس کی ترقی میں اس طرح کہ سورج کی کرنوں کے اثر کے نتیجہ میں ہماری زمین میں بہت سی خاصیتیں پیدا ہوتی ہیں جس کے نتیجہ میں زراعت کا علم ترقی کرتا ہے اور زراعتی علم نے ترقی کی ہے اور آئندہ بھی ترقی کرتا رہے گا اور پھر اگر سردی زیادہ ہو جاتی ہمیشہ اندھیرا رہنے کے باعث تو انسان کے لئے کام کرنا بڑا مشکل ہو جاتا اگر بارہ مہینے سورج ہی نکلا رہتا تو زمین جل کے کوئلہ ہو جاتی اس معنی میں کہ اس کی بہت سی خصوصیات مر جاتیں اور انسان اس سے فائدہ نہ اٹھاتا اور آرام کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہو جاتا اور یہ زمین انسانی رہائش کے قابل نہ رہتی اور بے آباد ہوتی پس بے شمار ایسی چیزیں اور ایسی خاصیتیں اور ایسے ستارے جو ہم سے دور ہیں اور ایسے سامان جو اس دنیا میں ہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے تا کہ انسان جسمانی اور روحانی لحاظ سے ترقی کر سکے کیونکہ دن کے بعد جو رات آتی ہے وہ قرب الٰہی، مقام محمود کے حصول کے سامان بھی پیدا کرتی ہے اگر دن ہی ہوتا بارہ مہینے کا تو انسان کے لئے روحانی طور پر مقام محمود تک پہنچنا مشکل ہو جاتا بہرحال یہ ایسی چیزیں ہیں کہ ہماری پیدائش سے پہلے نسل انسانی کی پیدائش سے بھی پہلے رحمٰن خدا نے اپنے کامل

علم اور کامل رحمت کے نتیجہ میں انسان کے لئے پیدا کی ہیں۔

ایک دوسری قسم کے رحمانیت کے جلوے ہیں جو روز بروز لحظہ بہ لحظہ، گھڑی بہ گھڑی ہمیں نظر آتے ہیں۔ ان کی طرف میں بعد میں جاؤں گا پہلے میں رحیمیت کو لیتا ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کی صفت رحیمیت ہماری تدبیر میں برکت ڈالتی ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بڑے لطیف پیرایہ میں ہمیں بتایا ہے کہ دعا بھی ایک تدبیر ہی ہے اور جب مادی تدبیر ہم انتہا کو پہنچا دیتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مادی تدبیر کے لحاظ سے جو احکام جاری کئے جو قانون وضع کئے تھے وہ تدبیر تو ہم نے کمال کو پہنچا دی لیکن یہ ایک مومن کا دل کہتا ہے کہ اب بھی مجھے میرے ربّ رحیم کی ضرورت ہے اور وہ دعا کرتا ہے کہ اے میرے رحیم خدا میری تدبیر کے بہتر نتائج نکال پس ایک مومن کے لئے کوئی تدبیر مکمل نہیں ہوتی جب تک دعا اس کا جزو لازم نہیں ہوتا۔

پس رحیمیت کے ساتھ عاجزانہ پرسوز دعاؤں کا بڑا گہرا تعلق ہے اگر یہ نہ ہو تو انسان مشرک بن جائے اگر وہ یہ سمجھے کہ مادی تدبیر کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحم کی کوئی ضرورت نہیں تو وہ مشرک بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ تو بتایا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں دنیا میں کہ اگرچہ وہ ہم پر ایمان نہیں لاتے اور نہ ہی ہماری معرفت رکھتے ہیں لیکن دنیا کمانے کے لئے جو دنیوی تدابیر وہ اختیار کرتے ہیں ان میں ہم انہیں کامیاب کر دیتے ہیں اور اس ورلی زندگی کا آرام و آسائش انہیں حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ سعی اور کوشش میں بھی دعا مخفی ہوتی ہے لیکن خدا کا ایک مومن بندہ صرف اس بات پر راضی نہیں ہوسکتا کہ اس نے تدبیر کی اور خدا تعالیٰ کی رحیمیت نے اس کی تدبیر کو صرف اس دنیا میں کامیاب کر دیا اور اُخروی دنیا میں اس کے لئے اس کے نتیجہ میں کوئی ثواب مقدر نہیں کیا کیونکہ ایک مومن جانتا ہے کہ چونکہ اُخروی زندگی یقینی ہے اس لئے ایک تسلسل زندگی کا ہے موت تو ایک پردہ ہے گرا رہتا ہے پھر اُٹھ جاتا ہے پھر انسان دوسری دنیا میں داخل ہو جاتا ہے جب تک اسے یہ یقین نہ ہو کہ میری زندگی کا تسلسل خدا کی رحمت کے سائے میں رہے گا اسے حقیقی آرام نہیں حاصل ہوسکتا۔

پس دعا تدبیر کا ایک لازمی حصہ ہے بلکہ یہ بھی ایک تدبیر ہی ہے۔ ایک تدبیر ہم مادی ذرائع سے کرتے ہیں اور ایک تدبیر ہم دعا کے ذریعہ سے کرتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اشیاء میں اس کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق ہم کوئی تدبیر کرتے ہیں تو اس کا فضل مومن کے شامل حال اس

رنگ میں ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی وہ کامیاب ہوتا ہے اور اُخروی زندگی میں بھی لیکن جو لوگ ایسے ہیں کہ جن کی ساری کوششیں اسی دنیا میں گم ہوگئیں اور ان کی ساری زندگیاں اسی دنیا کے لئے ہوگئیں جنہوں نے اپنے پیدا کرنے والے ربّ کو بھلا دیا اور اس سے نہ کسی خیر کی امید چاہی اور نہ کوئی خیر انہیں ملی اسی دنیا کی تدبیر کے نتیجہ میں صرف اس دنیا کی کامیابیاں انہیں رحیمیت کے طفیل حاصل ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحیمیت کے اس قسم کے جلوے روز ہمیں نظر آتے ہیں پس بعض خدائے رحیم سے محض دنیا کے فوائد حاصل کرتے ہیں۔ (اس کے وعدہ کے مطابق) بعض وہ بھی ہیں جو اپنے خدائے رحیم سے اس دنیا کے فائدے بھی حاصل کرتے ہیں اور اُخروی زندگی کے فائدے بھی حاصل کرتے ہیں کیونکہ وہ اس یقین کامل پر قائم ہوتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے لینا ہے اپنے ربّ سے لینا ہے۔

خدا تعالیٰ کی رحمانیت کے جلوے ایک دوسرے رنگ میں بھی ہمیں نظر آتے ہیں وہ اس طرح پر کہ بعض دفعہ ہر تدبیر ناکام ہو جاتی ہے بعض دفعہ کوئی تدبیر سوجھتی ہی نہیں مثلاً ایک مریض ہے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہم صحیح تشخیص پہ پہنچے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ اس مریض کو کینسر کی بیماری ہے اور جتنی دوائیں اس وقت تک انسان کو اس مرض کے علاج کے لئے معلوم ہیں وہ استعمال کرتے ہیں ایلوپیتھک بھی، طبِّ یونانی، ہومیو پیتھک بھی اور صدری نسخے بھی لیکن ہر قسم کی دوا دینے کے بعد بھی مریض کو افاقہ نہیں ہوتا۔

ایک ایسا مریض ڈاکٹروں کے پاس جاتا ہے دنیا کے چوٹی کے ڈاکٹر معائنہ کرتے ہیں اور نہیں سمجھ سکتے کہ اس کو مرض کیا ہے؟ مرض کی تشخیص ہی نہیں ہو سکتی۔ ابھی پچھلے دنوں ہمارے ایک احمدی دوست چوہدری عبدالرحمٰن صاحب جو انگلستان میں ہیں ان کو بخار آنے لگا (پہلے بھی اسی قسم کی بیماری میں وہ مبتلا ہوئے تھے پھر آرام آ گیا اور اب پھر ان کو اسی بیماری کا حملہ ہوا) ہسپتال میں رہے بڑا ترقی یافتہ ملک ہے بڑے ماہر ڈاکٹر ہیں بڑے تجربہ کار معالج ہیں مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہسپتال میں رکھا پتہ نہیں لگتا کہ بیماری کیا ہے؟ اگر بیماری کا پتہ ہی نہ لگے تو علاج کیسے ہو؟ کیا دوا دینی چاہیے اس کا بھی پتہ نہیں لگ سکتا اور اگر دوا کا پتہ نہ لگے تو مادی تدبیر نہیں کی جا سکتی اور رحیمیت کے جلوے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا رحیمیت کا جلوہ تو وہاں نظر آتا ہے جہاں تدبیر اپنے کمال کو پہنچے۔

پس بعض دفعہ تدبیر ناکام ہو جاتی ہے ہر قسم کی تدبیر کی جاتی ہے اور اس کا نتیجہ کوئی نہیں نکلتا کئی

دوست خط لکھتے ہیں کہ تجارت کرتے ہیں ہر قسم کے جتن کر دیکھے ہیں فائدہ نہیں ہوتا جس چیز میں ہاتھ ڈالتے ہیں نقصان ہوتا ہے ہر قسم کی تدبیر کی، احمدی تو تدبیر کا ایک لازمی حصہ چونکہ دعا کو بھی سمجھتا ہے اس لئے وہ دعا جو تدبیر کا حصہ بنتی اور مادی تدبیر کی کامیابی کے لئے کی جاتی ہے اور خدا کی صفت رحیمیت کو جوش میں لاتی ہے وہ بھی کی گئی اور ناکام ہوگئی۔ پس انتہائی تدبیر کی کیونکہ مادی تدبیر بھی کی اور اس کے بہتر نتائج کے لئے دعا کی صورت میں روحانی تدبیر بھی کی لیکن نتیجہ سوائے ناکامی کے کچھ نہ نکلا ایسے دوست بہت پریشان ہوتے ہیں اور پریشانی کا باعث یہ بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحیمیت کی صفت کیوں ہمارے حق میں جوش میں نہیں آتی پس بعض دوست پریشانیاں اٹھاتے ہیں ناکامیوں کا منہ دیکھتے ہیں اور میں بھی ان کے لئے پریشان ہوتا ہوں۔ پس اگر تدبیر ناکام ہو جائے یا اگر تدبیر سوجھے ہی نہ ہر دو صورتوں میں ہمیں خدائے رحمٰن کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے جس وقت مریض لاعلاج قرار دے دیا جاتا ہے اور مادی تدبیر کو کامیاب اور نتیجہ خیز بنانے کے لئے کی گئی دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر مبرم ہے اس وقت اگر رحمان کی صفت رحمانیت کے آگے عاجزی اختیار کی جائے اور اپنے رحمان خدا سے یہ کہا جائے کہ اے ہمارے ربّ! تو رحیم بھی ہے، تو رحمٰن بھی ہے، ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم تیری صفت رحیمیت کا دروازہ کھلوانے میں ناکام ہوئے ہیں اب ہم تیری رحمٰن ہونے کی صفت کے حضور جھکتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ نہ ہمارا کوئی عمل نہ کوئی تدبیر جس طرح تو نے سورج اور چاند کو نیز بے شمار ستاروں کو ہماری فلاح اور بہبود کے لئے پیدا کیا ہے اب بھی اپنی رحمانیت کی صفت کا ایک جلوہ دکھا اور یہ کام کر دے۔

تو جب رشتے دار مایوس ہو جاتے ہیں اور طبیب مریض کو لاعلاج قرار دیتا ہے اور وہ دعائیں جو تدبیر کا ہی حصہ ہیں، تدبیر بھی ہیں، وہ بھی قبولیت حاصل نہیں کرتیں اس وقت اگر ہم رحمٰن خدا کا دروازہ کھٹکھٹائیں تو بسا اوقات وہ ہمارے لئے کھولا جاتا ہے۔ ہمارے ربّ نے جس طرح بے شمار چیزیں ہمارے اعمال سے بھی پہلے ہمارے لئے پیدا کر دی تھیں اور ان کو ہماری خدمت میں لگا دیا تھا وہ خدائے رحمان اپنی تمام قدرتوں اور طاقتوں کے ساتھ آج بھی اسی طرح زندہ ہے جس طرح آج سے پہلے تھا۔

غرض جب رحیمیت کا دروازہ نہ کھلے تو ہمیں رحمانیت کے دروازے پہ جا کے کھڑے ہو جانا چاہیے اور یہ عرض کرنا چاہیے کہ تدبیریں تو نے پیدا کیں، ان کے استعمال کا ہمیں حکم دیا، تدبیروں کو کمال تک

پہنچانے کے لئے تدبیر کا ہی ایک حصہ بنا کر تدبیر کی کامیابی کے لئے دعا کا ہم کو حکم دیا، ہم نے اپنے جتن کئے، ہم کامیاب نہیں ہوئے اس لئے تو ہمارے لئے اپنی صفت رحمانیت کو جوش میں لا اور ہماری ضرورت کو پورا کر جس طرح بے شمار ضرورتیں تو نے ہمارے بغیر کسی عمل اور استحقاق کے اس سے پہلے پوری کر دیں.....

رحیمیت کی صفت ہم پر یہ ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لئے جو سامان پیدا کئے ہیں ان سامانوں کو بہترین رنگ میں ہم استعمال کریں اور ساتھ ہی روحانی تدبیر سے بھی کام لیں اور اس طرح اپنی تدبیر کو کمال تک پہنچائیں کیونکہ اگر تدبیر اپنے کمال کو نہ پہنچے تو بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے پس تدبیر کو انتہا تک پہنچانا ضروری ہے عقلاً بھی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی روشنی میں بھی جب انسان اس دنیا میں تدبیر کو اپنے کمال تک پہنچاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں صفت رحیمیت کا وہ جلوہ دیکھتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے دنیا دار انسان جو خدا پر یقین نہیں رکھتا وہ رحیمیت کا جلوہ تو دیکھتا ہے مگر وہ بدقسمت اسے پہچانتا نہیں وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے زور سے کامیاب ہوا وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اس کی طرح ہی تدبیر کو اپنی انتہاء تک پہنچایا مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے مثلاً سائنس دان ہیں ایک ایک مسئلہ کے حل کے لئے بعض دفعہ دو دو سَو سائنسدان تحقیق میں لگے ہوتے ہیں اور صرف ایک یا دو اس مسئلے کو حل کر پاتے ہیں اور باقی ناکام رہ جاتے ہیں حالانکہ تدبیر بظاہر ایک جیسی تھی اب جو دو کامیاب ہوئے یا ایک کامیاب ہوا تو وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی تدبیر سے کامیاب ہوا اور وہ یہ نہیں دیکھتا کہ ایک سو ننانوے دوسرے سائنسدان جو ہیں وہ اسی قسم کی تدبیر کرنے کے باوجود ناکام کیسے ہو گئے؟

پس اللہ تعالیٰ بعض پر رحیمیت کا جلوہ ظاہر کر دیتا ہے یہ جلوہ تو وہ دیکھتے ہیں لیکن صرف دنیا کی آنکھ رکھتے ہیں روحانی بینائی سے محروم ہیں اس لئے ان جلوؤں کے باوجود وہ خدائے رحیم کی معرفت سے محروم رہ جاتے ہیں۔

رحیمیت کے جلوے جماعت مومنین بھی ہر روز ہی دیکھتی ہے کیونکہ بعض کام ایسے ہیں کہ ان کے لئے بیس منٹ کی تدبیر کرنی پڑتی ہے اور بعض کام ایسے ہیں جن کے لئے گھنٹہ کی تدبیر کرنی پڑتی ہے اور بعض کام ایسے ہیں جن کے لئے دو گھنٹے کی تدبیر کرنی پڑتی ہے ہر کام کے لئے ایک وقت اللہ تعالیٰ

نے مقرر کیا ہوا ہے اور بہت سی تدبیریں دن کے ایک حصہ میں ہی کمال کو پہنچ جاتی ہیں مثلاً عورت نے گھر میں کھانا پکانا ہوتا ہے کوئی ایک گھنٹہ میں کھانا تیار کر لیتی ہے کوئی دو گھنٹہ میں اگر کوئی عورت یہ سمجھے کہ میں نے تدبیر کر لی اور کھانا پک گیا اب مجھے اپنے ربّ کی رحمت کی ضرورت نہیں تو ایسی عورت کو سبق دینے کے لئے اللہ تعالیٰ کبھی اس طرح بھی کرتا ہے کہ جس وقت بڑے شوق اور محنت سے وہ سالن تیار کر چکی ہوتی ہے اور خوش ہوتی ہے کہ میرے بچوں کو، میرے خاوند کو اچھی غذا مل جائے گی تو ایک بچہ دوڑتا آتا ہے اور اس کی ٹھوکر سے ساری ہنڈیا چولہے کے اندر گر جاتی ہے اللہ تعالیٰ بتانا چاہتا ہے کہ تیری تدبیر کافی نہیں میرا فضل جب تک ساتھ نہ ہو انسان کامیاب نہیں ہوسکتا۔

کافر اور منکر کہتا ہے یہ حادثہ ہے مومن کہتا ہے اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میری تدبیر کے ساتھ شامل نہ ہوئی اس طرح اللہ تعالیٰ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ جب تک میری رحیمیت کا جلوہ تمہاری تدبیر کے ساتھ نہیں ہوگا تم کامیاب نہیں ہوسکتے۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۱۶۸ تا ۱۷۴)

رحیمیت کی صفت تقاضا کرتی ہے کہ انسان اعمال کے نتیجہ کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر چھوڑے اور اس حقیقت کو پہچانے کہ تدبیر کرنا انسان کا کام ہے اور نتیجہ نکالنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اس دنیا میں جو اسباب کی دنیا ہے خدا تعالیٰ کی اس صفت کے جلوے بہت سے لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہتے ہیں کیونکہ اسباب کے پردے میں وہ جلوے بہت حد تک مستور ہوتے ہیں لیکن ایک مومن بندہ یہ جانتا ہے کہ انسان خواہ کتنی ہی تدبیر کیوں نہ کرے جو اسباب اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں ان کا بہترین استعمال کرے، اپنی قوتوں اور استعدادوں کو ضائع نہ ہونے دے اور ان کا صحیح استعمال کرے اور دعا بھی کرے کہ یہ بھی تدبیر ہی ہے پھر بھی دعا کو قبول کرنا اور اسباب کا وہ نتیجہ نکالنا جو یہ شخص چاہتا ہے کہ نکلے جس نے تدبیر کے ذریعے اُن اسباب کو استعمال کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ محض تدبیر کرنے سے یقینی طور پر وہ نتیجہ نہیں نکلتا جو تدبیر کرنے والا چاہتا ہے نہ ساری دعائیں قبول ہوتیں ہیں۔ ہماری اس زندگی میں ہزاروں بار یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ تدبیر کو انسان اپنی انتہا تک پہنچا دیتا ہے دعاؤں میں کوئی کمی نہیں رکھتا بظاہر لیکن دعائیں بھی ردّ کر دی جاتی ہیں اور تدابیر بھی بے نتیجہ ثابت ہوتی ہیں اور انسان حیران اور پریشان ہوتا ہے کہ میں نے کیا کچھ تھا اور چاہتا کچھ تھا لیکن ہوا کچھ اور۔ اور میری خواہش کے

مطابق میری تدبیر کا نتیجہ نہیں نکلا بیسیوں خطوط مجھے آتے رہتے ہیں پوری کوشش کرتے ہیں اپنی سمجھ کے مطابق لیکن جس قسم کی تجارت بھی کرتے ہیں اس میں ناکام ہو جاتے ہیں اور سرمایہ ضائع ہو جاتا ہے۔

تو تدبیر کرنا انسان کے لئے ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اسباب کی دنیا بنایا ہے اور انسان کو بہت سی قوتیں اور استعدادیں عطا کی ہیں جس کے نتیجہ میں وہ تدبیر کر سکتا ہے اسی لئے وہ اس قابل ہے کہ تدبیر کرے، وہ کام کرے، وہ محنت کرے، وہ سوچے، وہ اپنی عقل سے کام لے، وہ کامیابی کے بہترین طریقے جو ہیں ان پر چلے لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد اگر وہ یہ سمجھے کہ جس طرح ایک اور ایک مل کے دو بن جاتے ہیں اسی طرح میری تدبیر اور دعا کا ضرور نتیجہ نکلے گا تو وہ غلطی پر ہوتا ہے اور اپنی دنیا میں اس ٹھوس اور مادی دنیا میں ساری تدبیروں کو بے نتیجہ ہوتے، ساری دعاؤں کو ردّ ہوتے وہ دیکھتا ہے ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں متوجہ کیا ہے کہ خدائے رحمٰن کی طرف متوجہ ہو جائیں یعنی اپنے پر ایک قسم کی موت وارد کر کے اس کے حضور جھکو (اور یہ دعا عام دعاؤں کی قسم کی نہیں ہوتی) اور اس سے کہو اے ہمارے رحمٰن ربّ! تو نے ان گنت اور بے شمار نعمتیں ہمارے لئے پیدا کیں اور ہمارے عمل کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا کیونکہ وہ پیدائش سے بھی پہلے وجود میں آ چکی تھیں ان اسباب ان نعمتوں سے آج ہم فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو اٹھا نہیں سکتے ہم اگر تیری رحیمیت کا جلوہ دیکھنے کے قابل نہیں تو اے رحمان خدا! ہمیں اپنی رحمانیت کا جلوہ دکھا۔

ان دو کے علاوہ دو اُمہات الصفات ہیں جو سورۃ فاتحہ میں بیان ہوئی ہیں۔ ایک پہلی صفت جو ربوبیت کی صفت ہے اور ایک چوتھی صفت جو مالکیت یوم الدین کی صفت ہے۔

یہ چار صفات ایسی ہیں جن کے جلووں کا تعلق پیدائش عالم سے لے کر جزا سزا کے دن تک پھیلا ہوا ہے۔ ربوبیت کی صفت جلوہ گر ہی اس وقت ہوتی ہے جب پیدائش شروع ہو جائے جب خالق خلق کرتا ہے اور وہ تمام سامان پیدا کرتا ہے کہ اس کی مخلوق ان استعدادوں کو اپنے کمال تک پہنچائیں جو اس نے ان کے اندر رکھی ہیں خصوصاً انسان کے اندر بڑی استعدادیں اور قوتیں اس نے رکھی ہیں اور بڑی طاقتیں اس میں ودیعت کی ہیں تو ربوبیت کا جلوہ پیدائش کے وقت سے شروع ہو گیا۔ کیونکہ ربّ کے معنی ہیں خالق، پیدا کرنے والا۔ جو بہت سی قوتیں اور استعدادیں بھی ہر چیز میں پیدا کرتا ہے اور درجہ بدرجہ ان کو نشوونما کرتے ہوئے اس چیز کو اپنے کمال تک پہنچا دیتا ہے دنیا کی ہر چیز جو ہے

وہ ربوبیت کے اس دور میں گزر رہی ہے مثلاً ہیرا بنتا ہے شاید لاکھوں سال اس پہ گزرتے ہیں تب وہ ہیرے کی شکل اختیار کرتا ہے درجہ بدرجہ اس میں تبدیلیاں ہوتی چلی جاتی ہیں اور وہی مٹی کے ذرات جو آپ لوگوں کی جوتیوں کے تلوے کے نیچے حقیر اور بے قیمت ہوتے ہیں وہی ذرے ہیرے کی شکل اختیار کر جاتے ہیں.........

اسلام نے ربّ کا تخیل جو ہمیں دیا ہے وہ یہ نہیں کہ اللہ نے پیدا کیا اور پھر آرام کرنے لگ گیا یا دوسرے کاموں میں مشغول ہو گیا اور پیدائش کے ساتھ جو پہلے کر چکا ہے اس کا ہر وقت زندہ تعلق قائم نہ رہا بلکہ خدا تعالیٰ کی ربوبیت کی جو صفت ہے اس کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک چھوٹے سے فقرے میں بڑی بنیادی چیز ہمیں بتائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ربوبیت کا فیضان تمام کائنات کی جان ہے پھر فرماتے ہیں ایک لمحہ کے لئے یہ فیضان منقطع ہو جائے تو تمام عالم نابود ہو جائے تو اس نے پیدا کیا، نشوونما کے سامان پیدا کئے اور ہر وقت ایک زندہ تعلق اپنی مخلوق کے ساتھ اس نے قائم رکھا ہے اگر ربوبیت کا یہ تعلق ایک لحظہ کے لئے بھی منقطع ہو جائے مخلوق کے ساتھ تو وہ قائم نہ رہے جس طرح وہ نیست سے ہست ہوئی تھی ہست سے نیست ہو جائے فنا ہو جائے فوری طور پر۔

تو ربّ کا تعلق ہر وقت، ہر آن، ہر چیز سے ہے جس کو اُس نے پیدا کیا ہے۔ یہ تعلق انسان کے ساتھ بھی ہے اور انسان کو اس نے بڑی استعدادیں دیں اور اپنے قرب کے لئے اس نے اسے پیدا کیا اور اپنی صفات کا مظہر بننے کی قابلیت اس کے اندر رکھی اور ہم دیکھتے ہیں کہ بنی نوع انسان کو بحیثیت ایک نوع کے ایک بڑے ہی نچلے درجے سے آہستہ آہستہ اٹھا کر اس نے اس مقام پر پہنچایا کہ جہاں انسان کامل کی پیدائش ممکن ہو سکتی تھی اور انسان کامل کی پیدائش کر دی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور ایک کامل کتاب آپ کے ذریعہ بنی نوع انسان کو ملی۔ انسانی شعور اور انسانی عقل آپ کے زمانے میں اپنے کمال کو پہنچا اور اس کمال کو قائم رکھنے کے لئے دنیا کی تدبیر، جس طرح اور تدبیریں اس نے کیں، قرآن کریم کی شکل میں انسان کو دی کہ اگر اسی پر انسان غور کرتا رہے اور اس کے احکام کی پیروی کرے تو انسان کی عقل بھی اپنے معراج پر قائم رہے گی اور اس کی روحانیت بھی اپنی رفعتوں سے نیچے نہیں گرے گی۔

ربّ کی جو ربوبیت ہے اس کے جلوے انسان سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور مٹی کے ذرات سے بھی

تعلق رکھتے ہیں، ہر مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں اور اس خلق کا عالمین کی پیدائش کا خلاصہ اور لُب جو تھا وہ انسان کامل تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ذریعہ سے انسان کے لئے ایسے سامان پیدا کر دیئے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی عقل کے معیار کو بھی بلند تر مقام پر رکھ سکتا ہے اور روحانی رفعتوں کو بھی زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکتا ہے۔

جب تک ہم اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو صحیح طور پر نہ پہچانیں ہم غافل ہو جائیں گے اگر ہم یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی تو ہم سے تعلق رکھتا ہے کبھی ہم سے غافل ہو جاتا ہے تو پھر اس ٹوہ میں وہی رہیں گے نا کہ جو اس کی (نعوذ باللہ) غفلت کا زمانہ ہے اس میں ہم ایسی باتیں بھی کر جائیں جسے وہ پسند نہیں کرتا (العیاذ باللہ) لیکن اس کا تعلق تو ہر آن اور ہر وقت ہم سے ہے دوسری مخلوق سے بھی ہے لیکن انسان سے بھی ہے اور ربوبیت کا یہ تعلق ہی ایک زندہ تعلق ہے جو انسان سے ہے۔ اس نے انسان کے لئے اس بات کو ممکن بنا دیا ہوا اپنی جسمانی اور روحانی بقا کو حاصل کر سکے اور رفعتوں کو پا سکے یہ تو تھی وہ صفت کہ خلق کے ساتھ ہی اس کے جلوے ہر آن ہمیں نظر آنے لگیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے بہترین اور عظیم جلووں کے لئے پیدا کیا ہے یہ دنیا جو ہے وہ مادی دنیا ہے اور خدا تعالیٰ کے جو جلوے یہاں ہمیں نظر آتے ہیں وہ اسباب کے پردہ میں چھپے ہوئے ہیں اس وجہ سے بہت ہیں اندھے آنکھوں کے اور دل کے جو خدائے رحیم کے جلوے دیکھ ہی نہیں سکتے سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے حاصل کرنا ہے اپنے زور، طاقت، مال، اثر، رسوخ، اقتدار یا علم سے حاصل کرنا ہے یہ نہیں جانتے کہ جس خدا نے علم دیا ہے عقل دی ہے وہی خدا جب غضب میں آتا ہے تو عقل و علم کو جنون سے بدل دیتا ہے، نہیں سمجھتے کہ جس ہستی نے مال دیا ہے وہ ہستی اتنی قادر و توانا ہے کہ جب اس کا غصہ انسان خرید لے تو وہ دولت کو فقیری میں بدل دیتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ میری صحت بڑی اچھی ہے اور میں اکیلا ہی سو آدمیوں پر بھاری ہوں اور اپنے جسم کی صحت کے نتیجہ میں وہ تکبر اختیار کرتا ہے وہ نہیں جانتا کہ ایک سکینڈ کے ہزارویں حصہ میں خدا کے قہر کا جلوہ اس پر فالج وارد کر سکتا ہے اور ساری اس کی طاقتیں اور سارا اس کا تکبر اور گھمنڈ خاک میں مل جاتا ہے اور کچھ بھی باقی اس کا نہیں چھوڑتا لیکن چونکہ یہ اسباب کی دنیا ہے انسان بعض دفعہ غفلت برتتا ہے اور خدا تعالیٰ کی رحیمیت کے جلووں، اس کی رحمانیت کے جلووں کو دیکھ نہیں سکتا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ مادی دنیا ہے اسباب کی دنیا ہے

خدا تعالیٰ سے اپنی پوری شان کے ساتھ اس مادی دنیا میں نظر ہی نہیں آ سکتے۔ وہ جلوے عدم کو چاہتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک صفت یہاں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بیان کی۔ یہ صفت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جس عالمین کو ربّ العالمین نے پیدا کیا تھا اس عالمین کو وہ اللہ جو تمام صفاتِ حسنہ سے متصف اور قدرتوں کا مالک ہے ایک وقت میں فنا کر دے اور سارے حجاب دور ہو جائیں اور اس کے عظیم جلوے انسان پر ظاہر ہونے لگیں اور اس کو نظر بھی آنے لگیں کوئی حجاب بیچ میں نہ رہے اس کے قہر کے جلوے شقاوتِ عظمیٰ رکھنے والے دیکھیں اور اس کے پیار کے جلوے اور اس کے جمال کے جلوے اور اس کے حسن اور احسان کے جلوے وہ دیکھیں جو سعادت عظمیٰ رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے یہ جلوے ہر قسم کے حجاب سے باہر نکل کے اس کے سامنے آئیں۔ اس غرض کے لئے اس نے جزا سزا کا دن رکھا ہے اور ہمیں اس طرف متوجہ کیا کہ اس دنیا کی بھول اور خطا اور نسیان اور غفلت اور گناہ اور عصیان اور خدا سے دوری کی برداشت انسان کو ایک سکینڈ کے لئے بھی نہ کرنا چاہیے۔

اعمال کا نتیجہ اس دن نکلے گا اور وہ نتیجہ کوئی معمولی نہیں وہ نتیجہ اس دن نکلے گا جو جزا سزا کا دن ہے اور تمہارا ربّ جو رحمان اور رحیم ہے وہ مالک کی حیثیت سے تمہارے سامنے جلوہ گر ہوگا چونکہ وہ مالک کی حیثیت سے جلوہ گر ہوگا تم میں سے کوئی شخص کھڑے ہو کر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ اے ہمارے ربّ ہمارا تجھ پر یہ حق ہے ہمیں دے کیونکہ جو مالک ہے ہر ایک چیز کا اس پر کسی کا کوئی حق نہیں ہو سکتا عقل بھی اس کو تسلیم نہیں کرتی اور نہ کر سکتی ہے اور چونکہ وہ مالک ہے اس لئے امید بھی دلا دی کہ اگر وہ چاہے تو جتنا چاہے دے دے وہ جتنے گناہ چاہے معاف کر دے، وہ جتنا فضل کرنا چاہے فضل کرے لیکن ایک دولت مند امیر جس کے کارخانے میں ایک ہزار مزدور کام کر رہا ہے یہ مزدور اس سے ڈرتے نہیں کیونکہ کچھ حقوق ہیں ان کے کچھ ایسے حقوق ہیں جو مالک نے تسلیم کئے ہیں کچھ ایسے حقوق ہیں جو دنیا تسلیم کرتی ہے اور حق دلواتی ہے کچھ ایسے حقوق ہیں جو حکومتیں دلواتی ہیں کچھ ایسے حقوق ہیں جو حکومتوں کا تختہ الٹ کے حاصل کر لئے جاتے ہیں یہ دنیا ایسی ہے لیکن وہاں تو اس طرح نہیں ہوگا مالک کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا کوئی شخص کھڑے ہو کر یہ نہیں کہہ سکتا نہ یہاں نہ وہاں لیکن وہاں تو اس کے جلوے اس قدر عظمت اور جلال اور شان کے ساتھ ظاہر ہوں گے کہ کسی شخص کو یہ جرأت ہی نہ ہو سکے گی کہ وہ سمجھے کہ میرا کوئی حق ہے جو مجھے ملنا چاہیے۔ حق کوئی نہیں کسی کا جس نے پیدا کیا سارے

حقوق اسی کے ہیں جو ہمارا ربّ ہے جس کی رحمانیت کے ہم نے جلوے دیکھے ہیں جس کی رحیمیت کے پیار کو ہم نے محسوس کیا ہے جب اس کے سامنے ہم جائیں گے تو ہماری روح پکار رہی ہوگی کہ اے ہمارے ربّ! ہمارا تجھ پر کوئی حق نہیں لیکن ہم تیرے فضل اور تیری رحمت کے بھکاری ہیں ہم اس کی صدا دیتے ہیں کہ اپنے فضل اور رحمت سے ہمیں نواز۔ ہماری غفلتوں کو نظر انداز کر دے تو مالک ہے اگر ہم نے تیرا گناہ کیا اگر ہم نے کچھ خطائیں کی ہیں اگر ہم نے تیری دنیا میں وہ کیا جو تو ناپسند کرتا تھا تو آج اس دنیا میں مالک کی حیثیت سے ہمیں معاف کر دے۔ مالک کا جلوہ جو ہے وہ حقیقی معنی میں حقیقی رنگ میں اس دنیا میں نظر نہیں آتا کیونکہ یہ پردے کی دنیا ہے اس لئے ضروری تھا کہ جزا سزا کا دن مقرر کیا جاتا اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے کامل اور مکمل اور اصفیٰ جلوے کسی قسم کی کدورت کے بغیر وہ ہم پر ظاہر ہوتے ہیں اور پھر ہمیں وہ لذت اور سرور حاصل ہوتا ہے جو اس دنیا میں حاصل ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ یہاں ہے اسباب کی دنیا۔ جلوے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں....

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی صفت انتہا ہے ان چاروں اُمہات الصّفات کی، پیدا کیا، ترقی دی، نشوونما کے سامان پیدا کئے اس دنیا میں بے شمار، اَن گنت جیسا کہ خود قرآن نے دعویٰ کیا ہے اور ایک عقلمند اس کو صحیح سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اَن گنت نعمتیں اس نے عطا کیں اور جسمانی لحاظ سے اور ذہنی لحاظ سے اور اخلاقی لحاظ سے اور روحانی لحاظ سے رفعتوں پر پہنچاتا چلا گیا لیکن بسبب انسان جو حقیقتاً اپنے ربّ کی اور اس کی صفات کی معرفت حاصل کر لیتا ہے جب اس مقام پر پہنچا کہ اُس نے سمجھا کہ میں نے انتہائی رفعت کو پالیا اس وقت اُس کے سامنے اُس کا مالک آجاتا ہے یعنی خدا جو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے اور اُس کو یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اسی کا سہارا تھا اُس نے سہارا دیا اور بلندیوں پر لے گیا اپنے نفس کو دیکھتا ہوں تو خالی ہاتھ پاتا ہوں تب ایک انتہائی خوف اور قلق دل میں پیدا ہوتا ہے اور انسان اپنے ربّ کے حضور جھکتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا کسی نیکی کا، کسی بزرگی کا، کسی پاکیزگی کا میں دعویدار نہیں ہوں لیکن اے میرے پیارے! تو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے اس واسطے مالک کی حیثیت سے مجھ پر اپنی رحمت کو نازل کر اُس دن جس دن تو سب دنیا کو اکٹھا کرے گا اور تیرا فیصلہ حق کا فیصلہ ہوگا۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۱۷۸ تا ۱۸۵)

اسلام کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ربّ العالمین ہے۔ جو چیز بھی اس نے اس عالمین میں پیدا کی اس کی

ربوبیت کی ذمہ داری اس کے اوپر ہے۔ ہر چیز کو مناسبِ حال قوتیں عطا کیں اور ہر قوت کے مناسبِ حال غذا یا دوسری ضروریات جو ان کی نشوونما کے لئے چاہئیں تھیں وہ مہیا کیں۔ انسانوں کے لئے خاص طور پر پیدائشِ نوعِ انسانی سے پتا نہیں کتنے کروڑ سال پہلے سے ایسی اشیاء کی پیدائش کا سامان کیا جو انسان کو کئی کروڑ سال بعد چاہیے تھا۔ تو جو صفتِ ربوبیت ہے اس کا تعلق مخلوق کی ہر شے سے ہے۔ ربّ کے معنی عربی میں ہیں پیدا کرنے والا اور صحیح نشوونما کے سامان پیدا کر کے کمال مقصود تک پہنچانے والا۔ مثلاً (عام مثال میں لے لیتا ہوں سب کو سمجھانے کے لئے) ایک اچھا دنبہ چاہیے ایک صحت مند جسم کی صحت کو قائم رکھنے کے لئے۔ تو دنبہ پیدا کیا اس نے اور اس کو صحت مند رکھنے کے لئے جس چیز کی بھی ضرورت تھی وہ پیدا کر دی۔ اس لئے کہ تمام اشیاء آخرکار انسان کی خدمت پر لگی ہوئی ہیں۔ تو اسلام کہتا ہے کھیلو اس لئے کہ کھیلنے کے نتیجہ میں تمہارے اجسام کی، تمہارے جسموں کی نشوونما اس طور پر ہو کہ تم وہ بوجھ برداشت کر سکو جو دوسری تمہاری صلاحیتوں کے نتیجہ میں تمہارے جسموں پر پڑنے والے ہیں......

تو یہ جو ربوبیت ہے اس میں ہر چیز کے لئے ایسے سامان پیدا کئے گئے ہیں کہ جو اس کی صحیح نشوونما کریں اگلی صلاحیتوں کی، جو بعد میں بلندی کی طرف لے جانے والی ہیں۔ تو جسمانی صحت کے بعد ذہنی قوتیں اور طاقتیں اور استعدادیں اور صلاحیتیں ہیں تو اسلام کہتا ہے کہ ایسی کھیلیں کھیلو کہ تمہارے جسم ذہنی طور پر صحیح اور بہترین نشوونما حاصل کر سکیں......

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو چار بنیادی صفات اللہ تعالیٰ کی بیان کی ہیں، ان کے متعلق جو روشنی ڈالی ہے اپنی تفسیر میں مختصراً میں اس کو لیتا ہوں کیونکہ اصل جوڑ میرے دماغ نے انہی کے ساتھ باندھا ہے ان باتوں کا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام (الفاظ میرے ہیں کیونکہ میں نے نقل نہیں کئے، مفہوم نوٹ کیا ہوا ہے) فرماتے ہیں کہ اللہ ربّ العالمین ہے یعنی پیدا کرنا اور کمال مطلوب تک پہنچانا تمام عالموں میں جاری وساری ہے۔ اس میں انسان میں اور دوسری چیزوں میں فرق نہیں بلکہ حیوانات سے بھی آگے چلتے ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں یہ ربوبیت باری تمام ارواح واجسام حیوانات میں، نباتات میں، جمادات وغیرہ پر مشتمل ہے اسے آپ نے فیضانِ عام کا نام دیا اور یہ جو تقسیم کی ہے آپ نے، نباتات

وجمادات کا ایک گروپ اور اجسام وحیوانات کا دوسرا اور ارواح کا تیسرا اس میں یہ شکل بنتی ہے کہ اس سارے عالمین میں وہ اشیاء جن کا تعلق نباتات وجمادات سے ہے مثلاً کانین، کیلشیم اس کے اندر نمک آ جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ جو نباتات ہیں کھیتیاں ہیں، یہ درخت ہیں، یہ جنگل والے درخت ہیں، یہ پھل والے درخت ہیں یہ ساری چیزیں جو ہیں یہ نباتات میں آتی ہیں۔ یہ ساری کی ساری چیزیں حیوانات کی خدمت کر رہی ہیں، حیوانات واجسام کی خدمت کر رہی ہیں اور جو حیوانات واجسام ہیں یعنی حیوانات کے اجسام، وہ سارے کے سارے آگے انسان کی خدمت کر رہے ہیں، تو کچھ خدمت نباتات وجمادات اجسام وحیوانات کی وساطت سے انسان کی کر رہے ہیں۔ نباتات وجمادات کچھ خدمت بالواسطہ نہیں، بلاواسطہ ارواح کی یعنی انسان کی جس کو خدا تعالیٰ نے قائم رہنے والی روح عطا کی ہے اس کی کر رہے ہیں۔ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثية:۱۴) کہا گیا ہے۔

تو ربّ العالمین کی ربوبیت کا تعلق تمام اجسام سے ہے، ہر چیز جو مخلوق ہو اور ارواح سے بھی ہے اور تمام اجسام جو ہیں وہ ایک جہت کی طرف جا رہے ہیں۔ پہلے وہ ملتے ہیں انسانی زندگی کے ساتھ۔ پھر انسان کی جو ہے کوشش اور تگ ودو اور دوڑ یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن میں روشنی پیدا کرے، اچھے اخلاق کا مالک ہو، روحانی میدان میں اللہ تعالیٰ کے پیار کو حاصل کرے اور اپنے لئے ایک ایسی پیاری، خوشحال ابدی زندگی پائے جو مرنے کے بعد ملتی ہے انسان کو۔

تو ہم کھیل اس لئے کھیلتے ہیں کہ ہمارے لئے جنت میں جانا آسان ہو جائے۔ ہم وہ بوجھ اٹھا سکیں جن بوجھوں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ جنت میں بھیجنے کے سامان پیدا کرتا ہے اپنے فضل سے۔ یہ جسمانی استعدادیں اور صلاحیتیں جو ہیں ان کا تعلق ربوبیتِ ربّ العالمین سے ہے۔

دوسرے ہیں ذہنی صلاحیتیں، ان کا تعلق خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمٰن سے ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔

ہر جاندار کو جس میں انسان بھی شامل ہے اس کے مناسبِ حال صورت اور سیرت بخشی۔ جن قوتوں اور طاقتوں کی ضرورت تھی یا جس قسم کی بناوٹ جسم اور اعضا کی حاجت تھی وہ سب اس کو عطا کر دیئے۔

تو صفتِ رحمانیت کا تعلق سارے جانداروں سے ہے، حیوانات سے ہے اور تمام حیوانات کم یا

زیادہ ذہن رکھتے ہیں، فوری نتیجہ نکالا۔ شکاری جانتے ہیں کہ ہرن جب شکاری کے سامنے جھاڑیوں میں سے نکل کے آتا ہے تو اسے ایک سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لگتا یہ نتیجہ نکالنے میں کہ یہاں مجھے خطرہ ہے اور اس پھرتی سے وہ گھومتا اور پھر جھاڑیوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ اس کا تعلق ذہن سے ہی ہے نا۔ اس کے گھٹنوں سے یا اس کے پیروں سے یا اس کے سینگوں سے تو نہیں اس کا تعلق۔ لیکن سب سے زیادہ ذہن اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کیا۔ بہرحال رحمانیت کا تعلق جسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فیضانِ عام فرمایا، تمام حیوانات سے ہے کیونکہ اس کا تعلق ذہنی صلاحیتوں سے ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ انسان کو خدا تعالیٰ کی رحمانیت سے سب سے زیادہ حصہ ملا۔ ہر چیز اس کی کامیابی کے لئے قربان ہو رہی ہے۔ اس واسطے انسان کو ایسا ذہن ملا کہ اس کائنات کی ہر چیز سے جو اس کی خدمت پر مقرر کی گئی ہے فائدہ اٹھا سکے اور کام لے سکے۔

رحمانیت کا تعلق ذہنی صلاحیتوں سے ہے۔ رحیمیت کا تعلق اخلاقی استعدادوں سے ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اسے فیض خاص کہتے ہیں اور اس کا تعلق صرف انسان سے ہے۔ صرف انسان ہے جو بااخلاق یا بداخلاق ہے۔ جب مثلاً شکاری پر ریچھ حملہ کرتا ہے (ایسے علاقوں میں شکاری جاتے ہیں جہاں ریچھ رہتے ہیں، ان کے شکار کے لئے) تو کبھی انسان ریچھ کا شکار کر لیتا ہے کبھی ریچھ انسان کا شکار کر لیتا ہے۔ تو جب ریچھ حملہ کرتا ہے انسان پر تو کوئی دنیا کا انسان اسے بداخلاق نہیں کہتا۔ اسے خونخوار جانور تو کہتا ہے لیکن اخلاق کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ وہ اس کی فطرت جو ہے، رحمانیت نے جو اس کو ایک دیا ہے کہ جہاں خطرہ ہے اس کا مقابلہ کر اپنی زندگی بچانے کے لئے، اس لئے وہ حملہ کرتا ہے لیکن اس کو ہم اچھے خلق والا یا بداخلاق نہیں کہہ سکتے۔ جو مرغی آپ ذبح کر کے کھا جاتے ہیں اسے نہیں کہہ سکتے کہ بڑی اچھی، اخلاق والی دیکھو انسان پر قربان ہو گئی۔ مرغی کا اخلاق کے ساتھ کیا تعلق؟ اخلاق کا تعلق صرف انسان سے ہے اور خدا تعالیٰ کی صفتِ رحیمیت سے ہے اس لئے کہ اب یہاں قائم رہنے والی روح کا ایک بنیادی ہلکا سا تعلق ہو گیا پیدا۔ یعنی ایک ایسا فعل جس کے نتیجہ میں استحقاق پیدا ہو جاتا ہے خدا تعالیٰ کے پیار کے حصول کا۔ ملتا نہیں لیکن حقدار بن جاتا ہے یعنی اخلاقی نشوونما، روحانی نشوونما کے لئے راہ ہموار کرتی ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ رحیمیت کے معنی یہ ہیں کہ رحمٰن خدا لوگوں کی دعا اور تضرع اور اعمال صالحہ کو قبول فرما کر آفات اور بلاؤں اور

تجزیہ اعمال سے ان کو محفوظ رکھتا ہے۔

پھر آپؑ فرماتے ہیں صرف انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نطق عطا کیا۔ جس طرح میں اس وقت بول رہا ہوں اور جو بھی میرے خیالات ہیں وہ بیان کے ذریعے آپ تک پہنچا رہا ہوں، اس کو کہتے ہیں نطق عطا کیا۔ صرف انسان کو نطق عطا کیا اس معنی میں۔ اشارے کرتے ہیں جانور بھی ایک دوسرے کو۔ مثلاً کوّا کائیں، کائیں کر کے دوسرے کوّوں کو کہتا ہے خطرہ ہے، اڑ جاؤ یہاں سے۔ لیکن وہ بولنا نہیں، وہ نطق نہیں ہے وہ تو رحمانیت کے اندر آ جاتی ہے چیز۔

آپؑ فرماتے ہیں۔

اس لئے (یہ میں بیچ میں لے آیا ہوں ویسے مضمون سے تعلق نہیں رکھتا لیکن ایک بہت ہی لطیف بات یہاں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ) انسان کا دعا کرنا (یہ اچھی طرح سمجھیں۔ بعض لوگ دعا کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اصل میں تو چوبیس گھنٹے انسان کو دعا میں گزارنے چاہئیں) اس کی انسانیت کا ایک خاصہ ہے جو اس کی فطرت میں رکھا گیا ہے۔

تو جو ہماری فطرت کہتی ہے کہ ہم ہر ضرورت، حاجت، تکلیف یا ایک خواہش کے پورا ہونے کا خیال جب آئے تو ہم ایک خالق اور مالک، سب قدرتوں والے خدا کی طرف رجوع کریں۔

آپؑ فرماتے ہیں۔

رحیمیت کے ذریعہ سے استحقاق پیدا ہوتا ہے، جزا نہیں ملتی یعنی ایسے سامان پیدا ہو گئے کہ پھر وہ روحانیت میں ترقی کرے جنت میں جائے اور اس کو جزا ملے۔ ثمرۂ اعمالِ صالحہ حقیقتاً پورے طور پر وہاں ملتا ہے۔ یہاں بھی مل جاتا ہے اس دنیا میں بھی۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ دو جنتیں ہیں۔ ایک کا تعلق چھوٹی سی، محدود سی، کم وسعت والی جنت جس کا تعلق ہماری زندگی سے ہے اس ورلی زندگی سے اور ایک وہ جہاں اللہ تعالیٰ کا پیار پوری عظمتوں کے ساتھ، انسان کی صلاحیتوں اور استعدادوں کے مطابق ظاہر ہوگا اور ہر قسم کے خوف وہراس سے محفوظ زندگی، خوشحال زندگی، امن والی زندگی، سلامتی والی زندگی، پیار والی زندگی، دکھوں سے محفوظ زندگی اس کو عطا ہوگی اور نہ ختم ہونے والی زندگی ہمیشہ ایک مقام پر نہ ٹھہرنے والی زندگی، خدا تعالیٰ کے پیار میں ہمیشہ زیادتی

دیکھنے والی زندگی، ایک وہ جنت ہے۔

تو رحیمیت کا تعلق اخلاقی استعدادوں سے ہے اور جو اوپر کی منزل ہے سب سے اور جو مطلوب ہے پیدائش انسان کا وہ روحانی طاقتیں ہیں۔ روحانی طاقتیں دیں تا کہ انسانی روح جو قائم رہنے والی ہے اپنے مقصود کو پالے یعنی خدا تعالیٰ سے زندہ تعلق اس کا قائم ہو جائے اور اس کے پیار کو ہمیشہ پا لینے والی بنے۔ اسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فیضان اخصّ کہتے ہیں۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی یہ صفت ہے اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی صفت کا فیضان فیضان اخصّ ہے اور یہ استحقاق کے بعد ثمرہ عطا کرنے والی سند ہے۔ جزا ملتی ہے اس سے اور استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے رحم کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کی رحیمیت جو ہے اس نے ایسے سامان پیدا کئے کہ انسان اپنے لئے خدا تعالیٰ کے پیار کے حصول کا استحقاق حاصل کر لیتا ہے اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے نتیجہ میں ثمرہ مل جاتا ہے، خالی استحقاق نہیں۔ اب دیکھو نا اس دنیا میں بہت سارے ایم۔ اے، بی۔ اے ہیں جن کو نوکری کوئی نہیں ملتی لیکن نوکری کا حق ہے ان کا، ملتی نہیں۔ تو رحیمیت استحقاق پیدا کر دیتی ہے مالکیتِ یوم الدین اس کو وہ ثمرہ دے دیتی ہے وہ صفت فیضان اخصّ کی۔

آپؑ فرماتے ہیں:۔

اس کے دو پہلو ہیں۔ وسیع اور کامل طور پر عالمِ معاد (یعنی مرنے کے بعد جو زندگی ہے) میں یہ صفت متجلی ہوتی ہے، اس کا جلوہ ظاہر ہوتا ہے اور دوسرے اس عالم میں بھی، یہ جو ہماری دنیا، اس عالم کے دائرہ کے موافق یہ چاروں صفتیں جس میں مالك یوم الدین بھی ہے تجلی کر رہی ہیں اور انسان کو زمین سے اٹھا کر آسمانی رفعتوں تک پہنچاتی ہیں اور خدا تعالیٰ کی رحمت کے سایہ میں لا بٹھاتی ہیں۔ قرآن کریم میں ایک جگہ یہی جو ہے ایک حرکت انسان کی یا تنزل کی طرف یا روحانی طور پر رفعتوں کی طرف اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ہم نے تو اسے رفعت دینے کا ارادہ کیا تھا لیکن وہ زمین کا کیڑا بن گیا۔

تو دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں زمین کا کیڑا بن جانے سے محفوظ رکھے اور جو اس کی خواہش ہے کہ ہم اس کے پیار کو اپنے مقبول اعمال صالحہ کے نتیجہ میں حاصل کریں، اس میں وہ ہمیں کامیاب کرے۔ آمین۔

اور یہ صفت جو ہے یہ فیض کا ثمرہ بخشتی ہے یعنی وہ مل جاتی ہے۔ جنّت مل جاتی ہے مالکیّتِ یوم الدین کے نتیجے میں اور اس کے لئے انسان کو ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھنا نہیں بلکہ شروع کرنا ہے اپنے جسم کو مضبوط کرنا خاص مقاصد کے لئے یعنی کھیلنا، کھانے کو ہضم کرنا، جسم میں صلاحیت پیدا کرنا لیکن مقصد دنیا نہ ہو بلکہ دین ہو۔ (خطبات ناصر جلد نہم صفحہ ۳۹۸ تا ۴۰۵)

اللہ تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ میں اپنی چار صفات کا ذکر فرمایا ہے۔ اس میں ہمیں بتایا کہ وہ ربّ ہے۔ اس نے ہمیں پیدا کیا اور ہماری پرورش کے لئے سامان مہیا فرمائے۔ جن کے ذریعہ ہم درجہ بدرجہ پرورش پاتے اور درجہ بدرجہ ترقی کی منازل طے کرتے ہیں۔

وہ رَحْمٰنُ ہے۔ ہمارے استحقاق کے بغیر اس نے ہمارے لئے ہماری تمام ضروریات مہیا فرمائیں۔ وہ رَحِیْمٌ ہے۔ جب ہم تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور اس کی راہوں پر چلتے ہیں تو وہ ایسا کرتا ہے کہ آئندہ کی تکلیفوں سے ہمیں بچا لیتا ہے۔ وہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے جب ہم اس کی کامل اطاعت کرتے ہوئے اعمال صالحہ بجالاتے ہیں تو وہ مقام صالح جو ابدی سرور اور خوشحالی کا مقام ہے ہمیں عطا کرتا ہے۔

یہ چار صفات، حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ یہ اُمّ الصفات ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی جو تسبیحی صفات ہیں ان کی بنیادی صفات یہ چار ہیں۔ جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چاروں صفات اس کے وجود، کرم اور رحمت پر دلالت کرتی ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس کا منشا بھی ہے کہ وہ ہم سے رحم اور کرم کا سلوک کرے مگر کئی بدقسمت لوگ اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں کی وجہ سے اپنے آپ کو صفات الٰہی کے پرتو سے دور کرتے ہیں اور پھر دکھ اٹھاتے ہیں۔

ہمیں ہر وقت خیال رکھنا چاہیے کہ اس کی راہوں سے بھٹک نہ جائیں اور عاجزانہ راہوں سے چاہئیں کہ ان چار صفات کے پرتو کے نیچے رہیں کیونکہ جو شخص ان چار صفات کے پرتو سے نکل جاتا ہے تو وہ دکھ اٹھاتا ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد دہم صفحہ ۳۴۰، ۳۴۱)

توحید کے قیام کے لئے جیسا کہ میں نے کہا ہے دو ذمہ داریاں ہیں۔ (۱) اپنے نفسوں میں توحید کو قائم کرنا (۲) دنیا میں توحید کو قائم کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے جلوے تو بے شمار ہیں وہ گنے نہیں جا سکتے۔ اس کی صفات بھی بے شمار ہیں لیکن جن صفات کو اس نے ہماری زندگی میں ظاہر کیا ہے ان میں

سے چار اُمہات الصفات کہلاتی ہیں۔ یعنی اس کا ربّ ہونا، اس کا رحمٰن ہونا، اس کا رحیم ہونا اور اس کا مالک یوم الدین ہونا۔ اگر ہم ان چار صفات کو پوری طرح سمجھنے لگیں، اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے اور اس حقیقت کا اظہار ہم پر ہو جائے کہ ربّ کے کیا معنی ہیں۔ رحمٰن کی صفت کے جلوے کس طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ رحیمیت اپنا ظہور کس طرح کرتی ہے اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اپنے قادرانہ تصرف کو دنیا کے سامنے کس طرح پیش کرتا ہے تو دوسری صفات کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے ان چار اُمہات الصفات کو بیان کیا اور ان کی طرف توجہ دلائی۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اللہ تعالیٰ کے اس منشاء کے مطابق ہم پر بڑا زور دیا کہ ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرو اور ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کا حکم اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت حاصل کریں کیونکہ اگر ہم ان اُمہات الصفات کو جو تعداد میں چار ہیں خود نہ سمجھیں اور ہماری عقل میں ان کی کیفیت اور ان کی ماہیت (جس حد تک ہماری سمجھ ہے) نہ آئے تو ہم اس کے مطابق اپنی زندگی میں وہ صفات کیسے پیدا کر سکتے ہیں۔ صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کیلئے ان صفات کی معرفت کا حصول ضروری ہے ورنہ ہم اپنی زندگیوں میں ان صفات کے پیدا کرنے کی نتیجہ خیز اور ثمر آور کوشش نہیں کر سکتے۔

رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ کے معنی بڑے وسیع ہیں اس وقت میں اس صفت کے متعلق صرف ایک اصولی بات بیان کرنا چاہتا ہوں اور وہ بات یہ ہے کہ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ کے معنی ہیں پیدا کرنے کے بعد تکمیل کا متکفل ہو جانا یعنی جو فطری مطلوب تھا اس کو پورا کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو کسی خاص غرض کے لئے پیدا کیا ہے۔ انسان کو جس غرض کے لئے اس نے پیدا کیا ہے اور اس غرض کے حصول کے لئے اس کو جن قویٰ کے ساتھ پیدا کیا ہے ان قویٰ کے تدریجی ارتقاء کے بعد ان کو کمال تک پہنچانے کی ذمہ داری اس نے اپنے اوپر لی ہے۔ اس معنی میں وہ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہے۔

ذمہ داری اس معنی میں اس نے اپنے پر لی ہے کہ اس نے فرمایا کہ میں رحمٰن ہوں تمہاری تکمیل کے لئے اور جس غرض کے لئے تمہیں پیدا کیا گیا ہے اس کے حصول کے لئے جس چیز کی بھی ضرورت ہے وہ میں تمہیں دوں گا۔ انسان کو اللہ کا بندہ بننے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور حقیقی معنی میں ایک عبد ہونے کے لئے جس جسمانی قوت یا روحانی طاقت واستعداد کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے وہ طاقت اسے دی

اور اس کی نشوونما کے لئے جن اسباب مادیہ کی ضرورت تھی وہ اسباب مادیہ پیدا کئے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے جلوے ہم پر ظاہر ہوئے۔ ہمارے لئے وہ جلوے اس وقت بھی ظاہر ہوئے کہ ابھی زمانہ کروڑوں سال بعد ہماری پیدائش کا منتظر تھا مگر خدائے علام الغیوب کو چونکہ ہمارا پتہ تھا کہ اس طرح ہم اس کی مشیت سے پیدا ہونے والے ہیں اس لئے کروڑوں اربوں سال پہلے جن چیزوں کی ہمیں اس وقت پیدائش کے بعد ضرورت تھی اور جن کی پیدائش پر کروڑوں اربوں سال گزر جانے تھے وہ کروڑوں اربوں سال پہلے پیدا کر دیں۔

رحمانیت کے جلوؤں میں بڑا ہی حسن واحسان ہمیں نظر آتا ہے۔ ہر چیز جو ہمیں ملی یہ زمین اور اس کا جو فاصلہ سورج اور چاند سے ہے پیدا کی اور پھر زمین میں یہ قابلیت رکھی کہ وہ پانی کے بعد اس قسم کی غذا پیدا کرتی ہے کہ جو ہمارے جسم کو متوازن غذائیت (Nutrition) دے سکے۔ متوازن غذا دے سکے اگر زمین میں مثلاً تیزاب جو ہماری غذا کا ایک حصہ ہے اتنا ہوتا جتنا اس وقت اس میں سٹارچ (Starch) یعنی نشاستہ ہے تو یہ غذا ہم کھا کر زندہ نہ رہ سکتے۔ غرض ہمارے جسموں کو جس متوازن طیب غذا کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں وہ خصوصیات پیدا کیں کہ وہ ایک خادم کی حیثیت سے اس متوازن غذا کے ہمارے لئے سامان کرے۔ پھر رحیمیت ہے رحیمیت کے معنی ہیں کہ متضرعانہ دعاؤں اور اعمالِ صالحہ کو قبول کرتے ہوئے ان کا اچھا اور نیک بدلہ ہمیں دیتا ہے۔ ہماری متضرعانہ دعاؤں اور اعمال صالحہ میں بہت سے نقائص رہ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پردہ پوشی کرتا ہے اور جو نقص رہ جاتا ہے اس کو دُور کر دیتا ہے تا عملِ صالح ضائع نہ ہو۔ غرض رحیمیت کے معنی میں پردہ پوشی کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور رحیمیت کے معنی میں یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ عمل صالح کا نیک نتیجہ جس صورت میں نکل سکتا تھا عمل وہاں تک نہیں پہنچا اس میں کچھ نقص رہ گیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحیمیت اس نقص کو دور کرتی ہے اور اس طرح چشم پوشی سے کام لے کر عمل صالح کا وہ نتیجہ نکال دیتی ہے جو اس کا بہتر نتیجہ (ثمرہ حسنہ) نکلنا چاہئے تھا۔ غرض چشم پوشی کرنا اور نقص کو دور کرنا تا تضیع اعمال نہ ہو۔ اعمال صالح ضائع نہ ہو جائیں۔ رحیمیت کا کام ہے۔ انسان اپنی انتہائی کوشش اور اپنی نہایت عاجزانہ دعاؤں کے باوجود اس بات پر یقین نہیں کر سکتا اس بات پر تسلی نہیں پا سکتا کہ اس کے اعمال میں کوئی نقص نہیں

رہ گیا۔ اگر خدا تعالیٰ کی رحیمیت کے جلووں میں اس نقص کو دور کرنے اور چشم پوشی کے جلوے شامل نہ ہوتے تو ہمارے نیک اعمال کا نیک نتیجہ ہرگز نہ نکلتا۔ غرض اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کا نیک نتیجہ نکالتا ہے اور اس نیک نتیجہ کے نکالنے میں جس حد تک چشم پوشی کی ضرورت ہوتی ہے وہ چشم پوشی کرتا ہے اور جس حد تک ہمارے اعمال کے نقائص کو دور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان نقائص کو دور کرتا ہے اور ہمارے اعمال اور ہماری دعاؤں کا نیک نتیجہ نکال دیتا ہے۔

پھر نیک نتیجہ رحیمیت کے جلووں میں صرف استحقاق پیدا کرتا ہے۔ جس طرح ایک طالب علم جب امتحان دیتا ہے تو اس کی کوششوں کا نیک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ بی۔اے یا ایم۔اے پاس کر لیتا ہے۔ یہ ایک نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے دعائیں کرنے والے اور محنت کرنے والے طلباء کی کوششوں کا نکالتا ہے۔ لیکن بی۔اے پاس کر لینا یا ایم۔اے پاس کر لینا جو نتیجہ ہے یہ پورا بدلہ نہیں ہے بلکہ اس نتیجہ سے بدلہ کا استحقاق پیدا ہوتا ہے یعنی بی۔اے پاس کرنے کے بعد جس قسم کی نوکری کسی کو مل سکتی ہے اس قسم کی نوکری اسے مل جانی چاہئے۔ ایم۔اے پاس کرنے کے بعد جس قسم کی نوکری اُسے مل سکتی ہے وہ نوکری اُسے مل جانی چاہئے۔ یہ نتیجہ ہے جو رحیمیت کے جلووں کے بعد کسی کے اعمال کا نکلتا ہے یعنی ایک استحقاق پیدا ہو جاتا ہے لیکن دنیا میں استحقاق پیدا ہونے کے باوجود وہ بدلہ نہیں ملتا جس کا وہ استحقاق مطالبہ کر رہا ہوتا ہے۔ ہزاروں بی۔اے اور ایم۔اے مارے مارے پھر رہے ہیں اور انہیں کوئی پوچھتا نہیں۔ ابھی کراچی کے قیام کے دوران مجھے ایک احمدی دوست نے بتایا کہ میں سڑک پر جا رہا تھا کہ اچانک میری نظر سڑک پر کام کرنے والے مزدوروں پر پڑی۔ وہ مزدور اِدھر اُدھر سے مٹی اُٹھا کر سڑک پر ڈال رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک مزور عام مزدوروں کی طرح کا نہیں۔ اس میں کوئی ایسی بات پائی جاتی تھی کہ اس نے میری توجہ کو جذب کر لیا۔ یہ مزدور مجھے پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ یہ ان کا تاثر تھا بہرحال انہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے اپنی کار کھڑی کر لی اور اس مزدور کے پاس گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے بتایا کہ میں بی۔اے پاس ہوں لیکن نوکری نہیں ملتی اس لئے میں نے سڑک کوٹنے یا سڑک پر مٹی ڈالنے کی مزدوری کر لی ہے۔ پس اگر دنیا رحیمیت کے جلووں کے پرتو کے نیچے کسی طالب علم کو پاس کر دے (یعنی کوئی مثلاً بی۔اے پاس کر لے) تو کر دے لیکن ضروری نہیں کہ دنیا مالکیت یوم الدین کا نتیجہ ظاہر کرنے کی طاقت بھی

رکھتی ہو۔ خیر اللہ تعالیٰ نے اس احمدی افسر کے ذریعہ اپنی مالکیت کا جلوہ دکھانا تھا چنانچہ اُنہوں نے اس مزدور کو کہا کہ میں فلاں فیکٹری میں ہوں تم وہاں میرے پاس آ جانا میں تمہارے لئے کوئی نوکری تلاش کروں گا۔ چنانچہ وہ مزدور دوسرے دن ان کے پاس گیا اُنہوں نے اس کے لئے کوئی جگہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ انہیں معلوم ہوا کہ اس وقت فیکٹری میں کوئی ایسی جگہ خالی نہیں جہاں کسی بی۔اے پاس کو لگایا جائے۔ اس لئے انہوں نے اس کو ایک ایسے مزدور کی جگہ دلوا دی جس کو فیکٹری دس روپے یومیہ دیتی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ باہر تین چار روپیہ لے رہا ہو اور اس طرح اسے قریباً تین سَو روپے ماہوار کی نوکری مل گئی۔

غرض اللہ تعالیٰ صرف رحیم نہیں یعنی یہ نہیں کہ جو شخص امتحان دے وہ صرف اس کا نتیجہ نکال دے اور اسے پاس کر دے بلکہ وہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے۔ ویسے تو بندہ بڑا ہی عاجز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنی رحمت کے نتیجہ میں اس کی دعاؤں کو قبول کرتا اور اس کی کوششوں کو سراہتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ایک استحقاق پیدا کر دیتا ہے یعنی وہ کہتا ہے تمہارا میں نے یہ حق قائم کر دیا ہے پھر وہ اس سے وہ حق چھینتا نہیں بلکہ جو حق رحیمیت کے جلوے نے قائم کر دیا تھا وہ حق اسے دیتا ہے اس کے سامان پیدا کرتا ہے۔

ایک تو ہمیں یہ معرفت حاصل ہونی چاہئے کہ سوائے اللہ کے کوئی ذات ایسی نہیں جو تربیت کی متکفل ہو جو نشوونما کو کمال تک پہنچانے کی ذمہ داری لیتی ہو۔ ماں باپ بھی یہ ذمہ داری نہیں لے سکتے۔ کتنے ماں باپ ہیں جن کے بڑے ذہین بچے ہوتے ہیں لیکن وہ ان کی تربیت نہیں کر سکتے دنیا کی کوئی مخلوق بھی یہ تربیت نہیں کر سکتی لیکن ہمیں انسان کی بات کرنی چاہئے اللہ تعالیٰ نے اسے اشرف المخلوقات کے مقام پر کھڑا کیا ہے۔ کوئی انسان اس معنی میں اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر ربوبیت نہیں کر سکتا۔ انسان اگر یہ کہے کہ میں اپنے زور سے یہ کروں گا تو وہ نہیں کر سکتا۔ بہتوں نے دعوے کئے لیکن وہ اپنے دعوؤں کو سچا کر کے نہ دکھا سکے۔ آپ روس کے کمیونزم کو لے لیں آپ سوشلسٹ ممالک کے سوشلزم کو لے لیں آپ سرمایہ دارانہ حکومتوں کے دعاوی کو لے لیں کسی جگہ بھی آپ کو یہ نظر نہیں آئے گا کہ ہر شخص کی اس معنی میں ربوبیت ہو رہی ہے۔ بعض کی وہ ربوبیت کرتے ہیں مثلاً فیورٹزم (Favouritism) ہے لیکن یہاں بعض کا سوال نہیں یہاں سوال یہ ہے کہ وہ ہر مخلوق کی تربیت کے متکفل ہوں اور ایسا وہ نہیں کرتے بلکہ انہوں نے تو مزدور کی تنخواہ اور ڈیلی ویجز

(Daily Wages) کے ساتھ ایسا قانون باندھ دیا ہے کہ کم ہی مزدور ہیں جن کے حقوق انہیں ملتے ہیں جن کی ربوبیت کے یہ لوگ متکفل کہلائے جا سکتے ہیں۔یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہم تمہاری جسمانی اور روحانی استعدادوں کی نشوونما کریں گے اور اس کے لئے تمام سامان مہیا کرنے کے ہم ذمہ دار ہیں لیکن وہ عملاً ایسا کر نہیں سکے۔غرض ربوبیت کی صفت کے اندر جو یہ ذمہ داری ہے یہ کہیں نہیں پائی جاتی صرف خدا کے بندوں میں ہمیں یہ نظر آ سکتی ہے اور جو دوسری ذمہ داری ہم پر ہے اس کے ماتحت ہمیں خدا کا بندہ بننا چاہئے۔اگر ہم اللہ تعالیٰ کی توحید کو قائم کرنا چاہتے ہیں تو محض اس کی صفات کا عرفان کافی نہیں بلکہ اپنے اندر ان صفات کو پیدا کرنا بھی ضروری ہے ورنہ تو یہ ایک فلسفہ ہے جس کا حسن اور نہ احسان غیر کا دل موہ لینے کے قابل ہے جب تک وہ حسن اور احسان کا جذبہ ہمارے اندر پیدا نہ ہو اس وقت تک ہم دنیا میں توحید کو قائم نہیں کر سکتے۔

پس ہر احمدی کا فرض ہے کہ وہ ربوبیت کی صفت اپنے اندر پیدا کرے اور جس حد تک اللہ تعالیٰ نے اسے توفیق اور طاقت عطا کی ہے وہ اپنے دائرہ میں پرورش کا متکفل ہو مثلاً اگر وہ خاندان کا بڑا فرد ہے تو وہ اپنی استعداد کے مطابق پرورش کا متکفّل ہو۔اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی استعداد سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اور پھر جماعت کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے بھی وہ ربوبیت کی صفت اپنے اندر پیدا کرے۔ جماعت بحیثیت جماعت اپنے اندر ربوبیت کی صفت پیدا کرنے کیلئے۔اس لئے کوشش کرے کہ وہ سمجھے کہ دنیا میں ہم نے توحید باری کو قائم کرنا ہے اور جب تک ہم اپنے نظام میں، اپنے کام میں اور اپنے عمل میں ربوبیت کی صفت پیدا نہیں کریں گے ہم دنیا میں توحید کو قائم نہیں کر سکتے۔ غرض جس وقت تک ہر فرد جماعت بحیثیت ایک فرد جماعت، جماعت کے کام میں اپنی ذمہ داری کو نہ نبا ہے اس وقت تک توحید حقیقی دنیا میں قائم نہیں ہو سکتی۔

پس ہم پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم ربوبیت کی صفت انفرادی حیثیت میں بھی اور اجتماعی طور پر بھی اپنے اندر پیدا کریں۔ پھر رحمانیت کے جلوے ہیں۔ ہمارے پہلوں نے بڑی خوبصورتی اور بڑے حسن کے ساتھ ان جلوؤں کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کا واقعہ ہے کہ آپ نے ایک بچے کو روتے دیکھا تو دریافت کیا کہ یہ کیوں روتا ہے۔اس بچے کی ماں نے بتایا کہ چونکہ دودھ پیتے بچے کا راشن منظور نہیں کیا جاتا اس لئے میں نے

اس کا دودھ چھڑا دیا ہے۔ اب بچہ گندم یا کھجوریں وغیرہ نہیں کھا سکتا لیکن چونکہ دودھ چھڑانے کے نتیجہ میں اس کی جسمانی تربیت اور نشوونما پر ایک بُرا اور گندہ اور مہلک اثر پڑتا ہے اور اس کا اثر پھر روحانی تربیت پر بھی پڑے گا اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خدائے رحمٰن کی صفت کو اپنے نظام میں جاری فرمایا اور دودھ پیتے بچوں کے لئے راشن مقرر کر دیا۔ ہم سینکڑوں نہیں ہزاروں مثالیں ایسی دے سکتے ہیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ علیہم ہر وقت چوکس اور بیدار رہتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے جلوے دنیا کو ان کی زندگی میں اور ان کے نظام میں نظر آئیں تا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے حسن اور اس کے احسان سے دنیا متعارف ہو جائے اور اس کی طرف کھنچی چلی آئے اور غیر اللہ کے سارے رشتے اس کے نتیجہ میں کٹ جائیں اور صرف خدائے واحد و یگانہ کے ساتھ تعلق اطاعت اور تعلق عبودیت اور تعلق غلامی قائم ہو اور قائم رہے۔

یہ ذہنیت ہماری جماعت میں پیدا ہونی چاہئے اگر یہ ذہنیت ہماری جماعت میں پیدا نہ ہوا اور اگر ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے جلوے دنیا کو نہ دکھا سکیں تو ہم اللہ تعالیٰ کی توحید کو بھی دنیا میں قائم نہیں کر سکتے جس کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے اور آپؑ نے فرمایا کہ اس کے علاوہ میری اور کوئی غرض نہیں کہ میں توحید باری قائم کرنا چاہتا ہوں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت قائم کرنا چاہتا ہوں۔

رحیمیت کے جلوے بھی (جیسا کہ میں نے کہا ہے) ہمیں دکھانے چاہئیں، مالکیت کے جلوے بھی ہمیں دکھانے چاہئیں۔ اگر آپ غور کریں تو آپ بھی میری طرح اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اگر ہم اپنی زندگیوں میں اللہ تعالیٰ کی ان چاروں اُمہات الصّفات کے جلوے دکھانے میں کامیاب ہو جائیں تبھی اور صرف اسی صورت میں ہم خدا تعالیٰ کی توحید کو دنیا میں قائم کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ پس اللہ تعالیٰ کی توحید کے قیام کے سلسلہ میں ہماری ایک ذمہ داری تو یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت حاصل کر کے اپنی زندگی میں ان صفات کو قائم کر دیں اور دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم دنیا میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے جلوے اپنی زندگی میں دکھا کر دنیا کو اللہ تعالیٰ کے حسن و احسان کے جلوے دکھانے کے بعد اس کی معرفت کے حصول کا ذریعہ بنیں تا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید قائم ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وہ عزت عطا کی ہے کہ انسان کا تصور بھی اس عظیم عزت کا

احاطہ نہیں کر سکتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کو دنیا میں قائم کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ہم آپؐ کے ہر قول اور ہر فعل کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔ آپؐ کے ہر قول کو اللہ تعالیٰ کے کلام یعنی قرآن کریم کی تفسیر سمجھیں اور آپؐ کے ہر فعل کو ایسا حسین سمجھیں کہ اس کو اپنے لئے اُسوہ اور ایک قابل تقلید نمونہ سمجھیں اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال کو، آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے لئے اُسوہ نہ سمجھیں اور اس کی بجائے کوئی اور نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں تو اس کا صاف مطلب ہے کہ ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کو نہ سمجھا اور نہ اُسے قائم کرنے کی کوشش کی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل کو جیسا کہ وہ حسین ہے اور احسان کرنے والا ہے سمجھنے لگیں اور اپنی زندگی کیلئے اسے نمونہ بنائیں اور اس طرح پر دنیا میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کو قائم کرنے کی کوشش کریں تو دنیا بڑی جلد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و احسان کی گرویدہ ہو جائے گی۔ کیونکہ اس وقت دنیا میں حقیقی معنی میں نہ کہیں حسن نظر آتا ہے اور نہ کہیں کوئی محسن نظر آتا ہے۔ محسن حقیقی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ جسمانی اور دنیوی طور پر بھی اور روحانی اور اُخروی لحاظ سے بھی آپ ہی کی ذات محسن اعظم ہے اور آپ ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو انسان نے اس رنگ میں اور اس شان میں اور اس حسن میں اور اس احسان میں پہچانا اور اس سے تعلق رکھا۔

اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی ذات کے لحاظ سے بھی اور اپنی صفات کے لحاظ سے بھی بے مثال و مانند ہے لیکن اس کے قریب تر اور اس کے مشابہ تر جو وجود پیدا ہوا وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود تھا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کہا۔ میری صفات کے مظہر اتم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظہر اتم ہیں اگر ہم آپ کی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے لئے اُسوہ اور نمونہ سمجھیں اور بنائیں تو اپنی استعداد کے مطابق ہم بھی اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظہر ہوں گے اور ایک لحاظ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کو دنیا میں قائم کرنے کا موجب بنیں گے اور دوسرے لحاظ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ کو دنیا میں قائم کرنے کا وسیلہ بنیں گے۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۸۷۰ تا ۸۷۷)

جو قرآنِ کریم نے ہمیں بتایا ہے وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات میں ہمیں حُسنِ کامل اور احسانِ کامل نظر آتا ہے اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظہر اتم ہیں۔قریباً قریباً ساری خدائی صفات آپؐ کی زندگی میں جلوہ گر ہیں۔اس لئے ہم خدا تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ خدا کی مخلوق خدا نہیں بن سکتی لیکن خدا کی مخلوق جب خدا کے قریب تر پہنچ سکتی ہے اور حضرت محمدؐ کی ذات میں پہنچی ہے تو ہمیں آپؐ کی ذات میں خدا کی وہی شکل اور کیفیت نظر آتی ہے۔ جو قرآن کریم میں بیان ہوئی۔پس ایک تو جہاں تک انسان اپنے حُسن کو دوبالا کرسکتا تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں وہ دوبالا ہو چکا ہے اور جہاں تک کوئی انسان خدا تعالیٰ کے احسان کی صفات کو اپنی زندگی میں جلوہ گر کرسکتا تھا۔ وہاں تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احسان کی صفات جلوہ گر ہیں۔گویا آپؐ حسن واحسانِ صفاتِ باری کے مظہر اتم ہیں۔اللہ تعالیٰ کی صفتِ حُسن سے کیا مراد ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ احسان سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتب میں وضاحت فرمائی ہے۔آپ فرماتے ہیں:

”خدا تعالیٰ کی صفات اپنے نفس میں حُسنِ باری ہیں۔مثلاً یہ تصور کہ ایک ایسی ذات ہے جس نے تمام عالمین کو پیدا کیا اور وہ اُن کی ربوبیّت کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ ربوبیّت کی صفت ایک حُسن ہے۔رحمانیّت کی صفت ایک حُسن ہے۔رحیمیّت کی صفت ایک حُسن ہے اور مالکیت یوم الدین کی صفت ایک حُسن ہے لیکن جب یہی صفات جو اپنے نفس میں حُسنِ باری تعالیٰ کو ظاہر کر رہی ہیں کسی فرد یا جماعت پر جلوہ گر ہوتی ہیں اور ان کو فائدہ پہنچاتی ہیں تو فرد یا جماعت کے لئے احسان کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔خدا تعالیٰ کا ربّ ہونا اس کے حُسن کی علامت ہے اور خدا تعالیٰ کا اپنے ربّ ہونے کے لحاظ سے ہر کس و ناکس کی ربوبیّت کرنا اُس کے احسان کی علامت ہے گویا اللہ تعالیٰ کا ہر فرد بشر کی یا جماعت پیدا کر کے اُس کی ربوبیّت کے طور پر اس میں ایک انقلابِ عظیم بپا کرنا اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیّت کو ظاہر کرتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کی صفات میں حُسن بھی کامل اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں احسان کے کامل جلوے بھی نظر آتے ہیں اور یہی حال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بھی ہے۔آپؐ کی زندگی میں بھی حسن واحسان کے جلوے نظر آتے ہیں۔انسان ہونے کی جو حد ہے اُس میں ہم سب برابر ہیں لیکن

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسن واحسانِ باری میں یکتا اور انسانِ کامل ہیں اس لئے وہ منفرد ہیں۔

ہمیں یہ کہا گیا ہے کہ اس بات میں ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے لئے اُسوۂ حسنہ بنایا ہے۔ تم حسن واحسانِ باری تعالیٰ کے مظہر اتم تو نہیں بن سکتے لیکن تم اپنی استعداد اور طاقت کے مطابق مظہرِ حُسن اور احسانِ باری ضرور بن سکتے ہو۔ اس لئے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرتے ہوئے تمہیں بھی اپنے اندر اپنی زندگیوں میں اپنے معاملات میں اپنے تعلقات میں اپنے پیار میں اپنے غضب میں حسن واحسانِ باری کا اس رنگ میں مظہر بننے کی ضرورت ہے جس رنگ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں حسن واحسانِ باری کو ظاہر کیا۔ چنانچہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آپؐ صفاتِ باری کے مظہر اتم ہیں تو ہمیں کچھ مزید بھی بتانا پڑے گا۔ ورنہ تو یہ ایک فلسفہ بن جاتا ہے اور ہر آدمی اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس پر بڑے حسین رنگ میں روشنی ڈالی ہے۔

آپؑ فرماتے ہیں کہ سورۂ حمد میں اللہ تعالیٰ کی جن بنیادی صفات کا ذکر ہوا ہے وہ چار ہیں۔ ان کو اصل الاصول صفاتِ باری یا اُمّ الصفات سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات ان ہی چار صفات کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں تعلق رکھتی ہیں۔ اگر ہم یہ ثابت کر دیں کہ یہ خدا تعالیٰ کی اُمّ الصفات ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق (میں قرآن کریم کی زبان میں بات کر رہا ہوں) قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ صفات آپؐ کے اندر پائی جاتی تھیں۔ تو پھر ہمیں تاریخ دیکھنی پڑے گی۔ جس کو وقتی طور پر ہم ایک حد تک نظر انداز بھی کر سکتے ہیں اور کچھ مثالیں بھی دے سکتے ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ربّ العالمین کی صفت کامل طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی تھی اور رحمانیت کی کامل صفت آپؐ کے اندر پائی جاتی تھی اور اسی طرح رحیمیّت کی اور مالکیّت کی صفت بھی آپ کی ذات میں جلوہ گر تھی اور چونکہ یہ چاروں صفات اللہ تعالیٰ کی ساری صفات کی اصل یا اُمّ الصفات ہیں اس لئے ماننا پڑے گا کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود تمام صفاتِ باری تعالیٰ کا مظہرِ اتم ہے۔

یہ چار صفات جو سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بیان کی ہیں اور جن کے متعلق ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہ اصل الاصول اور اُمّ الصفات ہیں۔

قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (النور: ۳۶) اللہ تعالیٰ جو تمام صفاتِ حسنہ

کا مالک ہے۔اُس میں کوئی عیب یا نقص، کوئی اندھیرا یا ظلمت نہیں پائی جاتی۔تمام جہانوں کا حقیقی نور وہی ہے۔اِس حقیقت کو شاید بچوں کے لئے سمجھنا مشکل ہوگا اس لئے مَیں اسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الفاظ میں سمجھا دیتا ہوں۔آپؑ فرماتے ہیں:

''یہ سورج کی روشنی نہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کا نور ہے جو سورج کی چادر میں چُھپ کر یا لپٹ کر دنیا پر ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ چاند کا نور نہیں ہے جو اندھیری راتوں کو منوّر کرتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا نُور ہے۔ جو چاند کی چادر میں اپنے کو لپیٹتا اور اس مادی اور ابتلاء اور امتحان کی دنیا کو جگمگا دیتا ہے۔ یہ گلاب کی خوشبو نہیں ہے جو مشامِ جان کو معطر بنا دیتی ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کے لطف و کرم کا پرتو ہے جو انسان کو لذّت اور سرور بخشتا ہے اور گلاب کے پردے میں چھپ کر سامنے آتا ہے اور یہ بادل نہیں جو مینہ برساتے ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی رحمتیں ہیں جو بادل کی شکل اختیار کرتی ہیں اور مینہ برسانے لگ جاتی ہیں۔ خیر یہ ایک بڑا گہرا مسئلہ ہے جو لوگ اس کو سمجھتے ہیں وہ اس سے حظ اٹھا سکتے ہیں۔''

بہرحال خدا تعالیٰ کے متعلق قرآن کریم نے یہ اعلان کیا کہ وہ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہے۔ یہ گویا خدا کے حُسن کا اعلان ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے حسن کی خوبیاں جو کسی فرد یا گروہ کو عملاً فائدہ پہنچاتی ہیں۔ یہ وہی نور اور وہی حُسن کی صفات ہیں جو مختلف شکلوں میں انسان پر ظاہر ہوتی ہیں۔

پس جیسا کہ میں بتا رہا ہوں چار اُمّ الصفات جو سورۃ فاتحہ میں بیان ہوئی ہیں ان میں سے پہلی صفت ربوبیّت ہے، ربوبیت کا مطلب ہے پیدا کرنا اور کمال مطلوب تک پہنچانا۔ یہاں تاریخ کا قانون رائج ہے۔ بچہ پہلے ماں کے پیٹ میں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں نو ماہ تک اس کی پرورش کی جاتی ہے۔ پھر وہ اس دنیا میں آتا ہے اور سانس لیتا ہے۔بعض دفعہ سانس نہیں لیتا۔ بہرحال جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس وقت اس کے اندر کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ اس کو دودھ کی ضرورت ہے جو خود بخود اس کی ماں کی چھاتیوں میں اُتر آتا ہے مگر دنیا کی کون سی عورت ہے جو خدا تعالیٰ کے منشاء اور حکم کے بغیر اپنی چھاتیوں میں اپنے یا کسی اور کے بچہ کے لئے دودھ پیدا کر دے۔ اگر ماں اپنی مرضی سے اپنے بچّے کے لئے دودھ پیدا کرنے پر قادر ہوتی تو وہ اپنی عزیز اور پیاری سہیلی کے بچہ کے لئے جسے دودھ نہیں

مل رہا اس کے لئے دودھ پیدا کر دیتی مگر وہ نہیں پیدا کرتی اور نہ پیدا کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی مرضی سے دودھ پیدا نہیں کر سکتی۔ خدا کا منشاء ہو تو دودھ پیدا ہوتا ہے ورنہ دودھ پیدا نہیں ہوتا۔ بچہ کی پیدائش سے ربوبیّت شروع ہو جاتی ہے۔ چند دنوں کا بچہ پھر طفل بنتا ہے۔ پھر وہ طفل کی عمر سے نکل کر خادم کی عمر میں داخل ہوتا ہے۔ علم میں کمال حاصل کرتا ہے پھر وہ علمی کمال حاصل کر لیتا ہے تو عمل کے میدان میں آ جاتا ہے۔ ہر جگہ اور ہر قدم پر اسے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی ضرورت ہوتی ہے دراصل خدا تعالیٰ نے اپنی معرفت اور عرفان کے لئے انسان کو پیدا کیا ہے۔ تعبّدِ ابدی کے لئے پیدا کیا ہے۔ انسان کو اپنے دائرہ استعداد کے اندر خدا تعالیٰ کی صفات کا مظہر بننے کے لئے پیدا کیا ہے مظہرِ صفات باری بننے کے لئے پہلے سانس سے لے کر آخری سانس تک اُسے جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ ساری اس کے لئے مہیّا کر دی گئیں۔ انسان کو زندگی کی ضرورت تھی اُسے طاقتوں کو بحال رکھنے کے لئے اور اپنی ذہنی قوتوں سے صحیح اور بھرپور کام لینے کے لئے غذا کی ضرورت تھی۔ اس کو اخلاق کے اظہار کے لئے مادی ذرائع کی ضرورت تھی۔ اخلاق کا اظہار بھی مادی ذرائع کا محتاج ہے۔ یہ نہیں کہ آپ اپنے اخلاق کا اظہار سفر بغیر کسی مادی ذریعہ سے کر سکیں۔ مثلاً ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے مجھے کپڑے کی ضرورت ہے۔ آپ اس سے پیار کرتے ہیں اور اس کے لئے کپڑے کا انتظام کر دیتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس کپڑا ہی نہ ہو تو آپ کیا کریں گے۔ ایک شخص کو گندم کی ضرورت ہے ایک شخص کو اس بات کی ضرورت ہے جذباتی لحاظ سے کہ جو اس کو ملے وہ مسکراتے چہرے سے ملے۔ میں نے جماعت کو کہا تھا۔ اس جلسہ سے پہلے بھی اور یہاں بھی آ کر کہا کہ دُنیا تیوریاں چڑھا کر اور سُرخ آنکھیں نکال کر تمہاری طرف دیکھتی ہے۔ تم اس کی طرف مسکراتے چہروں سے دیکھو۔ چنانچہ مجھے بڑی خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ چھوٹے چھوٹے بچے ملاقاتوں کے دوران مسکراتے اور کھلے ہوئے چہروں کے ساتھ ملتے تھے۔ دنیا قطع نظر اس کے کہ غلط ہے یا صحیح وہ اپنا طریق اختیار کرتی ہے۔ ہمیں اس سے سروکار نہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ جس چیز کی انسان کو اس وقت ضرورت ہے وہ اس کو ملنی چاہیے اور عام طور پر انسان کو مسکراتے چہروں کی ضرورت ہے۔ اس لئے دوستوں کو ہر ایک سے مسکراتے چہرے کے ساتھ ملنا چاہیے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ضرورت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ مسکرانے والا چہرہ عطا نہ کرتا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ

زور زور سے تو نہیں ہنستے تھے البتہ ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔

غرض اللہ تعالیٰ ربّ ہونے کے لحاظ سے تمام عالمین کی اور اس عالمین کے ہر فرد کی ربوبیت کر رہا ہے اور ہر ایک کو کمال مطلوب تک پہنچا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان کئے کہ مثلاً جو درخت اُگیں عام قانون کے مطابق جب اُن کی پرورش کی جائے اور وہ بڑے ہوں تو ثمر آور ہوں۔ ہمارے اکثر زمیندار بھائی جو اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہیں وہ آخر کس کے بھروسے پر گندم کا بیج زمین میں ڈال آئے ہیں۔ اپنے اس ربِّ کریم کے بھروسے پر جس نے قرآن کریم میں فرمایا ہے۔ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (الواقعة :٦٥) کیا کھیتیاں تم اُگاتے ہو؟ نہیں! کھیتیوں کو تو میں اُگاتا ہوں اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی بناء پر تم نے خدا پر بھروسہ کیا کیونکہ وہ ربّ ہے۔ اب دیکھو گندم جس کو مالک نے زمین میں ڈال دیا اس کے متعلق ہمارے ربّ کریم نے کہا میں اس کی پرورش کر دوں گا اور ایک سے سات سو بنا دوں گا اور یہ اس لئے کہ اس کی ربوبیّت سارے عالمین میں کارفرما ہے۔ سورج، چاند اور ستاروں کے علاوہ بعض ایسے ستارے بھی ہیں جن کی روشنی ابھی تک زمین پر نہیں پہنچی۔ غرض یہ کائنات اور اس میں موجود کروڑوں کیڑے جو انسان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اُن کو پیدا کیا اور ان کی ربوبیّت کرتا چلا جا رہا ہے۔

احسان کی دوسری خوبی اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت میں مضمر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جاندار کو (صفتِ ربوبیّت میں جاندار یا غیر جاندار کا سوال نہیں ہے) درخت ہیں۔ پتھر ہیں، کائنات کے یہ ایسے ذرّے ہیں جن میں سے ایک کو اللہ تعالیٰ زمرّد بنا دیتا ہے۔ ایک کو لعل بنا دیتا ہے اور ایک کو سنگ مرمر بنا دیتا ہے اور کسی ذرّے کو حکم دیتا ہے کہ تو مٹی کا ذرہ اسی طرح بنا رہ لیکن تیری قیمت زیادہ ہے۔ اب اگر ساری دنیا میں زمیندار کو آپ پوچھیں کہ اگر اللہ کہے کہ اس کے کھیت کے ذرّوں کو ہیرے اور جواہرات بنا دیتے ہیں تو وہ کہے گا کہ اے میرے ربّ میں کھاؤں گا کیا؟ پس مٹی کے جو ذرّے، ہیرے اور جواہرات نہیں بنے اُن کی قیمت ہیرے اور جواہرات سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ انسان بحیثیت مجموعی اُن کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

پس ربوبیّت کے جلوے ہر مخلوق دیکھتی ہے۔ پتھر ہو یا مٹی یا درخت ہوں یا پانی ہو یا ہماری کھیتیاں ہوں، جانور ہوں، انسان ہو۔ سب ربوبیّت کے سائے تلے ہیں۔ رحمانیت فرمانِ خداوندی

ہر جاندار پر ہے اور ہر جاندار کو اس نے مناسبِ حال صورت اور سیرت بخشی ہے یعنی اس کو شکل بھی ایسی دی کہ جو کام اس سے وہ لینا چاہتا تھا وہ لے اور اس کو سیرت بھی ایسی بخشی وہ صفات الٰہی کا مظہر بنے۔ گویا اس کو جسمانی لحاظ سے ایسی ظاہری اور باطنی شکل عطا کی کہ وہ خدا کی صفات کے رنگوں میں رنگین ہو سکے۔ بکری سے کہا کہ ہم تجھے ایسا جسم دیتے ہیں کہ تو درخت کے پتے بھی کھا جایا کر اور بھیڑ جس کی بہت ساری قسمیں ہیں اُن سے کہا کہ تو درخت کے پتے نہ کھا بلکہ گھاس پھوس میں مُنہ مار اس میں سے تیرے لئے خوراک مل جائے گی۔ اُونٹ سے کہا کہ جہاں بکری کا مُنہ نہیں پہنچتا وہاں تک اپنی گردن لے جا اور وہاں سے پتّے کھا لے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اُن جانوروں کی جو مختلف اغذیہ بنائی ہیں جن کے گوشت کو ہمارے لئے حلال کیا۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں کیا۔ اس نے ایسا اس لئے کیا کہ دوسری جگہ فرمایا تھا کہ میں نے تمہارے لئے متوازن غذا بنائی ہے اگر صرف درختوں کے پتّے اور گھاس پھُوس کھانے سے گوشت بنتا ہوتا تو پھر بکری ہی ہوتی اونٹ اور گائے بیل نہ ہوتے تو گوشت کے لحاظ سے انسان کی غذاؤں میں فرق آ جاتا۔ اس لئے انسانی جسم کو متوازن غذا بہم پہنچانے کی خاطر مختلف جانور پیدا کئے جو مختلف قسم کا چارہ کھاتے ہیں اور مختلف تاثیر رکھتے ہیں لیکن اس کا سب سے زیادہ فائدہ انسان نے اُٹھایا کیونکہ اس کے لئے خدا نے بکری کو بھی قربان کر دیا اور بھیڑ کو بھی قربان کر دیا اس کے لئے اونٹ کو بھی قربان کر دیا اور بیل کو بھی قربان کر دیا حتیٰ کہ جتنے حلال جانور ہیں ان کو قربان کر دیا۔ تا کہ انسان کے جسم کو متوازن قسم کی پروٹین مل جائے۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے ہر چیز اُس کے جذبات پر اثر انداز ہوتی ہے یعنی انسان کا جو مطلوب ومقصود ہے وہ ہے اپنے اپنے دائرہ میں مظہرِ صفاتِ باری بننا۔ اب مظہرِ صفات باری بننے کے لئے (تفصیل میں جاؤں تو بات لمبی ہو جائے گی۔ آپ یہاں بھی سوچیں اور گھروں میں بھی جا کر سوچیں) مثلاً ٹانگیں عطا ہوئیں۔ مجھے اور آپ کو دوسری جگہ چل کر بھی جانا ہوتا ہے۔ کیونکہ بہت ساری صفات کے مظہر ہونے کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ چل کر جانا پڑتا ہے۔ استاد کو اپنے گھر سے اسکول جانا آنا پڑتا ہے اور اس کے لئے اس کے سکول پہنچنے کا انتظام ہونا چاہیے۔

غرض انسان نے صفاتِ باری کا مظہر بننا تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی کروڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً انسان کو آنکھیں دیں۔ اس کو کان دیئے اس کو آنکھیں اور کان اس لئے دیئے کیونکہ

اس نے دنیا کا معلم بھی بننا تھا اور اس طرح دوسرے حواس دیئے علم کی ابتداء حواس کے ذریعہ کی حواس سے حاصل ہونے والی معلومات کو علم کہتے ہیں آنکھوں نے جو دیکھا اور کانوں نے جو سنا۔ ایک ایسا علم ہے جس کا ذریعہ گویا ہمارے حواس ہوتے ہیں۔

جہاں تک آنکھ کا تعلق ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے سامنے ایک خاص شکل کا میدان ہے۔ اس کے پرلے سرے پر کچھ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں اور خلقت کا ایک ہجوم بیٹھا ہوا ہے مگر میری آنکھ اس پیار کو نہیں دیکھ سکتی جو میرے دل میں سے چشمہ کی طرح نکل کر آپ تک پہنچتا ہے اور نہ آپ کا وہ تعلق دیکھ سکتی ہے جو آپ کی طرف سے مجھے ملتا ہے۔ (نعرے) لیکن میرے کان اظہارِ مسرت کے ان کلمات کو سنتے ہیں جو اس مجمع میں کہے جاتے ہیں مگر میرے کانوں نے اس کے پیچھے محبت و پیار کا جو جلوہ تھا وہ نہیں سُنا۔ صرف ایک آواز سُنی ہے۔ علم حاصل کرنے کی ابتداء حواس کے ذریعہ ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے زبان دی ہے۔ ہم سوال کر سکتے ہیں اور اس کے ذریعہ علم کو بڑھا سکتے ہیں۔ سوال کرنا حصولِ علم کے لئے بڑا ضروری ہے اس لئے چھوٹے بچوں کو سوال کرنے دینا چاہیے۔ بعض دفعہ بچے اتنی کثرت سے سوال کرتے ہیں کہ استاد یا ماں باپ انہیں چپیڑ لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں چُپ کرو کیوں ہمارے کان کھاتے ہو۔ یہ طریق غلط ہے۔ اس طرح تو گویا تم حصولِ علم کا ایک دروازہ بند کر رہے ہو۔ بچّوں کو سوال کرنے دو اور صبر سے اُن کو جواب دو۔ تمہیں اللہ تعالیٰ نے کان دیئے ہیں اس کے سوال کو سُننے کے لئے اور انہیں زبان دی ہے سوال پوچھنے کے لئے۔

پس اللہ تعالیٰ نے جس قسم کا کام لینا تھا اس کے مطابق انسان بنا دیا۔ انسان اپنے جسم اور اپنی طاقت کے لحاظ سے ہر دوسری مخلوق سے زیادہ طاقتور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کو شریعت نہیں دینی تھی۔ اس لئے گھوڑے کو وہ جسم نہیں دیا۔ نہ عقل اور سمجھ دی اور نہ علم کے حصول کے ذرائع دیئے ہیں۔ یہ انسان کا خاصہ ہے۔ اُسے عقل شعور عطا کیا کیونکہ اس نے حاملِ شریعت بننا تھا۔ دراصل وہ فکر جو حواس سے حاصل شدہ علوم اکٹھا کرتی ہے اور نتیجہ نکالتی ہے وہ جانوروں کو نہیں دی گئی۔ البتہ وہ عقل بتائی جو تحریر کی لیبارٹری میں جا کر دیکھتی ہے کہ میرے فکر نے صحیح نتائج بھی نکالے ہیں یا نہیں۔ گدھے اور شیر کو یہ عقل نہیں دی۔ خدا نے اُن سے جو کام لینے تھے اس کے مطابق اُنہیں جسم دے دیا اور جو انسان سے کام لینے تھے ان کے مطابق انسان کو جسم دے دیا۔ یہ تمام جلوے جو مخلوقِ خدا بالخصوص

انسان کی ذات میں ظاہر ہوئے۔صفتِ رحمانیّت کے مظہر ہیں۔

پھر ان حواس کے بقاء کے لئے انسان کو صورت اور سیرت بخشی۔ وہ خود باقی نہیں رہ سکتا۔اس کو اس طرح نہیں بنایا کہ جس طرح ہم توپ کا گولہ پھینکتے ہیں اور وہ تباہی مچا دیتا ہے اس میں بھی ایک جان ہوتی ہے۔اس میں بھی ایک حرکت پیدا ہوتی ہے۔ وہ بھی زندگی کے مترادف ہے مگر توپ سے جو گولہ نکلا وہ جہاں گیا وہاں پھٹ گیا۔بس قصّہ ختم ہوا لیکن انسان نے تو ایک معینہ مدت تک باقی رہنا تھا۔ جب تک خدا تعالیٰ اسے زندہ رکھنا چاہے وہ زندہ رہتا ہے۔اس کی قوتوں کو اُٹھانے اور پیدا کرنے اور بڑھانے والے سامان پیدا ہونے چاہییں تھے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس کی بقاء کے لئے جن جن چیزوں کی اُسے ضرورت تھی وہ ان کے لئے مہیا فرمائیں گویا یہ اس کا احسان ہے اور صفتِ رحمانیّت کا مظہر ہے۔ پس صفتِ رحمانیت اُمّ الصفات اور اصل الاصول میں دوسرے نمبر پر ہے اور اس سے سب سے زیادہ فائدہ انسان اُٹھاتا ہے کیونکہ جانوروں کو بھی انسان کی خاطر قربان کر دیا جاتا ہے۔

احسان کی تیسری صفت رحیمیّت بھی ہے۔اس کا بھی محض انسان سے تعلق ہے صفت رحیمیّت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ انسان کی دُعا اور اس کی تضرّع اور اعمالِ صالحہ کو قبول فرماتا ہے یہ اس کی رحیمیّت ہے۔اس طرح وہ انسان کو آفات اور بلاؤں سے بچاتا ہے اور اس کی کوشش میں جو خامی اور نقص اور کمزوری رہ جائے اس کو دُور کر دیتا ہے۔اس کی کوشش کو ضائع ہونے سے بچالیتا ہے۔

سو ہمارا خدا بڑا رحیم خدا ہے۔آپ میں سے ہر ایک دوست سوچے۔ بہت سے زمیندار دوست بیٹھے ہیں۔ وہ سوچیں کہ انسان سے سُستی اور غفلتیں ہو جاتی ہیں۔کبھی نیند آ جاتی ہے اور اس عرصہ میں کھیتوں کا پانی ٹوٹ جاتا ہے۔ یا نہر کے پانی کی باری ہوتی ہے آدمی اُٹھ نہیں سکتا اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین کے کچھ حصہ کو سوکا آ جاتا ہے۔اسی طرح ہزاروں مواقع ایسے آتے ہیں جہاں انسان سے غفلتیں ہو جاتی ہیں۔تاہم ایک طرف انسان کی کوشش ہے۔ دوسری طرف اس کی کمزوری ہے یہ دونوں ساتھ ساتھ بلکہ متوازی چل رہی ہوتی ہیں۔ خدائے رحیم اپنی رحیمیّت کی صفت کے ماتحت انسانی کوششوں میں کمزوریوں کو دُور کرتا، انسان کی کوششوں کو ضائع ہونے سے بچاتا اور سچی کوشش اور محنت کا پھل دیتا ہے۔

احسان کی چوتھی صفت صفتِ مالکیت یوم الدین ہے۔صفت رحیمیت دُعا اور عبادت کے ذریعہ

کامیابی کا استحقاق پیدا کرتی ہے۔ جس طرح بی۔اے کا ایک نوجوان طالبعلم بڑی محنت کرتا ہے اور بڑے اچھے پرچے کرتا ہے۔ نتیجتاً وہ فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بظاہر وہ کامیاب تو ہو گیا لیکن اس معنی میں وہ کامیاب نہیں ہوا کہ اس کو نوکری بھی مل گئی۔ اس کو یہ کہہ دیا گیا کہ تم اس قابل ہو گئے ہو کہ جہاں ایک اچھے گریجوایٹ کو لگایا جاتا ہے۔ وہاں تمہیں بھی لگایا جا سکتا ہے اور بس لیکن دُنیا کی بادشاہتیں جس چیز کو نظر انداز کر دیتی ہیں ہمارا مالک خدا اپنی صفتِ مالکیت کے نتیجہ میں اس کا ثمرہ بھی عطا کرتا ہے۔

ہمارا ربّ انسان کو صرف یہی نہیں کہتا کہ اے میرے بندے تو میری رضا کی جنت کا مستحق ہو گیا۔ بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے اُدْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر:۳۱) آ اور میری جنت میں داخل ہو جا کیونکہ میں مالک ہوں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی وہ چار بنیادی صفات ہیں جن کو اُمّ الصفات اور اصل الاصول صفات کہا گیا ہے اور قرآن کریم کی سورۃ الحمد میں بیان ہوئی ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ ان اصل الاصول چار صفاتِ باری کی پہلی جلوہ گاہ انسان کامل کے دل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکی۔ ان صفات کی پہلی جلوہ گاہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دل ہے۔ آپؐ کے دل پر ان صفات کا جلوہ نازل ہوا۔ پس حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن کریم نے یہ اعلان کیا کہ آپؐ ان چار اُمّ الصفات کے مظہر اتم ہیں۔ مثلاً قرآن کریم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ربّ العالمین ہے۔ قرآن کریم نے یہ بھی کہا کہ محبوبِ خدا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ چنانچہ سورۃ انبیاء میں فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء:۱۰۸)۔ گویا صفتِ ربوبیت کے مظہر اتم ہونے کا جلوہ رحمۃ للعالمین کی شکل میں ظاہر ہوا۔ آپؐ سے پہلے جتنے انبیاء گذرے ہیں وہ رحمت تو تھے لیکن رحمۃ للعالمین نہیں تھے۔ ربُوبیّت کے مظہر تو تھے لیکن ربوبیت کاملہ کے مظہر نہیں تھے۔ حضرت موسیٰ آئے تو اُنہوں نے فرمایا کہ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح اور ترقی میرے مدّنظر ہے۔ مجھے کسی اور قوم سے کیا غرض؟ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کے لئے رحمت تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن عالمین کے لئے رحمت نہیں تھے۔ خدا تعالیٰ کی ربوبیّت کے مظہر تو تھے لیکن ربّ العالمین کی صفت کے مظہر نہیں تھے۔ ربّ العالمین کی ربوبیتِ کاملہ کا کامل مظہر وہ دل تھا جس پر ربّ العالمین کا جلوہ نازل ہوا

اور اس نے اس پاک وجود کو رحمۃ للعالمین بنادیا۔ آپؐ کا دِل بنی نوعِ انسان کے لئے گداز ہوا۔ آپؐ کا سارا ماحول عرب تھا لیکن آپ کا دل ہے کہ رحمۃ للعالمین کی موجوں سے لبریز تھا۔ آپؐ نے جزیرہ نمائے عرب سے یہ اعلان کیا کہ کالے اور سفید میں کوئی فرق نہیں۔ سرخ اور سفید میں کوئی فرق نہیں۔ عرب اور عجم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ جذبہ اور یہ انسانی قدر و منزلت رحمۃ للعالمین کا نتیجہ ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام (جو اپنی اپنی قوموں اور زمانوں کے لئے رحمت تھے) ان کا نہ یہ جذبہ ہے اور نہ اُن کے بس کی یہ بات ہے۔ پس خدا نے فرمایا۔ میں ربّ العالمین ہوں اور خدا نے فرمایا کہ میرا محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات کو لیں تو وہ ساری دنیا پر محیط ہیں۔ آپ کی ہدایت اور تبلیغ کو سامنے رکھیں تو وہ ساری دنیا پر ممتد ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو قیامت تک کے لئے فیض رسانی کا ذریعہ بنا دیا۔ یہ چیز تھی جو آپؐ لائے۔ آپؐ ساری دنیا کے لئے نبی اور آپؐ سارے زمانوں کے لئے ہیں۔ نہ پہلے انبیاء کی مکانی وسعت ساری دنیا تھی اور زمانی وسعت قیامت تک کا زمانہ تھا۔ رحمانیت کو لیں۔ یعنی بغیر اجر دینے والا تو اس میں بھی آپ کی ذات اُسوہ کا رنگ رکھتی ہے۔ رحمانیت کے جلوے مجاہدہ کے محتاج نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے فائدہ کے لئے سورج بنایا۔ ہم نے کب سورج کی روشنی سے فائدہ اٹھانے کی خاطر کوئی مجاہدہ کیا تھا۔ یا کوئی نمازیں پڑھی تھیں۔ یا کوئی قربانیاں دیں تھیں۔ یا کوئی خدمتِ خلق کی تھی۔ ہماری پیدائش سے ہی نہیں بلکہ آدمؑ کی پیدائش سے بھی پہلے اس کارخانۂ عالم کی ہر چیز کو انسان کی خدمت پر لگا دیا۔ اسی طرح بے شمار چیزیں صفتِ رحمانیّت کی مظہر ہیں۔ اس کے لئے انسان کو کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ صفت خود بخود جوش میں آتی ہے اور جانداروں کے لئے وہ کسی عمل کے بغیر نعماء اور فیوض کے چشمے جاری کر دیتا ہے۔ پس خدا کی دوسری بنیادی صفت رحمانیت ہے۔ یعنی بغیر کسی عمل کے فیض پہنچانا اور نفع پہنچانا اور نعمتوں سے مالا مال کر دینا۔ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صفاتِ باری کے مظہر اتم ہیں اس لئے آپؐ نے اپنی صفت رحمۃ للعالمین کی رُو سے سب اقوام اور قیامت تک کی نسلوں سے کہا مَآ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ (الفرقان:۵۸) میں تمہارے پاس جو ہدایت لایا ہوں اس پر میں تم سے کسی اجر کا مطالبہ نہیں کرتا۔ میں تمہارے کسی عمل کے نتیجہ میں تمہیں یہ کامل شریعت نہیں دینا چاہتا بلکہ اس خداداد محبت کے نتیجہ میں دینا چاہتا ہوں جو

میرے دل میں تمہارے لئے موجزن ہے۔ پس اس سے ظاہر ہوا کہ آپ کے فیوض و برکات کا کوئی بدل اور اجر نہیں ہے اور آپ رحمانیت کے بھی مظہرِ اتم ہیں۔

خدا کی تیسری صفت صفتِ رحیمیت ہے۔ آپؐ صفتِ رحیمیّت کے بھی مظہر اتم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا کَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (الاحزاب:۴۴) یعنی مومنین کے لئے آپ کی ذات بحیثیت رحیم کے ہے۔ مال کو ضائع ہونے سے بچانا۔ نیکیوں کا اجر دینا، یہ صفتِ رحیمیّت باری تعالیٰ میں اصل ہے۔ اس کے مقابلہ میں فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی تمام بنی نوع انسان کے لئے رحیم ہیں۔ جو شخص خدا کی آواز پر لبیک کہتا ہوا (خواہ وہ کسی زمانے یا کسی ملک یا کسی قوم کا فرد ہو) حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں آجائے گا اور آپ کی اتباع کرے گا اور آپ کی ہدایت اور شریعت کا جؤا اپنی گردن پر رکھے گا۔ اس کا عمل ضائع نہیں ہوگا۔ اس کا اُسے ثمرہ مل جائے گا۔ یا کم از کم اس کے ثمرہ کا استحقاق ضرور پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

> ’’آپؐ کے صحابہ نے جو محنتیں اسلام کے لئے کیں اور ان خدمات میں جو تکالیف اٹھائیں وہ ضائع نہیں ہوئیں۔ بلکہ اُن کا اجر دیا گیا۔‘‘ (الحکم ۱۰؍اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰)

گویا آپؐ کی دعاؤں کے نتیجہ میں اور آپؐ کی قوتِ قدسیہ کے ذریعہ ثمرہ کا استحقاق پیدا ہو جائے گا۔ خدا تعالیٰ کی چوتھی صفت مالکِ یوم الدین ہے اور یہ بھی اُمّ الصفات میں سے ہے۔ اس کے متعلق بھی قرآن کریم نے دعویٰ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مالکیتِ یوم الدین کے کامل اور اتم مظہر ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کی کئی آیات میں اس کا ذکر ہے۔ اس وقت میں ایک آیت پڑھوں گا۔ قرآن کریم نے کہا۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (الفتح:۲) اور اس فتحِ مبین اور فتح عظیم کی ایک بڑی زبردست تجلی فتح مکہ کے موقع پر ظاہر ہوئی۔ اس دن ایک مالک اور قادر کی حیثیت سے (اللہ تعالیٰ کے مظہر ہونے کی حیثیت سے اس میں کوئی شک نہیں) آپ مکہ میں فاتحانہ طور پر داخل ہوئے۔ عدل کرنے کے لئے بلکہ مالکیت کا جلوہ دکھانے کے لئے مکّہ کی سرزمین میں قدم رکھا۔ وہ لوگ جنہوں نے مکّی زندگی کے تیرہ سال آپؐ کو اور آپ کے متبعین کو انتہائی تکالیف اور دُکھ پہنچائے تھے اُن سے کہا بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟ اُنہوں نے کہا ہم آپ سے اسی سلوک کی توقع رکھتے ہیں جو

یوسف نے اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ اس وقت تک اہلِ مکہ یہ سمجھ چکے تھے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کی صفت مالکیت کے بھی مظہرِ اتم ہیں۔ چنانچہ اس فتح عظیم کے دن جب کہ اہلِ مکّہ کی قسمتوں کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ جاؤ تمہیں معاف کیا اور معاف بھی کیا تو اس رنگ میں کیا کہ کہا میں تمہارے پاس نہیں ٹھہرتا کیونکہ اس سے میری اس صفت میں فرق آتا ہے۔ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کی جائیدادیں آپؐ کے وہ مکانات اور حویلیاں جو مکہ اور اس کے گرد و نواح میں چھوڑی تھیں وہ آپؐ نے واپس نہیں لیں۔ آپؐ نے فرمایا میں خدا کا پیغام لے کر تمہاری طرف آیا تھا۔ تم نے مجھے قبول نہیں کیا اور تم نے ہماری جائیدادوں پر قبضہ کر لیا اور ہمیں مکہ سے باہر نکال دیا۔ اب میں خدا کی صفتِ مالکیّت کا مظہر اتم ہونے کی حیثیت میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ یہ جائیدادیں یہ مال و متاع یہ کوٹھیاں یہ حویلیاں سب تمہیں دیتا ہوں۔ یعنی مالک ہونے کے لحاظ سے یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ کسی چیز کا بھی تم سے بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ جاؤ خدا کی فوج میں داخل ہو جاؤ اور خدا کی نعمتوں پر شکر بجالاؤ۔

پس قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاروں اُمّ الصفات کے کامل اور اتم طور پر مظہر ہیں۔ یہ چاروں صفات وہ ہیں جس کا بیان ہمیں سورۃ فاتحہ میں نظر آتا ہے۔ ایک حدیث بھی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے لوائے حمد عطا کیا گیا ہے اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ آپؐ نے صفاتِ باری کے مظہر اتم تھے جو بنیادی طور پر سورہ حمد میں پائی جاتی ہیں۔ اُن کا آپ کو جھنڈا عطا کیا گیا ہے۔

میں نے وقت کی مناسبت سے چھوٹی چھوٹی مثالیں دی ہیں۔ قرآن کریم نے سورۂ حمد میں اللہ تعالیٰ کی چار بنیادی صفات بیان کی ہیں۔ جنہیں اُمّ الصفات یا اصل الاصول کہہ سکتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میری صفات کے مظہرِ اتم ہیں۔ تمہیں ہر صفت کے متعلق تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری بنیادی صفات ہیں اُن کے آپؐ مظہرِ اتم ہیں۔ تم دیکھ لو۔ آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔ آپؐ کی زندگی میں رحمانیّت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ آپ کی زندگی میں رحیمیّت اور مالکیت کے جلوے کامل طور پر نظر آتے ہیں ایسے جلوے نہ کسی نے پہلے دکھائے اور نہ کوئی آئندہ دکھا سکتا ہے۔ کیونکہ نہ پہلوں کو وہ استعداد ملی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی اور نہ بعد میں آنے والوں کو مل سکتی ہے۔

یہ نکتہ اور یہ مسئلہ بڑا اہم ہے کہ گو حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان صفات کا مظہرِ اتم بنایا گیا مگر خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بُت بنالو اور ان کی پوجا کرنے لگو۔ بلکہ خدا نے یہ فرمایا کہ میرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے اتنے قریب آ گیا ہے کہ کوئی طاقت اُتنی قریب نہیں آ سکتی یہ صرف صرف میرے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حاصل ہوا ہے اس نے انسانی طاقتوں کے لحاظ سے جتنا قرب حاصل کیا جا سکتا تھا اُس نے اتنا قرب حاصل کر لیا ہے۔ اس لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے اُسوۂ حسنہ ہیں۔ ہم بھی اپنی اپنی طاقت کے مطابق قُربِ الٰہی حاصل کر سکتے ہیں۔

غرض پہلی بات یہ تھی کہ اپنی قوتوں کی نشوونما کو کمال تک پہنچاؤ۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو مدّنظر رکھو۔

دوسرے یہ کہ انسان کو تمام قوتیں اور طاقتیں صفاتِ باری تعالیٰ کا مظہر بننے کے لئے دی گئی ہیں۔

تیسرے یہ کہ انسان کے صفاتِ باری کا مظہر بننے کی علامت یہ ہے کہ اس کے وجود میں بھی حسن و احسان کے جلوے نظر آنے لگیں۔ کیونکہ خود صفاتِ باری میں بھی ایک جلوہ حُسن کا اور دوسرا احسان کا نظر آتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظہر اتم یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی ایک جلوہ حسن کا اور دوسرا احسان کا نظر آتا ہے۔ جس طرح خدا نور ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نُور کہا گیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم صفاتِ باری کے مظہرِ اتم ہونے کے لحاظ سے اور لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ (موضوعات کبیر حرف اللام) کے بلند ترین شرف سے مشرف ہونے کی وجہ سے اس سارے جہان کا نور ہیں۔ آپؐ خالق اور مخلوق کے درمیان ایک ذریعہ بن گئے ہیں۔

اُسوۂ نبوی کا تیسرا بنیادی نکتہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات اور اُن کے مظہرِ اتم کی صفات کے جلوؤں میں ایک پہلو حُسن کا ہے اور دوسرا احسان کا ہے۔ اس لئے تمہارے اندر بھی اپنے اپنے دائرۂ استعداد کے لحاظ سے حُسن و احسان کے جلوے ظاہر ہونے چاہئیں اور اس غرض سے جماعت احمدیہ کو قائم کیا گیا ہے۔

قرآن کریم نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع اور فرمانبرداری کا حکم دیا ہے اور ہم سے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اٰلِ عمران: ۳۲) کی رُو سے وعدہ کیا گیا ہے

کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے جو اُسوۂ حسنہ رکھا ہے اپنے دائرہ استعداد میں اس کی پیروی کرتے ہوئے اپنے اندر صفاتِ باری کے مظہر بنیں گے اور دُنیا کو حسن واحسان کے جلوے دکھائیں گے تو ہم اللہ تعالیٰ کی محبت کو حاصل کر لیں گے۔

چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:۔

''(آپؐ کے نقشِ قدم پر چلنا انسان کو خدا کا محبوب بنا دیتا ہے)۔ جب ایک انسان سچے دل سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہے اور آپؐ کی تمام عظمت اور بزرگی کو مان کر پورے صدق وصفا اور محبت اور اطاعت سے آپؐ کی پیروی کرتا ہے یہاں تک کہ کامل اطاعت کی وجہ فنا کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ تب اس تعلق شدید کی وجہ سے جو آپؐ کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ وہ الٰہی نور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اُترتا ہے۔ اس سے یہ شخص بھی حصہ لیتا ہے............ اور اس کے ہر ایک عضو میں سے محبتِ الٰہی کا نور چمک اُٹھتا ہے تب اندرونی ظلمت بکلی دور ہو جاتی ہے۔ علمی رنگ سے بھی اس میں نور پیدا ہو جاتا ہے اور عملی رنگ سے بھی نور پیدا ہو جاتا ہے۔'' (روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۶۸۱)

پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

''جماعت احمدیہ میں داخل ہونے والوں کا پہلا فرض یہی ہے کہ یہ چاروں صفتیں اپنے اندر بھی قائم کرے کیونکہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کا یہی تقاضا ہے کیونکہ خدا کی ربوبیت یعنی نوعِ انسان اور نیز غیر انسان کا مربی بننا اور ادنیٰ سے ادنیٰ جانور کو بھی اپنی مربیانہ سیرت سے بہرہ نہ رکھنا ایک ایسا امر ہے کہ اللہ کی سچی عبادت کرنے والا کمالِ محبت سے اس الٰہی سیرت کا پرستار بن جاتا ہے اور خود بھی اس صفت اور سیرت کو اپنے اندر پیدا کرتا ہے تا اپنے محب کے رنگ میں آ جائے۔''

گویا اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا مظہر بننے کا جو حکم دیا اس کو یاد دلاتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام ہم سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم اپنے اندر صفت ربوبیت پیدا کریں اور اس کے نتیجہ میں انسان اور غیر انسان کے مربی بننے کی کوشش کریں۔ یعنی انسان تو کیا جانوروں کو بھی اپنی مربیانہ صفت سے بے بہرہ نہ رکھیں۔ ہمارے جماعتی پروگرام اسی نکتہ کو مدّنظر رکھتے ہوئے بنائے جاتے ہیں۔ دنیا دیکھتی

ہے اور بڑی حیران بھی ہوتی ہے کہ ہمیں اس ملک میں اپنے آرام اور سُکھ بھی عام لوگوں جتنے نصیب نہیں ہیں ہم ایک غریب قوم ہیں مگر خدا تعالیٰ کی رضا کو ہر حال میں دنیوی مرضیات پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارا زمیندار اگر ہفتہ میں ایک دفعہ مزیدار سالن کے ساتھ روٹی کھا سکتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں وہ بھی نہیں کھاتا میں اس لذّت کو کھوتا ہوں آخر وہ کیا چیز ہے جو اس جذبہ کے پیچھے کام کر رہی ہے۔ دنیا حیران ہے بعض دفعہ وہ ہمیں بیوقوف بھی سمجھتی ہے۔ کیونکہ وہ خدا اور اُس کے حُسن سے بے بہرہ ہے اور یہ امر ہمارے لئے غم اور افسوس کا باعث ہے کہ لوگ خدا کی صفات سے کیوں غافل ہیں۔

پس ہمارے پروگرام بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے ہیں اور ہمیں اس کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ بعض جاہل اور کم علم لوگ مجھے بھی لکھ دیتے ہیں کہ اپنے ملک میں تو کچھ نہیں کرتے اور غیر ملکوں میں توجہ دیتے ہیں۔ ہم تو پیدا ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ غیروں کی خدمت کریں۔ اگر غیروں سے تمہاری مراد باہر کے ممالک ہیں تو وہ بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔ ہمیں پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ ہر وہ جگہ جس میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیّت کے جلوے نظر آتے ہیں وہاں ہم پہنچیں اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیّت کے جلوؤں کے ساتھ اپنی استعداد کے مطابق اپنی ربوبیت کے تھوڑے بہت جلوے بھی شامل کر دیں۔

پھر خدا تعالیٰ چونکہ بڑا مہربان ہے وہ کہتا ہے میرے بندوں نے سب کچھ کیا ہے حالانکہ کیا اُس نے خود ہوتا ہے لیکن وہ اپنی رحمت سے ہمارے لئے برکتوں کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ میں نے کل آپ کو بتایا تھا پندرہ مہینے میں طبّی مراکز اور سکولوں کی آمد پنتالیس لاکھ روپے تک پہنچ گئی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلك۔ پھر اسی آمد میں سے ہم نے خرچ کیا گو ابتدائی خرچ تو اُس پیسے میں سے ہوا تھا جو جماعت نے نصرت جہاں ریزروفنڈ میں دیا تھا لیکن بعد میں اصل سرمایہ واپس آ گیا اور آمد میں سے خرچ کیا گیا۔ دنیا کہتی ہے جماعت احمدیہ نے خرچ کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل کا نتیجہ ہے۔ ایک ملک کے ہائی کمشنر (مصلحتاً میں مُلک کا نام نہیں لوں گا) نے کہا جس رنگ میں جماعت احمدیہ کام کر رہی ہے ہم نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ اگلے آٹھ سال میں ہمارے ملک کی ۸۰ فیصد آبادی احمدی ہو چکی ہو گی اور اس نے یہ بھی کہا کہ میں نے تو اپنے بیٹے کو کہہ دیا کہ ابھی سے احمدیت میں داخل ہو جاؤ آٹھ سال کے بعد احمدی ہوئے تو کوئی مزہ نہیں ہو گا۔ ایک پاکستانی دوست

نائیجیریا میں تھے۔ وہاں سے اُن کا کسی اور ملک میں تبادلہ ہوا تو وہ ایک احمدی دوست سے کہنے لگے کہ خاموشی کے ساتھ مگر نہایت تندہی کے ساتھ جماعت احمدیہ نائیجیریا میں تبلیغ اسلام کا کام کر رہی ہے۔ اب دیکھو وہ خود احمدی نہیں ہے لیکن اس کا تاثر یہ تھا کہ جماعت احمدیہ ترقی کر رہی ہے۔ تاہم جماعت احمدیہ نہ تو خاموشی سے کام کر رہی ہے اور نہ دنیا کی واہ واہ اس کے مدّنظر ہے۔ ہم نے لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا (الدھر:۱۰) کی رُو سے دُنیا سے یہ نہیں کہنا کہ وہ ہمارا شکر ادا کرے۔

پس یہ ہے ہمارا علم اور یہ ہے ہمارا لائحہ عمل۔ ہم دنیا سے نہ شکر گذاری کے متمنّی ہیں اور نہ کسی سے کوئی بدلہ مانگتے ہیں۔ ہم تو خدا تعالیٰ کے بندے بن کر بنی نوعِ انسان کی خدمت کے لئے میدانِ جہاد میں برسر پیکار ہیں۔ خدا نے فرمایا کہ میں جنّ و اِنس اور انسان اور غیر انسان کا ربّ ہوں۔ ہم اپنے ملک سے باہر نکلے اور ہم نے کہا کہ اپنے ربّ کی اس صفت کا صحیح مظاہرہ تبھی ہوسکتا ہے کہ جب ہم دنیا کے کونے کونے میں پہنچ کر اپنے ربّ سے کہیں کہ ہمیں جتنی طاقت ہے اتنے ہم پھیلے اور تیری ربوبیت کے جلوؤں میں اپنی حقیر سی کوشش ہم نے بھی شامل کر دی۔ اے خدا تو اپنے فضل سے ہماری حقیر کوششوں کو قبول فرما اور ان کے بہترین نتائج پیدا کر۔

پس یہ ہے ہمارا پروگرام اور یہ ہے ہماری کوششوں کا منتہائے مقصود۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں رحمان ہوں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم سے کسی چیز کا اجر نہیں مانگتا یہ رحمانیت کے معنی اور مفہوم کا بنیادی تصور ہے۔ یعنی بغیر کسی عوض کے خدمت کرنا اور مخلوقِ خدا پر رحم کرنا۔ جو شخص خدا تعالیٰ کا سچا عاشق ہے اور اس کے جلوؤں کو دیکھتا ہے اور اس کی صفات کی معرفت رکھتا ہے اور اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اس صفت سے متّصف ہو اور بنی نوع انسان کی خدمت بغیر کسی اجر کے کرتا رہے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

گالیاں سن کر دُعا دو

اب گالی دینا کوئی خدمت تو نہیں جس کے بدلے میں کسی کو دُعا دی جائے کہ گویا کسی کی خدمت کا بدلہ اُتارا جا رہا ہے۔ بلکہ وہ تو خدمت کی ایک بھیانک شکل میں نفی ہے مگر گندہ دہانی کرنے والا شخص جس کی گندہ دہانی اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی ہو وہ بھی یہ یاد رکھے کہ وہ ہمارے احسان سے بچ نہیں سکتا۔ وہ اپنی محفلوں کو ہمیں گالیاں دے کر سجاتا ہے۔ ہم اپنی راتوں کو ان

کے لئے دعائیں کر کے منور رکھتے ہیں۔

ہمارا خدا رحمان ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کی صفتِ رحمانیّت کے مظہر کے طور پر اس کے جلوؤں میں اپنی طرف سے تھوڑی سی چاشنی ملا دیں۔ تا کہ اس کی رحمتوں کے ہم بھی وارث بن جائیں۔ یہ ضروری ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جو باتیں بیان فرمائی ہیں۔ خصوصاً اس ضمن میں وہ بڑی ضروری ہیں۔ کئی لوگ ایسے موقع پر غصّے میں آ جاتے ہیں۔ ویسے تو یہ انسانی فطرت ہے۔ غصہ میں آنا نہ بُرا ہے اور نہ قابلِ اعتراض ہے۔ تاہم غصّے کو نہ دبانا یہ بُری بات ہے۔

میں نے بتایا تھا کہ ایبٹ آباد میں ہمارے مکان بن رہے تھے۔ بعض لوگوں نے ان کو آگ لگا دی جس سے بیس پچیس ہزار روپے کا نقصان ہو گیا۔ ہمارے بعض احمدیوں نے بڑے غصّے کا اظہار کیا۔ میں نے اُن سے کہا تم بڑے عجیب لوگ ہو۔ تم یہ بنیادی بات بھول جاتے ہو کہ جماعت احمدیہ کو اللہ تعالیٰ نے اتنا بلند مقام عطا فرمایا ہے اور اس کے اندر اتنی طاقت اور وسعت پیدا کر دی ہے کہ یہ بیس پچیس ہزار روپے کی رقم اس کے لئے ایسی ہے جیسے ایک مضبوط جسم پر ایک مکھی آ کر بیٹھ جائے۔ کیا وہ مضبوط جسم اس مکھی کے بوجھ تلے دب جایا کرتا ہے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! ہم ان کی ان حرکتوں کے نتیجہ میں ان کے دشمن نہیں بنتے۔ بلکہ ہمارے دل میں اُن کے لئے رحم کی موجیں اور زیادہ شدّت اختیار کر جاتی ہیں کہ قرآن کریم ایک حسین تعلیم تھی یہ اس سے غفلت برتنے والے ہیں اور اس کے کمالات سے بے خبر ہیں۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ کوئی شخص اگر تم پر احسان نہ بھی کرے تب بھی تم اس پر احسان کرو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ہم احسان کرتے ہیں وہ ہمیں مٹانے کے درپے ہیں۔ ہم ان سے جزا اور شکر کا مطالبہ نہیں کرتے مگر وہ ہمیں مٹانے کے درپے ہیں۔ وہ قرآن کریم کی تعلیم کو بھول جاتے ہیں۔ ہم ان کے لئے دعائیں کر رہے ہیں اور وہ ہمیں گالیاں دے رہے ہیں اور نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔

قرآن کریم نے ایک جگہ کہا ہے کہ یہ لوگ استہزاء کر رہے ہیں اور اے رسول! تو ان کی ان حرکتوں پر تعجب کر رہا ہے۔ خدا نے ان کے لئے ایک عزّت کا سامان آسمان سے بھیجا۔ اور وہ اپنی عزّت اور شرف کے سامان کو پہچانتے ہی نہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفت رحیمیت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو بھی بطور مظہرِ اتم کے دنیا پر ظاہر فرمایا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی نصیحت فرمائی ہے کہ اپنے اپنے

دائرۂ استعداد میں کمال کو پہنچانی چاہیے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جوٹھیک کام کرنے والے ہیں ان کے کام کی تکمیل میں اُن کی مدد کرنا ضروری ہے۔

صفتِ رحمانیت کے زیادہ ظاہری جلوے وہاں عیاں ہوں گے جہاں یہ جلوہ ظاہر ہورہا ہے۔اس کا جماعت سے تعلق نہیں اور رحیمیّت کا جلوہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (المائدۃ:۳) کے ماتحت ظہور پذیر ہوگا۔کوشش کرو کہ جو نیک کوشش میں مصروف ہے وہ اپنے مطلوب کو حاصل کرلے۔یعنی اپنی زبان میں احمدیت کی زبان میں یا اسلام کی زبان میں بات کریں تو کوشش کرو کہ تمہاری نوجوان نسل جو اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ ساری دنیا میں اسلام کو غالب کرے ان کی تربیت درست ہو اور وہ جو کوشش کررہے ہیں اس میں تم ان کے مددگار بنو اور ان کا ہاتھ بٹاؤ۔ان کے ساتھ چلو۔ان کی رہنمائی کرو اور ان سے پیار کرو اور ایسا پیار کہ اس دُنیا میں اس سے زیادہ پیار انہیں کہیں نظر نہ آئے۔وہ سمجھ جائیں اور یہ حقیقت پہچان جائیں کہ وہ کس غرض کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔یاد رکھو اپنے مطلوب کو حاصل کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔اپنی کوشش اور اپنے بھائی کی مدد اور اس کا ساتھ دینا۔اس طرح کرنے سے ہم صفتِ رحیمیّت کے مظہر بن جائیں گے اور جماعت کو ایک بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح بنادیں گے۔اس لئے نہیں کہ اس سے میں نے یا آپ نے کوئی ذاتی فائدہ اُٹھانا ہے بلکہ اس لئے کہ ہم میں سے ہر ایک شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرے اور وہ اس عظیم ہستی کی عظیم فوج کا ایک سپاہی بن جائے۔جس کے ذریعہ سے دنیا کے گھر گھر میں اللہ تعالیٰ کے نور کے چراغ روشن ہوئے ہیں اور جن مکانوں کے اُوپر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لوائے حمد لہرایا جاتا ہے۔

پھر جماعت کو مالکیت یوم الدین کا بھی مظہر بننا ہے۔ہم اس کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ساری جماعت مل کر کوشش کرتی ہے۔اسے ہر وقت سامنے رکھنا چاہیے۔کوئی فیصلہ نفس کے جوش سے نہیں کرنا چاہیے ہر فیصلہ اللہ تعالیٰ کی منشاء اور اسلامی تعلیم کے مطابق ہونا چاہیے اور اس فیصلہ سے قضائی فیصلہ مراد نہیں ہے۔اس فیصلہ سے ثالثی فیصلہ مراد نہیں ہے۔بلکہ ہر کام کے کرنے سے پہلے جو فیصلہ کیا جاتا ہے وہ فیصلہ مراد ہے۔صبح سے لے کر شام تک آپ کا جو وقت گذرتا ہے۔اس میں آپ اس قسم کے سینکڑوں فیصلے کرتے ہیں۔مثلاً آپ نے بچوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ان میں سے ہر ایک سے بوجہ طبیعتوں کے اختلاف کے علیحدہ علیحدہ سلوک کرنا ہے۔آپ نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اگر مثلاً

کسی کی بیوی غفلت کر جائے تو غصہ میں نہیں آنا۔ پچھلے دنوں مجھے بڑا دُکھ پہنچا جماعت کے ایک کارکن کی بیوی آپا مریم صدیقہ اور منصورہ بیگم کے پاس آئی اور بتایا کہ اُس کے خاوند نے اسے اتنی بے رحمی سے مارا ہے کہ اس کا سارا جسم نیلا ہوا ہوا ہے۔ تم خدا کی طرف اور اس کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور اس کے محبوب مہدی کی طرف منسوب ہوتے ہو۔ تمہارے کان میں تو یہ آواز پڑ رہی ہے کہ مالکیت یوم الدین کی صفت کے مظہر ہو لیکن اپنے نفس کے جوش سے ظلم اور وحشت کا مظاہرہ کرتے ہو۔ احباب جماعت ایسے لوگوں کے لئے دُعا بھی کریں۔

پس مالکیّتِ یوم الدین کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ نفس کے سارے جوش ٹھنڈے ہو جائیں۔ سوچو اور غور کرو۔ بعض دفعہ جوش آ بھی جاتا ہے۔ اس قسم کی کیفیت فطرتی لازمہ ہے۔ مثلاً کہیں جلسہ ہو رہا ہے۔ وہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو گالیاں دی جا رہی ہیں۔ ایک وقت میں غیر ملکوں میں اسلام کے خلاف سخت گندے اعتراض کر دیئے جاتے تھے۔ دنیا کے ایک حصّے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی گئی اور گندہ اعتراض کیا گیا اور دنیا کے دوسرے حصہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب مہدی معہود علیہ السلام کو گالیاں دی گئیں اور گندے اعتراضات کر دیئے گئے۔ جہاں بھی یہ اعتراض ہو وہاں ہمارے نفس جوش میں نہیں آنے چاہئیں۔ خدا تعالیٰ کے ایک بندے کی روح میں وہ ردّ عمل پیدا ہونا چاہیے کہ خود خدا کہے کہ میرا بندہ میرا محبوب ہے یہ غلط قدم نہیں اٹھاتا۔ گالیوں میں گالیاں ملا کر گند اور عفونت کی آواز کو ہم نے بلند نہیں کرنا بلکہ گالیوں کے گندے شعلوں کو اپنے آنسوؤں اور دعاؤں سے بجھانے کی کوشش کرنی ہے۔ اس کے لئے ہم پیدا کئے گئے ہیں۔ یہی ہماری زندگی ہے۔ یہی ہماری روح ہے اور یہی ہمارا شعار ہے۔ اس کے بغیر تو کوئی زندگی نہیں ہے۔ اگر ہم نے قرآنِ کریم کو چھوڑ دینا ہے۔ اگر ہم نے اس سے کوئی پیار نہیں کرنا۔ اگر ہمارے دل میں مہدی معہود کے لئے کوئی پیار نہیں تو کیا کرنا ہے زندہ رہ کر۔ اگر خدا سے دور ہی رہنا ہے تو پھر زندگی کا کوئی مزہ نہیں ہے۔ مزہ تو اس میں ہے کہ خدا کہے کہ تکلیفیں برداشت کرو۔ ہم ان تکلیفوں کو برداشت کریں اور ہمیں پتہ یہ لگے کہ ان میں خدا نے ہمارے لئے سرور پیدا کر دیا ہے۔ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے کسی نے سوال کیا کہ جن لوگوں کو آپ خدا کے پیارے اور محبوب کہتے ہیں اُن پر دُکھ کیوں آتے ہیں ان پر ابتلاء کیوں نازل ہوتے ہیں۔ آپ چونکہ خود صاحب تجربہ تھے

آپ نے مسکرا کر دیکھا اور فرمایا تم ان سے جا کر پوچھو ان ابتلاؤں اور امتحانوں کو (جو دشمن کی نگاہ میں دُکھ اور تکلیف کا موجب ہیں) دکھ اور تکلیف سمجھتے ہیں یا ان میں نہایت لذّت اور سرور پاتے ہیں۔ جب وہ اسے تکلیف ہی محسوس نہیں کرتے تو تم اسے تکلیف کیوں کہتے ہو۔

پس یہ خدا کی چار صفات ہیں جو اصول کے طور پر سورۃ فاتحہ میں بیان ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ ان چار صفات کا مظہر بنے اور اپنی زندگیوں پر ان کا رنگ چڑھائے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایک عملی نمونہ پیش کرنے کے لئے اپنے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خلق کیا اُن کی اُنگلی پکڑی۔ ان کا ساتھی اور دوست بنا۔ ان سے پیار کرنے والا بنا۔ اُن کو اپنا محبوب بنایا۔ خود اُن کا محبوب بھی بنا اور اس طرح گویا ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ اس عالمین کی یا ان افلاک کی جو غرضِ تخلیق تھی وہ پوری ہو جائے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے اپنا عمدہ نمونہ پیش کیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا مظہر بنانے کے لئے تمہارے سامنے جو نمونہ رکھا ہے۔ اس میں کوئی خامی کوئی کمزوری اور کوئی نقص نہیں ہے۔ جو صفاتِ باری کا مظہرِ اتم اور مظہرِ اکمل ہے اور وہ ایک کامل اور مکمل اُسوۂ حسنہ بن کر تمہارے سامنے آیا۔ اس اُسوۂ حسنہ کے مطابق جو تمہیں قویٰ دیئے گئے۔ تعبدِ ابدی کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بننے کے لئے ان کی نشوونما کو کمال تک پہنچاؤ۔ خدا تعالیٰ کی صفات کے حسن و احسان کے جو جلوے خدا کی صفات اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں نظر آتے ہیں وہ حسن و احسان کے جلوے تمہاری زندگیوں میں بھی نظر آئیں۔ تم ربّ بھی بنو خدا کے فضل اور اُس کی دی ہوئی توفیق سے اپنے اپنے دائرۂ استعداد کے اندر اندر اور اس طرح رحمان بھی بنو رحیم بھی بنو اور مالک یوم الدین بھی بنو اور خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے جو دائرہ مقرر کیا ہے اس کے اندر رہو گے تو میری رضا کی جنتوں میں میری رضا کے ماحول میں رہو گے۔ باہر نکلو گے تو جہنم میں جا پڑو گے۔ اس لئے باہر نہ نکلنا۔ اپنے اپنے دائرہ میں اپنی زندگی گذارو۔ آپ کے سارے پروگرام، آپ کے سارے کام اور سارے فیصلے اور ساری تمنائیں اور دعائیں اور آپ کی زندگی کے سارے پہلو اسی حقیقت کے غماز ہونے چاہئیں حتیٰ کہ آپ کے آخری لمحات میں بھی یہ حقیقت نظر انداز نہیں ہونی چاہیے جب کہ انسان موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہوتا ہے اور خدائے رحمان سے کہتا ہے یا خدائے رحیم سے

کہتا ہے کہ اے خدا اس قسم کی ہزاروں موتیں بھی آئیں تیری رحمت اور تیرے فضل اور تیرے پیار کے مقابلہ میں یہ موتیں ہمیں کیسے ڈرا سکتی ہیں موت ہمارا منتہا نہیں۔ تیری رضا ہمارا منتہائے مقصود ہے اور تیرے فضل اور رحم پر منحصر ہے۔ (خطاباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۵۸۱ تا ۶۰۲)

ہماری دعائیں سورۃ فاتحہ سے شروع ہوتی ہیں۔ سورۃ فاتحہ جو کہ پہلی سورۃ ہے اس میں اتنی زبردست دُعائیں ہیں اور اتنی وسیع دُعائیں ہیں کہ ان کی وسعتوں میں تو اس مختصر سے وقت میں مَیں نہیں جا سکتا لیکن اِس وقت کی دُعا بہرحال سورۃ فاتحہ سے ہی شروع کرتا ہوں۔

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی چار بُنیادی صفات کا ذکر ہے جنہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُمّہات الصفات کہا ہے۔ یعنی ہمارا اللہ ربّ العالمین ہے۔ ہمارا اللہ رحمٰن ہے۔ ہمارا اللہ رحیم ہے۔ ہمارا اللہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے اور ہمیں یہ حکم ہے کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللهِ کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا رنگ اپنے پر چڑھاؤ۔ اور پھر سورۃ فاتحہ میں یہ ذکر ہے کہ یہ جو اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات ہیں ان صفات کا رنگ اپنے اوپر چڑھاؤ۔ ان صفات کے جلووں کے نتیجہ میں اِنسان کو بہت سی طاقتیں اور استعدادیں حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں ہمیں یہ دُعا سکھائی گئی ہے کہ خدا سے یہ دُعا کرو کہ اے خدا جو قوتیں اور استعدادیں تُو نے دی ہیں انہیں احسن اور بہتر رنگ میں استعمال کرنے اور ان استعدادوں سے پُورے طور پر فائدہ اُٹھانے کی ہمیں توفیق عطا کر پھر چونکہ انسان ہمیشہ کی ترقیات کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ یعنی اے خدا جو کچھ تُو نے دیا ہے اس سے جب ہم پُورا فائدہ اُٹھالیں تو وہ ہماری آخری منزل تو نہیں ہے اس کے بعد مزید منزلوں نے آنا ہے۔ پس ان کے لئے جن استعدادوں اور قوتوں کی ہمیں ضرورت ہو وہ ہمیں عطا کر اور اپنے صراط مستقیم پر ہمیں قائم کر دے اور اپنی رضا کی جنتوں میں داخل کر لے۔ (خطابات ناصر جلد دوم صفحہ ۸۷، ۸۸)

خدا تعالیٰ کا اپنے بندوں سے تو یہ سلوک نہیں ہوتا وہ تو صرف پاس ہی نہیں کرتا، وہ صرف رحیم ہی نہیں ہے، صرف استحقاق ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ وہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بھی ہے۔ ہر چیز اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب استحقاق پیدا کرتا ہے تو ساتھ یہ بھی کہتا ہے، یہ لو اور دُنیا حیران ہے اور ہم اپنے پیارے ربّ کے پیارے جلوؤں کو دیکھ کر خوشی سے اپنی زندگی کے دن گزار رہے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا کہ میں تمہیں دُنیا کی طرح اجر نہیں دوں گا بلکہ میرا اجر تو اجرِ عظیم

ہے۔(عظیم عربی لغت کے لحاظ سے اس عظمت کو کہتے ہیں جس سے بڑھ کر کوئی عظمت نہ ہو) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو اجر میں نے دینا ہے، اس سے بڑھ کر اجر تمہیں کہیں اَور نہیں مل سکتا پس یہ عظیم اجر ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے اور یہ عظیم اجر ہے جسے ہم عملاً اللہ تعالیٰ سے وصول کر رہے ہیں اور جس پر ہم خوش ہیں۔ (خطبات ناصر جلد سوم صفحہ ۴۵۴)

اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر چونکہ حقیقی پرستش نہیں کی جاسکتی اس لئے عبادت کا حق ادا کرنے کے لئے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ ہم اس کے حضور عاجزانہ دعاؤں سے جھکیں کہ اپنی کوشش سے ہم اس حق کو ادا نہیں کر سکتے اس لئے شروع میں ہی اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ فرمایا اور ہمیں اس طرف متوجہ کیا کہ اگر تم صحیح طریق پر عبادت کرنا چاہتے ہو تو اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ یہ دعا کرتے رہا کرو کہ اے خدا! عبادت کی خواہش تو ہم رکھتے ہیں لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اپنی قوت اور طاقت سے ہم اس فرض کو پورا نہیں کرسکیں گے جب تک تیری مدد ہمارے شامل حال نہ ہو اس لئے تو ہم پر رحم کر اور ہماری مدد کو آ اور ہمیں توفیق عطا کر کہ ہم تیری عبادت کو کما حقہ پورا کرسکیں۔

اسی سورۃ میں انعام کی طرف بھی اصولاً اور بڑے حسین پیرایہ میں متوجہ کیا ہے آج حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ اپنے اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننے کی وجہ سے ہمارے دل میں جو سب سے بڑی تڑپ پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان اپنے ربّ کو پہچانیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احسان کو مانتے ہوئے آپؐ پر درود بھیجنے لگیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے وارث ہوں اگر اور جب ہماری عبادت قبول ہو جائے اور خدا ہمیں کہے کہ میں جیسا کہ تیری خواہش تھی تمہاری مدد کو آیا اور میں نے تمہیں توفیق عطا کی کہ تم صحیح معنی میں میرے عبادت گزار بندے بن جاؤ اب میں تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں بتاؤ کیا لینا چاہتے ہو؟ تو ہم میں سے ہر احمدی کی یہ ندا ہو کہ اے میرے ربّ تو نے ہم پر بڑا احسان کیا کہ ہمیں عبادت کی توفیق عطا کی تو نے ہم بڑا احسان کیا کہ تو نے ہماری ان عبادتوں کو قبول کیا اور تو ہم پر بڑا احسان کر رہا ہے کہ ان عبادتوں کو قبول کرنے کے بعد ہمیں اپنے فضلوں اور انعاموں سے نوازنا چاہتا ہے۔ ہماری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اس دنیا میں بسنے والے تمام ہمارے انسان بھائی تمہیں پہچاننے لگیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیم دنیا کی بہتری کے لئے لائے تھے وہ اپنی گردنیں اس تعلیم کے جوئے کے نیچے رکھ دیں اور ابدی

جنتوں کے ہماری طرح وہ بھی وارث ہوں۔

پرستش کا دعویٰ کرنا اور یہ کہنا کہ ہم عبادت کر رہے ہیں آسان ہے لیکن کرنا مشکل ہے کیونکہ عبادت صرف نمازیں پڑھنے کا نام نہیں قیام رکوع اور سجود کو ظاہری شکل میں بجالانے کا نام ہی عبادت نہیں ہے خالی زکوٰۃ دے دینا بھی عبادت نہیں محض روزے رکھنا بھی عبادت نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک روح ہے جس کی ضرورت ہے اگر ہماری نماز، اگر ہمارے روزے، اگر ہماری زکوٰۃ اور اگر ہماری دوسری عبادات زندہ ہیں تو وہ قبول ہوں گی اگر مردہ ہیں تو جو مردوں سے سلوک کیا جاتا ہے وہی ان سے کیا جائے گا پرستش کرنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے پس روح کی ضرورت ہے جس کے لئے ہم اپنے ربّ سے دعائیں مانگتے ہیں وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم غیر اللہ کے وجود کو مٹائیں اور غیر اللہ میں پہلا وجود ہمارے اپنے نفس کا ہوتا ہے اگر ہم اپنے ہی ہاتھ سے اپنی نفسانی خواہشات کی گردن پر چھری پھیر کر انہیں اپنے ربّ کے قدموں میں نہ لا ڈالیں تو ہماری عبادت کیسے قبول ہوگی اللہ کہے گا کہ آدھے تم میری طرف جھکے اور آدھے تم اپنے نفسوں کی پرستش میں مصروف رہے اس قسم کی عبادتوں کو میں پسند نہیں کرتا حقیقی عبادت جیسا کہ خدا چاہتا ہے کہ ہم اس کی کریں اس کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے جو میں اس وقت پڑھ دیتا ہوں اور جس پر میں آج اپنے مختصر سے خطبہ کو ختم کروں گا۔ آپ فرماتے ہیں۔

> ’’انسان خدا کی پرستش کا دعویٰ کرتا ہے۔ مگر کیا پرستش صرف بہت سے سجدوں اور رکوع اور قیام سے ہوسکتی ہے یا بہت مرتبہ تسبیح کے دانے پھیرنے والے پرستارِ الٰہی کہلا سکتے ہیں بلکہ پرستش اس سے ہوسکتی ہے جس کو خدا کی محبت اس درجہ پر اپنی طرف کھینچے کہ اس کا اپنا وجود درمیان سے اٹھ جائے اوّل خدا کی ہستی پر پورا یقین ہو‘‘۔

(حقیقۃ الوحی روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۵۴)

اس طرف ہمیں خاص توجہ دینی چاہئے نام تو ہم اللہ کا لیتے رہتے ہیں اس کے نشان بھی بڑی کثرت سے ہماری جماعت دیکھتی ہے مگر وہ یقین کامل جو اس کی کامل ہستی اور اس کی قدرت اور اس کی دوسری صفات حسنہ پر ہونا چاہئے بعض دفعہ بعض احمدیوں کے دل میں بھی ان کے متعلق کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اس متاع حسین اور بڑی قیمتی متاع کی حفاظت ہر وقت ہر احمدی کو کرتے

رہنا چاہیے۔

آپ فرماتے ہیں۔

’’اوّل خدا کی ہستی پر پورا یقین ہو اور پھر خدا کے حسن و احسان پر پوری اطلاع ہو اور پھر اس سے محبت کا تعلق ایسا ہو کہ سوزش محبت ہر وقت سینہ میں موجود ہو اور یہ حالت ہر ایک دم چہرہ پر ظاہر ہو اور خدا کی عظمت دل میں ایسی ہو کہ تمام دنیا اس کی ہستی کے آگے مردہ متصور ہو اور ہر ایک خوف اسی کی ذات سے وابستہ ہو اور اس کی درد میں لذت ہو اور اسی کی خلوت میں راحت ہو اور اس کی بغیر دل کو کسی کے ساتھ قرار نہ ہو اگر ایسی حالت ہو جائے تو اس کا نام پرستش ہے مگر یہ حالت بجز خدا تعالیٰ کی خاص مدد کے کیونکر پیدا ہو اسی لئے خدا تعالیٰ نے یہ دعا سکھلائی اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ یعنی ہم تیری پرستش تو کرتے ہیں مگر کہاں حق پرستش ادا کر سکتے ہیں جب تک تیری طرف سے خاص مدد نہ ہو خدا کو اپنا حقیقی محبوب قرار دے کر اس کی پرستش کرنا یہی ولایت ہے جس سے آگے کوئی درجہ نہیں مگر یہ درجہ بغیر اس کی مدد کے حاصل نہیں ہو سکتا اس کے حاصل ہونے کی یہ نشانی ہے کہ خدا کی عظمت دل میں بیٹھ جائے خدا کی محبت دل میں بیٹھ جائے اور دل اسی پر توکل کرے اور اسی کو پسند کرے اور ہر ایک چیز پر اسی کو اختیار کرے اور اپنی زندگی کا مقصد اس کی یاد کو سمجھے اور اگر ابراہیم کی طرح اپنے ہاتھ سے اپنی عزیز اولاد کے ذبح کرنے کا حکم ہو یا اپنے تئیں آگ میں ڈالنے کے لئے اشارہ ہو تو ایسے سخت احکام کو بھی محبت کے جوش سے بجالائے اور رضا جوئی اپنے آقائے کریم میں اس حد تک کوشش کرے کہ اس کی اطاعت میں کوئی کسر باقی نہ رہے یہ بہت تنگ دروازہ ہے اور یہ شربت بہت تلخ شربت ہے تھوڑے لوگ ہیں جو اس دروازہ میں سے داخل ہوتے ہیں اور اس شربت کو پیتے ہیں زنا سے بچنا کوئی بڑی بات نہیں اور کسی کو ناحق قتل نہ کرنا بڑا کام نہیں اور جھوٹی گواہی نہ دینا کوئی بڑا ہنر نہیں مگر ہر ایک چیز پر خدا کو اختیار کر لینا اور اس کے لئے سچی محبت اور سچے جوش سے دنیا کی تمام تلخیوں کو اختیار کرنا بلکہ اپنے ہاتھ سے تلخیاں پیدا کر لینا یہ وہ مرتبہ ہے کہ بجز صدیقوں کے کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ عبادت ہے جس کے ادا کرنے کے لئے انسان مامور ہے اور جو

شخص یہ عبادت بجالاتا ہے تب تو اس کے اس فعل پر خدا کی طرف سے بھی ایک فعل مترتب ہوتا ہے جس کا نام انعام ہے“۔(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۵۴، ۵۵)

(خطبات ناصر، جلد دوم صفحہ ۱۶۲ تا ۱۶۶)

سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے الفاظ میں ہمیں اس طرف متوجہ کیا ہے کہ مجھ سے مدد مانگنے سے قبل میری پہلی عطایا کی قدر کرو۔ میں نے تمہیں قوتیں، قابلیتیں اور استعدادیں عطا کی ہیں۔تمہارے اندر رفعتوں کے حصول کا مادہ ودیعت کیا ہے۔تمہارے لئے اپنے قرب کی راہوں کو آسان کیا ہے۔ میں نے تمہیں اپنا مقرب بنانے کے لئے پیدا کیا ہے اس لئے ان رفعتوں کے حصول اور ان سیدھی راہوں پر چلنے کے لئے میں نے جو سامان پیدا کئے ہیں تمہارا فرض ہے کہ تم ان کی قدر کرو اور اپنی تدبیر میں پوری طرح انہماک اور جدوجہد کے ساتھ مشغول رہو........

پس اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں اور استعدادوں کو بھی اور اسی طرح انسان کو ملنے والی دوسری ہر قسم کی نعمتوں کو بھی صحیح اور پورے طور پر استعمال میں لانا نہایت ضروری ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے الفاظ میں ہمیں اس طرف متوجہ کیا ہے کہ جب تم ہر عطائے الٰہی کو فضل الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرلو گے اور اپنی تدبیر کو انتہا تک پہنچا دو گے تو پھر میرے پاس آنا اور نہایت عاجزانہ اور منکسرانہ طور پر میرے حضور یہ عرض کرنا کہ اے خدا! تو نے اپنے فضل سے مجھے یہ قوتیں عطا کیں اور ان کی نشوونما کے لئے ہر قسم کے سامان پیدا کئے۔ میں نے اپنی قوت کے مطابق اپنی طاقت کے مطابق اور اپنی استعداد کے مطابق تیرے عطا کردہ سامانوں کو تیری رضا کے حصول کے لئے استعمال کیا لیکن نہ تو میرا بھروسہ اپنی ان قوتوں اور طاقتوں اور استعدادوں پر ہے جو تو نے مجھے عطا کی ہیں اور نہ میرا تکیہ اُن اسباب پر ہے جو تو نے میرے لئے پیدا کئے ہیں۔ یہ قوتیں اور طاقتیں بےنتیجہ اور یہ استعدادیں بےکار ہو جاتی ہیں اور یہ اسباب بےسود ہو کر رہ جاتے ہیں اگر تیرا فضل شامل حال نہ ہو اس لئے تو اپنا فضل فرما اور اپنی رحمت سے ہماری کوششوں میں برکت ڈال تا کہ ہمیں اپنی زندگی کا مقصد حاصل ہو جائے۔

پس اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں ہمیں یہ سبق دیا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں اور دوسری نعما کماحقہٗ استعمال کریں۔ اُن سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں، تدبیر کریں اور پھر اس کو انتہا تک پہنچائیں

اور پھر اپنی کوششوں پر تکیہ نہ کرتے ہوئے اُسی سے دعا کرتے رہیں اور اس کے حضور جھکے رہیں کیونکہ دین و دنیا کی کوئی بھی بھلائی اور بہتری اُس کے فضل کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو نعمتیں عطا کی ہیں ان میں سے سب سے بڑی نعمت قرآن عظیم ہے۔ یہ ایک مکمل ہدایت نامہ اور کامل شریعت ہے یہ سرچشمہ ہے ہر خیر کا، یہ منبع ہے ہر برکت کا اور یہ ذریعہ ہے ہر فیض کے پانے کا۔ لَا رَیْبَ یہ ایک عظیم کتاب ہے جس کی عظمتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ اس عظیم کتاب کے دو پہلو ہیں ایک یہ کہ یہ کتاب مبین ہے یعنی اس کے وہ عمیق اسرار جو ہم سے پہلوں نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل کئے اور ہم تک پہنچائے۔ جب تک اُن کے لئے ان اسرار اور ان رموز اور ان نئی سے نئی حکمتوں، دلائل عقلیہ اور فلسفہ یا اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا کی نئی راہوں کی نشاندہی نہیں ہوئی تھی یہ ساری چیزیں قرآن کریم کے دوسرے حصے یعنی کتاب مکنون کا حصہ تھیں لیکن جب ہمارے اسلاف میں سے نامور بزرگوں نے قرآن کریم کے بعض حقائق کو ہمارے سامنے پیش کیا، اس کے اسرار اور رموز سے پردہ اُٹھایا، عقلی اور نقلی دلائل سے اس کی صداقتوں کو ثابت کیا تو ان کی اس تشریح و توضیح کے نتیجہ میں ہمارے لئے یہ کتاب مبین بن گئی کیونکہ اس کے رموز و اسرار پر سے پردہ ہم سے پہلے آنے والوں نے اُٹھایا تھا لیکن جس طرح گلاب کے پھول کی پتیاں ایک کے بعد دوسری کھلتی ہیں اور خودنمائی اور حسن و خوبصورتی کو دوبالا کرتی چلی جاتی ہیں۔ اسی طرح قرآن عظیم کی علم و عرفان کی باتیں گلاب کے پھول کی پتیوں کے مشابہ ہیں۔ جب اس کے پُر حکمت کلمات پر سے پردہ اُٹھتا ہے تو ہمیں نیچے اَور پتیاں نظر آتی ہیں۔ ایک نیا زمانہ آتا ہے ایک نئی نسل پیدا ہوتی ہے وہ قرآن مبین سے یعنی جو پہلے تفسیر ہو چکی ہے اس سے فائدہ اُٹھاتی ہے۔ پھر لوگ دعائیں کرتے ہیں اللہ تعالیٰ فضل کرتا ہے ان کیلئے نئی پتیاں کھلتی ہیں اسرار روحانی سے پردہ اُٹھاتے جاتے ہیں انہیں نئے طریقوں کا علم ہوتا ہے نئے علوم کا پتہ لگتا ہے۔

قرآن کریم کا ایک پہلو تو مبین ہے اور اس پہلو میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر نسل اضافہ کرتی چلی آئی ہے اور ہر نسل ہی اللہ تعالیٰ کے فضل سے کتابِ مکنون اور اس کی حکمتوں کی وارث بھی بنتی رہی ہے۔ ہر نسل کو نئے سے نئے علوم حسبِ ضرورت اور بتقاضائے حالات دیئے جاتے رہے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑا رحم کرنے والا ہے۔ اس نے کسی چیز کو بے سہارا نہیں چھوڑا۔

ہمارے اِس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی تاثیروں نے اس انتہائی جوش کی حالت میں آئندہ زمانوں کے لئے بہت سے اسرار کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیئے اور جن کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ اُن کے لئے یہ سامان پیدا کر دیئے کہ ان کا سمجھنا نسبتاً آسان ہو جائے کیونکہ ایک حد تک تفسیر ہو چکی ہے اور ایک حد تک باقی ہے۔ بہرحال اس وقت اس قرآن عظیم کی تفسیر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے خلفاء کی کتب میں پائی جاتی ہے اگر ہم قرآن عظیم سے دین اور دنیا کی خیر حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اِس نعمت کی قدر کریں اگر ہم قرآن کریم کی ہدایتوں کی طرف متوجہ نہ ہوں گے اگر ہم قرآن کریم کے احکام کی پابندی نہیں کریں گے اگر ہم قرآن کریم سے اس قسم کا عشق نہیں کریں گے تو ہمیں دین اور دنیا کی بھلائی کس طرح مل سکتی ہے؟ ہمیں اس نعمت کی حتی المقدور قدر کرتے رہنا چاہیے تا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی تاثیرات سے ہمیں بھی کتابِ مکنون کا حصہ ملتا رہے جو ہماری زندگی کی پریشانیوں کو دور کرنے والا اور اُلجھنوں کو سُلجھانے والا ہو۔ پس اگر ہم مبین والے حصے کی جو دراصل ایک عظیم نعمت ہے جو ہمیں دی گئی ہے اس کی قدر نہ کریں اور اس سے فائدہ نہ اُٹھائیں تو ہماری دعائیں قبول نہیں ہوں گی۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے جو کچھ تمہیں دیا ہے پہلے اُس کی قدر کرو یعنی اُسے پورا پورا استعمال کرو اور اس سے کما حقہ، فائدہ اُٹھاؤ۔ پھر میرے پاس آؤ اور کہو اے خدا! تو نے ہماری فطرت میں ایک غیر محدود Urge (خواہش) ایک جذبہ اور ایک شوق رکھا ہے۔ ہم پہلوں سے جو حاصل کر سکتے تھے وہ ہم نے حاصل کیا اب ہم دعا کرتے ہیں کہ تو اپنے فضل سے ہم پر مزید ترقیات کے دروازے کھول دے اور ہمیں قرآن عظیم کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی اور قربانیاں دینے اور ایثار دکھانے کی توفیق عطا فرما لیکن اگر ہم پر جو عطا ہو چکی ہے جو کچھ ہمیں مل چکا ہے ہم اس کی قدر نہ کریں اُس کا صحیح استعمال نہ کریں۔ اُس سے پورا فائدہ نہ اُٹھائیں تو ہماری دعا ردّ کر دی جائے گی۔ اس قسم کی دعا ہمارے منہ پر مار دی جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو میں نے تمہیں دیا ہے اس کی تو تم نے صحیح قدر نہیں کی اور اس سے تو تم نے پورا فائدہ نہیں اُٹھایا اب جس چیز کو مجھ سے مانگ رہے ہو اس سے تم کیسے فائدہ حاصل کرو گے یا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کیسے کر سکو گے؟ پس

ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے جو کچھ مل چکا ہے اس کی قدر کرو اور اس سے حتی المقدور فائدہ اُٹھاؤ، اپنی قوت اور طاقت کے مطابق اپنی تدبیر کو انتہا تک پہنچا دو اور اس کے بعد میرے پاس آؤ اور مجھ سے مانگو، میں تمہیں نئی نعمتیں دوں گا، میں تم پر اپنے فضلوں کے دروازے کھولوں گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ریاء اور نمائش کے زہر کا تریاق ہے کیونکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم نے تمہیں جتنی قوتیں اور طاقتیں عطا کی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی خاطر صرف اس کی رضا کے حصول کے لئے ہیں۔ اُس کے اخلاق کا رنگ اپنے اوپر چڑھانے کے لئے ہیں۔ پس جب انسان اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں اور دوسری ہر قسم کی نعمتوں کا استعمال اور ان سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش محض اس لئے کرے کہ خدا تعالیٰ کی رضا اس کو حاصل ہو تو پھر ریاء نہیں ہوگا نمائش نہیں ہوگی، کسی کو دکھانے کی خواہش نہیں ہوگی۔ نمائش کے ذریعہ سے لوگوں کی واہ واہ حاصل کرنے کی خواہش اور ارادہ نہیں ہوگا۔ یہ مقام تو فنا کا مقام ہے جب غیر اللہ سے دل تہی ہو جاتا ہے تو اس میں صرف اللہ تعالیٰ کا خیال رہ جاتا ہے جو شخص ہر مخلوق شجر حجر وغیرہ کو استعمال میں لا کر فائدہ اُٹھا سکتا ہے ہر نعمت کو جو آسمان سے آتی اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں کے ذریعہ سے نازل ہوتی ہے اس کو محض اللہ تعالیٰ کے لئے خرچ کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے اور جو بھی میں نے کرنا ہے وہ خدا تعالیٰ کے لئے کرنا ہے تو پھر انسان کے کسی بھی عمل میں ریاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے انسان کے کسی بھی کام میں حتی کہ اس کے دماغ کے کسی گوشہ میں بھی ریاء کا کوئی دخل ہی نہیں ہو سکتا۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ریاء کی بیماریوں کا علاج ہے کیونکہ انسان جب سب کچھ کرنے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ مَیں نے یہ اپنی کسی قوت پر اور نہ اپنی کسی قابلیت پر بھروسہ کرنا ہے اور نہ ہی دوسری نعمتوں کو خدائی کا درجہ دینا ہے بلکہ سب کچھ کرنے کے بعد یہ سمجھنا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا، سب کچھ کر لینے کے بعد اور تدبیر کو انتہا تک پہنچانے کے بعد بھی میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہتے ہوئے جھکنا ہے اور یہ کہنا ہے کہ میں نے جو کچھ کرنا تھا وہ میں نے کر لیا ہے جو کچھ میں کر سکتا تھا یا جو میرے بس میں تھا وہ تو ہو چکا لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کے باوجود میں تیرے فضلوں کو حاصل نہیں کر سکتا جب تک تیرا ارادہ، تیری مدد، تیری نصرت میرے

ارادے اور میری کوشش کے شامل حال نہ ہو۔ پس اس صورت میں اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کے دعائیہ الفاظ انسانی تکبر اور غرور اور نخوت کے بھوت کی گردن پر ایک تیز چھری کا کام دیتے ہیں۔ اس دعا کے ذریعہ انسانی تکبر اور غرور اور نخوت کے بھوت کا سر کچل دیا جاتا ہے اور انسان تکبر اور غرور، نخوت اور خود بینی کے زہر سے ہلاک ہونے سے بچ جاتا ہے کیونکہ انسان کے لئے اس دنیا میں اس زندگی میں ایک ہی موت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے لئے فنا ہو جانے کی موت ہے یہ موت بھی ہے اور ایک لِقا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں فنا اور اللہ تعالیٰ کے ذریعہ سے بقا اور زندگی کا حصول ہے۔

پس اس وقت جو سب سے بڑی نعمت مجھے نظر آتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ بھی غور کریں تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ سب سے بڑی نعمت جو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہے وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قرآن کریم کی تفسیر کے خزانے ہیں کہ جن سے ہم جتنا بھی فائدہ اُٹھائیں یہ خزانہ ختم ہونے والا نہیں ہے۔ اس لئے اِس خزانے کی قدر کرنا ضروری ہے اور اپنے چھوٹے بڑے ہر قسم کے مسائل کو اس کی روشنی میں سلجھانا ضروری ہے۔ اگر ہم اپنی طرف سے اپنی زندگی کے مسائل کو سُلجھانا شروع کریں گے تو ناکام ہوں گے۔ قرآن کریم کی ہدایت ہی کے ذریعہ انفرادی اور اجتماعی مسائل کا صحیح حل تلاش کیا جا سکتا ہے اس کے بغیر ممکن نہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو ہمارے لئے ایک کامل ہدایت نامہ بنایا اور پھر قرآن کریم کی اس کامل ہدایت اور حسین تعلیم کو سمجھنے کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ ایک نہایت ہی اہم چیز یعنی آپ کی تفسیر ہمارے ہاتھ میں دے دی اگر اس کے بعد بھی ہم غافل ہو جائیں تو ہم سے بڑھ کر بدقسمت انسان کوئی نہیں ہوگا۔ اس لئے میں بار بار جماعت کو اس طرف توجہ دلاتا ہوں کہ یہ ایک خزانہ ہے اس کے دروازے کھولو، کتابیں پڑھو اور اُن پر غور کرو...... میں قرآن کریم کی تفسیر کے سمجھنے کے سلسلہ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی اعلیٰ درجہ کی قوت دی ہے اور یہ ہے فکر اور غور کرنے کی قوت اور یہ اس لئے دی ہے کہ ہم قرآن اور اس قرآن عظیم کی جو تفسیریں پہلے بزرگوں نے کی ہیں اور اب اس زمانے میں جو بہترین تفسیر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کی ہے اور جس کا دائرہ قیامت تک وسیع ہے اور پھر جو تفسیر آپ کے خلفاء کی کتابوں میں پائی جاتی ہے اس کو ایک نعمت سمجھتے ہوئے اس کے سمجھنے سمجھانے کے لئے غور و فکر کریں اور ان حقائق سے پُر کتابوں کو مجبور کر کے

نہ چھوڑ دیں کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتب کے ذریعہ قرآن کریم کے حقائق سمجھ کر ان پر عمل پیرا رہنے پر ہماری نجات منحصر ہے اسی میں ہماری اپنی خوشحالی اور ہماری اگلی نسلوں کا آرام اور خوشحالی کا راز مضمر ہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتب کو بار بار پڑھنا اور ان سے فائدہ اُٹھانا اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے ماتحت آتا ہے کیونکہ یہ ایک عطا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہم پر یہ فضل ہے تم اس سے فائدہ اُٹھاؤ اور جب فائدہ اُٹھانے کی پوری تدبیر کرلو اور جب ان تفسیروں سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں اور سامانوں کے استعمال پر اپنا پورا زور لگا چکو تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے پھر میرے حضور آؤ اور مجھ سے مانگو اور کہو کہ اے ہمارے ربّ! تو نے ہم پر بڑی نعمتیں نازل کیں اور تو نے سب سے بڑی نعمت قرآن عظیم کی شکل میں عطا کی اور پھر ان کی تفسیر کرنے کے لئے تو نے دنیا میں اپنے مطہرین کا گروہ بھیجا، اُنہوں نے تفسیریں لکھیں، پھر تو نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھیجا اور ہمیں اُن پر ایمان لانے کی توفیق بخشی، ہم نے آپ کی کتابوں کو پڑھا اپنی طرف سے ان کو سمجھنے کی مقدور بھر کوشش کی، اپنی طرف سے یہ کوشش بھی کی کہ جن ہدایتوں پر وہ مشتمل ہیں اُن پر عمل پیرا رہیں لیکن ہماری یہ ساری کوششیں بے کار ہیں۔ اگر تیرا دست قدرت یاوری نہ کرے، ہم فائدہ تو تب ہی حاصل کر سکتے ہیں جب کہ تیری مدد ہمارے شامل حال ہو، جب تیری نصرت کے ہم مستحق ٹھہریں۔ پس اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ہم تیرے پاس مدد و نصرت لینے کے لئے آئے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ تیری مدد کے بغیر ہماری کسی کوشش یا تدبیر کا کوئی نتیجہ کہیں نکل سکتا ہے اور نہ اسباب کے کسی استعمال کا فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ کسی فکر اور غور اور تدبر کا نہ خشوع کا کیونکہ خشوع وخضوع میں بھی بعض دفعہ شیطان کا دخل آجانے سے بناوٹ آجاتی ہے۔ انسان خود رو رہا ہوتا ہے اور دراصل وہ شیطانی آنسو ہوتے ہیں، اُسے خود بھی پتہ نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت میں رکھے تو امان ہے ورنہ امان کہیں بھی نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم عبادت کے تقاضے کو پورا کرلو گے تو پھر میں تمہارے اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہنے کی رو سے تم نے جو مجھ سے مدد مانگی ہے اور نصرت طلب کی ہے وہ میں تمہیں عطا کروں گا میں تمہاری مدد کے لئے آجاؤں گا لیکن میری مدد کے حصول سے قبل تمہارے لئے یہ ضروری ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں عبادت کے جن تقاضوں کا ذکر ہے تم ان تقاضوں کو پورا کرنے والے بنو کیونکہ جو شخص خداداد قوتوں اور طاقتوں اور اس کی عطا کردہ

دوسری نعمتوں سے لا پرواہی برتتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور شوخی اور گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے۔ پس ادب کا طریق اور عاجزی کی راہ یہی ہے کہ ہم اس کی عطا کردہ قوتوں یا صلاحیتوں یا دوسرے مادی اسباب اور روحانی نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں لیکن اُن کو بُت بھی نہ بنائیں یہ سمجھنا تو حماقت ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت، اپنی قابلیت یا اپنی عقل و فراست یا اپنے فکر و تدبر کے نتیجہ میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ ساری چیزیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو روحانی نعمتیں بخشی ہیں ان کے صحیح استعمال کے باوجود ہم روحانی رفعتیں حاصل نہیں کر سکتے جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہو کیونکہ روحانی رفعتیں یا روحانی بلندیاں جن ستونوں کے سہاروں پر کھڑی ہیں وہ انسان کے بنائے ہوئے ستون اور سہارے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے ستون اور سہارے ہیں۔ ان سہاروں کے بغیر انسان رفعتوں اور بلندیوں پر کھڑا رہ ہی نہیں سکتا جو شخص اپنے آپ کو بڑا بلند سمجھنے لگتا ہے مگر خدا تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کا سہارا نہیں لیتا وہ بلندیوں سے گرتا ہے اور اس کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں اور اس کا درختِ وجود ذرّہ ذرّہ ہو کر رہ جاتا ہے........ پس اللہ تعالیٰ کی بنیادی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت قرآن عظیم ہے اور اس کی خصوصاً وہ تفسیر ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کی ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کو جو نماز کی ہر رکعت میں پڑھنے کا حکم دیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات ہر وقت تمہارے سامنے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو مختلف نعمتیں عطا کی ہیں مثلاً مختلف قوتوں یا قابلیتوں کی شکل میں، مختلف اسباب کی شکل میں یا قرآن کریم کی مختلف تفاسیر کی شکل میں یا زبان کی شکل میں یا خشوع و خضوع کی شکل میں یا فکر و تدبر کی شکل میں یہ ساری خداداد قوتیں اور قابلیتیں اور یہ سارے ساز و سامان اور یہ سارے خداداد ملکات خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول میں خرچ ہونے چاہئیں۔ جب اس طرح عبادت کی جائے اور دنیوی اعمال بجالائے جائیں تو پھر تم اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کہنے کے مستحق ٹھہرتے ہو پھر تمہیں میرے حضور دعا کرنی چاہیے اور مجھ سے ہی مانگتے رہنا چاہیے اور یہ دعا بھی کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ دعاؤں کو قبول فرمائے اور مزید رفعتوں کے حصول کے دروازے کھول دے۔ پس اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت تو قرآن کریم ہے اور

پھر اس کو سمجھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم نعمت ہمیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تفاسیر کی شکل میں عطا کی ہے۔اس لئے اس کی قدر اسی طرح ہو سکتی ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتب کے ہمیشہ پڑھتے پڑھاتے رہنے کا تسلی بخش انتظام ہوتا رہے......

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں جب یہ کہا کہ میرے حضور جھکو اور یہ کہو کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ یعنی یہ کہ جو نعمتیں تو نے ہمیں عطا کی ہیں ہم ان کی قدر کرتے اور ان کو صحیح استعمال کرتے اور تیری رضا کے حصول کی کوششوں میں انہیں لگاتے ہیں اور اسی طرح ایک دوسری نعمت عظمیٰ شرف انسانی کے قیام کی صورت میں رونما ہوئی ہے یعنی ہم نے تمام بنی نوع انسان کی بحیثیت انسان عزت اور شرف اور احترام کو قائم کرنا ہے اور ایک دوسرے سے معاملہ کرتے ہوئے انسان کی عزت نفس اور اس کے انسانی شرف کا خیال رکھنا ہے اور ہمیشہ یہ یاد رکھنا ہے کہ جس سے میں مخاطب ہوں یا جس سے میں کوئی معاملہ کر رہا ہوں یا جو اپنی ضرورت کے پورا کروانے یا اپنے حق کے حصول کے لئے میرے پاس آیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بحیثیت انسان میری طرح ہی عزت اور شرف رکھتا ہے یہاں تک کہ عزتِ نفس اور شرف انسانی کے اعتبار سے فخر انسانیت حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ویسے ہی انسانی شرف کے مالک ہیں جیسے ایک دوسرے آدمی کا انسانی شرف قائم کیا گیا ہے۔آپ یہ یاد رکھیں کہ شرفِ انسانی کے لحاظ سے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی دوسرے انسان میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس شرف انسانی کی بنیاد پر اخلاقی رفعتوں اور روحانی بلندیوں کے سامان پیدا کئے اور خدا تعالیٰ کے پاک بندوں میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور انہوں نے انتہائی سے انتہائی بلند ہونے کی کوشش کی تو اس بلند پروازی میں سیدنا حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آگے نکل گئے اور ایسے بلند ترین مقام کو حاصل کیا کہ اس سے زیادہ تو کیا اس جتنا بھی کسی کے لئے پانا نہ پہلوں کے لئے ممکن ہوا اور نہ پچھلوں کے لئے بھی ممکن ہوگا بعض فلسفی اعتراض کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیوں پابندی لگا دی؟ پابندی کا یہاں سوال نہیں ہے روحانی انعامات کے حصول میں کوئی روک نہیں ہے لیکن ہمارے علّام الغیوب خدا نے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ نہ پہلے اور نہ بعد میں آنے والے اخلاقی اور روحانی لحاظ سے اس بلند ترین مقام کو پہنچ سکیں گے جس بلند ترین مقام پر آپؐ پہنچے تھے۔انسان کی تمام قوتیں جن کی شرفِ انسانی کے قائم ہونے کے بعد ابتدا ہوئی ہے ان کے لحاظ سے اس دوڑ میں تو آپؐ ہی

آگے نکلے لیکن مقابلے میں جہاں سے دوڑ Start (سٹارٹ) یعنی شروع ہوتی ہے آپ نے دیکھا ہوگا دس پندرہ آدمی قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور پھر دوڑ شروع ہوتی ہے، اگر قطار میں سارے Competitor (مقابلہ میں حصہ لینے والوں) کو کھڑا کر دیا جائے تو بحیثیت انسان سب برابر ہیں۔ اس لحاظ سے قطار میں کھڑے ہونے کی حیثیت میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی دوسرے انسان میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن جب روحانی میدان میں دوڑ شروع ہوگئی تو دوسرے آپؐ کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے........

پس یہ دوسری بنیادی نعمت عظمیٰ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہے اور اِیَّاكَ نَعْبُدُ کے تقاضے میں یہ تھا کہ میں نے جو نعمتیں دی ہیں ان کا صحیح اور پورا استعمال کرو جس کو ہم دوسرے الفاظ میں یہ کہتے ہیں کہ تدبیر کو انتہا تک پہنچاؤ۔ ایسا کرنے کے بعد پھر میرے پاس آؤ تب میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ (خطبات ناصر جلد دوم صفحہ ۹۰۸ تا ۹۲۳)

سورۂ فاتحہ میں ایک حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ انسان کی سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی پیروی کرے اور بندہ اپنے ربّ کا عبد اُسی وقت بنتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی صفات کا رنگ اُس پر چڑھ جائے اور اُس کے رنگ میں وہ رنگین ہو جائے اور چونکہ انسان اپنی طاقت یا اپنے کسی حیلہ یا تدبیر کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے رنگ میں خود کو رنگین نہیں کر سکتا اس لئے سورۂ فاتحہ میں ہمیں یہ دُعا سکھلائی اِیَّاكَ نَعْبُدُ۔ اِس میں دُعا کا پہلو ہے اور اس میں ہمیں یہ بتایا گیا کہ جب تم اللہ تعالیٰ کی، جو تمام عیوب اور نقائص سے منزہ ہے اور تمام صفاتِ حَسنہ کا جامع ہے، اُس کی صفات کی معرفت حاصل کرو گے تو اس کی عظمت اور جلال تم پر ظاہر ہوگا اور جب اُس کی عظمت اور جلال اور اُس کی صفات کی عظمت اور جلال کا عرفان تمہیں حاصل ہوگا تو صرف اُس صورت میں ہی تم اُس کی صفات کی پیروی کر سکتے ہو اور اُس کی عظمت اور جلال کا جلوہ انسان کو یہ سبق دیتا ہے کہ وہ فی ذاتہٖ کوئی حقیقت اور حیثیت نہیں رکھتا اور ریا کاری جو تمام نیکیوں کو کھا جانے والا گناہ ہے اُس سے انسان اُس عظمت کے جلوہ کے نتیجہ میں محفوظ ہو جاتا ہے اور اس طرح پر اللہ تعالیٰ کی صفات کا رنگ اپنے پر چڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسری بدی جو اِس سعادت عظمیٰ سے انسان کو محروم رکھتی ہے اور وہ بہت بڑی بدی ہے بلکہ تمام بدیوں کی بسا اوقات وہی جڑ اور موجب بن جاتی ہے۔ وہ بدی تکبر کی بدی ہے۔

انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھ میں وہ طاقت، وہ قوت وہ استعداد ہے کہ میں اپنی قوتوں اور طاقتوں اور استعدادوں کے نتیجہ میں کچھ بن سکتا ہوں لیکن اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی دُعا تکبر کی جڑ کو کاٹنے والی ہے اس طرح پر کہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہمیں اُن نعمتوں اور اُن احسانوں کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی عمل کے ہم پر کئے۔ اس کی رحمانیت کے جلوے جو بغیر استحقاق کے ذِی ارواح پر نازل ہوتے ہیں اُن سے ہمیں پتہ لگتا ہے کہ جب تک وہ نعمتیں ہمارے کسی عمل کے بغیر ہمیں حاصل نہ ہوتیں ہم کسی قسم کی ذاتی کوشش اور جدوجہد کرنے کے قابل ہی نہیں تھے۔ مثلاً رحمانیت نے انسان کے لئے روشنی اور اندھیرے کا انتظام کیا ہے۔ ایک نظام بنایا ہے اِس دُنیا میں جہاں انسان کی قوتیں اپنی جدوجہد میں مصروف ہوتی ہیں اور جہاں ہماری قوتیں تھک کر رات کے اندھیروں میں سکون کی تلاش کرتی ہیں اور کوفت کو دور کر کے وہ آرام کی حالت اپنی طاقت کو از سرِ نو زیادہ سے زیادہ کوشش کے لئے تیار کر دیتی ہیں۔ بادلوں کا برسنا، زمین کی یہ ساری قوتیں جو ہماری جسمانی غذا کا سامان پیدا کرتی ہیں اور ہماری بیماریوں کے علاج کے لئے مختلف جڑی بوٹیاں پیدا کرتی ہیں۔ یہ چیزیں انسان کی پیدائش سے پہلے یہاں تھیں۔ کوئی احمق کھڑا ہو کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ میں نے نیکیاں کیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے سورج بنایا اور آسمان بنایا اور یہ پانی بنایا اور یہ زمین بنائی۔ تم تو تھے ہی نہیں جب یہ سب کچھ بنایا گیا۔ اس لئے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی دُعا اور یہ دُعائیہ فقرہ ہمیں یہ دُعا سکھلانے والا ہے جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ہمیں بتایا ہے یہ رحمانیّت کے مقابلہ پر رکھا گیا ہے اور رحمانیّت کے جلووں کا احساس اور اُن کا عرفان اور اُن کی معرفت انسان کو اِس حقیقت سے آشنا کرتی ہے کہ وہ خود اپنی کوشش اور اپنی جدوجہد سے کچھ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ جن چیزوں پر اُس کی کوشش کی بنیاد ہے وہ اُس کی پیدائش سے بھی پہلے پیدا کر دی گئی تھیں۔ پس جو نعمتیں اُس کی پیدائش سے بھی پہلے پیدا کر دی گئیں اور جن کے بغیر اُس کی کوئی کوشش ممکن ہی نہیں۔ جب یہ معرفت انسان کو حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اُس کے اندر تکبر کا کوئی سوراخ باقی نہیں رہتا جو اُس کے وجود کے اندر، جو اُس کی شخصیت کے اندر داخل ہو اور اُس کی تمام نیکیوں کو اور تمام نیکی کی کوششوں کو جڑ سے اکھیڑ دے۔ پس اِیَّاکَ نَعْبُدُ ریا سے انسان کو بچاتا ہے اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تکبّر سے انسان کو بچاتا ہے لیکن تیسری چیز جو کہ انسان کی روحانی رفعتوں کے لئے ضروری وہ اس معرفت کے علاوہ ایک اور چیز ہے۔ ہمیں یہ معرفت حاصل

ہوئی کہ خدا تعالیٰ تمام صفاتِ حسنہ سے متّصف ہے اور کوئی نقص اور کمی اُس میں نہیں ہے اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے اسلامی تعلیم میں یہ بتایا ہے خصوصاً سورۂ فاتحہ میں اس پر روشنی ڈالی کہ انسان کی سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی پیروی کرے اور تخلّق باخلاق اللہ ہو اور اُس کے رنگ میں وہ رنگین ہونے کی کوشش کرے اور اس عرفان کو حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال کے جلوے ظاہر ہوتے ہیں جو انسان کو یہ بتاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں اُس کے پاس کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو انسان شو (show) کر سکے اور جس پر بنیاد رکھ کر ریاکاری کر سکے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُس پر اپنی رحمانیّت کے جلوے ظاہر کئے اور رحمانیّت کے جلووں نے اُس کو یہ بتایا کہ تجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے شمار، بے حد وحساب ایسی نعمتیں ملی ہیں جن میں تیرے عمل کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تیری پیدائش سے بھی پہلے وہ نعمتیں تیرے لئے پیدا کر دی گئیں اور یہ اس لئے کیا گیا تھا کہ ان کے بغیر تیری قوتیں اور تیری استعدادیں جو خود خداداد ہیں وہ اپنا کام نہیں کر سکتی تھیں تو تیری ہر حرکت خدا تعالیٰ کی صفتِ رحمانیّت کی محتاج ہے۔ تو تکبّر کس بات پر؟ انسان ایک انگلی نہیں ہلا سکتا اگر رحمانیّت کا جلوہ اس سے قبل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ یہی ظاہر کرنے کے لئے بہت سے بچوں کو پیدائش کے وقت اپنی رحمانیّت کے جلووں سے محروم کر دیتا ہے۔ بعض دفعہ بڑا تندرست، بڑا خوبصورت بچہ پیدا ہوتا ہے اور ہوا جو رحمانیّت کا جلوہ ہے جو انسان کی پیدائش سے پہلے اُس کے لئے بنائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کو کہتا ہے کہ تو اِس پر وہ اثر نہ کر جو عام انسانوں پر تو کرتی ہے۔ وہ سانس نہیں لے سکتا۔ ہمارے ہی گھر میں، میری بڑی بیٹی کے ہاں پہلا بچہ جب پیدا ہوا تو اُس نے سانس نہیں لیا اور اتنا خوبصورت اور اتنا تندرست اور خوب موٹا تازہ بچہ میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی نہیں دیکھا۔ خدا کی شان تھی کہ عین اُس وقت جب وہ اپنی ماں کے پیٹ سے اِس دُنیا میں آیا تو رحمانیّت کے جلوے اُس بچے کے لئے بند کر دیئے گئے اور یہ میری اُس بچی کو اور دوسری کو سبق دینے کے لئے ہوا کہ جب تک تمہارے عمل سے پہلے کی نعمتیں نہ ملیں اُس وقت تک تمہارا اپنا کام شروع ہی نہیں ہو سکتا۔ سانس ہم اپنی ماں کے پیٹ سے تو لے کر نہیں آتے۔ پھر پانی ہے۔ غذائیں ہیں۔ آب و ہوا ہے۔ گرمی اور سردی کا ایک متوازن نظام ہے جسے زمین میں مختلف شکلوں میں خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اِس کی تفصیل میں تو میں اس وقت نہیں جا سکتا وہ بڑی عجیب مختلف مؤثرات اور تاثیریں ہیں جن کے نتیجہ میں انسان کے جسم اور اس

کے اخلاق بنتے ہیں۔ بہرحال اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی دُعا کو ٹھیک طرح سمجھ لینا اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنا یہ چیز تکبّر کو بالکل مٹا دیتی ہے کیونکہ انسان کو پتہ ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ کسی میدان میں بھی میری کوئی حرکت آگے نہیں بڑھ سکتی جب تک اس حرکت سے پہلے خدا تعالیٰ کی رحمانیّت کے جلوے موجود نہ ہوں لیکن خدا تعالیٰ کی عظمت وجلال بھی ہو اور رحمانیت کی صفت کو بھی انسان پہچانے تو پھر بھی خود اپنے لئے اپنی کوشش سے راہِ راست اور صراطِ مستقیم تلاش نہیں کرسکتا۔ اس میں بھی اُسے خدا تعالیٰ کی مدد کی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر وہ راہِ راست پر چل نہیں سکتا۔ راستہ پر تو وہ چلنا شروع کر دے گا لیکن وہ صرف ''صراط'' ہوگا صراط مستقیم نہیں ہوگا۔ راستہ پر اس لئے چلے گا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے جلوے اس پر ظاہر ہوئے اور صفتِ رحمانیّت کے جلوے ظاہر ہوئے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا تعلق رحمانیت سے ہے اور نیکیوں کی کوششوں کو نقص سے پاک کرنا اور اچھے نتائج نکالنا یہ رحمانیت کا کام ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی جہاد خدا کی راہ میں کر رہا ہو اور محاسبۂ نفس کر رہا ہو اس کے اعمال میں تھوڑا یا بہت نقص رہ جاتا ہے اور عام قانون یہ ہے کہ تھوڑا یا بہت نقص رہ جائے تو انسان منزلِ مقصود تک پہنچ نہیں سکتا مثلاً ایک موٹی مثال میں اِس وقت دیتا ہوں جسے بچے بھی سمجھ جائیں گے کہ ایک شخص نے سو قدم چل کر وہاں پہنچنا ہے جہاں اُس کا مقصود اُسے حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر وہ ننانوے قدم چلے اور سواں قدم نہ چلے تو وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو صرف ایک قدم کی کمی ہے ننانوے قدم اُس نے اُٹھائے ہیں لیکن ایک قدم نہیں اُٹھا سکا اس لئے وہ اپنے مقصود کو نہیں پا سکتا۔ پس ہر انسان کی کوشش اور عملِ صالح میں کوئی نہ کوئی کمی اور غفلت رہ جاتی ہے۔ اِس وقت رحمانیت آتی ہے اور انسان کی انگلی پکڑتی ہے اور کہتی ہے جو قدم تو نے نہیں اُٹھایا وہ میں تمہیں اُٹھا دیتا ہوں اور اُس کے عملِ صالح کی کفیل ہوجاتی ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں یہی دُعا سکھائی ہے کہ وہ سیدھا راستہ ہمیں دکھا جو منزل مقصود تک پہنچانے والا ہو۔ جس کا مطلب ہے کہ سارے قدم اور ساری کوششیں انتہا تک پہنچانے والی ہمیں نصیب ہوں۔ اس کے بغیر تو کوئی دو قدم سیدھا چل کر، کوئی بیس قدم سیدھا چل کر، شاید کوئی ننانوے قدم سیدھا چل کر بھی اپنے عمل کے نتیجہ سے محروم ہوجاتا ہے پس یہاں بتائی گئی تین دعاؤں کے نتیجہ میں انسان

کو ایک طرف ان تمام نقائص اور کمزوریوں سے محفوظ رکھنے کا سامان پیدا کیا گیا جو اس کی کوششوں کو بے نتیجہ اور بغیر ثمر کے بنا دیتی ہیں اور دوسری طرف خدا تعالیٰ کی انگلی پکڑ کر انتہائی کامیابی تک پہنچانے کے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں سامان پیدا کر دیئے۔ یہ مضمون بیان کرنے کے بعد آخر میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کچھ تفصیل اور فروعی ذمہ داریوں کی طرف ہمیں توجہ دلائی ہے۔ وہ چند ہدایات میں پڑھ دیتا ہوں۔ یہ ان باتوں کا ایک قسم کا خلاصہ ہے جو باتیں میں نے بیان کی ہیں۔

(ترجمہ) ''اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ کسی بندہ کے لئے ممکن نہیں کہ اُس وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ سے توفیق پانے کے بغیر عبادت کا حق ادا کرے اور عبادت کی فروع میں یہ بھی ہے (میں نے بتایا تھا کہ آپ نے یہاں عبادت کی فروع بتائی ہیں) کہ تم اُس شخص سے بھی جو تم سے دشمنی رکھتا ہو ایسی ہی محبت کرو جس طرح اپنے آپ سے اور اپنے بیٹوں سے کرتے ہو اور یہ کہ تم دوسروں کی لغزشوں سے درگزر کرنے والے اور ان کی خطاؤں سے چشم پوشی کرنے والے بنو اور نیک دل اور پاک نفس ہو کر پرہیزگاروں والی صاف اور پاکیزہ زندگی گزارو اور تم بُری عادتوں سے پاک ہو کر باوفا اور باصفا زندگی بسر کرو اور یہ کہ خلق اللہ کے لئے بلا تکلف اور تصنّع بعض نباتات کی مانند نفع رساں وجود بن جاؤ اور یہ کہ تم اپنے کبر سے اپنے کسی چھوٹے بھائی کو دُکھ نہ دو اور نہ کسی بات سے اس (کے دل) کو زخمی کرو بلکہ تم پر واجب ہے کہ اپنے ناراض بھائی کو خاکساری سے جواب دو اور اسے مخاطب کرنے میں اس کی تحقیر نہ کرو اور مرنے سے پہلے مر جاؤ اور اپنے آپ کو مردوں میں شمار کر لو اور جو کوئی (ملنے کے لئے) تمہارے پاس آئے اس کی عزت کرو خواہ وہ پرانے بوسیدہ کپڑوں میں ہو نہ کہ نئے جوڑوں اور عمدہ لباس میں اور تم ہر شخص کو السلام علیکم کہو خواہ تم اسے پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو اور (لوگوں کی) غم خواری کے لئے ہر دم تیار کھڑے رہو''۔ (اعجاز المسیح۔ روحانی خزائن جلد نمبر ۱۸ صفحہ ۱۶۸، ۱۶۹)

پس میں نے مختصراً ہی تین اصولی باتیں بیان کی تھیں۔ ایک یہ کہ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ہر آن یہ کوشش کرتے رہیں کہ تخلق باخلاق اللہ کرنے والے ہوں اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے رنگ سے ہمارا وجود رنگین ہو اور ریاکاری ہماری زندگی میں داخل نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ ہم یہ دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے اُن رحمانیت کے جلووں سے ہمیں نوازے جن کی ہمیں ذاتی جدوجہد کے لئے

ضرورت ہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ توفیق عطا کرے کہ ہم اُسی کی عطا کردہ قوّتوں اور استعدادوں کو اُس کے قُرب اور اُس کی رضا کے حصول پر لگائیں تو وہ خود ہماری رہنمائی کرے ہمیں صراطِ مستقیم دکھائے اور اُس پر چلنے کی اور انتہا تک پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے اور اُس کی فروع وہ ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی چند سطروں میں آئیں ہیں اور میں نے بیان کی ہیں۔

(خطبات ناصر جلد پنجم صفحہ ۶۰۹ تا ۶۱۴)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کی تفسیر میں یہ مضمون بیان کیا ہے اور بڑا حسین نکتہ نکالا ہے کہ خدا کے کسی بندے کو اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کہنے کا حق تبھی حاصل ہوتا ہے جب اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کہنے کی اہلیت وہ اپنے اندر پیدا کر لے۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کے معنی ہیں کہ اے ہمارے ربّ! تو نے ہمیں اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا اور تو نے ہمیں روحانی قوتیں عطا کرنے کے بعد ایسی تمام مادی اشیاء بھی عطا کیں جن کی ضرورت ان قوتوں کی نشوونما کے لئے تھی اور ہم نے تیری توفیق سے تیری عطا کردہ قوتوں کو انتہائی طور پر استعمال کر کے تیرے حضور اپنی پیشکش کی۔ جب تک ان قوتوں سے انسان فائدہ نہ اٹھائے جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں، اس وقت تک وہ حقیقی معنی میں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ نہیں کہہ سکتا۔ جب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سب قوتوں سے انتہائی فائدہ حاصل کر لے تب وہ کہہ سکتا ہے کہ تو نے اپنا بندہ اور عبد بننے کے لئے جو طاقتیں ہمیں دی تھیں ہم نے ان کا صحیح اور انتہائی استعمال کر لیا اور چونکہ تو نے ہمارے اندر آگے ہی آگے بڑھنے کا جذبہ اور جوش پیدا کیا ہے۔ اس لئے اس مقام پر ہمارے دل تسلی نہیں پکڑتے اور ہم نہیں چاہتے کہ ہم یہیں کھڑے رہیں۔ اس لئے جو قوتیں تو نے ہمیں عطا کیں ان کے مطابق ہم نے اپنی طرف سے اپنی بساط کے مطابق کوشش کی، اب آگے بڑھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہماری قوت میں اضافہ ہو، اس واسطے اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ہم تیری مدد مانگتے ہیں تجھ سے استعانت چاہتے ہیں کہ تو ہمیں مزید طاقت دے تا کہ تیری راہ میں ہم آگے ہی آگے بڑھتے چلے جائیں۔

کئی فقیر آپ کو نظر آئیں گے یا بعض ہنگامی حالات میں ان کی یہ حالت آپ کے سامنے آئے گی کہ دس دس ہزار، بیس بیس ہزار، پچاس پچاس ہزار روپیہ ان کے پاس جمع بھی ہے اور گلیوں اور بازاروں میں اپنے دوسرے بھائیوں کے سامنے مانگنے والا ہاتھ انہوں نے آگے بھی کیا ہوا ہے اسی

طرح کئی لوگ ایسے ہیں کہ جو ان کے پاس ہے اسے خرچ نہیں کرتے اور خدا کو کہتے ہیں کہ اَور دے۔ فقیر جس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے اسے تو معلوم نہیں کہ اس کے گھر میں رات کی روٹی ہے یا نہیں۔ نہ اسے یہ علم ہے کہ اس کی تجوری یا تھیلی میں پانچ دس بیس پچاس لاکھ روپیہ ہے۔ جب نوٹ کینسل (Cancel) ہوئے اور کہا گیا کہ پرانے نوٹ لاؤ تو بعض ایسے فقیروں کا ذکر بھی اخباروں میں آیا (واللہ اعلم کہاں تک یہ درست ہے) جن کے پاس لاکھوں روپیہ تھا اور پھر بھی وہ بھیک مانگ رہے تھے اور دینے والا ان کو دے رہا تھا اور اس کے بھائی کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ بے چارہ! اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں۔ پیسہ اس کے پاس نہیں کہیں رات کو بھوکا نہ سو جائے اس کو دے دو لیکن جو ہاتھ خدا تعالیٰ کے سامنے پھیلایا جاتا ہے وہ ایک ایسی ہستی کے سامنے پھیلایا جاتا ہے جس سے کوئی چیز غائب نہیں۔ خدا تعالیٰ کہتا ہے میں نے تجھے دیا اور تو نے میری راہ میں خرچ نہیں کیا۔ اب میرے سامنے ہاتھ کیوں پھیلا رہا ہے۔ آگے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کا مقام جو آج کے دن کا مقام ہے اسے حاصل کر۔ جو کچھ میں نے تجھے دیا قوت اور طاقت اور استعداد کے لحاظ سے، جو کچھ میں نے تجھے دیا ظاہری سامانوں کے لحاظ سے اور مادی اشیاء کے لحاظ سے، جو کچھ میں نے تجھے دیا عقل اور فراست کے لحاظ سے، جو کچھ میں نے تجھے دیا قرآن عظیم جیسی ہدایت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ کے لحاظ سے۔ یہ جو تجھے چیزیں ملیں پہلے ان سے انتہائی فائدہ اٹھا۔ پھر میرے پاس آ۔ میرے خزانے خالی نہیں ہیں لیکن تیری ساری قوتیں میری راہ میں خرچ ہونے کے بعد میرے سامنے تیرا دست سوال پھیلنا چاہیے۔ پھر انسان خرچ کرنے کے بعد یعنی ''جو کچھ ہے'' پورے کا پورا خدا تعالیٰ کے حضور پیش کر دینے کے بعد خدا سے کہتا ہے کہ جہاں تو نے مجھے اتنا کچھ دیا اور مجھے یہ توفیق بھی دی کہ میں تیری راہ میں سارا کچھ خرچ کر دوں وہاں تو نے مجھے یہ جذبہ اور جوش بھی دیا کہ میں کسی مقام سے تسلّی نہ پکڑوں کیونکہ تیرے قرب کے مقامات کی کوئی انتہا نہیں۔ آگے بڑھنے کے لئے میرے ربّ مجھے اور دے۔

پھر جب اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کے بعد مخلصانہ دعا اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کی ہوتی ہے تب خدا تعالیٰ اسے اور قوت دیتا ہے اور تب خدا تعالیٰ اسے جو قوت دیتا ہے اسے لے کر وہ آگے بڑھتا ہے پھر ایک اعلیٰ مقام پر کھڑا ہوتا ہے پھر کہتا ہے اے خدا! تو نے مجھے جو طاقتیں دیں وہ تیری راہ میں خرچ ہو گئیں اب مجھے اور دے کیونکہ جو طاقتیں ملیں ان کے خرچ کرنے پر تو ایک جیسا ثواب ملتا رہے گا۔ اگر مجھے مزید ثواب ملتا ہے

اور ترقی کی مزید راہیں کھلتی ہیں تو ضروری ہے کہ تو مجھے اور طاقتیں دے پھر اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کہتا ہے کہ اے خدا! میری مدد کو آ میں یہاں کھڑا ہو گیا ہوں جو کچھ تو نے دیا تھا وہ اب استعمال کر چکا۔ یہ سلسلہ چند گھنٹوں کا بھی ہے چند گھنٹے انسان خدا کی راہ میں کام کرتا ہے۔ پھر ہر نماز میں کہتا ہے۔ پھر ہر نماز میں کہتا ہے۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ۔ یعنی جو کچھ تو نے مجھے دیا میں نے وہ تیری راہ میں خرچ کر دیا۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس دو گھنٹے کے وقفہ میں مثلاً جو آج کل ظہر اور عصر کے درمیان ہوتا ہے۔ اس میں خدا نے کچھ نہیں دیا کیونکہ خدا تعالیٰ کے بندے تو ہر وقت خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اس سے مزید حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ عصر کے وقت حقیقتاً (مبالغہ کے طور پر نہیں) بندے کا اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کا مقام ظہر کے مقابلہ میں آگے ہوتا ہے اور پھر کہتا ہے اے خدا! مغرب کے وقت تک مجھے اور آگے لے جا۔ یہ حرکت روحانی جو لازمی قرار دی گئی ہے (یعنی نمازوں کی ادائیگی حرکت روحانی ہے) اس میں دو گھنٹے کا وقفہ ہے اور ہر نماز میں سورۃ فاتحہ کو پڑھنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نماز میں ہمیں کہا گیا ہے کہ خدا سے یہ دعا کرو کہ جو تو نے ہمیں اس عرصے میں بھی دیا اسے بھی ہم نے تیری راہ میں خرچ کر دیا تیرا ہی عطا کردہ ابدی ترقیات کا جو جذبہ ہے اسی کی وجہ سے ہم ایک جگہ کھڑے نہیں رہ سکتے۔ پھر مغرب کی نماز میں پھر عشاء کی نماز میں (نوافل میں چھوڑ رہا ہوں) پھر صبح کی نماز میں نوافل کی توفیق ملتی ہے۔ نوافل کی توفیق مغرب اور صبح کے درمیان اس لئے ملتی ہے کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ عشاء کے وقت کہنے کے بعد اس نے اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کی بھی دعا کی تھی۔ تو یہ چھوٹے سے چھوٹا جو وقفہ ہمارے سامنے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کے تسلسل کو قائم رکھنے اور جاری رکھنے کا آتا ہے۔ نمازوں کے درمیان ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا یہ چھوٹے سے چھوٹا وقفہ ہے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ خدا نے تمہارے لئے عید بنا دیا ہے یہ ایک دوسری اکائی ہے یعنی جمعہ سے جمعہ تک ہر روز لازمی طور پر پانچ دفعہ توفیق دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہر ہفتہ پینتیس دفعہ لازمی طور پر اس نے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ بھی کہا اور اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ بھی کہا پھر جمعہ آتا ہے اور اس کی عبادت کرتے ہیں۔ پھر اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کہتے ہیں اور خدا سے کہتے ہیں اے خدا پچھلے جمعہ ہم نے کہا اِیَّاکَ نَعۡبُدُ اور ہم نے کہا اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ تو نے ہماری دعا کو قبول فرمایا۔ (جمعہ کی نماز ایسی ہے کہ جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں ایک گھڑی ایسی آتی ہے جو قبولیت دعا کی گھڑی ہے)

میں اس گھڑی کو لیتا ہوں ۔ مَیں جماعت کی اجتماعی زندگی کے متعلق بات کر رہا ہوں ۔کوئی ہم میں سے کمزور ہے، کوئی بزرگ ہے ۔ اجتماعی زندگی کے لحاظ سے میں یہ لے رہا ہوں کہ جمعہ کو وہ دعا کی گھڑی آئی تو بعض احمدیوں نے اس سے فائدہ اٹھایا (جونہیں اٹھا سکے انہیں اللہ تعالیٰ فائدہ اٹھانے کی توفیق دے) اور اس گھڑی میں خدا تعالیٰ کے مومن بندے نے کہا اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔یعنی جو قوتیں اور طاقتیں تو نے دیں ان کے مطابق میں نے تیری عبادت کی اور پرستش کی اور میں نے آگے بڑھنا ہے اس واسطے مجھے اور قوتیں عطا کر میری قوتوں میں اَور مضبوطی اور استحکام پیدا کر اور خدا نے اس گھڑی میں وہ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی دعا قبول کی اور اس کا ایک قدم اگلے جمعہ کو اَور آگے بڑھ گیا ۔ پھر اگلا جمعہ آیا، پھر اگلا جمعہ، پھر اگلا جمعہ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے انسان کا انجام بخیر ہو جائے ۔ یہ ایک دوسری اکائی ہے جمعہ سے جمعہ آٹھ دن اور معنی میں ثواب کی اکائی ہے ۔ ہمارے لئے سارے معنی برکت کے معنی ہیں پھر اس کے بعد سال آ جاتا ہے کیونکہ جو اگلی عید ہے وہ ایک سال کے بعد آتی ہے ۔بعض عبادتوں کے لحاظ سے ایک وقت میں عید آ جاتی ہے اور دوسری عبادتوں کے لحاظ سے دوسرے وقت میں ۔ اور ہمارے لئے جلسہ سالانہ ہے جو سال کے بعد آتا ہے آج کے جلسہ پر ہم نے کہا اِيَّاكَ نَعْبُدُ لیکن ساتھ ہی ہم نے کہا اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ آئندہ جلسہ پر اے خدا ہم تیری رحمتوں کے زیادہ وارث بننے والے ہوں بوجہ اس دعا کے جو تو نے ہمیں سکھلائی اور جو تو نے ہمارے منہ سے بار بار کہلوائی ۔ ہم تجھ سے زیادہ طاقتیں حاصل کرنے کے بعد تیرے حضور زیادہ حسین قربانیاں پیش کرنے والے ہوں........

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ فرمایا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے مقابل اِيَّاكَ نَعْبُدُ کو رکھا گیا ہے ۔ اسی واسطے میں نے اس طرح اس حصہ سورۃ کو پڑھا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ۔ جو کچھ ہمیں اس کے عبد بننے میں ملا اس پر ہمارے دل اس کی حمد سے معمور ہیں اور ہم اس کے ممنون ہیں اور ہماری زبانیں اس کی حمد کرتے ہوئے تھکتی نہیں ہمارے گلے خشک ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے دل کی دھڑکنیں اور روح کی امواج خدا تعالیٰ کی حمد کر رہی ہوتی ہیں اس اتنے بڑے اجتماع کی برکتیں ہمارے دوسرے کاموں پر بھی اثر انداز ہوں گی اور ان کا ایک عکس پڑے گا روشنی پڑے گی ۔

(خطبات ناصر جلد چہارم صفحہ ۵۸۵ تا ۵۹۱)

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ ایک عجیب دعا بڑی حسین اور بڑی وسعتوں اور بڑی گہرائیوں اور بڑی تاثیروں والی دعا سکھائی اور ہمیں بتایا کہ یہ دعا کرو کہ اے خدا عقل بھی ہمیں یہی بتاتی ہے ہماری فطرت بھی اسی طرف راہ نمائی کرتی ہے کہ ہر مقصود پانے کے لئے ایک سیدھی راہ ہوا کرتی ہے اور جو اس سیدھی راہ کو اختیار کرتا ہے وہی اپنے مقصود کو حاصل کرتا ہے اس لئے ہمیں وہ سیدھی راہ دکھا جو ہمیں تجھ تک پہنچا دے تو ہمیں مل جائے تیرے ساتھ ہمارا تعلق قائم ہو جائے تجھے ہم پالیں، تیری رحمتوں کے ہم وارث بن جائیں اور بتایا کہ یہ راہ آج پہلی دفعہ انسان کو نہیں بتائی جارہی بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے نبوت کا ایک سلسلہ شروع ہوا اور انبیاء سے تعلق رکھنے والے بزرگ خدا کی راہ میں قربانی دینے والے، خدا کی محبت کو پانے والے پیدا ہوتے رہے پس جس طرح پہلوں پر اصولی طور پر تیرے انعام نازل ہوئے تو ہمیں ایسی راہ دکھا کہ ہم بھی ان جیسے بن جائیں اور اس قسم کے انعام ہمیں بھی تیری طرف سے ملیں......

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ منعم علیہم گروہ کے علاوہ ایک گروہ وہ بھی ہے جو منعم علیہم نہیں اور آگے وہ دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے ایک گروہ وہ جو مغضوب بن جاتے ہیں اور ایک جو راہ سے بھٹک جاتے ہیں مغضوب کے معنی قرآن کریم کی اصطلاح میں یہ ہیں کہ جو شخص انشراح صدر کے ساتھ کفر کو کفر سمجھتے ہوئے قبول کرتا ہے سب سے پہلا انشراح صدر اس سلسلہ میں ابلیس کو ہوا تھا اس سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں تھی وہ اپنے اللہ کو پہچانتا تھا، اللہ سے وہ گفتگو کر رہا تھا لیکن کہتا تھا کہ میں کفر کروں گا اور لوگوں کو بھٹکاؤں گا تیرا کہنا نہیں مانوں گا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی سزا ملے گی خدا نے کہا تھا کہ میں تجھ سے اور تیرے ماننے والوں سے جہنم کو بھر دوں گا لیکن وہ کفر پر قائم رہا غرض مغضوب اس کو کہتے ہیں جو نافرمانی کی راہ سمجھتا ہے جو کفر کے راستہ کو کفر کا راستہ سمجھتا ہے جو جانتا ہے کہ اگر میں نے یہ راہ اختیار کی تو اللہ تعالیٰ کا یقینی غضب مجھ پر نازل ہوگا لیکن پھر بھی اس کا شیطانی نفس یہ فیصلہ کرتا ہے کہ میں نے اسی راہ کو اختیار کرنا ہے اللہ تعالیٰ مغضوب کے اس مضمون کو بیان کرتے ہوئے سورہ نحل میں فرماتا ہے مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ۔ (النحل:۱۰۷)

اس آیت میں بڑی وضاحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ غضب اس گروہ یا فرد پر نازل ہوتا ہے جو انشراحِ صدر سے کفر کے راستہ کو قبول کرتا ہے پس غضب کے نزول کے لئے جو وجہ بنتی ہے وہ جان بوجھ کر خدا تعالیٰ کے غضب، اس کی ناراضگی اور اس قہر کے راستوں کو اختیار کرنا ہے کہ اس سے خدا ناراض ہو جائے لیکن پھر جرأت کرتا ہے اور خدا کی ناراضگی، اس کے غضب اور قہر کو مول لیتا ہے۔ اسی طرح سورۃ بقرہ کی آیات ۹۰ اور ۹۱ میں یہ مضمون بیان ہوا ہے میں چونکہ اختصار کرنا چاہتا ہوں اس لئے نہ میں پوری آیات پڑھ رہا ہوں نہ میں ان کا ترجمہ کروں گا نہ تفسیر بیان کروں گا میں اس مطلب کے ٹکڑے لوں گا، آیت ۹۰ میں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ کہ ان کے پاس جب کافروں پر فتح اور کامرانی حاصل کرنے کے سامان آ گئے تو باوجود اس عرفان کے، باوجود اس کے سمجھ کے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت کے سامان پیدا ہوئے ہیں، كَفَرُوۡا بِهٖ انہوں نے اس کا انکار کر دیا اور آیت ۹۱ میں جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ اس بات پر بگڑتے ہیں کہ اللہ اپنی مرضی سے اپنے بندوں میں جس پر چاہتا ہے کلام نازل کر دیتا ہے یہ کیا بات ہوئی ہم جس پر چاہیں اللہ کا فضل ہے (نعوذ باللہ) کہ وہ اس پر کلام نازل کرے غرض وہ جانتے تھے کہ کلام اللہ کا ہے وہ یقین رکھتے ہیں کہ جس پر یہ کلام نازل ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے اسی کو پسند کیا ہے اور اس کو اپنا محبوب بنانا چاہا ہے۔ اپنے قرب سے نوازنا چاہا ہے اور اس پر اپنا کلام نازل کیا ہے اور یہ جانتے بوجھتے انکار کرتے ہیں نتیجہ کیا ہوا؟ فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ایک غضب کے بعد دوسرے کا وہ مورد بن گئے جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ کی وجہ سے ایک غضب مول لے لیا اور اس بات سے ناراض ہوئے کہ خدا نے اپنی مرضی سے اپنی پسند سے اس شخص پر اپنا کلام کیوں نازل کیا جسے اس نے مقرب بنانا چاہا ہماری مرضی چلنی چاہیے تھی وہ سمجھتے ہوئے کہ یہ کلام خدا کا ہے اور جس پر نازل ہوا ہے وہ خدا کا مقرب بھی ہے انکار کر جاتے ہیں فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ایسے لوگ غضب کے بعد غضب کے مورد ہو جاتے ہیں۔ غرض غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ اے خدا کبھی ایسا نہ ہو کہ ہم شیطان کی طرح تیری معرفت رکھنے کے باوجود اس بات پر یقین رکھتے ہوئے کہ تیری طرف لے جانے والی صراطِ مستقیم کون سی ہے پھر بھی اس راہ کو چھوڑ دیں اور شیطان کی راہوں کو اختیار کر لیں اور یہ ہو نہیں سکتا جب تک تیرا فضل اور تیری رحمت

ہمارے شاملِ حال نہ ہو اس لئے تجھ سے یہ عاجزانہ دعا ہے کہ ہمیں مغضوب کبھی نہ بنانا۔

وَلَا الضَّآلِّيْنَ اور نہ کبھی ہمیں ضال بنانا۔ ضال سیدھے راہ سے بھٹکنے والے کو کہتے ہیں اور قرآن کریم نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الکھف:۱۰۵) پس ضالین وہ ہیں جن کی تمام کوششیں ان راہوں کی تلاش میں رہتی ہیں جو اُخروی زندگی سے ورے ورے ختم ہوتی جاتی ہے۔ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وہ اس ورلی زندگی کے کناروں سے نکل کر اُخروی زندگی تک نہیں پہنچتیں۔ راہ بھٹک جاتی ہے کوشش جو ہے وہ آگے چل ہی نہیں سکتی ایسے راستے وہ اختیار کرتے ہیں جن کا صرف اس دنیا سے تعلق ہے حالانکہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہ ساری چیزیں (خواہ وہ قوتیں اور استعدادیں ہوں یا مادی سامان ہوں یا فطرت کے تقاضے ہوں) اس لئے دی تھیں کہ اس دنیا میں وہ ختم نہ ہوں نہ صرف اس دنیا سے ان کا تعلق ہو بلکہ ان کے نتیجہ میں انسان اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کی جنت کو حاصل کرے اور اس دنیا میں بھی وہ اس رضا کی جنت کو حاصل کرے لیکن ایک گروہ انسانوں میں سے یا بعض افراد ایسے ہوتے ہیں کہ جو ان قوتوں کی انتہا اس دنیا کے ورے ورے سمجھتے ہیں اسی طرح دنیا کے جو سامان ہیں ان کے متعلق سمجھتے ہیں کہ وہ بس دنیا میں ہی ہمارے کام آئیں گے حالانکہ ایک عقلمند مومن یہ جانتا ہے کہ وہ بکرا جو خدا نے مجھے دیا ہے اور جو گوشت پوست ہے اور اس کی زندگی بھی چھوٹی ہے ایک ایسی چیز ہے جو صرف اس دنیا میں ہمارے کام نہیں آسکتی بلکہ اگر ہم چاہیں تو یہ اس دوسری دنیا میں بھی ہمارے کام آئے گی کیونکہ اگر ہم چاہیں تو تقویٰ کا ٹیگ، لیبل اس کے ساتھ لگا دیں تو بکرا یہاں رہ جائے گا لیکن وہ ٹیگ، وہ لیبل آسمانوں کے خدا کے پاس پہنچ جائے گا۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج:۳۸) تقویٰ کے ساتھ لگا تو بکرا اللہ کے حضور پہنچ گیا اور تمہارے لئے دوسری زندگی میں بھی مفید ہوگا (یہ زندگی تو اس زندگی کے مقابلہ میں اتنی معمولی چیز ہے کہ ہم اس کا نام ہی نہیں لیں گے) دوسری زندگی میں بھی وہ کام آجائے گا آپ دفتر میں جاتے ہیں سو روپیہ آپ کو تنخواہ ملتی ہے اب کوئی احمق ہی کہہ سکتا ہے کہ یہ چاندی کے سکے یا کاغذ کے نوٹ صرف اس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں قیصر کی چیز ہے اس کا ایک حصہ اس کو دے دینا چاہیے لیکن چونکہ یہ خدا کی چیز نہیں اسے نہیں دینا چاہیے اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ تباہ ہو جائے گا اُسے یہ کہنا چاہیے کہ ہر چیز چونکہ خدا کی ہے اس لئے جس قدر چاہے وہ لے لے پھر جو بچ

جائے گا وہ میں استعمال کرلوں گا ایک مومن کی یہی نیت ہوتی ہے اس کی یہ نیت نہیں ہوتی کہ جو مجھ سے بچ جائے گا وہ میں خدا کو دے دوں گا بلکہ اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ جو بچ جائے گا اس معنی میں وہ کہے کہ میں نے اتنا لے لیا باقی تم استعمال کرلو تو پھر وہ میں استعمال کرلوں گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ میں سے بعض کے ساتھ یہی سلوک کیا آپؐ نے فرمایا نہیں اتنا مال نہیں چاہیے واپس لے جاؤ اور استعمال کرو اس نیک نیتی کے ساتھ جتنا دینا چاہا پیش کر دیا اور ہمیں یقین ہے کہ اس نے خدا سے اسی کے مطابق ثواب حاصل کرلیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حالات کو دیکھتے ہوئے اور اسلام کی اس وقت کی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے کہا سارے مال کی ضرورت نہیں واپس لے جاؤ پھر یہ بتانے کے لئے کہ جب ایک مومن خدا کے حضور اپنا سارا مال پیش کرتا ہے تو اس کے دل میں یہ بدنیتی نہیں ہوتی کہ سارا مال قبول نہیں کیا جائے گا اس لئے سارا مال پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں حضرت ابوبکرؓ نے جب اپنا سارا مال پیش کیا تو وہ سارا قبول کرلیا گیا اور بتایا گیا کہ ہر مومن کے دل کی یہی کیفیت ہے لیکن کچھ مومن وہ ہوتے ہیں جو جواں ہمت ہوتے ہیں اور جو انتہائی بوجھ برداشت کر سکتے ہیں (چنانچہ آپ نے ان میں سے ایک کا سارا مال لے لیا اور مثال کو قائم کر دیا) اور کچھ وہ ہوتے ہیں کہ ان کی روح تو انتہائی قربانیاں دینے کے لئے تیار ہوتی ہے لیکن ان کا ماحول اور ان کا جسم اس کے لئے تیار نہیں ہوتا ان کو فتنہ اور امتحان سے بچانے کے لئے ان کے مال کا ایک حصہ قبول کرلیا جاتا ہے اور ایک حصہ واپس کر دیا جاتا ہے۔

پس مومن کی مادی کوشش دنیا میں حدود سے ورے ختم نہیں ہو جاتی اور اس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا کیونکہ روپیہ وہ خرچ کرتے ہیں زندگی کا ہر لمحہ جو وہ گزارتے ہیں اخلاق کا ہر مظاہرہ ان سے سرزد ہوتا ہے بچوں سے محبت اور پیار کا سلوک جو دنیا ان سے دیکھتی ہے اس کے پیچھے یہی روح کام کر رہی ہوتی ہے کہ جس نے خدا کی رضا کے لئے اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالا اس نے بھی ثواب حاصل کرلیا۔ غرض مومن اپنے ہر دنیوی کام کو اُخروی جزا اور اُخروی نعماء کے حصول کا ذریعہ بنالیتا ہے اور اس کے متعلق ہمیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا والے گروہ میں ہے لیکن بہت سے لوگ ہمیں ایسے بھی نظر آتے ہیں بہت سی قومیں ہمیں ایسی نظر آتی ہیں جو راہ بھول گئے ہیں ان کو پتہ ہی نہیں کہ سیدھا راستہ کونسا ہے اس لئے وہ مغضوب علیہم کے گروہ

میں شامل نہیں کئے جا سکتے وہ ضَالّ کے گروہ میں شامل ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی اصلاح کے ذرائع تو اختیار کرے گا اور وہ انہیں سخت بھی محسوس ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے شروع ہی میں سورۃ فاتحہ میں ان دو گروہوں کے (درمیان) ایک فرق کر دیا یعنی ایک کو مغضوب کہا ہے اور ایک کو ضَالّ کہا ہے یہ لوگ صراط مستقیم کو پہچانتے نہیں۔ ضَالِّین یہ سمجھتے ہیں کہ جس راستہ پر وہ ہیں بس وہی ٹھیک ہے نہ وہ خدا کو پہچانیں نہ کوئی آسمانی تعلیم ایسی ہے جس کے اوپر ان کا پختہ یقین ہے کہ وہ سمجھتے ہیں بس یہ دنیا پیدا ہوئی یا اگر ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ دنیا کو اللہ نے پیدا کیا ہے مگر اتنی بڑی ہستی اور عاجزوں سے ایک زندہ تعلق قائم کیوں رکھے گی اس لئے اس کا ہمارے ساتھ کوئی زندہ تعلق نہیں غرض اپنی حماقت اپنی بیوقوفی اپنی روایات (ہزار قسم کی وجوہات ہو سکتی ہیں ان سب وجوہات) کے نتیجہ میں وہ راہ گم کر بیٹھتے ہیں اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر یہ جماعت مؤمنین جو احیائے اسلام کے لئے پیدا کی گئی ہے ضالین کے سامنے بھٹکتے ہوئے راہی کے سامنے ہدایت پیش کرے گی تو ان سے بہت سے اسے قبول کرلیں گے کیونکہ ان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے وہ جان بوجھ کر انشراح صدر کے ساتھ ضلالت کی راہوں کو اختیار نہیں کرتے بلکہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ ان کو صراطِ مستقیم کا پتہ ہی نہیں۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دعا کرتے رہو کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ ہم میں سے کوئی فرد یا جماعت گمراہی میں کفر میں پڑ کر ایک حصہ ان کا مغضوب بن جائے اور ایک حصہ ان کا ضالّ بن جائے یعنی ہر شخص دعا کرنے والا اپنے اور اپنوں کے لئے یہ دعا کرے کہ اے خدا میری فطرت میں شیطنت کو کبھی پیدا نہ ہونے دینا کہ میں تیری راہ کو جانتے بوجھتے انشراح صدر کے ساتھ چھوڑنے لگ جاؤں اور نہ ایسے حالات پیدا کرنا کہ میں تیری راہ کو گم کر دوں اور بھٹک جاؤں اور شیطان کی راہوں کو اختیار کرلوں۔

غرض جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے متعدد جگہ تحریر فرمایا ہے سورۃ فاتحہ ایک عظیم دعا ہے اس وقت میں صرف اس چھوٹے سے ٹکڑے کا مضمون بیان کر رہا ہوں اور اس سورۃ کا یہ ٹکڑا بھی عظیم دعا ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ میرے غضب سے بچنے کے لئے ہر قسم کی تدبیر اختیار کرنے کے بعد میرے حضور آؤ اور دعائیں کرو اور ضلالت کی راہوں کو اختیار کرنے سے بچنے کے لئے ہر قسم کی تدبیر اختیار کرو اور میرے پاس آؤ اور دعا کرو اگر خلوص نیت سے میرے حضور دعا کرو گے تو ضَالّ

ہونے سے بھی تجھے اے انسان بچایا جائے گا مغضوب ہونے سے بھی تجھے بچایا جائے گا اور صراطِ مستقیم تجھے دکھائی جائے گی اس راہ پر چلنے کی تجھے توفیق عطا کی جائے گی میرے قرب کو تو حاصل کر لے گا میری رضا کی جنت میں تو داخل ہو جائے گا اور اس گروہ میں شامل ہو جائے گا جو منعم علیہم کا گروہ ہے جس کا ذکر متعدد آیات قرآنیہ میں پایا جاتا ہے۔ (خطبات ناصر جلد دوم صفحہ ۲۱۰ تا ۲۱۵)

قرآن کریم نے ہمیں صرف یہ دعا نہیں سکھائی کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں صراطِ مستقیم کے ایک معنی یہ ہیں کہ وہ راستہ جو کم سے کم کوشش کے نتیجہ میں منزل مقصود تک پہنچانے والا ہو۔ دُنیا کی ہر خواہش کے پُورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ایک راستہ ہے اور جب تک اُس راہ کا علم انسان کو نہ ہو وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچتا یا بہت تکالیف اُٹھانے کے بعد بہت چکر کاٹ کر اور تکلیف اُٹھا کر اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔

ہمیں صرف یہ دعا نہیں سکھائی بلکہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا کی قبولیت کے ساتھ جو ذمہ واری ہم پر عائد ہوتی ہے اُس کے نبھانے کے لئے دعا ہمیں اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں پہلے سکھائی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ اے خدا! ہمیں توفیق عطا کر کہ جو طاقتیں تُو نے صراط مستقیم پر چل کر منازل مقصودہ تک پہنچنے کے لئے عطا کی ہیں ہم ان کا صحیح اور پُورا استعمال کر سکیں۔ اِس تفسیر کی روشنی میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے یہ معنی ہیں۔ پھر وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ دُعا سکھائی کہ بتدریج ارتقا کا قانون اس مادی دنیا میں ہمیں نظر آتا ہے اور کسی منزل کو بھی آخری منزل سمجھ کر تسلی پا جانے کی فطرت ہمیں تُو نے دی نہیں اس لئے ہر منزل پر پہنچ کر اگلی منزل کی تلاش دل میں پیدا ہوتی ہے اور تیری محبت کی جس منزل پر بھی ہم پہنچے ہوتے ہیں اُس سے زیادہ کے حصول کی خواہش ہمارے دل میں مچلتی ہے اِس لئے ہر منزل جس تک ہم پہنچیں (ان طاقتوں اور کوششوں اور تدابیر کو انتہا تک پہنچا کر ان طاقتوں کے ذریعہ جو تُو ہمیں دے چکا ہے یعنی اپنی انتہائی کوشش کے نتیجہ میں) وہ تیری پیدا کردہ فطرت کے مطابق ہماری آخری منزل نہیں بلکہ اگلی منزل کی خواہش پیدا ہوتی ہے جس کے لئے پہلے سے زیادہ قوت اور طاقت کی ضرورت ہے اور جب تیری توفیق سے اپنی طاقتوں کا صحیح اور پورا استعمال کر کے ہم ایک جگہ پہنچیں تو پھر ہماری دعا ہے کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں مزید طاقتیں عطا کر۔ چنانچہ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں اس طرف اشارہ ہے اور

اس طرح پر یہ صراطِ مستقیم جو ایک معنی میں منزل بہ منزل انسان کی خوشیوں کے سامان بھی پیدا کرتا ہے اور دوسرے معنی میں ہر منزل اگلی منزل کی نشاندہی کرتی ہے اور اس طرح پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو مزید حاصل کرنے کی جو خواہش دل میں مچلتی ہے اُس کے لئے مزید طاقتوں کی ضرورت ہے جس کے لئے ہمیں دعا سکھائی۔

پس صرف یہ نہیں کہا کہ ہمیں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دے بلکہ یہ بھی فرمایا کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت ملنے کے بعد بھی بعض بدقسمت راہِ راست کے کنارہ پر گِر کر مر جاتے ہیں اور ان کا جسم اور رُوح سڑ گل جاتی ہے اور تعصب اُن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ آخر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اپنی زندگی میں ہمیں یہ نظارہ نظر آیا کہ بعض ایسے بدقسمت تھے جن کو یہ کامل اور مکمل ہدایت ملی یعنی قرآن عظیم کی شریعت اور جن کو ایک بہترین اُسوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ملا اُنہوں نے اس کو ایک حد تک پہچانا اور اس سے فائدہ حاصل کیا اور ایک وقت کے بعد وہ مُرتد ہو گئے۔ پس صراطِ مستقیم کے کنارے پر ان کی رُوحانی یا بعض دفعہ رُوحانی اور جسمانی ہلاکت واقع ہوئی۔ پس محض صراطِ مستقیم کا عرفان حاصل کر لینا کافی نہیں یعنی اِس ہدایت کا مِل جانا کہ یہ سیدھا راستہ ہے بلکہ اس پر چلنا ضروری ہے اور محض چلنا ضروری نہیں بلکہ ہر لحہ اور ہر آن پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ راہِ راست پر حرکت کرنا ضروری ہے تب انسان کو آخری خوشیاں اور جو انتہائی لذّتیں ہیں اور انتہائی خوشی ہے وہ ملتی ہے جس کا نام اِس دُنیا کی جنّت بھی رکھا گیا ہے اور جس کی آخری شکل اِس جہان سے گذرنے کے بعد دوسری زندگی کے اندر انسان کے سامنے آئے گی لیکن وہاں بھی صراطِ مستقیم کی منازل کی انتہا نہیں ہوگی۔ قرآن کریم نے بھی اور احادیث نے بھی قرآن کریم کی تفسیر کرتے ہوئے بڑی وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے یہ بات رکھی ہے کہ وہاں بھی اگرچہ امتحان نہیں ہوگا مگر عمل ہوگا۔ امتحان کا مطلب ہے کہ جہاں یہ خطرہ ہو کہ عمل درست بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی ہو سکتا ہے۔ عمل اللہ تعالیٰ کی رحمت کو حاصل بھی کر سکتا ہے یعنی عمل صالح بھی ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھی بھڑکا سکتا ہے یعنی عمل غیر صالح بھی ہو سکتا ہے۔

پس یہاں عمل ہے اور امتحان ہے اور دوسری زندگی میں عمل تو ہے (نکمّا پن نہیں کہ پوستیوں کی طرح افیم کھا کر بیٹھ گئے اور اونگھتے رہے) عمل ہے مگر امتحان نہیں۔ یہاں عمل ہے اور امتحان ہے۔

وہاں عمل ہے اور ترقیات کے دروازے کھلے ہیں۔ وہاں پیچھے ہٹنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے آگے ہی آگے بڑھنا ہے ہر روز زیادہ ترقیات ملتی ہیں اور ہر روز زیادہ عمل کی توفیق ملتی ہے۔ پس یہ شکل ہے ایک مومن کی زندگی کی۔ پھر دنیا میں اُس کے اعمال بھی یہی رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اور دوسری دُنیا میں بھی اُس کے اعمال یہی رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں انسان مومن صالح، خدا کا محبوب اور مقرب دو قسم کا عمل کرتا ہے۔ ایک عمل ہے اُس کا شکرادا کرنے کے لئے اور ایک عمل ہے مزید شکر کے سامان کے حصول کے لئے یعنی پہلے سے زیادہ ملے اور زیادہ وہ شکرادا کرے۔ ہمیں اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (البقرۃ:۲۰۲) کی دعا سکھائی کہ ہمیں ایسے اعمال کی توفیق عطا کر کہ اس دنیا کی حسنات بھی ہمیں ملیں (مثلاً درخت لگے ہوئے ہوں اور گرمی کم ہو۔ یہ دنیا کے حسنات میں سے ہے) اور ہمیں ایسے مقبول اعمال کی توفیق عطا کر کہ تیری جنتیں ہمیں یہاں سے جانے کے بعد حاصل ہوں۔ جنتوں کے ہم حقدار ٹھہریں وہاں جانے کے بعد ایک ہی زندگی ہے یہاں ہمارے سامنے دو زندگیاں ہیں۔ ایک اس دنیا کی زندگی اور ایک اُس دنیا کی زندگی اس لئے اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً ہمیں سکھایا لیکن اُس دنیا میں ایک ہی زندگی ہے یعنی جنت کی زندگی اور اس میں امتحان نہیں ہے لیکن ترقیات ہیں اس لئے وہ ایک ہی قسم کے اعمال ہیں۔ وہ اعمال شکر بھی ہیں اور مزید ترقیات کے حصول کے بھی ہیں یہاں فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً کی جو دعا ہے وہ شکر کے لئے ہے اور ناکامیوں سے بچنے کے لئے بھی ہے کہ جو تو نے دنیا کی نعمتوں کے حصول کے دروازے ہمارے لئے کھولے ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے اور ہمیں توفیق دے کہ ان پر تیرا شکرادا کر سکیں اور کبھی محروم نہ رہ جائیں۔ بہرحال یہ مومن کی زندگی کی تصویر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مومن جب حقیقی مومن بن جاتا ہے تو اس کا قدم آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ استقامت اور صراط مستقیم قریباً ایک مفہوم میں استعمال ہو جاتے ہیں۔ پس استقلال کے ساتھ اور استقامت کے ساتھ کام کرتے چلے جانا یہ مومن کی زندگی کی ایک نمایاں علامت ہے۔

(خطبات ناصر جلد پنجم صفحہ ۴۷۹ تا ۴۸۲)

اسلام ایک کامل مذہب ہے۔ اسلام نے ہمیں ایک کامل دعا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے الفاظ میں سکھائی ہے۔ دراصل جس طرح ایک نگینہ کسی زیور میں جڑا ہوتا ہے اسی طرح یہ دعا بہترین دعا کی

شکل میں سورۃ فاتحہ میں بیان کی گئی ہے۔

گو ساری سورۃ فاتحہ ہی ایک نہایت اعلیٰ رنگ کی دعا ہے لیکن اس میں دعا کے لحاظ سے ایک بنیادی نکتہ ہمیں یہ سوجھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو پیدا کیا ہے۔ انسان کو خَلق کیا اسے بہت سی قوتیں اور استعدادیں بخشیں اور اس کی زندگی کا یہ مقصد ٹھہرایا کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے حی و قیوم خدا کے ساتھ زندہ تعلق قائم کرے لیکن چونکہ اس تعلق کا پیدا ہونا اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے بغیر ممکن نہیں تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل اور رحمت سے سورۂ فاتحہ کی شکل میں ایک کامل دعا سکھادی تا کہ ہم اس دعا کے ذریعہ خدا کے فضلوں کو جذب کرتے ہوئے اپنے مقصد حیات کو حاصل کرسکیں۔

چنانچہ سورۃ فاتحہ کی اس آیہ کریمہ میں جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ اسی اصول کی رہنمائی کرتا ہے کہ میں نے جو کچھ بھی پیدا کیا ہے میری صفات کی جو تجلیات تمہیں اپنی زندگیوں اور اپنے ماحول میں نظر آتی ہیں اگر تم ان کا غور سے مشاہدہ کرو گے تو اس نتیجہ پر پہنچو گے کہ ہر شے کے حصول کے لئے ایک سیدھا اور مقررہ راستہ ہوتا ہے۔ وسائل ہوتے ہیں جن کے بغیر انسان کسی چیز کو حاصل نہیں کرسکتا سیدھی راہیں ہوتی ہیں جن پر چلے بغیر انسان منزل مقصود تک پہنچ نہیں سکتا۔

پس اگر یہ درست ہے اور یقیناً یہی درست ہے تو بنیادی دعا جو ایک انسان کو مانگنی چاہیے وہ یہی ہے کہ اے ہمارے خدا! ہمارا جو بھی نیک مقصد ہو اس کے حصول کے لئے جو سیدھی راہ ہے یعنی صراط مستقیم وہ ہمیں دکھا اور چونکہ انسان کی پیدائش کی اصل غرض خدا تعالیٰ سے ایک زندہ تعلق کو قائم کرنا ہے۔ اس لئے یہ دعا یوں بنے گی کہ اے ہمارے خدا! ہمیں وہ سیدھا راستہ دکھا جس پر چل کر ہم تجھ تک پہنچ سکیں اور تیرا قرب حاصل کرسکیں۔

غرض جب تک اللہ تعالیٰ وہ راہ نہ دکھائے جب تک انسان محنت اور کوشش اور مجاہدہ کے ذریعہ اور دعا اور تضرّع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کو جذب نہ کرے جس کے نتیجہ میں اسے سیدھی راہ دکھائی جاتی ہے اس وقت تک خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا اس کا مقرب بن جانا اس کا محبوب بن جانا ممکن ہی نہیں۔

پس جہاں تک مقصدِ حیات کا تعلق ہے یہ دعا کامل اور مکمل ہے لیکن یہیں بس نہیں بہت ساری ذیلی چیزیں ہیں جو حقیقتاً اسی مقصود کے حصول کے لئے ہیں مثلاً صحت کا قائم رہنا صحت کے قیام کے ساتھ اصل مقصد تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور پیار کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش اور

محنت کی جا سکے اور دعائیں کی جائیں۔

ایسی دعائیں جو بسمل کی طرح تڑپا دیتی اور خدا تعالیٰ کو پیاری ہیں ہمارے جسم اور ہماری روح کو اس مشقت کے برداشت کرنے کی توفیق ملے۔

چنانچہ قیام صحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ راہیں یعنی کچھ طریقے مقرر کئے ہیں۔ کچھ وسائل پیدا کئے ہیں ان راہوں کا علم حاصل کئے بغیر اور ان وسائل کے حصول کے بغیر ہم اپنی صحت کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ ہم وہ محنت اور کوشش وہ تضرّع اور دعا نہیں کر سکتے جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کا پیار حاصل ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی کے علاوہ دو قسم کے اور حقوق بھی ہوتے ہیں۔ ان کی ادائیگی بھی ضروری ہے ایک تو حقوق العباد ہیں اور دوسرے حقوق النفس ہیں جب تک یہ حقوق ادا نہ ہوں۔ انسان اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرنے میں اور اس کے پیار کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

پس ہر وہ چیز جو ہم نے حاصل کرنی ہے ہمارا جو بھی مقصود و مطلوب ہے اور جس کے حصول کے لئے ہم نے کوشش اور دعا کرنی ہے اس کے لئے پہلی اور بنیادی چیز یہی ہے کہ ہمیں صراط مستقیم مل جائے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے صراط مستقیم کو توحید کے حصول کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور بالکل سچی بات ہے اور ہماری عقل بھی اسے تسلیم کرتی ہے۔ چنانچہ آپ نے قریباً نو چیزوں سے توحید کا تعلق گنوایا ہے۔ یہ تو ایک لمبا مضمون ہے۔ اس وقت تو میں مختصراً چند باتیں کہنے پر اکتفا کروں گا۔

میں نے بتایا ہے کہ صراط مستقیم کا حصول اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے بغیر میسر نہیں آ سکتا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے اور اپنا مقصود پانے کے لئے ہمیں اپنی کوشش اور محنت، تضرّع اور دعا کو ذریعہ بنانا چاہیے۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس کے نتیجہ میں انسان کو اللہ تعالیٰ کا قرب ملتا اور انسان اس کے پیار اور اس کی رضا کو حاصل کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

اس زمانے میں ہم پر ایک اور بہت بڑی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم تمام بنی نوع انسان کو اس خدا کی طرف کھینچ کر لے آئیں جس نے ان کو پیدا کیا ہے گویا جماعت احمدیہ کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ تمام بنی نوع انسان کے دل میں اس بات کو جانشین کر دے کہ تمہاری زندگی کا وہ مقصد نہیں ہے جو تم سمجھتے ہو بلکہ تمہاری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف واپس لوٹو اور جس پیار کے

حصول کے لئے اس کی رحمت نے تمہیں پیدا کیا ہے اس پیار کے حصول کی کوشش کرو۔

(خطبات ناصر جلد پنجم صفحہ ۱۶۵ تا ۱۶۷)

اس سورۃ میں جو بڑے وسیع اور بڑے گہرے اور بڑے حسین مضامین اپنے اندر لئے ہوئے ہے اس میں ایک آیت یہ بھی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان کیا ہے کہ ہر چیز کے حصول کا ایک صحیح راستہ ہے اور اسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے بہت سے غلط راستوں پر بھی چلے جاتے ہیں مثلاً ایک موٹی مثال ہے ایک شخص اپنے اس علم کی وجہ سے اور اس تجربہ کی وجہ سے جو علم اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا اور جس تجربہ کے حصول کی اللہ تعالیٰ نے اسے توفیق دی تجارت میں مہارت حاصل کر چکا ہے اور وہ دولت کما رہا ہے وہ تمام تجارتی اصول سامنے رکھ کے تجارتی معاملات کرتا ہے اور پھر دعائیں کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو سنتا اور اس کی عقل اور فراست کو روشن رکھتا ہے اور سیدھا راستہ اس کو دکھا دیتا ہے اور بڑا مالدار ہو جاتا ہے ایک دوسرا شخص مالدار ہونے کے لئے چوری کرتا ہے اور دنیا میں مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ مبالغہ نہیں ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ پچاس فیصدی چور یقیناً ایسے ہیں جو پکڑے نہیں جاتے اور چوری کے مال سے وہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں تو وہ بھی ایک راستہ تھا مال کے حصول کا جو اختیار کیا گیا اور کامیابی سے اختیار کیا گیا بظاہر دنیا دار جو ہے وہ دنیوی نقطہ نگاہ سے جب دیکھتا ہے تو کہتا ہے یہ بھی مال دار ہے ایک شخص کہتا ہے کہ تم کہتے ہو سیدھا راستہ اختیار کرو اپنے ملک کی حالت دیکھو کتنے ہیں جنہوں نے بلیک مارکیٹنگ کے نتیجے میں اور بددیانتی کے نتیجہ میں مال کو جمع کر لیا ہے اور اب دنیا میں ان کی بڑی عزت ہے تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ سیدھے راستے سے اگر تم وہ چیز حاصل کرو گے جو کرنا چاہتے ہو دنیوی مال تو ایک نعمت ہے نا، دنیا میں ہزاروں نعمتیں ہیں اگر سیدھے راستے پہ چل کے تم اپنے مقصد کو حاصل کرو گے تو یہ تو ہوگا انعام اللہ کی طرف سے اور اگر غلط راستہ اختیار کرو گے تو وہ انعام نہیں ہوگا اس کے ساتھ سزا لگی ہوئی ہے اس دنیا میں بھی سزا ملتی ہے جب چور پکڑا جاتا ہے جب بددیانت پکڑا جاتا ہے جب بلیک مارکیٹ کرنے والا پکڑا جاتا ہے اور یہ گرفت کئی قسم کی ہوتی ہے کبھی اللہ تعالیٰ آسمان سے گرفت نازل کرتا ہے مثلاً بڑا مال کما لیا اور کھانا ہضم نہیں ہوتا کئی ایسے بھی ہم نے دیکھے ہیں بڑے امیر ہیں امارت پیسہ جو ہے مال جو ہے اس کا ایک خرچ یہ ہے کہ زبان کا چسکا جو ہے وہ پورا کیا جائے لیکن وہ شخص کھا ہی نہیں سکتا پیسے رکھے

ہوئے ہیں اس کے اِردگرد لوگ کھا رہے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ میں تو مصیبت میں پھنسا ہوں کھا ہی کچھ نہیں سکتا ہضم نہیں ہوتا بیمار ہو جاتا ہوں جب بھی کوئی ثقیل چیز کھا لوں پرہیزی کھانا کھا رہے ہیں لاکھوں روپیہ تجوری میں ہیں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے جسم میں، جلد میں ایسی بیماری پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اچھا کپڑا پہن نہیں سکتے اب وہ دھوتی پہنی ہوئی ہے پھر رہے ہیں پیسہ بڑا ہے دل کرتا ہے کہ پانچ سَو روپیہ گز والا کپڑا خرید کے سوٹ بنائیں لیکن وہ پہن ہی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ گئے ہیں ہزاروں مثالیں اس قسم کی دی جا سکتی ہیں بعض کو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ پکڑ لیتا ہے بعض کو اُخروی زندگی میں پکڑ لیتا ہے بعض کو میں اس لئے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تو مالک ہے کسی کو معاف کر دے تو یہ بھی اس کی شان میں ہے اس کی صفات کی شان کے عین مطابق ہوگا لیکن بعض کے متعلق یقیناً اس نے کہا ہے کہ میں گرفت کروں گا اس واسطے انسان کو مطمئن نہیں رہنا چاہیے تو یہاں یہ فرمایا کہ ہر چیز کے حصول کے لئے ایک سیدھی راہ ہے یا ایک سے زائد بھی بعض دفعہ ہو سکتی ہیں اگر زیادہ وسعت والا مضمون ہمارے ذہن میں ہو مثلاً قربِ الٰہی کے ایک سے زائد رستے ہیں مثلاً جنّت کے سات دروازے ہیں جن کا مطلب ہے سات راہیں جنّت کی طرف جا رہی ہیں لیکن اس دنیا میں عام طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اچھے مقاصد کے حصول کے لئے ایک سیدھی راہ ہے اس راہ پہ اگر انسان چلے تو اسے یہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ہر سیدھی راہ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کا انعام اس کا منتظر ہوتا ہے اگر وہ سیدھی راہ پر نہیں چلتا تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اس کا انتظار کر رہی ہو کیونکہ مغفرت کے اوپر انسان کی تو کوئی اجارہ داری نہیں ہے نا لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کا عذاب، اس کا قہر، اس کا غضب، اس کا انتظار کر رہا ہو اس کو وعدہ یہ نہیں ہے کہ تمہیں انعام ملے گا انعام مل جائے تو اور چیز ہے .... کیونکہ اس سورۃ میں اس نے اپنی صفت مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بیان فرمائی ہے کہ مالک کی حیثیت سے وہ انسان سے معاملہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا ان سے تو یہ کوئی وعدہ نہیں بلکہ وعید بڑا ہے کہ غلط راہوں کو اختیار کرو گے تو عام قانون سزا کا ہے استثنائی طور پر معافی کا ہے ٹھیک ہے مالک ہے معاف کر دے لیکن اس نے ہمیں وعید یہ دیا ہے ہمیں کہا یہ ہے کہ اگر تم غلط راہوں کو اختیار کرو گے۔ غلط نتائج نکلیں گے .... تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اچھے مقاصد کے حصول کے لئے کچھ نیک راہیں معین کی گئی ہیں ان راہوں پہ چلو تو کیا دیکھو گے آگے تمہیں کیا انعام

ملے گا خالی یہ نہیں کہا انعام ملے گا ان لوگوں کا انعام ملے گا جو تم سے پہلے گزرے جنہوں نے ہم سے انعام حاصل کئے اور تمہیں پتہ ہے کہ کس قسم کے انہوں نے انعام حاصل کئے، انبیاء ہیں، صدیق ہیں، شہید ہیں، صالح ہیں انہوں نے اس دنیا میں بھی انعام حاصل کئے تم نہیں یہ کہہ سکتے کہ جو مثال ہمارے سامنے رکھی جارہی ہے وہ ہم سمجھ نہیں سکتے کیونکہ ان انعاموں کا جن کا ذکر کیا جارہا ہے دوسری زندگی میں ملنا ثابت ہے ان لوگوں کو اس دنیا میں بھی انعام ملا دنیا نے ان کو بے عزت کرنا چاہا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بے عزت نہیں ہونے دیا ہر قسم کی عزت ان کو عطا کی سب سے زیادہ عزت تو اللہ تعالیٰ کی آنکھ میں رضا کی چمک جب بندہ دیکھ لیتا ہے تو اس سے زیادہ اس کو کسی اور عزت کی ضرورت ہی نہیں رہتی، انبیاء ہیں ساری دنیا مخالفت کرتی ہے ایک شخص کھڑا ہوتا ہے خدا کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ سامنے ہوتا ہے کہ ساری دنیا نے میری مخالفت کرنی ہے اس کو پتہ ہوتا ہے کہ دنیوی سامان میرے پاس نہیں ہیں کتنا بڑا توکّل کا مقام ہے جو اسے حاصل ہوتا ہے ساری دنیا پر اپنے ربّ کو وہ ترجیح دیتا ہے اس پر وہ توکّل رکھتا ہے پھر دنیا اپنا زور لگا لیتی ہے لیکن اس شخص کو بے عزّت اور ناکام نہیں کرسکتی بے عزّتی تو ناکامی ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب دعویٰ کیا کوئی بھی ساتھ نہیں تھا۔ آدمی برداشت نہیں کرسکتا اس زمانے کے حالات جب اپنے ذہن میں لاتا ہے آپ نے خود نثر اور نظم اردو اور عربی میں لکھا ہے کہ گھر والے پرواہ نہیں کرتے تھے وہ جو برابر کا شریک تھا اس کو اپنے دستر خوان کے ٹکڑے بھیج دیتے تھے یہ عزت اس خدا کے برگزیدہ کی تھی اپنے خاندان کے دل میں۔ لیکن خدا نے جو وعدے دیئے وہ پورے کئے آپؑ نے فرمایا اپنے زمانہ میں کہ کبھی تو دستر خوان کے ٹکڑے مجھے ملتے تھے اب ہزاروں خاندان ہیں جو میری وجہ سے پل رہے ہیں انہیں روٹی مل رہی ہے۔ (خطبات ناصر جلد دوم صفحہ ۱۹۱ تا ۱۹۶)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تفسیر سورۃ البقرۃ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آیت ۱ تا ۱۷ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾

الٓمّٓ ﴿۲﴾ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ۚۛ فِیْہِ ۚۛ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۳﴾ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ
بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴿۴﴾ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ
اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ﴿۵﴾ اُولٰٓئِکَ عَلٰی
ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ ٭ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ
عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۷﴾ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ
وَ عَلٰی سَمْعِھِمْ ؕ وَ عَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ ۫ وَّ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۸﴾
وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۹﴾
یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَ مَا
یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰﴾ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ۚ وَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۬ۙ
بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَ اِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا
نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ اِذَا
قِیْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ کَمَآ اٰمَنَ السُّفَھَآءُ ؕ اَلَآ
اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ وَ لٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ

وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۵ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۶ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۱۷

قرآن کریم نے دعویٰ کیا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ یہ قرآن ایک کامل اور مکمل شریعت ہے اور اس دعویٰ کے دلائل قرآن کریم نے یہ دیئے کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ - رَيْبَ کے چار معنی جو یہاں چسپاں ہوتے ہیں ان کی رو سے یہاں ہمارے سامنے چار دلائل بیان کئے گئے ہیں اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ واقعہ میں یہ قرآن، یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل کامل اور اکمل اور اتم ہے۔

رَيْبَ کے ایک معنی کی رو سے قرآن کریم کی تعریف یہ نکلتی ہے کہ انسان کی روحانی اور جسمانی اور معاشرتی اور اخلاقی اور اقتصادی اور سیاسی ضرورتوں کو پورا کرنے والی صرف یہی ایک کامل کتاب ہے اور یہی ایک کامل کتاب ہے جو فطرت انسانی کے سب حقیقی تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ کیونکہ یہ اپنے ذاتی کمالات اور فضائل اور بے نظیر تعلیمات کے ساتھ اپنی ضرورت اور صداقت کو ثابت کرتی ہے۔ اگر میں اس دلیل کو پھر ایک دعویٰ قرار دے کر اس کے دلائل بیان کرنے لگوں تو اس ایک دلیل پر ہی بڑا وقت خرچ ہو جاتا ہے قرآن کریم کو ایک حد تک سمجھنے والے بھی یہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کے دلائل اور فضائل اور بے نظیر تعلیمات اس قسم کی ہیں کہ جو تمام پہلی کتب پر اس کو افضل ثابت کرتی ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جب بنی اسرائیل کی الہامی کتب کے متعلق یہ سوال کیا گیا کہ ان کے ہوتے ہوئے قرآن کریم کی کیا ضرورت تھی؟ تو آپ نے یہ جواب دیا کہ سارے قرآن کریم کا نام نہ لو وہ تو بہت وسیع کتاب ہے بڑے بڑے علوم اس کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اس کے شروع میں سورۂ فاتحہ ہے اور سورۂ فاتحہ میں جو معارف اور حقانی دلائل بیان ہوئے ہیں ان معارف اور دلائل کے مقابلہ پر اپنی تمام روحانی کتب سے اگر تم وہ دلائل اور معارف نکال کر دکھا دو تو ہم سمجھیں گے کہ تمہاری کتابیں قرآن کریم کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اس دعوتِ مقابلہ پر ایک لمبا زمانہ گذر چکا ہے اور کیتھولک ازم میں کئی پوپ یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے اور کیتھولک چرچ کی سربراہی

انہیں حاصل ہوئی۔ اسی طرح دوسرے فرقے تھے عیسائیوں کے ان میں سے کسی ایک کے سربراہ کو بھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ سورۂ فاتحہ کے مقابلہ میں اپنی کتب سماوی سے اس قسم کے دلائل نکال کر پیش کر سکے۔ جن کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دعویٰ تھا کہ ہم اس سورۃ سے نکال کر تمہارے سامنے رکھیں گے۔

پس لَا رَیۡبَ فِیۡہِ کے ایک معنی یہ ہیں کہ وہ کتاب جو اپنے ذاتی کمالات اور فضائل اور بے نظیر تعلیمات کے ساتھ اپنی ضرورت اور صداقت کو ثابت کر سکتی ہے اور جب آپ سے سوال کیا گیا کہ قرآنِ کریم کی ضرورت کیا ہے تو اس کا جو جواب دیا گیا اور اس جواب میں جس دعوت فیصلہ کی طرف بلایا گیا اس کو آج تک عیسائی فرقوں کے سربراہوں نے قبول نہیں کیا اور اس سے واضح طور پر ثابت ہوا کہ وہ سورۂ فاتحہ کے مضامین کے مقابلہ میں اپنی کتب سماوی کے مضامین کو پیش نہیں کر سکتے۔

اَلۡکِتٰبُ کامل کتاب ہونے کی دوسری دلیل لَا رَیۡبَ فِیۡہِ میں اللہ تعالیٰ نے یہ دی ہے کہ قرآنی تعلیم انسان کو ظن اور گمان کے بے آب و گیاہ ویرانوں سے اٹھا کر دلائل اور آیات بیّنات کے ساتھ یقین کی رفعتوں تک پہنچاتی ہے اور یہ خوبی ہمیشہ اس میں قائم رہے گی۔ کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے محفوظ کیا ہوا ہے۔ رَیۡبَ کے ایک معنی کے لحاظ سے یہ مفہوم بھی پایا جاتا ہے کہ یہ کتاب خدا تعالیٰ کی حفاظت میں ہے۔ شیطانی دجل اس میں راہ نہیں پا سکتا۔ اس لئے اس کا جو اثر انسان کی روح پر آج پڑ رہا ہے وہی اثر اس کا قیامت تک انسان کی روح پر پڑتا چلا جائے گا۔ اس لئے یہ اَلۡکِتٰبُ ایک کامل کتاب ہے۔ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ کوئی ایسی ہدایت اور صداقت جو ایک کامل کتاب میں ہونی چاہیے وہ اس سے باہر نہیں رہی اس کے متعلق بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے متعدد مقامات پر غیر ادیان کو فیصلہ کی طرف بلایا ہے۔ مثلاً آپؑ نے فرمایا کہ ہستی باری تعالیٰ کے متعلق کوئی ایسی سچی اور حقیقی دلیل تم اپنی کتابوں سے نکال کر دکھا دو جو میں قرآن کریم سے نکال کر نہ دکھا سکوں۔ پس ہر وہ صداقت جس کا کوئی دوسری کتاب دعویٰ کر سکتی ہے وہ اس کے اندر پائی جاتی ہے اور بہت سی ایسی صداقتیں بھی اس میں پائی جاتی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں پائی جاتیں اس لئے یہ کتاب ایک کامل کتاب ہے۔

لَا رَیْبَ فِیْہِ کے چوتھے معنی کی رو سے یہاں یہ دلیل دی گئی ہے کہ اس پر عمل کر کے تو دیکھو تم ہر قسم کے مصائب اور آفات سے محفوظ ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جاؤ گے پھر دنیا کا کوئی دجل یا دنیا کی کوئی طاقت یا دنیا کی کوئی سازش تمہارا حقیقی اور واقعی نقصان نہیں کر سکتی۔ نقصان تو اس وقت ہوتا ہے جب کوئی چیز حقیقتاً ضائع ہو جائے لیکن اگر کسی کے پانچ روپے گم ہو جائیں اور اس کا والد اس کو کہے کہ پانچ روپے تو تمہارے پانچ روپے کے بدلہ میں مَیں دیتا ہوں اور یہ دس روپے اس تشویش کے بدلہ میں ہیں جو تم کو اُٹھانی پڑی ہے اور اس طرح اسے پندرہ روپے مل جائیں تو دنیا کا کوئی عقلمند یہ نہیں کہے گا کہ اس کا پانچ روپے کا نقصان ہوا ہے جبکہ اس کے بدلہ میں اس کو پندرہ روپے مل گئے ہوں۔

پس اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ دعویٰ کیا کہ تم اس پر عمل کر کے کسی نقصان یا مصیبت میں نہیں پڑو گے۔ یہ نہیں کہا کہ تمہیں کوئی دکھ نہیں دے سکے گا کیونکہ ایک مومن کو خدا تعالیٰ کی راہ میں قربانیاں دینی پڑتی ہیں لیکن حقیقی مومن اس چیز کو جسے دنیا تکلیف سمجھتی ہے اپنے لئے راحت سمجھتا ہے اور اس کا خدا اور اس کا ربّ اور وہ جو اس کا مالک ہے اور جس کی خاطر وہ یہ تکالیف برداشت کر رہا ہوتا ہے اس کے سرور کے، اس کی مسرت کے اور اس کے آرام کے ایسے سامان پیدا کر دیتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ دکھ دینے والے نے مجھے تھوڑا دکھ دیا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ اگر وہ اس سے زیادہ دکھ دیتا تو میرے ربّ کا مجھے اس سے بھی زیادہ پیار حاصل ہو جاتا۔ تو چونکہ یہ ایسی کتاب ہے جس پر عمل کرنے والا حقیقی مومن کبھی بھی گھاٹے میں نہیں رہتا اور اس کے مقابلہ میں جو دوسری کتب ہیں ان کا یہ حال نہیں اس لئے یہ ثابت ہوا کہ یہی کتاب اَلْکِتٰبُ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ نسآء میں فرمایا کہ

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّكُمْ ۔(النسآء:۱۷۱)

اے تمام بنی نوع انسان سنو کہ ایک کامل رسول کامل صداقت لے کر تمہارے ربّ کی طرف سے تمہارے پاس پہنچ چکا ہے۔ تمہارا ربّ جس نے تمہیں ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا تھا نشوونما اور ارتقاء کے مختلف مدارج میں سے تمہیں گزارتا ہوا وہ اس مقام پر تمہیں لے آیا ہے کہ اپنی کامل جنتوں میں تمہیں داخل کرے۔ سن لو کہ یہ رسول آ گیا فَاٰمِنُوْا جو وہ کہتا ہے اس پر ایمان لاؤ زبان سے بھی، دل سے بھی اور اپنے جوارح سے بھی تم اسے مانو اور اس کی تعلیم پر عمل کرو۔ اگر تم اس کامل رسول پر ایمان لاؤ گے اور جو اکمل شریعت ہے اس کے مطابق تم اپنی زندگیاں گزارو گے تو تم خیر اُمّت بن جاؤ

گے اور جب تم خیر اُمّت بنو گے اور صرف اس وقت جب تم خیر اُمّت بنو گے تو تم اس قابل ہو گے کہ تمام بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچا سکو تمہارے ذریعہ سے تمام اقوام اور ہر زمانہ کے لوگ دینی اور دنیوی فوائد حاصل کریں گے۔ (خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۶۴۹ تا ۶۵۲)

ایک کامل اور مکمل ہدایت نامہ جس کے بغیر ہم حقیقی معنی میں نہ دنیوی ارتقائی منازل طے کر سکتے ہیں نہ روحانی بلندیوں تک پہنچ سکتے ہیں وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جا رہا ہے۔ اَلْكِتٰبُ اور لَا رَيْبَ فِيْهِ اس کی صفات ہیں لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ایک ہدایت نامہ نہایت حسین تعلیم ایک ایسی شریعت جو زمین کی پستیوں سے اُٹھا کر آسمانوں کی بلندیوں تک پہنچانے والی ہے تمہارے ہاتھ میں دی جا رہی ہے لیکن یہ نہ بھولنا کہ یہ شریعت صرف ان لوگوں کو کامیابی تک پہنچانے والی ہے جو مضبوطی کے ساتھ تقویٰ کو اختیار کرتے ہیں اگر کوئی شخص بڑی نمازیں پڑھنے والا ہو، اگر کوئی شخص بظاہر اپنے مال کو مستحقین میں بڑا ہی خرچ کرنے والا ہو، اگر کسی شخص (کی) زبان نہایت ہی میٹھی ہو، اگر کوئی بظاہر انتہائی ہمدردی اور خیر خواہی کرنے والا ہو لیکن اگر اس کے یہ اعمال تقویٰ کی بنیادوں پر قائم نہیں کئے جاتے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور قبول نہیں ہو سکتے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ مکمل ہدایت نامہ ہے پوری طرح اس پر عمل کر کے بھی اگر تقویٰ سے خالی ہو کامیابی کو تم نہیں پا سکتے کامیابی کو وہی پائیں گے جو تقویٰ کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے اسلامی احکام کی پابندی کریں گے۔

دوسری جگہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (المائدۃ:۲۸) جو شخص تقویٰ کی باریک راہوں کو اختیار کرے گا اس کے اعمال قبولیت کا درجہ حاصل کریں گے ورنہ وہ ردّ کر دیئے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان پر کسی ثواب کا فیصلہ نہیں کرے گا تو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہی لوگ اس ہدایت سے فائدہ اٹھائیں گے اور اٹھانے والے ہوں گے جو اتقاء کی صفت میں استحکام اختیار کریں گے جن کا تقویٰ بڑی مضبوط بنیادوں کے اوپر قائم ہوگا ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو قبول نہیں کرے گا۔ تقویٰ بھی جیسا کہ ہر دوسری چیز اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہی حاصل ہو سکتا ہے جیسا کہ سورۂ فتح:۲۷ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى کے تقویٰ کے طریق پر ان کے قدم کو خود اس نے مضبوط کر دیا ہے۔ انسان اپنی کوشش سے اور

اپنی جدو جہد سے تقویٰ کی راہوں پر مضبوطی سے قدم نہیں مار سکتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تقویٰ کے یہ معنی کئے ہیں۔ آپ ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم میں فرماتے ہیں

’’اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان خدا کی تمام امانتوں اور ایمانی عہد اور ایسا ہی مخلوق کی تمام امانتوں اور عہد کی حتی الوسع رعایت رکھے یعنی ان کے دقیق در دقیق پہلوؤں پر تا بمقدور کار بند ہو جائے‘‘۔ (براہین احمدیہ جلد پنجم روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۱۰)

قرآن کریم نے تقویٰ کے اس معنی کو مختلف مقامات پر بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ۔ (الحجرات :۸) یہاں بھی تقویٰ کے معنی ایک نہایت حسین پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے اپنے فضل سے ایمان کی محبت تمہارے دلوں میں پیدا کی وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ اور تمہارے دلوں کو اس نے اپنے فضل سے اس حقیقت تک پہنچا دیا کہ حقیقی روحانی خوبصورتی تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں اور نہ روحانی بدصورتی سے تقویٰ کے بغیر بچا جا سکتا ہے۔

تو ایک طرف تقویٰ ہر حکم الٰہی کی بجا آوری میں بشاشت پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف ہر اس چیز سے نفرت پیدا کرتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باہر نکالنے والی اور اس کی ناراضگی کو مول لینے والی ہو۔ یہاں تقویٰ کے متعلق ہی ایک لطیف مضمون بیان ہوا ہے جس کی تفصیل میں تو میں اس وقت نہیں جاؤں گا بہر حال یہ اشارہ کافی ہے۔ اسی وجہ سے سورۃ ’’بقرۃ‘‘ کے شروع میں ہی فرمایا تھا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اور سورہ بقرہ میں ایک دوسری جگہ آگے جا کے آیت ۱۹۰ میں یہ فرمایا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى۔ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ کامل نیک وہ ہے جو تقویٰ کی تمام راہوں کو اختیار کرتا ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اَلْبِرَّ کامل نیک وہ شخص نہیں جو اپنے اوقات کو نمازوں میں زیادہ خرچ کرتا ہے اپنے اموال کو خدا کی مخلوق کی محبت میں اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے خرچ کرتا ہے یا حج کرتا ہے یا رمضان کے روزے رکھتا ہے بلکہ کامل نیک وہ ہے جو تقویٰ کی راہوں کا خیال رکھتا ہے جو شخص تقویٰ کی راہوں کا خیال رکھتا ہے باقی اعمال صالحہ یا اقوال پاکیزہ جو ہیں وہ اسی طرح اس سے نکلتے ہیں جس طرح ایک جڑ سے کسی درخت کی شاخیں نکلتی ہیں جس کی مثال دی گئی ہے تقویٰ کے سلسلہ میں

ہی اور اس کے متعلق آگے جا کر میں کچھ بیان کروں گا۔

پس یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کامل نیک (اَلْبِرَّ) وہ ہے جو تقویٰ کی تمام راہوں پر گامزن ہے اور فرمایا وَ اتَّقُوا اللّٰہَ کہ بنیادی حکم تمہیں یہ دیا جاتا ہے کہ تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے تو تمام نیکیاں بھی بجالاؤ گے اور تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ ایسی کامیابی کہ جس کی نظیر دنیا میں نہیں، تقویٰ کے بغیر تم نہیں پا سکتے۔ حقیقت یہی ہے کہ جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایام الصلح میں فرمایا ہے۔

''تقویٰ ہر ایک بدی سے بچنے کے لئے قوت بخشتی ہے اور ہر ایک نیکی کی طرف دوڑنے کے لئے حرکت دیتی ہے''۔ (ایام الصلح روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۳۴۲)

اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ فرمایا کہ جب تک انسان تقویٰ کی راہوں کو اختیار نہ کرے روح کے ان خواص اور قویٰ کی پرورش کا سامان اس کو قرآن شریف سے نہیں مل سکتا جس کو پا کر روح میں ایک لذت اور تسلی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی وہی مضمون ہے جو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ میں بیان کیا گیا ہے کہ تقویٰ کے بغیر روح کے ان خواص اور قویٰ کی پرورش کا سامان اس کو قرآن شریف سے نہیں مل سکتا حالانکہ قرآن کریم تو وہاں موجود ہے جس کو پا کر روح میں ایک لذت اور تسلی پیدا ہوتی ہے۔ اس مضمون کو کہ تقویٰ کا تعلّق تمام ہی نیکیوں سے ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ''تقویٰ ہر ایک ..... قسم کے فتنہ سے محفوظ رہنے کے لئے حصن حصین ہے''۔ (ایام الصلح روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۳۴۲)

تقویٰ ایک ایسا قلعہ ہے کہ جب اس کے اندر نیک اقوال اور صالح اعمال داخل ہو جائیں تو وہ شیطان کے ہر حملہ سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی عمل بظاہر کتنا ہی پاکیزہ اور صالح کیوں نظر نہ آتا ہو اگر وہ اس قلعہ میں داخل نہیں تو شیطان کی زد میں ہے، کسی وقت وہ اس پر کامیاب حملہ کر سکتا ہے کیونکہ اگر تقویٰ نہیں تو کبر پیدا ہو سکتا ہے، ریاء پیدا ہو سکتا ہے، عُجب پیدا ہو سکتا ہے اگر تقویٰ ہے تو ان میں سے کوئی بدی پیدا نہیں ہو سکتی یعنی شیطان کامیاب وار نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ قرآن کریم میں یہ مضمون بیان فرمایا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ابھی جو فقرہ میں نے پڑھا ہے وہ معنوی لحاظ سے اسی کا ترجمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ دخان : ۵۲ میں

فرماتا ہے: اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ کہ متقی یقیناً ایک امن والے اور محفوظ مقام میں ہیں تو یہی وہ حصن حصین ہے۔ یہی ''امین'' کے معنی ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کئے ہیں کہ محفوظ اور امن میں وہی ہے جو تقویٰ پر مضبوطی سے قائم ہوتا ہے جو تقویٰ پر قائم نہیں وہ امن میں نہیں وہ خطرہ میں ہے وہ حفاظت میں نہیں خوف کی حالت میں ہے اور ایسا شخص مقام امین میں نہیں ہے بلکہ اس مقام پر ہے جسے دوسرے لفظوں میں جہنم کہا جاتا ہے۔ پس قرآن کریم نے ہی تقویٰ کے معنوں کو بیان کرتے ہوئے معنوی لحاظ سے حصن حصین کا تخیل پیش کیا ہے کہ سوائے تقویٰ کی راہوں پر چل کر کوئی شخص امن میں نہیں رہ سکتا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے اس مضبوط قلعہ میں داخلہ ہونے کا سوائے تقویٰ کے دروازے کے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی مضمون کو ایک دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے۔

ہر اک نیکی کی جڑ یہ اتقاء ہے

ہر نیکی خواہ وہ قولی ہو یا فعلی وہ تقویٰ کی جڑ سے نکلتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو سینکڑوں احکام دیئے ہیں جب ہم ان پر عمل کرتے ہیں اور اس رنگ میں عمل کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جنّت میں داخل ہونے کا ذریعہ بنیں اور اللہ تعالیٰ کی جنّت کے درختوں کی شاخیں ہو جائیں اور ان درختوں کے لئے پانی کا کام دیں تو یہ اسی وقت ہوتا ہے جب یہ شاخیں تقویٰ کی جڑ سے نکلیں......

پس ہر ایک نیکی کی جڑ یہ اتقاء ہے۔ جو شخص تقویٰ کی جڑ تو نہیں رکھتا لیکن بظاہر ہزار قسم کی نیکیاں بجا لاتا ہے اسے فائدہ ہی کیا کیونکہ اس سے وہ شاخیں نہیں پھوٹ سکتیں جو خدائے رحمٰن تک پہنچتی ہیں نہ وہ پھل لگ سکتے ہیں جو پھل کہ دوسری صورت میں ان شاخوں کو لگا کرتے ہیں اور روحانی سیری کا موجب بنتے ہیں۔ اس مضمون کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کریم کی تفسیر کرتے ہوئے ایک دوسری جگہ یوں بیان فرمایا ہے کہ

''حقیقی تقویٰ اپنے ساتھ ایک نور رکھتی ہے''۔

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۷۷)

ہر وہ پاک اعتقاد یا عمل صالح جو نور کے ہالہ میں لپٹا ہوا نہیں وہ ردّ ہونے کے قابل ہے اور ردّ کر دیا جاتا ہے لیکن جب انسان کا قول اور فعل تقویٰ کے نور کے ہالہ میں لپٹا ہو تو اللہ تعالیٰ کو

وہ بڑا ہی پیارا اور محبوب ہوتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی تشریح بھی کی ہے آپؑ ہی کے الفاظ میں اس مضمون سے متعلق ایک چھوٹا سا اقتباس میں نے لیا ہے جو یہاں بیان کرتا ہوں آئینہ کمالات اسلام میں ہی آپؑ فرماتے ہیں:

اللہ جل شانہ فرماتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ یُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ (الانفال:۳۰) وَ یَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ (الحدید:۲۹) یعنی اے ایمان لانے والو! اگر تم متقی ہونے پر ثابت قدم رہو اور اللہ تعالیٰ کے لئے اتقاء کی صفت میں قیام اور استحکام اختیار کرو تو خدا تعالیٰ تم میں اور تمہارے غیروں میں فرق رکھ دے گا (ایک فرقان تمہیں عطا کرے گا) وہ فرق یہ ہے کہ تم کو ایک نور دیا جائے گا جس نور کے ساتھ تم اپنی تمام راہوں میں چلو گے یعنی وہ نور تمہارے تمام افعال اور اقوال اور قویٰ اور حواس میں آجائے گا تمہاری عقل میں بھی نور ہوگا اور تمہاری ایک اٹکل کی بات میں بھی نور ہوگا اور تمہاری آنکھوں میں نور ہوگا اور تمہارے کانوں اور تمہاری زبانوں اور تمہارے بیانوں اور تمہاری ہر ایک حرکت اور سکون میں نور ہوگا اور جن راہوں پر تم چلو گے وہ راہ نورانی ہو جائیں گی۔ غرض جتنی تمہاری راہیں، تمہارے قویٰ کی راہیں تمہارے حواس کی راہیں ہیں وہ سب نور سے بھر جائیں گی اور تم سراپا نور میں ہی چلو گے''۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۱۷۷، ۱۷۸)

تو اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ یُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ یہ اسی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے فرمایا ہے کہ ہر وہ عمل جو تقویٰ کی جڑ سے نہیں نکلا، جو تقویٰ کے قلعہ میں محفوظ نہیں، جو تقویٰ کے نور کے ہالہ میں روحانی زینت نہیں رکھتا وہ ردّ کر دیا جاتا ہے اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ تقویٰ عطا کرتا ہے اس کی ساری زندگی کو، اس کے سارے افعال کو، اس کے سارے اقوال کو اس کی ساری حرکات اور سکنات کو وہ نور عطا کرتا ہے جس نور سے ایسا متقی غیروں سے علیحدہ ہوتا اور ایک خصوصیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی مضمون کو ایک اور رنگ میں بھی بیان فرمایا ہے آپؑ فرماتے ہیں کہ روحانی خوبصورتی اور روحانی زینت تقویٰ سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ دراصل روحانی

خوبصورتی نام ہے (اور خوبصورت سے ہماری مراد ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں خوبصورت ہو) خوبصورت افعال اور خوبصورت اعمال کا یعنی جب تک ہمارے اقوال اور ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں روحانی خوبصورتی پانے والے نہ ہوں دعویٰ خواہ کوئی انسان کتنا ہی کرتا رہے وہ خوبصورت نہیں ہوا کرتے۔

قرآن کریم نے جو یہ فرمایا یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف:۳۲) تو یہاں بھی اسی طرف ہمیں متوجہ کیا گیا ہے۔ مسجد تذلل اور عبادت کے مقام کو کہتے ہیں اور زِیْنَۃٌ سے یہاں مراد دل کی صفائی اور پاکیزگی اور دل کا تقویٰ ہے اللہ تعالیٰ نے یہاں حکم دیا ہے کہ جب بھی میرے حضور تذلل سے جھکنا چاہو اور میری اطاعت اور میری عبادت کرنا چاہو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے تم اپنے دلوں کو پاکیزہ کرو اور تقویٰ کی راہوں کو اختیار کرتے ہوئے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ضمیمہ براہین احمدیہ (حصہ) پنجم میں فرماتے ہیں۔

”انسان کی تمام روحانی خوبصورتی تقویٰ کی تمام باریک راہوں پر قدم مارنا ہے تقویٰ کی باریک راہیں، روحانی خوبصورتی کے لطیف نقوش اور خوشنما خط و خال ہیں اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی امانتوں اور ایمانی عہدوں کی حتی الوسع رعایت کرنا اور سر سے پیر تک جتنے قویٰ اور اعضا ہیں جن میں ظاہری طور پر آنکھیں اور کان اور ہاتھ اور پیر اور دوسرے اعضاء ہیں باطنی طور پر دل اور دوسری قوتیں اور اخلاق ہیں، ان کو جہاں تک طاقت ہو ٹھیک ٹھیک محل ضرورت پر استعمال کرنا اور ناجائز مواضع سے روکنا اور ان کے پوشیدہ حملوں سے متنبہ رہنا اور اسی کے مقابل پر حقوق العباد کا بھی لحاظ رکھنا یہ وہ طریق ہے کہ انسان کی تمام روحانی خوبصورتی اس سے وابستہ ہے اور خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں تقویٰ کو لباس کے نام سے موسوم کیا ہے چنانچہ لِبَاسُ التَّقْوٰی قرآن شریف کا لفظ ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ روحانی خوبصورتی اور روحانی زینت تقویٰ سے ہی پیدا ہوتی ہے“۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم، روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۲۰۹، ۲۱۰)

تو تقویٰ ایک ایسا حکم ہے جس کا براہ راست اور نہایت ہی گہرا اور ضروری تعلّق تمام دوسرے احکام سے ہے، خواہ وہ احکام ہمارے اقوال سے تعلق رکھتے ہوں یا اعتقادات سے تعلق رکھتے ہوں یا اعمال سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ وہ احکام مثبت ہوں کہ کرنے کا حکم دیا گیا ہو، خواہ وہ احکام منفی ہوں

کہ بُرائیوں سے روکا گیا ہو۔ ہر حکم کی بجا آوری اس رنگ میں کہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں ہمارا وہ فعل مقبول اور محبوب ہو جائے ممکن نہیں جب تک تقویٰ کی بنیاد پر اس کی عمارت نہ ہو، جب تک تقویٰ کی جڑ سے اس کی شاخیں نہ پھوٹیں، جب تک تقویٰ کے نور کے ہالہ میں وہ لپٹا ہوا نہ ہو، جب تک تقویٰ کی روحانی زینت اسے خوبصورت نہ کر رہی ہو ہمارے ربّ کی نگاہ میں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تقویٰ پر دوسرے احکام کے مقابلہ میں بہت ہی زور دیا ہے اور اس لئے بھی زور دیا ہے کہ اس حکم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ خود کو بڑا ابزرگ سمجھنے یا کہنے لگ جاتے ہیں یا کسی دوسرے کو بڑا ابزرگ سمجھنے یا کہنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ اس بنیادی حقیقت کے مدِّنظر ہی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ حکم دیا ہے کہ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النّجم: ۳۳) جب تقویٰ کا تعلّق دل سے ہے، جب تقویٰ کا تعلق نیّت سے ہے، جب تقویٰ کا تعلّق اس پوشیدہ تعلّق سے ہے جو ایک بندے کا خدا سے ہوتا ہے تو پھر بندوں کو تو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ خود فیصلہ کریں اور حَکَمْ بنیں۔ یہ کام اللہ تعالیٰ کا ہے هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى انسان کو عاجزانہ راہوں کو اختیار کرتے ہوئے بنیادی فضل اللہ تعالیٰ سے یہ چاہنا چاہیے کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں تقویٰ دے، اے ہمارے ربّ! ہمیں تقویٰ اختیار کرنے کی طاقت اور استعداد دے، اے ہمارے ربّ، ہمارے اعمال کو تقویٰ کے قلعہ میں محفوظ کر لے۔ اے ہمارے ربّ! ہمارے اعمال کو تقویٰ کے نور میں لے لے اور منور کر دے اور اے ہمارے ربّ! تقویٰ کی روحانی خوبصورتی ہمارے اعمال پر چڑھا وہ تجھے مقبول ہو جائیں اور تو ہم سے راضی ہو جائے۔

(خطبات ناصر جلد دوم صفحہ ۶۴ تا ۷۲)

سورۂ بقرہ میں پہلے قرآن کریم کو ایک عظیم، ایک کامل، ایک مکمل کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے رکھا اور یہ اعلان کیا کہ یہ عظیم کتاب ہر قسم کے شکوک وشبہات اور نقائص سے مبرا اور پاک ہے اور اس کے بعد اُمّت مسلمہ کو بیدار اور چوکس کیا یہ کہہ کر کہ تم کو ہر وقت تین محاذوں پر، تین فرنٹیرز پر ہوشیاری کے ساتھ شیطان کے حملوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور اس کے لئے تمہیں ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

ایک محاذ جس کی طرف ہمیں متوجہ کیا وہ اندرونی محاذ ہے تربیت کا محاذ تربیت کے محاذ کے دو پہلو ہیں۔ ایک تربیت یافتہ کو تربیت کے اعلیٰ مقام پر قائم رکھنے کی کوشش کرنا اور یہ کوشش کرنا کہ وہ مزید

ترقیات روحانی راہوں پر کرتا چلا جائے۔ تربیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ جو اُمّت مسلمہ میں نئے نئے شامل ہوں بیعت کر کے یا ولادت کے نتیجہ میں، ان کو اسلام کے رنگ میں صحیح طور پر رنگنا اور سچا مسلمان بنانے کی کوشش کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کتاب هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے اس میں اس طرف اشارہ کیا کہ تقویٰ کے بلند مقام پر پہنچنے کے باوجود انسان کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی ضرورت رہتی ہے اور اس ضرورت کو یہ قرآن پورا کر رہا ہے۔ متقیوں کے لئے ہدایت کا سامان اس کے اندر پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مضمون کو دعائیہ الفاظ میں دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے کہ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا (اٰلِ عمران: ۹) کہ ہدایت تیرے فضل سے ہمیں حاصل ہو جائے پھر بھی یہ خطرہ لاحق رہے گا کہ ہمارے دلوں میں کسی قسم کی کجی نہ پیدا ہو جائے۔ پس ہم تیرے حضور عاجزانہ دعا کے ذریعہ جھکتے ہیں اور یہ التجا کرتے ہیں کہ جب ہمیں ہدایت حاصل ہو جائے، صراط مستقیم ہمیں مل جائے، ہمارے دل سیدھے ہو جائیں، تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں کوئی کجی نہ پیدا ہو.......

بہر حال هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں ایک تو یہ فرمایا کہ ہدایت پا جانے کے بعد بھی تمہیں ہدایت پر قائم رہنے کے لئے ایک ہدایت کی ضرورت ہے اور وہ قرآن کریم میں پائی جاتی ہے اور دوسرے اللہ تعالیٰ نے اشارۃً یہ فرمایا کہ قرآن کریم ہدایت کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے (دوسری جگہ بڑی وضاحت سے اسے بیان کیا ہے) اور اشارۃً بتایا گیا ہے کہ جو ہدایت یافتہ نہ ہوں بڑے ہوں، شعور رکھنے والے ہوں لیکن ابھی ان پر اسلام کی حقیقت واضح نہ ہوئی ہو یا بچپن سے بڑے ہو رہے ہوں اور ابھی اس قسم کا شعور ان میں پیدا نہ ہوا ہو جو بھی صورت ہو نئے سرے سے ہدایت دینے کے سامان قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں اور قرآن کریم نے بڑا زور دیا ہے کہ تربیت کے اس پہلو کو بھی ہمیشہ مدّنظر رکھو اور اس میں کبھی غفلت سے کام نہ لو۔

دوسرا محاذ جہاں ہمیں چوکس رہنا چاہیے اور اس کی طرف سورۃ بقرہ کے شروع میں ہی اللہ تعالیٰ نے ہمیں متوجہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے مضمون کے متعلق آیات بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کہ ایک دوسری جماعت یا

دوسرا گروہ وہ ہے (اس کامل کتاب کے نزول کے بعد) کہ جن کے دل اور دماغ اور روح کی کیفیت یہ ہے کہ تم انہیں انذاری پیشگوئیاں بتا کر انذار کرو یا نہ کرو ان کے لئے برابر ہوگا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم نبی کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں دنیا کی طرف بھیج دیا ہے اور قیامت تک دنیا کی قسمت کو آپ کے پاک وجود کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور جو شخص آپ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا وہ اس دنیا میں بھی اور آنے والی دنیا میں بھی گھاٹے میں رہتا اور خسران پانے والا ہے تو جب تک ان کے ذہنوں کی یہ کیفیت رہے کہ تمہارا ڈرانا نہ ڈرانا ان کے لئے برابر ہی ہو تو اس وقت تک وہ ایمان کیسے لا سکتے ہیں اس لئے تم پر یہ فرض عائد کیا جاتا ہے کہ تم ان کے ذہنوں کی اس کیفیت کو بدلنے کی کوشش کرو اس کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے بڑی تفصیل سے قرآن کریم میں ہدایتیں دی ہیں ہمیں یہ کہا ہے کہ تمہارے دل میں ایسے لوگوں کے لئے رحم کا جذبہ اس شدت کا پیدا ہو جائے کہ تم ہر وقت ان کے لئے دعائیں کرتے رہو وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لے رہے ہیں اس کی آواز پر لبیک نہیں کہہ رہے ایک جہنم اپنے لئے پیدا کر رہے ہیں اے خدا! تو اپنے ان بندوں کو اس جہنم سے نجات دلا ان کی آنکھیں کھول ان کے دلوں کی اس کیفیت کو بدل دے۔

اس کے متعلق جیسا کہ میں نے بتایا ہے بڑی تفصیل سے قرآن کریم نے ہدایتیں ہمیں دی ہیں۔ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (النحل:۱۲۶) کہہ کے عملی نمونہ دکھاؤ وغیرہ وغیرہ سینکڑوں ہدایتیں ہمیں دی گئی ہیں اس محاذ پر بھی ہمیں ہر وقت چوکنا رہنا چاہیے.......

تیسرا ایک اور محاذ ہے جس کا ذکر شروع میں ہی اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور پھر مختلف صورتوں میں کافی لمبی بحث بھی اس مسئلہ پر قرآن کریم نے کی ہے اور وہ ہے نفاق کا محاذ، سورۃ بقرۃ کے شروع میں ہی نفاق کے متعلق جب بحث ہوئی ہے تو بہت سی آیتوں میں زیادہ تفصیل سے بات کی گئی ہے کیونکہ نفاق ایک ایسی بیماری ہے جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا ملتی ہے اتنی بڑی سزا کسی اور گناہ کے نتیجہ میں نہیں ملتی۔ قرآن کریم نے کہا ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النسآء:۱۴۶) یعنی جو سزا خدا کے حضور منافق کے لئے مقدر ہے وہ مشرک کے لئے بھی مقدر نہیں، کافر کے لئے بھی مقدر نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی ان آیات میں جو نفاق اور منافقوں کے متعلق ہیں بڑی تفصیل سے ان

کی عادتوں اور طریقوں پر بحث کی ہے قرآن کریم نے دوسری جگہ ان آیات کے مضامین کو اور وضاحت کے ساتھ کھولا ہے ہمیں جس بنیادی چیز کی طرف متوجہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ منافق مصلح کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے یعنی اعلان یہ ہوتا ہے کہ میں جماعت میں اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ جماعت میں فساد پیدا کیا جائے اس واسطے بہت ہی زیادہ ہشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے اس کیلئے جو بنیادی تعلیم ہمیں دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خلیفہ وقت یا امام وقت یا اگر رسول زندہ ہو تو رسول کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ اس کے ساتھ لگے رہو تب تم نفاق کے حملوں سے بچ جاؤ گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے مخاطب تھے قرآن کریم کے اور ابدی زندگی آپ کو عطا ہوئی تو سارا زور اس پر ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چمٹو روحانی طور پر کیونکہ آپ قیامت تک کے لئے زندہ ہیں اس لئے حقیقت یہی ہے کہ اب بھی یہی حکم ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آ کے چمٹ جاؤ اور آپ کو اُسوہ بناؤ منافق کے شر سے بچ جاؤ گے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب اللہ تعالیٰ دنیا میں پیدا کرتا رہا ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سب سے بڑے نائب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ محبوب روحانی فرزند کی شکل میں دنیا کی طرف بھیجا اور پھر ایک سلسلہ خلافت دنیا میں قائم کیا۔ اصل چیز تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اصلی زندگی تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے نفاق اور کفر سے بچنے کا اصل ذریعہ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیار اور محبت ہے اور پھر ان سے جن کے متعلق خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ہے کہ ان کی اطاعت کرو اور ان سے پیار کا تعلق قائم کرو۔

جو طریق منافق اختیار کرتا ہے اس پر قرآن کریم نے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً ایک طریق اس کا یہ بتایا ہے کہ وہ یہ اعتراض کرتا ہے کہ هُوَ اُذُنٌ کہ یہ تو کان ہیں لوگ آتے ہیں کان بھر جاتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے (نعوذ باللہ) اور غلط فیصلے ان سے ہو جاتے ہیں۔ وہ دن اور آج کا دن اور پھر قیامت تک یہی ہوتا رہے گا۔ جو آپ کے عاجز اور ناچیز بندے آپ کے نام پر خدا تعالیٰ کی طرف سے کھڑے کئے جاتے ہیں بطور نائب کے، بطور خادم کے، بطور پیار کرنے والے کے، بطور اس ذرۂ ناچیز کے جسے خدا تعالیٰ اپنی دو انگلیوں میں لے اور اعلان کرے کہ اس ذرّہ کے

ذریعہ میں اپنی قدرت کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں ان پر یہ اعتراض ہوتے رہیں گے ہو رہے ہیں اور ہوتے چلے جائیں گے۔

تو یہ ایک بڑی واضح علامت اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے منافق کی، کہ کہتے ہیں کہ کان بھرنے والے کان بھر دیتے ہیں اور یہ فیصلہ کر دیتا ہے بغیر سوچے سمجھے حالانکہ جسے اللہ تعالیٰ اس مقام پر کھڑا کرتا ہے اسے فراست بھی عطا کرتا ہے اور وہ فراست بہرحال عام مومن کی فراست سے زیادہ ہی ہوتی ہے عام مومن کی فراست سے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈرایا ہے۔ مومن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی فراست دی ہوتی ہے تو جو مقام ایک مومن کا بتایا گیا ہے تم وہ مقام بھی خلیفہ وقت کو دینے کے لئے تیار نہیں اور کہتے ہو هُوَ اُذُنٌ خلیفہ وقت کی کیا حیثیت ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں؟ جب تمہارے بڑوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں چھوڑا تو تم مجھ پر یا مجھ سے پہلوں پر یا بعد میں آنے والوں پر اس طرح پر اعتراض کرو تو کیا حقیقت ہے اس اعتراض کی!

اللہ تعالیٰ نے وہاں یہ نہیں جواب دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُذُنِ نہیں ہیں بلکہ ان کے اس قول کو صحیح تسلیم کیا ہے کہ ہاں اُذُنِ ہیں سنتے ہیں باتیں، مگر اس کے بعد جو فیصلہ کرتے ہیں وہ تمہاری خیر کا ہوتا ہے اور تمہارے لئے شر کا فیصلہ نہیں ہوتا اور سننا ضروری ہے کیونکہ ہر جگہ کی ہر قسم کی بات پہنچنی چاہیے ورنہ صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچا جا سکتا یعنی ہر جگہ سے بات کا کانوں تک پہنچنے سے منافق کا یہ نتیجہ نکالنا کہ اس سے شر پیدا ہوگا یہ احمقانہ بات ہے کیونکہ خدا کا کوئی بندہ بغیر صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے کوئی کام نہیں کرتا اللہ تعالیٰ خود اس کی رہنمائی کرتا ہے اور صحیح نتیجہ پر وہ پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُذُنِ تو ہے لیکن اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ تمہاری بھلائی کے لئے کان ہے جو فیصلہ کرے گا باتیں سننے کے بعد وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔

(خطبات ناصر جلد دوم صفحہ ۳۰ تا ۳۷)

قرآن عظیم کا یہ دعویٰ ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ یہ ایک کامل کتاب ہے جس میں شک اور شبہ نہیں۔ کے بہت سے معانی کئے گئے ہیں۔ ایک معنی یہ ہیں کہ اس کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں جو حقیقت سے بعید ہو اور شک اور شبہ والی نہیں۔

ایک معنی یہ کئے گئے ہیں کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو صاحبِ فراست، غور کرنے والوں اور نیک نیتی سے اس کا مطالعہ کرنے والوں کے دلوں میں شکوک وشبہات نہیں چھوڑتی اور اس راہ کو جو خدا تعالیٰ

کی رضا کی طرف لے جانے والی ہے روشن کر کے خدا کے بندہ کے سامنے رکھ دیتی ہے۔

قرآن کریم نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ یہ قرآن ہے۔ بار بار پڑھی جانے والی کتاب۔ بار بار پڑھی جانے والی کتاب کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ ہر فرد پر جو اسلام پر ایمان لایا اسے اپنی زندگی کی راہوں کو ہموار کرنے کے لئے قرآن کریم کا بار بار مطالعہ کرنا اور اس کو پڑھنا اور اس پر غور کرنا ضروری ہوگا۔

اس کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ ہر آنے والی نسل اسے پڑھے گی اس طرح نوعِ انسانی قیامت تک اس کتابِ عظیم سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی کے مسائل کو حل نہیں کر سکے گی بلکہ ہر بعد میں آنے والی نسل مجبور ہوگی کہ اپنے مسائل کو حل کرنے کے لئے قرآن کریم کی طرف رجوع کرے۔

یہ ایک کامل کتاب اس معنی میں بھی ہے کہ انسانی زندگی کے تمام مسائل کو حل کرنے کی طاقت اس میں پائی جاتی ہے لیکن محض یہ اعلان نہ ہمیں کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ غیر مسلموں کو کوئی تسلّی دے سکتا ہے۔ ان کے سامنے صرف یہ کہہ دینا کہ قرآن عظیم بڑی ہی عظیم کتاب ہے کیونکہ تمام مسائل کو یہ حل کرتی ہے انہیں تسلی نہیں دے سکتا۔ اس تسلی کے لئے ضروری ہے کہ ہم مثالیں دے کر اُن کو بتائیں کہ یہ عظیم کتاب تمہارے ان مسائل کو حل کرنے کے قابل ہے اور حل کرتی ہے جنہیں تم حل نہیں کر سکے اپنی زندگی میں۔ اس کے لئے یعنی مثالیں دینے کے لئے قرآن کریم کی روح کو سمجھنا، سات سو سے اوپر جو احکام اس میں پائے جاتے ہیں ان پر غور کرنا اور اپنی زندگی ان راہوں پر ڈھالنا جو بیان کی گئی ہیں اور اپنی گردن ان سات سو سے زائد اس زنجیر کے جو حلقے ہیں ان میں باندھ دینا اور جس طرح ایک بکری مجبوراً قصائی کے سامنے اپنی گردن رکھ دیتی ہے اور کہتی ہے لے چھری چلا لے اس طرح برضاورغبت پوری بشاشت اور خوشی کے ساتھ خدا تعالیٰ کے احکام کو تسلیم کرنا اور خوشی اور بشاشت کے ساتھ اپنی زندگی خدا تعالیٰ کی رضا کے مطابق گزارنا اور علیٰ وجہ البصیرت اس بات کے قابل ہو جانا کہ غیروں کے سامنے مثالیں دے کر آپ یہ کہیں کہ قرآن عظیم واقع ہی عظیم ہے کیونکہ تمہارے یہ دیکھو ایک دو تین جتنی مثالیں اس وقت آپ دے سکیں دے کر ان کو بتائیں کہ تم ان مسائل کو حل نہیں کر سکتے، نہ کر سکے ہو لیکن قرآن کریم کی یہ تعلیم انہیں حل کر رہی ہے۔ (خطبات ناصر جلد نہم صفحہ ۱۷، ۱۸)

ایمان کے مفہوم میں بنیادی طور پر یہ بات پائی جاتی ہے کہ کچھ پہلو غیب میں ہے جس پر ہم ایمان لاتے ہیں اسی واسطے قرآن پاک کے شروع میں ہی يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کہا گیا ہے۔ پس غیب

کی باتوں کو مان لینا یہ ایمان کا لازمی حصہ ہے۔ اسکے بغیر ایمان ایمان ہے ہی نہیں۔ مثلاً اس علم پر کہ آج جمعہ ہے اور اس وقت دن کا ایک حصہ ہے کوئی ثواب نہیں کیونکہ یہ بات اتنی ظاہر ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ چمگادڑ کو بھی پتہ ہے اسی لئے جب دن غائب ہوجاتا ہے تو وہ اپنے کمین گاہوں سے باہر نکل آتی ہے۔ پس دن کے وقت اس کا چھُپ جانا اور رات کو باہر نکل آنا یہ بتاتا ہے کہ دن اور رات اتنی واضح چیز ہے کہ انسان کے علاوہ بہت سی دوسری مخلوقات کو بھی پتہ ہے۔ سارے جاندار حیوانات کو پتہ ہے۔ پھر درختوں کو پتہ ہے کیونکہ ان کا دن اور رات کا ردِّعمل مختلف ہے۔ انکا ردِّعمل دن کے وقت اور ہے اور رات کے وقت اور ہے مثلاً دن کے وقت درخت آکسیجن باہر نکالتے ہیں اور رات کے وقت کھا رہے ہوتے ہیں تو دن اور رات کے ردّعمل میں فرق ہے کہ جس قسم کی بھی حس اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں دی گئی ہے وہ اس میں تمیز کر رہی ہے لیکن سب مخلوقات میں سے صرف انسان کو ثواب ملتا ہے ثواب علم پر نہیں ملتا ایمان پر ملتا ہے اور ایمان کا لازمی حصہ غیب پر ایمان لانا ہے۔

غیب پر ایمان عقلاً آگے دو حصوں میں منقسم ہوجاتا ہے۔ ایک وہ غیب ہے جس کے حق میں قرائن مرجّحہ نہیں ہیں۔ قرائن قویہ نہیں ہیں اور جس غیب کا میلان یقین کی نسبت شک کی طرف زیادہ ہے۔ اسلام نے ہمیں اس غیب پر ایمان لانے کے لئے نہیں کہا جیسا کہ قرآن کریم کے بہت سے مقامات سے یہ بات عیاں ہے۔ ایک غیب وہ ہے جس کا میلان شک کی نسبت یقین کی طرف زیادہ ہے۔ پس قرائن قویہ مرجّحہ جہاں پائے جائیں ایک مومن اس پر ایمان لاتا ہے۔ مثلاً ایمان باللہ ہے۔ اس ایمان کا ایک پہلو علم کی طرح عیاں ہے اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کا تعلق ہے اس کا ایک پہلو عیاں بھی ہے لیکن جو تصور اسلام نے ہمیں اللہ تعالیٰ کا دیا ہے اس کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی وسعتوں کے مقابلہ میں یہ عیاں پہلو اتنا بھی نہیں جتنا سمندر میں سے ایک قطرہ اٹھالیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی صفات کے جلووں کی حدّ بندی نہیں کی جاسکتی وہ ذات غیر محدود ہے اور کسی محدود کی غیر محدود کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا ایک حصہ تو ہمارے سامنے آ گیا لیکن بڑا حصہ ہم سے پوشیدہ ہے۔ اس پر ہم ایمان بالغیب لاتے ہیں یعنی خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے ان جلووں پر جو ہنوز پردۂ غیب میں ہیں پھر ایمان بالغیب کا تعلق ملائکہ اور حشر ونشر سے ہے۔ وہ ایمان بالغیب کی ایک اور لائن ہے ایمان بالغیب

کے کچھ اور پہلو بھی ہیں جنہیں میں مثال کے طور پر بیان کر دیتا ہوں۔ ایمان بالغیب کا تعلّق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کی شخصیت اور وجود پر ایمان لانے سے بھی ہے اس پاک ومطہر وجود کا ایک حصہ ایک دَور کے انسان پر ظاہر ہوتا اور ایک بڑا حصہ ہر دَور کے انسان کی نظر سے غائب رہتا ہے مثلاً ایک پہلو جو ہم آپ کی ذات کا لیں وہ محسن ہونے کا ہے ہر صدی کے حالات واحوال کے اختلافات کی وجہ سے اس احسانِ عظیم کی بعض پوشیدہ باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی صدی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلّق اس ایمان پر قائم ہونا کہ قیامت تک کے لئے آپ ایک عظیم محسن کی حیثیت رکھتے ہیں آپ پر ایمان لانے کا ایک پہلو ہے پہلی صدی میں اس احسان عظیم کے کچھ جلوے ظاہر ہوئے لیکن وہ جلوے تو ظاہر نہیں ہوئے جن کے نتیجہ میں ہم یہ کہہ سکیں کہ آپ قیامت تک کیلئے دنیا کے محسنِ اعظم ہیں پہلی صدی کے بعد قیامت تک آپ کے احسان کے جو پہلو انسان کے سامنے آنے تھے پہلی صدی کے لئے وہ جلوے پردۂ غیب میں تو تھے لیکن ان پر ایمان لانا ضروری تھا ورنہ ایمان بالرسول نہ ہوتا لیکن صرف یہ فقرہ کہ ’’ہمارے محسن ہیں‘‘ حقیقی ایمان نہیں حقیقی ایمان یہ ہے کہ ہمارے بھی محسن ہیں اور قیامت تک بنی نوع انسان کے بھی محسن ہیں اور یہ ایمان بالغیب ہے جس کا تعلّق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہے مثلاً آج کی دنیا انقلابات کی دنیا ہے ایسے انقلابات بھی آئے کہ جن کا ایک حصہ غلبۂ اسلام کی مہم میں ممد ثابت ہوا اور ہورہا ہے لیکن ایک حصہ ایسا تھا جو نوعِ انسانی کے ایک بڑے حصہ کو خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دور لے جانے والا تھا۔ یہ جو مسائل آج کی دنیا کے لئے پیدا ہوئے ان مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمارے محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم بھی دی اور ان حالات میں اپنا ایک اُسوہ بھی ہمارے سامنے پیش کیا۔ یہ باتیں پہلی صدیوں کے انسانوں کے لئے غیب کا حکم رکھتی ہیں اور آج کے بعد قیامت تک جو مسائل نوعِ انسانی کے لئے پیدا ہوں گے ان کے حل کے لئے قرآنی تعلیم کے وہ پہلو جن کا ان مسائل کے ساتھ تعلق ہے اور آپ کے اُسوہ کے وہ جلوے جن کا اس زمانہ کے انسان کے ساتھ تعلق ہے آج ہمارے لئے ’’غیب‘‘ ہیں۔

پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت تک کیلئے نوعِ انسانی کا محسن سمجھ کر ایمان لانا اس ایمان میں غیب کا ایک بڑا حصہ ہے اور قرائنِ قویہ مرجّحہ کی وجہ سے ہم ایمان لاتے ہیں مثلاً پہلی صدی کے انسان

نے کہا کہ میرے اوپر احسان کیا اور یہ کہنے کے بعد احسان کیا کہ میں تمہارے لئے محسنِ اعظم ہوں آپ نے جو کہا وہ ہماری زندگیوں میں پورا ہوا۔ جو آئندہ کے متعلق کہا گیا ہے وہ پورا ہوگا۔ اسی طرح اور بیسیوں پہلو پیش کئے جا سکتے ہیں جو قرآئن کا حکم رکھتے ہیں جن کے نتیجہ میں ترجیح اس بات کو دی گئی کہ ہم یقین کی طرف مائل ہو جائیں اور ایمان لے آئیں۔

قرآن کریم نے اسی تسلسل میں یہ دعویٰ کیا کہ میں اب ہمیشہ کے لئے نوعِ انسانی کے ہر قسم کے مسائل کو حل کروں گا اور ان کی روحانی ضروریات کو اور ان کی دنیاوی ضروریات کے بنیادی مسائل کو حل کروں گا اور قرآنِ کریم نے ایک بڑا اقوی قرینہ جو قائم کیا وہ یہ ہے کہ قرآن کو ہمیشہ مطہّر بندے سمجھ سکیں گے۔ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعة: ۸۰) میں جہاں اس بات کا ذکر ہے کہ مطہّرین پر نئے سے نئے اسرار قرآنی کھولے جاتے ہیں وہاں یہ بھی تو ذکر ہو گیا نا! کہ قرآن کریم میں اسرار و رموز چھپے ہوئے ہیں ورنہ مطہّر کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر ہر چیز قرآن کریم کی پہلی صدیوں میں ظاہر ہو گئی تو پھر نہ قرآن کریم پر ایمان بالغیب کی ضرورت ہے نہ آئندہ کسی مطہّر کی ضرورت ہے کیونکہ قرآن کریم کے علوم میں کوئی اسرار و رموز اور بنیادی حقیقتیں جو آئندہ زمانہ سے تعلّق رکھتی تھیں وہ باقی نہیں رہیں تو قرآنِ کریم پر ایمان، ایمان بالغیب سے بھی تعلّق رکھتا یعنی کتاب مبین کے ساتھ ساتھ ایک بڑا حصہ ایمان بالغیب کے ساتھ تعلّق رکھتا ہے یعنی کتاب مکنون پر ایمان۔

(خطبات ناصر جلد پنجم صفحہ ۱۷۰ تا ۱۷۳)

میرے دل میں یہ خواہش شدت سے پیدا کی گئی ہے کہ قرآن کریم کی سورہ بقرہ کی ابتدائی سترہ آیتیں جن کی میں نے ابھی تلاوت کی ہے۔ ہر احمدی کو یاد ہونی چاہئیں اور ان کے معانی بھی آنے چاہئیں اور جس حد تک ممکن ہو ان کی تفسیر بھی آنی چاہیے اور پھر ہمیشہ دماغ میں وہ مستحضر بھی رہنی چاہیے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ستّر اسّی صفحات کا ایک رسالہ جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ اور حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کی تفاسیر کے متعلقہ اقتباسات پر مشتمل ہوگا شائع بھی کر دیں گے۔ مجھے آپ کی سعادت مندی اور جذبۂ اخلاص اور اس رحمت کو دیکھ کر جو ہر آن اللہ تعالیٰ آپ پر نازل کر رہا ہے امید ہے کہ آپ میری روح کی گہرائی سے پیدا ہونے والے اس مطالبہ پر لبیک کہتے ہوئے ان آیات کو زبانی یاد کرنے کا اہتمام کریں گے۔ مرد بھی یاد

کریں گے عورتیں بھی یاد کریں گی۔ چھوٹے بڑے سب ان سترہ آیات کو اَز بر کر لیں گے پھر تین مہینے کے ایک وسیع منصوبہ پر عمل درآمد کرتے ہوئے ہم ہر ایک کے سامنے ان آیات کی تفسیر بھی لے آئیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں جو مضمون بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت نبی اکرم افضل الرسل ہیں۔ آپؐ انسان کامل ہیں۔ آپؐ پر کامل شریعت نازل ہوئی آپؐ خاتم النبیین کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا جو جلوہ اپنے وجود میں دکھایا اس کے نتیجہ میں یہ دنیا تین گروہوں میں بٹ جائے گی ایک گروہ وہ ہے جو ایمان لائے گا۔ فرمایا ان کی بنیادی خصوصیات یہ ہوں گی کہ وہ اپنی تمام جسمانی اور ذہنی قوتوں اور صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے قربان کر دیں گے۔ اپنی اخلاقی اور روحانی قوتوں کو انوار الٰہیہ سے منور بنا کر اس سے ساری دنیا کو مستفید کرنے کی کوشش میں لگے رہیں گے اور ان کی تیسری بنیادی خصوصیت یہ بتائی کہ اس دنیا میں آئندہ ظہور پذیر ہونے والے واقعات پر مشتمل جو پیش خبریاں دی گئی ہیں اور بشارتیں دی گئی ہیں۔ وہ ان پر اس طرح ایمان لاتے ہیں گویا کہ یہ باتیں پوری ہو چکی ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی صفات، اس کی قوتوں اور اس کی طاقتوں پر یقین ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہ ہو چکی ہو اور اگر اس کے راستہ میں کوئی روک پیدا ہو تو وہ اس روک کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کسی قربانی سے گریز نہیں کرتے۔ ان کو یہ پتہ ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہے ضرور ہو کر رہے گی۔ اگر کوئی روک پیدا ہوئی ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں ہماری کوئی آزمائش مقصود ہے لہٰذا ہمیں اس آزمائش میں پورا اُترنا چاہیے تاکہ ہمیں ثواب اور اجر کے زیادہ مواقع عطا ہوں۔ وہ اس یقین پر بھی قائم ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جسمانی اور روحانی ترقیات کے لامحدود دروازے کھول رکھے ہیں اور ان کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ روحانی رفعتوں کو حاصل کرتے ہوئے کسی ایک مقام پر جا کر رک نہیں جاتے یا اسی کو کافی سمجھ کر وہیں بیٹھ نہیں جاتے بلکہ ان کی زندگی غیر محدود ترقیات کے حصول میں ایک غیر محدود جدوجہد میں رواں دواں رہتی ہے۔ غرض سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس ہدایت یافتہ گروہ کی بنیادی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک دوسرا گروہ منکرین اسلام کا گروہ ہے اور ان کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو صداقت حقّہ کے قبول کرنے اور دلی بشاشت کے ساتھ قربانیاں دینے

کی جو قابلیتیں اور قوتیں عطا کی تھیں یہ ان کو کھو بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں روحانی اثر کے قبول کرنے کی صلاحیت بخشی تھی جس سے یہ بہت کچھ سیکھ سکتے تھے لیکن ان کے دل پتھر ہو گئے اور اپنی فطرتی حالت میں نہیں رہے جو رقت کی اور رجوع کی اور توبہ کی اور عاجزی کی حالت ہے اور چونکہ ان کے دل پتھر ہونے کی وجہ سے اپنی فطری حالت پر نہیں رہے اس لئے فطرتی دینی اعمال بجالانے کے قابل نہیں رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دل کی بہت سی دوسری امراض بتائیں اور ان کے علاج بھی بتائے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کے اندر ایک چیز یہ بھی نظر آتی ہے کہ ہم نے انہیں سننے کیلئے کان دیئے تھے اور سماع سے ہماری مراد یہ تھی کہ جب صوتی لہریں ہوا کے دوش پر ان کے کانوں تک پہنچیں تو پھر آگے ان کے اثرات ذہن پر پڑیں جس سے دل بھی متاثر ہوں کیونکہ قبول ہدایت کا ایک بڑا ذریعہ دل ہی ہے۔ انسان جب نیکی کی باتیں غور سے سنتا ہے تو اس کا ذہن تدبّر سے کام لیتے ہوئے ان کے اثرات کو دل کی طرف منتقل کر دیتا ہے جس کے نتیجہ میں دل کے اندر ایک ایسا انقلاب اور ایک ایسا تغیر رونما ہوتا ہے کہ انسان قبولِ ہدایت کے لئے تیار ہو جاتا ہے لیکن انہوں نے اپنی بداعمالیوں کے نتیجہ میں کانوں پر مہر لگا دی ہے۔ کوئی آواز ان کے کانوں میں پڑتی ہی نہیں صوتی لہریں ان کے کانوں سے ٹکراتی اور واپس ہو جاتی ہیں یا ایک کان میں گھستی ہیں اور دوسرے کان سے نکل جاتی ہیں۔ پھر ان کو آنکھیں اس لئے دی تھیں کہ وہ اس دنیا میں خدائے حَیٌّ وقَیُّومٌ کے قادرانہ تصرّفات کا مشاہدہ کرتے اور اس سے عبرت حاصل کرتے۔ تاریخ عالَم پر نگاہ ڈالتے ،مختلف آسمانی کتابوں کو غور سے پڑھتے اور پھر فکر و تدبّر سے کام لیتے تو انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جب سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ یہ سلوک رہا ہے کہ جب بھی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہی اس کی طرف سے نازل ہونے والی ہدایت کو قبول کیا اس کی بارگاہ پر جھک گئے اور اس کی راہ میں قربانیوں سے دریغ نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر کس طرح اپنے انعامات نازل کئے اور انہیں کس طرح اپنے فضلوں کا وارث بنایا۔ مگر جن لوگوں نے خدا تعالیٰ کی اس آواز پر کان نہ دھرے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت کو ٹھکرا دیا اور اس کی قدر نہ کی وہ کس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب کے بھنور میں پھنس کر ہلاکت سے دوچار ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ان منکرینِ اسلام کی تو یہ حالت ہے کہ گویا ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں حالانکہ فطرتی لحاظ

سے ان کی آنکھوں پر کوئی غلاف نہیں تھا۔ یہ تو انہوں نے خود اپنی آنکھوں پر چڑھا لیا ہے۔ ان کی اس حالت گھوڑے یا گدھے کی مانند ہے جس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ چلتے وقت کسی چیز کے خوف سے ڈر نہ جائے۔ پس انہوں نے بھی اس خوف سے کہ کہیں روحانیت کی کوئی جھلک ان کی آنکھوں میں نہ پڑ جائے (جو دنیوی عارضی مسرتوں سے ان کو دُور لے جائے) اپنی آنکھوں پر غلاف چڑھا لئے ہیں جس کی وجہ سے یہ حسن واحسان کے روحانی جلوے دیکھنے سے قاصر ہیں۔

بہر حال سورۂ بقرہ کی ان ابتدائی سترہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے منکرین کا ذکر کر کے ان کی جسمانی کیفیات اور ان کے روحانی امراض کی طرف متوجہ کرتے ہوئے سامان عبرت مہیا فرمایا۔ پھر ان کو جھنجھوڑ کر یہ انتباہ فرمایا کہ اگر تمہاری حالت یہی رہی تو تم حق کو ہرگز قبول نہیں کر سکتے۔ تم قبولِ حق کی توفیق صرف اسی صورت میں پا سکتے ہو کہ تمہاری روحانی اور اخلاقی کیفیت یہ نہ ہو کہ ہمارے اس عظیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ڈرانا یا نہ ڈرانا تمہارے لئے برابر ہو۔ چاہیے کہ اس کا ڈرانا تمہارے دلوں پر اثر انداز ہو۔ جب تک تمہارے اندر یہ تبدیلی رونما نہیں ہوتی جب تک وہ مہریں جو تم نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے قلوب اور اپنے کانوں پر لگالی ہیں ان کو تم توڑ نہ دو اور ہم نے آسمانی مؤثرات کو قبول کر لینے کیلئے تمہارے دل میں جو کھڑکیاں بنا رکھی ہیں۔ ان کو تم کھول نہ دو جب تک تم ان غلافوں اور ان پردوں کو جنہیں تم نے اپنی آنکھوں پر ڈال لیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نور سے اپنے آپ کو چھپانے کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے نور کے جلوؤں سے اپنے آپ کو بچانے کیلئے خود ہی تم نے اپنی آنکھوں پر پٹی کے طور پر باندھ رکھے ہیں تم ان کو ہٹا نہ دو، اس وقت تک تمہاری یہ حالت مبدل بہ اسلام نہیں ہوسکتی اور اللہ تعالیٰ کی توجہ کو تم حاصل نہیں کر سکتے۔ تم جب تک اپنی یہ حالت نہیں بدلتے خدا تعالیٰ سے دُور و مہجور رہو گے۔ دنیا کی جھوٹی اور عارضی لذت سے تم لطف اندوز تو ہو سکتے ہو لیکن اگر تمہاری یہی حالت رہے تو تم اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے پیار کی حقیقی اور سچی لذت اور ابدی سرور کو کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ پس جب تک منکرین دین کی حالت نہیں بدلتی۔ اس وقت تک قرآن کریم کی تعلیم یا حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ حسنہ کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

ایک اَور گروہ بھی دنیا میں پیدا ہوگا اور یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت

پر ایمان لائے لیکن درحقیقت وہ ایمان نہیں لاتے۔ان کا یہ دعویٰ ایمان سراسر جھوٹا ہوتا ہے۔ پہلے دو گروہوں کا ذکر نسبتاً مختصر الفاظ میں فرمایا کیونکہ اس متن اور مضمون میں ان دو گروہوں کے بارے میں زیادہ کہنے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ ان دونوں گروہوں کی خصوصیات اور کیفیات ظاہر و باہر ہوتی ہیں مگر جس گروہ کا ذکر وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے اس کے متعلق نسبتاً زیادہ باتیں بیان کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ یہ گروہ مارِ آستین بن کر اندر ہی اندر جماعت کے اجتماعی جسم کو ڈستا رہتا ہے۔منکرینِ اسلام ظاہری طور پر باہر سے علی الاعلان حملہ آور ہوتا ہے اور مومن بندے اپنے اپنے اخلاص کے مطابق اللہ تعالیٰ پر توکّل رکھتے ہوئے اس کے سامنے سینہ سپر رہتے ہیں وہ ہر وقت چوکس اور بیدار رہ کر اس کے شب خون سے محفوظ رہتے ہیں کیونکہ ایک مومن جس طرح دن کو بیدار اور باخبر رہتا ہے اسی طرح وہ شب بیدار بھی ہوتا ہے کیونکہ جو لوگ رات کو سو جاتے ہیں دشمن ان پر تو شب خون مارتا اور بے خبری میں ان کو شدید نقصان پہنچاتا ہے لیکن وہ جو دن کو بھی ہوشیار ہو اور جو راتیں بھی خدا تعالیٰ کی حمد اور اس کی ثناء کرتے ہوئے گزارتا ہو شیطان اس پر شب خون مارنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔اس لئے منکرین اسلام کی بعض بنیادی باتوں کے اظہار پر اکتفا فرماتے ہوئے یہ سبق دیا کہ منکرین کی بیماریوں کی تشخیص کو میں نے آسان کر دیا ہے۔اس لئے میری ان ہدایتوں کی روشنی میں اپنی دلی ہمدردی اور غم خواری سے ان کے علاج میں کوشاں رہنا تمہارا فرض ہے لیکن یہ جو تیسرا گروہ ہے یہ ایک مومن کے لباس میں مگر ایک فتنہ گر کی حیثیت میں اُمّت مسلمہ میں داخل ہوتا ہے اور اندر ہی اندر مفسدانہ سرگرمیوں میں مصروف رہتا ہے اس لئے اس بات کی زیادہ ضرورت تھی کہ اللہ تعالیٰ اس گروہ کی بُرائیوں اور بدخصلتوں کے متعلّق زیادہ تفصیل سے بیان فرمائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو باتیں اس گروہ کے متعلّق ان چند آیات میں بیان فرمائی ہیں وہ بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور مومنوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ مجھے پہلے بھی کئی بار یہ خیال آیا ہے ابھی جب میں یہاں آ رہا تھا تو مجھے پھر یہ خیال آیا کہ ہمارے ربّ نے کس پیار اور کس اعتماد کے ساتھ ہمارا ذکر فرمایا ہے۔فرماتا ہے کہ جس طرح یہ لوگ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے کیونکہ میں علّام الغیوب ہوں، میرے علم نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے، مجھ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، مجھ پر کبھی غفلت طاری نہیں ہوتی غرض اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی صفات کی مالک ہے کہ اسے کوئی

دھوکا نہیں دے سکتا کیونکہ اس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ لَا رَیْبَ یہ خدا تعالیٰ کی بلند شان ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ اسی طرح میرے مومن بندوں پر بھی منافقت کی کوئی چال کارگر نہیں ہوسکتی۔ منافق انہیں بھی کوئی دھوکا نہیں دے سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندے کو کتنا بڑا مقام عطا کیا ہے کہ اس کو بھی اپنے ساتھ۔ (اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے مومن بندوں کو منافق دھوکا نہیں دے سکتے یہاں منافق کے دھوکے سے بچنے میں اللہ تعالیٰ نے مومن بندے کو بھی اپنے ساتھ شامل کیا۔) یہ درحقیقت بڑے ہی پیار اور اعتماد کا اظہار ہے مگر اس کے ساتھ ہی ہم پر بڑی بھاری ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں کیونکہ بالواسطہ طور پر اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ اس کے مومن بندے بھی اس کی طرح ہر وقت چوکس اور بیدار رہیں اور اپنے دائرہ عمل میں ہر چیز کا علم حاصل کریں۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی کوئی چیز ان سے پوشیدہ نہ رہے۔ اب مثلاً میرا علم جو ہے اس کا ایک حصہ ایک لحاظ سے دراصل آپ کا ہی علم ہے کیونکہ مجھے کراچی کی بیدار اور چوکس جماعت بھی اطلاع بھجوا رہی ہے، مجھے راولپنڈی کی بیدار اور چوکس جماعت بھی اطلاع بھجوا رہی ہے، مجھے پشاور کی بیدار اور ہوشیار جماعت بھی اطلاع دے رہی ہے غرض ہر جگہ سے جہاں بھی ہماری جماعت قائم ہے وہاں سے مجھے اطلاع مل رہی ہے اور چونکہ میرا اور آپ کا وجود ایک ہی ہے۔ اللہ کے فضل سے آپ میری آنکھیں ہیں جن کے ذریعہ سے میں دیکھتا اور علم حاصل کرتا ہوں آپ میرے کان ہیں جن کے ذریعہ سے میں سنتا اور حالات کی روش کو محسوس کرتا ہوں۔ چنانچہ آپ کی فراست اور میری فراست دراصل ایک ہی تصویر کے دو رُخ یا ایک ہی پیالے کے مختلف اطراف ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح مجھے کوئی منافق دھوکا نہیں دے سکتا اس طرح میرے مومن بندے کی بھی یہی شان ہے اسے بھی کوئی منافق دھوکا نہیں دے سکتا۔ بڑے ہی پیار کا اظہار ہے لیکن ساتھ ہی بڑا بے چین اور پریشان کر دینے والا بیان بھی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ سے دعا ہونی چاہیے کہ یہاں جس اعتماد کا اظہار کیا گیا ہے ہم اس اعتماد پر پورا اُترنے والے ثابت ہوں۔

فرمایا ان منافقوں کی دوسری علامت یہ ہے کہ ان کے دل میں مرض پیدا ہو چکا ہے اور یہ خود اپنے علاج کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اس لئے خدا تعالیٰ کی صفات کا جو عام جلوہ ہے کہ جیسا کوئی بندہ ہوتا

ہے اسی کے مطابق اس سے اس کا سلوک بھی ہوتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرض گھٹتا نہیں بلکہ فطرتی تقاضوں کی غلط روش سے ان کا مرض بڑھتا ہی چلا جاتا ہے چنانچہ قرآن کریم نے امراض قلوب پر متعدد جگہ روشنی ڈالی ہے۔ دل کی ایک مرض نہیں ہوتی بلکہ متعدد امراض ہیں جس طرح جسم کی بھی ایک مرض نہیں انسان مختلف قسم کی غلطیاں کرتا رہتا ہے۔ صبح ایک قسم کی غلطی کر بیٹھتا ہے اور شام کو دوسری قسم کی غلطی کا مرتکب بن جاتا ہے ہر مرض کا تعلق انسان کے کسی نہ کسی غلط اقدام سے ہے انسان کی کسی نہ کسی غلط روش کے نتیجہ میں مرض لاحق ہوتی ہے اور ان آیات میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے.......

بہرحال منافق کی دوسری علامت یہ بتائی کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے مومن بندوں کو تو دھوکا دینا چاہتا ہے مگر اس کا اپنا یہ حال ہے کہ ہر قسم کی روحانی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ منافقت نے اس کے درختِ وجود کو پراگندہ کر کے رکھ دیا ہے اس کا جسم ایک آتشک زدہ کے جسم کے مشابہ ہے۔ جس طرح آتشک وغیرہ کے مریض کے اعضاء گلنے سڑنے لگ جاتے ہیں اس صورت میں وہ انسانی جسم کہلانے کا مستحق نہیں رہتا بلکہ عفونت اور گندگی کے ایک لوتھڑے کا مصداق بن جاتا ہے اسی طرح منافق بھی روحانی طور پر گندگی اور ناپاکیزگی اور عدمِ طہارت کی وجہ سے ایک لوتھڑا ہی ہوتا ہے وہ حقیقی معنوں میں انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا حالانکہ وہ انسان کے زمرہ میں شامل ہے اور انسان کو تو اللہ تعالیٰ نے لامحدود روحانی ترقیات کے لئے پیدا کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس گروہ کی تیسری بیماری یا کمزوری یہ بتائی ہے کہ یہ اپنے آپ کو مصلح سمجھتے ہیں یعنی یا تو اپنی جہالت کے نتیجہ میں خود ہی مصلح بنے پھرتے ہیں اور یا پھر شرارت کی نیت سے ایک مصلح کا روپ دھار لیتے ہیں۔ بہرحال وہ ایک مصلح کے لباس میں اُمّتِ مسلمہ میں گھسے رہتے ہیں اور اسے اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر دینے کے لئے منافقانہ کارروائیوں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ چنانچہ ہماری تاریخ میں اس قسم کی منافقانہ سرگرمیوں کی ایک نہیں دو نہیں بلکہ بیسیوں مثالیں پائی جاتی ہیں کہ بعض یہودی مسلمان علماء کی شکل میں مسلم معاشرہ کے جزو بن کر تباہی و بربادی پھیلاتے رہے۔ سپین میں مسلمانوں کی صدیوں تک حکومت رہی اور ایک وقت تک ان کے رعب اور ان کے علم و فضل اور ان کے اخلاق فاضلہ نے سارے یورپ پر اپنی دھاک بٹھائے رکھی۔ بڑے بڑے مشہور پادریوں نے

سپین میں آ کر مسلمانوں سے علوم وفنون سیکھے۔ اگرچہ ظاہری طور پر یا سیاسی لحاظ سے مسلمانوں کا اقتدار سپین کے خطہ ہی پر تھا لیکن حقیقت میں ان کی حکومت سارے یورپ کے ذہن پر اور سارے یورپ کے دل پر تھی لیکن بعض یہودی مسلمانانِ اُندلس کی صفوں میں داخل ہوئے اور مسلمانوں کی عبرتناک تباہی کا باعث بنے۔ شروع میں اُنہوں نے مسلمانوں سے کتابی علوم سیکھے کیونکہ اسلامی علوم سیکھنے کے لئے ایمان لانے کی شرط نہیں ہے۔ اب عام آدمی بھی مسلمان ہوئے بغیر اپنے ذہن اور حافظہ کی مدد سے اسلامی علوم کے ظاہری حصہ پر حاوی ہوسکتا ہے البتہ کتابِ مکنون والے حصے میں جا کر حقیقی نیک اور ظاہری نیک میں عقل وفکر اور غور وتدبر کرنے والے فرق کر لیتے ہیں۔ بہرحال یہ لوگ دشمنی کی نیت سے اسلام میں داخل ہوئے ظاہری علوم سیکھ کر ''حضرت مولانا'' بن بیٹھے اور پھر اندر ہی اندر وہ فتنہ بپا کیا کہ چشمِ فلک نے شاید ہی پہلے کبھی دیکھا ہو۔ مگر ایمان رکھنے والے اللہ تعالیٰ سے محبت کا دم بھرنے والے مسلمانوں نے اُس وقت اپنی اس عظیم ذمہ داری کو فراموش کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے اعتماد سے فرمایا تھا کہ مجھے اور میرے مومن بندوں کو یہ منافق دھوکا نہیں دے سکتے۔ مگر مسلمانانِ اُندلس نے ایسے منافقوں کے فتنوں سے بچنے کیلئے ہوشیاری اور بیدار مغزی کا ثبوت نہ دیا۔ دراصل ایک منافق کا ایک بہت بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شیطان بن کر ایک آدمی کے پاس چلا جاتا ہے اور اس کو کہتا ہے کہ دیکھو آپ اتنے نیک اور بزرگ اور یہ اور وہ ہیں اور خلیفہ وقت کتنا ظالم ہے کہ اس نے پبلک میں آپ کو جھاڑ دیا حالانکہ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے بڑی عقل دی ہے آپ بڑے بزرگ ہیں۔ اگر وہ آدمی بدبخت ہے تو وہ اس کے دھوکے میں آ جاتا ہے لیکن اگر اس آدمی پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سایہ ہے تو وہ آگے سے اسے جواب دیتا ہے کہ تم غلطی سے میرے دروازے پر آ گئے ہو تمہیں کسی اور طرف جانا چاہیے تھا۔ مجھے تو یہ پتہ ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ کو کبھی نہ نیند آتی ہے اور نہ کبھی اُونگھ اور نہ ہی کبھی اس پر غفلت طاری ہوتی ہے میں بھی ظلّی طور پر خدا تعالیٰ کی اُن صفات سے متّصف ہونے کی حیثیت میں ہوشیار اور بیدار ہوں تم میرے پاس کیا لینے آ گئے ہو ہماری جماعت میں ایسے دس بیس، سَو دوسَو واقعات سال میں رونما ہو ہی جاتے ہیں مجھے اطلاع ملتی رہتی ہے لکھا ہوتا ہے کہ میرے پاس منافق آیا تھا اور میں نے اسے یہ جواب دیا ہے۔

لیکن جن پر غفلت طاری ہوتی ہے یا جن کی حالت ایمان اور نفاق کے درمیان ہوتی ہے دل اور

دماغ اور روح میں کچھ روحانی کمزوری ہوتی ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے منافق نہیں قرار دیا بلکہ فرمایا ہے کہ یہ کمزوریِ ایمان رکھنے والے ہیں دل کی ساری امراض کو نفاق نہیں کہا اگرچہ یہ امراض نفاق کا حصہ ضرور ہیں لیکن ان کو کلیۃً نفاق بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اگر کسی کے دل میں ایک فیصدی نفاق ہے تو وہ منافق نہ ہوا مگر اس کی حالت خطرہ سے باہر بھی نہیں ہوتی ایسے شخص کی اصلاح اور تربیت آسانی سے کی جاسکتی ہے۔

پس منافق مصلح کے لباس میں دوست اور ہمدرد کی حیثیت سے لوگوں کے پاس جاتے اور ان کے ایمان کے اندر رخنہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ رخنہ ابتداء میں سُوئی کے ناکے کے برابر ہوتا ہے بظاہر بالکل معمولی سا نظر آتا ہے لیکن اندر سے گند کا ایک لوتھڑا بن جاتا ہے مثلاً آج کل سیب کا پھل عام ہے آپ نے دیکھا ہوگا بعض کیڑے سیب پر حملہ آور ہوتے ہیں آپ ایک سیب اُٹھائیں اس پر سُوئی کے ناکے کے برابر داغ نظر آئے گا اور جب اسے کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ اندر موٹی موٹی سونڈیاں پھر رہی ہوں گی حالانکہ اس سیب پر بظاہر سُوئی کے ناکے سے زیادہ سوراخ نظر نہیں آئے گا.......

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان آیات میں یہ بتایا ہے کہ منافق ایک مصلح کے روپ میں تمہارے سامنے آئے گا جب کبھی وہ تمہارے سامنے اس روپ میں آئے تو ہم تمہیں ایک جواب سکھاتے ہیں وہ جو اب تم اس کو دے دیا کرو تم اس سے کہہ دیا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ تم اصلاح کا جو بھی جامہ پہنو ہم تمہیں پہچانتے ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کی یہ آواز ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے کہ تم ہی مفسد ہو تمہارا مصلح کے روپ میں ہمارے سامنے آنا ہمیں دھوکا نہیں دے سکتا۔

منافق کی چوتھی علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ منافق لوگ اپنے آپ کو بڑا عقلمند اور ہوشیار سمجھتے ہیں اور اپنے نفاق کو اپنی ہوشیاری کا نتیجہ سمجھتے ہیں حالانکہ ان کی یہ حالت اوّل درجے کی حماقت کے مترادف ہوتی ہے لیکن یہ بات ان کے دماغ میں آتی ہی نہیں ان کا مرض لاعلاج ہو چکا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب ان سے کہا جائے کہ آخر یہ سارے مسلمان جو ہیں ان کے دلوں میں ایمان اور بے نفسی پائی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کے لئے خلوص اور ایثار پایا جاتا ہے جس طرح اُنہوں نے اپنی تمام خواہشات اور اپنی بزرگیوں اور بڑائیوں کو اللہ تعالیٰ کی عزت اور عظمت پر قربان کر دیا ہے تم کیوں

نہیں ان کے رنگ کو اختیار کرتے اور اپنے اندر ایمان اور بے نفسی پیدا کرتے منافق یہ سن کر جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم ان بیوقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں۔ یہ تو احمق ہیں مالی قربانی کا مطالبہ ہوتا ہے تو یہ اپنے بیوی بچوں کو بھوکا مار دیتے ہیں مگر قربانی ضرور دیتے ہیں بھلا یہ بھی کوئی عقلمندی ہے کہ بیوی بچے بھوکے مرتے رہیں اور مالی قربانیوں پر زور ہو پھر جن منافقین کے گھر باہر ہوتے ہیں اور بظاہر ان کے گھروں کے پہرے یا حفاظت کا کوئی انتظام نہیں ہوتا اِدھر انہیں وقت کی قربانی دینے سے بھی گریز ہوتا ہے اور بہانہ بنا لیتے ہیں کہ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَۃٌ (الاحزاب : ۱۴) ہمارے یہاں تو پہرے کا انتظام نہیں اس لئے ہم سے وقت کی قربانی کا مطالبہ نہ کریں اور ہمیں باہر نہ بھیجیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ حفاظت کا سارا دارومدار ان کی موجودگی پر ہے حالانکہ حقیقی محافظ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے ہوتے ہیں ہمارے ملک میں بھی مختلف مواقع پر فسادات رونما ہوتے رہے ہیں اور بہت سے احمدیوں نے اللہ تعالیٰ کی شان کو بچشم خود دیکھا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ احمدی کا اکیلا گھر تھا ایک بپھرا ہوا مجمع اس پر حملہ آور ہوا مگر واپس چلا گیا اور اس گھر کے مکین احمدیوں کو کسی قسم کی گزند نہ پہنچا سکا اور بعض دفعہ ایسے واقعات بھی رونما ہوئے ہیں کہ بعض احمدی گھرانوں میں مرد موجود نہیں تھے صرف عورتیں تھیں۔ چنانچہ جب بھی اس قسم کے گھر پر مشتعل ہجوم حملہ آور ہوا تو ان کے سامنے اکیلی عورت کھڑی ہو گئی اور خدا تعالیٰ کے فرشتوں نے اس گھر کو اپنی حفظ و امان میں لے لیا اس حفاظت کا ایک زبردست نظارہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے اس وقت دکھایا جب آپ صرف بارہ آدمیوں کے ساتھ دہلی تشریف لے گئے تھے جہاں ایک بڑے مشتعل ہجوم نے آپ پر حملہ کیا اور یہ نہتے دُہری چار دیواری کے اندر اپنے قادر و توانا خدا کے سہارے بیٹھے تھے۔ مادی لحاظ سے یا دنیوی سامانوں کے لحاظ سے اپنی مدافعت کا کوئی سامان ان کے پاس نہ تھا مگر اللہ تعالیٰ جو عظیم قدرتوں کا مالک ہے اس کی حفاظت کا شرف انہیں حاصل تھا چنانچہ ہجوم باہر کا دروازہ توڑ کر اندر صحن میں داخل ہو گیا پھر اندر کے صحن کا دروازہ توڑ ہی رہے تھے کہ کسی نامعلوم وجہ سے اپنے آپ ہی واپس چلے گئے اب دنیا کو تو وہ وجہ نظر نہیں آتی لیکن ہمیں تو وہ وجہ نظر آتی ہے یہ دراصل اللہ تعالیٰ کا زبردست رُعب تھا جو ان کے دلوں پر ڈالا گیا اور وہ اس وجہ سے ڈر کر واپس چلے گئے چنانچہ یہ ایک عظیم معجزہ اور اللہ تعالیٰ کے پیار کا ایک عجیب مظاہرہ تھا جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں رونما ہوا۔ جس

سے ہمیں بھی یہ سبق ملتا ہے کہ اگر ہم بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ پر توکل کریں گے تو ہمیں بھی اس طرح اللہ تعالیٰ کی حفظ و امان حاصل رہے گی اور مخالف کا کوئی وار کامیاب تو کیا ہوگا وہ اس موقعہ پر خود ہی خائب و خاسر ہو کر لوٹ جائے گا۔

پس یہاں خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ جو شخص اپنے گھر بار کو خدا کے سپرد کر کے خدا تعالیٰ کے لئے اپنا وقت دینے کیلئے چلا جاتا ہے وہی عقل مند ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ میرا گھر ننگا ہے پہرے کا کوئی انتظام نہیں اجازت دیجئے کہ میں جہاد میں شامل ہونے کی بجائے گھر بار کی حفاظت کروں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ایسا شخص دراصل غیر محفوظ ہے وہ چاہے جتنے مرضی انتظام کرے، مضبوط سے مضبوط قلعے بنا لے وہ ملک الموت سے بچ نہیں سکتا وہ ایسے وقت میں اس کے پاس پہنچ جاتا ہے کہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔

بعض دفعہ دشمن الٰہی سلسلہ پر حملہ آور ہوتا ہے اور ظاہری لحاظ سے وہ سمجھتا ہے کہ میں غالب آ گیا ہوں چنانچہ وہ جماعت کے امام کو کہلا بھیجتا ہے کہ آپ لوگوں کی جان صرف اس صورت میں بچ سکتی ہے کہ آپ اس قسم کا ایک بیان جاری کر دیں لیکن اسے یہی جواب سننا پڑتا ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی حفاظت میں ہیں تم کیا تمہارے جیسے کروڑوں بھی آ جائیں ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے ہمیں اپنے قادر و توانا خدا پر بھروسہ ہے اور یقین ہے کہ اس کی حفاظت ہمارے شامل حال ہے۔ اس حقیقی حفاظت اور سچی امان کو چھوڑ کر ہمارا جھوٹے وعدوں کی طرف متوجہ ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پس الٰہی سلسلوں کا یہی حال ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی جذبہ عقلمندی کہلاتا ہے لیکن جو منافق ہیں جن کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے ہوشیار ہیں دیکھو ہم نے دنیوی حفاظت کیلئے کیسی عقلمندی، ہوشیاری اور چالاکی سے کام لیا کہ بیک وقت دعویٰ ایمان کی وجہ سے مسلمانوں کی صفوں میں بھی شامل رہے اور پس پردہ منکرین اسلام سے بھی بنائے رکھی۔ وہ اپنی اس حماقت کو عقلمندی سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا مورد ہیں ان کے سروں پر اللہ تعالیٰ کے غضب کا کوڑا اسی طرح لہراتا ہے جس طرح بجلی آسمان سے کوندتی ہے اور جس چیز پر گرتی ہے آنکھ جھپکنے میں اس کو بھسم کر کے رکھ دیتی ہے۔ کراچی میں پتہ نہیں آپ کو ایسے موقعے ملتے ہیں یا نہیں مگر خدا تعالیٰ کے اس قہر کے کئی نشان دیہاتوں میں اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنے قہر

سے بچائے۔ انسانی ہمدردی کے لحاظ سے احمدی یا غیر احمدی سب برابر ہیں۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں کا یہ واقعہ ہے کہ ہماری زمینوں کے قریب ہی ایک غیر از جماعت زمیندار کے پانچ جانور (تین ایک طرف اور دو دوسری طرف آمنے سامنے) باندھے ہوئے تھے۔ اچانک بجلی گری اور ایک طرف کے دونوں جانوروں اور پاس کے درخت کے ایک حصے کو ایک سیکنڈ کے اندر بالکل راکھ بنا کر رکھ دیا اگر انسان اس درخت کو کاٹ کر اس کی راکھ بنانا چاہتا تو شاید اس کو کئی دن لگ جاتے مگر خدا تعالیٰ کے قہر کے اس ایک جلوے نے ایک سیکنڈ کے اندر درخت کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے یہ جلوے بھی اپنے اندر کئی سبق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ اپنے بندوں کو متنبہ کرتا ہے کہ دیکھو میرے فضل اور میری رحمت کے بغیر ایک پل بھر کے لئے بھی تمہاری زندگی اس کی صحت اور بقاء قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر میرا فضل شامل حال نہ ہو تو میرے قہر کا ایک معمولی سا جلوہ تمہارے درخت وجود کو جلا کر خاکستر کر دے۔ اس لئے اپنی حفاظت کے لئے میری پناہ میں آجاؤ اور میرے دامن سے اپنے آپ کو وابستہ کر لو۔ پس مومن بندہ اس حقیقت سے آگاہ اور باخبر ہوتا ہے اور اسی لئے وہ ہمیشہ اپنے ربّ کے حضور سجدہ ریز رہتا ہے لیکن جب ایک منافق سے یہ کہا جائے کہ اپنے ربّ سے بے نفس ایثار اور سچے خلوص کا تعلق قائم کرو اور اس کے لئے جس قربانی کا مطالبہ ہو اس کو پورا کرو تو وہ آگے سے کہہ دیتے ہیں کہ اس قسم کا ایمان تو دراصل ایک پاگل پن کی دلیل ہے ایک مجنونانہ فعل اور احمقانہ حرکت ہے۔ ہم اتنے عقلمند ہو کر بھلا کیوں اس قسم کا ایمان لائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان سے کہہ دو هُمُ السُّفَهَآءُ بیوقوف اور احمق تو دراصل تم ہی ہو لیکن بیوقوف اور احمق ہونے کے علاوہ بڑے بدبخت بھی ہو کہ تمہیں اپنی بیوقوفی اور حماقت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ احمق جو اپنی حماقت کا احساس رکھتا ہے وہ خود بھی بہت سی تکلیفوں سے محفوظ رہتا ہے اور دوسرے بھی اس کے آزار سے بہت حد تک محفوظ رہتے ہیں کیونکہ اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اتنا دماغ نہیں دیا جتنا دوسروں کو دیا گیا ہے لیکن جو شخص اپنی حماقت کا احساس نہیں رکھتا وہ ہر وقت معرضِ خطرہ میں رہتا ہے اور نقصان سے دوچار رہتا ہے۔ اسی واسطے دانشمندوں کا یہ قول ہے کہ ایک بیوقوف دوست کی نسبت ہزار عقلمند دشمن اچھے ہوتے ہیں کیونکہ بسا اوقات ہزار عقلمند دشمن کسی کو وہ نقصان نہیں پہنچا سکتے جو ایک بیوقوف دوست کے ہاتھوں اسے اُٹھانا پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ میری نگاہ میں اور میری صفات سے متصف میرے بندوں کی نگاہ میں بھی بیوقوف تم ہی ہو خواہ تم کتنے ہی عقلمند کیوں نہ بنتے پھرو۔ پس منافقین کی یہ بنیادی علامات ہیں جن کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی اشارہ کیا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ اپنی منافقت کو عقلمندی سمجھتے ہیں خدائے رحمٰن کو بھی اپنا سردار سمجھتے ہیں اور شیطان کو بھی اپنا سردار سمجھتے ہیں اور جو خدا کا بندہ خدا کی صفت رحمانیت کا مظہر ہے وہ بھی ظلّی طور پر رحمٰن ہے ہر انسان اپنے محدود دائرہ میں ظلّی طور پر اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کو منعکس کر کے ربّ بھی ہے رحمٰن بھی ہے رحیم بھی ہے اور مالک بھی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے کہ ہماری جماعت پر یہ فرض لازم ہے کہ دوست ان صفات باری تعالیٰ کو ظلّی طور پر اپنے اندر بھی پیدا کریں۔ پس ایک ایسا شخص جو رحمٰن اور شیطان میں فرق نہیں کر سکتا وہ بھلا عقلمند کیسے ہو سکتا ہے؟ منافق بے شک اپنے آپ کو عقلمند سمجھتے پھریں اللہ تعالیٰ کا ان کے متعلق فیصلہ یہ ہے کہ وہ پرلے درجے کے سفیہہ بڑے ہی بیوقوف اور سخت احمق ہیں کیونکہ یہ تو رحمٰن اور شیطان میں بھی فرق نہیں کر سکتے۔ یہ ان کی بیوقوفی اور حماقت کی دلیل نہیں تو اَور کیا ہے اس دورنگی کو عقلمند کون کہہ سکتا ہے کہ جب اپنے شیطان سرداروں کے پاس جاتے ہیں تو ان کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں لیکن مومنوں کے پاس آ کر اسی زبان سے مومنانہ جذبات کا اظہار بھی کر رہے ہوتے ہیں اور بڑی چرب زبانی سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص خدائے رحمٰن اور شیطان ملعون میں فرق نہ کر سکے وہ سفیہہ یعنی پرلے درجے کا بیوقوف نہیں تو اور کیا ہے لیکن اپنی سفاہت کا احساس نہ رکھنے کی وجہ سے یا محض شرارت کی نیت سے عقلمند کے روپ میں تمہارے سامنے آئیں گے۔ بظاہر بڑے عقلمند بڑے مصلح نہایت ہمدرد اور پکے مومن۔ لیکن در پردہ منافق ہوں گے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے جماعت مومنہ! میں تم پر یہ اعتماد کر رہا ہوں اور تمہارے سامنے ان کی علامات کو کھول کھول کر اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ تم بھی ہمیشہ ایسے گروہ سے چوکس اور بیدار رہو جس طرح یہ لوگ مجھے بیوقوف نہیں بنا سکے اسی طرح یہ تمہیں بھی بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ (بِقُدْرَتِهِ الْكَامِلَةِ)

پس اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ہر سہ جماعتوں کے متعلق ان کی خصوصیات، کیفیات اور علامات

کو ظاہر فرما دیا ہے مومنوں کے لئے غیر محدود ترقیات کے دروازے کھولے۔ منکرینِ اسلام کے متعلق فرمایا کہ جب تک ان کی یہی کیفیت رہے گی یہ ایمان لانے کی سعادت سے محروم رہیں گے انہیں اس وقت تک ایمان کی توفیق نہیں مل سکتی جب تک اپنی اس بنیادی کمزوری کو دور نہ کریں کہ اپنے ہاتھوں سے انہوں نے جو غلط قسم کی مہریں اور پردے اپنے دل، کان اور آنکھ پر ڈال لئے ہیں وہ ہٹا نہ دیں۔ جب تک ان کی یہ حالت تبدیل نہیں ہوتی انہیں ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔ اس سے ہمیں بھی یہ بتانا مقصود ہے کہ تم بھی دیکھو کہ وہ مہریں کیسی ہیں ان کو کس طرح توڑا جا سکتا ہے تا کہ ایمان سے محروم اپنے ان بھائیوں کی خدمت کر سکو چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا کہ وہ پردے اس شکل کے ہیں، اس رنگ کے ہیں اور ان اثرات کے حامل ہیں لہٰذا تم ان پردوں کو ہٹا کر اپنے بھائیوں کو جو اس وقت تک ایمان کی دولت سے محروم ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کے نشان دیکھنے اور ان پر ایمان لانے کے قابل بنا سکتے ہو۔

پھر اس گروہ کا ذکر فرمایا جو مومن ہونے کا لیبل لگا کر مومن ہی کے روپ میں اُمّتِ مسلمہ میں گھسے رہتے ہیں اور اندر ہی اندر نفاق کا بیج بوتے ہوئے اُمّتِ کے شیرازہ کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان آیات کے علاوہ بھی قرآن کریم نے کئی دوسری جگہ اس گروہ کی مختلف روحانی بیماریوں اور اس کی مفسدانہ کارروائیوں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے لیکن یہاں ان آیات میں اس گروہ سے متعلّق چند بنیادی علامات کو واضح کیا گیا ہے جہاں تک ان کی بیماریوں اور ان کے فتنوں کا تعلّق ہے ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ جب بیماری کہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا اس کی اپنی ذات کو نقصان پہنچ رہا ہے لیکن جب فتنہ کہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری جماعت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ یوں دراصل ان کی بیماریاں اور ان کے فتنے ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں پس قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے منافق کی بیماریوں، اس کے فتنوں وغیرہ کے متعلق اور پھر ان کا کس طرح ازالہ کیا جا سکتا ہے اس کے متعلق وضاحت سے بیان فرمایا ہے کہ اگرچہ ان بیماریوں کا علاج اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے لیکن چونکہ اس کے مومن بندے اس کی صفات کے مظہر ہوتے ہیں اس لئے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہونے کی حیثیت میں ان کی بیماریوں کے علاج میں کوشاں رہتے ہیں۔ پس ان آیات میں منافقین کی بنیادی کمزوریوں کو بیان فرمایا۔ ان سے بچنے کی تلقین فرمائی اس لئے یہ مضمون اس اعتبار سے بنیادی

حیثیت کا حامل ہے کہ اس میں ان بیماریوں سے بچنے کی راہیں بتائی گئی ہیں۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۸۵۰ تا ۸۶۵)

اگرچہ ہر نبی کے ساتھ یہی معاملہ رہا ہے لیکن بڑا نمایاں ہو کر ہمارے محبوب آقا محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت پر ہمیں یہ نظارہ دکھائی دیتا ہے کہ کچھ لوگ تو ایمان لائے سچا اور حقیقی ایمان اور اُنہوں نے اپنی زندگیاں اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دیں۔ وہ ہر دم اور ہر آن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آواز پر لبیک کہتے رہے اور اسی میں اپنی عزت سمجھتے رہے اور اسی میں اپنی فلاح پاتے رہے اور اسی کے ذریعہ اُخروی زندگی میں اپنے لئے جنتوں کی تلاش کرتے رہے۔

ایک گروہ تھا جو آپ کی صداقت کا منکر ہوا۔ اس گروہ میں سے آہستہ آہستہ ایمان لا کر کئی لوگ جماعتِ مومنین میں شامل ہوئے یا پھر اپنے اپنے وقت پر اس جہان سے کُوچ کر گئے اور اُن کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے جا پڑا۔ جس سلوک کے وہ مستحق تھے وہ اُن سے ہوا ہوگا لیکن چونکہ اُس زندگی سے ہمارا تعلق نہیں اِس لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے جو وعدہ کیا ہے اس کے مطابق اُن کو یقیناً سزا دی ہوگی۔

ایک تیسرا گروہ جو بڑا نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے وہ منافقین کا گروہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی میں جس قسم کا خبیثانہ نفاق پایا جا سکتا ہے اور جس کا ذکر خود قرآن کریم نے کیا ہے اُس کے متعلق یہ سمجھنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد اُمّتِ محمدیہ میں ایسا نفاق ظاہر نہیں ہوگا صحیح نہیں ہے۔ اس بات کو عقل تسلیم نہیں کرتی۔ قرآن کریم نے ایک جگہ پر یہ ہدایت کی ہے کہ منافقوں کی سال میں (مَرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ) ایک دو بار آزمائش کرتے رہنا چاہیے اور اُن کو ٹٹولتے رہنا چاہیے۔ اس سے بھی بعض اصلاح کر لیتے ہیں اور بعض گند کے اس مقام پر جہاں کھڑے تھے وہاں کھڑے رہتے ہیں یا بعض اس گند میں ترقی کرتے ہیں بہرحال اِلٰہی سلسلوں کو چوکس اور بیدار رہ کر اپنی اجتماعی، اخلاقی اور روحانی زندگی گزارنی چاہیے۔

اِس وقت مَیں اس سلسلہ میں بعض آیات جن کا مَیں نے انتخاب کیا ہے پڑھوں گا اور ساتھ اُن کا ترجمہ کروں گا۔ ویسے قرآن کریم نے بہت سے دیگر مقامات پر بھی منافقین کا ذکر کیا ہے لیکن اگر وہ آیات بھی میں پڑھنے لگوں تو یہ بہت لمبا مضمون بن جائے گا اس لئے میں نے چند آیات کو منتخب کیا

ہے دوست ان کو غور سے سُنیں۔قرآن عظیم نے ہماری بھلائی اور ہدایت کے لئے جو باتیں بیان کی ہیں انہیں سمجھنے کی کوشش کریں انہیں یاد رکھیں اوران سے فائدہ اُٹھائیں۔

سورۃ بقرہ کی ابتدا میں تینوں گروہوں کا ذکر ہے تیسرے گروہ کا ذکر وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ سے شروع ہوتا ہے۔اِن آیات کی مَیں نے آغازِ خطبہ میں تلاوت کی ہے ان کا ترجمہ یہ ہے:۔

''اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آنے والے دن پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ ہرگز ایمان نہیں رکھتے۔وہ اللہ کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں دھوکا دینا چاہتے ہیں مگر (واقعہ میں) وہ اپنے سوا کسی کو دھوکا نہیں دیتے لیکن وہ سمجھتے نہیں۔اُن کے دِلوں میں ایک بیماری تھی پھر اللہ نے اُن کی بیماری کو (اور بھی) بڑھا دیا اور اُنہیں ایک دردناک عذاب پہنچ رہا ہے کیونکہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔اور جب اُن سے کہا جائے (کہ) زمین میں فساد نہ کرو (فتنہ نہ پیدا کرو) تو کہتے ہیں ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔

(کان کھول کر) سُنو! یہی لوگ بلا شُبہ فساد کرنے والے ہیں۔مگر وہ (اس حقیقت کو) سمجھتے نہیں اور جب اُنہیں کہا جائے کہ (اسی طرح) ایمان لاؤ جس طرح (دوسرے مخلص) لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا ہم (اس طرح) ایمان لائیں جس طرح بیوقوف (لوگ) ایمان لائے ہیں۔یاد رکھو! (یہ جھوٹ بول رہے ہیں) وہ خود ہی بیوقوف ہیں مگر (اس بات کو) جانتے نہیں۔اور جب وہ اُن لوگوں سے ملیں جو ایمان لائے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو (اس رسول کو) مانتے ہیں اور جب وہ اپنے سرغنوں سے علیحدگی میں ملیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم یقیناً تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف (ان مومنوں سے) ہنسی کر رہے تھے۔اللہ انہیں (اُن کی) ہنسی کی سزا دے گا اور انہیں اپنی سرکشیوں میں بہکتے ہوئے چھوڑ دے گا۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی کو اختیار کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو اُنہیں دُنیوی فائدہ پہنچا اور نہ اُنہوں نے ہدایت پائی۔''

پھر اللہ تعالیٰ سورۃ توبہ میں فرماتا ہے:۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَ قَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ ۝۴۸ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ

قَبْلُ وَ يَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ۞ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ
يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۞ وَ مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ
خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ
اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ
يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۞ وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ
اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۞ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ
بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ
هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۞ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ
حَسْبُهُمْ ۚ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۞ (التوبۃ:۴۸، ۵۰، ۵۱، ۵۸، ۶۱، ۶۲، ۶۵، ۶۷، ۶۸)

اُنہوں نے اس سے پہلے بھی فتنہ (پیدا کرنا) چاہا تھا اور تیرے لئے حالات کو کئی کئی طرح بدلا تھا یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو گیا اور وہ اس فیصلہ کو ناپسند کرتے تھے۔ اگر تجھے کوئی فائدہ پہنچے تو اُن کو بُرا لگتا ہے اور اگر تجھ پر کوئی مصیبت آ جائے تو وہ کہتے ہیں ہم نے تو پہلے ہی سے اپنے پیش آنے والے دنوں کا انتظام کر لیا تھا اور وہ خوشی کے مارے پیٹھ پھیر کر چلے جاتے ہیں۔ تُو (اُن سے) کہہ دے ہم کو تو وہی پہنچتا ہے جو اللہ نے ہمارے لئے مقرر کر چھوڑا ہے وہ ہمارا کارساز ہے اور مومنوں کو چاہیے کہ وہ اللہ پر ہی توکّل رکھیں۔ اور اُن میں سے کچھ (منافق) ایسے ہیں جو صدقات کے بارے میں تجھ پر الزام لگاتے ہیں اگر ان صدقات میں سے کچھ اُن کو دے دیا جائے تو وہ راضی ہو جاتے ہیں اور اگر ان میں سے انہیں کچھ نہ دیا جائے تو فوراً خفا ہو جاتے ہیں۔ اور اُن میں سے بعض ایسے (منافق) بھی ہیں جو نبی کو دُکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو (کان ہی) کان ہے تو کہہ دے کہ وہ تمہارے لئے بھلائی سُننے کے کان رکھتا ہے وہ اللہ پر ایمان لاتا ہے اور جو تم میں سے مومن ہوں اُن (کے وعدوں) پر (بھی) یقین رکھتا ہے اور مومنوں کے لئے رحمت کا موجب ہے اور وہ لوگ جو اللہ

کے رسول کو دُکھ پہنچاتے ہیں اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ وہ تمہارے خوش کرنے کے لئے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں حالانکہ اللہ بھی اور اس کا رسول بھی زیادہ حق دار ہیں کہ اُس کو خوش کیا جائے بشرطیکہ یہ (منافق) سچے مومن ہوں۔ اور اگر تو اُن سے پوچھے (کہ تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو) تو وہ ضرور یہی جواب دیں گے ہم تو صرف مذاق اور ہنسی کرتے تھے۔ تو ان کو جواب دیجیو کہ کیا اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول سے مذاق اور ہنسی کرتے تھے؟ منافق مرد اور منافق عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ وہ بُری باتوں کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں کے خلاف تعلیم دیتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو (خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے) روکتے ہیں۔ اُنہوں نے اللہ کو ترک کر دیا سو اللہ نے بھی ان کو ترک کر دیا۔ منافق یقیناً اطاعت سے نکلنے والے ہیں۔ اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کفار سے جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے وہ اس میں رہتے چلے جائیں گے۔ وہی ان (کی پوری توجہ کھینچنے) کے لئے کافی ہے (اور اس کے علاوہ) اللہ نے ان کو (اپنی درگاہ سے) دھتکار بھی دیا ہے اور اُن کے لئے ایک قائم رہنے والا عذاب (مقدّر) ہے۔‘‘

پھر غزوۂ احزاب کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا - هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا - وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا - (الاحزاب: ۱۱ تا ۱۳)

(ہاں! اس وقت کو یاد کرو) جب کہ تمہارے مخالف تمہاری اوپر کی طرف سے بھی (یعنی پہاڑی کی طرف سے بھی) اور نیچے کی طرف سے بھی (یعنی نشیب کی طرف سے بھی) آ گئے تھے اور جب کہ آنکھیں گھبرا کر ٹیڑھی ہو گئی تھیں اور دل دھڑکتے ہوئے حلق تک آ گئے تھے اور تم اللہ کے متعلق مختلف شکوک میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس وقت مومن ایک (بڑے) ابتلا میں ڈال دیئے گئے تھے اور سخت ہلا دیئے گئے تھے اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب کہ منافق اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری تھی کہنے لگ گئے تھے کہ اللہ اور اُس کے رسول نے ہم سے

صرف ایک جھوٹا وعدہ کیا تھا۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۔ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔(المنٰفقون:۸،۹)

یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول کے پاس جو لوگ رہتے ہیں اُن پر خرچ نہ کرو، یہاں تک کہ وہ (فاقوں سے تنگ آکر) بھاگ جائیں حالانکہ آسمان اور زمین کے خزانے اللہ کے پاس ہیں، لیکن منافق (اس حقیقت کو) سمجھتے نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ کی طرف لوٹ کر گئے تو جو مدینہ کا سب سے معزز آدمی ہے (یعنی عبداللہ بن اُبی بن سلول اپنے زعم میں) وہ مدینہ کے سب سے ذلیل آدمی کو اس سے نکال دے گا۔ اور عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کو ہی حاصل ہے لیکن منافق جانتے نہیں۔

قرآن کریم نے متعدد جگہوں پر مختلف رنگ میں منافقوں کا ذکر کیا ہے ان کی علامتیں بتائی ہیں اور وہ فتنہ پھیلانے کی جو راہیں اختیار کرتے ہیں ان کا ذکر کیا ہے چونکہ قرآن کریم صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہؓ کے لئے نہیں اُترا تھا بلکہ قیامت تک کے انسانوں کے لئے نازل ہوا تھا اور لوگوں کے لئے ہدایت، کامیابی اور فلاح کا ذریعہ اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں اور اس کے پیار کو حاصل کرنے کے لئے آیا ہے اس لئے قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے جن جن مضامین کا ذکر ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن مضامین کو ذہن نشین کیا کریں۔ ہم اپنے ماحول میں اور اپنے معاشرہ میں شیطان کے لئے کوئی راہ کھلی نہ رہنے دیں اور جو طریقے قرآن کریم نے بتائے ہیں وہ واضح ہیں البتہ اُن میں یہ طریقہ نہیں ہے کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا جائے بلکہ دُعا کا طریقہ ہے سمجھانے کا طریقہ ہے اور پھر یہ یقین ہے کہ اگر منافق اصلاح نہیں کریں گے تو اُن کو سزا دینا انسان کا کام نہیں۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مَیں اُن کو اِس دُنیا میں بھی سزا دوں گا اور وہ اُخروی زندگی میں جہنم میں جائیں گے۔ یہ خدا کا کام ہے یہ انسان کا کام نہیں ہے لیکن انسان کا یہ کام ہے کہ وہ کسی منافق کو اپنے معاشرہ میں فتنہ پیدا نہ کرنے دے اللہ تعالیٰ ہمیں چوکس رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (خطباتِ ناصر جلد ششم ۲۶۱ تا ۲۶۷)

آیت ۲۰ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۲۰

وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ کہ وہ ان لوگوں کو جو اس کے منکر ہیں اور اس کی ذات اور صفات کا علم نہ رکھنے کی وجہ سے اس سے دوری کی راہوں کو اختیار کرتے ہیں اپنے غضب کا نشانہ بنانے کیلئے ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے وہ ان پر اپنا غضب نازل کرتا ہے اور اس طرح انہیں پھر واپس لے آتا ہے۔
(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۵۳۰ تا ۵۳۹)

آیت ۴۶ وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝۴۶

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کے بندوں کی جو عاجزی ہے اور تواضع ہے اس میں زیادتی پیدا کرنے کے سامان پیدا کرتا ہے اور ہماری روحانی ترقی کے لئے عجز وانکسار کا پایا جانا ہماری فطرت میں اور اس کی کامل نشوونما ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ ہمیں یہ کہا گیا ہے کہ جب تک تم اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کو مضبوطی سے پکڑو گے نہیں، جو کہتا ہے وہ کرو گے نہیں، جس سے روکتا ہے اس سے باز نہیں آؤ گے اور دعا اور وہ دعا جس کو صلوٰۃ کے لفظ میں یاد کیا گیا ہے اس کے ذریعے سے میرے فضل اور رحمت کو جذب نہیں کرو گے تم میرے قرب کو حاصل نہیں کر سکتے۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ اور صبر اور دعا کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ بہت جگہ اور بھی آیا ہے۔ اس آیت کا انتخاب میں نے اس لئے کیا کہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ صبر وصلوٰۃ کے بغیر کوئی استعانت، مدد نہیں مل سکتی، اس کی رحمت اور اس کا فضل اور اس کی برکتیں تمہیں حاصل نہیں ہوسکتیں اور صبر اور صلوٰۃ، عجز اور انکساری کی بنیادوں کے اوپر اٹھتے ہیں۔ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ اور بے شک فروتنی اختیار کرنے والوں کے سوا دوسروں کے لئے یہ امر مشکل ہے یعنی جو فروتنی کرنے والے ہیں صرف ان کے لئے یہ مشکل نہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے اور اس کی ہدایت کے

مطابق صبر اور صلوٰۃ پر کار بند ہوں۔

صبر کے بنیادی معنی تو ہیں استقلال کے ساتھ اور استقامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننا اور ان کے مطابق اپنی زندگی گزارنا۔لیکن اللہ تعالیٰ کے احکام جو ہیں وہ ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور عربی زبان بہت سے بنیادی ایسے پہلوؤں کے ساتھ صبر کا لفظ استعمال کرتی ہے اس لئے مفرداتِ راغب نے اس کے معنی کرتے ہوئے یہ کہا کہ صبر کے اصل معنی تو یہ ہیں کہ حَثُّ النَّفْسِ عَلٰى مَا يَقْتَضِيْهِ الْعَقْلُ وَ الشَّرْعُ کہ مضبوطی کے ساتھ اپنے نفس کو اس مقام پر قائم رکھنا جس مقام پر قائم رہنے کا عقل اور شریعت مطالبہ کرتی ہے، تقاضا کرتی ہے لیکن اس کی وہ کہتے ہیں مختلف شکلیں نکل آتی ہیں۔مصیبت کے وقت صبر کرنا، جس کا مطلب ہے واویلا نہ کرنا اور کوئی ایسی بات نہ کرنا، نہ بولنا جس سے یہ معلوم ہو کہ انسان کا تعلق خدا تعالیٰ سے نہیں بلکہ اس کے غیر کی طرف وہ رجوع کر رہا ہے یا خدا تعالیٰ پر اسے کامل بھروسہ نہیں اور اس کے جو احکام ہیں جس شکل میں بھی وہ آتے ہیں ان پر وہ پوری طرح راضی نہیں۔

دوسرے اس کے معنی میدانِ جنگ میں ایک کیفیت ہے اس کے متعلق بولا جاتا ہے۔وہ شجاعت ہے جس معنی میں اسلام نے اسے استعمال کیا ہے۔شجاعت کے معنی ہیں وہ بہادری جس کا تقاضا احکامِ قرآنی کر رہے ہیں۔مثلاً قرآن کریم نے شجاعت کے معنوں میں یہ تقاضا کیا کہ ایک وقت میں کہا کہ اگر ایک ہو گے تو دو پر بھاری یعنی ایک ہزار تم ہو گے میدانِ جنگ میں تو دو ہزار پر بھاری ہو گے۔پھر کہا تمہیں ہم روحانیت میں ترقی دیں گے تم ایک ہزار ہو گے دس ہزار پہ بھاری ہو گے۔تو یہ شجاعت، یہ ہے شجاعت جس کو قرآن کریم کی اصطلاح میں صبر کہہ سکتے ہیں میدانِ جنگ میں۔

بڑا بہادر تھا طارق جس نے اپنی کشتیاں جلائیں اور کامل توکل خدا تعالیٰ پر کیا۔اس نے سوچا ہو گا شاید کہ میرے مقابلہ میں ایک وقت میں میرے پاس (کچھ اور فوج مل گئی تھی ان کو) بارہ ہزار ہیں تو ایک لاکھ بارہ ہزار سے زیادہ تو کسی میدان میں جمع نہیں ہوں گے اس واسطے مجھے کشتیوں کے سہارے کی ضرورت نہیں، میرے لئے خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ کافی ہے۔کس قدر شجاعت کا مظاہرہ کیا خدا تعالیٰ کے احکام پر قائم ہو کر اور دنیا کے لئے ایک حیرت اور ایک اعجوبہ بن گیا طارق۔لیکن صرف طارق ہی تو نہیں جس جگہ ہماری ساری تاریخ میں خدا تعالیٰ کے احکام پہ عمل کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کی ہدایت

کے مطابق صبر کا نمونہ دکھایا مسلمان نے اور کامل توکل کیا اپنے ربّ پر دشمن کے تیر ان کی پیٹھ پر نہیں پڑے سینوں پر کھائے۔

ایک صبر کے معنی ہیں آفاتِ سماوی آتی ہیں آزمائش کے لئے اس وقت زجر نہ کرنا۔

چوتھے معنی ہیں زبان پر قابو رکھنا۔ بہت سارے لوگوں کو عادت ہے ویسے ہی بولتے رہتے ہیں اور فتنہ پیدا ہوتا ہے اور وہ خوشحال معاشرہ اور پُرامن معاشرہ جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے ان کی زبان اس میں رخنے پیدا کر دیتی ہے۔ زبان پر قابو رکھنا اس معنی میں بھی صبر کا لفظ آیا ہے کہ اپنی زبان کو احکامِ الٰہی کی رسیوں میں باندھو اور جتنی، جب اجازت ہو جس حد تک بولنے کی اس سے زیادہ نہ بولو۔ نہ کرنے والی بات کر نہ دینا، گالی نہ دینا، افترا نہ کرنا، اتہام نہ لگانا، بدظنی نہ کرنا وغیرہ وغیرہ خدا تعالیٰ نے بہت سے احکام ایسے ہیں جن کے ذریعے سے زبان پر پابندیاں لگائی ہیں اور ان احکام کے مطابق اپنی زبان کا استعمال کرنا اللہ تعالیٰ کی اصطلاح میں ایک یہ بھی صبر ہے۔

پانچویں، مفرداتِ راغب میں ہے، یہ معنی ہیں اس کے کہ عبادتِ الٰہی میں جس حد تک ممکن ہو مشغول رہنا اور ہمارے لئے تو اللہ تعالیٰ نے ہر وقت مشغول رہنے کا سامان پیدا کر دیا۔ جس وقت ہم باجماعت نماز پڑھ رہے ہیں وہ بھی عبادت میں مشغول ہیں لیکن خدا تعالیٰ نے یہ کہا کہ یہ ضروری نہیں کہ ایک اجتماعی نماز کے وقت بھی میری عبادت میں تم مشغول ہو، کھڑے ہونے کی حالت میں، بیٹھے ہونے کی حالت میں، لیٹے ہونے کی حالت میں تم میرا ذکر کر سکتے ہو اور میری عبادت میں مشغول رہ سکتے، میری صفات کا ورد کر سکتے ہو، ان کے واسطے سے مجھ سے مانگ سکتے ہو اور دعائیں کر سکتے ہو، اپنی ضرورتیں میرے سامنے پیش کر سکتے ہو، دعا اور صلوٰۃ میں ہر وقت مشغول رہ سکتے ہو اور جو دعا کرتے ہوئے سو جاتا ہے سوتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ اس کو ایسا ہی ثواب دے دیتا ہے۔

اور چھٹے یہ کہ اھوائے نفس کے خلاف ہر وقت جہاد میں مشغول رہنا۔ یہ جو انسان کا نفس ہے نا یہ بڑا تنگ کرتا ہے انسان کو اور چوکس اور بیدار رہ کے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی عظمت اور اس کے جلال کو سامنے رکھے بغیر انسان اپنے نفس سے کامیاب جنگ نہیں کر سکتا۔

تو وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ میری مدد حاصل کرو صبر کے ساتھ۔ اور جو صبر ہے وہ عاجزی کے بغیر تم نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہم نے صبر کے معنی کئے تھے مصیبت کے وقت جزع فزع نہ کرنا۔ جو عاجز بندہ ہے وہ تو

کہے گا کہ جو جتنی دیر میں اس مصیبت سے امن میں رہا اس کا بھی میرا کوئی میرے ربّ پہ حق نہیں۔ تو جب وہ چیز مجھ سے لے لی گئی اور میرے پر بے اطمینانی کے حالات پیدا ہو گئے تو میں کیا شکوہ کروں خدا سے۔ جب وہ اطمینان جو میرے پاس تھا وہ میرا حق نہیں تھا تو جو مجھ سے لیا گیا وہ میرا حق چھینا نہیں گیا لیکن اگر کوئی شخص کہے اتنا بڑا میرے ربّ نے میرے پر یہ ظلم کر دیا، بے صبری کی بات ہو گئی نا، عاجزی کی بات نہ رہی نا، تکبّر کی بات ہو گئی نا، فخر کی بات ہو گئی نا، اِباء کی بات ہو گئی نا، شیطانی کلمہ منہ سے نکل گیا نا، زبان پر قابو نہ رکھنا مثالوں پہ گیا تو بہت مثالیں دیں تو دیر ہو جائے گی۔ اکثر زبان کا وار جو ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے احکام کو توڑنے والا، وہ اپنی بڑائی کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ ایک عاجز بندہ اپنی زبان سے دوسرے کو دکھ دے ہی نہیں سکتا۔ خدا تعالیٰ نے تو یہاں تک حکم دیا کہ شرک سب سے بڑا گناہ، مشرک کو میں اس کا گناہ معاف نہیں کروں گا لیکن تمہیں میں تمہاری زبان کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ جن بتوں کی وہ پرستش کر رہے ہیں ان کو تم گالی دو وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (الانعام: ۱۰۹) کہ جو شخص خدا کے اس حکم کو توڑ کے بت کو گالی دیتا یا کسی اس کے بندے کے خلاف بدزبانی کرتا ہے وہ جس کے خلاف بدزبانی کرتا ہے اس سے خود کو بڑا سمجھتا ہے نا تبھی اس نے اپنا یہ حق سمجھا نا کہ اس کو گالیاں دینی شروع کر دیں، بدزبانی اس کے خلاف شروع کر دی۔

تو جب تک صحیح اور حقیقی خشوع نہ ہو، عاجزی نہ ہو، انکسار نہ ہو، تواضع نہ ہو صبر کے تقاضے نہیں پورے کئے جا سکتے اور اسی واسطے میں نے شروع میں کہا کہ جو صبر ہے وہ عاجزی اور انکسار کی بنیادوں پر کھڑا ہوتا ہے۔

دوسرے ہے صلوٰۃ۔ صلوٰۃ کے معنی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے۔ دعا سے مختلف ہیں۔ صلوٰۃ دعا بھی ہے لیکن ہر دعا جو ہے وہ صلوٰۃ نہیں ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

”جب انسان کی دعا محض دنیوی امور کے لئے ہو تو اس کا نام صلوٰۃ نہیں۔ (یہ بات میں اپنی طرف سے واضح کر دوں کہ اللہ تعالیٰ نے دنیوی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بھی ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم خدا سے مانگیں لیکن یہاں یہ سوال نہیں کہ وہ حکم ہے یا نہیں، یہاں یہ ہے کہ اس کو دعا نہیں ہم کہتے۔ ضروری ہے آپ نے فرمایا جوتے کے تسمے کی بھی ضرورت ہے تو یہ نہ سمجھو کہ کوئی دکان تمہیں تسمہ دے دے گی، مجھ سے مانگو) لیکن جب انسان خدا کو ملنا چاہتا

ہے اور اس کی رضا کو مدّ نظر رکھتا ہے اور عجز، انکسار، تواضع اور نہایت محویت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہو کر اس کی رضا کا طالب ہوتا ہے تب وہ صلوٰۃ میں ہوتا ہے۔''

اور پھر آپ دوسری جگہ فرماتے ہیں

''دل پگھل جائے اور روح پانی کی طرح حضرتِ احدیت کے آستانہ پر گرے'' (یہ ہے صلوٰۃ)

تو جو معنی صلوٰۃ میں، صلوٰۃ کے لفظ میں، موٹے تو ہر ذہن میں آتے ہیں دعا کرنا یا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ایک خاص دعا ہے، یہ آتے ہیں لیکن اس کے معنی میں عجز اور انکساری بھی شامل ہے وہ جو چھپا ہوا حصہ تھا اس معنی کا اس آیت نے اسے کھول کر بیان کر دیا اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ کہ جب تک عجز و انکسار کی راہوں کو اختیار نہ کیا جائے تم وہ حقیقی دعا جسے ہم صلوٰۃ کہہ سکتے ہیں وہ خدا تعالیٰ سے مانگ نہیں سکتے۔ (خطبات ناصر جلد نہم صفحہ ۱۹۳ تا ۱۹۷)

آیت ۴۷ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۷﴾

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس (ماہ رمضان) کو صبر کا مہینہ بھی کہا ہے اور جو آیت ابھی میں نے تلاوت کی ہے یعنی وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے۔ اس کا ایک بطن میرے نزدیک یہ بھی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ صبر کے ذریعہ یعنی رمضان کی ذمہ داریاں نبھانے، عبادات بجا لانے اور دعا کے ساتھ مجھ سے مدد مانگو وہ دعا جو عبادت ہے وہ تو صبر کے اندر آ جاتی ہے کیونکہ جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ یہ ماہ صبر یا ماہ رمضان پانچ عبادات پر مشتمل ہے۔ ان عبادات میں دعا بھی شامل ہے۔ رات کے نوافل بھی شامل ہیں لیکن اس ماہ کی دعا یعنی ماہ رمضان کی دعا جو نوافل ہیں اور جو عبادات کے طور پر ہیں اس کے علاوہ ایک اور دعا کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ نماز جو عبادت ہے وہ تو صبر کے اندر آتی ہے لیکن یہاں الصلوٰۃ کے لفظ سے اس معنی میں جو مَیں کر رہا ہوں ایک خاص دعا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ فرمایا ہے کہ اگر تمہیں مجھ سے استعانت حاصل کرنے، مجھ سے مدد حاصل کرنے اور استمداد کی خواہش ہو تو تمہارے لئے ضروری ہے کہ جتنی طاقت اور قوت اب تک تمہیں مل چکی ہے اور عطا ہو چکی ہے اسے تم میری راہ میں خرچ کرو یعنی اپنی تدبیر کو اپنی انتہاء تک پہنچاؤ۔

صبر جن عبادات کی طرف اشارہ کر رہا ہے (میں نے بتایا ہے کہ یہ لفظ اصولی طور پر تمام ذمہ داریوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے) وہ یہ ہیں۔

۱۔ دنیا کو خدا کے لئے چھوڑنا۔ ۲۔ خدا کے لئے آفاتِ نفس سے بچنا۔ ۳۔ اللہ کی رضا کے لئے دوسروں سے عدل وانصاف سے بڑھ کر جود وسخا کا معاملہ کرنا۔ ۴۔ اپنے محبوب کی محبت کی تڑپ کی وجہ سے راتوں کی نیند بھول جانا اور اس کا احساس بھی نہ رکھنا۔ ہر وقت اور راتوں کو اُٹھ کر بھی اللہ کے حضور جھکنا اس سے پیار کا اظہار کرنا اور اس کے پیار کو طلب کرنا۔ ۵۔ آفاتِ نفس سے بچنا۔ یہ پانچوں چیزیں اس جگہ صبر کے لفظ کے اندر آجاتی ہیں کیونکہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے ماہِ رمضان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شَهْرُ الصَّبْرِ (یعنی صبر کا مہینہ) بھی کہا ہے اور صبر کے معنی ہیں استقلال کے ساتھ ان باتوں پر کار بند رہنا اور بندھے رہنا (جیسے ایک آدمی دو چیزوں کو باہم باندھ دیتا ہے اور پھر وہ ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوسکتیں) اسی طرح صبر کے معنی میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ انسان خود کو ان چیزوں سے جن کا ہماری عقل تقاضا کرتی ہے یا جن کا ہماری شریعت (قرآن کریم) تقاضا کرتی ہے اس طرح باندھ لے کہ پھر جُدائی کا امکان ہی باقی نہ رہے اور اس معنی کے لحاظ سے صبر کے اندر تمام ذمہ داریاں اور ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے ثباتِ قدم کا حصول اور ان کو پوری ہمت اور عزم کے ساتھ ادا کرنا سب چیزیں آجاتی ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر تم ربّ العالمین کی مدد چاہتے ہو تو تمہیں آج تک ربّ العالمین نے جو کچھ دیا ہے وہ اس کی راہ میں خرچ کرو۔ صلوٰۃ کا لفظ جو یہاں نمایاں کر کے دیا گیا ہے اس سے مراد عام عبادت یعنی نماز نہیں۔ ایک دعا تو وہ ہے جو تدبیر اور دعا کو بریکٹ کرنے کی کیفیت کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ یعنی دعا کرتے وقت انسان خدا کی حمد بیان کرتا ہے اس کی قدّوسیت بیان کرتا ہے اور اس کی تمام صفات کو اپنے ذہن میں حاضر رکھتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اے خدا ہم کمزور ہیں ہم حتی الوسع طاقت خرچ کر رہے ہیں۔ ہم خلوص رکھتے ہیں اور نیک نیت بھی ہیں۔ مگر نہیں کہہ سکتے کہ ہماری نیتیں نیک ہیں اور ہمارا خلوص واقعہ میں خلوص ہے اور ہماری جو کوشش ہے واقعہ میں مقبول ہونے والی ہے تو ہماری کوششوں کو قبول کر۔ اس آیت میں صلوٰۃ کے لفظ کو جو علیحدہ کیا گیا ہے یہ میرے نزدیک یہ بتانے کے لئے ہے کہ یہ دعا بھی ہونی چاہیے کہ اے خدا تو ہماری دعا قبول کر۔ پس دعائیں دو قسم کی ہیں ایک دعا وہ ہے جو انسان تسبیح اور تحمید کے ساتھ

خدا تعالیٰ کے حضور جھک کر مانگتا ہے اور ایک دعا وہ ہے جو انسان خدا سے مانگتا ہے کہ اے خدا تو ہماری دعاؤں کو قبول کر کیونکہ محض دعا سے ہمیں تسلی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ قبول نہ ہو۔ اسی لئے اس آیت میں صلوٰۃ کے لفظ کو دوبارہ لایا گیا ہے کیونکہ عام نماز تو صبر کے لفظ کے اندر آ جاتی ہے۔

یہاں وہی مضمون نسبتاً وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے جو سورہ فاتحہ میں اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ میں بیان ہوا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی بڑی لطیف تشریح کی ہے کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ (ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں) کا مطلب یہ ہے کہ تو نے ہمیں جو بھی قوتیں اور طاقتیں عطا کی ہیں ہم ان سب کو خرچ کرتے ہوئے تیری عبادت کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص عمل نہ کرے اور صرف دعا کرے تو وہ شوخی دکھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا کہ میں نے جو تمہیں دیا تھا۔ اس سے تو تُو نے فائدہ نہیں اُٹھایا پھر تو مجھ سے اور کیوں مانگ رہا ہے.....

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہِ رمضان کو صبر کا مہینہ کہا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ فرمایا ہے کہ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ رمضان کی عبادتوں کو توجہ، ہمّت اور عزم سے ادا کرو اور اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ ادا کرو۔ عاجزی، فروتنی اور انکسار کے ساتھ ادا کرو۔ دوسروں پر صرف عدل اور انصاف ہی کا ہاتھ نہ رکھتے ہوئے بلکہ ان کے سروں پر جود اور سخا کا ہاتھ رکھتے ہوئے اور اپنے نفس کو بُرائیوں سے بچاتے ہوئے ان عبادات کو ادا کرو اور اپنے نفس کو شریعت کے احکام کا اس طرح پابند کرتے ہوئے ادا کرو کہ پھر احکام شریعت اور نفس انسانی میں دُوری پیدا نہ ہو سکے۔ پھر اللہ تعالیٰ سے یہ بھی کہو کہ اے خدا تو نے مجھے جو کچھ دیا تھا میں نے اس سے کام لیا ہے اور اتنا کام لیا ہے جتنی میری طاقت تھی۔ لیکن اے میرے ربّ تو نے ہمیں مزید رفعتوں کے حصول کی استعداد عطا کی ہے۔ ان مزید رفعتوں کے حصول کے لئے جس چیز کی بھی ضرورت ہے وہ ہمیں عطا کر۔ ہم تیرے ناشکرے بندے ثابت نہیں ہوئے لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم اپنی طاقت سے آئندہ بھی ناشکر گزار بندے نہیں بنیں گے۔ اس لئے تیرے حضور ہماری یہ التجا بھی ہے کہ تو ہمیں ہمیشہ اپنے ہاتھ کا سہارا دے تو ہمیں ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھتا کہ ہم ہمیشہ ہی تیرے شکر گزار بندے بنے رہیں۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۹۶۷ تا ۹۷۱)

آیت ۸۸ وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَ قَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَ اٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤی اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِیْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۸﴾

دوسری چیز جو تکبّر کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے وہ الٰہی اور آسمانی تعلیم سے محرومی ہے اللہ تعالیٰ سورۃ بقرہ میں فرماتا ہے:۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤی اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ یعنی جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول اس تعلیم کو لے کر آیا جسے تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے تو تم نے تکبّر کا مظاہرہ کیا یعنی اپنی بدعادات، گندی روایات، بدرسوم اور جھوٹے اعتقادات کو اپنے تکبّر کی وجہ سے آسمانی تعلیم سے بہتر سمجھا اور آسمانی تعلیم کو اپنے تکبّر کی وجہ سے تم نے ٹھکرا دیا۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ جن لوگوں میں تکبّر پایا جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو صاحبِ عظمت، صاحبِ رفعت اور صاحبِ طاقت و دولت سمجھتے ہیں اور دوسروں کو اپنے جیسا نہیں سمجھتے، پھر اس تکبّر کے نتیجہ میں ہر وہ رسم ہر وہ عادت ہر وہ خیال اور ہر وہ اعتقاد جو وہ بچپن سے سنتے آئے ہیں قبول کر لیتے ہیں اور جب ان گندی چیزوں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرماتے ہوئے اور صحیح عقائد ان کے سامنے رکھنے کے لئے اپنے رسول کو بھجواتا ہے اور وہ اس کی لائی ہوئی آسمانی ہدایت کو سنتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ خدا تعالیٰ کے شکرگزار ہوں اور کہیں کہ ہمارے ربّ نے ہم پر رحم کیا اور ہمارے لئے ہمارے کسی عمل کے بغیر اور ہمارے کسی استحقاق کے بغیر آسمان سے ہدایت کو نازل کیا تا کہ ہم اپنی پیدائش کے مقصد کو حاصل کر سکیں اور خدا تعالیٰ کے قرب کو پا سکیں انہوں نے وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ (الاعراف:۱۷۷) کے ماتحت اپنی ہی پسند، اپنی ہی خواہش اور اپنی ہی عادتوں کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت، اس کی تعلیم اور آسمانی نور کے مقابلہ میں افضل، اعلیٰ اور ارفع سمجھا اور اس طرح وہ الٰہی ہدایت اور آسمانی نور کے قبول کرنے سے محروم ہو گئے۔ سو یہ بھی

ایک نہایت ہی بھیانک، بُرا اور مہلک نتیجہ ہے جو تکبّر کی وجہ سے نکلتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ آیت اس طرف بھی اشارہ کر رہی ہے کہ ایک تو وہ لوگ ہیں جو کافر ہوئے جو منکر ہوئے اور انہوں نے خدا تعالیٰ کے رسول کو نہیں مانا یہ لوگ تو خدا تعالیٰ کی ہدایت اور نور سے محروم تھے ہی لیکن جو لوگ خدا اور اس کے رسول کو ماننے والے ہیں وہ بھی بعض دفعہ اپنے تکبّر کی وجہ سے الٰہی ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کا نفس مثلاً پسند نہیں کرتا کہ کوئی شخص ان کے پاس آئے اور ان کو یہ بتائے کہ تمہارے اندر فلاں کمزوری پائی جاتی ہے تم اسے دُور کرو۔ وہ کہتے ہیں ہماری بے عزّتی ہوگئی یا مثلاً کوئی شخص کسی بڑے مالدار کو یہ کہے کہ دیکھو تم غریبوں پر رحم کیا کرو تو وہ سمجھتا ہے کہ اس شخص نے میری بے عزّتی کی ہے اور اس طرح وہ اپنے آپ کو اسلامی حکم سے بالا سمجھنے لگتا ہے اور اپنے آپ کو ان فیوض سے محروم کر لیتا ہے جن فیوض کو وہ اسلامی تعلیم کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہے۔

(خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۲۵۳ تا ۲۵۴)

آیت ۱۰۷ مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝۱۰۷

مُصَدِّقُ الَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡهِ یہ قرآن پہلی کتب کی تصدیق کرتا ہے۔ میں جو تصدیق کا ذکر ہے اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ تصدیق کا ایک طریق قرآن کریم نے یہ بیان فرمایا ہے۔ مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ کہ جب بھی ہم کسی پیغام کو منسوخ کریں یا بھلا دیں اس سے بہتر یا اس جیسا پیغام ہم دنیا میں لے آتے ہیں۔ اس آیت میں تین باتیں بیان ہوئی ہیں۔

ایک یہ کہ پہلی کتب کی بعض باتوں کو بعض ہدایتوں کو قرآن کریم نے منسوخ کر دیا ہے اور جب اللہ تعالیٰ یہ اعلان فرماتا ہے کہ مَیں نے پہلے جو کتاب بھیجی تھی اس کی یہ یہ ہدایتیں منسوخ کی جاتی ہیں تو اس اعلان میں اس کتاب کی تصدیق بھی ہو رہی ہوتی ہے یعنی منسوخ کا اعلان خود تصدیق کر رہا ہوتا ہے۔ اس بات کی کہ وہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نازل کی گئی تھی جسے اب اللہ تعالیٰ منسوخ کر رہا ہے۔

دوسرے اس میں یہ بتایا کہ جو جو بنیادی صداقتیں پہلی کتب میں تھیں وہ تمام کی تمام ہم نے قرآن کریم میں جمع کر دی ہیں۔ مِثْلِهَا میں اسی طرف اشارہ ہے۔ مِثْل اس لئے کہا۔ پہلے مجمل طریق پر یہ صداقتیں بیان ہوئی تھیں اور حکمت بتائے بغیر۔لیکن اب وہ کامل اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں رکھ دی گئی ہیں بالکل وہی نہیں۔ کیونکہ بالکل وہی ہوں تو اس سے قرآن کریم میں نقص لازم آتا ہے لیکن ہیں ویسی ہی مگر زیادہ اچھی شکل میں اور زیادہ تفصیل کے ساتھ۔

بِخَيْرٍ مِّنْهَا وہ باتیں جن کی پہلی امتیں حامل نہ ہوسکتی تھیں بیان کر دیں اس لئے اس میں وہ ابدی صداقتیں بھی ہیں جو پہلی ہدایتوں کی جگہ آئیں اور ان سے زیادہ خوبصورت شکل میں۔اس میں ضمناً یہ بھی بتادیا کہ چونکہ پہلی کتب محرف ومبدّل ہوگئیں اس لئے مجموعی طور پر ان شریعتوں کو منسوخ کرنا پڑا مجموعی طور پر اس لئے کہ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں اب بھی بعض باتیں اسی شکل میں موجود ہیں جس شکل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔لیکن مجموعی طور پر وہ شریعت انسانی دخل کی وجہ سے اس قدر محرّف ہوچکی ہے کہ اس میں وہ برکت، وہ حسن اور اللہ تعالیٰ کا وہ جلوہ نظر نہیں آرہا ہے جو برکت، جو حُسن اور جو جلوۂ الٰہی اس میں نزول کے وقت تھا اس لئے قرآن کریم نے اسے منسوخ کر دیا لیکن اس کی بنیادی صداقتوں کو لے لیا۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک اور بات بھی بتائی ہے وہ یہ کہ ہم انسان کے ذہن سے شریعت کو مٹا کر (کہ وہ اسے بالکل بھول جائے) بھی منسوخ کیا کرتے ہیں۔

اگر قرآن کریم ان نامعلوم شریعتوں کا (جو نامعلوم تعداد میں دنیا کی طرف بھیجی گئیں اور جن کا اب نام ونشان نہیں) نام لیتا تو ہمارے دماغوں میں بڑی الجھن پیدا ہوجاتی۔مثلاً اگر کہا جاتا کہ افریقہ میں فلاں نبی پر فلاں شریعت نازل ہوئی۔حالانکہ نہ دنیا کی تاریخ نے اس نبی کے نام کو محفوظ رکھا ہوتا، نہ اس کی شریعت کے نام کو محفوظ رکھا ہوتا۔اور نہ اس کی کتاب کے کسی حصے کو محفوظ رکھا ہوتا تو کیسی مشکل پیش آتی؟ تاریخِ انسانی ان چیزوں کو بھلا چکی ہے۔فرمایا کہ بعض شریعتوں کو اور بعض کتبِ سماوی کو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے گذری تھیں ہم نے ذہنِ انسانی سے بھلا کر انہیں منسوخ کر دیا ہے۔خدا تعالیٰ تو عَلِيْم ہے وہ تو نام بھی لے سکتا تھا لیکن اگر وہ ایسا کرتا تو ہمارے لئے پریشانی کا باعث بنتا۔اس واسطے اس کے رحم نے تقاضا کیا کہ ان کو بھولا رہنے دے اور اس طرح

ان کو منسوخ کردے۔ سو یہ بھی منسوخ کرنے کا ہی ایک طریق ہے۔

جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے کہ شریعت یا اس کا کوئی حصہ منسوخ کیا جائے (کسی اعلان کے نتیجہ میں) یا شریعت کا کوئی حصہ زیادہ اچھی شکل میں قرآن کریم میں نازل کردیا جائے یا یہ اعلان کردیا جائے کہ ہم نے نام لئے بغیر بعض شریعتوں کو منسوخ کردیا ہے۔ ہر سہ صورتوں میں قرآن کریم مصدّق بنتا ہے۔ ان سب پہلی شریعتوں کا کیونکہ اعلانِ تنسیخ اور اعلانِ نسیان خود تصدیق ہے کہ وہ شریعتیں یا ان شریعتوں کے وہ حصّے جو بنیادی صداقتیں تھی جن میں انسان کی طرف سے کوئی ملاوٹ نہیں کی گئی وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے تھیں۔ (خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۳۶۵ تا ۳۶۷)

آیت ۱۱۲، ۱۱۳ وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۱۲ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۱۱۳

(ترجمہ) اور وہ (یعنی یہودی اور مسیحی) کہتے ہیں کہ جنّت میں سوائے ان کے جو یہودی ہوں یا مسیحی ہوں ہرگز کوئی داخل نہیں ہوگا۔ یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں۔ تو انہیں کہہ دے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔ بھلا کیوں داخل نہ ہوں گے۔ جو بھی اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردے اور وہ نیک کام کرنے والا بھی ہو تو اس کے ربّ کے ہاں اس کے لئے بدلہ مقرر ہے اور ایسے لوگوں کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

سورۃ بقرہ کی ان دو آیات میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ یا بعض فرقے یہ سمجھتے ہیں کہ جنّت کے دروازوں کی چابی ان کے پاس ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ ان سے تعلّق رکھنے والے ہیں صرف وہی اس تعلّق کی بنا پر جنّت کے مستحق ہیں اور تمام وہ لوگ جو ان سے تعلّق نہیں رکھتے محض ان سے تعلّق نہ رکھنے کی بنا پر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ان کے پاس اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ لوگ محض خوش فہمی میں مبتلا ہیں حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ جو

خلوصِ نیّت کے ساتھ اپنا سارا وجود خدا کے سپرد کر دے یعنی اسی کا ہو رہے اور جو احکام خدا نے دیئے ہیں انہیں پورے اخلاص اور تعہّد کے ساتھ بجالائے اور اس طرح نیک اعمال بجالانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے وہ جنّت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ ان آیات سے صاف عیاں ہے کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو جنّت کا مستحق قرار دے۔ یہ فیصلہ تو خدا نے کرنا ہے کہ کون بَلٰی ۗ مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحۡسِنٌ کا مصداق ہونے کے باعث جنّت کا مستحق ہے اور کون خدا تعالیٰ کا نافرمان ہونے کے باعث جہنم کا حقدار ہے۔ محض نام کی بنا پر کوئی شخص بھی جنّت کا مستحق نہیں ٹھہر سکتا۔ خدا تعالیٰ تو صرف اُس کو ہی جنّت کا مستحق قرار دے گا جو اس کے احکام پر چلنے والا ہوگا......

اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کی ان دو آیات میں یہ بتایا ہے کہ یہود اور نصاریٰ کا اپنی اپنی جگہ یہ کہنا کہ بجز یہودیوں کے اور کوئی جنّت میں نہیں جائے گا یا بجز نصاریٰ کے جنّت میں جانے کا اور کوئی مستحق قرار نہیں پائے گا ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اس حقیقی مسلمان کو جنّت میں جانے کا حقدار قرار دے گا جو اپنے وجود کو اعتقادی اور عملی طور پر خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دکھائے اور جو اس درجہ محسن للہ ہو کہ بجز طاعتِ خالق اور ہمدردیٔ مخلوق کے اس میں اور کچھ باقی نہ رہے اس کے جنّت کا مستحق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ کی رو سے خدا تعالیٰ ایسے حقیقی اور کامل فرمانبردار مومن کو اسی دنیا میں جنّت عطا کر دیتا ہے۔ وہ جس حال میں بھی ہو دِم نقد بہشت میں ہوتا ہے۔ پھر وہ اگلے جہان میں بھی اسے جنّت عطا کرے گا۔ سو گویا وہ ایک جنّت سے نکل کر دوسری جنّت میں داخل ہو جائے گا۔

سورۃ بقرۃ کی ان آیات کی رُو سے کسی کے جنّت کا مستحق ہونے کا فیصلہ خدا نے کرنا ہے۔ انسانوں کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ خود اپنے یا کسی اور کے جنّت میں جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کریں۔ جو یہ فیصلہ کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ اصل چیز تو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی زندگی کو وقف رکھنا ہے جس نے اپنی زندگی خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر کے اور محسن للہ ہو کر اسی دنیا میں جنّت حاصل نہیں کی وہ محض رسمی تعلق کی بنا پر اگلے جہان میں جنّت میں کیسے چلا جائے گا جائے گا وہی جو بَلٰی ۗ مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ کا مصداق ہوگا اور کون اس کا مصداق ہے اور کون نہیں ہے یہ خدا تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس کا فیصلہ اس نے ہی کرنا ہے یہ فیصلہ کرنے کا اختیار بجز اس

کے اور کسی کو حاصل نہیں۔ ہمیں خدا تعالیٰ نے ایک سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، وہی راستہ جو اسلام کا راستہ ہے اور ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس پر چل کر اپنے آپ کو ایسا بنائیں کہ ہم خدا تعالیٰ کی نگاہ میں مومن اور جنّت کے مستحق قرار پاتے چلے جائیں۔ پس ہم اس امر کی پرواہ کئے بغیر کہ دائیں طرف سے آوازیں آرہی ہیں یا بائیں طرف سے آوازیں آرہی ہیں اس راستہ پر چلتے چلے جائیں گے۔ (خطبات ناصر جلد ششم صفحہ ۱۴۵ تا ۱۴۸)

جہاں تک کمیونزم (اشتراکیت) یا سوشلزم یا دوسرے مختلف ازم جن میں کیپٹیل ازم بھی شامل ہے، کا تعلق ہے ان کے متعلق ہم مسلمانوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام اس قدر کامل اور مکمل نظام زندگی پیش کرتا ہے کہ دنیا میں معاشی اور اقتصادی مساوات کے قیام کی کوئی انسانی کوشش اس کی ہوا کو بھی نہیں پہنچتی وہ اس کی رفعتوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ اس لئے ہمیں اسلامی نظام زندگی کو سمجھنے اور اس کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اسلام کا نظام زندگی جس میں معاشیات اور اقتصادیات بھی شامل ہیں ایک مرکزی نقطہ پر قائم ہے اور وہ ہے اللہ اسلام نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اللہ تمام صفاتِ حسنہ سے متّصف اور اپنی ذات میں اور صفات میں کامل ہے ہمارا پیدا کرنے والا ہے، وہ ہمارا آقا ہے، ہمارا ربّ ہے وہ ہمیں زندگی بخشتا ہے اور ہماری زندگی کو قائم رکھنا بھی اسی کا کام ہے اور ہر چیز اسی کی ملکیت ہے اس لئے ہمیں ہر وقت اس سے ایک زندہ تعلق قائم کرنے کی ضرورت ہے ہر مخلوق کا وہی خالق ہے اور ہر خلق کا کوئی مقصد ہے اور وہ مقصد یہ ہے اے انسان! کہ ہر چیز کو تیرے لئے پیدا کیا گیا ہے پس کسی فردِ واحد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ حقیقی اور غیر مشروط ملکیت کا دعویٰ کرے۔ ہر انسان کے پاس جو چیز بھی ہے وہ بطور امانت کے ہے اور اپنی امانتوں کو دیانتداری کے ساتھ ادا کرنا اس کا فرض ہے۔ اسلام نے اللہ تعالیٰ کی تمام ایسی صفات کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے اور وہ تشبیہی صفات کہلاتی ہیں۔

اس مرکزی نقطہ یعنی ''اللہ'' کے تصوّر سے دو خط ممتد ہوئے یعنی دو لکیریں نکلیں ایک خط یا لکیر کو ہم وہ ''صراطِ مستقیم'' کہتے ہیں جو بندے کو خدا تک پہنچاتا ہے یعنی حقوق اللہ کی ادائیگی اور دوسرا وہ خط ہے جو بندہ کو بندہ کے ساتھ اخوت اور محبّت اور ہمدردی اور غم خواری اور احسان اور ''ایتاءِ ذی القربیٰ'' کے رشتوں کے ساتھ باندھتا ہے اسے ہم حقوق العباد کا راستہ کہتے ہیں یعنی وہ راستہ جس پر چل کر اسلام کی

تعلیم کے مطابق حقوق العباد حاصل کئے جانے چاہئیں۔ان دونوں خطوط یا لکیروں کا ذکر اس آیہ کریمہ میں ہے جو ابھی میں نے تلاوت کی ہے۔اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی تعلیم دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے ایک یہ کہ اللہ کی رضا کے لئے اپنی تمام خواہشات کو ترک کر دیا جائے اور اس کی رضا کے لئے اپنے پر موت وارد کی جائے اور اس سے ایک نئی اخلاقی اور روحانی زندگی حاصل کی جائے۔اس حصہ کا ذکر مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ میں ہے دوسرا خط یا لکیر جو اس مرکزی نقطہ سے نکلی وہ ''وَهُوَ مُحْسِنٌ'' کا خط یا لکیر ہے اسلام کی مادی، تمدنی، معاشی، سیاسی، اقتصادی تعلیم اسی سے تعلق رکھتی ہے۔

احسان کے ایک معنی ہیں خوبصورت بنانا اور دوسرے معنی ہیں نیک عقائد اور نیک تعلیم کا علم حاصل کرنا اور ان پر عمل کرنا۔انسان کو انسان سے باندھنے والے اس خط کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ہم نے انسانی معاشرہ کی جو تعلیم دی ہے اگر تم اس پر چلو تو دنیا میں ایک نہایت حسین اور جمیل معاشرہ قائم ہو جائے گا تو اس معاشرہ کی بنیاد احسان پر ہے۔ احسان کے معنی ہیں جتنا حق دوسرے کا مجھ پر ہے میں اسے اس سے زیادہ دوں اور جتنا حق میرا دوسرے پر ہے میں اس سے کم حق اس سے وصول کروں۔ جتنے جھگڑے آج دنیا میں یا آج کل بدقسمتی سے ہمارے ملک میں پیدا ہو گئے ہیں یہ ''احسان'' کی نیگیشن (Negation) یعنی نفی ہے یعنی ہر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے میرے حق سے زیادہ دو یا وہ یوں کہتا ہے کہ جو میرا حق ہے وہ مجھے دو اور جو تمہارا حق ہے وہ میں دینے کے لئے تیار نہیں اور اس طرح فتنہ کا دروازہ کھل گیا ہے۔اسلام نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اسلامی معاشرہ احسان کی بنیاد پر قائم ہے یعنی ہر شخص اور ہر گروہ اپنے حق سے کم وصول کرنے میں بشاشت محسوس کرے اور جو حق دوسرے کے اس پر ہیں اسے اس سے زیادہ دینے میں خوش ہو اگر یہ معاشرہ قائم ہو جائے تو کوئی جھگڑا باقی نہیں رہتا مثلاً قرآن کریم نے ہر انسان کا یہ حق قائم کیا ہے کہ وہ بھوکا نہیں رہے گا یعنی کم سے کم خوراک جو اس کی زندگی کے قیام اور اس کی صحت کی بحالی کے لئے ضروری ہے وہی اسے ملنی چاہیے اگر قرآن کریم میں صرف اسی قدر بیان ہوتا تو پھر بھی جھگڑا پیدا ہونے کا احتمال تھا کہ معلوم نہیں ابھی ضرورت پوری ہوئی ہے یا نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ انسان کی زندگی کے قیام اور صحت کی بحالی کے لئے جو کم سے کم خوراک درکار ہے اس کو اس سے کچھ زیادہ دو تا کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو، بدظنی پیدا نہ ہو، اگر مثلاً ایک کارخانہ دار ایک مزدور کو اس کے حق سے کچھ زائد دینے پر اصرار کرے اور

مزدور سے اپنے حق سے کچھ کم لے رہا ہو تو بڑا پُرسکون اور اطمینان بخش معاشرہ پیدا ہو جاتا ہے اگر کوئی مزدور اپنے حق سے کچھ لینے پر بھی غصہ میں نہ آئے اور دوسرے کو اس کے حق سے بھی زیادہ دینے کو تیار ہو تو پھر بھی کوئی جھگڑا پیدا نہیں ہوگا یعنی ہر شخص کی یہ خواہش ہونی چاہیے کہ میں نے دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینا ہے۔ ایک سرمایہ دار کی یہ کوشش ہوگی کہ مزدور یا کسان کو اس کے حقوق سے زیادہ مل جائے اور مزدور اور کسان یہ کوشش کریں گے کہ اسلامی تعلیم کے مطابق دوسروں کا اس پر جو حق بنتا ہے ہم اس سے کچھ زیادہ ہی دے دیں تو کوئی حرج نہیں اگر اس بات میں مقابلہ ہو جائے تو بڑا ہی حسین اور اطمینان بخش معاشرہ قائم ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ خالق کل مالک کل کے مرکزی نقطہ سے نکلا ہوا پہلا خط (یعنی حقوق اللہ) جو ہے اس کا بھی ایک اثر اور ایک عکس آپس کے تعلّقات پر پڑتا ہے اور اس آیت سے جو میں نے تلاوت کی ہے تین باتوں کا پتہ لگتا ہے جن کی طرف میں مختصراً اشارہ کر دیتا ہوں۔

اصل بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو حقوق بندہ پر ہیں ان کو ادا کیا جائے وہ ہمیں پیدا کرنے والا ہمیں زندگی بخشنے والا، ہمیں قائم رکھنے والا، ہماری ربوبیت کرنے والا، ہمیں استعدادیں بخشنے والا اور ان استعدادوں کو کمال تک پہنچانے والا اور ساری دنیا کو ہماری خدمت پر لگانے والا ہے ہر آن ہمارا ہر ذرّہ اس کے احسانوں کے نیچے دبا ہوا ہے ہمیں اس کے شکر گذار بندے کی حیثیت سے زندگی کے دن گذارنے چاہئیں اور جو شخص ان حقوق کی ادائیگی میں اپنے نفس پر ایک موت وارد کرتا اور اپنی خوشیوں کو اس کی رضا کے لئے چھوڑتا ہے اس کے اس فعل کا اثر انسان کے آپس کے تعلّقات پر بھی بہت گہرا پڑتا ہے مثلاً پہلی بات ہمیں ایسے مسلم کے متعلق جو بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کی تعلیم پر کاربند ہے یہ نظر آئے گی کہ وہ ایک خوف زدہ دل سے اپنے مخالف کی بات سنے گا اور تحمّل سے اس کو جواب دے گا۔ جو شخص خوف زدہ دل کے ساتھ اپنے مخالف کی بات نہیں سنتا اس میں انانیت ابھی باقی ہے اور جو تحمّل کے ساتھ اسے جواب نہیں دیتا اس کا نفس ابھی موٹا ہے اس نے ابھی اپنے نفس کو خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان نہیں کیا۔

دوسرا اثر ان حقوق اللہ کی ادائیگی کے نتیجہ میں انسانی معاشرہ پر یہ پڑتا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حقوق کو دیانت داری کے ساتھ اور ایثار اور قربانی اور اخلاص کے ساتھ ادا کرنے والے ہیں اور

وحدت باری میں گم اور فنا ہیں وہ خشک جھگڑوں میں کبھی نہیں پڑتے وہ سخت گوئی اور بدزبانی کو کبھی اپنا شیوہ نہیں بناتے وہ دوسروں پر وحشیانہ حملے نہیں کیا کرتے ان کو تو ہر وقت اپنی فکر رہتی ہے وہ اپنے نفسوں کی اصلاح میں لگے رہتے ہیں ان کا دل ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے کہ کہیں کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے کہ جس کے نتیجہ میں وہ اپنے محبوب حقیقی سے سچا تعلّق پیدا کرنے میں ناکام ہو جائیں اور اس کے غضب کو مول لے لیں۔ غرض حقوق اللہ کی ادائیگی کے نتیجہ میں باہمی محبت اور پیار اور انکساری اور عاجزی کی فضا پیدا ہوتی ہے اور انسان ایک دوسرے کو کھانے کو نہیں دوڑتا۔ زبانیں تیز نہیں کی جاتیں بلکہ دعائیں دی جاتی ہیں کیونکہ سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔

تیسرا اثر جو حقوق اللہ کی ادائیگی کے نتیجہ میں انسانی معاشرہ پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص کسی کے عقائد اور خیالات اور نظریات کا مخالف ہو وہ اپنے مخالف کی جان اور مال اور عزّت کو تباہ کرنے کے پیچھے نہیں پڑتا، اس کا دشمن نہیں بن جاتا اور اسے نابود کرنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ تشدّد کا نعرہ نہیں لگاتا اور نہ ظالمانہ راہوں کو اختیار کرتا ہے بلکہ انصاف اور خدا ترسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھتا ہے وہ پیار اور محبّت سے اپنے نظریات کو قائم کرنا چاہتا ہے اور پیار اور محبّت کے ساتھ اپنے حقوق کو لینا چاہتا ہے کیونکہ جو شخص غیر کی جان یا اس کے مال یا اس کی عزّت کا دشمن ہوا اس کے دل میں ایک بُت ہے وہ خدائے واحد و یگانہ کی پرستش نہیں کر رہا وہ خدا میں ہو کر اپنے حقوق کے حصول کی کوشش نہیں کر رہا وہ اپنے نفس کو اتنا مضبوط اور طاقتور سمجھتا ہے کہ کہتا ہے کہ جس بات کو میں صحیح سمجھتا ہوں وہ ہونی چاہیے نہیں تو میں دوسرے کی گردن کاٹ دوں گا لیکن وہ شخص جو بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کی ہدایت کا قائل ہو اور اس پر عمل پیرا ہو وہ اپنے مخالف کے عقائد اور اس کے نظریات کو سن کر اس سے دشمنی کی بجائے محبّت کا سلوک کرتا ہے اور اس کو کاٹنے کی بجائے اس کی مدد کو آتا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ظالم کو ظلم سے روکنے سے اس کی مدد کر۔ (صحیح البخاری کتاب المظلوم باب اَعِنْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مظلومًا) پھر دشمنی کہاں رہی پھر تو محبت قائم ہو گئی۔

غرض یہ تین موٹے اثر ہیں جو حقوق اللہ کی ادائیگی کے نتیجہ میں حقوق العباد، باہمی تعلقات اور نظام حیات پر پڑتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم صحیح معنی میں مسلم بن جاؤ اور اپنے پر ایک موت وارد کر کے اپنی ساری خوشیوں کو خدا کی خوشی اور رضا پر قربان کر دو تو اس کے دو نتیجے نکلیں گے، ایک تو

حقوق اللہ کی ادائیگی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ سے اجر پاؤ گے دیکھو دنیا میں کوئی ایسا معاشرہ یا کوئی ایسا نظریہ یا کوئی ایسی جدوجہد نہیں جس کا یہ دعویٰ ہو کہ ہم غریب کو اس کا حق دلاتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ہمیں خدا تعالیٰ کی رضا بھی حاصل ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ سے ہمیں اجر ملے گا۔ کمیونزم کیپیٹل ازم یا دوسرے جو ازم ہیں ان میں یا تو خدا کا تصور نہیں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا ملنے کا تصور نہیں کیپیٹیلسٹ اقوام اگرچہ زبانی طور پر اپنے ایک خود تراشیدہ معبود کو مانتی ہیں لیکن وہ یہ دعویٰ نہیں کرتیں کہ اگر ہم نے اقتصادی مساوات قائم کی تو اس کے بدلہ میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا اپنے محبوب کی طرف سے اجر ملے گا لیکن اسلام یہ کہتا ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے نتیجہ میں سب سے بڑا فائدہ تمہیں یہ ہوگا کہ اس دنیا میں بھی تمہیں ایک جنّت مل جائے گی اور اُخروی دنیا کے جنّت کے بھی تم وارث بنو گے (فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ) پھر جو جنّت اس دنیا میں ملے گی اس میں دو خصوصیتیں ہوں گی ایک تو خوف نہیں ہوگا دوسرے حزن نہیں ہوگا۔ جب ہر شخص دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینے کے لئے تیار ہوگا تو کسی کو یہ ڈر تو نہیں ہوگا کہ میرا حق مارا گیا ہے یا مارا جا سکتا ہے خوف کا تو سوال ہی نہیں رہتا ہر شخص اس کوشش میں ہوگا کہ وہ اپنے بھائی کو اس کے ان حقوق سے کچھ زیادہ دے جو اسلام نے مقرر کئے ہیں اور جب ہر شخص کو اس کے حق سے بھی زیادہ مل جائے گا تو غم کس بات کا؟

(خطبات ناصر جلد دوم صفحہ ۵۴۷ تا ۵۵۱)

الٰہی سلسلوں کے دو امتیازی نشان ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ الٰہی سلسلوں میں داخل ہونے والا اور اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ جماعت کا فرد عبدِ مسلم ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ عبدِ محسن ہوتا ہے۔

میں نے جو آیت ابھی تلاوت کی ہے اس میں ان دونوں باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ اسلام نام ہے اس بات کا کہ انسان کا اپنا کوئی ارادہ باقی نہ رہے اور اس پر ایک موت وارد ہو جائے۔ انسان اپنی تمام خواہشات کے ساتھ اور اپنی تمام قوتوں کے ساتھ اپنے ربّ کے پاؤں پر گر جائے اور اس سے یہ کہے کہ اے میرے پیدا کرنے والے محبوب! جو کچھ مجھے ملا وہ تیرے فضل سے ملا۔ جو کچھ مجھے مل رہا ہے وہ تیرے فضل سے مل رہا ہے اور جو کچھ مجھے ملے گا وہ بھی تیرے فضل سے ہی ملے گا کیونکہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ میری آنکھ صرف اس وقت دیکھ سکتی ہے جب تیرا فضل اسے کہے کہ وہ دیکھے۔ میری زبان صرف اس وقت بول یا چکھ سکتی ہے، جب زبان پر تیرا حکم نازل ہو کہ وہ بولے اور لذت

اور سرور حاصل کرے۔ اسی طرح میرے کانوں کی شنوائی بھی تیری رحمت کی محتاج اور میرے حواس کی حِس بھی تیرے فضل کے بغیر زندہ اور قائم نہیں رہ سکتی۔ اے خُدا! تو نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ تو قادر و توانا ہے اور بہت کچھ دے سکتا ہے۔ ہماری امیدوں سے بھی زیادہ، ہماری توقعات سے بھی زیادہ، ہمارے تخیل اور تصوّر سے بھی زیادہ دے سکتا ہے۔ ہمیں جو کچھ بھی مل سکتا ہے، وہ تیری رحمت کے طفیل ہی مل سکتا ہے۔ ہم تیرے حضور جھکتے اور تیری رضا کی خاطر اور تیرے وصال کے لئے تیری محبت پانے کے لئے ہم اپنے اوپر ایک موت وارد کرتے ہیں۔ اے زندہ اور زندگی بخش! تو ہماری اس موت کو اپنی راہ میں قبول کر اور ہمیں وہ زندگی دے جس پر فرشتے بھی رشک کریں.......

دوسرا امتیازی نشان الٰہی جماعتوں اور ان جماعتوں کے افراد میں یہ نظر آتا ہے کہ وہ عبدِ محسن ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص خدا تعالیٰ کی راہ میں تمام شرائط کے ساتھ اعمالِ صالحہ کو بجالانے والا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر احسان کرنے والا ہوتا ہے۔

احسان کے لفظ کو جب دوسروں پر احسان کے معنوں میں استعمال کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو حقوق دیئے تھے، وہ اپنے یہ حقوق بھی اپنے بھائیوں کو دے دیتا ہے اور اسی طرح اپنے حق سے کم لینے پر اس لئے تیار رہتا ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ کی رضا مل جائے اور پھر احسان کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ اسلام میں اللہ تعالیٰ نے ہر فرد واحد کے جو حقوق قائم کئے ہیں، انسان ان حقوق سے زیادہ دینے کے لئے تیار ہوجائے۔ ایسا شخص محسن ہوتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ پیار کرتا ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ محسنوں سے اللہ تعالیٰ پیار کرتا ہے۔ یہ وہ محسن ہوتا ہے جس کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔

پس جب ہم عبدِ مسلم بننے کے بعد عبدِ محسن بھی بن جائیں (یا مجھے شاید یوں کہنا چاہیے کہ) عبدِ مسلم بنے بغیر کوئی شخص حقیقی معنے میں محسن نہیں بن سکتا، اس لئے عبدِ مسلم بھی بنے اور عبدِ محسن بھی بنے اور خدا تعالیٰ کے بندوں سے پیار کرنے لگے اور ان کے لئے اپنے حقوق کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوجائے اور اُن کے اللہ تعالیٰ نے جو حقوق قائم کئے ہیں اُن سے زائد دینے کے لئے تیار ہوجائے تو یہ وہ محسن ہوتا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے میں تمہارے ساتھ ہوں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (العنکبوت: ۷۰) غرض جسے اللہ تعالیٰ کی معیّت

حاصل ہو جائے اُسے کسی غیر کی احتیاج کہاں باقی رہتی ہے مگر جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نہ ہو، وہ ساری دُنیا پر غرور کر کے بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ (خطباتِ ناصر جلد سوم صفحہ ۴۵۷ تا ۴۵۹)

قرآن کریم میں یہ بیان ہے کہ مومن، مومن میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جو اسلام لاتے ہیں ان کی ابتدا تو اس نچلے مقام سے شروع ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہہ لیا کرو۔ وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات:۱۵) ابھی تمہارے دل ایمان سے خالی ہیں لیکن وہ مبتدی جن کی ابتدا یہاں سے شروع ہوتی ہے وہ درجہ بدرجہ روحانی میدانوں میں ترقی کرتے ہوئے آخر میں ایک ایسے مقام تک پہنچتے ہیں جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (الانفال:۵) کہ وہ سچے اور پورے اور حقیقی مومن ہیں۔

جو آیت مَیں نے ابھی تلاوت کی اس میں اس آخری رفعت کا ذکر ہے اور ان لوگوں کا ذکر اشارۃً ہے کہ جن کا خاتمہ بالخیر اس مقام پر ہو جاتا ہے......

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا یہ جو گروہ ہے اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ نے بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ والی آیت میں بیان کی ہے۔ وہ آئیڈیل (Ideal) ہے۔ کوئی شخص اس آیت کو سُن کے اور اس کی تفسیر (جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بیان کی ہے جسے پڑھ کر سناؤں گا آپ کو اسے) سُن کے اس شبہ میں نہ رہے۔ ایک: کہ سارے کے سارے مومن اس مقام تک پہنچے ہوئے ہیں۔ نہیں، سارے نہیں پہنچے ہوئے لیکن جو پہنچے ہوئے ہیں وہ بھی اور جو نہیں پہنچے ہوئے اس مقام کو، وہ بھی مسلسل اس کوشش میں ہیں کہ زندگی کے ہر آنے والے لمحہ میں ان پر اللہ تعالیٰ کی اس سے زیادہ برکات نازل ہوں جو گزرنے والے لمحے میں ان پر نازل ہوئیں۔ یہ ایک مسلسل حرکت روحانی میدانوں میں جاری ہے۔ نہ یہ غلط فہمی ہونی چاہیے کہ جو مُؤْمِنُوْنَ حَقًّا بن گئے، مرتے دم تک ان کو کوئی خطرہ نہیں۔ دوم:۔ اس لئے کہ اس میدان کا کوئی کنارہ نہیں کہ جہاں پہنچ کے انسان کی کنارے پر پہنچنے کی کوشش ختم ہو جاتی ہے کیونکہ یہ ساری کوشش خدا تعالیٰ کے قرب کے حصول کے لیے ہے اور جو بُعد انسان اور خدا میں ہے وہ غیر محدود ہے، نہ ختم ہونے والا ہے لیکن قریب سے قریب ہوتا چلا جاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ پیار انسان اللہ تعالیٰ کا حاصل کرتا رہتا ہے اپنی زندگی میں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ آئیڈیل ہے بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ میں جو بیان ہوا۔ سارے یہاں تک نہیں پہنچے لیکن یہ بھی درست ہے کہ ہر ایک کو اس

آئیڈیل، اس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچنے کے لیے کانشسلی (Consciously) بیدار زندگی گزارتے ہوئے کوشش کرنی چاہیے ورنہ ہلاکت ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس مقام کے متعلق جو فرماتے ہیں ایک مختصر سا اقتباس اس وقت میں پڑھ کے دوستوں کو سناؤں گا۔ اس کا ایک ایک حرف جو ہے وہ یاد رکھنے کے قابل ہے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو گزارنے کی کوشش کرنی چاہیے.... حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اور اصطلاحی معنے اسلام کے وہ ہیں جو اس آیت کریمہ میں اس کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ کہ بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ یعنی مسلمان وہ ہے ('' وہ مسلمان جسے مُؤْمِنُوْنَ حَقًّا کے گروہ میں اللہ تعالیٰ نے شامل کیا'' حضور ایدہ اللہ تعالیٰ) جو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے تمام وجود کو سونپ دیوے یعنی اپنے وجود کو اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے ارادوں کی پیروی کے لئے اور اس کی خوشنودی کے حاصل کرنے کے لئے وقف کر دیوے اور پھر نیک کاموں پر خدا تعالیٰ کے لئے قائم ہو جائے اور اپنے وجود کی تمام عملی طاقتیں اس کی راہ میں لگا دیوے'' (آئینہ کمالاتِ اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۵۸) (خطباتِ ناصر جلد نہم صفحہ ۳۴۹ تا ۳۵۱)

میں نے بتایا ہے کہ اصطلاحی معنے لغوی معنی کو محدود کرتے ہیں۔ اسی لئے جب میں ۱۹۶۷ء میں یورپ کے دورے پر گیا تو ایک موقع پر یہ لطیفہ ہوا کہ تین مختلف سوسائٹیز کے چار چار نمائندے بارہ کی تعداد میں جب مجھے ملے (جن میں دو گروہ عیسائی پادریوں کے تھے اور ایک گروہ سکالرز کا تھا) تو اُن سے بڑی اچھی طرح باتیں ہوتی رہیں لیکن ایک پادری کچھ شوخ اور بے ادب تھا۔ اسلام کے متعلق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق جب اس کی زبان سے بے ادبی کا کلمہ نکلا تو خدا تعالیٰ کی عطا کردہ تفہیم کے پیش نظر میں نے اس کو اس معاملے میں جواب نہ دیا بلکہ باتوں باتوں میں یہ کہا کہ سَنْ آف مین (Son of man) نے یہ کہا ہے کہ وہ چونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا بھی مانتے ہیں۔ (حالانکہ سَن آف مین کا محاورہ انجیل میں بڑی کثرت سے استعمال ہوا ہے) اس لئے وہ بڑا اسٹپٹایا۔ اس پر ان سب کی توجہ بٹ گئی اور وہ حملہ سے دفاع کی طرف آ گئے۔ کہنے لگے یہ تو ہماری اصطلاح ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے یہ تمہاری اصطلاح ہے لیکن سن آف مین (Son of

man) کے معنے سن آف مین (Son of man) کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ اصطلاح لغوی معنے کو محدود کرتی ہے اس میں وسعت پیدا نہیں کرتی وہی پادری کہنے لگا نہیں۔ میں نے دل میں کہا میرا مقام بحث کرنے کا نہیں بلکہ اللہ پر توکل کرنے کا ہے چنانچہ جو اِن کا لیڈر تھا اس کو میں نے کہا کہ یہ کہتا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں اس کو جواب دینا نہیں چاہتا تم اس کا جواب دو۔ ان کے لیڈر نے کہا یہ ٹھیک کہتے ہیں تم غلط کہتے ہو۔ غرض اسلام میں اسلام کی اصطلاح لغوی معنی کو بہرحال محدود کرے گی یعنی لغت اگر اسلام کے لفظ کو چار معانی میں استعمال کرتی ہے تو یہ اس سے کم معانی میں استعمال کرے گی۔ چنانچہ اسلام کی اصطلاح بَلٰی ۚ مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡہَہٗ لِلّٰہِ وَ ہُوَ مُحۡسِنٌ میں استعمال ہوتی ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اسلام کے اصطلاحی معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا تمام وجود اللہ تعالیٰ کو سونپ دینا۔ گویا لغوی معنی کے برعکس اپنے آپ کو کسی کے سونپ دینا اصطلاحی معنے ہیں اسلام کے اور بھی معنی ہیں لیکن باقیوں کی نسبت اس کو اصطلاحی معنوں کے لحاظ سے اسلام نے پیش کیا ہے اور یہ اللہ کے حضور اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے متعلق ہے زید بکر یا یہ اور وہ یا بہت یا قوم کی طاقت یا سٹیٹ (State) کمیونسٹ بعض دفعہ کہہ دیتے ہیں کہ ''عوام'' ہمارا خدا ہے ان سب کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کو اسلام نے اس رنگ میں پیش کیا ہے کہ گویا انسان اپنا سب کچھ اس کو سونپ دیتا ہے یہ اور دو قسم کا ہوتا ہے ایک اعتقاداً اور ایک عملاً۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک جگہ مختصراً یہ مضمون بڑے لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ آپ کے نزدیک اعتقاداً سونپ دینے کے معنے یہ ہیں کہ انسان یہ اعتقاد رکھے کہ میرا وجود خدا تعالیٰ کے ارادوں کے ماتحت ارادے رکھنے اور اس کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

ایک مسلمان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انسانی پیدائش کی کیا وجہ ہے۔ خدا نے اُسے کیوں پیدا کیا ہے؟ اعتقاداً مسلمان وہ شخص ہے جو یہ اعتقاد رکھتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ میرے ربّ نے مجھے اس لئے پیدا کیا ہے کہ میں آوارہ ارادوں کا مالک نہ بنوں بلکہ اپنے ارادے اور خواہشات کو خدا تعالیٰ کے لئے وقف کر دوں اپنی ہر خواہش کو اُس کے ارادوں کے ماتحت کر دوں۔ جو اللہ کا ارادہ ہے وہی ہمارا ارادہ ہو جائے۔ جو اللہ کی رضا ہے وہی ہماری رضا بن جائے اور عملاً مسلمان ہونا اور اپنے وجود کو اللہ کو سونپ دینے کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جتنی طاقتیں دی ہیں وہ ساری کی ساری نیکی

کے کاموں پر خرچ ہوں اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی طاقتیں دی ہیں۔اتنی طاقتیں دیں کہ اگر وہ اپنی ساری قوتوں کو بحیثیت انسان مجموعی طور پر استعمال کرے تو زمین وآسمان کو اپنا خادم بنا سکتا ہے اسی لئے انسان کو نہ صرف جسمانی اور ذہنی اور علمی قوتیں عطا کی گئیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اخلاقی اور روحانی قوتیں بھی بخشیں۔جس طرح خلق خدا میں اتنی وسعت ہے کہ اسے ہم غیر محدود کہتے ہیں اسی طرح انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے محدود طاقتیں اور قوتیں عطا کی گئی ہیں۔انسان کہتے ہی اس وجود کو ہیں جو خداداد طاقتوں اور استعدادوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔

اگر آپ سوچیں کہ یہ میرا جسم ہے یہ آپ کا جسم ہے ویسے دراصل انسان صرف جسم کا نام نہیں ہے کیونکہ مادی جسم کے لحاظ سے گدھے کا جسم بھی مٹی کے اجزاء سے بنا ہے اور کتے کا بھی بنا، اونٹ اور بیل اور شیر اور ہاتھی اور بے شمار مخلوق دُنیا کی چرند پرند اور درندے ہیں ان کے وجود بھی بنے اس لئے جہاں تک انسانی نفس کے مادی وجود کا تعلّق ہے۔انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔اس واسطے صرف مادی جسم کے لحاظ سے کسی کو ہم انسان نہیں کہہ سکتے۔آخر جانور اور انسان میں کوئی امتیاز پیدا ہونا چاہیے۔

جہاں تک احساس کا تعلّق ہے ایک درخت میں بھی حِس ہے اور ایک انسان میں بھی حِس ہے۔ایک درخت ایسا بھی ہے کہ اگر انسان اس کو جرأت کر کے ہاتھ لگالے تو اس کے پتے شرما کر سکڑ جاتے ہیں۔درخت میں حِس ہے تو سُکڑتے ہیں۔ان کو اگر آپ ضرورت سے زیادہ غذا دے دیں تو جس طرح انسان کو نقصان پہنچتا ہے۔اسی طرح اس درخت کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔بعض دفعہ انسان زیادہ کھانے سے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔میں اس کا عینی شاہد ہوں۔ایک دفعہ غلطی سے ایک درخت کو شام کے وقت میں نے ضرورت سے زیادہ غذا دے دی۔اور صبح جب میں اُٹھا تو وہ مرا ہوا تھا۔تو یہ حِس انسان اور درختوں کی زندگی میں برابر ہے۔یہ زندگی حیات کا نام ہے۔اس میں حیوان اور انسان برابر ہیں پس وہ کیا چیز ہے جو فرق پیدا کرتی ہے اور امتیاز پیدا کرتی ہے اور فرقان پیدا کرتی ہے انسان اور دوسری خلق میں وہ یہی انسانی قوت اور استعداد ہی تو ہے۔تمام قوتوں کے حصول کے نتیجہ میں انسان کے لئے تسخیر عالمین کا امکان پیدا ہوا۔اگر انسان کو قوتیں دی جاتیں لیکن اس کے اندر ہمت نہ ہوتی اسے عزم نہ عطا کیا جاتا اس کے دل میں کوئی خواہش نہ پیدا ہوتی۔وہ کوئی بڑا ارادہ نہ رکھتا۔اس

کے دل میں کوئی امنگ نہ ہوتی تو ساری قوتیں بیکار تھیں۔ اس لئے ایک طرف تسخیر عالمین کے لئے اس کو قوتیں عطا کی گئیں دوسری طرف اس کے دل میں خواہشات اور ہمت اور ارادہ پیدا کیا گیا۔ کس کام کے لئے تھا یہ عزم اور خواہش اور ارادہ؟ اس کام کے لئے کہ میں اپنی تمام قوتوں کو انتہائی طور پر استعمال کروں گا اور جب اس نے اپنے روحانی مقام کو پہچانا اور روحانی قوتوں کا اُس نے اندازہ لگایا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں اپنے وجود میں کوئی ایسا ارادہ نہیں رکھوں گا جو اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے تضاد رکھنے والا ہو اور اس کے مخالف ہو۔ جو خدا کا ارادہ ہوگا وہی میرا ارادہ ہوگا۔ جو خدا تعالیٰ کی خواہش ہو گی وہی میری خواہش ہوگی۔ تاہم خدا تعالیٰ کے متعلق ہمارے نوجوان سمجھ لیں کہ یہ الفاظ اُس پر پوری طرح چسپاں نہیں ہوتے کیونکہ وہ ہر پہلو ہر لحاظ سے ایک منفرد واحد اور یگانہ ذات ہے لیکن ہم خود ان کو سمجھتے اور دوسرے کو سمجھانے کے لئے اپنے وہ محاورے اور الفاظ استعمال کرتے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے متعلّق ہیں۔ دوسرے معنی میں بھی اللہ تعالیٰ کا عزم اور اس کی خواہش اور اس کا ارادہ ہے مگر جہاں تک انسان کا تعلّق ہے اس کے ماتحت اس کے سائے میں اس کے عکس کے طور پر اس کی تشریح کے طور پر انسان کا ارادہ اور اس کی خواہش ہونی چاہیے۔ خدا نے کہا میں نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری صفات کا مظہر بنے۔ اس لئے انسان کو یہ چاہیے کہ بنیادی طور پر اُس کی ایک ہی خواہش ہو اس کا ایک ہی ارادہ ہو اور وہ یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بنوں گا۔

اسلام کے یہ معنے بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ کے اندر آتے ہیں۔ اعتقادی طور پر اس طرح کہ میری کوئی ایسی خواہش نہ ہوگی میرا کوئی ایسا عزم نہ ہوگا میری کوئی ایسی ہمت نہ ہوگی کوئی ایسا ارادہ نہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے خلاف ہو۔ جو اس کے عزم اور اس کی ہمت سے متضاد ہو تاہم انسان اور اللہ تعالیٰ کی ہمت میں بڑا فرق ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ تمہاری اور اس کی ہمت میں بھی بڑا فرق ہے۔ ہم بڑی کوشش کرتے ہیں اور بڑی محنت کرتے ہیں اور بڑی تکلیف اُٹھاتے ہیں اور بڑا مجاہدہ کرتے ہیں۔ تب اس کے فضل سے نتائج کو پاتے ہیں لیکن وہ تو کسی امر کے متعلق کُنْ کہتا ہے اور وہ وجود میں آجاتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے لیکن کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ارادے اور عزم اللہ تعالیٰ کے عزم اور ارادہ کے ماتحت ہونے چاہئیں۔ انسان کا عزم اور ارادہ تو بہر حال اتنا نہیں ہوتا جتنا خدا کا ہوتا ہے پھر انسان انسان کے عزم و ارادہ میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس مضمون میں

جانے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جتنی طاقتیں دی ہیں خواہش اور ارادے سے استعمال ہونی چاہئیں گویا ان کا استعمال اس رنگ میں ہونا چاہیے کہ تسخیر عالمین کا مقصد پورا ہو جائے اور اس رنگ میں تسخیر عالم ہو کہ سارے عالمین زمین وآسمان میں جو کچھ ہے ان کو اس رنگ میں خدمت پر لگایا جائے کہ نیکی دُنیا میں قائم ہو جائے۔

انسان کا نیکی پر پختگی سے قائم ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان عملی طور پر اپنی زندگی وقف کر دے یا اپنی زندگی کو خدا تعالیٰ کے حضور پیش کر دے۔ اس کو سونپ دے اعتقاداً اور عملاً ہر دو طریق پر اپنے سارے وجود اور اپنے وجود کی سب خواہشات اور ہر عزم اور ہمت جو ہے اور ہر قوت اور اس کا استعمال خدا کو سونپ دیا جائے۔ اس کی خواہش کے مطابق ہماری خواہشات اور اس کے حکم کے مطابق ہماری اپنی قوتوں کا استعمال تسخیر عالمین کی کوشش کے لئے وقف ہو جائے۔

بعض نادان کہہ دیتے ہیں کہ مذہب کا مطلب ہے درویش پن۔ یہ غلط ہے۔ مذہب کا اگر یہ مطلب ہوتا تو اللہ تعالیٰ تسخیر عالمین کی قوتیں انسان کو عطا نہ کرتا۔ اس لئے مذہب کا یہ مطلب نہیں کہ درویش بن جاؤ۔ گوشہ نشین بن جاؤ، دُنیا سے قطع تعلق کر لو جنگل میں چلے جاؤ، درخت کے نیچے اپنا ڈیرہ ڈال لو اور صبح شام اللہ ھُوْ، اللہ ھُوْ کہتے رہو۔ مذہب کا یہ مطلب نہیں۔ مذہب کا تو یہ مطلب ہے کہ اصلاح ہو یعنی اعتقاداً اور عملاً اپنے وجود کو خدا تعالیٰ کے حضور سونپ دینا اور اس کا مطلب یہ ہے کہ عالمین جس کی تسخیر کے لئے جو قوتیں عطا کی گئیں ہیں اس سے ہم قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ یہ تو خدا تعالیٰ کے منشاء کے خلاف ہے ورنہ وہ ہمیں طاقت ہی نہ دیتا لیکن تسخیر عالمین کے لئے اپنی قوتوں کے استعمال کا مطلب یہ ہے کہ انہیں خدا کے منشاء کے مطابق استعمال کرنا چاہیے۔ اس کے حکم کے نیچے ہونا چاہیے ورنہ پھر آدمی بیٹھ جائے پھر وہ اس سے تو ایک قدم آگے بڑھے گا جس نے کہا تھا کہ اس عالمین سے انسان کا کیا تعلق؟

گو وہ ایک قدم آگے بڑھا اس میں کوئی شک نہیں لیکن یہاں آکر وہ ٹھہر گیا۔ وہ روسی کمیونسٹ بن گیا اور کہہ دیا میں اپنی قوتوں کو استعمال کر کے اس عالمین کی تسخیر اللہ تعالیٰ کے منشاء کو پورا کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی منشاء کو پورا کرنے کے لئے کروں گا۔ پھر انسانی جان کی کوئی قدر نہیں رہے گی۔ خدا تعالیٰ نے کہا تھا کہ یہ عالمین اور یہ ساری خلق یعنی زمین وآسمان کے اندر جو کچھ پایا جاتا ہے ان

سے خدمت لو۔ گویا انسان کی خدمت کرنے کے لئے کائنات معرضِ وجود میں آئی لیکن ایسے آدمی پیدا ہو گئے جو کہتے ہیں ہم ان سے خدمت لیں گے۔ انسان کو دُکھ پہنچانے کے لئے انسان کی ایذاء دہی کے لئے انسان کو قتل کرنے کے لئے انسان کا گلا گھونٹنے کے لئے، انسان کی نورانیت کو اندھیروں میں تبدیل کرنے کی کوشش کے لئے۔ یہ تو اسلام نہیں سکھاتا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو مسلمان اس لئے بنایا ہے اور اس لئے ہدایت نازل کی ہے کہ وہ اس ارادہ کے ماتحت رہتے ہوئے اپنی تمام قوتوں کو تسخیر عالمین کے لئے استعمال کرے اور اس استعمال کی جو غرض ہے اس غرض کو بھی سامنے رکھے اور وہ ہے حقوق العباد کی ادائیگی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بار بار فرمایا ہے کہ اسلام کا خلاصہ حقوق اللہ کی ادائیگی اور حقوق العباد کی ادائیگی ہے۔ جہاں تک حقوق العباد کا تعلّق ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ نے ہی قائم کئے ہیں۔ انسان کو اتنی سمجھ بوجھ نہیں کہ وہ حقوق العباد قائم کر سکے لیکن اسلام نے انہیں کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ کے قائم کردہ حقوق العباد کو قائم کرنا ضروری ہے۔

اس طرح اعتقاداً اور عملاً اپنے وجود کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کر دینا اُسے سونپ دینا اپنی ساری خواہشات اور ارادے اپنی انتہائی ہمت اور اپنے عزم کو اس کی منشاء کے مطابق کر دینا حقیقی اسلام ہے یعنی انسان کہے کہ اے میرے خدا میں وہی خواہش کروں گا جو تیری خواہش ہوگی میں وہی کام کروں گا جو تیری منشاء ہوگی۔ اعتقاد کے بعد عمل شروع ہوتا ہے۔ اگر اعتقاد صحیح ہے تو عمل صحیح ہوگا اور اعتقاد غلط ہے تو عمل بھی غلط ہوگا۔ گویا عملاً بھی خود کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کر دینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جتنی قوتیں عطا کی ہیں ان کو استعمال کرنا چاہیے جو شخص استعمال نہیں کرتا وہ بھی خدا سے دور چلا جاتا ہے کیونکہ خدا اُسے انعام دینا چاہتا ہے مگر وہ کہتا ہے میں نہیں لیتا۔ یہ تو شوخی کرنے، استکبار کرنے اور اِباء کرنے کے مترادف ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہر انسان کو اس بات کا مکلّف ٹھہرایا ہے کہ اس نے جو طاقت اسے دی ہے وہ اس کا استعمال کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔ جنگلوں میں جا کر اس کا نام جپنا یہ تو انسان کے سپرد نہیں کیا گیا۔ اس کو خدا تعالیٰ نے طاقت دی یہاں تک کہ اس نے کہا کہ انسان چاند پر کمند ڈال سکتا ہے اور ڈال رہا ہے اور چاند تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا ہے لیکن اس کوشش کے نتیجہ میں سیٹلائٹ تو بنا لیا مگر عجیب مضحکہ خیز باتیں کرنے لگ گئے کہتے

ہیں ان مصنوعی سیاروں کے ذریعہ اپنے دشمنوں پر ایٹم بم گرائیں گے۔ بھلا ان سے پوچھو تمہارا دشمن کون ہے کیا خدا کا بنایا ہوا تمہارا ایک بھائی دشمن ہے؟ لیکن جب خدا کو نہیں پہچانا اور اسلام کی روشنی سے منور نہ ہوئے تو اس قسم کی باتیں نہ کریں تو اور کیا کریں؟

غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر تمہارے ارادے میرے ارادے ہو جائیں اور تمہاری قوتوں کا استعمال میرے حکم میرے امر کے نیچے آجائے۔ اگر اپنی طاقتوں کو غلط جگہ استعمال کرنے سے رُک جاؤ۔ آخر اوامر ونواہی دیئے ہی اس لئے گئے ہیں کہ تم اپنے اچھے بُرے اعمال کا جائزہ لے سکو اور نیک و بد میں تمیز کر سکو تو تم میرے نیک بندے بن جاؤ گے۔

انسانی قوت کا استعمال صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی ہوسکتا ہے۔ اگر تم میرے اوامر ونواہی کے مطابق اعمال بجا لاؤ گے تو فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ کی رو سے تم میرے بندے بن جاؤ گے۔ میری صفات کا مظہر بن جاؤ گے۔ یہ بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کی جزا ہے جو حقیقی مسلمان ہوتا ہے اس کو فائدہ کیا ہوتا ہے؟

فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ان کے اعتقادات جو انہوں نے رکھے اور وہ جو نیک اعمال انہوں نے کئے اس کا اجر انسان نہیں دے گا خود خدا دے گا یہ بڑا عظیم اور خوشکن وعدہ ہے۔ انسان جب بدلہ نہیں دے گا تو اور کون دے گا۔ انسانی اعمال کا بدلہ اللہ دے گا۔ فرمایا فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اور یہاں اللہ نہیں کہا ربّ کہا ہے اس میں ایک حکمت ہے کیونکہ جس نے پیدا کیا ہے وہ تمہیں پہچانتا ہے۔ تمہاری قوتوں اور استعدادوں کو پہچانتا ہے۔ تم تھوڑا مانگو گے اپنی قوت اور استعداد سے وہ تمہیں زیادہ دے گا کیونکہ وہ ربّ ہے کیونکہ کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے اور تم زیادہ مانگو گے جو کہ تمہاری تباہی اور ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ زیادتی ہے تو وہ تمہیں تھوڑا دے گا کیونکہ وہ ربّ ہے تم جتنا برداشت کر سکتے ہو اتنا دے گا۔

ماں اپنی ساری محبت کے باوجود بعض دفعہ بیٹے کو کم دے دیتی ہے اور بعض دفعہ زیادہ دے دیتی ہے۔ میرے پاس دوست آتے رہتے ہیں کوئی کہتا ہے میرا یہ بچہ ہے کچھ کھاتا نہیں ہے اور عام طور پر یہ بات صحیح ہوتی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ یہ کھاتا ہے یا نہیں کھاتا بلکہ سوال تو یہ ہے جو یہ کھانا چاہتا ہے وہ تم دینے کے لئے تیار ہو یا نہیں۔ یہ کہتا ہے میں نے چنے کھانے ہیں تم کہتے ہو نہ! نہ!! نہ!!! ماں وہمی

ہوتی ہے باپ وہی ہوتا ہے کہتے ہیں تمہارے پیٹ میں درد ہو جائے گی حالانکہ اس کے اندر سے جسم کی اپنی فطرت کی آواز یہ ہوتی ہے اس لئے چنا اس کو ملنا چاہیے۔ جو اندر سے آواز آ گئی ہے کہ اتنا مجھے کھانے کے لئے ملنا چاہیے تم اس سے کم دیتے ہو۔ بعض دفعہ ہم نے خود دیکھا ہے ماں دو سال کے بچے کو چپیڑ مار دیتی ہے اور کہتی ہے دودھ پیتے ہو یا نہیں تم اسے زیادہ دودھ دے دیتی ہو اس کا جسم کہتا ہے میں نے نہیں پینا۔ کیوں اسے زیادہ دے رہی ہو لیکن جو ربّ ہے اس کو پتہ ہے کہ میرے اس پیارے بندے کی اس انسان کی اس فرد کی جس نے کوشش کی میری صفات کا مظہر بننے کی اس کا دائرہ استعداد کتنا ہے۔ میں اس کے مطابق اسے دوں گا۔ اس واسطے اس جزا اور اس اجر میں کوئی تکلیف کا پہلو نہیں ہے کیونکہ اللہ دینے والا ہے۔ دوسرے یہ فرمایا کہ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ تم میرے بن جاؤ پھر دُنیا میں جو تمہیں ستانے کی کوشش کرتا ہے، کرتا رہے تمہاری ہلاکت کی کوشش کرتا ہے، کرتا رہے تمہیں ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کا بن گیا تو پھر اُسے دُنیا سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بننے کے لئے تیار نہیں اس کی عطا کردہ خواہشات اور قوتوں کو صحیح استعمال کرنے کے لئے تیار نہیں اس سے تمہیں کیا ڈرنا ہے؟ تم اللہ کی حفاظت میں ہو۔ اس لئے انبیاء اور مامورین کی جماعتیں جو ہیں ان کا کردار ایسا ہوتا ہے کہ چودہ سو سال کے بعد آج مورّخ حیران ہیں کہ یہ کیسے ہو گیا اور قریباً ستّر، اسّی سال کے بعد ہم بھی حیران ہیں کہ یہ کیسے ہو گیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے بارہ ساتھیوں کو لے کر دہلی کے شور شرابے کے باوجود اور ان کی بے وفائی اور دھوکہ دہی کے باوجود جو اُنہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم انتظام کریں گے کہ کوئی نقص امن نہ ہو اس وقت علماء ظاہر کے کہنے پر بارہ ساتھیوں کے ساتھ دہلی کی بہت بڑی جامع مسجد میں تشریف لے گئے اور ان کو کہلا بھیجا۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں اور اس لئے آ رہا ہوں کہ تم نے کہا تھا کہ تم امن قائم رکھنے کے ذمہ دار ہو۔ تم نے دھوکہ دہی کی اب میں نے اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا ہے اب میں آ رہا ہوں۔ اتنے بڑے ہجوم کے اندر آپ بے دھڑک چلے گئے۔

اگر کسی کو حالات کا پتہ نہ ہو اور وہاں یورپ میں جا کر آدمی یہ بتائے وہ کہے گا اُنہوں نے کہانی بنالی ہے۔ کسی کو سمجھ نہیں آ سکتا ایسا دماغ جس نے خدا کی معرفت کو حاصل نہیں کیا اور اس نے خدا تعالیٰ کی

صفات سے لذت و سرور نہیں پایا۔ وہ کہے گا یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے خدا نے فرمایا وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں تمہیں فکر کی کیا بات ہے؟ جاؤ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس وقت انگریزوں کی حکومت تھی ایک انگریز (S-P) ایس پی تھا۔ غالباً وہ وہاں پولیس لے کے گیا ہوا تھا وہ تو مسجد سے باہر رہا اور آپ تو مسجد کے اندر چلے گئے تھے۔ جب واپس آئے تو ہجوم حملہ آور ہوا ایک وہ ایس پی تھا انگریز جس پر دوسروں کی حفاظت کی ذمہ داری تھی اور ایک وہ خدا کا بندہ مہدیٔ معہود جس کو خدا نے کہا تھا کہ تم میری حفاظت میں ہو۔ دونوں باہر آئے۔ ایک جگہ پر اکٹھے ہوئے۔ ایس پی صاحب کے پتھر پڑے اور چوٹ آ گئی لیکن خدا کے اس محبوب کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور بڑے آرام سے گذر گئے۔ جب انسان خدا کا ہو جاتا ہے تو پھر کوئی خوف باقی رہتا ہے اور نہ کوئی حُزن رہتا ہے۔

پس خدا کی گود میں خود کو بٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے اور جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ہے جو بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ کے مطابق حقیقی معنی میں مسلمان ہو گیا۔ اعتقاداً اور عملاً اس نے اپنے وجود کو اللہ کے حضور پیش کر دیا اور اسے سونپ دیا اسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہو سکتا۔

(خطباتِ ناصر جلد پنجم صفحہ ۴۵ تا ۵۴)

آیت ۱۲۰ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۲۰﴾

اس آیت میں حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مخاطب ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے، مبعوث کیا ہے بشیر اور نذیر بنا کر اور اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ کے متعلق تجھ سے باز پرس نہیں کی جائے گی۔

قرآن کریم نے یہاں یہ نہیں کہا کہ کافروں کے متعلق تجھ سے باز پرس نہیں کی جائے گی بلکہ یہ کہا کہ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ کے متعلق تجھ سے باز پُرس نہیں ہوگی۔ تیری یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ کوئی دوزخ میں جاتا ہے یا نہیں جاتا۔

اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ کے معنی سمجھنے کے لئے جب ہم قرآن کریم ہی کو دیکھتے ہیں اور وہیں سے ہمیں صحیح

معنی پتا لگ سکتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ یا اَصۡحٰبُ النَّارِ، دوزخ کی آگ میں پڑنے والوں کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں تین بڑے گروہ ہیں جن کا ذکر اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ یا اَصۡحٰبُ النَّارِ کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ ان کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تجھ سے ان تینوں گروہوں کے جہنم میں جانے کے متعلّق باز پُرس نہیں ہوگی۔

پہلا گروہ ان میں سے وہ ہے جس کا ذکر سورۃ مائدہ کی آیت ۱۱ میں بیان ہوا۔ فرمایا وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہوں کو اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا، جو دلائل صداقت کے تھے ان کی تکذیب کی اور خدا تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلایا اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ ۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ کے نزدیک اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ ہیں، دوزخ میں پھینکے جائیں گے۔ یہ گروہ جو ہے آگ میں پڑنے والا ہے۔

دوسرا گروہ جو آگ میں پڑنے والا ہے قرآن کریم کی اصطلاح میں، یہ بھی ایک بڑا گروہ ہے جس کا ذکر سورۃ نساء کی آیت ۱۴۶ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِی الدَّرۡکِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ کہ منافق یقیناً جہنم کی گہرائی کے سب سے نچلے حصہ میں ہوں گے۔ پس ایک تو کفار ہوئے جن کا پہلے ذکر تھا اور دوسرے منافق ہوئے جو قرآن کریم کی اصطلاح میں اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ یا اَصۡحٰبُ النَّارِ ہیں۔

اور تیسرا گروہ جن کا ذکر قرآن کریم نے اَصۡحٰبُ النَّارِ کے زمرہ میں کیا ہے وہ یہ ہے۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۲۱۸ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ مَنۡ یَّرۡتَدِدۡ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ فَیَمُتۡ وَ ھُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھر جائے اور راہِ ارتداد اختیار کرے پھر وہ طبعی موت مرے اس حالت میں کہ وہ ارتداد کے ذریعہ سے جس کفر میں داخل ہوا تھا (ایمان کو چھوڑ کے) اس کفر پر وہ قائم تھا۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایمان کی حالت میں جو نیکیاں کی تھیں اور جو بظاہر قربانیاں دی تھیں لیکن بعد میں ارتداد اختیار کیا تو حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ وہ نیک اعمال بھی ان کے کسی کام نہیں آئیں گے اور اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ان کی نیکیوں کا بدلہ ثواب اور خدا تعالیٰ کی رضا کی شکل میں نہیں ملے گا۔ وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ اور ایسے مرتد جو ہیں وہ اَصۡحٰبُ النَّارِ ہیں، اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ ہیں۔ دوزخی ہیں، دوزخ

کی آگ میں پڑنے والے ہیں اور لمبا عرصہ اس میں رہنے والے ہیں۔

ان آیات کی روشنی میں ہمیں تین گروہ نظر آئے اور وَ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ کے یہ معنی ہوں گے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تجھ سے اس بات پر باز پُرس نہیں ہوگی کہ جب تو نے دنیا پر اسلام کو پیش کیا اور صداقت کے دلائل جو خدا تعالیٰ نے ظاہر کئے تھے اور نشاناتِ آسمانی جو تیری صداقت کے لئے آئے تھے وہ تُو نے بتائے اور تبلیغ کی اور دعوت دی کہ یہ حق ہے اس کی طرف آؤ۔ لیکن جہاں ایک حصہ نے اس کو قبول کیا وہاں ایک دوسرا حصہ تھا جنہوں نے قبول نہیں کیا اور وہ کافر بن گئے تو کافروں کے متعلّق تجھ سے یہ باز پُرس نہیں ہوگی، یہ پوچھ گچھ نہیں ہوگی کہ کیوں وہ کفر کی حالت میں مرے اور ایمان نہیں لائے۔ یہ تیری ذمہ داری نہیں ہے۔ تیرا کام صرف البلاغ ہے، دعوت دینا ہے، سمجھانا ہے، ان کے لئے دعائیں کرنا ہے لیکن ہدایت پانے والے نے خود اپنی مرضی سے ہدایت پانی ہے اگر اللہ تعالیٰ اُسے اس کی توفیق دے یا بدقسمت ہوگا اور توفیق نہ پائے گا تو انکار کرے گا۔ بہر حال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا کہ کیوں اتنے دلائل سُننے کے بعد اور معجزات دیکھنے کے بعد ایک دنیا منکرین کے گروہ میں شامل ہوئی اور انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور محمدؐ کے خدا کا کفر کیا۔

دوسرے اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وَ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ کہ وہ لوگ جو ایمان لائے، جنہوں نے کہا کہ ہم خدا اور رسول کی اطاعت کا جُوا اپنی گردنوں پر رکھتے ہیں لیکن ان کا یہ دعویٰ صرف زبان سے تھا عملاً انہوں نے ایثار اور قربانی اور وفا اور ثباتِ قدم کی راہوں کو اختیار کرنے کی بجائے نفاق کی راہوں کو اختیار کیا اور خدا اور رسول سے محبت کرکے اور خدا کی مخلوق سے شفقت کرکے ان کی اسلامی تعلیم اور ہدایت کے مطابق خدمت کرنے کی بجائے فتنہ پیدا کیا اور فساد پیدا کیا اور وسوسے پیدا کئے اور نفاق کی چالوں کو پسند کیا وفا کو چھوڑ کر اور منافق نے کیوں نفاق اختیار کیا؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے باز پرس نہیں ہوگی۔ فرمایا، تیرا کام یہ نہیں کہ ایمان لانے والے کو اس بات پر مجبور کرے کہ وہ ایمان کے تقاضوں کو بھی پورا کرنے والا ہو۔ ایمان کے تقاضوں کو اپنی مرضی سے پورے کرنے والے جو ہیں انہوں نے خدا تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنا ہے۔ ان کے اوپر کوئی جبر نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی منافق منافقانہ مفسدانہ راہوں کو اختیار کرتا ہے (منافق تو پہلے دن سے ہی ہمارے ساتھ

لگے ہوئے ہیں۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی ہمیں ایسے واقعات نظر آتے ہیں کہ خطرناک نفاق کا مظاہرہ کرنے والے عبد اللہ بن اُبیّ ابن سلول جیسے لوگ موجود تھے)۔ پس حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بری قرار دیا گیا اس الزام سے کہ کیوں بعض نے نفاق کی راہوں کو اختیار کیا۔ وَ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ یہ منافق جو اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کی رو سے جہنم کے بدترین حصوں میں پھینکے جانے والے ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی وجہ سے کوئی الزام عائد نہیں ہوتا، نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی وجہ سے کوئی باز پرس ہوگی۔

تیسرے وَ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ کے تیسری آیت جو میں نے پڑھی ہے اس کی روشنی میں، یہ ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر باز پرس نہیں کرے گا خدا کہ ایمان لانے کے بعد لوگ مرتد کیوں ہو گئے۔ یہ ذمہ داری محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہے کہ جو ایمان لے آیا اسے زبردستی دائرۂ اسلام کے اندر پکڑ کے رکھیں۔ یہ اس کا کام ہے۔ ساری بنا ہی آزادی پر ہے جزا اور سزا۔ خدا تعالیٰ کی رضا اور خدا تعالیٰ کے قہر کا جلوہ جو ہے، اس کا انحصار ہر شخص کے اپنے افعال پر ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ کوئی ذمہ داری ہے نہ آپ سے کوئی پوچھ گچھ اس کے متعلق کی جائے گی۔

جماعتوں اور گروہوں کے لحاظ سے یہ تین گروہ ہی ہیں۔ کفر کرنے والے، نفاق کی راہوں کو اختیار کرنے والے اور ارتداد اختیار کرنے والے۔ اور تینوں ''وَ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ'' کے مفہوم کے اندر آتے ہیں کیونکہ تینوں کے متعلق قرآن کریم نے دوزخی اور دوزخ کی آگ میں پڑنے والوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔

تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تجھے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا۔ پہلے مفسرین اس بحث میں بھی پڑے ہیں کہ اس آیت میں بشیر اور نذیر کا تعلق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے یا حق کے ساتھ ہے کہ ہم نے ایسے حق کے ساتھ تجھے بھیجا ہے جو حق بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا ہے مگر دوسری جگہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق واضح طور پر بشیر اور نذیر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

بات یہ ہے کہ یہ بحث لفظی ہے اس لئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان کیا، خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ اعلان کروایا ''اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ'' پس محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے اگر کسی کو بشارت دی ہے تو وحی کے نتیجہ میں دی ہے اپنی طرف سے تو نہیں دی کوئی بشارت، اور اگر کسی کو کوئی تنبیہ کی ہے اور ڈرایا ہے کہ اگر تم یہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے گا تو اپنی طرف سے تو نہیں ڈرایا۔ وہ تو اسی واسطے ڈرایا کہ خدا نے کہا تھا کہ میں ناراض ہو جاؤں گا اگر تم ایسے کام کرو گے۔ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بشیر اور نذیر ہونا ہی بتاتا ہے کہ جو تعلیم آپ لے کر آئے، جو قرآن کریم آپ پر نازل ہوا وہ قرآن کریم خود بتا رہا ہے کہ کن لوگوں کو خدا تعالیٰ بشارتیں دے رہا اور کن لوگوں پر خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہونے والا ہے اور قرآن کریم ان کو ڈرا رہا ہے کہ دیکھو ایسے کام نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے گا۔

تو اس آیت سے بھی ہمیں پتا لگتا ہے کہ اسلام نے کامل مذہبی آزادی دی ہے اور ایک مفسّر نے جیسا کہ میں ابھی بتاؤں گا یہ کہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے دلوں پر تصرف کرنے کی طاقت ہی نہیں دی گئی تھی۔ جب طاقت ہی نہیں دی گئی تو الزام کیسے۔ یعنی لَا تُسْـَٔلُ کا لفظ بتاتا ہے کہ آپ کو یہ طاقت نہیں دی گئی تھی کہ زبردستی کسی کے دل کی حالت کو بدلیں۔ جب طاقت ہی نہیں تھی تو الزام بھی نہیں۔ پوچھ گچھ بھی نہیں، باز پُرس بھی کوئی نہیں۔

اس سلسلہ میں مَیں نے چند ایک نمونے مشہور مفسّرین کے بھی لئے ہیں کیونکہ جب ہم بات کرتے ہیں تو ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ہمیں کہتا ہے کہ تم خود ساختہ تفسیر کر رہے ہو۔ پہلوں نے بھی اس کے متعلق کچھ کہا؟ اس لئے میں کچھ نمونے پہلوں کے بھی اس سلسلہ میں لیتا ہوں اور ان کو بیان کر دیتا ہوں۔

ایک مشہور مفسر امام رازیؒ جن کی تفسیر ''تفسیر کبیر'' کے نام سے مشہور ہے اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اِعْلَمْ اَنَّ الْقَوْمَ لَمَّا اَصَرُّوْا عَلَى الْعِنَادِ وَ اللَّجَاجِ الْبَاطِلِ وَ اقْتَرَحُوا الْمُعْجِزَاتِ عَلٰى سَبِيْلِ التَّعَنُّتِ بَيَّنَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِرَسُوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَنَّهٗ لَا مَزِيْدَ عَلٰى مَا فَعَلَهٗ فِيْ مَصَالِحِ دِيْنِهِمْ مِنْ اِظْهَارِ الْاَدِلَّةِ وَ كَمَا بَيَّنَ ذٰلِكَ بَيَّنَ اَنَّهٗ لَا مَزِيْدَ عَلٰى مَا فَعَلَهُ الرَّسُوْلُ فِيْ بَابِ الْاِبْلَاغِ وَ التَّنْبِيْهِ لِكَيْ لَا يَكْثُرَ غَمُّهٗ بِسَبَبِ اِصْرَارِهِمْ عَلٰى كُفْرِهِمْ۔''

پھر لکھتے ہیں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہ اس کے معنی یہ ہیں۔

''قَالَ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ يَا مُحَمَّدُ! بِالْحَقِّ لِتَكُوْنَ مُبَشِّرًا لِمَنِ اتَّبَعَكَ وَ اهْتَدٰى بِدِيْنِكَ

وَمُنۡذِرًا لِمَنۡ كَفَرَبِكَ وَ ضَلَّ عَنۡ دِيۡنِكَ اَمَّا قَوۡلُهٗ تَعَالٰى وَلَا تُسۡئَلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِيۡمِ ......فَفِي التَّاۡوِيۡلِ وُجُوۡهٌ کہتے ہیں بہت سارے معنے لَا تُسۡئَلُ کے ہو سکتے ہیں۔ اَحَدُهَا : اَنَّ مَصِيۡرَهُمۡ اِلَى الۡجَحِيۡمِ فَمَعۡصِيَتُهُمۡ لَا تَضُرُّكَ وَ لَسۡتَ بِمَسۡئُوۡلٍ عَنۡ ذٰلِكَ وَهُوَ كَقَوۡلِهٖ فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَيۡنَا الۡحِسَابُ وَقَوۡلُهٗ عَلَيۡهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيۡكُمۡ مَا حُمِّلۡتُمۡ۔

(الثّانی) اِنَّكَ هَادٍ وَ لَيۡسَ لَكَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَيۡءٌ فَلَا تَأۡسَفۡ وَلَا تَغۡتَمَّ لِكُفۡرِهِمۡ وَمَصِيۡرِهِمۡ اِلَى الۡعَذَابِ وَ نَظِيۡرُهٗ قَوۡلُهٗ فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُكَ عَلَيۡهِمۡ حَسَرَاتٍ۔

(الثالث) لَا تَنۡظُرۡ اِلَى الۡمُطِيۡعِ وَ الۡعَاصِيۡ فِي الۡوَقۡتِ فَاِنَّ الۡحَالَ قَدۡ يَتَغَيَّرُ فَهُوَ غَيۡبٌ فَلَا تُسۡئَلُ عَنۡهُ وَ فِي الۡاٰيَةِ دَلَالَةٌ عَلٰى اَنَّ اَحَدًا لَا يُسۡئَلُ عَنۡ ذَنۡبِ غَيۡرِهٖ وَ لَا يُؤۡخَذُ بِمَا اجۡتَرَمَهٗ سِوَاهُ سَوَاءٌ كَانَ قَرِيۡبًا اَمۡ بَعِيۡدًا۔“

امام رازیؒ لکھتے ہیں اس آیت کی تفسیر میں کہ تمہیں علم ہونا چاہیے کہ جب کفار نے مخالفت اور بے فائدہ ضد پر اصرار کیا اور ہٹ دھرمی کے طور پر اقتراحی معجزات کا متواتر مطالبہ کیا تو خدا تعالیٰ نے اپنے رسول کو کہا کہ اس نے یعنی اللہ تعالیٰ نے دلائل ظاہر کر کے ان لوگوں کی دینی بہتری کے لئے جو کچھ کیا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا یعنی خدا تعالیٰ نے اس سے زیادہ نہیں کیا دلائل دے دیئے۔ آیاتِ آسمانی نازل کر دیں۔ امام رازیؒ کہتے ہیں اس آیت میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتا ہے کہ جو میں کر چکا ہوں اس سے زیادہ میں ان لوگوں کی دینی صلاح کے لئے، دینی مصالح کے لئے نہیں کر سکتا۔ میں نے دلائل قائم کر دیئے، حجج قاطعہ ظاہر کر دیں، آیاتِ آسمانی آ گئے صداقت کے اظہار کے لئے اور جیسے خدا تعالیٰ نے یہ بات بیان کی ہے خدا تعالیٰ نے یہ بھی بیان کر دیا کہ جو کچھ رسول نے انہیں تبلیغ کرنے اور تنبیہ کرنے میں کردار ادا کیا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور ایسا اس لئے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا غم ان کے کفر پر مصر ہو جانے کی وجہ سے زیادہ نہ ہو جائے۔

پھر یہ لکھتے ہیں کہ بَشِيۡرًا وَّ نَذِيۡرًا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے تجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ تُو ان لوگوں کو جو تیری پیروی کریں اور تیرے دین کے ذریعہ ہدایت پائیں بشارت دے اور جو تیرا انکار کریں اور تیرے دین سے گمراہ ہو جائیں انہیں ڈرائے اور خدا تعالیٰ کا جو فرمان ہے کہ ”وَلَا تُسۡئَلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِيۡمِ“ مختلف پہلوؤں سے اس کی تفسیر کی جا سکتی ہے اوّل یہ کہ اَصۡحٰبِ الۡجَحِيۡمِ

ہیں وہ۔ ان کفار کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور ان کی نافرمانی تجھے کوئی نقصان نہیں دے گی یعنی جو ان کی نافرمانی ہے، خود ان کو اس کا نقصان پہنچے گا تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور نہ ہی تجھ سے اس کے متعلق پوچھ گچھ ہوگی۔ جیسے کہ خدا تعالیٰ دوسری جگہ فرماتا ہے کہ تیرا فرض تو تبلیغ ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے اور ایک اور جگہ فرمایا کہ اس رسولؐ پر وہ کام کرنا ضروری ہے جو اس کے ذمہ لگایا گیا اور تم پر وہ کام کرنا ضروری ہے جو تمہارے ذمہ لگایا گیا۔ نمبر دو کہتے ہیں کہ دوسرے اس کا مطلب یہ ہے کہ تو ہدایت دینے والا ہے۔

ہدایت دینے والا دعوت دینے والا، ہدایت پہنچا دینے والا ہے ان تک اور اس معاملہ میں تیرا کوئی اختیار نہیں یعنی اس معاملہ میں کہ وہ مانتے ہیں کہ نہیں تیرا کوئی اختیار نہیں۔ پس تو ان کے کفر اور دوزخ میں جانے کی وجہ سے غم نہ کر۔

اس مطلب کی ایک دوسری آیت بھی ہے جس میں فرمایا کہ تیری جان ان پر افسوس کرتے ہوئے ضائع نہ ہو جائے۔ تیسرے فرمایا کہ تُو موجودہ وقت میں مطیع اور نافرمان کا خیال نہ کر حالات بدلتے رہتے ہیں۔ انہی میں سے تو پھر مسلمان ہو گئے۔ پھر وہ کہتے ہیں اس آیت سے ایک اور بات کا بھی پتا چلتا ہے وہ یہ کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہ کی وجہ سے نہ پوچھا جائے گا اور نہ ہی کسی دوسرے کے گناہ کی وجہ سے اس کا مؤاخذہ ہوگا خواہ وہ گنہگار قریبی ہو یا قریبی نہ ہو۔

ابنِ جریر ایک مشہور مفسّر ہیں اپنی تفسیر جامع البیان میں وہ لکھتے ہیں۔

”وَ مَعْنٰی قَوْلِہٖ جَلَّ شَانُہٗ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا، اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ يَا مُحَمَّدُ بِالْاِسْلَامِ الَّذِیْ لَآ اَقْبَلُ مِنْ اَحَدٍ غَيْرَهٗ مِنَ الْاَدْيَانِ وَهُوَ الْحَقُّ مُبَشِّرًا مَنِ اتَّبَعَكَ فَاَطَاعَكَ وَ قَبِلَ مِنْكَ مَا دَعَوْتَهٗ اِلَيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِالنَّصْرِ فِي الدُّنْيَا وَ الظَّفَرِ بِالثَّوَابِ فِي الْاٰخِرَةِ النَّعِيْمِ الْمُقِيْمِ فِيْهَا وَ مُنْذِرًا مَنْ عَصَاكَ فَخَالَفَكَ وَ رَدَّ عَلَيْكَ مَا دَعَوْتَهٗ اِلَيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِالْخِزْيِ فِي الدُّنْيَا وَالذُّلِّ فِيْهَا وَالْعَذَابِ الْمُهِيْنِ فِي الْاٰخِرَةِ (وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ) وہ کہتے ہیں اس کے معنے ہیں يَامُحَمَّدُ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا فَبَلَّغْتَ مَا اُرْسِلْتَ بِهٖ وَ اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَالْاِنْذَارُ وَ لَسْتَ مَسْئُوْلًا عَمَّنْ كَفَرَ بِمَا اَتَيْتَهٗ بِهٖ مِنَ الْحَقِّ وَ كَانَ مِنْ اَهْلِ الْجَحِيْمِ۔“ (تفسیر جامع البیان) وہ کہتے ہیں کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھے اس دینِ اسلام کے ساتھ بھیجا ہے جس کے سوا مَیں کسی اور دین کو کسی سے قبول نہیں کروں گا اور دینِ اسلام

حق ہے۔ جو شخص تیری پیروی کرے، تیری اطاعت کرے اور جس حق کی تُو نے اسے دعوت دی ہے اسے وہ قبول کرے تو یہ حق جو ہے وہ اسے بشارت دیتا ہے کہ دنیا میں اس کی مدد کی جائے گی اور آخرت میں اسے ثواب دیا جائے گا اور اسے دائمی نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ اس کے برعکس جو تیری بات نہ مانے، تیری مخالفت کرے اور جس حق کی طرف تُو نے اسے دعوت دی ہے اسے وہ ردّ کر دے تو اسے یہ حق جو ہے وہ تنبیہ کرتا ہے کہ اسے دنیا میں ذلّت پہنچے گی اور وہ خوار ہوگا اور آخرت میں اسے ذلّت آمیز عذاب دیا جائے گا۔

وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ کہتے ہیں پس معنی یہ ہوئے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ پس جو پیغام تجھے دیا گیا تو نے وہ پہنچا دیا اور تیرا کام پہنچا دینا اور تنبیہ کر دینا ہے اور تجھ سے ان لوگوں کے متعلق سوال نہ کیا جائے گا جنہوں نے اس حق کا انکار کیا جو تو ان کے پاس لے کر آیا اور وہ دوزخیوں میں شامل ہو گئے۔

تیسرا حوالہ میں نے لیا ہے امام قرطبی کی تفسیر سے۔ وہ اپنی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ اَلْمَعْنٰی اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا غَيْرَ مَسْئُوْلٍ کہ ہم نے تجھے بشیر اور نذیر کر کے بھیجا ہے اور تجھ سے ان لوگوں کے بارہ میں پوچھ گچھ نہ ہوگی، باز پرس نہ کی جائے گی۔

علامہ محمود الوسی کی ایک مشہور تفسیر ہے روح المعانی اس میں اس آیت کی تفسیر یوں آئی ہے۔

''اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ اَیْ مُتَلَبِّسًا مُؤَيِّدًا بِهٖ ...... وَ الْمُرَادُ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ لِاَنْ تُبَشِّرَ مَنْ اَطَاعَ وَ تُنْذِرَ مَنْ عَصٰی لَا لِتُجْبِرَ عَلَى الْاِيْمَانِ فَمَا عَلَيْكَ اِنْ اَصَرُّوْا وَ كَابَرُوْا۔ اور وہ وَ لَا تُسْـَٔلُ کے متعلق کہتے ہیں اَیْ اَرْسَلْنٰكَ غَيْرَ مَسْئُوْلٍ عَنْ اَصْحَابِ الْجَحِيْمِ مَا لَهُمْ يُؤْمِنُوْا بَعْدَ اَنْ بَلَّغْتَ مَا اُرْسِلْتَ بِهٖ وَ اَلْزَمْتَ الْحُجَّةَ عَلَيْهِمْ'' (روح المعانی)۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے تجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کے ذریعہ تیری تائید کی گئی ہے اور کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اے رسول ہم نے تجھے اس لئے بھیجا ہے تا تُو ان کو جو اطاعت اختیار کریں خوشخبری دے اور جو نافرمانی کریں تنبیہ کرے۔ تجھے اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ تو کسی کو ایمان لانے پر مجبور کرے۔ یہاں میں یہ زائد کروں گا کہ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ کے جو قرآن کریم نے تین گروہ بیان کئے تھے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ تجھے اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ تُو کسی کو ایمان لانے پر مجبور کرے یا کسی کو ایمان کے

تقاضوں کے پورا کرنے پر مجبور کرے کہ وہ نفاق کی راہوں کو اختیار نہ کریں یا کسی کو اس بات پر مجبور کرے کہ وہ ایمان لانے کے بعد ارتداد اختیار نہ کریں۔

پس اگر وہ کفر پر اصرار کریں یا نفاق کی راہوں کو اختیار کریں یا ایمان لانے کے بعد ارتداد اختیار کریں اور فضول جھگڑا کریں تو اس میں تیرا کوئی نقصان نہیں اور تجھ پر کوئی الزام نہیں۔

شیخ اسماعیل حقّی کی تفسیر ہے روح البیان، وہ لکھتے ہیں۔

''(اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ) حَالَ كَوْنِكَ مُتَلَبِّسًا (بِالْحَقِّ) مُؤَيِّدًا بِهٖ وَ الْمُرَادُ الْحُجَجُ وَ الْاٰيَاتُ وَسُمِّيَتْ بِهٖ لِتَأْدِيَتِهَا اِلَى الْحَقِّ (بَشِيْرًا) حَالَ كَوْنِكَ مُبَشِّرًا لِّمَنِ اتَّبَعَكَ ...(وَنَذِيْرًا) اَيْ مُنْذِرًا وَّمُخَوِّفًا لِمَنْ كَفَرَبِكَ وَعَصَاكَ وَالْمَعْنٰى اَنَّ شَأْنَكَ بَعْدَ اِظْهَارِ صِدْقِكَ فِيْ دَعْوَى الرِّسَالَةِ بِالدَّلَائِلِ وَالْمُعْجِزَاتِ لَيْسَ اِلَّا الدَّعْوَةُ وَالْاِبْلَاغُ بِالتَّبْشِيْرِ وَالْاِنْذَارِ لَا اَنْ تُجْبِرَهُمْ عَلَى الْقُبُوْلِ وَ الْاِيْمَانِ فَلَا عَلَيْكَ اِنْ اَصَرُّوْا عَلَى الْكُفْرِ وَالْعِنَادِ۔'' (روح البیان)

کہتے ہیں کہ یہاں حق سے مراد دلائل اور نشانات ہیں اور بَشِيْرًا تو بشارت دینے والا ہے ان کو جو تیری پیروی کریں اور نَذِيْرًا اور تو ڈراتا ہے انہیں جو تیرا انکار کریں، تیری نافرمانی کریں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دلائل اور معجزات کے ذریعہ تیرے دعویٰ رسالت کی سچائی کے اظہار کے بعد تیرا کام یہی ہے کہ تو اس حق کی طرف دعوت دے اور اسے لوگوں تک پہنچا دے خواہ خوشخبری دے کر یا ڈرا کر۔ تیرا یہ کام نہیں کہ تو ان کو حق کے قبول کرنے یا اس پر ایمان لانے کے لئے مجبور کرے اور تیرے پر کوئی الزام نہیں کہ دلائل اور معجزات کے بعد انہوں نے کفر اور مخالفت پر اصرار کیوں کیا۔ تیرا کام پہنچانا تھا تو نے پہنچا دیا اور لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ یہ باز پرس نہیں ہوگی کہ کیوں وہ ایمان نہیں لائے۔

ایک تفسیر ہے ''تفسیر المنار'' الامام الشیخ محمد عبدہٗ لیکچر دیا کرتے تھے ان کے ایک شاگرد ہیں سید رشید رضا صاحب انہوں نے ان کے جو لیکچر تھے یعنی قرآن کریم کے درس ان کو اکٹھے کر کے شائع کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ

''اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْعَقَائِدِ الْحَقِّ الْمُطَابِقَةِ لِلْوَاقِعِ وَالشَّرَائِعِ الصَّحِيْحَةِ الْمُوْصِلَةِ اِلٰى سَعَادَةِ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ۔ بَشِيْرًا لِّمَنْ يَّتَّبِعُ الْحَقَّ بِالسَّعَادَتَيْنِ (یعنی سعادتِ دنیا اور آخرت) وَ نَذِيْرًا لِّمَنْ لَا يَأْخُذُ بِهٖ بِشَقَاءِ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ۔ وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحَابِ

الْجَحِيْمِ اَىْ فَلَا يَضُرُّكَ تَكْذِيْبُ الْمُكَذِّبِيْنَ الَّذِيْنَ يُسَاقُوْنَ بِجُحُوْدِهِمْ اِلَى الْجَحِيْمِ لِاَنَّكَ لَمْ تُبْعَثْ مُلْزِمًا لَّهُمْ وَ لَاجَبَّارًا عَلَيْهِمْ فَيُعَدُّ عَدَمُ اِيْمَانِهِمْ تَقْصِيْرًا مِّنْكَ تُسْأَلُ عَنْهُ بَلْ بُعِثْتَ مُعَلِّمًا وَّ هَادِ بِالْبَيَانِ وَ الدَّعْوَةِ وَ حُسْنِ الْاُسْوَةِ لَاهَادِيًا بِالْفِعْلِ وَلَا مُلْزِمًا بِالْقُوَّةِ. لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ۔'' (تفسیر المنار) یہ کہتے ہیں کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھے عقائدِ حقہ کے ساتھ جو واقعات کے مطابق ہیں اور صحیح احکام کے ساتھ جو دینی اور دنیوی سعادت تک پہنچانے والے ہیں بھیجا ہے۔ بَشِيْرًا اور تُو بشارت دینے والا ہے دونوں قسم کی سعادت کی ہر اس شخص کو جو حق کی پیروی کرے۔ وَنَذِيْرًا اور ڈرانے والا ہے دنیا اور آخرت کی بدبختی سے اسے جو اسے اختیار نہ کرے۔ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ اُن مکذبین کی تکذیب تجھے کوئی ضرر نہیں پہنچائے گی جو اپنے انکار اور تکذیب کی وجہ سے جہنّم کی طرف دھکیلے جائیں گے کیونکہ تو اس لئے مبعوث نہیں کیا گیا کہ تو ان پر دباؤ ڈالے یا انہیں مجبور کرے ایمان پر کہ ایمان نہ لانے کو تیری کوتاہی شمار کیا جائے اور اس کے متعلق تجھ سے باز پُرس کی جائے بلکہ تُو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ تو تعلیم اور ہدایت دے۔حق کو بیان کرے۔اس کی دعوت دے اور نیک نمونہ پیش کرے۔اپنے اُسوہ سے ان کو صداقت کی طرف بلائے نہ اس لئے کہ تو انہیں عملاً مجبور کر کے بالجبر ہدایت یافتہ بنائے یا اپنی طاقت سے ان پر دباؤ ڈالے۔

دوسری جگہ فرمایا تیرا ذمہ نہیں کہ تو انہیں ضرور ہدایت تک پہنچائے لیکن اللہ تعالیٰ خود ہدایت دیتا ہے اسے جسے چاہتا ہے اور اس آیت میں ایک سبق بھی ہے کہ انبیاء کو بطور معلم کے بھیجا جاتا ہے نہ کہ بطور داروغہ کے اور نہ انہیں لوگوں کے دلوں میں تصرف کرنے کی طاقت حاصل ہوتی ہے یعنی ان کو یہ طاقت ہی نہیں دی گئی کہ لوگوں کے دل بدلیں۔کسی نبی کو نہیں دی گئی۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خدا تعالیٰ نے دل بدلنے کی طاقت نہیں دی تھی۔اس میں خدا تعالیٰ نے یہ اعلان کیا ہے کہ میں نے دلائل مہیّا کر دیئے، آسمانی نشان ان کو دکھا دیئے۔اس سے زیادہ ان کی دینی بہبود کے لئے میں (خدا جو ساری طاقتوں کا مالک ہے) بھی اور کچھ نہیں کروں گا۔ان کی مرضی پر چھوڑا ہے وہ میری رضا کی راہوں پر چلتے ہیں یا اپنے بدعملیوں کے نتیجہ میں میرے غصے کو بھڑکاتے ہیں۔

تو یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کو بطور معلّم کے بھیجا جاتا ہے نہ کہ بطور داروغہ کے اور نہ انہیں لوگوں کے دلوں

میں تصرف کرنے کی طاقت حاصل ہوتی ہے نہ انہیں جبر واکراہ کے لئے حکم ہوتا ہے۔ پس جب کبھی وہ جہاد کرتے ہیں تو صرف حق کے دفاع کے لئے نہ اس لئے کہ لوگوں کو وہ حق ماننے پر مجبور کریں۔

آخری حوالہ بہت پرانی تفسیر کا نہیں بلکہ ماضی قریب کی ہے یہ تفسیر۔ تو جیسا کہ پہلے بھی خطبوں میں میں بیان کر چکا ہوں ایک آیت اس مضمون پر روشنی ڈالتی ہے۔ ہم سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کریم کہتا کیا ہے؟ حکم تو شریعتِ قرآنیہ کا چلے گا اور خدا کہتا ہے کہ میں بھی جبر نہیں کرتا اور میرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی جبر نہیں کرتا۔ اس آیت کے یہی معنے کئے ہیں ان مفسرین نے کہ خدا نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ میں جبر نہیں کرتا۔ میرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی جبر نہیں کرتا اور اس وجہ سے وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ اگر کوئی انکار کرتا ہے، کوئی نفاق کی راہوں کو اختیار کرتا ہے۔ کوئی مرتد ہو جاتا ہے ایمان لانے کے بعد، کسی پہ جبر کوئی نہیں۔ لیکن کام یہ ہے کہ ڈراؤ اُن کو نہیں مانو گے تو خدا تعالیٰ کے غضب کی آگ میں جلو گے۔ منافقانہ راہوں کو اختیار کرو گے تو قہرِ الٰہی کی وہ تجلّی ظاہر ہوگی کہ تمہاری نسلیں بھی کانپ اٹھیں گی۔ یہ انذار کیا ہے اور اگر ارتداد کی راہوں کو اختیار کرو گے تو خدا تعالیٰ کی گرفت میں آؤ گے۔ یہ انذار کر دو، ان کو سمجھا دو اور اگر مانو گے خدا کے پیار کو پاؤ گے ..... اگر کوئی منافق بننا چاہتا ہے تو جبراً اسے روکا نہیں جا سکتا لیکن سزا اس کی بڑی سخت ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ اگر کوئی ارتداد اختیار کرتا ہے تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدایا میں نے بیس سال تو تیری پاک جماعت میں شامل رہ کر تیری راہ میں قربانیاں دی تھیں ان کا بدلہ تو مجھے دے۔ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا ان کے ایسے اعمال ضائع ہو جائیں گے ان کا بھی کوئی بدلہ نہیں ملے گا مرتد کو یہ یاد رکھنا چاہیے اور مرتد بنانے کی کوششیں بھی ہوتی ہیں شیطان کا یہ بھی کام ہے۔ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ کے جو تین معنے ہیں ان کی رو سے شیطان کے بھی تین کام ہیں۔ ایک اس کا کام ہے کہ انسان سے کفر کروائے یعنی قبول ہی نہ کرے صداقت کو جو اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ میں بیان ہوا ہے۔ دوسرے شیطان کا یہ کام ہے جس وقت کوئی ایمان لے آتا ہے تو بڑا تلملاتا ہے شیطان۔ یہ کیا ہو گیا۔ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر وہ وسوسے پیدا کر کے انسان کو نفاق کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہے اور یا وسوسے پیدا کر کے اسے ارتداد کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہے۔

(خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۸۳ تا ۹۵)

آیت ۱۲۶ تا ۱۳۰ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا
مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ
لِلطَّآىِٕفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۶﴾ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ
هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ
وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۷﴾ وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا
تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ
ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۳۰﴾

آٹھویں غرض یا آٹھواں مقصد بیت اللہ کی تعمیر کا یہ بتایا کہ یہ مَثَابَةً ہے۔ اس لفظ میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ دنیا کی اقوام فرقہ فرقہ بن گئی ہیں اور جس وقت یہ فرقہ بندی اپنی انتہا کو پہنچ جائے گی اس وقت ایک ایسا رسول مبعوث کیا جائے گا جو بیت اللہ کی اس غرض کو پورا کرنے والا ہوگا اور ان متفرق اقوام کو ایک مرکز پر لا جمع کرے گا۔ وہ سب کو عَلٰى دِيْنٍ وَّاحِدٍ لے آئے گا۔ پس یہاں بتایا کہ باوجود اس کے کہ تفرقہ ایک وقت پر اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ اس وقت ایک ایسے رسول کو مبعوث فرمائے جو تمام اقوام کو اُمَّةً وَّاحِدَةً بنا دے۔

نواں مقصد یہاں یہ بیان کیا کہ اَمْنًا یعنی یہ گھر جو ہے یہ اَمْنًا لِلنَّاسِ ہے۔ یہاں اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے اپنے اس گھر کو ایسا بنانا چاہا ہے کہ اس کے ذریعہ اور صرف اس کے ذریعہ دنیا کو امن نصیب ہوگا کیونکہ صرف یہ ایک گھر ہوگا جسے بیت اللہ کہا جا سکتا ہے اس کو چھوڑ کر اور ان تعلیموں کو نظر انداز کر کے جن کا تعلق اس گھر سے ہے دنیا کی کوئی تنظیم امن عالم کے لئے کوشش کر کے دیکھ لے وہ کبھی اس میں کامیاب نہیں ہوگی۔ حقیقی امن دنیا کو صرف اس وقت اور صرف اسی تعلیم پر عمل کرنے

کے نتیجہ میں مل سکتا ہے جو تعلیم وہ نبی دنیا کے سامنے پیش کرے گا جو خانہ کعبہ سے کھڑا کیا جائے گا۔

امن کے ایک دوسرے معنی کے لحاظ سے اَمۡنًا لِلنَّاسِ کے معنی یہ بھی ہیں کہ دنیا روحانی طور پر اطمینان قلب صرف مکّہ معظّمہ اور صرف اس آخری شریعت کے ساتھ پختہ تعلّق پیدا کرنے کے نتیجہ میں حاصل کر سکے گی جو آخری شریعت مکّہ میں ظاہر ہوگی اور تمام اقوام عالم کو پکار رہی ہوگی اپنے ربّ کی طرف اور چونکہ اطمینانِ قلب ہر انسان کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے فطری تقاضوں کو وہ تعلیم پورا کرنے والی ہو اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جتنی قوتیں اور استعدادیں پیدا کی ہیں ان سب کی راہ نمائی اور نشوونما کرنے کے قابل ہو پس یہاں یہ فرمایا کہ مکّہ گھر ہوگا ایک ایسی تعلیم کا جو حقیقی طور پر دنیا کو اطمینانِ قلب پہنچانے والی ہوگی یعنی ہر دو معنی یہاں چسپاں ہوتے ہیں۔ایک تو یہ کہ دنیا کو اگر امن نصیب ہوسکتا ہے تو وہ مکّہ کی وساطت سے دوسرے یہ کہ دنیا کی ارواح اگر اطمینانِ قلب حاصل کرسکتی ہیں۔دنیا کی عقلیں اگر تسلی پا سکتی ہیں تو صرف اس تعلیم کے نتیجہ میں جو مکّہ میں نازل ہوگی۔

دسویں غرض اور دسواں مقصد ان آیات میں خانہ کعبہ کا اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا ہے۔کہ اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى اس سے پہلی ایک آیت میں مَقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ کا ذکر تھا۔اس سے مراد یہ تھی کہ یہ مقام ایسا گھر ہے جہاں بنیاد ڈالی گئی ہے اس حقیقی عبادت کی جو محبت اور ایثار اور عشق الٰہی کے چشمہ سے بہہ نکلتی ہے اور اتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى میں اس عبادت کا ذکر ہے جو تذلّل اور انکسار کے منبع سے پھوٹتی ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا کہ بیت اللہ کی تعمیر کی ایک غرض یہ ہے کہ ایک ایسی قوم پیدا کی جائے جو تذلّل اور انکسار کے ساتھ اپنے ربّ کی عبادت کرنے والی ہو اور جو تذلّل اور انکسار کی عبادت کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام کے ظِلّ ساری دنیا میں قائم کرے اور اشاعتِ اسلام کے مراکز کو قائم کرنے والی ہو۔

گیارھویں غرض تعمیر بیت اللہ کی یہ بیان کی گئی ہے کہ طَهِّرَا بَيۡتِيَ اور اس میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ خانہ کعبہ کو ظاہری صفائی اور باطنی طہارت کا سبق سیکھنے کے لئے ساری دنیا کے لئے بطور ایک جامعہ اور یونیورسٹی اور ایک مرکز کے بنایا جائے۔

بارھویں غرض تعمیر کعبہ کی یہ بتائی گئی ہے کہ لِلطَّآئِفِيۡنَ یعنی اقوام عالَم کے نمائندے بار بار یہاں

جمع ہوا کریں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قریباً اڑھائی ہزار سال پہلے یہ بتایا تھا کہ تمام اقوامِ عالَم کے نمائندے بار بار یہاں آئیں گے طواف کرنے کے لئے بھی اور دوسری ان اغراض کے پورا کرنے کے لئے بھی جن کا تعلق خانہ کعبہ سے ہے۔

تیرھواں مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ وَالْعٰكِفِيْنَ خانہ کعبہ اس غرض سے ازسرِنو تعمیر کروایا جا رہا ہے کہ اس کے ذریعہ سے ایک ایسی قوم پیدا کی جائے جو اپنی زندگیاں خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کرنے والے ہوں اور اس طرح بیت اللہ کے مقاصد کو پورا کرنے والے ہوں۔

چودھواں مقصد یہاں یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ایک ایسی قوم پیدا کی جائے جو توحید باری پر قائم ہو اور جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری سے اپنی زندگیوں کو گزارنے والی ہو۔

پندرھواں مقصد یہ بیان ہوا ہے کہ بَلَدًا اٰمِنًا۔ امن کا لفظ ان آیات میں تین مختلف مقاصد کے بیان کے لئے اللہ تعالیٰ نے استعمال کیا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اس گھر کو دنیا کے ظالمانہ حملوں سے اپنی پناہ میں رکھیں گے اور کوئی ایسا حملہ جو خانہ کعبہ کو مٹانے کے لئے کیا جائے گا وہ کامیاب نہیں ہوگا بلکہ حملہ آور تباہ و برباد کر کے رکھ دیئے جائیں گے تا دنیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرے کہ وہ نبی جسے ہم یہاں سے مبعوث کرنا چاہتے ہیں وہ بھی خدا تعالیٰ کی پناہ میں ہوگا اور دنیا کی کوئی طاقت اس کی ذات کو ہلاک یا اس کے مشن کو ناکام نہیں کر سکے گی اور تا دنیا یہ بھی نتیجہ نکالے کہ جو شریعت نبی معصوم کو دی جائے گی وہ ہمیشہ کے لئے ہوگی اور خدا تعالیٰ اس کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوگا۔

سولہویں غرض جو خانہ کعبہ سے وابستہ ہے وہ یہ ہے کہ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ اس میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتایا کہ میں بیت اللہ کو ازسرِنو تعمیر کروا رہا ہوں اس غرض سے بھی کہ تا بیت اللہ اور اس کی برکات کو دیکھ کر دنیا اس نتیجہ پر پہنچے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے پر موت وارد کرتے ہیں اور اس کے ہو کر اس کی راہ میں قربانی دیتے ہیں اور دنیا سے کٹ کر صرف اسی کے ہی ہو رہتے ہیں ان کے اعمال ضائع نہیں ہوتے بلکہ شیریں پھل انہیں ملتا ہے اور عاجزانہ اور عاشقانہ اعمال کے بہترین نتائج ان کے لئے مقدّر کئے جاتے ہیں۔

سترھویں غرض بیت اللہ کے قیام کی یہ بتائی کہ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا بیت اللہ کی تعمیر کی ایک غرض یہ ہے

کہ تا دنیا یہ جانے اور پہچانے کہ روحانی رفعتوں کا حصول دعا کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے۔ جب دعا میں انسان کا تضرّع اور ابتہال انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور موت کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تب فضل الٰہی آسمان سے نازل ہوتا ہے اور معرفت کی راہیں بندہ پر کھولی جاتی ہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ نے یہاں بیت اللہ کے قیام کی غرض بتائی کہ یہاں ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو دعا اپنی تمام شرائط کے ساتھ کرے گی اور دعا میں ان پر ایک موت کی سی کیفیت وارد ہوگی اور ان کا وجود کلیۃً فنا ہو جائے گا اور پانی بن کر آستانہ ربّ پر بہہ نکلے گا اور وہ جانتے ہوں گے کہ ہم اپنے اعمال کے نتیجہ میں (محض اعمال کے نتیجہ میں) کچھ حاصل نہیں کر سکتے جب تک ہم دعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو جذب نہ کریں اس لئے انتہائی قربانیاں دینے کے بعد بھی وہ اپنی قربانیوں کو کچھ چیز نہ سمجھیں گے اور ہر وقت اپنے ربّ سے ترساں اور لرزاں رہیں گے اور انتہائی قربانیوں کے باوجود ان کی دعا یہ ہوگی کہ جو کچھ ہم تیرے حضور پیش کر رہے ہیں وہ ایک حقیر سا تحفہ ہے۔ تیری شان تو بہت بلند ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ تیرے حضور ہمارا یہ تحفہ قبول ہونے کے لائق نہیں لیکن تو بڑا رحم کرنے والا ربّ ہے ہمارے اس حقیر تحفہ کو قبول فرما اور ہماری غفلتوں اور ہماری حقیر مساعی کو چشم مغفرت سے دیکھ اور رحمت کے سامان پیدا کر تا کہ ہماری مساعی اور کوششیں تیرے حضور قبول ہو جائیں۔ غرض اس قسم کی قوم پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خانہ کعبہ کی از سر نو تعمیر سے اٹھارہواں مقصد یہ ہے کہ دنیا یہ جانے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کے حضور اس رنگ میں دعائیں کرتے ہیں وہی ہیں جو اپنے ربّ کی صفت سمیع کا نظارہ دیکھتے ہیں اور پھر دنیا دیکھتی ہے کہ ہمارا ربّ جو ہے وہ سننے والا ہے۔ وہ ہماری دعاؤں کو سنتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں نے تمہاری دعاؤں کو سنا۔ پس خانہ کعبہ کے قیام کے نتیجہ میں خدائے سمیع کی معرفت دنیا حاصل کرے گی۔

انیسواں مقصد یہ ہے کہ دنیا اس کے ذریعہ سے خدائے علیم کی معرفت حاصل کرے گی یہ نہیں ہوگا کہ بندہ نے اپنے علم ناقص کے نتیجہ میں جو دعا کی اسے اللہ تعالیٰ نے اسی رنگ میں قبول کر لیا بلکہ بندہ دعا کرے گا اور دعا کو انتہاء تک پہنچائے گا تو اس کا ربّ اس کی دعا کو سنے گا اور قبول کرے گا مگر قبول کرے گا اپنے علم غیب کے تقاضا کو پورا کرتے ہوئے یعنی جس رنگ میں وہ دعائیں قبول ہونی چاہئیں

اس رنگ میں۔بعض دعاؤں کا ردّ ہوجانا یا بعض دعاؤں کا اس شکل میں پورا نہ ہونا جس رنگ میں کہ وہ کی گئی ہیں یہ ثابت نہیں کرے گا کہ خدا سمیع نہیں ہے یا قادر نہیں ہے بلکہ وہ یہ ثابت کرے گا کہ خدا تعالیٰ ہی کی ذات علّام الغیوب ہے۔تو خانہ کعبہ کی بنیاد اس لئے رکھی گئی کہ خدا تعالیٰ کے بندے خدائے علیم سے متعارف ہوجائیں اور اس کو جاننے لگیں اور پہچاننے لگیں۔

بیسویں غرض یہاں یہ بیان کی گئی ہے کہ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ یعنی اُمّتِ مسلمہ ہماری ذریت میں سے بنائیو۔اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بتایا ہے کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی طرف مبعوث ہوں تو آپ کی قوم اُمَّةً مُّسْلِمَةً بننے کی اہلیت رکھتی ہو اور ابراہیمی دعاؤں کے نتیجہ میں وہ اُمَّةً مُّسْلِمَةً بن بھی جائے گی اور اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ وہ نبی جس کا وعدہ دیا گیا ہے کہ وہ مکّہ میں پیدا ہوگا مگر تم دعا کرتے رہو کہ اے خدا! ہماری اور ہماری نسلوں کی کسی غفلت اور کوتاہی کے نتیجہ میں کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرے نزدیک ہم اس قابل نہ رہیں کہ وہ وعدہ ہمارے ساتھ پورا ہو بلکہ کسی اور قوم میں وہ نبی مبعوث ہوجائے تو فرمایا میری اولاد کو ہی اُمت مسلمہ بنانا۔پہلے مخاطب وہی ہوں اور سب کے سب قبول کرنے والے بھی وہی ہوں۔

پس یہاں یہ بتایا ہے کہ وہ اُمّت جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) کی ذرّیت سے پیدا ہونے والی ہے وہ اُمّتِ مسلمہ بنے۔اس نبی کا انکار نہ کرے۔اس نبی پر ایمان لا کر جو ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر پڑیں وہ ان کو نباہنے کی قوت اور استعداد رکھنے والی ہو۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان کو ایسی ہی قوم بنانا چاہتے ہیں اور اسی غرض سے ہم نے خانہ کعبہ کی ازسرِنو تعمیر کروائی ہے۔

اکیسواں مقصد یہاں یہ بیان فرمایا کہ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا اس میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ مکّہ معظّمہ سے ایک ایسا رسول صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوگا جو دنیا کی طرف اس وقت آئے گا جب وہ اپنی روحانی اور ذہنی نشوونما کے بعد ایسے مقام پر پہنچ چکی ہوگی کہ وہ کامل اور مکمل شریعت کی حامل بن سکے۔ایسی شریعت جس میں پہلی شریعتوں کے مقابلہ میں لچک ہے۔ایسی شریعت جس میں مناسب حال عمل کرنے کی تعلیم دی گئی ہو اور ایسی شریعت جو ہر قوم اور ہر زمانہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہو۔ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا ہمارے مناسب حال جو کام اور جو عبادتیں ہیں جو ذمہ داریاں ہیں وہ ہمیں دکھا اور سکھا۔یعنی قرآنی شریعت کو ہم پر نازل فرما۔

پس اَرِنَا مَنَاسِكَنَا میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب وہ رسول آئے گا اس کا تعلّق دنیا کی ساری اقوام سے ہوگا اور ہر زمانہ سے ہوگا۔ پس دعا کرتے رہو کہ اے ہمارے ربّ قوم قوم کی ضرورتوں اور طبیعتوں میں فرق اور زمانہ زمانہ کے مسائل میں فرق کے پیشِ نظر شریعت ایسی کامل اور مکمل بھیجنا کہ جو ہر قوم کے فطرتی تقاضوں کو پورا کرنے والی ہو اور ہر زمانہ کے مسائل کو وہ سلجھانے والی ہو۔ قیامت تک زندہ رہنے والی ہو تا جس غرض کے لئے اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی ہے وہ پوری ہو۔

بائیسویں غرض اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ تُبْ عَلَيْنَا۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو آخری شریعت یہاں نازل کی جائے گی اس کا بڑا گہرا تعلق رَبِّ تَوَّاب سے ہوگا اور اس شریعت کے پیرو اس حقیقت کو پہچاننے والے ہوں گے کہ توبہ اور مغفرت کے بغیر معرفت کا حصول ممکن نہیں ہے اس لئے وہ بار بار اس کی راہ میں قربانیاں بھی دینے والے ہوں گے اور بار بار اس کی طرف رجوع بھی کرنے والے ہوں گے اور کہیں گے کہ اے خدا! ہماری خطاؤں کو معاف کر دے۔ وہ ایسی قوم ہوگی کہ جو نیکی کرنے کے بعد بھی اس بات سے ڈر رہی ہوگی کہ کہیں ہماری نیکی میں کوئی ایسا رخنہ نہ رہ گیا ہو جس سے ہمارا ربّ ناراض ہو جائے وہ ہر وقت استغفار اور توبہ میں مشغول رہنے والی قوم ہوگی۔

تیئسواں مقصد اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ کہ ہم محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا مولد اسے بنانا چاہتے ہیں ہم اسے ایسا مقام بنانا چاہتے ہیں کہ جس کے ماحول میں تضرع اور ابتہال کے ساتھ، عاجزی اور انکسار کے ساتھ، عشق اور محبّت کے ساتھ کی گئیں دعاؤں کے نتیجہ میں ہم اپنے ایک عبد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو محمدیت کے مقام پر کھڑا کریں گے اور اس کے ذریعہ سے ایک ایسی شریعت کا قیام ہوگا اور ایک ایسی اُمّت کو جنم دیا جائے گا کہ جو زندہ نشان اپنے ساتھ رکھتی ہوگی يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ اور زندہ خدا کے ساتھ اور زندہ نبی کے ساتھ اور زندہ شریعت کے ساتھ ان کا تعلّق ہوگا اور ان کو کامل شریعت کا سبق دیا جائے گا لیکن ناسمجھ بچوں کو جس طرح کہا جاتا ہے ان سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ ہم کہتے ہیں اور تم مانو۔ اللہ تعالیٰ ان کی عقل اور فراست کو تیز کرنے کے لئے اپنے احکام کی حکمت بھی ان کو بتائے گا اس نبی کے ذریعہ اور اس طرح وہ کچھ ایسے پاک کر دئے جائیں گے کہ اس قسم کی پاکیزگی کسی پہلی قوم کو حاصل نہ ہوئی ہوگی اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہماری عقل بھی تسلیم کرتی ہے کیونکہ اگر پہلی اُمتوں پر نسبتاً ناقص شریعتوں کا نزول ہوا اور اس ناقص

راہ نمائی کے نتیجہ میں ان کا تزکیہ ہوتو وہ تزکیہ کامل نہیں وہ ان کی فطرت کے مطابق ان کی استعداد کے مطابق، ان کی قوت کے مطابق تو ہے لیکن وہ کامل تزکیہ نہیں ہے کیونکہ جو تعلیم انہیں دی گئی ہے وہ کامل نہیں کیونکہ ان کی استعداد ابھی کامل نہیں۔ پھر جب وہ قوم پیدا ہوگئی جو کامل شریعت کی حامل ہونے کی استعداد رکھتی تھی تو ان میں سے جن لوگوں نے انتہائی قربانیاں دے کر اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس کے تمام احکام پر عمل کر کے اور تمام نواہی سے بچتے ہوئے اس کے حضور گریہ وزاری میں اپنی زندگی گزاری ان کو جو تزکیہ نفس حاصل ہوگا (محض خدا تعالیٰ کے فضل سے نہ کہ ان کے اعمال کے نتیجہ میں) وہ ایک ایسا کامل تزکیہ ہوگا۔ وہ ایک ایسی مکمل طہارت اور پاکیزگی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی ایسی خوشنودی اور رضا ہوگی کہ اس قسم کی رضا پہلی قوموں نے حاصل نہیں کی ہوگی۔

(خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۶۳۸ تا ۶۴۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا کی اور جسے میں نے اپنے خطبوں میں تیئیسواں مقصد بیان کیا تھا وہ دعا یہ تھی رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِكَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَ یُزَكِّیۡهِمۡ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ اے ہمارے ربّ ہماری یہ بھی التجا ہے کہ تو انہی میں سے ایک ایسا رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے یقیناً تو ہی غالب اور حکمتوں والا ہے۔

یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے قبول ہوئی اور جو رسول اس دعا کے ذریعہ سے مانگا گیا تھا عاجزانہ جھک کر خدا کے حضور، وہ آ گیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، قبولیت دعائے ابراہیمی کے نتیجہ میں، اللہ تعالیٰ کی یہ ساری تدبیر تھی انسان کے ہاتھ کا کوئی منصوبہ نہیں ہے خدا کا ہی منصوبہ تھا، وہ ہمیں میں یہ جو ابھی ایک آیت پڑھوں گا اس سے پتا لگے گا لیکن اس سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِكَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَ یُزَكِّیۡهِمۡ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ یہ جو چار مقاصد لے کے دنیا کی طرف آنے والے رسول کے لئے دعا کی گئی تھی یہ قرآن عظیم میں اس یہ البقرۃ کی آیت ۱۳۰ ہے اس کے علاوہ چار اور جگہ بالکل انہیں چار مقاصد کا ذکر ہے کچھ زوائد کے ساتھ۔

سورۃ بقرہ کی ہی ایک اور آیت ہے اور وہ ۱۵۲ ہے اور اس سے ہمیں پتا لگتا ہے اس میں یہ بتایا گیا

ہے اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو قبول کیا گیا اور وہ نبی جو ان کو دعا خدا نے سکھائی تھی کہ یہ دعا کرو محمد صلی اللہ علیہ وسلم آنے والے ہیں...... تو یہ جو دعا جو قبول ہوئی اس کا ذکر بھی اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کی میں نے بتایا ۱۵۱ تا ۱۵۴ آیات میں ہے وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یہ آیات یہاں سے شروع ہوتی ہیں بتانے کے لئے کہ اسی دعا کے ساتھ اس کا تعلّق ہے۔

وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور تُو جس جگہ سے بھی نکلے اپنی پوری توجہ مسجد حرام کی طرف پھیر دے وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ اور تم جہاں کہیں بھی ہوا پنے منہ اس کی طرف کیا کرو فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ تا ان لوگوں کے سوا جو ان مخالفوں مرتکب ہوئے ہیں باقی لوگوں کی طرف سے تم پر الزام نہ رہے۔ الزام ایک، بہت سے معانی ہیں قرآن کریم کے، ایک یہ الزام بھی تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا تمہارے متعلق نہیں قبول ہوئی تم اس گروہ میں نہیں ہو یہ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ الزام باقی نہ رہے فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ ان ظالموں سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ یہ حکم میں نے اس لئے دیا ہے کہ تم پر لوگوں کا الزام نہ رہے تا کہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کر دوں اور تا کہ تم ہدایت پاؤ آگے پھر وہ كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا اسی طرح جس طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔ پس جب میں اس قدر فضل کرنے والا ہوں تو تم مجھے یاد رکھو، میں بھی تمہیں یاد کرتا رہوں گا اور میرے شکرگزار بنو اور میری ناشکری نہ کرو اس میں لمبی تفصیل بھی ہوسکتی ہے لیکن اس وقت میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہی چار مقاصد لے کے مبعوث ہوئے۔ اعلان کیا گیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دعا میں جن چار مقاصد کا ذکر تھا ان مقاصد کے ساتھ مبعوث ہو گئے۔ اور اسی دعا کے ساتھ تعلق ہے تبھی کہا ہے ناں شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا ذکر کر کے اور واضح اشارہ کر دیا کہ اس کے ساتھ تعلق ہے۔

باقی جو ہیں پوائنٹس وہ میں چھوڑتا ہوں پھر چار جگہ یہ ذکر ہے چوتھی جگہ سورہ جمعہ میں ہے یہ اتفاق ہوا ہے کہ میرے کہے بغیر آج قاری صاحب نے وہی سورۃ جمعہ کی آیات پڑھ دیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَفَمَنِ

اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ (اٰلِ عمران: ۱۶۳) کہ وہ شخص جو اللہ کی رضا کے پیچھے چلتا ہے یعنی جو خدا چاہتا ہے وہ کرتا ہے کوئی ایسا کام نہیں کرتا کہ سمجھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگا، ہر وہ کام سمجھتا ہے کہ اللہ خوش ہوگا اللہ کو خوش کرنے کے لئے وہ کام کرتا ہے۔ پھر میں سارے حصے نہیں لے رہا اس کے بعض چیزیں لے رہا ہوں آپ کو بات سمجھانے کے لئے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ (اٰلِ عمران: ۱۶۴) وہ جماعت وہ اُمّتِ مسلمہ جو خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر خدا کی خواہش کے مطابق اس کی ہدایت کی اتباع میں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں، اعمالِ صالحہ بجالانے والے ہیں۔ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وہ ایک جیسے درجات رکھنے والے نہیں وہ مختلف درجات رکھنے والے لوگ نہیں اور وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ اور یہ جو چھوٹا درجے کا مومن خدا کا پیارا لیکن درجے میں بڑا کم اس سے ذرا اوپر، اس سے ذرا اوپر سب سے اوپر یہ جو ہے یہ اس لئے نہیں ہے کہ ویسے ہی فیصلہ کر لیا بغیر کسی حکمت اور دلیل کے بلکہ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ہر شخص نے اپنے اعمال کے مطابق ثواب حاصل کرنا اور ایک مقام کو، ایک رفعت کو حاصل کرنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ہے اور وہ عالم الغیب ہے وہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق، اس کے خلوص کے مطابق، اس کی نیت کے مطابق، ثواب دے گا اور اسی کے مطابق اس کا ایک درجہ ہوگا۔ سارے ایک درجہ کے نہیں ہیں بلکہ ترجیحات ہیں کچھ لوگ خدا کو بہت پیارے، کچھ لوگ اس سے کم پیارے، کچھ لوگ اس سے کم پیارے، لیکن سارے کے سارے ہی خدا کے پیار کی جنتوں میں جانے والے ہیں پھر فرمایا کہ اے وہ لوگو! جو ہمارے اس رسول پر ایمان لائے اور جس کے نتیجہ میں تم نے اپنے عقائد کو درست کیا اور اعمال صالحہ بجالائے اور وہ درجے درجے میں تقسیم ہوئے لیکن میری رضا کی جنتوں میں تم داخل ہوئے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (اٰلِ عمران: ۱۶۵) ایسے مومنوں جنہوں نے اس طرح میرے پیار کو حاصل کیا ہے تم پر خدا کا احسان ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں ہدایت پانے کی خدا کا پیار حاصل کرنے کی خدا کی رضا کی جنتوں میں جانے کی توفیق عطا کی۔ تمہارا احسان نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے اور نہ خدا تعالیٰ پر ہے ایک جگہ فرمایا خدا نے لَا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ (الحجرات: ۱۸)۔ احسان نہ جتاؤ مجھ

پر کہ ہم مسلمان ہو گئے اور مسلمان ہونے کے بعد جن قربانیوں کا اور جس شر کا اور جس تکلیف کو برداشت کرنے کا اور جس قسم کا جگرا تا کرنے کا اور دن کے اوقات میں روزے رکھنے کا اور بھوکے رہنے کے متعلق کئے گئے تھے یہ ہم نے کسی پہ احسان کیا لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اور وہاں کہا لَا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ (الحجرات:۱۸)۔

خدا کا احسان ہے تم پر اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ تم واقعہ میں مومن اور خدا کے پیار کو حاصل کرنے والے ہو تو خدا کا احسان ہے اپنے زور سے تم ایسا نہیں کہہ سکتے تھے کہ اگر یہ ہدایت نہ نازل ہوتی اور اگر اتنی عظیم تعلیم نہ آتی اگر اتنی بشارتیں ساتھ نہ لاتی اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ وعدے نہ دیئے جاتے کہ تیری اُمّت کے وہ لوگ جو تیری اتباع کریں گے وہ میری محبّت کو میرے پیار کو، حاصل کر لیں گے۔تو پھر کہاں سے تم پاتے یہ سب چیزیں فرمایا لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ خدا تعالیٰ نے ان مومنوں پر احسان کیا اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ کہ جب ان میں ایک رسول بھیجا ہے جو انہی میں سے ہے يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وہی چار مقاصد آ گئے جو خدا تعالیٰ کی آیات ان کے اوپر پڑھتا ہے وہ کھول کے ان کے سامنے بیان کرتا ہے اور سمجھاتا ان لوگوں کی طبیعتوں پر اثر پیدا کرتا ہے خیرِ کل جو ہے اس کو وہ قبول کرو اور اس سے استفادہ کرے اور خالی یہ نہیں کہتا، کرو، بلکہ بتاتا ہے اگر ایسا کرو گے تمہیں فائدہ ہے وَالْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اس میں ایک اور چیز بڑی زائد آ گئی کہ وہ باتیں بتاتا ہے جو تمہیں پہلے پتا نہیں تھیں۔اگر چہ تم یقیناً کھلی کھلی گمراہی میں تھے پہلے، لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے آپ پر شریعت قرآنیہ نازل ہوئی ایک عظیم کتاب اور بحرِ بے کنار جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے اتنے علوم اس میں بھرے ہوئے ہیں آ گے ہی، کہ ہر ایک نے اپنی ہمت کے مطابق غوطے لگائے ہر ایک نے اپنی صلاحیت کے مطابق، اس سمندر کی تہہ سے بڑے قیمتی موتی اور جواہرات نکالے خدا کا احسان ہے اگر یہ نہ ہوتا تو تم خدا کے پیار کو حاصل نہ کر سکتے، اس کی ترتیب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں ترتیب یہ رکھی تھی تو ایسا رسول آئے جو ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے پہلے آیات وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ پھر کتاب کا ذکر وَ الْحِكْمَةَ پھر حکمت کا ذکر اور اس کے بعد چوتھی بات حضرت ابراہیم کی دعا میں تزکیہ نفس کا ذکر لیکن جو قبولیت دعائے ابراہیمی ہے اس میں اس ترتیب کو بدل دیا گیا اور اس میں یہ کیا گیا کہ آیات پڑھ کے سنائے اور ان کا تزکیہ کرے۔ پھر

کتاب سکھائے اور حکمت سکھائے اور اس میں علاوہ اور بہت سارے مضمون کے جن سے قرآن بھرا پڑا ہے ایک حکمت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو ترتیب اختیار کی اس وقت کی ہدایت، آسمانی ہدایت اسی ترتیب کو چاہتی تھی اس وقت کی آسمانی ہدایت کیونکہ تزکیہ نفس پر ساری کوشش ختم ہو گئی ابدی ترقیات کا وعدہ نہیں تھا ان کو الکتاب کامل کتاب اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ ایک حصہ دیا گیا تھا۔ اس واسطے ان کی روحانی ترقیات اور دوسری خیر جو ان ہدائتوں کے ذریعے سے ان کو ملتی تھی وہ ایک جگہ پہ ختم ہو جاتی تھی ابدی طور پر نہ ختم ہونے والی ترقیات ہمیشہ بڑھتے رہنے والا ہر آن بڑھتے رہنے والا اللہ تعالیٰ کا پیار یہ وعدہ ان ہدایتوں ان شریعتوں میں نہیں دیا گیا تھا۔

اس واسطے ان کے نزدیک کمال جو ہے وہ تزکیہ نفس ہے اور اسی ترتیب سے انہوں نے ذکر کر دیا لیکن جو ہدایت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آئی وہ نہ ختم ہونے والی ترقیات، نہ ختم ہونے والے انعامات، ہمیشہ مسلسل بڑھتے چلے جانے والے اللہ تعالیٰ کے انعام کا وعدہ اس کے اندر ہے اور لیکن جو نشان ہیں، نکتے، وہ صرف چار ہیں آیات سے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی میں ترتیب لیتا ہوں آیات ہیں اور کتاب ہے اور حکمت ہیں اور تزکیہ نفس ہے۔ یہ چار ہی ہے ناں۔

وہاں آ کے ان کی شریعت ترقیات کو ختم کر دیتی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ختم ہونے والی ترقیات ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے والی۔ تو یہ چار جو ہیں پوائنٹ (نکتے) اس میں تو محدود بن جاتے ہیں یعنی جب چوتھے پہ پہنچیں گے تو پانچواں نہیں آئے گا لیکن اگر چکر چلے تو پھر نہ ختم ہونے والا بن گیا اور چکر اس طرح چلا یہ میں آپ کو بتاتا ہوں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ ہے اس کو مختصراً شروع میں بیان کیا تھا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ جو متقی ہیں ان کے لئے بھی ہدایت ہے متقی بناتی بھی ہے متقیوں کو مزید ہدایت دیتی ہے۔ پھر پہلے سے بڑا ایک بڑھ کر متقی بن جاتا ہے انسان۔ پھر جب بڑھ کر متقی بن جاتا ہے بڑھ کر انعام حاصل کرتا ہے۔ جب بڑھ کر انعام حاصل کرتا ہے جو اس کی صلاحیت ہے وہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ اسے پہلے کی نسبت زیادہ ہدایت نصیب ہو، پھر اس کو جب زیادہ ہدایت نصیب ہوتی ہے زیادہ تزکیہ نفس نصیب ہوتا ہے زیادہ تزکیہ نفس ہوتا ہے زیادہ پیار ملتا ہے، جب زیادہ تزکیہ نفس ہوتا تو پھر، وہ حقدار ہو جاتا ہے ہدایت اس کو اور ملے تو اس تسلسل کی وجہ سے جو ایک دائرہ ہے چھوٹا ہو یا بڑا جب اس کے گرد آپ چکر لگائیں وہ نہ ختم ہونے والی حرکت ہے ہماری عقل کہتی ہے۔ بے شک

پنسل سے لگا کے دیکھ لو اپنے کاغذوں کے اوپر، ختم ہی نہ ہوگی ختم تو وہ ہوتی ہے جو ایک جگہ آ کے آ گے ختم ہوگئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دماغ میں جس شریعت کا تصوّر تھا اپنی، وہ وہ تصوّر تھا ایک نَصِيْبٌ مِّنَ الْكِتٰبِ کامل کتاب کا ایک حصہ ہے ان کے پاس اور آیات ہیں آسمانی نشان ہیں پھر ہدایت ہے چھوٹا سا، اس کی تھوڑی بہت حکمت بھی بیان کی گئی ہے، اس طرح کی نہیں، لیکن کچھ نہ کچھ ہے ان کی عقل اور سمجھ کے مطابق ہے کامل سمجھ کامل فراست کے مطابق نہیں۔ پھر اطمینان مل گیا پھر ختم ہوگیا وہ شخص اپنی استعداد کی انتہا کو پہنچ گیا۔

اُمّت مسلمہ میں کوئی شخص بھی اپنی وقتی استعداد کی انتہا کو پہنچنے کے بعد وہاں ٹھہرتا نہیں کیونکہ جو وقتی استعداد تھی اللہ تعالیٰ کا فضل اس استعداد میں شدت اور وسعت پیدا کرتا ہے اور مزید ہدایت کے قبول کرنے کے سامان پیدا کرتا اور مزید فضلوں کے حصول کے سامان پیدا کر دیتا ہے، اسباب پیدا کر دیتا ہے۔

دوسری تین جگہ جہاں آیا ہے جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جہاں آیا ہے کہ خدا نے وہ رسول مبعوث کر دیا کہ جس کے لئے دعا مانگی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور جو وہ چار مقاصد لے کے آ گیا جن چار مقاصد والے رسول کے لئے دعا مانگی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ تو ایسا رسول ہے، فرق کر دیا پہلے سے کہ جس کے متبعین جو ہیں وہ غیر محدود ترقیات کے وارث بن سکتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت شامل حال ہو......

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تزکیہ نفس آخری پوائنٹ پہ ختم کر دیا تھا۔ شریعت محمدیہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمہ وقت نازل ہونے والے فرزند کے نتیجہ میں اس چکر کی وجہ سے ہمیشہ ترقیات، ابدی ترقیات کا حصول ممکن ہوگیا اور ترتیب کا بدلنا ضروری ہوگیا۔ جیسا کہ میں نے کہا اس میں جو آل عمران ہے اس میں (چیک کرلوں) یہ جو میں نے بتایا ناں فرق جو ہے یہ اس وجہ سے ہے اس کو خود الفاظ میں بھی ظاہر کیا ہے تینوں جگہ دوسری جانب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہو جانے کا ذکر ہے ان تینوں جگہ یہ ہے کہ تمہیں وہ دیا جاتا ہے جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔ یہی میں نے بتایا ہے ناں۔ تزکیہ آپ آتا ہے پھر وہ چیز دی جاتی ہے جو پہلے ان کے پاس نہیں تھی پھر ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، پھر ایک نیا دور شروع ہوتا ہے کیونکہ ہر دور کے بعد يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ اور وَ اِنْ

كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (الجمعۃ :۳) اور جو چوتھی قرآن کریم کی ترتیب میں بھی آخری موقعے پر یہ دوہرائے گئے ہیں چار مقاصد وہ سورہ جمعہ ہے۔

یہ جو ابدی ترقیات کا حصول ممکن ہونا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں یہ خیال گزر سکتا تھا کہ یہ انفرادی طور پر ہوتا ہے اور اسی کا ذکر کیا گیا ہے لیکن سورۃ جمعہ میں اُمّتِ محمدیہ کے لئے، اُمّتِ محمدیہ بحیثیت اُمّت محمدیہ ان دائروں میں سے گزرتی چلی جائے گی۔ سمجھ نہیں آئے گی ان کو اور دنیا کے بدلے ہوئے حالات میں جو فضل اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ پر نازل ہوں گے وہ بعض پہلوؤں کے لحاظ سے اس میں کہیں خلط کر جائیں کیونکہ پہلوں کو جو ملا ہے۔ وہ بڑا عظیم تھا۔ وہ بے حد عظیم تھا لیکن بعض پہلوؤں کے لحاظ سے ہر آنے والی نسل پہلوں سے کچھ زیادہ فضل بھی لے رہی ہے اس لئے چودہ سو سال جو گزرے اس کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہر صدی نئے مسائل لے کر آتی ہے جب ہر صدی نئے مسائل لے کر آئی ہے تو ان مسائل کو حل کرنے کے لئے جو بطون قرآنی ہیں اور قرآن کریم کے بطون ہر چار چیزوں سے تعلق رکھنے والے ہیں یعنی آیات جو پہلے ظاہر نہیں ہوئیں وہ ظاہر ہونی شروع ہوئیں کتاب کے معنی جو یعنی اصول اور فلسفہ مثلاً اشتراکیت کے مقابلے میں ہی جا کے بات کرتا ہوں پہلوں کو ضرورت ہی نہیں تھی قرآن کریم کی آیات سے اس استدلال کی جو مجھے آج ضرورت پڑ گئی، میرے ربّ نے مجھے وہ سکھا دیئے اور حکمت اور حکمت تو اب بہت پوچھتے ہیں جب نیا مسئلہ ہوگا نئے معنی ہوں گے تو نئی حکمت بھی بتانی پڑے گی اور اگر ان تین کے نتیجہ میں نیا تزکیہ ہوگا تو وہ پہلوں سے بہر حال مختلف ہوگا اور پہلے تو معروف ہیں یعنی ہر شخص جانتا ہے تو یہاں کچھ زیادہ مل گیا لیکن اپنی عظمت اور شان کے لحاظ سے وہ جو دیوانہ وار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد گھومے اور جنہوں نے آپ کی جسم کی بھی حفاظت کی اور آپ کے پیغام کی بھی حفاظت کی ان کے رتبے تو بہت بلند ہیں، اس لئے بھی کہ اس وقت سے لے کے آج تک ہم ان پر بھی درود بھیج رہے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے وقت اور ہماری دعائیں چودہ سو سال کی قبول ہونے والی دعائیں جو ہیں انہوں نے ان کی رفعتوں کو بلند کر دیا ہے اس لحاظ سے وہ بلند ہیں بعض دوسرے پہلوں سے آنے والے زیادہ تزکیہ نفس حاصل کر لیتے ہیں۔ بہر حال ان کا مقام، آنے والوں کا مقام آنے والوں کا مقام، سورۃ جمعہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہا ہے وہ بادشاہ ہے ہر چیز اس کی

بادشاہت اور اس کی پاکیزگی اور اس کے غلبہ اور اس کے حقیر ہونے کا اظہار کر رہی ہے۔ وہ جو ہر زمانے میں نئے سے نئے علوم قرآن کریم سے نکلتے ہیں اس میں بھی خدا تعالیٰ نے جو کہا وہ میں بتا دیتا ہوں آپ کو اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الواقعۃ :۷۹ تا ۸۱) نئے علوم جو ہیں وہ یہ بتاتے ہیں کہ قرآن کریم کی تعلیم ربّ العالمین کی طرف سے آئی ہے تا کہ ہر زمانے کے مسائل کو حل کر دے اور ربّ العالمین ہے صرف پہلے زمانوں کا ربّ نہیں تھا بلکہ قیامت تک کے لئے ہر زمانے کا وہ ربّ، ہر زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اس نے قرآن عظیم کو نازل کیا ہے۔

اس واسطے يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ جو بادشاہ بھی ہے اور پاکیزگی مجسم اور پاکیزگی کا سرچشمہ اور منبع اور سب خوبیوں کا جامع اور غالب اور حکمت والا اور قرآن کریم کو ہر زمانہ کے لئے نئی سے نئی حکمتوں سے معمور کر دینے والا ہے، هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اللہ تعالیٰ کے متعلق پہلی آیت میں ذکر کا یہ اعلان کیا وہ اللہ جس کی تسبیح کر رہے ہیں مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وہ خدا جو بادشاہ بھی ہے، پاک بھی، سب خوبیوں کا جامع بھی ہے، غالب اور حکمت والا بھی اس خدا نے بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اُمیوں میں سے ہی دنیوی لحاظ سے ان پڑھ لوگوں میں سے ایک شخص کو رسول بنا کے بھیج دیا اُمّی میں سے رسول اور رسول وہ جو رسولوں کا سرتاج جو خاتم الانبیاء جس کے سامنے ہر ایک نے ہر آن گزشتہ پہلے نبی نے اس کی عظمت کا اقرار کیا اور اس کے مقابلے میں اپنے لاشئے ہونے کا اقرار کیا۔

اس اُمّی کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا اور آپ پہ جو کلام نازل ہوا اس کا ایک کامل اور مکمل ہونا اور اتمام نعمت کرنے والا ہونا یہ بتاتا ہے کہ یہ کلام جو ہے اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو اس کی تسبیح کر رہی ہے، ہر وہ چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو بادشاہ بھی ہے پاک بھی ہے پاکیزگی کا سرچشمہ بھی ہے۔ غلبہ کا مالک بھی ہے اور ہر ایک کو اسی کا غلبہ عطا ہوتا ہے وہ حکیم بھی ہے حکمت والا بھی ہے اس کی تعلیم حکمتوں سے بھری ہوئی اس کے نیک بندے اس معنوں میں حقیقی تھے نئے ضرورتوں میں نئی حکمتیں سیکھتے اور دنیا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کی عظمتوں کو بیان کرتے اور اللہ تعالیٰ کی واحدانیت اور اس کی عظمت کے نعرے لگانے والے ہیں۔

ان آیات میں جو پہلی آیت ہے يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے وَ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ کہ یہ ایک نسل یا ایک صدی یا صرف ایک محدود زمانہ کے اندر اس کی برکتیں اور اس کی رحمتیں اور اس کی حکمتیں اور اس کے پاک کرنے اور تزکیہ کرنے کی قوت جو ہے اور اس کا حسن جو ہے وہ ختم نہیں ہو جائے گا کیونکہ اس خدا کی طرف سے اُمّی کے اوپر نازل ہوا ہے، ایک اور جماعتیں اس میں شامل ہوتی رہیں گی۔ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ اور آخرین میں بھی ایک جماعت ہے جو انہیں کے ساتھ، پہلوں کے ساتھ صحابہ کے ساتھ جا ملے گی اور ان کے سپرد جو کام ہوگا وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ان کی کامیابیاں غلبہ اسلام کی جدوجہد اور جہاد میں دنیا پر یہ ثابت کریں گی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والا کلام غالب ہستی کی طرف سے نازل ہوا اور اس ہستی کی طرف نازل ہوا جو حکیم ہے حکمت والا ہے اور حکمت سکھانے والا ہے پھر جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ جب یہ آخرین پیدا ہو جائیں گے تو دنیا میں ایک طمانیت اٹھے گی، یہ ذلیل لوگ یہ غریب لوگ یہ بے سہارا لوگ یہ بے بس لوگ یہ بے مایہ لوگ جن کی کوئی قدر نہیں ہے جن کا سیاست میں کوئی دخل نہیں اس میں کوئی دلچسپی بھی نہیں۔ انہیں کو چننا تھا خدا نے۔ اسی واسطے یہاں اُمّیّین کا لفظ پہلے پڑھایا گیا کہ جس طرح اُمّیّین میں سے ایک کو چنا اور اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنا دیا اسی طرح وہ عزیز اور حکیم خدا آخرین میں سے ایک کو چنے گا اور اسے مہدی بنا دے گا اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم روحانی فرزند بنا دے گا اور اس حقیر جماعت' دنیا کی دھتکاری ہوئی جماعت سے خدا جو قدرتوں والا خدا ہے کام لے گا تا کہ انسان کا دل شیطانی امور سے نہ بھر جائے بلکہ ہر نفس اپنے گریبان میں جھانکے اور اعلان کرے کہ میں خدا کا عاجز بندہ مجھے خود پتا نہیں کہ یہ انقلاب کیسے اور کیوں بپا ہو رہا ہے لیکن خدا تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ بپا ہو اور اسلام غالب آئے خدا تعالیٰ نے بشارت دی تھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وَ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وہ زمانہ آ گیا، وہ حالات پیدا ہو گئے، انقلاب پہ انقلاب، انقلاب پہ انقلاب دیکھنے والی آنکھ دیکھتی ہے کم از کم پندرہ سولہ سال سے کچھ تھوڑا بہت دھندلا سا تھا پہلے بھی، میرے دماغ میں۔ ہر تبدیلی انسانی زندگی میں اس لئے آ رہی ہے کہ آخر کار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت جو ہے وہ انسان پر ظاہر ہو اور وہ تبدیلیاں ہم کر رہے ہیں تم کر رہے ہو کون کر رہا ہے ہمارے مرد کر رہے ہیں عورتیں کر رہی ہیں خدا کر رہا ہے خدا کے فرشتے جو انسان کو نظر نہیں آتے وہ آسمانوں

سے نازل ہوتے اور دلوں میں تبدیلیاں پیدا کر دیتے ہیں وہ لوگ جن کی زبانیں اسلام کو بُرا بھلا کہتے تھکتی نہیں تھیں ان کی آنکھوں سے آنسوؤں سے خود میری آنکھوں نے اسلام کی تعریف سننے کے بعد آنسو ٹپکتے دیکھے ہیں۔

یہاں پہلی بات پہلا مقصد یہ بتایا گیا یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ یہ جو آیات ہیں یہ خانہ کعبہ کا مقصد بھی ہے اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ چوتھی غرض میں نے بتائی تھی اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ اور میں نے بتایا تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کعبہ سے ظاہر ہونے والا نور ایسے نشانات اور تائیدات سماوی کا منبع بنے گا جو ہمیشہ کے لئے زندہ رہیں گے آسمانی نشانوں کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھولا گیا ہے فرمایا بَلْ هُوَ اٰیٰتٌۢ یہ دوسری آیت ہے قرآن کریم کی بَلْ هُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ کہ قرآن کریم کا حقیقی علم رکھنے والوں کے سینوں کے اندر اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ کے نتیجہ میں ان کے سینوں میں پیدا ہوئیں اور ہر لحظہ وہاں سے نکلتی اور دنیا کو عظمت قرآنی اور عظمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بتا رہی ہیں۔آیت کے معنی ہیں یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ آیات کا مفرد ہے الایہ اور اس کے معنی لغت میں لکھے ہیں هِیَ الْعَلَامَةُ الظَّاهِرَةُ ظاہری علامت، ہر وہ ظاہری چیز، ظاہری علامت جس کے ذریعے کسی دوسری خفی چیز کا پتہ لگے، ایک معنے اس کے یہ ہیں اور دوسرے یہ جو آیات ہیں، آیات وہ عقلی امور ہیں جو خدا کی ذات یا صفات کی نشاندہی کرتی ہیں ان کی طرف راہنمائی کرنے والی ہیں ان میں دلائل عقلیہ بھی آتے ہیں وہ بھی آیت بنتی ہے دلائل عقلیہ جو قرآن کریم میں زبردست عقلی دلائل ہیں ان کو بھی قرآن کریم کی زبان میں آیت کہا گیا ہے۔قرآن کریم کی ہر آیت، آیت کہلاتی ہے ناں۔ہم کہتے ہیں اس سورۃ کی اتنی آیات، اتنی آیات، جو دلائل عقلیہ، جو خدا تعالیٰ کی معرفت عطا کرنے والی ہیں۔

اسی طرح آیات سے وہ آسمانی نشانات اور معجزات مراد لئے جاتے ہیں جو اپنے پاک بندہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ ظاہر کرتا اور ان کے نتیجہ میں انسان کی ہدایت کے سامان پیدا کرتا ہے۔آسمانوں اور زمین کی پیدائش کو بھی، یہ یاد رکھیں بہت سارے لوگ اس چیز کو بھول جاتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی پیدائش، حرکت اور زمانہ کو بھی آیت کہا گیا قرآن کریم میں، یعنی سورج کی پیدائش یہ آیت اللہ ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے سورج نہیں بنایا تو تم نے بنایا کسی اور نے بنایا۔کون ہے دعویٰ کرنے والا کہ میں نے جا کے سورج کو بنا دیا تھا۔

جو چیز بھی اس کائنات میں، اس مادی دنیا میں اور جو غیر مادی ہے اس میں بھی ظہور پذیر ہوتی ہے جو عدم سے وجود میں ظاہر ہوتی ہے یعنی پہلے نہیں تھی ہوگئی، وہ آیت ہے........

وَالْكِتٰبَ یہ جو کتاب ہے یہ تو مضمون ویسے ساری دنیا کو ہی اپنے اندر سمیٹنے والا ہے قرآن کریم کی تعلیم جو ہر شعبہ زندگی کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز کے متعلق حکم دیا قرآن کریم نے یا قرآن کریم کی تفسیر بیان کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ مثلاً کھانا، کتنے لوگ ہیں شرم آتی ہے مجھے آپ سے بھی پوچھتے ہوئے کہ آپ سے آپ تو بڑے آگے نکل گئے دین میں لیکن ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے جو کھانے کے متعلق کی سوچتے ہیں کیا ہمیں تعلیم دی اتنی چھوٹی بات کہ كُلْ بِيَمِيْنِكَ و كُلْ مِمَّا يَلِيْكَ اس وقت تھال میں سارے کھاتے تھے کہا دائیں ہاتھ سے کھا اور جو سامنے تیرے کھانا پڑا ہوا ہے پرات میں اسی میں سے لقمہ لو ادھر ادھر بوٹیوں کی تلاش نہ کر دوسرے کو متلی شروع ہو جائے گی۔ یعنی اس کو با اخلاق باادب بنایا دوسرے کو گھن کی تکلیف سے بچایا بڑے احسان کئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت محمدیہ پر۔ پہلے اس سے کہہ دیا تھا کہ گندے ہاتھ لے کے۔ مثلاً آدمی ورکشاپ میں کام کرتا ہے کوئی اعتراض کی بات نہیں گریس لگی ہوئی ہوتی ہے موبل آئل لگا ہوا ہے موٹر ورکشاپ میں اور اسی طرح ہاتھ دھوئے بغیر آ کر وہ خوراک والے شوربے میں سے بوٹیاں یا لقمے لینے شروع کر دے دوسرے آدمی کو گھن آئے گی۔ کہا ہاتھ دھو پہلے آکے۔ پاکیزگی کے متعلق اتنی تفصیل سے تعلیم دی گئی ہے جسم کے حصے ہیں میں نے اسی مضمون کے سلسلے میں بہت سارے حوالے نکلوا لیا کرتا ہوں۔ وقت کے لحاظ سے مجھے پتا ہوتا ہے کام نہیں آئیں گے علم بڑھ جاتا ہے زبان کی پاکیزگی، اب زبان کی پاکیزگی کئی طرح کی ہے کتاب کے متعلق یعنی جو تعلیم قرآن کریم نے دی الْكِتٰبَ ہے ناں اس کی تفاصیل بتا رہا ہوں، جھوٹ نہ بول، ہر وقت سچ نہ بول، موقع اور محل کے مطابق بات کر محض سچ نہیں بولنا بلکہ قول سدید کرنا ہے بعض آدمی اس طرح سچ بولتے ہیں وہ تھوڑا سا پیچ دار بھی کر دیتے ہیں اس کو یہ نہیں کرنا اور طیّب کہنا ہے اور قول حمید یعنی ایسی بات کہو منہ سے نکالو اپنے، معاشرے میں، کہ دنیا تمہاری تعریف کرے مُکّا لے کر تمہارے پیچھے نہ پڑے ایسے بھی سچ ہیں جو غصہ دلا دیتے ہیں اگلے آدمی کو کیوں دلاتے ہو غصہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منع فرمایا ہے۔ یہ زبان کی پاکیزگی چل رہی ہے دھونے کے علاوہ کسی کی چغلی نہیں کرنی، کسی کی

غیبت نہیں کرنی، زبان سے کرتے ہیں ناں آپ، کسی پر تہمت نہیں لگانی، کسی کو گالی نہیں دینی، کسی کو زبان سے ایذا نہیں پہنچانی، دکھ نہیں دینا وغیرہ وغیرہ۔ اتنی تفصیل میں گئی ہے شریعتِ اسلامیہ اور کوئی فلسفے تو نہیں ہیں جن کو سمجھانے کے لئے کسی بہت بڑے فلاسفر کی ضرورت ہو اور آپ کو سمجھنے کے لئے مہینوں کی ضرورت ہو......

اور آپ کی تعلیم چار حصوں میں تقسیم، جن میں سے دو کے متعلق مختصراً میں نے کہا ہے اور تیسری چیز ہے حکمت اس کے بڑے پہلو ہیں۔

قرآن کریم کے ہر حکم میں، مَیں ایک دو بنیادی حکمتیں ہیں وہ بیان کرنے لگا ہوں ہر حکم جو ہے اس کے اندر اعتدال کے پہلو کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے تا کہ انسان تھک نہ جائے اور دلبرداشتہ نہ ہو جائے، اعتدال کا پہلو مثلاً کھانے پینے کے متعلق اعتدال کا حکم، روزہ رکھنے کے متعلّق اعتدال کا حکم، ایک تو یہ کہ ہر روزہ مہینے کے سارے دنوں کے چوبیس گھنٹے کا روزہ نہیں بلکہ دن کا روزہ رکھا، تو دن اور رات میں ایک اعتدال پیدا کر لیا جو دن کی جسمانی کوفت تھی یا جسمانی تکلیف تھی یا جو جسمانی طور پر روزمرہ کی عادت میں فرق پڑا تھا عام طور پر لوگ کھانا کم نہیں کرتے، میں نے بڑا مطالعہ کیا ہے کچھ زیادہ ہی کھا لیتے ہیں مثلاً جو لوگ رمضان سے باہر پراٹھا نہیں کھاتے وہ رمضان میں کھا لیتے ہیں باقاعدہ گھی کے ساتھ، قطع نظر اس کے فوائد اس کے پھر بھی ہیں اس بحث میں نہیں میں اس وقت پڑتا۔.....

جب طبعی قوتوں کو موقع محل اور ضرورت کے مطابق استعمال کیا جائے وہ اخلاقِ فاضلہ بن جاتے ہیں۔ پھر پاکیزگی ہے، پاکیزگی کے متعلق دو باتیں اصولی بیان کیں ایک انسان کو یہ کہا فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النّجم :۳۳) اپنے آپ کو پاک نہ کہا کرو گنہگار ہو جاؤ گے غرور پیدا ہو جائے گا شیطان کی گود میں چلے جاؤ گے ہمیشہ عاجزانہ راہوں کو اختیار کرو کبھی جوش میں آکے نہ کہو میں بڑا پاک، میں بڑا ولی میں بڑا یہ میں بڑا وہ ہر شخص خدا کے حضور ایک عاجز وجود ہے اور جس چیز کو اسلام پاکیزگی کہتا ہے وہ یہ لپ سٹک اور سرخی کلّوں پہ لگانے کا نام نہیں ہے ظاہری آنکھ نے جسے دیکھنا ہے اس کا دل سے تعلّق ہے قرآن نے کہا لَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ دیکھ کبھی اپنے آپ کو پاک نہ کہنا هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم :۳۳) اس بات کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے کہ کون متقی ہے اور کون نہیں ہے۔

جب یہ کہا کہ خدا کو ہی علم ہے کہ کون پاک اور کون نہیں اور کون مطہّر اور کون نہیں کون متقی اور کون

نہیں تو پھر انسان کو تو تبھی پتا لگے گا، جب خدا بتائے گا کسی استاد سے اس کی سند نہیں لے سکتے قرآن کہتا ہے نہیں نہیں هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى اللہ کو پتا ہے یہ بھی استاد کو نہیں پتا کسی مجسٹریٹ سے لے کے جا کے کوئی پرانا کاغذ جو ہے اس کی تصدیق اور ثبوت مہیا نہیں کیا جا سکتا ہے اس کے سامنے، گواہوں کے ساتھ، کیونکہ گواہ بھی نہیں دے سکتے کہ کیا بات ہے اسلام نے یہ اعلان کیا ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کی راہ میں پاک اور متقی ہوگا خدا تعالیٰ خود اس کے متقی اور پاک ہونے پر گواہی دے گا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ جو میری نگاہ میں پاک اور مطہّر ہوں میں ان کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتا ہوں۔ ایک جگہ فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (حٰمٓ السجدۃ:۳۱) جنہوں نے کہا کہ ربّ حقیقی ہمارا اللہ تعالیٰ ہے ہم ہر قسم کی ربوبیت اور نشوونما کے لئے اس کے محتاج ہیں اسی سے مانگیں گے اسی سے لیں گے وہ دے گا تو ہماری نشوونما ہوگی ورنہ نہیں ہوگی ثُمَّ اسْتَقَامُوْا پھر وہ اپنے اس عہد پر سختی سے قائم رہتے ہیں استقامت سے قائم رہتے ہیں تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو ان کے پاس بھیجتا ہے انہیں تسلّی دیتا ہے خوف کے اوقات میں، ان کو تسلّی دیتا ہے جس وقت کوئی کوتاہی اور غفلت ہو جائے اور وہ بے چین ہو کر خدا سے توبہ اور استغفار کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کی توبہ اور استغفار قبول بھی ہوئی ہے یا نہیں اور بے چینی میں ان کے اوقات گزر رہے ہوتے ہیں آسمان کے فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں لَا تَحْزَنُوْا غم نہ کرو خدا نے تمہیں معاف کر دیا۔ آسمانی نشانوں کے ساتھ وہ ان کی پاکیزگی کو ظاہر کرتا ہے اس نے قرآن کریم کی عظمت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جلال کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم میں یہ اعلان کیا تھا لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعۃ:۸۰) کہ قرآن کریم کا فہم وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو پاک اور مطہّر ہو کیونکہ یہ پاک کا کلام ہے اور پاک کے سینے میں ہی یہ نور پیدا کر سکتا ہے۔

(خطاباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۴۳۰ تا ۴۵۳)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک الہامی دعا سکھائی گئی اور آپ نے وہ دعا خود بھی کی اور اپنی نسل سے بھی کروائی۔ جو یہ تھی کہ

اے ہمارے ربّ! انہی میں سے ایک ایسا رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب سکھائے اور حکمت اور دلائل سکھائے اور انہیں پاک کرے یقیناً تو ہی غالب ہے اور

تیری قدرتوں کا مظاہرہ حکمت کی بنیاد پر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے جو دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کروائی اسے قبول بھی کرنا تھا اور قبول کیا اور اس کا اعلان قرآن کریم میں کیا گیا، سورۃ جمعہ میں کہ وہی خدا ہے جس نے ایک اَن پڑھ قوم کی طرف اسی قوم میں سے ایک شخص کو رسول بنا کر بھیجا جو اُن کو خدا کی آیات سناتا ہے اور اُن کو پاک کرتا ہے اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے الفاظ کی ترتیب ان دو آیات میں بدلی ہوئی ہے اور جس میں حکمت ہے کیونکہ قرآن کریم، قرآن حکیم ہے حکمت بتاتا اور دلیل دیتا ہے۔

جو قبولیت دعائے ابراہیم کا اعلان ہے اور جس آیت میں یہ اعلان کیا گیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ الْأُمِّيِّنَ میں بھی انہیں میں سے ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے عظیم آیات دے کر مبعوث کیا وَيُزَكِّيهِمْ تاکہ وہ ان آیات کے نتیجہ میں حصول تزکیۂ نفس کی راہ پر چلنا شروع کر دیں۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ اور تزکیۂ نفس کرتے ہوئے جو عظیم شریعت قرآن کریم، محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کے ذریعہ سے اس قوم کو دی گئی ہے اُس کا علم زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے لگیں اور اس کی حکمتیں سیکھنے لگیں اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ نشانات کے ذریعے قبول ہدایت کا سامان پیدا ہوا اور ایک حد تک تزکیہ ہو گیا لیکن قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعة:۸۰) کہ اس کے علوم حقیقی، حقیقی طور پر وہی سیکھ سکتے اور سمجھ سکتے ہیں جن کے اندر تزکیۂ نفس پایا جائے تو آیات کے نتیجہ میں ایک حد تک تزکیۂ نفس پیدا ہو گیا اور تزکیۂ نفس کے نتیجہ میں قرآنی علوم پہلے سے زیادہ انہیں حاصل ہوئے اور قرآنی آیات اور تعلیم کی حکمتیں پہلے سے زیادہ ان کی سمجھ اور فراست اور عقل میں آئیں جس کے نتیجہ میں ان کا تزکیہ ترقی کر گیا اور اس راہ پر وہ آگے بڑھ گئے مزید تزکیہ کے حصول کے بعد انہیں قرآن کریم کے چھپے ہوئے مزید بطون حاصل ہوئے حکمتیں انہوں نے پائیں اور تزکیۂ نفس اور آگے بڑھ گیا زیادہ طہارت اور پاکیزگی انہیں حاصل ہوئی اور اس کے نتیجہ میں قرآنی علوم اور زیادہ انہیں ملے اور کیونکہ قرآن کریم کے علوم غیر محدود ہیں اس لئے اُمتِ محمدیہ کے لئے غیر محدود ترقیات اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے حصول کی راہیں کھول دی گئیں۔ (خطاباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۵۱۳و۵۱۴)

آیت ۱۵۱، ۱۵۲ وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ
وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ
حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ ۗ وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ
عَلَيْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ
تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو۔ تمہیں اپنی زندگی کا یہ مقصد کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ تمہاری بہتری کے تمام سامان اور تمہارے مقاصد کی یاددہانی کرانے والی ساری علامتیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مسجد حرام یعنی بیت اللہ سے تعلّق رکھتی ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا میں نے بیت اللہ پر متواتر کئی خطبات دیئے تھے جو چھپ چکے ہیں۔ ان خطبات میں مَیں نے بتایا تھا (اور جن کے بتانے کا مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن ملا تھا) کہ مسجد حرام کے ساتھ تئیس مقاصد وابستہ ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مکان کے لحاظ سے یا زمان کے لحاظ سے (دونوں پہلو اس کے اندر آتے ہیں) تمہیں اپنی وجہ یعنی توجہ کو مسجد حرام کی طرف رکھنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ فرمایا: وَ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ (الرحمٰن:۲۸)

اس کے معنے کرتے ہوئے امام راغب نے مفردات میں لکھا ہے۔

جو باقی رہنے والی چیز ہے وہ ایسے اعمال صالحہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے کئے جاتے ہیں۔ یعنی وہ اعمال صالحہ جنہیں انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی خاطر بجالاتا ہے وہ گویا وَجْهُ رَبِّكَ کے مترادف ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جو کوشش کی جاتی ہے۔ وہ قائم رہتی ہے اور باقی تو ہر عمل ضائع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ایک اور جگہ فرماتا ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (القصص:۸۹) امام راغب نے اس آیت کے یہ معنی کئے ہیں کہ كُلُّ شَيْءٍ مِنْ اَعْمَالِ الْعِبَادِ هَالِكٌ وَّ بَاطِلٌ اِلَّا

مَا اُرِيْدَ بِهٖ اللّٰهُ یعنی انسانوں کے اعمال میں سے ہر عمل ہلاک ہونے والا اور لایعنی اور باطل ہے سوائے اس عمل کے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پس اس اعتبار سے فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ کے یہ معنے ہوں گے کہ تم اپنی نیتوں کو ایسا بناؤ کہ وہ ہمیشہ تعمیر بیت اللہ کے مقاصد کی طرف متوجہ اور مائل رہیں۔ تمہیں چاہیے کہ تعمیر بیت اللہ کے سلسلہ میں قرآن کریم میں جو مقاصد بیان ہوئے ہیں تم اُن سے نظر نہ ہٹاؤ۔ جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ عملاً ظاہری طور پر بھی خانہ کعبہ کی حکومت تمہیں مل جائے گی۔ اس لئے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دعویٰ تو یہ ہے کہ میں ابراہیمی دعاؤں کا پھل اور ثمرہ ہوں۔ اگر میری بعثت کے مقاصد میں بنی نوع انسان کی دینی اور دنیوی ترقیات اور رفعتوں کے حصول خانہ کعبہ کے مقاصد میں بیان ہوئے ہیں اور جن کے آخر میں یہ دعا کروائی تھی کہ ایسا نبی ہو جو تزکیہ کرنے والا، حکمت سکھانے والا، آیات بیان کرنے والا ہو وغیرہ اس سچے دعویٰ کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ خانہ کعبہ پر کوئی غیر مسلم یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ماننے والوں کے علاوہ اور کوئی قابض رہے۔

پس ایک تو اس میں دوبارہ اس کو حاصل کرنے کی سعی کا بھی ذکر ہے کیونکہ اس کے بغیر تو وہ وعدے پورے نہیں ہوتے اور الزام آتا ہے یعنی اگر ایسا نہ ہوا تو غیر لوگ یہ الزام لگائیں گے کہ تمہارا دعویٰ تو یہ ہے کہ ہم ابراہیمی دعاؤں کے نتیجہ میں مبعوث ہوئے ہیں اور حالت یہ ہے کہ وہ مسجد حرام، وہ بیت اللہ جو حضرت ابراہیم کے ذریعہ از سرِ نو تعمیر کروایا گیا تھا اور اس کے جو مقاصد بیان ہوئے تھے ان کے ساتھ تمہارا عملاً کوئی تعلق نہیں وہ تو غیر کے ہاتھ میں ہے۔ فرمایا یہ تو تمہیں ملے گا۔ تمہیں ملنا چاہیے مگر اس کے لئے تمہیں جدوجہد کرنی پڑے گی اور تمہیں جدوجہد کرنی چاہیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہو گیا لیکن ابھی بات ختم نہیں ہوئی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تمہاری توجہ قیامت تک اس خانہ کعبہ کی طرف رہنی چاہیے۔ تمہاری نگاہ ہمیشہ اس کی طرف اٹھنی چاہیے تا کہ تمہیں معلوم ہوتا رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ذریعہ سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس عظمت اور جلال کا اعلان بنی نوع انسان کے سامنے کیا ہے، آپ اس کے مستحق ہیں کیونکہ آدم کے وقت میں پہلے نبی کے وقت میں جو انسان کی طرف آیا، اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے ایک گھر تیار کروایا اور

ہزار ہا سال تک اس کی حفاظت کروائی۔ جب آپ کی بعثت کا وقت قریب آیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اس کھوئے ہوئے خزانہ کو ڈھونڈیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی وحی کے ذریعہ انہوں نے اسے ڈھونڈ نکالا اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ حکم دیا کہ اس کی از سرِ نو تعمیر کرو کیونکہ جس کی یہ چیز ہے وہ مبعوث ہونے والا ہے۔

پس اس دعویٰ کے بعد مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ یا بیت اللہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ماننے والوں کے سوا کسی اور کے پاس رہ ہی نہیں سکتا۔ اس حقیقت کو جاننے کے بعد وہ مسلمان بڑا ہی ناشکرا ہوگا جو اس کی طرف اپنے وَجْہ کو نہیں کرتا یعنی اپنی توجہ کو اس طرف نہیں رکھتا اور اپنے اندر یہ احساس نہیں پیدا کرتا کہ ہماری ساری ترقیات کا راز ان مقاصد کے حصول کی کوشش میں ہے جو خانہ کعبہ کے تعلق میں بیان کئے گئے ہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ ان آیات میں فرماتا ہے کہ اے مسلمانو! خانہ کعبہ کی تعمیر کے جملہ مقاصد حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے رہو تا کہ تم پر دشمن کا کسی طور پر بھی الزام نہ آئے نہ ظاہری طور پر کہ خانہ کعبہ تمہارے پاس نہیں اور نہ روحانی طور پر کہ دعویٰ تو کرتے ہو مگر تم اس کے مطابق اپنی زندگیاں نہیں گذارتے اس واسطے تمہارا یہ فرض ہے کہ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ تم ہمیشہ اپنی نیّت اور مقصد یہ رکھو کہ خانہ کعبہ کے ساتھ جو برکات اللہ تعالیٰ نے رکھی ہیں یا خانہ کعبہ کے جو مقاصد اس نے بیان فرمائے ہیں۔ ہم اُن مقاصد کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو ڈھالیں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ کے اس عظیم اور نہایت پُر جلال فعل کو دیکھیں کہ اس نے کس طرح ہزار ہا سال پہلے ایک منصوبہ بنایا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بابرکت ظہور کا۔ جس سے آپؐ کی عظمت اور جلال بھی ظاہر ہوتا ہے۔ انسانوں کو پتہ ہی نہیں تھا۔ انبیاء علیہم السلام کو اسی نور کی صرف ایک جھلک دکھائی گئی تھی یعنی علم الٰہی میں اس نور کا اِدھر بھی اور اُدھر بھی پَرتَو پڑ رہا تھا۔ ایک روشنی تھی جو ماضی کو بھی منور کر رہی تھی۔ ایک روشنی تھی جو مستقبل کو بھی روشن کر رہی تھی اور قیامت تک پھیلی ہوئی تھی۔ باوجود اس کے کہ ایک لحاظ سے آپ اس مادی دنیا کے مادی بشر تھے مگر روحانی طور پر آپ کی عظمت اور جلال کا اظہار دیکھو۔ فرمایا میرا وہ محبوب آ رہا ہے جو انسانیت کا نچوڑ ہوگا۔ وہ میرے قریب تر ہونے والا ہے اور عملاً قریب تر رہے گا۔ کیونکہ روحانی طور پر آپ کی زندگی ماضی، حال اور مستقبل پر

اثر انداز ہے ایک ابدی حیات۔ باقی جب سے اور جب تک خدا تعالیٰ نے چاہا آپ کو زندگی عطا فرمائی۔ ہم تو عاجز بندے ہیں۔ ہمارا تخیل تو ان چیزوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

بہر حال اتنا ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ پہلے نبی کے وقت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کا اظہار ہونا شروع ہو گیا تھا اور علم الٰہی میں تو یہ ہمیشہ سے موجود تھا۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس عظمت اور جلال کو دیکھنے کے بعد کیا تم غیر اللہ سے ڈرو گے اور تمہارے دل میں اُن کا خوف پیدا ہوگا۔ تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی برکات کو دنیا میں پھیلانے اور بڑھانے کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے انسان کے ذریعہ اپنا کام شروع کروایا تھا اور کہا تھا کہ میرا پیارا آنے والا ہے تم اس کے لئے تیاری کرو اور پھر اس کی عظمت کو دیکھو کہ ہزار ہا سال تک ایک نبی کے بعد دوسرا نبی، ایک قوم کے بعد دوسری قوم اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل آتی رہی لیکن اللہ تعالیٰ کی جو سکیم تھی وہ جاری رہی۔ پس یہ اس کی عظمت اور جلال کا اظہار ہے۔

اب خانہ کعبہ اور اس کے مقاصد کے ذکر میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد خالی از حکمت نہیں ہے کہ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ یعنی غیر اللہ سے نہیں ڈرنا۔ صرف میرا خوف تمہارے دل میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ جیسا کہ ہم میں سے سب چھوٹے بڑے جانتے ہیں اور یہ بات اکثر ان کے کانوں میں پڑتی رہتی ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہے تو اس سے ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارے دل میں یہ خوف ہے کہ کہیں خدا تعالیٰ ہم سے ناراض نہ ہو جائے ہمارے دل میں یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ہم اپنے گناہوں اور غفلتوں کی وجہ سے خود کو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں سے محروم نہ کر لیں جنہیں وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طفیل ہمیں عطا کرنا چاہتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا یہی خوف ہے جو ہمیں ہر وقت لاحق رہتا ہے اللہ تعالیٰ کی اس عظمت اور جلال کا خوف رہتا ہے جس کے احساس سے انسان خود کو اور ہر دوسری مخلوق کو لاشئ محض سمجھتا ہے۔ فرمایا تم نے اس عظمت اور جلال کو خانہ کعبہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وجود میں دیکھا ہے اس لئے فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ کسی اور سے نہ ڈرنا۔ مجھ سے ڈرتے رہنا فرمایا قرآن کریم میں ہم نے خانہ کعبہ کے جملہ مقاصد بیان کر دیئے ہیں۔ اس لئے ہر عقلمند آدمی یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ

سارا منصوبہ بنی نوع انسان کی بھلائی اور رفعتوں کے لئے ہے اور یہ اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْکُمْ تا کہ میں اپنی کامل نعمتیں تم پر بارش کی طرح نازل کروں اور اس اتمامِ نعمت کے نتیجہ میں لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ تم ایسی فلاح اور کامیابی حاصل کرو کہ جس سے بہتر اور جس سے بڑھ کر اور کوئی کامیابی ہو ہی نہیں سکتی۔

جن آیات میں خانہ کعبہ کے مقاصد بیان ہوئے ہیں ان کے آخر میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی دعا کی گئی ہے جو آیات میں نے پڑھی ہیں ان میں اس دعا کی قبولیت کا ذکر ہے۔فرمایا:۔

کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَ یُزَکِّیْکُمْ وَ یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ

تا انسان کو یہ یاد دہانی کرائی جائے کہ فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَہٗ کے اصل معنے کیا ہیں۔

قرآن کریم کی ہر آیت کے ایک سے زائد بطون اور بہت سے معانی ہوتے ہیں لیکن مضامین اور معانی کا جو سلسلہ میں اس وقت بیان کر رہا ہوں اس میں فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَہٗ کے معنے کی وضاحت کے لئے آگے یہ نتیجہ آ گیا ہے کہ

کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَ یُزَکِّیْکُمْ وَ یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ

فرمایا وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، وہ خدا کا پیارا اور محبوب جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا نتیجہ اور امیدوں کا مرکز اور جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش گوئیوں پیش خبریوں اور بشارتوں کے مطابق مبعوث ہونا تھا۔ وہ آ گیا اور جن مقاصد کے لئے اسے مبعوث کیا جانا تھا اُن مقاصد کے پورا ہونے کا زمانہ آ گیا۔اس لئے فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَہٗ تم اُن مقاصد کو نظر انداز نہ کر دینا ورنہ تم پر الزام بھی آئے گا۔تم شیطان کے حربوں سے نقصان بھی اٹھاؤ گے۔ اتمام نعمت کے راستے میں روکیں بھی پیدا ہوں گی اور اس طرح تم آخری فلاح حاصل نہیں کر سکو گے لیکن اگر تم نے اپنی پوری توجہ خلوصِ نیّت اور پختہ عزم کے ساتھ ان مقاصد کو یاد رکھا اور ان کے حصول کے لئے کوشش کی جن کا تعلق خانہ کعبہ کی تعمیر کے ساتھ ہے تو پھر یاد رکھو! دنیا تم پر الزام نہیں دھر سکے گی کیونکہ تم سے خدا تعالیٰ کا پیار اور اس کی محبت کا سلوک دنیا کے سارے الزاموں کو مٹا دے گا۔

پس تم اس پیار کو حاصل کرو۔ دنیا اگر اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ کی رو سے ظلم کی راہ اختیار کرے اور

خدا تعالیٰ کے پیار کو دیکھتے ہوئے بھی تم پر الزام لگائے تو تم اس کی پرواہ نہ کرو کیونکہ بصارت رکھنے والی دنیا، آنکھیں رکھنے والی دنیا اور عقل رکھنے والی دنیا اعتراض نہیں کر سکے گی۔ دنیا یہ اعتراض نہیں کر سکے گی کہ تم ان مقاصد کو بھول گئے ہو یا یہ کہ اس زمانے میں خانہ کعبہ تمہارے قبضے میں نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا مسلمانو! خانہ کعبہ یا بیت اللہ تمہیں ملے گا اور پھر قیامت تک تمہارے پاس رہے گا لیکن جن ذمہ داریوں کا تعلّق خدا تعالیٰ کے اس گھر سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تحفۃً اپنے پیارے بندے، اپنے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیا تھا۔ ان ذمہ داریوں کو ہمیشہ اپنی نگاہ میں رکھنا۔ ان کو کبھی نظر انداز نہ کر دینا۔ پھر سوائے ظالموں کے کسی اور کا تم پر اعتراض نہیں رہے گا۔ کوئی حجّت نہیں ہوگی۔ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال کے جلوے دیکھنے لگو گے۔ پھر اندھیرے تمہاری نگاہ کے سامنے نہیں آئیں گے کیونکہ جب تم اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا کر لو گے تو پھر تم اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال کے جلوے دیکھو گے اور تم پر اس کی نعمتیں نازل ہوں گی۔ فرمایا وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف منسوب ہونے والی امت (جسے ہم امت مسلمہ کہتے ہیں) تم پر اتمام نعمت ہو جائے گی۔ پھر دنیا یہ ماننے پر مجبور ہو جائے گی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور تمام بنی نوع انسان اور تمام مخلوق کے ربّ نے وہ پیار جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اس امت سے کیا وہ پیار اور کسی سے نہیں کیا۔ پھر فرمایا وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ اس پیار کے نتیجہ میں کامل اور آخری کامیابی تمہیں نصیب ہوگی۔ مگر دامنِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک دفعہ پکڑ کر پھر اس کو چھوڑنا نہیں۔ پھر تم خدا تعالیٰ کی آنکھوں میں اپنے لئے وہ پیار دیکھو گے جو دنیا کے سارے خزانوں اور دنیا کی ساری نعمتوں سے کہیں بڑھ کر ہے پھر تمہیں کسی کی کیا پرواہ رہے گی۔ (خطباتِ ناصر جلد چہارم صفحہ ۱۴۸ تا ۱۵۴)

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی آیت کے اس ٹکڑے میں جس کی میں نے ابتداء میں تلاوت کی تھی فرمایا ہے فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ یعنی تم ان شیطانی وساوس یا شیطان صفت لوگوں سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ فرماتا ہے۔ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (اٰلِ عمران:۱۷۶)

یعنی شیطان اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے۔ جو لوگ شیطان کے دوست بن جاتے ہیں اور خدا کے دوست نہیں رہتے ان کے دل میں شیطان خوف پیدا کرتا ہے کہتا ہے دیکھو! دولت چلی گئی تو پھر پتہ

نہیں تمہیں ملے یا نہ ملے اور وہ بیوقوف یہ نہیں سمجھتا کہ پہلے جو دولت آئی تھی وہ شیطان نے تو نہیں دی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس دولت کو پیدا کیا۔ اور ان طاقتوں کو بھی پیدا کیا جن کی بدولت اسے وہ دولت ملی۔ اس کا اپنا تو کچھ نہیں۔

اسی طرح جو شخص صاحب اقتدار بن جاتا ہے سیاسی میدان میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے تو پھر وہ کہتا ہے اگر میں انصاف کروں تو شاید میرا اقتدار جاتا رہے کیونکہ صاحب اقتدار لوگوں سے بے انصافی کے تقاضے بھی کئے جاتے ہیں۔ ان سے ظلم کے تقاضے بھی کئے جاتے ہیں۔ آخر شیطان کو قیامت تک جو مہلت دی گئی ہے تو اس کا یہی مطلب تھا کہ شیطان کو قیامت تک دوست ملتے رہیں گے جن کو وہ ڈراتا اور خوف دلاتا رہے گا۔ چنانچہ مطالبہ ہوتا ہے کہ فلاں حصہ ملک پر یا فلاں جماعت پر یا فلاں گروہ پر ظلم کرو ورنہ ایجی ٹیشن ہوگی، ورنہ اقتدار تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

پس شیطان اپنے دوستوں کو اس قسم کی باتوں سے ڈراتا رہتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ہمیں یہ ہدایت دیتا ہے کہ فَلَا تَخْشَوْهُمْ ۔ شیطان کے دوست الٰہی احکام کے خلاف الٰہی شریعت کے خلاف اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ حسنہ کے خلاف لوگوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے ڈراتے ہیں مگر تم نے ان سے نہیں ڈرنا۔ ایک ہی چیز ہے ایک ہی وجود ہے اور ایک ہی ہستی ہے جس کے خوف سے انسان کے دل میں خشیت پیدا ہونی چاہیے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ شیطان کے دوستوں سے مت ڈرو صرف مجھ سے ڈرو اور میری خشیت اختیار کرو۔

میں نے اس وقت دنیا کی نعمتوں کے ضیاع کے خوف کا حصہ زیادہ نمایاں کیا ہے ورنہ یہ چیز ہر قسم کے خوف کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ تاہم نعمتوں کے ضیاع کے خوف کی طرف میری توجہ وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں نے اِس عالمین کو پیدا کیا اور اس قابل بنایا کہ وہ تمہاری خدمت کر سکے۔ تم اُسے مسخر کر سکو۔ تسخیر کائنات کے لئے تمہیں ہر قسم کی طاقتیں دیں۔ اِس کائنات کی ہر چیز حتیٰ کہ ان ستاروں سے لے کر جن کی روشنی ابھی تک زمین تک نہیں پہنچی زمین کے ذرّوں تک کو تمہاری خدمت پر لگا دیا کہ تم اُن پر حکومت کرو اور اُن سے فائدہ اُٹھاؤ۔ جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو بڑی طاقتیں اور

صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں جن کی بدولت انسان دولت اور اقتدار کا مالک بنتا ہے۔مگر شیطان اُسے یہ کہتا ہے کہ تجھے دولت ملی ہے اس کو سمیٹنے اور جمع کرنے کی فکر کرو۔ خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو کیونکہ خدا کی یہ مخلوق اور یہ عالمین اور تیری طاقتیں تیرا ساتھ چھوڑ دیں گی تو پھر کیا کرو گے؟ آج دولت ملی ہے کل نہیں ملے گی۔مگر خدا تعالیٰ فرماتا ہے جس طرح میں نے آج دولت دی ہے کل بھی دوں گا۔مگر شرط یہ ہے کہ تم نے شیطانی خوف دل میں نہیں رکھنا بلکہ صرف مجھ سے ڈرنا ہے اور صرف میری خشیت کو اپنے دل پر وارد کرنا ہے۔خشیت کے معنی دراصل ایسے خوف کے ہوتے ہیں کہ جس ہستی سے خوف کھایا جائے اس کی عظمت اور جبروت کا دل پر اثر ہو۔ چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی عظمت اور جلال کی دہشت، اس کی عظیم قدرتوں کا احساس اور اس کے حاکمِ کُل ہونے کا یقین ہے جو انسان کو خشیتُ اللہ پر مجبور کر دیتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر تم اپنے دل میں شیطانی وساوس پیدا نہیں ہونے دو گے، میری عطا کردہ دولت اور اقتدار یا مَیں نے جو دوسری چیزیں (مثلاً) صلاحیتوں کے رنگ میں یا عقل کے رنگ میں یا اخلاق کے رنگ میں عطا ہیں اُن کو میرے قرب کا ذریعہ بناؤ گے تو میں تم پر اور زیادہ انعام کروں گا.....

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ شیطان کے دوست ہیں شیطان انہیں خوف دلاتا رہتا ہے۔مثلاً وہ خوف دلاتا ہے کہ تمہاری دولت نہیں رہے گی۔ وہ خوف دلاتا ہے کہ تمہارا اقتدار نہیں رہے گا۔ چنانچہ شیطان جس قسم کا بھی خوف دلاتا ہے اس کا مقصد اور مطلوب یہ ہوتا ہے کہ انسان نیکیوں سے محروم ہو جائے اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم شیطان کی آواز سنو گے تو نیک نہیں بنو گے۔تم ان عظیم نعمتوں کو حاصل نہیں کر سکو گے۔ جن کو مَیں نے اس دُنیا میں تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔لیکن اگر تم شیطان کے دوست نہیں بنو گے اس کے خوف دلانے سے اثر قبول نہیں کرو گے۔ بلکہ اللہ سے خوف کھاؤ گے اس کی عظمت اور جلال کا احساس اور اس کی صفاتِ حسنہ کی معرفت رکھو گے اور یہ یقین رکھو گے کہ یہ کائنات یہ عالمین ہمیشہ تمہارے خادم رہیں گے۔اور یہ کہ تمہارے اندر وہ قوتیں موجود ہیں جن کے ذریعہ تم ان سے خدمت لے سکتے ہو تو پھر میں (اللہ) تم سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری اس خشیت (کہ کہیں اللہ ہم سے ناراض نہ ہو جائے۔ کہیں ہم اس کی رحمتوں سے محروم نہ ہو جائیں) اس

خوف کے نتیجہ میں لِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْکُمْ میں تم پر اتمامِ نعمت کروں گا۔ چنانچہ قرآن کریم کے الفاظ میں اتمامِ نعمت کی حسین شکل یہ ہے

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدۃ :۴)

اس آیہ کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ اتمامِ نعمت یعنی کامل شریعت تمہیں مل چکی ہے اگر تم اس کامل ہدایت پر عمل کرو گے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے عاجزانہ راہوں کو اختیار کرو گے اپنی زندگی کو اسلامی تعلیم کے رنگ میں رنگین کرلو گے تو اس دُنیا میں بھی اور اُخروی زندگی میں بھی تم پر اتمامِ نعمت ہو جائے گا تمہیں حسناتِ دُنیا بھی اپنے کمال میں ملیں گی اور حسناتِ اُخروی بھی کامل رنگ میں ملیں گی۔

اب اگر ہمیں یہ حسنات نہیں ملتیں تو اس میں ہمارا اپنا قصور ہے ہم نے خدا تعالیٰ کی بجائے بنی اسرائیل کا خوف اپنے دل میں بٹھا لیا یا خدا تعالیٰ کی بجائے روس کا خوف اپنے دل میں پیدا کرلیا یا ہم خدا تعالیٰ کی بجائے امریکہ سے ڈرنے لگے اور یہ نہ سوچا هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا (الملك :۳۰) یہ خدائے رحمان ہی ہے جس نے ہماری پیدائش سے قبل ہمارے لئے ان گنت نعمتیں پیدا کیں۔ دُنیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور ہستی نہیں ہے جو عمل سے پہلے انعام دے رہی ہو۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کو نہیں مانتے انہیں اللہ تعالیٰ کی صفات کی پرچھائیاں اور سائے سے نظر آئیں تو آئیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے کامل جلوے اسی انسان پر نازل ہوتے ہیں جو اس کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے......

یہ تو شیطان کے دوست ہیں جن کے دل میں غیر اللہ کی خشیت پیدا ہوتی ہے۔ شیطان خود سرکش اور اپنے دوستوں کو خدا سے دور لے جانے والا ہے۔ جو شخص خدا سے دور لے جانے والے کا دوست ہو گا اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر کسی کے دل میں غیر اللہ کی خشیت پیدا ہو گی تو ہم اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہوں گے کہ شیطان کے ساتھ اس نے دوستی لگا لی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کہتا ہے کہ جب کسی کے دل میں غیر اللہ کی خشیت پیدا ہوتی ہے تو یہ علامت ہوتی ہے شیطان کی دوستی کی۔ ہمیں ہر حال میں اس تعلیم پر عمل پیرا رہنا چاہیے جس کے متعلق قرآن کریم نے بار بار زور دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (ابراھیم :۱۳) بھروسہ کرنے والوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ پھر فرمایا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (المجادلۃ:۱۱) اور چاہیے کہ مومن صرف اللہ پر توکل کریں۔ (خطباتِ ناصر جلد چہارم صفحہ ۳۹۶ تا ۴۰۳)

ایک تقاضا ہے محبت کا اس خوف کا پیدا ہو جانا کہ ہمارا محبوب ہم سے کہیں ناراض نہ ہو جائے اس کو اسلام کی زبان میں خشیت اللہ کہتے ہیں۔ خشیت وہ خوف نہیں جو ایک خونخوار درندے کو دیکھ کر انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے خشیت وہ جذبہ ہے جو اللہ، اس عظیم ہستی کے جلال کو دیکھ کر اور اس کے حسن کا گرویدہ ہو کر اس کے احسان تلے پس کر اس احساس کے ساتھ کہ اتنے احسانات ہیں کہ ہم اپنی زندگیوں میں اس کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ عظیم اور صاحبِ جلال واقتدار ہستی ہم سے ناراض نہ ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں ہم اس کی محبت کو کھو بیٹھیں اور اپنی اس کوشش میں کہ ہم اس کی رضا کو حاصل کریں ناکام ہو جائیں۔ یہ ہے خشیت جو اللہ تعالیٰ کی پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ میری معرفت کے حصول کے بعد جب تم محبت کے میدانوں میں داخل ہو گے۔ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ اس وقت یہ یاد رکھنا کہ صرف میری ہی ذات وہ صاحبِ جلال ذات ہے کہ جس کے متعلّق جذبۂ خشیت انسان کے دل میں پیدا ہونا چاہیے کسی اور ہستی میں نہ وہ جلال ہے نہ وہ عظمت نہ اس کا وہ حسن نہ اس کا وہ احسان کہ انسان کے دل میں اس کے لئے خشیت پیدا ہو۔ ایک جابر اور ظالم بادشاہ کے لئے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے خشیت نہیں پیدا ہوتی یعنی دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس کے ظلم کا نشانہ ہم نہ بن جائیں لیکن اللہ تعالیٰ تو ظالم اور جابر نہیں وہ تو رحیم اور رحمان ہے۔ ہم کچھ بھی نہیں کرتے تب بھی وہ ہمیں اپنی عطا سے نوازتا ہے وہ رحمان ہے۔ اور جب ہم اس کے حضور کچھ پیش کرتے ہیں تو وہ کمال رحیمیّت کی وجہ سے نہ ہمارے کسی حق کے نتیجہ میں ہمارے اعمال کو قبول کرتا اور بہتر جزا ہمیں دیتا ہے اور انسان کے دل میں یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ اس کے کسی گناہ کے نتیجہ میں اس کی کسی کمزوری کی وجہ سے وہ عظیم حسن و احسان کا مالک ہم سے ناراض نہ ہو جائے اور اس کی محبّت اور اس کی رضا سے ہم محروم نہ ہو جائیں۔

(خطباتِ ناصر جلد پنجم صفحہ ۶۲۳)

آیت ۱۵۴ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۴

یعنی اے میرے مومن بندو! جو اس بات پر ایمان رکھتے ہو کہ میں خدائے قادر و توانا ہوں اور اپنی

تمام صفاتِ حسنہ کے ساتھ اپنی تمام قدرتوں کے ساتھ اور اپنے جلال کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہنے والا اور زندہ رکھنے والا حیّ و قیّوم خدا ہوں جو اس بات پر ایمان رکھتے ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی تمام اقوام کے لئے اور قیامت تک ہر زمانہ کے لئے نجات دہندہ کی شکل میں بھیجے گئے ہیں جو اس بات پر ایمان رکھتے ہو کہ قرآن کریم انسان کے تمام دینی اور دنیوی مسائل کو حل کرتا ہے جو اس بات پر ایمان لاتے ہو کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے ہی مبعوث فرمایا ہے۔ جو ایمان لاتے ہو کہ جس مقصد کیلئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث کئے گئے ہیں۔ اس مقصد میں آپ اور آپ کی جماعت ضرور کامیاب ہوگی تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں بے شک مشکل بڑی ہے اور کام اِس نوعیت کا ہے کہ عقلِ انسانی بظاہر یہ فیصلہ نہیں دے سکتی کہ اس میں ضرور کامیابی حاصل ہوگی لیکن خدا تعالیٰ کا جو وعدہ ہے وہ پورا ہوگا۔ اس لئے ہم تمہیں ہدایت دیتے ہیں کہ جس وقت یہ دیوار تمہارے سامنے آجائے اور تم کو محسوس ہونے لگے کہ آگے بڑھنے کا راستہ مسدود ہو گیا ہے اور ان اقوام کے دلوں کو فتح کرنا بظاہر ناممکن ہے یاد رکھو کہ اس وقت صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ میری مدد اور نصرت کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔

صبر کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ انسان استقلال کے ساتھ بُرائیوں سے بچنے کی کوشش کرتا رہے۔ یعنی اُسے اپنے نفس پر اتنا قابو ہو کہ وہ کبھی بے قابو ہو کر گناہ کی طرف مائل نہ ہو دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان نیکی پر ثابت قدم رہے اور دنیا کی کوئی طاقت، دنیا کا کوئی وسوسہ اور دنیا کا کوئی دجل صدق کے مقام سے مومن کا قدم پَرے نہ ہٹا سکے اور صبر کے تیسرے معنی یہ ہیں کہ جب کوئی نازک وقت اور مشکل پیش آئے اور دل میں شکوہ پیدا ہو تو وہ اسے خدا تعالیٰ کے سامنے پیش کرے۔ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (یوسف:۸۷)

یعنی اگر تم ایسا کرو گے تو وہ تمہاری امداد اور نصرت کے سامان پیدا کرے گا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ ہم نے تمہیں مادی سامان بہت کم دیئے ہیں لیکن جتنا بھی تمہیں ملا ہے مال کے لحاظ سے، طاقت کے لحاظ سے، وقت کے لحاظ سے، عزت کے لحاظ سے (کروڑوں نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہیں) جو کچھ بھی ہماری نعماء سے تمہیں ملا ہے۔ اگر تم اس کا صحیح استعمال کرو اور قربانی کے ان تقاضوں کو پورا کرو جو تم پر عائد ہوتے ہیں اور کبھی اپنی نگاہ میری ذات سے ہٹا کر کسی

اور کی طرف نہ لے جاؤ بلکہ اپنی کمزوری، ناتوانی، بے بضاعتی اور بے بسی کا رونا صرف میرے سامنے ہی روؤ اور خوشی کے ساتھ نیکیوں پر قائم ہو جاؤ اور جو تدابیر بھی تم کر سکتے ہو۔ ان تدابیر کو اپنے کمال تک پہنچاؤ تو میں تمہاری مدد اور نصرت کے سامان کر دوں گا۔

پھر صلوٰۃ ہے اس کے ایک معنی تو اِس نماز کے ہیں جو ہم پنج وقتہ ادا کرتے ہیں پھر کچھ سنتیں ہیں کچھ نوافل ہیں (جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے وہ نوافل بھی ادا کرتے ہیں) یہ سارے معنی صلوٰۃ کے لفظ میں آجاتے ہیں۔ پس صلوٰۃ کے ایک معنی اس خاص عبادت کے ہیں جو اسلام میں ایک مسلمان کے لئے لازم کی گئی ہے۔

پھر صلوٰۃ کے ایک معنی رحمت کے ہیں اور ان معنوں میں یہ لفظ خدا تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے صلی اللہ کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے نوازے۔ ہمارے کاموں میں برکت ڈالے۔ ہم پر احسان کرے اور ہمارے گناہوں کو معاف کر دے۔ (استغفار کے معنی بھی صلوٰۃ کے اندر آجاتے ہیں) پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم ایک طرف اپنی تدبیر کو اپنے کمال تک پہنچا دو اور جو کچھ تم کر سکتے ہو وہ کر گزرو اور پھر ہمارے پاس آجاؤ اور کہو اے خدا! جو کچھ تو نے ہمیں دیا تھا وہ ہم نے تیری راہ میں قربان کر دیا ہے مگر وہ اتنا کم ہے کہ دنیا کی طاقتوں کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہم اگر اپنا سارا مال بھی تیری راہ میں قربان کر دیں تو بھی ہم امریکہ کی دولت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم میں سے ہر ایک احمدی فرد لنگوٹا کس لے اور بھوکا رہنے کیلئے تیار ہو جائے اور اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دے تب بھی ہم روس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

پس خدا تعالیٰ نصیحت فرماتا ہے کہ میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ جتنی دولت روس کے پاس ہے اتنی دولت تم میری راہ میں خرچ کرو اور نہ میرا تم سے یہ مطالبہ ہے کہ جتنی دولت امریکہ اور انگلستان کے پاس ہے یا جتنی دولت دوسرے ممالک کے پاس ہے اتنی ہی تم میری راہ میں خرچ کرو میں تم سے صرف یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ جتنا کچھ میں نے تمہیں دیا ہے اُسے میری راہ میں خرچ کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہو جب امام وقت کی آواز آئے تو تم اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہر قسم کی قربانی کرنے کیلئے تیار رہو اور جب تم یہ سب کچھ کر گزرو تو میرے پاس آؤ اور کہو ہم نے تیرے ارشاد کے ماتحت جو کچھ بھی ہمارے پاس تھا تیری راہ میں قربان کر دیا ہے یا قربان کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن ہماری یہ قربانیاں

ان طاقتوں کے ساتھ تو ٹکر نہیں لے سکتیں جن کو تو نے دنیا میں قائم رہنے کی اجازت دی ہے تو اے ہمارے ربّ! ہم جو کچھ کر سکتے تھے وہ کر دیا ہے۔ ہم انسان ہیں ہم میں کمزوریاں بھی ہیں۔ ہم سے خطائیں بھی سرزد ہوتی ہیں اس لئے ہم تیرے پاس آئے ہیں۔ ہم تیری مغفرت کی چادر کے متلاشی ہیں تو ہمیں اپنی مغفرت کی چادر میں ڈھانپ لے۔ پھر ہم چاہتے ہیں کہ تو ہم پر احسان کرتے ہوئے ہمیں اپنی رحمت سے نوازے ہمارے کاموں میں برکت دے اور ہمیں محض اپنے فضل سے اس مقصد میں کامیابی عطا کرے جس کے لئے تو نے جماعت کو قائم کیا ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم یہ دو باتیں کر لو گے یعنی ایک طرف صبر اور تدبیر کو انتہاء تک پہنچا دو گے اور پھر صرف مجھ پر بھروسہ کرو گے اور اپنے نفس کو کلیۃً میری راہ میں فنا کر کے کامل توحید پر قائم ہو جاؤ گے تو یہ یاد رکھو کہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ میں تمہاری مدد کے لئے آسمان سے اُتروں گا اور جب میں آسمان سے اپنی تمام صفاتِ حسنہ کے ساتھ اپنی عظمت اور کبریائی کے ساتھ اور اپنے حسن اور جلال کے تمام جلوؤں کے ساتھ تمہاری مدد کیلئے نازل ہوں گا تو اس وقت نہ روس کی طاقت تمہارا مقابلہ کر سکے گی اور نہ ہی تمہارے سامنے چین کی کوئی حیثیت رہے گی۔ امریکہ اور انگلستان کا غرور بھی توڑ دیا جائے گا اور یہ وعدہ پورا ہوگا کہ اسلام دنیا میں غالب آئے گا اور تمام اقوامِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گی۔

لیکن ہمیں بہر حال یہی ارادہ اور نیت رکھنی چاہیے اور دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ صبر اور صلوٰۃ کی جو تعلیم دیتا ہے ہمیں اس پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔

(خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۱۹۱ تا ۱۹۴)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا دعویٰ کرنے والو اللہ پر ایمان کا دعویٰ کرنے والو کہ ہم خدا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے جو بشارتیں تمہیں ملی ہیں اگر تم انہیں حاصل کرنا چاہتے ہو، وہ بلند تر مقام جو تمہارے مقدّر میں ہے اس بلندی اور رفعت تک تم پہنچنا چاہتے ہو تو یاد رکھو اپنے زور سے وہاں نہیں پہنچ سکتے۔ نہ اپنی کوششوں سے خدا تعالیٰ کے پیار کو حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے خدا تعالیٰ کی مدد کو حاصل کرنا۔ اگر اللہ تعالیٰ فضل کرے اور اس کی مدد تمہارے شاملِ حال ہو۔ اگر اس کی نصرت تمہیں

توفیق دے کہ تم اس کے حضور قربانیاں پیش کرسکو۔ اگر اس کی رحمت اور اس کا فضل تمہاری کوششوں میں تمہارے اعمالِ صالحہ میں ایک حسن پیدا کرے۔ ایک نور پیدا کرے تب یہ ممکن ہے اور صرف اس وقت ممکن ہے۔ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اگر اپنا مقدر حاصل کرنا چاہتے ہو۔ یعنی جہاں تک تم پہنچ سکتے ہو جس غرض کے لئے تمہیں پیدا کیا اُمّتِ مسلمہ میں، اس غرض کو اپنے زندگی کے اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہو، اس مقدر کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو خدا سے استعانت چاہو، اس کی مدد، اس کی نصرت، اس کا فضل، اس کی رحمت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ کیسے کوشش کرو، صبر کے ساتھ اور صلوٰۃ کے ساتھ۔

صبر کا تعلق انسان کی اپنی جدوجہد، اس کی اپنی سعی کے ساتھ ہے۔ اپنے مجاہدہ کے ساتھ ہے جو روحانی میدانوں میں وہ بجالاتا ہے۔

صبر کا ایک پہلو یہ ہے کہ استقامت کے ساتھ بُرائیوں سے بچے، اپنے نفس کو نواہی سے بچنے پر باندھے رکھے۔ یہ ہیں صبر کے معنی ایک پہلو کے لحاظ سے۔ پوری کوشش کرے کہ کوئی ایسا عمل اس سے سرزد نہ ہو جو (خدا کے فرمان کے مطابق) خدا کو ناراض کرنے والا ہے اور صبر کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جرأت اور شجاعت کے ساتھ نیکیوں کی راہوں پر گامزن رہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری مدد حاصل کرو صبر کے ذریعہ سے کوشش کرو کہ تم سے گناہ سرزد نہ ہو اور کوشش کرو کہ ہمیشہ نیکیاں سرزد ہوتی رہیں۔ اعمالِ صالحہ تم بجالاتے رہو اور یہ تمہاری کوشش ہو۔ لیکن یہ کافی نہیں اس کے لئے بنیاد بناؤ اپنے عمل کو، اور صلوٰۃ کو، خدا سے دعائیں مانگو، خدا کو یاد رکھو، خدا کی صفات اور اس کی ذات کی معرفت حاصل کرو اور خدا تعالیٰ کی عظمتوں کو اپنے ذہن میں حاضر رکھتے ہوئے ان عظیم صفات کا واسطہ دے کر اس سے مانگو (مدد) کہ وہ قَدَمَ صِدْقٍ ظاہر و باطن طور پر جو ایک کامل درجہ مقرر ہے وہاں تک تمہیں پہنچا دے۔

اعمالِ صالحہ بجالاؤ بدیوں سے پرہیز کرو مگر اس کے نتیجہ میں نخوت پیدا نہ ہو بلکہ سمجھو اور یقین کرو کہ اپنی کوشش کوئی شے نہیں جب تک اس کے ساتھ صلوٰۃ دعا اور مقبول دعا کا جو نتیجہ ہے یعنی خدا تعالیٰ کا فضل، اس کا نزول نہ ہو اس وقت تک کچھ ہو نہیں سکتا۔ اگر اس استعانت میں مدد کے حاصل کرنے میں تم اپنی نیّت کے خلوص کے نتیجہ میں، اگر تم اپنے جذبۂ ایثار اور قربانی کے نتیجہ میں، اگر تم اپنے پیار کی

شدت کے نتیجہ میں اگر تم اپنے فدائیت کے حسن کے بعد خدا تعالیٰ کے فضل کو جذب کر سکو گے تو تمہارے اعمال مقبول ہو جائیں گے جو صبر کی تعلیم کی روشنی میں تم بجالائے اور جب تمہارے اعمال مقبول ہو جائیں گے تب تم اس قسم کے مومن بن جاؤ گے۔ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا کہ جن کے متعلق بشارت دی گئی ہے اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ جن کا خدا تعالیٰ کے حضور ظاہر و باطن طور پر ایک کامل درجہ ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۴۸۲ تا ۴۸۴)

آیت ۱۵۶ تا ۱۵۸ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۶ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۱۵۷ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۟ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝۱۵۸

اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ہمیں اس طرف توجہ دلائی کہ آزمائش کے بغیر، امتحان کے بغیر تمہیں چھوڑا نہیں جائے گا۔ جو دعاوی محبّت اور پیار کے اور فدائیت اور ایثار کے تم کرو گے اس سلسلہ میں تمہاری آزمائش بھی کی جائے گی، تمہارا امتحان بھی لیا جائے گا۔ کسی قدر خوف پیدا ہوگا بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ خوف کے حالات مختلف قسموں کے ہیں۔ دو ایکسٹریمز (Extremes) یعنی سب سے زیادہ خوف، سب سے کم خوف۔ سب سے زیادہ خوف اس وقت ہوتا ہے جب انسان یہ دیکھے کہ دنیوی طاقتیں اسے مٹا رہی ہیں اور سب سے کم خوف نہ ہونے کے برابر اس وقت ہوتا ہے جب انسان یہ محسوس کرے کہ جو سب سے زیادہ طاقت ور ہے اللہ ہمارا، وہ ہماری مدد کے لئے ہمارے پاس کھڑا ہے اور دشمن ہمیں ایذا تو پہنچا سکتا ہے کچھ خوف کے حالات تو پیدا کر سکتا ہے لیکن اپنے منصوبہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بھوک سے بھی تمہاری آزمائش کی جائے گی۔ جو صنعت و تجارت سے خدا تعالیٰ کے فضل اور رحمت اُس کی تُم حاصل کرو گے اس میں کمی اموال تمہارے ہوں گے، ان تجارتوں میں گھاٹا، صنعتی جو تمہارے منصوبے ہیں ان میں نقصان ہوگا اور ہم تمہاری آزمائش کریں گے۔ تمہاری

جان لے کر بھی تمہاری آزمائش کریں گے یعنی جان لے کر آزمائش تو اس کی ہے جس کی جان نہیں لی گئی۔ یعنی تمہاروں کی جان لوں گا میں اَور تمہاری آزمائش کروں گا وہ تمام فدائی جو پہلے زمانہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کے وقت اپنی جان نثاری کا ثبوت دے رہے تھے اور شہادت حاصل کر رہے تھے وہ تو جنّتوں میں چلے جاتے تھے۔ تکلیف اٹھانے والے، امتحان میں پڑنے والے تو وہ رہ جاتے تھے جو پیچھے زندہ چھوڑے جائیں۔ اور پھلوں کا نقصان ہوگا۔ باغات ہیں زراعت ہے، ثمرات کے لفظ میں صرف درخت کا پھل نہیں آتا بلکہ زمین کی پیداوار ساری کی ساری اس کے اندر آجاتی ہے۔ تو تمام ذرائع آمد کا ذکر کیا ہے مختلف پہلوؤں سے، مختلف وقتوں میں، مختلف شکلوں میں اللہ تعالیٰ نقصان کے ذریعے ان چیزوں میں ہماری آزمائش کرتا ہے۔

دوسری بات جو اس آیت میں بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مصیبتیں جو تم پر نازل ہوں گی، وہ ایک دوسری قسم کی مصیبت جو ہے ویسی نہیں ہوں گی۔ قرآن کریم سے ہمیں پتا چلتا ہے اور اس آیت میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ مصیبت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک آزمائش ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے عذاب کی شکل میں آتی ہے اور ایک وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے امتحان کی شکل میں آتی ہے۔ تو یہاں یہ فرمایا کہ یہ مصیبتیں عذاب نہیں، آزمائش ہیں۔ جو مصیبتیں عذاب کی شکل میں ہوتی ہیں ان کا تعلّق انذار اور اللہ تعالیٰ کے غضب کی جہنّم سے ہے لیکن جو مصیبتیں آزمائش کے رنگ میں آتی ہیں ان کا تعلّق بشارتوں اور خدا تعالیٰ کی رضا کی جنتوں کے ساتھ ہے۔ اس لئے یہاں اعلان کیا گیا کہ یہ مصیبتیں جو تم پر آئیں گی یہ تمہاری آزمائش کے لئے ہوں گی۔ یہ بریکیٹڈ (Bracketed) ہوں گی ہماری بشارتوں کے ساتھ ہمارا عذاب نہیں ہوگا۔ جس پر آئیں گی، اس سے یہ نہیں ثابت ہوگا کہ خدا ان سے ناراض ہوا یہ ثابت ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیار کے جلوے ان پر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

تیسری بات یہاں یہ بیان کی گئی کہ اس امتحان میں (ہر امتحان کے ساتھ یہ لگا ہوا ہے کہ فیل بھی ہو جاتے ہیں لوگ اور کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ تو یہاں یہ اعلان کیا گیا کہ اس امتحان میں) پورے وہ اترتے ہیں جو آزمائشی مصیبت، امتحان کے رنگ میں جو مصیبت آتی ہے جب وہ آئے تو ان کی توجّہ اپنے دکھ اور درد کی طرف نہیں ہوتی، اپنے نقصان کے خیال سے وہ اذیت نہیں اٹھا رہے ہوتے بلکہ

آزمائش والی مصیبت ان کو دھکا دے کر اور بھی ان کے ربّ کے انہیں زیادہ قریب کر دیتی ہے اور وہ شیطانی وسوسوں سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ ان کے وجود کا ذرّہ ذرّہ یہ پکارتا ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ہم اور ہماری ہر چیز اللہ کی ہے اور اسی کی طرف ہم نے لوٹ کے جانا اور اسی سے ہم نے اس کی رحمتوں اور اس کے فضلوں کو حاصل کرنا ہے۔

اور چوتھی بات یہاں یہ فرمائی کہ اگر تم اپنے امتحان میں پورے اُترو گے تو ایسوں پر ہی اس کی رحمت کا نزول ہوتا ہے نمبر ایک اُولٰٓىِٕكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ (ایسوں پر ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے) وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ اور ایسے ہی ان تمام انعامات کے وارث ہوتے ہیں جو ہدایت یافتہ جماعتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مقدّر کئے ہیں اور جن کی بشارتیں ہمیں قرآن کریم میں نظر آتی ہیں۔ (خطباتِ ناصر جلد نہم صفحہ ۳۳۳ تا ۳۳۵)

فتنہ یا آزمائش جس سے مومن آزمائے جاتے ہیں وہ قضاء وقدر کی آزمائش ہے کبھی کبھی اللہ تعالیٰ مومنوں کو قضاء وقدر کی آزمائش میں ڈال کر ان کا امتحان لیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ کہ ہم اپنی مشیت اور اِذن سے تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہارے مالوں میں نقصان کی صورت پیدا کر دیں گے۔

احمدیت میں بھی جو اللہ تعالیٰ کا سچا سلسلہ ہے ہر روز ایسی مثالیں ملتی رہتی ہیں مجھے کئی خطوط آتے رہتے ہیں جن میں لکھا ہوتا ہے کہ ہم احمدی ہوئے تھے مگر بیعت کے بعد ہمیں نقصان ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اگر یہ لوگ قرآن کریم کی ذرا بھی سمجھ رکھتے ہوں تو وہ فوراً جان لیں کہ یہ نقصان احمدیت کی صداقت کی دلیل ہے نہ کہ اس کے غلط یا جھوٹا ہونے کی کیونکہ قرآن کریم نے پہلے ہی بوضاحت بتا دیا تھا کہ جب تم ایمان لاؤ گے تو کبھی خدا تعالیٰ تمہارے مالوں میں تنگی پیدا کرے گا اور تمہیں آزمائے گا کہ آیا تم مال کو خدا تعالیٰ پر ترجیح دیتے ہو یا خدا تعالیٰ کی مرضی کو مال پر ترجیح دیتے ہو۔

وَ الْاَنْفُسِ اور کبھی یہ کرے گا کہ اِدھر تم ایمان لائے اُدھر تمہارا بچہ مر گیا یا کوئی دوسرا رشتہ دار فوت ہو گیا۔ اس وقت شیطان آئے گا اور تمہارے دل میں وسوسہ ڈالے گا کہ یہ مذہب جو تم نے اختیار کیا بڑا منحوس ہے۔ دیکھو ابھی تم ایمان لائے اور تمہارا بچہ فوت ہو گیا یا تمہاری ماں کا انتقال ہو گیا یا تمہارا باپ چلتا بنا وغیرہ وغیرہ لیکن اگر تم قرآن کریم کو جانتے اور سمجھتے ہو گے تو تم اس آیۃ کے ماتحت ایک قسم کی

بشاشت محسوس کرو گے کہ کتنا سچا ہے ہمارا خدا اور کتنا مہربان ہے وہ کہ وقت سے پہلے ہی اس نے یہ بتا دیا تھا کہ ہم اس قسم کی آزمائش میں تمہیں ڈالیں گے۔

وَالثَّمَرٰتِ اور کبھی وہ یہ کرے گا کہ دنیا کے حصول کے لئے جو تمہاری کوششیں ہوں گی دنیوی میدان میں اس کا نتیجہ ٹھیک نہیں نکلے گا اور ہم اس کو تمہارے لئے ایک آزمائش بنادیں گے۔ تو اس قسم کی آزمائشوں کو قضاء وقدر کی آزمائش کہا جاتا ہے یہ دوسری قسم کی آزمائش ہے جس میں سے مومن کو گزرنا پڑتا ہے.....

پھر قضاء وقدر کی آزمائش میں بھی ہمیں نہایت اچھا اور نیک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس وقت مسلمان کہلانے والوں میں سے ایسے خاندان بھی آپ کو نظر آئیں گے جو گھر میں فوت وموت ہونے کے وقت یا تو خدا تعالیٰ کو گالیاں دینے لگ جاتے ہیں یا پھر اس کا شکوہ شروع کرنے لگتے ہیں۔ وہ اس بشارت کے مستحق نہیں بن سکتے جس کا ذکر خدا تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

جس کی چیز تھی اس نے لے لی شکوہ کی گنجائش ہی کہاں ہے لیکن انسان بعض دفعہ بڑی حماقت کی باتیں کرتا ہے اور اپنے ربّ کا بھی شکوہ شروع کر دیتا ہے۔ تو قضاء وقدر کی آزمائش اور امتحان جو ہمارے لئے مقدّر ہیں ان میں بھی ہم نے ایسا نمونہ دکھانا ہے کہ خدا تعالیٰ کی بشارتیں ہمیں ملیں اس کا غضب یا ناراضگی ہم پر نہ اترے۔ (خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۲۱۷ تا ۲۲۱)

آیت ۱۷۸ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اَلْبِرَّ کا لفظ دو دفعہ مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ البِرّ کے ایک معنی

ہیں الطَّاعَۃُ۔ الصلاح الصِّدق (المنجد زیر لفظ بر)

اس لحاظ سے اَلْبِرّ کے معنی یہاں یہ ہوں گے ہر قسم کے فساد سے پاک ہونا اور ہر قسم کے حقوق اور واجبات پوری اطاعت کے ساتھ ادا کریں۔ پس فرمایا حقیقی نیکی یہ نہیں کہ تم نمازوں کی ادائیگی کے وقت مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرو۔ یا ان بشارات کو مدّنظر رکھتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں قرآن مجید میں دی ہیں کہ مشرق و مغرب کے تمام ممالک پر تمہارا قبضہ ہوگا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے ہو جائیں گے اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرہ:۱۱۶) کہ جس طرف تم رُخ کرو گے اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت اور اس کے ملائکہ کی فوج کو اپنی امداد کے لئے پاؤ گے۔ تو فرمایا ان پیشگوئیوں کو پورا کرنے کے لئے تم مشارق اور مغارب کی طرف نکلو یا عبادت کی غرض سے تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرو تو محض یہ بات وہ نیکی نہیں جس کا تمہارا ربّ تم سے تقاضا کرتا ہے۔ فرمایا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ (اور یہاں الْبِرَّ کا لفظ دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔) مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ کہ ہر قسم کے مفاد سے پاک اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پوری اطاعت اور فرمانبرداری سے ادا کرنے والا وہ ہے جو ایمان باللہ کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے والا ہو۔ یعنی علی وجہ البصیرۃ خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین رکھتا ہو۔ اور اس کی ذات اور صفات میں کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراتا ہو اور یقین رکھتا ہو کہ صحیفہ فطرت صحیحہ انسانیہ پر اس کی صفات کا انعکاس ہے اور تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ ہی سب نیکی ہے اور اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (البقرہ:۱۳۲) کا نعرہ لگاتے ہوئے فنافی اللہ کے سمندر میں اپنی ذات کو غرق کر دینا ہی سچی اور صحیح اور حقیقی اطاعت ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہاں نیکی کی اصل صفت کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ ہے مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ یعنی نیک وہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہے اور کہ وہ واحد یگانہ ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور وہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کہ اس زندگی کے ساتھ تمہاری حیات ختم نہیں بلکہ حشر کے روز پھر تمہیں اکٹھا کیا جائے گا ضرور پورا ہوگا اور اس روز ہم اپنے اعمال کو اپنے سامنے موجود پائیں گے اور وہ بھی یقین رکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ملائکہ کو اس کارخانۂ علّت و معلول میں آخری مخلوق علّت قرار دیا ہے اور اپنے اور مخلوق کے درمیان بطور واسطہ کے قائم کیا ہے اور وہ یہ بھی ایمان لاتا ہے کہ چونکہ خدا تعالیٰ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ہے اور انسان کی انفرادی نشوونما اور ارتقاء اور انسان کی اجتماعی نشوونما اور ارتقاء ایک خاص الٰہی منصوبہ کے ماتحت ہی ہے۔ اس لئے اس نے اپنے علم

کامل کے مطابق ابتدائے پیدائش سے ہی الکتاب قرآن کریم کو ربّانی ہدایت مقرر فرمایا ہے بے شک حضرت آدمؑ کے زمانہ سے ہی انبیاء پیدا ہوتے رہے جو انسان کو درجہ بدرجہ پست مقامات سے اُٹھا کر بلند مقامات کی طرف لے جاتے رہے لیکن ان کو جو کچھ بطور شریعت کے ملا وہ کامل اور مکمل شریعت نہ تھی بلکہ نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ (النّساء :۵۲) اسی کامل کتاب کا ایک حصہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں عطا ہوا تھا۔ اصل کتاب، اصل شریعت اور ہدایت جو اللہ تعالیٰ کے علم کامل میں ہے وہ قرآن کریم میں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کامل نیک جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو صحیح طور پر بجالاتا ہے اور اپنے ربّ کی کامل فرمانبرداری اور اطاعت کرتا ہے۔ وہ ہے جو الکتاب پر ایمان لاتا ہے۔ یعنی قرآن کریم کو اس کا حق دیتا ہے اور اس کی قدر کرتا ہے جیسے کہ واقعی قدر کرنی چاہیے کیونکہ یہی وہ کامل کتاب ہے جس کے بعض حصوں نے آدم علیہ السلام کی تربیت کی، بعض حصوں نے نوح علیہ السلام کی تربیت کی، ان کے بعد موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کی تربیت کی اور آخر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی اصلی اور حقیقی اور کامل اور مکمل شکل میں نازل ہوئی۔ پس کامل تربیت پانے والے صرف حامل قرآن ہی ہیں۔

والنّبیین وہ شخص تمام انبیاء اللہ پر بھی ایمان لاتا ہے۔ ایمان بالنّبوۃ کے لئے بھی کامل فرمانبرداری کی ضرورت ہے حتیٰ کہ اس کے اپنے نفس کا کچھ بھی باقی نہ رہے اور انسان اپنا سب کچھ اپنے ربّ کی راہ میں قربان کرنے کیلئے تیار ہو جائے اپنی عزّت بھی، اپنی روایات بھی، اپنے توہمات اور خوش اعتقادیاں بھی......

آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآىِٕلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ کہ وہ اپنا مال دیتا ہے۔ رشتہ داروں کو، یتامٰی، مسکینوں اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرانے کے لئے بھی۔ لیکن یہ نیکی نہیں جب تک عَلٰى حُبِّهٖ نہ ہو۔ یہ خرچ مومن بھی کرتا ہے اور کافر بھی کرتا ہے کیونکہ بہت سے دنیادار آپ کو نظر آئیں گے۔ جو اپنے رشتہ داروں پر اس لئے خرچ کر رہے ہوں گے کہ اس طرح خاندانی اتحاد اور اتفاق قائم رہے گا اور ان کی عزّت اور وجاہت قائم رہے گی وہ اپنے خاندان میں بھی بڑے سمجھے جائیں گے اور دنیا بھی ان کو عزّت کی نگاہ سے دیکھے گی۔

اسی طرح بہت سے دنیا دار مختلف اغراض کے پیشِ نظر یتامیٰ کی پرورش کے لئے خرچ کرتے ہیں اسی طرح مساکین کی حمایت کا دم بھرنے والے دنیا دار محض دنیا کی خاطر اپنے مال دیتے ہیں۔ بہت سی پارٹیاں آپ کو انگلستان اور امریکہ میں نظر آئیں گی کہ جنہیں کمزوروں کے ساتھ کوئی محبت اور پیار نہیں ہوتا۔ لیکن اس خیال سے کہ اگر ہم نے ان کو اپنے سینے سے لگایا تو ہمیں سیاسی برتری حاصل ہو جائے گی۔ وہ ان کے لئے دوڑ دھوپ کرتی رہتی ہیں۔

اسی طرح مسافروں پر بھی اپنا پیسہ خرچ کر کے احسان کیا جاتا ہے تاکہ جب وہ اپنے وطن جائیں تو وہ کہیں کہ زید بڑا اچھا، بڑا خرچ کرنے والا اور بڑا پیار کرنے والا ہے اور مسافروں کا بڑا خیال رکھنے والا ہے ہم اس کے ہاں گئے تو اس نے ہماری بڑی خاطر کی یہی حال اس خرچ کا ہے جو غلاموں کے لئے کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ نیکی نہیں، نیکی یہ ہے کہ انسان اپنے پیسے یا مال کو (مال کے معنی مملوکہ چیز کے ہیں انسان اپنے نفس کا بھی مالک ہے، اپنی عزّت کا بھی مالک ہے۔ اپنے پیسے کا بھی مالک ہے۔ وغیرہ) خرچ کرے تو عَلٰی حُبِّہٖ صرف خدا تعالیٰ کی محبّت میں خرچ کرے۔ خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کی خوشنودی کے سوا کوئی غرض اسے مدّنظر نہ ہو۔ نہ تو اسے عزّت کی خواہش ہو۔ نہ وجاہت کی خواہش ہو نہ دنیوی شہرت کی خواہش۔ اور نہ اس کا ذہن فخر ومباہات کے غبار سے آلودہ ہو بلکہ جب بھی اور جو کچھ بھی وہ خرچ کرے خدا تعالیٰ کی محبّت اور اس کے نتیجہ میں اور اس کی خوشنودی کے حصول اور اس کی رضا کے پانے کے لئے خرچ کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ نیک شمار نہیں ہوگا اور کسی ثواب کا مستحق نہیں ٹھہرے گا۔

اسی طرح فرمایا کہ عبادت بجالانا خواہ وہ نماز ہو۔ یا مالی فرائض (مثلاً زکوٰۃ) ہوں یہ بھی حقیقی نیکی نہیں بلکہ نماز کو ان شرائط کے ساتھ بجالانا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہیں حقیقی نیکی ہے۔

ان شرائط میں سے بنیادی شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہوئے سوائے اس کے اور کوئی غرض نہ ہو کہ اس کی خوشنودی حاصل ہو۔ تب یہ عبادت صحیح عبادت شمار ہوگی۔

اگر کسی نے اپنے نفس کو پالا اور اسے موٹا کیا اور قربانی دینے کے لئے تیار نہ ہوا تو اس کے متعلق یقیناً نہیں کہا جا سکتا۔ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ کہ اس نے نماز کو پورے شرائط کے ساتھ ادا کیا۔

وَابْنَ السَّبِيْلِ (مسافر) کے متعلق میں ایک بات بیان کر کے اپنے خطبہ کو بند کر دوں گا۔ (ورنہ اس آیت کے مضامین بہت وسیع ہیں) اللہ تعالیٰ نے مسافر کے ساتھ ہمدردی، اخوت کا سلوک کرنے اور اسے مالی امداد دینے پر بڑا زور دیا ہے اور مختلف مقامات میں زور دیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم ہر اس شخص سے جو ہمیں اپنے ماحول میں اجنبی نظر آئے واقفیت پیدا کریں ورنہ ہم اس کی خدمت نہیں کر سکیں گے۔

ابھی چند روز ہوئے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ میں باہر کی ایک جماعت میں گیا مسجد میں پہنچ کر میں نے اپنا بیگ رکھا اور نماز ادا کی وہ دوست کہتے ہیں کہ مجھے ان لوگوں کی مہمان نوازی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ خدا تعالیٰ نے مجھے بہت کچھ دیا ہوا ہے، میری جیب میں پیسے تھے اور مجھے خیال بھی نہ تھا کہ میں کسی کے پاس جا کر کھانا کھاؤں۔ لیکن مجھے یہ احساس ہوا کہ خدا تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ مسافر کا خیال رکھو مگر ہمارے ان دوستوں نے میری طرف کوئی توجہ ہی نہیں کی۔ ہو سکتا ہے کہ میری طرح کوئی اور مسافر یہاں آئے اور وہ ضرورت مند ہو۔ اگر اس سے بھی ایسا ہی بے توجہی کا سلوک ہو تو اس کی ضرورت پوری نہ ہوگی اسی احساس کے ماتحت میں یہ رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں تا کہ آپ دوستوں کو اس طرف متوجہ کریں۔ (خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۲۷۰ تا ۲۷۴)

آیت ۱۸۴ تا ۱۸۸ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۱۸۴ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۱۸۵ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ

عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ
قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ
لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ
لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ
اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ
اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ
الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ
اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

آیات کی تو میں نے تلاوت کردی، ان کا ترجمہ تفسیر صغیر کے ترجمہ کی روشنی میں یہ ہے یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اے لوگو! جو ایمان لائے ہو خدا اور اس کے رسول اور اس عظیم کتاب پر، تم پر بھی روزوں کا رکھنا اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں تا کہ تم روحانی اور اخلاقی کمزوریوں سے بچو۔ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سو تم روزے رکھو چند گنتی کے دن اور تم میں سے جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو اسے اور دنوں میں تعداد پوری کرنی ہوگی اور ان لوگوں پر جو اس کی طاقت نہ رکھتے ہوں یعنی روزے کی بطور فدیہ ایک مسکین کا کھانا دینا بشرط استطاعت واجب ہے اور جو شخص پوری فرمانبرداری سے کوئی نیک کام کرے گا تو اس کے لئے بہتر ہوگا اور تم سمجھو تو تمہارا روزے رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے۔

رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس کے بارہ میں قرآن کریم نازل کیا گیا۔ (میں ترجمہ میں کوئی تھوڑا سا ردّو بدل بھی کر رہا ہوں) اور جس مہینے میں قرآن کریم کا نزول ہوا اور قرآن کریم وہ عظیم کتاب ہے جسے تمام انسانوں کے لئے ہدایت بنا کر بھیجا گیا ہے اور جو کھلے دلائل اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسے دلائل جو ہدایت پیدا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی قرآن کریم میں الٰہی نشان بھی ہیں اس لئے تم میں

سے جو شخص بھی اس مہینہ کو پائے یا دیکھے، اس حالت میں کہ نہ وہ مریض ہو نہ مسافر اسے چاہیے کہ وہ اس کے روزے رکھے اور جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو اس پر اور دنوں میں تعداد پوری کرنا واجب ہوگی۔ اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے تنگی نہیں چاہتا اور یہ حکم اس نے اس لئے دیا ہے کہ تم تنگی میں نہ پڑو اور تا کہ تم تعداد کو پورا کرلو اور اس بات پر اللہ کی بڑائی کرو اس نے تم کو ہدایت دی ہے تا کہ تم اس کے شکر گزار بنو۔

اور اے رسول! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو جواب دو کہ میں ان کے پاس ہی ہوں۔ جب دعا کرنے والا مجھے پکارے تو میں اس کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔ سو چاہیے کہ وہ دعا کرنے والے بھی میرے حکم کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا وہ ہدایت پائیں۔

تمہیں روزہ رکھنے کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانے کی اجازت ہے وہ تمہارے لئے ایک قسم کا لباس ہیں اور تم ان کے لئے ایک قسم کا لباس ہو۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم اپنے نفسوں کی حق تلفی کرتے تھے۔ اس لئے اس نے تم پر فضل سے توجہ کی اور تمہاری اس حالت کی اصلاح کردی۔ سو اب تم بلا تأمّل ان کے پاس جاؤ اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے مقدر کیا ہے اس کی جستجو کرو اور کھاؤ اور پیئو یہاں تک کہ تمہیں صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔ اس کے بعد صبح سے رات تک روزوں کی تکمیل کرو اور جب تم مساجد میں معتکف ہو تو ان بیویوں کے پاس نہ جاؤ۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اس لئے تم ان کے قریب بھی مت پھٹکو۔ اللہ اسی طرح لوگوں کے لئے اپنے احکامات بیان کرتا ہے۔ تا کہ وہ ہلاکتوں سے بچیں۔

ان آیات میں جو احکام دیئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔ اب میں مفہوم بتاؤں گا۔ نمبر ایک روزہ رکھنا تم پر اس طرح فرض ہے جس طرح پہلوں پر فرض کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلوں پر ماہِ رمضان میں اسی طرح روزے فرض کئے گئے تھے جس طرح مسلمان پر کئے گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلوں پر بھی روزے فرض کئے گئے تھے اور انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اپنی اپنی شریعت کے احکام کے مطابق روزے رکھو تو جس طرح پہلوں پر فرض تھا کہ وہ اپنی شرائع کے مطابق اور ان کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے روزے رکھیں۔ اسی طرح تم پر فرض ہے کہ تم اپنی شریعت کے مطابق اور ان کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے روزے ان دنوں میں جن دنوں میں روزہ رکھنے کا حکم ہے۔ ان

شرائط کے ساتھ جن شرائط کے ساتھ روزہ رکھنے کا حکم ہے۔

تو روزہ رکھنے کا جو حکم ہے وہ مختلف ہے شریعت، شریعت میں۔لیکن بنیادی حکم جو ہے وہ ایک ہی ہے کہ اپنی شریعت کے مطابق جو شریعت کے احکام ہیں ان کو مدّنظر رکھتے ہوئے بتائے ہوئے طریق پر روزے رکھو۔ دوسرے یہ کہا گیا ہے کہ روزہ رکھنا روحانی اور اخلاقی کمزوریاں دُور کرنے کا ذریعہ ہے۔تقویٰ پیدا کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے (پہلا مضمون بھی اس سے واضح ہوتا ہے) کہ پہلوں کی روحانی کمزوریاں اور قسم کی تھیں اور ان کی اخلاقی حالتیں کچھ اور رنگ رکھتی تھیں۔لیکن انسان ارتقائی مدارج میں سے گزرتا ہوا اس حالت کو پہنچ گیا کہ قرآن کریم کی شریعت کا متحمل ہو سکے تو اب اس کی ضرورت کے مطابق اور اس کی طاقت اور قابلیت اور صلاحیت کے مطابق اس کو قرآن کریم نے حکم دیئے۔پہلی شریعتوں کا بھی مقصد یہی تھا کہ ان کے ماننے والوں کی روحانی اور اخلاقی کمزوریاں دور ہوں۔لیکن ضرورتیں اور تھیں احکام اور تھے اور شریعت محمدیہ کا بھی یہ مقصود ہے کہ ایک ایسے شخص کی جو اُمتِ محمدیہ کی طرف منسوب ہوتا اور جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کو پکڑا ہے اس کی روحانی اور اخلاقی کمزوریاں دور ہوں۔

یہ جو کہا گیا کہ روحانی اور اخلاقی کمزوریاں دُور کرنے کا ذریعہ ہے۔تقویٰ کا ذریعہ ہے اس میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے اس عبادت کے چھلکے پر اگر تم نے اکتفا کیا اور سمجھا کہ یہ کافی ہے اور اس کی روح کو پانا اور اس سے فائدہ اٹھانا ضروری نہیں تو تمہاری روحانی اور اخلاقی کمزوریاں دُور نہیں ہوں گی تو سوچو اور غور کرو کہ وہ تمام حکمتیں جو قرآن کریم نے بیان کی اور وہ تمام روحانی اور اخلاقی بیماریاں جن کے متعلق کہا گیا کہ قرآن کریم شفا ہے ان کے لئے۔ وہ کونسی ہیں اور روزے کے دنوں میں Consciously اور بیدار مغزی کے ساتھ اس عبادت کو اس رنگ میں ادا کرو کہ روحانی اور اخلاقی کمزوریاں دور ہو جائیں اور تم شریعتِ محمدیہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے ہو۔

تیسرے یہ کہا گیا ہے کہ مقررہ گنتی پوری کرنا فرض ہے۔ یہ مضمون پہلی شریعتوں اور شریعتِ محمدیہ دونوں کے ساتھ Parallel چل رہا ہے۔ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو کہ مقررہ گنتی پوری کرنا ضروری ہے۔جس شریعت میں جس گنتی میں روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ سب شریعتوں میں رمضان کے روزے رکھنا فرض کیا گیا ہے اس واسطے کہ جہاں پہلوں کا ذکر تھا ان کی گنتیاں کچھ اور

تھیں اور تمہاری کچھ اور ہیں۔ ان کے روزے کے اوقات کچھ اور تھے تمہارے کچھ اور ہیں۔ اس واسطے یہ الفاظ کر دیئے کہ جو تمہیں کہا گیا اس اس کے مطابق گنتی کا پورا کرنا فرض ہے اور جو ان کو کہا گیا اس کے مطابق ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ گنتی کو پورا کریں۔

جو دائم المریض ہوں۔ یہ دو جگہ آیا ہے دو آیتوں میں۔ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ پہلی آیت میں جو مریض کا لفظ ہے اس سے مراد دائم المریض ہے اور اس کی طرف اشارہ کرتا ہے آیت کا یہ اگلا ٹکڑا کہ جو روزے کی طاقت کھو بیٹھے ہوں کیونکہ اَطَاقَ يُطِيْقُ بابِ افعال جو ہے اس کی ایک خاصیت سلب کی ہے تو جو روزہ رکھنے کی طاقت کھو بیٹھے ہوں یعنی روزہ رکھ ہی نہ سکتے ہوں وہ روزہ نہ رکھیں اور اگر طاقت رکھتے ہوں تو ہر روزہ کے بدلہ میں بطور فدیہ کے طَعَامُ مِسْكِيْنٍ چوبیس گھنٹے کا کھانا جو ہے وہ فدیہ کے طور پر دیں۔ یعنی وہ لوگ جن کی طاقت کمزور ہوگئی ہے، ان کا روزہ نہ رکھنا کیونکہ ایک اجتہادی امر ہوگا۔ یہ فیصلہ تو ہر شخص نے خود کرنا ہے کہ میں اتنا کمزور ہو چکا ہوں۔ بیماریوں کی کثرت کے نتیجہ میں یا عمر کی زیادتی کے نتیجہ میں یا ڈاکٹروں کے مشورہ کے نتیجہ میں کہ اب مجھ میں روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رہی۔ زیادہ لمبا فاقہ نہیں میں کرسکتا۔ تو یہ اجتہاد ہوگا اور جب اجتہاد ہوگا تو اجتہادی غلطی کا بھی امکان ہوگا۔ جب اجتہادی غلطی کا امکان ہوگا تو اس نامعلوم یا غیر محسوس گناہ پر مغفرت کی چادر ڈالنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انتظام کیا ہے کہ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ بطور فدیہ کے دے دیا کرو۔ کہ اگر تو اجتہادی امر ہے اس میں غلطی نہیں مزید ثواب تمہیں مل جائے گا اور اگر اجتہادی امر جو ہے اس میں غلطی ہے کچھ تو خدا تعالیٰ اس طرح تمہاری مغفرت کر دے گا۔ ایک اور ذریعہ سے تم اس کے فضل کو حاصل کرنے والے ہو گے۔

اور چھٹے یہ کہ اگر سفر پر ہو تو روزہ نہ رکھو۔

ساتویں یہ کہ اصل چیز یہ ہے کہ نیت یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی پوری اور سچی اور حقیقی فرمانبرداری کرنی ہے۔

آٹھویں بات یہ بتائی گئی ہے کہ روزوں کا حکم تمہاری بہتری کے لئے ہے اب جو درس دینے والے ہیں وہ آپ کو بتائیں گے کہ بہتری کی کتنی قسمیں ان کو نظر آئیں۔ بے شمار قسمیں ہیں بہتری کی۔

نویں بات ہمیں یہ بتائی گئی کہ ماہِ رمضان کا دوہرا تعلق قرآن کریم سے ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم

میں اس کے احکام ہیں ۔ ماہِ رمضان کی عبادات صوم کی جو عبادات ہیں اس کے احکام جو ہیں وہ قرآن کریم میں نازل ہوئے اور دوسرے یہ کہ قرآن کریم ماہِ رمضان میں نازل ہوا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ہر رمضان میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنا قرآن نازل ہوتا تھا اس کا دور کیا کرتے تھے۔ تو ماہِ رمضان کا ایک گہرا تعلّق اور دوہرا تعلّق قرآن کریم سے ہے۔

پھر دسویں یہ بتایا گیا کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے انسانوں کے کسی ایک گروہ کے لئے نہیں۔ کسی ایک خطۂ ارض کے لئے نہیں اور ہمیں اس طرف توجہ دلائی گئی کہ ماہِ رمضان میں قرآن کریم کے پڑھنے اور اس کے مطالب سیکھنے کی طرف دوسرے دنوں کی نسبت زیادہ توجہ دیا کرو۔ اور جو تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے اس لئے جو ماننے والے ہیں اس حقیقت کو کہ قرآن تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے ان کا یہ فرض ہوجاتا ہے کہ اس عالمگیر ہدایت کی طرف بنی نوع انسان کو (جو ابھی تک اس سے واقف نہیں) لانے کے لئے قرآن کریم کے علوم سیکھیں۔

گیارھویں ہمیں یہ بات بتائی گئی ۔ قرآن کریم جس کا ماہِ رمضان سے گہرا تعلّق ہے ایسے دلائل اپنے اندر رکھتا ہے جو ہدایت پیدا کرتے ہیں ۔ یعنی یہ تصوّر اسلام نے نہیں دیا کہ مسلمان ہوتے ہی یا اصلاحِ نفس کے ابتدائی دور میں ہی انسان ہدایت کے عروج کو اس کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں یہ ہدایت دی ہے قرآن کریم نے ہمیں یہ علم عطا کیا ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں اس بات کے لئے ابھارا ہے کہ دیکھو وصلِ الٰہی اصلی اور آخری انتہائی مقصود ہے اور انسان اور خدا کے درمیان غیر محدود بُعد ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ایک ہدایت کے بعد دوسری ہدایت کا پانا ضروری ہے۔ اس کی رضا کو تم پاؤ گے تمہیں روحانی سرور ملے گا۔ تم خدا کے پیارے ہوگے اس حد تک۔ لیکن یہ پیار وہ انتہائی پیار تو نہیں ہوگا۔ جو تم حاصل کر سکتے ہو اس لئے قرآن کریم میں شروع میں ہی کہہ دیا گیا تھا کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہدایت کے بعد دوسری ہدایت۔ نئی راہیں ہدایت کی جو اور آگے لے جانے والی ہیں۔ ایک منزل کے بعد اگلی منزل پر پہنچیں گے پھر ہدایت ملے گی۔ یہ تو نہیں تمہاری منزل آگے چلو۔ پھر اور راہ دکھادی۔ پھر اور آگے لے گئے۔

پس اپنے نفس کے لئے اور دوسروں کی ہدایت کے لئے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی جو یہ صفت ہے کہ وہ ہدایت کے بعد ہدایت دیتا چلا جاتا ہے اس کا ہمیں علم ہو اور اس کے لئے ہماری جدو جہد اور

جہاد اور مجاہدہ ہو۔

اور بارھویں یہ ہے کہ ہدایت کی نئی راہیں کھولنے والے دلائل ہیں۔ دوسرے نئی راہوں کی ضرورت پڑتی ہے نئے زمانوں کے ساتھ۔ ہر زمانہ نئے مسائل انسان کے سامنے رکھتا اور نئے علومِ قرآنی کا تقاضا کرتا ہے تو پچھلے دروازے پچھلی راہیں بند ہو جاتی ہیں آگے نہیں چلتیں۔ انسان کے مسائل کو حل کرنے کے لئے انسان کا ساتھ نہیں دے رہی ہوتیں۔ نئی راہیں کھلنی چاہیے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کیا ہے کہ ہر زمانہ میں خدا تعالیٰ کے ایسے محبوب بندے اُمتِ محمدیہ میں موجود رہتے ہیں جو خدا تعالیٰ سے نئے علوم روحانی سیکھ کر ہدایت کی نئی راہوں کا علم حاصل کر کے زمانہ کے نئے مسائل کو حل کرنے کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

اور تیرھویں ہمیں یہ بتایا گیا کہ قرآن کریم ایک ایسی عظیم کتاب ہے کہ اس کے ساتھ محض دلائل کا یا تعلیم کا، ہدایت کا ہی تعلّق نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے فرقان بھی اس کو دیا گیا اور اس کے ساتھ الٰہی نشان بھی ہیں۔ پہلے کہا گیا تھا کہ روزے تم پر فرض کئے گئے جس طرح پہلوں پر فرض کئے گئے۔ اب چودھویں بات ہمیں یہ بتائی گئی کہ تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ رمضان کے روزے رکھو امر کے صیغہ میں۔ پہلے فرضیت بتائی تھی، اب حکم کا رنگ ہے۔ تمہیں حکم ہے کہ رمضان کے روزے رکھو۔

اور پندرھویں یہ کہ اگر عارضی وقتی بیماری ہو۔ پہلے جس بیماری کا ذکر تھا وہ دائمی تھی جب روزہ رکھنے کی طاقت ہی جاتی رہتی ہے لیکن اب یہ ذکر ہے کہ عارضی طور پر انسان بیمار ہو جاتا ہے مثلاً بہت ساری بیماریاں ہیں ایک کو بطور مثال کے لے لیتے ہیں۔ رمضان سے دو چار دن پہلے آٹھ دس دن پہلے اگر کسی نوجوان بالغ کو ٹائیفائیڈ ہو جاتا ہے ڈاکٹر اس کو کہے گا تم روزہ نہیں رکھ سکتے تو اگر وقتی بیماری ہو تو تعداد جو ہے، جتنے چھٹ گئے مثلاً بیماری جو ہے وسط رمضان میں بھی آ سکتی ہے شروع میں بھی آ سکتی ہے پہلے بھی آ سکتی ہے۔ کچھ روزے بھی چھڑوا سکتی ہے۔ سارے روزے بھی چھڑوا سکتی ہے تو جو تعداد رہ گئی ہے وہ تعداد اور دنوں میں پورا کرو اور تمہیں ثواب رمضان کے روزوں کا ہی ملے گا یہ شان ہے اسلامی تعلیم کی۔ اگر وقتی بیماری ہے اور عذر صحیح ہے اور نیت میں اخلاص ہے تو دوسرے وقت میں ماہِ رمضان سے باہر جو تم فرض روزے پورے کر رہے ہو گے تمہیں ثواب وہی ملے گا جو رمضان کے دوران روزہ رکھنے والوں کو ثواب ملے گا اور اگر مسافر ہو تب بھی اور دنوں میں تعداد پوری کرنا واجب ہے۔

سولھویں بات ہمیں یہ بتائی (اللہ بدعات سے محفوظ رکھے) کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے۔ایک یہ بتایا کہ ان آیات میں یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اللہ آسانی چاہتا ہے اس کی بڑی مہربانی ہے پر ہم تکلیف اٹھا کے اس کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے۔اسلام کہتا ہے کہ تم اپنے زورِ بازو سے اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل نہیں کرسکتے۔کامل فرمانبرداری کے نتیجہ میں اس کی رضا کو حاصل کرو گے تو سولھویں کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے۔

اور سترہویں ہمیں کہا وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ۔اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم اپنے لئے تنگی پیدا کرو تو جو شخص اپنے لئے تنگی پیدا کرکے خدا تعالیٰ کی طرف سے جو یُسر اور آسانی (یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ) کی سہولت دی گئی ہے اس کے خلاف کام کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کام کررہا ہے کیونکہ اعلان کیا گیا ہے وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ تم اپنے لئے تنگی پیدا کرو تو خدا تعالیٰ کچھ چاہتا ہے اور تم اس کے خلاف چاہتے ہو اس کو کیسے خوش کرو گے۔

اوراٹھارہویں بات اس میں یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے۔اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ تم اپنے لئے تنگی پیدا کرو۔اس لئے اللہ کہتا ہے دوسرے وقتوں میں تعداد کو پوری کرو۔اگر مریض ہو تب بھی اگر عارضی طور پر مریض ہو تب بھی اور اگر مسافر ہو تب بھی اور یہ حکم اس نے اس لئے دیا ہے کہ تم تنگی میں نہ پڑو اور تعداد کو بھی پورا کرلو یعنی تنگی میں پڑے بغیر روزوں کی تعداد پوری کرکے اس کی رضا بھرپور جو لے سکتے ہو تم حاصل کرلو۔

اورانیسویں یہ کہ روزہ رکھنے کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جاسکتے ہو۔

اور بیسویں یہ کہ تم ایک دوسرے کے لئے لباس ہو۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہردو کے تعلّقات ایسے ہیں اور ہردو کی ذمہ داریاں ایسی ہیں (مرد اور عورتیں دونوں سن لیں) کہ خاوند بیوی کی عزت کا نگہبان اور بیوی خاوند کی عزت کی نگہبان بن جاتی ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کسی فرانسیسی مترجم نے فرانسیسی میں قرآن عظیم کا ترجمہ کیا تو اس آیت کا یہ ترجمہ کردیا کہ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ کہ عورتیں تمہاری پتلونیں ہیں اور تم ان کے گھگرے ہو They are your trousers and you are their shirts تو یہ مطلب نہیں ہے ظاہری لباس مراد نہیں۔لباس ڈھانکتا

ہے۔لباس سردی گرمی سے حفاظت کرتا ہے۔لباس زینت بنتا ہے۔لباس کے متعلق خود قرآن کریم نے دوسری جگہ بہت سے فوائد بتائے ہیں۔ یہاں روحانی فوائد مراد ہیں اور صرف اتنا کہا ہے کہ تم ان کے لئے لباس اور وہ تمہارے لئے لباس۔

اکیسویں بات یہ بتائی گئی کہ کھاؤ پیو روزہ کھولنے کے بعد کوئی پابندی نہیں یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔شروع میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بعض ایسے مخلص مسلمان تھے (پوری طرح احکام ابھی واضح نہیں تھے) کہ جب روزوں کا حکم ہوا تو انہوں نے روزے سے روزہ ملانا شروع کر دیا یعنی دو دن کا روزہ اکٹھا رکھ لیا اور بہت زیادہ تنگی میں اپنے آپ کو ڈالا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع کیا۔اب یہ حکم ہے کہ روزہ کھولنے کے بعد سحر تک جو سحری بند ہونے کا وقت ہے جس کو قرآن کریم کی اصطلاح میں روشنی کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگ جاتی ہے کہتے ہیں اس وقت تک کھاؤ پیو اپنی ضرورت کے مطابق۔ یہ نہیں کہ اسراف کرو۔ اپنی ضرورت کے مطابق ہر شخص کھائے اور پیئے۔کسی کی دو چھٹانک کی ضرورت ہے ممکن ہے کسی کی ایک سیر کی ہو جائے لیکن بہر حال کہا ہے کہ اپنی ضرورت کے مطابق کھاؤ اور پیو صبح تک۔

اور بائیسویں یہ بتایا کہ اس کے بعد جس وقت سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے اس کے بعد رات تک غروبِ آفتاب تک روزوں کی تکمیل کرو۔ ادھورے روزے نہیں جس طرح ’’چڑی روزہ‘‘ بچے رکھا کرتے ہیں یعنی دن میں چار پانچ روزے بالغ مسلمانوں کے لئے وہ روزے نہیں ہیں۔

تئیسویں یہ ہے کہ اعتکاف کی حالت میں رات کو بھی بیویوں کے پاس نہ جاؤ اور یہ تفصیل بیان کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے بنیادی باتیں بیان کرنی شروع کیں۔

اور چوبیسویں یہ بتایا کہ یہ جو میں نے حکم نازل کئے ہیں ان کو ایسا سمجھو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قائم کردہ حدود ہیں۔ان کے قریب بھی مت جاؤ۔بعض لوگ دیر بعد سحری شروع کرتے ہیں اور دیر تک کھاتے رہتے ہیں اور حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ ایک مؤذن مدینہ میں کوئی آدھ منٹ یا ایک منٹ پہلے صبح کی اذان دے دیتے تھے تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ

زیادہ محتاط ہیں وہ جو آخری ایک منٹ ہے وہ تو تمہارا ہے کھانے کا۔اس میں بے شک کھالیا کرو۔لیکن اصل یہ ہے کہ سفید دھاری روشنی کی، کالی دھاری سے الگ نظر آنے لگ جائے۔اس کے بعد کچھ نہیں کھانا۔یہ حدّ ہے اس کے قریب بھی مت جاؤ اور فرمایا کہ خدا تعالیٰ جو اس تفصیل کے ساتھ اپنے احکام بیان کرتا ہے۔اس طرح لوگوں کے لئے احکام بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگ ہلاکتوں سے بچ جائیں تو یہ باتیں تفصیل سے تمہیں بتادیں۔روزہ کی مصلحتیں بتادیں۔

روزے کے آداب بتادیئے۔روزہ کے آداب میں سے سب سے بڑا ادب قرآن کریم کی کثرت سے تلاوت۔کثرت سے دعائیں کرنا ہے اور بیچ میں سے ایک آیت میں چھوڑ گیا تھا کیونکہ میں اس کے او پر ذرا لمبا کہنا چاہتا تھا میرا خیال تھا کہ اگر وقت ہوا تو بتادوں گا۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اس کا روزوں کے ساتھ اور ماہِ رمضان کے ساتھ اور کثرتِ عبادت کے ساتھ اور کثرتِ قراءت کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے

(خطباتِ ناصر جلد ہشتم ۲۸۱ تا ۲۹۱)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزوں کا رکھنا فرض کیا گیا ہے۔جس طرح ان لوگوں پر (ان کی شریعتوں کے مطابق) فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم روحانی اخلاقی کمزوریوں سے بچو۔سو تم روزے رکھو چند گنتی کے دن (رمضان کا مہینہ) اور تم میں سے جو شخص مریض ہو یا مسافر تو اَور دنوں میں تعداد پوری کرنی ہوگی اور ان لوگوں پر جو اس روزہ کی طاقت نہ رکھتے ہوں بطور فدیہ ایک مسکین کا کھانا واجب ہے یعنی جتنے روزے چُھٹے ہیں اس کے مطابق بشرطِ استطاعت۔رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن کریم اترا یا جس کے بارہ میں قرآن کریم نے ہدایت فرمائی۔یہ بھی درست ہے کہ رمضان میں پورے کا پورا قریباً قرآن اترا کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ ہر رمضان میں اس وقت تک جس قدر قرآن کریم نازل ہو چکا ہوتا حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا دَور کرتے تھے۔رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اُترا جو تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے جو کھلے دلائل، جو ہدایت کا رنگ رکھتے ہیں اپنے اندر رکھتا ہے اور فرقان ہے، مابہ الامتیاز پیدا کرتا ہے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان۔اس لئے تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو دیکھے اسے چاہیے کہ وہ روزے رکھے اور جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو اس پر اور دنوں میں تعداد پوری کرنی واجب ہوگی۔اللہ

تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے تنگی نہیں چاہتا اور چاہتا ہے کہ تم تعداد کو پورا کرلو اور اس بات پر اللہ کی بڑائی کرو کہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے اور تا کہ تم اس کے شکر گزار بندے بنو۔ اور جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلّق پوچھیں تو میں ان کے پاس ہی ہوں۔ جب دعا کرنے والا مجھے پکارے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ سو چاہیے کہ وہ بھی میرے حکم کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا وہ ہدایت پائیں۔

یہ تو درست ہے کہ حکومتِ وقت نے اپنے ایک فیصلہ کے ذریعے جماعت احمدیہ کو غیر مسلم اور دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا ہے۔ اس لئے جو ان کے فیصلے ان کے معیّن کردہ دائرۂ اسلام کے اندر نفوذِ اسلام کے لئے ہوں ان کا اطلاق جماعتِ احمدیہ پر نہیں ہوتا، نہ ہوسکتا ہے۔ اپنی جگہ یہ درست لیکن جو ہدایت اس نے قرآن عظیم کے ذریعے دی ہے ہماری اپنی ہی بھلائی کے لئے اور ترقیات کے لئے اس کی پابندی کرنا ہم میں سے ہر ایک پر ایک بنیادی فرض ہے ان ہدایات کے مطابق جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دی ہیں۔ قرآن کریم نے شہرِ رمضان کی جو خصوصیات اور ذمہ داریاں ہیں وہ بیان کر دی ہیں، حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر عمل کر کے وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے عملی تفسیر ان آیات کی رکھ دی ہے۔

میں نے جو طریق اس وقت منتخب کیا ہے وہ یہ نہیں کہ میں ان آیات کی تفسیر کروں بلکہ اس میں سے میں نے بارہ پوائنٹس (Points) اٹھائے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

نمبر ایک یہ کہ روزہ رکھنا ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے، ہر اس احمدی کے لئے ضروری ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے روزہ رکھنا ضروری قرار دیا ہے۔ بعض آسانیاں پیدا کیں اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر بعد میں آئے گا لیکن کسی احمدی کی ''خو'' ''بہانہ جُو'' نہیں ہونی چاہیے کہ بہانہ ڈھونڈ کے روزوں سے بچنے کی راہ کو اختیار کرے۔ روزہ فرض ہے روزہ رکھنا ہر اس احمدی پر جس کو رکھنا چاہیے فرض ہے اور ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو اس کی سزا مقرر کی نہ رکھنے کی، اس کے حکم توڑنے کی، وہ کوئی دنیوی سزا نہیں ہے اور یہ یاد رکھیں کہ دنیا کی کوئی سزا اللہ تعالیٰ کی سزا کا کفارہ نہیں بن سکتی کہ آپ سمجھیں کہ دنیا میں چونکہ انسان کی بنائی ہوئی سزا مل گئی اس لئے کفارہ ہو جائے گی۔ قرآن کریم میں بعض ایسی سزاؤں کا ذکر ہے جو کفارہ بن جاتی ہیں۔ تفصیل میں اس وقت نہیں جاؤں گا۔ ابھی یہ مضمون چلے گا

انشاءاللہ تعالیٰ پھر موقع ہوا تو اس کو بھی بتادوں گا۔ بہر حال خدا تعالیٰ کا یہ حکم توڑنا کہ خدا کہے کہ اے فرد واحد، (ہر فرد کو مخاطب کیا ہے قرآن کریم نے) اے احمدی! تجھ پر روزہ فرض ہے کیونکہ فرض کی جو شرائط ہیں وہ تیرے وجود میں، تیری ذات میں تیری زندگی میں پوری ہوتی ہیں اور پھر وہ خدا تعالیٰ کے اس حکم کو توڑے تو خدا تعالیٰ کی سزا کا، عذاب کا وہ مستحق ٹھہرے گا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اور دنیوی کوئی سزا بطور کفارہ کے اس کے لئے نہیں بن سکتی کہ انسان کی سزا خدا تعالیٰ کی سزا سے اسے بچالے۔

قرآن کریم، قرآن حکیم ہے دلیل دیتا اور ہمیں سمجھاتا ہے کہ جو میرا حکم ہے اس پر کیوں عمل کرو۔ تو یہاں دو چیزوں کی طرف اشارہ کیا گیا۔ ایک یہ کہ اخلاقی بیماریاں ہیں بہت سی، روزہ ان سے بچاتا ہے کیونکہ پاکیزگی پیدا کرتا اور خدا تعالیٰ کے قرب کی راہیں کھولتا ہے اور جن پر اللہ تعالیٰ کے قرب کی راہیں کھولی جاتی ہیں اللہ تعالیٰ ایسا سامان پیدا کر دیتا ہے کہ ان راہوں پر چل کر اخلاقی اور روحانی بیماریاں پیدا نہیں ہوسکتیں اور نہ ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ایسے لوگوں کی حفاظت کرتا ہے جو نیک نیتی کے ساتھ اور پورے اخلاص کے ساتھ اور پوری توجہ کے ساتھ اور انتہائی عاجزانہ جھک کے اس کے حضور روزہ بھی رکھتے ہیں اور قبولیتِ روزہ کے لئے اس کے حضور دعائیں بھی کرتے ہیں۔

تیسری بات جو ان آیات سے ہمیں پتا لگتی ہے، ظاہر ہے کہ جو بیمار ہو روزہ نہ رکھے۔ اور چوتھی بات یہ کہ جو سفر پر ہو وہ روزہ نہ رکھے۔ سفر پر ہونے کے متعلق نہ یہ بتایا ہے قرآن کریم نے کہ دس دن کے سفر پر ہو یا دس مہینے کے سفر پر ہو یا تین دن کے سفر پر ہو، نہ یہ بتایا ہے کہ دس میل کے سفر پر ہو یا پچاس میل کے سفر پر ہو یا پانچ ہزار میل کے سفر پر ہو۔ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے اس لئے فرمایا ہے کہ جو عرفِ عام میں سفر کہلاتا ہے وہ سفر ہوگا۔ آپ نے فرمایا ہم سیر کے لئے نکلتے ہیں، کئی میل سیر کے لئے چلے جاتے ہیں کسی کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم سفر پر ہیں اور ہم سفر کی نیت سے نکلتے ہیں اور ابھی دو میل نہیں گئے ہوتے تو ہمارا دماغ جان رہا ہوتا ہے کہ ہم سفر پہ نکلے ہوئے ہیں۔ جو بیمار یا جو سفر پہ ہو، اس کے لئے جو سہولت دی گئی یہ اختیاری نہیں جس طرح یہ حکم ہے کہ جب روزہ رکھنا تم پر واجب ہوجائے شرائط کے لحاظ سے، روزہ رکھو۔ اسی طرح یہ حکم ہے کہ جب تم بیمار ہو یا سفر پہ ہو تو روزہ نہ رکھو۔

اصل چیز اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کہا تھا جب انہوں نے کہا کہ میں نے رؤیا میں دیکھا کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں خدا تعالیٰ کی راہ میں تو انہوں نے بڑا ہی لطیف جواب دیا۔ انہوں نے یہ نہیں کہا پھر ذبح کر دو۔ انہوں نے یہ کہ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ (الصّٰفّٰت : ۱۰۳) جو حکم ہے اس پہ عمل کرو۔ تو اصل روح یہ ہے کہ جو خدا تعالیٰ نے کہا ہے اس کی اطاعت میں برکت اور ثواب اور خدا کی رضا کا راز ہے۔ اپنے زورِ بازو سے تم خدا تعالیٰ کے پیار کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتے۔ کوشش کرنے والے تو بعض لوگ ایسے ہیں جو غلط راہ پہ چل کے ساری عمر اس طرح ہاتھ اونچا رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے یہاں تک کہ دورانِ خون ختم ہو کے سارا بازو خشک ہو جاتا ہے۔ ناسمجھ دماغ کہے گا کہ اس نے خدا کے لئے بڑی قربانی دی لیکن جو صاحبِ فراست اور جس کو تَفَقُّہ فِي الدِّيۡنِ حاصل ہے وہ کہے گا کہ اس نے اطاعت باری تعالیٰ سے گریز کیا اور خدا تعالیٰ کو ناراض کیا تو اس نکتے کو سمجھو۔ صرف جماعت احمدیہ کو کہ ان کو سمجھانا میرا فرض ہے۔ یہ کہہ رہا ہوں کہ کوئی بدعت بیچ میں نہ آئے۔ خدا نے جو کہا ہے وہ کرو۔ جو خدا نے کہا ہے وہ کرو گے تمہیں خدا کا پیار مل جائے گا۔ اگر اپنی طرف سے بیچ میں بدعات کو شامل کرو گے خدا تعالیٰ کو ناراض کر دو گے۔

پانچویں بات ہمیں یہ پتا لگی کہ ایسے لوگ جو عارضی طور پر بیمار اور روزہ چھوڑ رہے ہیں۔ مثلاً تین دن ۱۰۶ بخار ہو گیا ملیریا ہمارے ملک میں بڑا ہے دو دن، تین دن اس کی کمزوری رہی پانچ چھ دن میں وہ روزہ نہیں رکھ سکا، پھر رمضان میں (رمضان تو انتیس، تیس دن کا ہے) اس نے روزے رکھنے شروع کر دیئے لیکن پانچ چھ روزے جو چُھٹ گئے اس کے تو حکم یہ ہے کہ بعد میں رکھے، اگلے رمضان سے پہلے ان روزوں کو پورا کرے اور مسافر ساری عمر کے لئے تو مسافر نہیں ہوتا۔ کوئی پانچ دن کے لئے باہر جائے گا اس کے پانچ روزے چھوٹیں گے اگر رمضان میں گیا، کوئی ممکن ہے کہ سارا رمضان بھی سفر میں گزارے حکم ہے کہ چھٹے ہوئے روزے انتیس دن کا اگر رمضان تھا تو انتیس روزے اگلے رمضان سے پہلے رکھے۔ اگر وہ تیس دن کا رمضان ہے تو اگلے رمضان سے پہلے وہ تیس روزے اپنے پورے کرے۔ یہ حکم ہے ان آیات میں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو، جو بیمار ہے، جو سفر پہ ہے قسم کی کیٹیگری (Categary) میں نہیں آتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آگے دو قسمیں ہیں ان کی، جو ہمیشہ کے لئے اپنی عمر میں روزہ رکھنے کی طاقت کو کھو بیٹھے ہیں۔ ایک پچھتّر اسّی سال کا بوڑھا ہے، وہ بالکل ہی

کمزور ہو گیا ہے، چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہیں، لوگوں کے سہارے سے اٹھ رہا ہے اور اس حالت میں رمضان آیا پھر خدا تعالیٰ نے اس کو دس سال اور زندگی دی تو دس رمضان کے روزے اس نے گزارے ہیں۔ اس کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ رمضان کے روزے جو چھوٹ گئے ہیں وہ بعد میں رکھ لے۔ ایک یہ گروہ ہے۔ یا مثلاً ٹی بی کا بیمار ہو گیا نوجوان اور بیمار ہی رہا اس کو آٹھ، دس، پندرہ، بیس سال خدا نے زندگی دی اور ڈاکٹر اس کو دن میں پانچ دفعہ انجیکشن (Injection) لگاتے ہیں یا دوائی دیتے ہیں یا کینسر کا بیمار ہے وہ کہتے ہیں اتنے اتنے وقفے کے بعد ایک دن میں چار خوراکیں دوائی کی کھاؤ، روزہ رکھنے کا سوال ہی نہیں اس کے لئے اور چند سالوں کے بعد اس کی وفات ہو جاتی ہے۔ یہ دوسری قسم ہے اور یا ایسا عذر ہے جو سال بھر اس کو روزہ نہیں رکھنے دے گا چونکہ اگلے سال سے پہلے پورے کرنے تھے نا اس واسطے اس کے روزے نہیں رکھے یعنی اس ماہِ رمضان کے روزے اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیئے۔ مثلاً ایک حاملہ ہے، حاملہ کے لئے روزے رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایک حاملہ ہے جس نے بچہ جننے کے بعد دودھ بھی پلانا ہے اپنے بچے کو، دودھ پلانے والی ماں نے روزہ نہیں رکھنا۔ تو سال گذر گیا ممکن ہے اس سے بھی زیادہ زمانہ گذر جائے لیکن ایک سال تو یقیناً گذر گیا نا۔ رمضان میں وہ حاملہ ہے، چھ مہینے کے بعد اس نے بچہ جنا، دودھ پلانا شروع کر دیا وہ اگلے رمضان تک کے جو گیارہ مہینے ہیں ان میں وہ روزہ رکھنے کے قابل نہیں ہوئی، یہ اجازت اس کو ملی ہے۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ بھی اس کے روزے نہیں رکھیں گی اور نہ روزے پورے کریں گی بعد میں۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شریعت کی بنا آسانی پر، یُسر پہ رکھی ہے عُسر پہ نہیں رکھی اور ہمیں دعا بھی سکھائی وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (البقرۃ: ۲۸۷) اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ ہمارے اوپر ایسا بوجھ ڈال دے جس کے اٹھانے کی اس نے ہمیں قوت ہی نہ عطا کی ہو خدا تعالیٰ تو ایسا کر ہی نہیں سکتا اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم تیرے دین کے احکام کی ایسی انٹر پرٹیشن (Inter-Pretation) ایسی تفسیر نہ کر لیں کہ اس پر عمل مَالَا یُطَاق بن جائے ہمارے لئے، ہمیں فراست عطا کر کہ تیری مرضی کے مطابق ہم تیرے احکام کو بجالانے والے ہوں اور مَا لَا طَاقَةَ لَنَا نہ ہو بلکہ بشاشت اور شرحِ صدر کے ساتھ ہم تیرے احکام کو پورا کرنے والے ہوں۔

ساتویں بات یہاں یہ بتائی گئی ہے کہ تمہیں سوچنا چاہیے کہ ہم جو تمہارے پیدا کرنے والے ہیں جو تمہیں قوتیں اور استعدادیں عطا کرنے والے ہیں ہمیں معلوم ہے کہ تم میں کس قسم کی صلاحیت پائی جاتی ہے ہم نے اپنے کامل علم کی بنا پر اور حکمتِ کاملہ کے نتیجہ میں یہ فیصلہ کیا کہ تمہاری طرف جو ایک کامل اور مکمل شریعت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کے ذریعہ سے بھیجی جائے اس کی بنیاد آسانی پر رکھی جائے یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَ لَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ وہ تنگی نہیں چاہتا اور حکم ہے تمہارے لئے کہ جب خدا تمہارے لئے تنگی نہیں چاہتا تو تم بھی اپنے لئے تنگی نہ چاہو۔

آٹھویں بات یہ ہے کہ اسلام کی روح بشاشت اور شرح صدر ہے یہ روح نہیں ہے کہ مشقت کرو مشقت سمجھو کوئی بھی عبادت مشقت نہیں کیونکہ جو سچا اور حقیقی مسلمان ہے وہ شرحِ صدر سے احکام بجالاتا ہے اللہ تعالیٰ کے فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَھُوَ خَیۡرٌ لَّہٗ اور جو شخص پوری فرمانبرداری سے کوئی نیک کام کرے گا یہ اس کے لئے بہتر ہوگا یعنی اصل بنیاد فرمانبرداری ہے۔

نویں بات یہ کہ جو شخص رخصت سے فائدہ نہیں اٹھاتا وہ زورِ بازو سے خدا کو خوش کرنا چاہتا ہے، یہ جہالت ہے، یہ بیوقوفی ہے۔ کوئی شخص دنیا میں، کوئی وجود دنیا کا اپنے زور سے اپنے ربّ کو خوش نہیں کرسکتا۔ اس کی اطاعت کرکے، اس کے حضور عاجزانہ جھک کے، اس سے دعائیں کرکے، اس کی رحمت کو، اس کے فضل کو، اس کی برکتوں کو جذب کرکے، اس کو خوش کرسکتا ہے ویسے نہیں کرسکتا۔

دسواں یہ کہ رمضان کا مہینہ بڑی عظمتوں والا ہے۔ یہ ایک بنیادی چیز ہے اور سمجھنے والی اور یادرکھنے والی، رمضان کا مہینہ بڑی عظمتوں والا ہے اس لئے کہ شَھۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن کریم جیسی ہدایت نازل ہوئی۔ ھُدًی لِّلنَّاسِ یہ انسانوں کے لئے ہدایت ہے۔ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡھُدٰی اور ایسے دلائل اپنے اندر رکھتی ہے (انسان کو سمجھاتی ہے کہ جو تمہارے سامنے تعلیم رکھی جارہی ہے وہ ان راہوں کی طرف ہدایت دیتی ہے) جو خدا تعالیٰ کی رضا کی جنتوں کی طرف لے جانے والی ہیں اور ایسی تعلیم ہے جو فرقان ہے، حق و باطل میں تمیز کرنے والا ہے۔

گیارہویں بات اور یہ جو یہاں روزہ رکھنے کا حکم ہے پہلا حکم تھا نماز پڑھنے کا وہ ان آیات میں نہیں ہے لیکن صوم کی وجہ سے اس کا ذکر ضروری ہے۔ نماز جو ہے الصَّلٰوۃُ اَلدُّعَاءُ نماز پڑھتے ہی ہم دعا کے لئے ہیں نماز میں دو قسم کی دعائیں ہیں، ایک وہ مسنون دعائیں ہیں یعنی قرآن کریم

کی آیات اور وہ دعائیں ہیں جو مروی ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم سے اور ایک وہ دعائیں ہیں اور یہ یاد رکھو اس میں بھی بدعت پیدا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اجازت دی ہے بلکہ پسند کیا ہے کہ تم مسنون دعاؤں کے علاوہ اپنی زبان میں خدا تعالیٰ کے حضور دعائیں کرو اور اس سے مانگو نماز کے اندر۔

سیدنا حضرت اقدس علیہ السلام فرماتے ہیں کہ نماز جو ہے صلوٰۃ، یہ تزکیۂ نفس کرتی ہے اور تزکیۂ نفس (آپ فرماتے ہیں) یہ ہے کہ نفسِ اَمّارہ کی شہوات سے بُعد حاصل ہوتا ہے یعنی اہوائے نفس جو ہیں نفسانی خواہشات جو ہیں ان سے انسان بچتا ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ (العنکبوت:۴۶) اور جو روزہ ہے یہ تجلّیٔ قلب کرتا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں (حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو کئے) کہ کشف کا دروازہ کھلتا ہے اور دیدارِ الٰہی کے سامان پیدا ہوتے ہیں۔ تو کتنی عظمت ہے ماہِ رمضان میں کہ اگر نیک نیتی سے مقبول روزے رکھ لو گے تو دیدارِ الٰہی کے سامان پیدا کئے جائیں گے اور قرب کی راہیں جو ہیں وہ کشادہ کی جائیں گی تمہارے لئے۔

بارہویں بات اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ قرآن کریم کی کثرت سے تلاوت اس مہینے میں کی جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی سنّت تھی اور جیسا کہ میں نے بتایا حضرت جبرائیل علیہ السلام ماہ رمضان میں دور کیا کرتے تھے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سیدنا حضرت اقدس علیہ السلام فرماتے ہیں۔

”اس وقت اسلام کی عزت بچانے کے لئے اور بطلان کا استیصال کرنے کے لئے صرف یہی کتاب پڑھنے کے قابل ہے“

اس واسطے میں کہتا ہوں جماعت کو کہ آپ کثرت سے قرآن کریم پڑھیں خصوصاً رمضان کے مہینے میں بہت زیادہ زور تلاوت قرآن کریم کے اوپر ڈالیں۔ ایک محدث یا فقیہ تھے (مجھے یاد نہیں رہا امام بخاریؒ تھے یا دوسرے) ان کے متعلق آتا ہے کہ رمضان کا جب مہینہ شروع ہوتا تھا تو ساری کتابیں بند کر کے رکھ دیتے تھے اور صرف قرآن کو پکڑ لیتے تھے، سارے رمضان میں سوائے قرآن کریم کے اور کچھ نہیں پڑھتے تھے آپ فرماتے ہیں۔ ”اس نور کے آگے کوئی ظلمت ٹھہر نہیں سکتی“ آپ فرماتے

ہیں ’’غلبۂ اسلام کے لئے یہ حربہ ہاتھ میں لو‘‘ اس کام کے لئے ہم پیدا کئے گئے ہیں۔ قرآن کریم کا حربہ ہاتھ میں لو اللہ تعالیٰ تمہیں تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کر دے گا کیونکہ یہ فرقان بھی ہے نا۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ جو لوگ اللہ (سیدنا حضرت اقدس علیہ السلام کا ترجمہ ہے بعض لفظی تبدیلیوں کے ساتھ) اور اس کے رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں یہ پوچھنا چاہیں اگر کہ خدا تعالیٰ ہم سے کیا عنایات رکھتا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں سے، جو ہم سے مخصوص ہوں اور غیروں میں نہ پائی جاتی ہوں۔ (وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ کے یہ معنی آپ نے کئے ہیں) تو ان کو کہہ دے میں نزدیک ہوں یعنی تم میں اور تمہارے غیروں میں یہ فرق ہے کہ تم میرے مخصوص اور قریب ہو اور دوسرے مہجور اور دُور ہیں۔ جب کوئی دعا کرنے والوں میں سے جو تم میں سے دعا کرے، دعا کرتے ہیں تو میں اس کا جواب دیتا ہوں یعنی میں اس کا ہم کلام ہو جاتا ہوں اور اس سے باتیں کرتا ہوں اور اس کی دعا کو پایۂ قبولیت میں جگہ دیتا ہوں۔

(خطباتِ ناصر جلد نہم صفحہ ۱۵۹ تا ۱۶۷)

ان دو آیات میں جو میں نے ابھی تلاوت کی ہیں اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے رکھنے کے فوائد اور جن طریقوں سے وہ فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں ان کے متعلق ہمیں ایک حسین رنگ میں تعلیم دی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے شَهْرُ رَمَضَانَ اس مہینے کا نام اسلام سے قبل ناتق تھا اسلام نے اس مہینے کو رمضان کا نام دیا ہے اور اس نام کے اندر اتنے وسیع معانی ہمیں نظر آتے ہیں کہ دل انہیں معلوم کر کے خدا تعالیٰ کے کمالِ قدرت کو دیکھ کر اس کی حمد کے جذبہ سے بھر جاتا ہے۔

رمضان کا لفظ رَمَض سے نکلا ہے اور جب ہم رَمَض کے مختلف معانی پر غور کرتے ہیں تو اس کے بہت سے معنی ایسے ہیں جن کا ماہ رمضان سے تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب عربی میں اَرْمَضَ الشَّیْئَ کہا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں اَحْرَقَهٗ اسے جلا دیا۔ اس لفظ میں سوزش کا تصوّر پایا جاتا ہے۔ اگر کہا جائے اَرْمَضَ الرَّجُلَ تو اس کے معنی ہوتے ہیں اَوْجَعَهٗ اس کو دکھ پہنچایا۔ تکلیف دی۔ جب ہم ان دو معانی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ماہ رمضان سے تعلّق ہے۔ اس طرح پر کہ وہ لوگ جو دین اسلام کے منکر ہیں یا اسلام میں تو داخل ہیں لیکن ان کے اندر روحانی

کمزوری ہے۔ وہ اس مہینہ کو محض دکھ اور درد، بھوک اور پیاس اور بے خوابی کا مہینہ سمجھتے ہیں۔ انہیں اس میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا اور نہ ہی اس کی برکات سے وہ کوئی حصہ لیتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ کے جو نیک اور مومن بندے ہیں وہ اس مہینہ کی تکلیف کو تکلیف نہیں سمجھتے۔ رَمَضَ النَّصْلَ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ تیر کے پھل کو، یا نیزے کے پھل کو یا چھری کے پھل کو پتھر پر رگڑ کر تیز کیا۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے مومن بندے اس مہینہ کے اندر اپنے سہام اللیل یعنی رات کے تیروں کو جو دعاؤں کی صورت میں آسمان کی طرف چلا رہے ہوتے ہیں تیز کرتے ہیں اس طرح ان تیروں کا اثر اس ماہ میں بڑھ جاتا ہے۔ اور ان کی کاٹ تیز ہو جاتی ہے۔ اور جن اغراض کیلئے ان تیروں کو استعمال کیا جاتا ہے وہ اغراض اس ماہ میں بطریق احسن حاصل ہو جاتی ہیں۔

پھر لغت میں تَرَمَّضَ الصَّيِّدَ کا محاورہ بھی لکھا ہے۔ یعنی جنونی شکاری شدت گرما کی پرواہ نہ کرتے ہوئے۔ گرمی کے وقت اپنے شکار کی تلاش میں نکلا۔ گویا اللہ تعالیٰ کا مومن بندہ بھوک اور پیاس اور دوسری سختیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے مطلوب کی تلاش میں نکلتا ہے۔ گرمی کی شدت یا تکلیف، یا بھوک اور پیاس، یا بے خوابی وغیرہ اس کے راستہ میں روک نہیں بن سکتیں۔ اور وہ جو کچھ تلاش کرتا ہے اس کا مفہوم بھی ہمیں اسی لفظ سے ہی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس کا مطلوب ہرن اور تیتر کا شکار نہیں ہوتا چنانچہ الرَّمَضُ کے ایک اور معنی عربی میں اَلْمَطَرُ يَأْتِيْ قَبْلَ الْخَرِيْفِ فَيَجِدُ الْأَرْضَ حَارَّةً مُحْتَرِقَةً (اقرب) ہیں یعنی وہ بارش جو گرمی کی شدت کے بعد اور موسم خزاں سے پہلے آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ اور جب وہ نازل ہوتی ہے تو زمین پوری طرح تپی ہوئی اور جلی ہوئی ہوتی ہے لیکن جب وہ بارش نازل ہوتی ہے تو اس تپش کو دور کر دیتی ہے۔ اس جلن کو مٹا دیتی ہے اور سکون کے حالات پیدا کر دیتی ہے۔

تو یہاں سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا ایک مومن بندہ رمضان کے مہینے میں جنونی شکاری کی طرح بھوک اور پیاس اور دوسری تکالیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے جس مطلوب کی تلاش میں نکلتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بارش ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس رحمت کی بارش کے بغیر میرے دل کی جلن دُور نہیں ہو سکتی میرے اندر جو آگ لگی ہوئی ہے وہ بجھ نہیں سکتی جب تک کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی

بارش نازل نہ ہو پس یہ تمام مفہوم لفظ رمضان کے اندر ہی پایا جاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ایک ایسا مہینہ ہے کہ میرے بندوں کو چاہیے کہ وہ راتوں کے تیروں (دعاؤں) کو تیز کریں اور جنونی شکاری کے جنوں سے بھی زیادہ جنوں رکھتے ہوئے میری رحمت کی تلاش میں نکل پڑیں تب میری رحمت کی تسکین بخش بارش ان پر نازل ہوگی اور میرے قرب کی راہیں ان پر کھولی جائیں گی۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ۔فرمایا یہ ایک ایسا مہینہ ہے جو بہت ہی برکتوں والا ہے۔ کیونکہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن کریم نازل کیا گیا یا جس کے بارے میں قرآن کریم نے تعلیم دی یا جس میں قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا۔

اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کے اندر تین باتیں بیان کی گئی ہیں:

اوّل یہ کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں نزول قرآن کریم کی ابتداء ہوئی۔ احادیث اور دوسری کتب (تاریخ) سے پتہ چلتا ہے کہ رمضان کے آخری حصہ میں قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا تھا۔ تو مہینے کا انتخاب اور پھر رمضان کے آخری حصہ کا انتخاب جو خدائے تعالیٰ نے کیا وہ بغیر کسی حکمت اور وجہ کے نہیں ہوسکتا۔

دوسرے اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کے یہ معنی بھی ہیں کہ اس کے بارے میں قرآن کریم نے تاکیدی اور تفصیلی احکام نازل کئے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں کوئی حکم تاکید کے ساتھ نازل فرماتا ہے تو اس لئے نازل فرماتا ہے کہ اس حکم کو بجالا کر بندہ اپنے ربّ کی بہت سی برکتوں کو حاصل کر سکے۔

تیسرے معنی اس کے یہ ہیں کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں کہ بار بار سارا قرآن کریم نازل ہوتا رہا۔ کیونکہ احادیث میں یہ امر بڑی وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ ہر رمضان کی پہلی رات سے آخری رات تک حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول فرماتے اور اس وقت تک جتنا قرآن کریم نازل ہو چکا ہوتا۔ آپؐ سے مل کر اس کا دَور کرتے۔ اس طرح وہ نازل شدہ قرآن آپؐ پر پھر ایک دفعہ بذریعہ وحی نازل ہوتا اور ہر سال ایسا ہوتا تھا۔ بخاری میں یہ حدیث یوں درج ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدَ النَّاسِ وَكَانَ اَجْوَدَ مَايَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ حِيْنَ يَلْقَاهُ جِبْرِيْلُ وَكَانَ يَلْقَاهُ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ

الْقُرْاٰنَ۔ (بخاری باب کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْیِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ)

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔آپؐ کی جود وسخا کو کوئی شخص نہیں پہنچ سکتا تھا نہ پہنچا اور نہ ہی آئندہ بھی پہنچے گا۔لیکن آپؐ کی یہ سخاوت رمضان شریف کے مہینہ میں اور بھی بڑھ جاتی۔ اور وہ اس لئے کہ رمضان میں جبریل علیہ السلام نازل ہوتے فَیُدَارِسُہُ الْقُرْاٰنَ اور آپؐ سے مل کر قرآن مجید کا دَور کرتے۔

ان دنوں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آسمان سے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو بارش کی طرح اترتے دیکھتے تو آپؐ کی سخاوت اور جود وکرم میں بھی ایک تیزی پیدا ہوجاتی اور آپ ان ہواؤں کی نسبت بھی جو موسلا دھار بارش لاتی ہیں زیادہ سخی نظر آتے۔

اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ فرما کر گویا یوں کہا کہ اے میرے بندو! دیکھو یہ رمضان وہ ہے کہ جب قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا تو اسی مہینہ میں شروع ہوا۔دوسرے گیارہ مہینے بھی تو تھے ان میں بھی نازل کیا جا سکتا تھا مگر خدا تعالیٰ نے اپنی بالغ حکمت اور اپنے کامل علم کی بناء پر نزول قرآن کریم کے لئے اسی مہینہ کو چنا اور اسی میں اس کے نزول کی ابتدا ہوئی۔

پھر کتنی تاکید کے ساتھ، کتنی حکمتیں بیان کرنے کے بعد اور کتنے دلائل دے کر اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ حکم دیا کہ رمضان کے مہینے میں روزے رکھو اور عبادات پر زور دو تا الٰہی فضلوں کے تم وارث بنو۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری نگاہ میں اس مہینے کی اتنی قدر ہے کہ میں ہر سال اس مہینہ میں جبرئیل کو بھیجتا ہوں تا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر قرآن کریم کا دَور کرے۔

پس ان باتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ کتنی برکتیں ہیں جن کا تعلق اس مہینہ سے ہے اور تمہیں کس قدر کوشش کرنی چاہیے کہ تم ان برکات سے زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کر سکو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ قرآن جو رمضان کے مہینہ میں اترنا شروع ہوا اور پھر بار بار اس میں نازل ہوتا رہا۔ یہ کوئی معمولی کتاب نہیں جس کے لئے اس مہینہ کو چنا گیا ہے۔ بلکہ ھُدًی لِّلنَّاسِ یہ وہ پہلی کامل شریعت ہے جو تمام بنی نوع انسان کے لئے بطور ہدایت بھیجی گئی ہے۔

ہدایت کے ایک معنی اس الٰہی شریعت کے ہیں جو انبیاء اللہ اپنے ساتھ لے کر دنیا کی طرف آتے ہیں۔تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ کتاب رمضان کے مہینہ میں اُتری ہے۔ھُدًی لِّلنَّاسِ یہ تمام بنی نوع

انسان کو قیامت تک بحیثیت ایک شریعت کاملہ فائدہ اور برکت پہنچاتی رہے گی۔

ایک معنی ہدایت کے یہ بھی ہیں کہ یہ کتاب بنی نوع انسان پر ٹھونسی نہیں گئی بلکہ اس میں انسانی صلاحیتوں اور استعدادوں کے مطابق لوگوں کو عبادات اور اعمالِ صالحہ بجالانے کا طریق بتایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ شریعت جو انسان کے لئے نازل کی گئی ہے وہ اس کی استعدادوں، صلاحیتوں اور قابلیتوں کو مدِّ نظر رکھ کر نازل کی گئی ہے۔ اور قیامت تک انسان میں جو جو نئی سے نئی قابلیتیں پیدا ہوتی رہیں گی وہ بھی ہم سے پوشیدہ نہیں۔ کیونکہ ہم عالم الغیب ہیں۔ اس لئے آج کے انسان سے لے کر اس آخری انسان تک جو اس دنیا میں پیدا ہوگا۔ اور ملکِ عرب سے لے کر تمام ان ملکوں کی اقوام تک جو اکنافِ عالم میں آج موجود نہیں یا آئندہ پیدا ہوں گی ان سب کی صلاحیتوں اور استعدادوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ عظیم الشان کتاب بنی نوع انسان کے ہاتھ میں دی ہے۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ وہ قرآن ہے۔ اتنا عظیم الشان قرآن کہ جس کا تعلق ہم نے ماہِ رمضان کے ساتھ بڑی مضبوطی سے قائم کر دیا ہے۔

پھر هُدًى لِّلنَّاسِ میں یہ بھی فرمایا کہ قرآن کریم صرف انسانی صلاحیتوں اور استعدادوں کے مطابق ہی نہیں بلکہ اس میں ایک یہ بھی خوبی پائی جاتی ہے کہ بندے کی ہدایت کو درجہ بدرجہ بڑھاتا چلا جاتا ہے کیونکہ جس طرح ایک طالب علم پہلی جماعت کا نصاب ختم کرنے کے بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسری جماعت میں بیٹھے اور دوسری جماعت کا نصاب ختم کرنے کے بعد وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ تیسری جماعت میں بیٹھے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کے جو نیک بندے ہیں جب وہ ہدایت کے ایک درجہ پر پہنچتے ہیں اور الٰہی احکام کو بجالاتے ہوئے اپنے آپ کو اس قابل بنا لیتے ہیں کہ اس درجہ کی ہدایات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں تو اللہ تعالیٰ ان کے درجہ کو اور بلند کر دیتا ہے اور ہدایت کی نئی راہیں ان پر کھولتا ہے۔ تو ہدایت کے معنوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مزید ہدایت کی جو خواہش یا استعداد پیدا ہو جاتی ہے اس کے مطابق مزید ہدایت کے سامان بھی اس میں موجود ہیں۔

پس فرمایا کہ یہ کوئی معمولی کتاب نہیں بلکہ ایسی عظیم الشان کتاب ہے کہ صرف ایک دفعہ ہدایت دے کر پھر پیچھے ہٹ کر کھڑی نہیں ہو جاتی بلکہ ہمیشہ تمہیں اس کی ضرورت رہتی ہے۔ جتنی جتنی تم ایمان اور عرفان میں ترقی کرتے جاتے ہو۔ قرآن کریم تمہیں اس سے آگے ہی راستہ دکھاتا چلا جاتا ہے اور کہتا

ہے کہ تمہاری انتہائی منزل ابھی نہیں آئی۔ آؤ میں تمہیں اس سے بھی آگے لے جاؤں۔ پھر وہ تمہارا ہاتھ پکڑتا ہے اوراگلی ہدایات کی طرف راہنمائی کرتا ہے اوراپنے قرب کی نئی راہیں تم پر کھولتا ہے۔

تو فرمایا کہ اتنی عظیم الشان کتاب کو ہم نے رمضان شریف میں نازل فرمایا ہے۔ هُدًى لِّلنَّاسِ میں ایک بڑا زبردست دعویٰ پیش کیا گیا ہے۔فرمایا کہ اب یہی ایک کتاب ہے جس پر عمل کر کے تمہارا انجام بخیر ہوسکتا ہے اورتم جنّت موعودہ کو پاسکتے ہو۔

دنیا کی دوسری تعلیمیں فلسفیانہ ہوں یا مذہبی، ان کے اندر کچھ ایسی باتیں تو ضرور پائی جاتی ہیں کہ جن پر عمل کر کے ہم اس دنیا میں ترقی کر سکتے ہیں لیکن یہاں فرمایا کہ قرآن کریم کے علاوہ دنیا میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں جو انسان کی ضرورتوں کو اس طور پر پورا کر سکے کہ اس کی اُخروی زندگی بھی اس کیلئے جنّت بن جائے۔ یہ صرف قرآن کریم ہی ہے جس کے ذریعہ انسان کا انجام بخیر ہوتا ہے اور اس کو جنّت نصیب ہوتی ہے۔

پھر فرمایا وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى یعنی جب قیامت تک تمام بنی نوع انسان کے لئے یہ قرآن مجید ہدایت ہے۔ اور دوسری جگہ ہمیں اسلامی تعلیم میں یہ بھی ملتا ہے کہ انسان اس دنیا میں نسلاً بعد نسلٍ ہر لحاظ سے ترقی کرتا چلا جائے گا۔ اس کا علم بھی، اس کی عقل بھی اوراس کا اندازفکر بھی ترقی کی راہ پر چلتا چلا جائے گا۔تو آخرایسا زمانہ آجائے گا کہ جب انسان یا انسانوں میں سے اکثر حصہ محض دین العجائز پر قانع نہیں رہے گا بلکہ وہ کہے گا کہ ہم نے مان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور کہ اس پر ہمیں عمل بھی کرنا ہے لیکن ہمیں تسلی نہیں جب تک کہ ہمیں اس حکم کی حکمتیں نہ بتائی جائیں اور دلائل نہ سمجھائے جائیں وغیرہ وغیرہ گویا اس میں ایک پیشگوئی بھی مضمر تھی۔

تو فرماتا ہے کہ اس تعلیم میں جہاں جہاں دعویٰ پیش کیا گیا ہے اس کے عقلی دلائل بھی پیش کر دیئے گئے ہیں جہاں کہیں حکم دیا گیا ہے ساتھ ہی اس کی حکمتیں بھی بیان کر دی گئی ہیں۔ انسانی دماغ خواہ ترقی کی کتنی منازل طے کرتا چلا جائے خواہ کتنے ہی بلند مقام پر پہنچ جائے۔ بہرحال وہ قرآن کریم کا محتاج رہے گا۔

وَ الْفُرْقَانِ اوراس قرآن میں ایسے نشانات اور دلائل رکھے گئے ہیں جو حق اور باطل کے درمیان امتیاز قائم کر دیتے ہیں حتیٰ کہ کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا جیسا کہ خود انہی آیات میں اللہ تعالیٰ نے

قبولیتِ دعا کا ذکر کیا ہے یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے سامنے باطل ٹھہر ہی نہیں سکتا۔

الغرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رمضان میں روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ تم سہام اللیل (دعاؤں) کے پھلوں کو تیز کرو اور اپنے مطلوب (رضاء الٰہی) کی تلاش میں نکلو۔ پیاس اور بھوک کو برداشت کرو۔ اور بے خوابی کو خدا تعالیٰ کا فضل سمجھو۔ کیونکہ یہ ایسا برکتوں والا مہینہ ہے کہ جس میں قرآن کریم جیسا کلام الٰہی نازل کیا گیا ہے۔ اس لئے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ تم میں سے جو شخص بھی بلوغت۔ صحت اور حضر میں یہ ماہ پائے وہ اس کے روزے رکھے۔

شَهِدَ کے ایک معنی ہیں عَايَنَهُ وَاطَّلَعَ عَلَيْهِ کہ اس کا معائنہ کیا اور اس پر اطلاع پائے۔ یعنی ہم نے جو اس روزہ کی حکمتیں بیان کی ہیں۔ اگر تم ان کا اچھی طرح مطالعہ کرو اور ان پر اطلاع پاؤ تو پھر تمہیں اس ماہ کے روزے پوری طرح اور مقرر کردہ شرائط کے مطابق رکھنے چاہئیں بلکہ تم خود بخود اس کے روزے رکھو گے سوائے اس کے کہ کوئی روحانی کمزوری تم میں موجود ہو۔

آگے فرمایا يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو تنگیاں تمہیں نظر آتی ہیں کہ صبح سے شام تک کھانا پینا چھوڑنا جس کی وجہ سے بھوک اور پیاس لگتی ہے۔ پھر سخت گرمی کے موسم میں اور سخت سردی کے موسم میں کچھ اور تکالیف پیش آتی ہیں۔ فرمایا یہ جو تکالیف تمہیں پیش آتی ہیں یہ محض عارضی اور وقتی ہیں۔

اتنا پیارا خدا اتنا پیارا ربّ جس نے قرآن کریم جیسی اعلیٰ تعلیم تم پر نازل کی اور بے شمار دنیوی نعمتوں سے تمہیں محض اپنے فضل سے نوازا، وہ ہرگز پسند نہیں کرے گا کہ وہ تمہیں ان تکالیف میں اس لئے مبتلا کرے کہ تا تمہیں دکھ پہنچائے۔ نہیں بلکہ وہ تو تمہارے لئے آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے کیونکہ اگر تم ان خفیف سی وقتی تکالیف کو برداشت کر لو گے تو ان کے بدلے میں وہ تمہیں وہ انعام اور اکرام بخشے گا کہ انہیں پا کر تمہیں یہ دکھ، دکھ ہی نظر نہ آئے گا۔ پھر فرمایا وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ ہم نے تم پر روزے فرض کئے تو یہ حکم بھی دیا کہ سارے رمضان کے روزے رکھو تا کہ تم اس کی گنتی کو پورا کرو۔ اگر صرف یہ حکم ہوتا کہ روزے رکھو تو کوئی بیس دن کے روزے رکھتا۔ کوئی دس دن کے، کوئی رمضان کے مہینے میں رکھتا کوئی دوسرے مہینوں میں۔

پس ہم نے رمضان میں روزے رکھنے کا اس لئے حکم دیا تا کہ اُمتِ مسلمہ ساری کی ساری اس

سارے مہینے میں روزے رکھے اوران اجتماعی برکات سے فائدہ اٹھائے جو اجتماعی عبادات سے تعلق رکھتی ہیں۔

دوسرے اس کے معنی یہ ہیں اور یہ زیادہ لطیف ہیں کہ جو زندگی تمہیں دی گئی ہے اسے تم پورا کرو۔ اس کا کمال تمہیں حاصل ہو۔اس میں اشارۃً ہمیں بتایا کہ اگر کسی شخص کے پاس مثلاً سَو روپیہ ہے۔اگر اس میں سے بیس روپے گم ہو جائیں یا چوری ہو جائیں اور باقی وہ خرچ کرے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس نے تمام سَو روپیہ خرچ کیا ہے کیونکہ اس کے پاس خرچ کرنے کے لئے تو صرف اسّی روپے رہ گئے تھے سَو کا سَو روپیہ وہی خرچ کرتا ہے جس کے پاس وہ سَو کا سَو روپیہ موجود بھی ہو۔

فرماتا ہے کہ تم میں سے ہر ایک کو ہم نے ایک پیمانہ کے مطابق عمر دی ہے اور ہم نے تم پر دینی فرائض اس لئے واجب کئے ہیں تا کہ تم اپنی عمر کو پوری طرح گزار سکو اور اس کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہو۔ ایک شخص کی عمر سَو سال ہو اس میں سے ۲۰ سال اس نے دنیا کی لہو ولعب میں ضائع کر دئے ہوں تو حقیقتاً اس نے سَو سال کی زندگی نہیں گزاری کیونکہ بیس سال اس نے مردہ ہونے کی حالت میں گزارے ہیں۔سَو سال کی عمر پانے والا سَو سال کی زندگی اسی صورت میں صحیح طور پر گزارتا ہے جس صورت میں کہ اس نے ساری زندگی اپنے اللہ کی اطاعت میں گزاری ہو۔جس شخص نے اپنی زندگی کے چند لمحات یا زیادہ وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے پہلو تہی کرتے ہوئے، اس سے منہ موڑتے ہوئے، نیک نیتی اور اخلاص کو بالائے طاق رکھتے ہوئے گزارا ہو اس کی عمر کا وہ حصہ ضائع ہو گیا۔اور نہیں کہہ سکتے کہ اس نے اپنی پوری عمر جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی تھی وہ حقیقتاً اس نے اس دنیا میں گزاری کیونکہ یہاں کی پیدائش کا ایک مقصد ہے اور جو حصہ عمر اس مقصد کے خلاف خرچ ہوتا ہے وہ عمر ضائع جاتی ہے۔

پس فرمایا کہ اگر تم ماہ رمضان کی برکات سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہتے ہو اور اس کے لئے اپنی عمر کو خرچ کرتے ہو تو دیگر برکات کے علاوہ تمہیں ایک یہ برکت بھی حاصل ہو گی کہ تمہیں اللہ تعالیٰ دوسری نیکیاں کرنے کی بھی توفیق دے گا اور اس مہینہ کے بعد جو گیارہ ماہ اور تمہاری زندگی میں آنے والے ہیں وہ بھی حقیقی معنی میں تم خدا کی راہ پر خرچ کرنے والے ہو گے۔

تو جو شخص رمضان شریف کو نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ گزارتا ہے تو بقیہ سال کے گیارہ مہینوں

میں بھی وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کی توفیق پاتا ہے اور اس طرح اس کی ساری زندگی نیکیوں میں گزرتی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی ساری عمر اس مقصد کے لئے گزاری جس کیلئے اسے پیدا کیا گیا تھا۔

وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس مہینہ میں میں تم پر اتنی روحانی نعمتیں اور برکتیں نازل کروں گا کہ تم اپنے آپ کو مجبور پاؤ گے کہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان کرتے پھرو اور پھر تم قربانی کے ہر موقع کو تکلیف اور دکھ نہیں سمجھو گے بلکہ فضل الٰہی جانو گے وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اور یہ فضل تم پر اس لئے بھی نازل ہوں گے کہ تمہارے دل اس کے شکر سے بھر جائیں اور جس مومن کا دل اس کے شکر سے بھر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فضلوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور دَور اس کے لئے شروع ہو جاتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراھیم:۸) یعنی میرا شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا۔

پس جب اللہ تعالیٰ کا انعام نازل ہوا اس لئے کہ اس نے ہماری حقیر سی کوشش کو قبول فرما لیا تو اس کے نتیجہ میں ہمارے دل میں شکر کے جذبات پیدا ہوئے فرمایا لَاَزِيْدَنَّكُمْ کہ میں تمہیں اور نیکیوں کی توفیق بخشوں گا۔ پھر اس کی وجہ سے اور شکر کے جذبات پیدا ہوں گے۔ گویا اس طرح ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اسی تسلسل اور مخلصانہ نیت کی وجہ سے اُخروی زندگی محدود اعمال کے باوجود ابدی زندگی ہو جائے گی۔

پھر فرمایا۔ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ کہ جب میں نے اپنے بندوں کو یہ بتایا کہ تم پر بڑے انعامات نازل ہوں گے بڑا فضل نازل ہوگا اور تم خدا کے مقرب بن جاؤ گے تو اس پر میرے بندے کہیں گے کہ ہمارا ربّ تو محض کبریائی ہے۔ محض پاکیزگی ہے۔ رفیع الدرجات ہے۔ تمام صفاتِ حسنہ سے متّصف ہے کمال تام اسی کو حاصل ہے اور وہ اتنا ارفع اور اعلیٰ ہے کہ اس کی رفعتوں تک ہمارا تخیل بھی نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی اس کی رفعتوں کی کوئی انتہا ہے۔ لیکن جب ہم اپنے کو دیکھتے ہیں تو اپنے کو خطا کار، گنہگار اور نہایت ضعیف پاتے ہیں۔ اس طرح ہمارے درمیان اور ہمارے ربّ کے درمیان لامتناہی فاصلے پائے جاتے ہیں۔ کیا ہماری حقیر کوششوں کے نتیجہ میں ہمیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے؟

فرمایا۔ جب میرے بندے تجھ سے اس معاملہ کے متعلّق سوال کریں تو تم انہیں کہہ دو کہ بے شک تم کمزور بھی ہو۔ تم گنہگار بھی ہو۔ تم خطار کار بھی ہو۔ میں تمام بلندیوں کا مالک اور تمام رفعتیں میری طرف ہی منسوب ہوتی ہیں لیکن میری ایک اور صفت بھی ہے اور وہ یہ کہ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (الزمر: ۵۴) کہ اگر میں چاہوں تو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہونے کی وجہ سے اپنے بندوں کے تمام گناہوں کو بخش بھی دیا کرتا ہوں اور جب گناہ میری مغفرت کی چادر کے نیچے چھپ جائیں تو پھر میرے اور تمہارے درمیان جو گناہوں کے فاصلے ہوں گے وہ مٹ جائیں گے اور میں خود آسمانوں سے اتروں گا اور تمہارے قریب آ جاؤں گا اور تمہیں اپنا مقرب بنالوں گا۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ اور اس کی علامت یہ ہوگی کہ تم دعا کرو گے تو میں اسے قبول کرلوں گا تا کہ دنیا یہ نہ کہہ سکے کہ تمہارا یہ دعویٰ کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کا جو قرب حاصل ہے وہ اسلام کی تعلیم پر عمل کرنے کی برکت سے حاصل ہوا ہے یہ محض تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔ اس قرب کی دلیل مہیا کرنے کیلئے میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا تا کہ دنیا یقین کرلے کہ تمہارا یہ دعویٰ کہ تم اللہ تعالیٰ کے فضلوں کے وارث ہو۔ واقعی سچا ہے۔ اگر تم گریہ وزاری اور عجز و انکسار اور تذلل کے ساتھ میرے سامنے جھکتے رہو گے تو دنیا اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ کے نظارے بھی دیکھتی چلی جائے گی۔

دعا اور قبولیت دعا کے متعلّق ہمیں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ ہمارا ربّ ہماری دعائیں قبول تو کرتا ہے لیکن اپنے فضل اور اپنی مرضی سے۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ گویا خدا تعالیٰ ہمارا غلام ہے (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ) اس کا فرض ہے کہ ہماری دعا کو اس رنگ میں قبول کرے جس رنگ میں کہ ہم چاہتے ہیں۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ وہ تو تمام طاقتوں کا مالک ہے اور وہ محض اپنے فضل سے نہ کہ ہماری کسی خوبی کی وجہ سے ہمارے لئے قرب کی راہیں کھولتا ہے اور ہماری دعاؤں کو قبول کرتا ہے۔ چونکہ وہ علاّم الغیوب ہے۔ ہم نہیں جانتے مگر وہ جانتا ہے کہ جو دعا ہم اپنے لئے جس رنگ میں مانگ رہے ہیں وہ ہمارے لئے اچھی بھی ہے یا نہیں۔ تب بعض دفعہ وہ ہماری دعاؤں کو قبول کرتے ہوئے ہمارے لئے خیر کی راہیں اس طرح کھول دیتا ہے کہ جو ہم نے مانگا تھا وہ نہیں دیتا اور جو ہم نے نہیں مانگا تھا وہ ہمیں دے دیتا ہے۔

پھر وہ ہمارے اخلاص اور محبّت کے دعویٰ کی آزمائش بھی کرتا ہے کہ کیا ہم اپنے دعویٰ میں سچے بھی

ہیں یا نہیں۔ پھر بسا اوقات ہماری دعا اور قبولیت دعا کے درمیان بڑا زمانہ گزرتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے براہین احمدیہ میں اس کے متعلق ایک بڑا لطیف نوٹ دیا ہے۔ فرمایا:-

’’غرض ایسا ہوتا ہے کہ دعا اور اس کی قبولیت کے درمیانی اوقات میں بسا اوقات ابتلاء پر ابتلاء آتے ہیں اور ایسے ابتلاء بھی آ جاتے ہیں جو کمر توڑ دیتے ہیں مگر مستقل مزاج، سعید الفطرت ان ابتلاؤں اور مشکلات میں بھی اپنے ربّ کی عنایتوں کی خوشبو سونگھتا ہے اور فراست کی نظر سے دیکھتا ہے تو اس کے بعد نصرت آتی ہے اور ان ابتلاؤں کے آنے میں پھر یہ ہوتا ہے کہ دعا کے لئے جوش بڑھتا ہے‘‘۔

پھر فرمایا فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي کہ دعا کا نشان دیکھ کر مومن بندوں کو یقین کر لینا چاہیے کہ میں نے جو احکام بھی ان کے لئے آسمان سے نازل کئے ہیں وہ ان کی بہتری کے لئے ہی ہیں۔ وَلْيُؤْمِنُوا بِي چاھیے کہ وہ میری توحید پر ایمان لائیں اور میری صفات کی معرفت حاصل کریں اور تخلّق باخلاق اللہ کی طرف وہ متوجہ ہوں اور اس کی توفیق انہیں صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ کہ وہ ہدایت پر استقامت سے قائم ہو جائیں۔

رُشد کے معنی ہیں نیکیوں پر دوام اور یہ بڑی ضروری چیز ہے جو شخص چند روزہ نیکیوں کے بعد پھر اپنی زندگی کا ایک حصہ اللہ تعالیٰ کی بغاوت میں گزارتا ہے وہ اس کے فضلوں کو کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے فضلوں کو حاصل کرنے کے لئے رشد کی ضرورت ہے اور رُشد کے معنی عربی زبان میں یہ ہیں کہ ہدایت پا گیا اور اس پر قائم رہا۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے تمہارے لئے ہدایت کے سامان بھی مہیا فرمائے ہیں اور پھر تم ماہ رمضان میں قبولیت دعا کے نمونے بھی دیکھتے ہو لیکن اگر تم مستقل طور پر میری اطاعت کو اختیار نہیں کرو گے تو میرے فضل بھی تم پر مستقل طور پر نازل نہیں ہوں گے اور نہ ہی تمہارا انجام بخیر ہوگا۔ انجام بخیر اسی کا ہوتا ہے جو اپنی زندگی کے آخری سانس تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جُوا اپنی گردن پر رکھے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان دو چھوٹی سی آیات میں جو حکمت اور ہدایت کی باتیں بتائی ہیں اس سے جو نتیجے نکلتے ہیں ان میں سے اوّل تو یہ ہے کہ رمضان شریف کا قرآن مجید کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے رمضان شریف میں تلاوت قرآن مجید بڑی کثرت سے کرنی چاہیے۔ ہمارے بعض بزرگ تو

ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمریں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے جمع کرنے میں گزار دیں۔لیکن جب رمضان آتا تو وہ حدیث کا سارا کام بستوں میں لپیٹ دیتے اور کہتے کہ اب یہ قرآن مجید پڑھنے کا مہینہ ہے۔حتیٰ کہ ان میں سے کئی ایک تو ایک ایک دن میں قرآن کریم کا دور ختم کرتے یعنی رمضان شریف کے ایک مہینے کے اندر وہ تیس دفعہ قرآن کریم کو پڑھتے۔

دوسری بات یہ کہ جب قرآن هُدًى لِلنَّاسِ ہے۔اور اس میں بَيِّنَات ہدایت بھی درج ہیں اور پھر وہ الفرقان بھی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم تلاوت کرتے ہوئے قرآن کریم کی آیات پر غور کریں اور فکر اور تدبّر سے کام لیں اور ساتھ ہی دعا بھی کریں کہ اے اللہ! ہمیں علمِ قرآن عطا کر اور اس کے حقیقی معنی سمجھا۔

تیسری بات جو بیان ہوئی ہے۔وہ فَلْيَصُمْهُ ہے۔کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔یہ ایک حکم ہے۔کسی کو سمجھ آئے یا نہ آئے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔کیونکہ مسلمان کا اتنا تو ایمان ضرور ہوتا ہے کہ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔اور اس میں روزے رکھنے کا حکم ہے۔اس لئے روزے رکھنے چاہئیں۔

چوتھی بات یہ کہ جو شخص سفر پر ہو یا بیمار ہو تو وہ اتنے دن کے روزے بعد میں رکھے۔یہاں یہ نہیں فرمایا کہ جو سفر پر ہو یا بیمار ہو اور وہ روزے نہ رکھ سکے تب وہ ان روزوں کو پورا کرے۔تو ان الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص غلطی سے بیماری میں روزہ رکھ لیتا ہے یا سفر میں روزہ رکھ لیتا ہے تو قرآن کریم کی اس آیت پر تبھی وہ کاربند رہ سکتا ہے کہ ان روزوں کے باوجود کسی اور وقت میں روزے رکھے۔کیونکہ قرآن کریم نے تو یہ کہا ہی نہیں کہ روزے چھوٹیں تب اور وقت میں روزے رکھو۔قرآن کریم نے تو صرف یہ فرمایا ہے کہ جو دن رمضان کے ایسے آئیں جن میں تم بیمار ہو یا سفر میں ہو تو ان دنوں کے روزے تم نے دوسرے دنوں میں رکھنے ہیں۔مگر بہانہ جُو بھی نہیں بننا چاہیے بات یہ ہے کہ سفر کے متعلق بعض لوگ کہہ دیتے ہیں ”جی اَج کل دے سفر دا کی اے۔بڑا آرام ہے ریل وچ بیٹھے ایتھوں اوتھے پہنچ گئے“ لیکن اگر روزہ رکھنا عبادت ہے۔تو عبادت خواہ جونسی بھی ہو۔اسے ہم نے اس کی پوری شرائط کے مطابق ادا کرنا ہے۔مثلاً قرآن کریم کا پڑھنا، نوافل ادا کرنا، رات کو جاگنا، دن کو بھوکے اور پیاسے رہنا۔پھر بُری عادتوں کو چھوڑنا اور کئی نیکیوں کے کرنے کا اپنے ربّ

سے وعدہ کرنا۔ وغیرہ کئی چیزیں ہیں جن کا تعلّق رمضان کے مہینے سے ہے۔ سو اگر رمضان کی عبادت کماحقہٗ ہم نے ادا کرنی ہے تو یقینی بات ہے کہ چاہے ریل کا سفر ہو۔ یا ہوائی جہاز کا ہم اس عبادت کو سفر میں یا بیماری میں کماحقہٗ ادا نہیں کر سکتے۔ ایک شخص بیماری کی وجہ سے مثلاً نوافل ادا نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی رات کو دعا کرنے کا موقع پا تا ہے۔ تو ایک طرح اس نے اس عبادت سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھایا صرف بھوکا پیاسا رہنا ہی تو روزے کا مقصد نہیں کہ صبح صبح کسی کو اس کے گھر والے اٹھائیں۔ یا سوئے سوئے اس کے منہ دودھ کا پیالہ یا ہارلکس کا ایک گلاس ڈالدیں اور پھر وہ لیٹ جائے۔ اور سارا دن سوتا رہے اور پھر شام کے وقت اس کو افطاری کے لئے اٹھا دیا جائے۔

یہ کوئی روزہ نہیں نہ یہ رمضان کی عبادت کہلائے گی بہرحال بہانہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ کہ کسی طرح روزے کو چھوڑ دیا جائے۔ بیماری کے متعلق تو بہانہ بنانا آسان ہے اس لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے یہ صرف ڈاکٹر ہی فیصلہ دے سکتا ہے۔ کہ یہ بیماری ایسی ہے کہ جس کی وجہ سے روزہ چھوڑا جائے۔ بعض بیمار ایسے ہوتے ہیں کہ بظاہر چنگے بھلے معلوم ہوتے ہیں چلتے پھرتے بھی ہیں لیکن ڈاکٹر یہ فیصلہ دے دیتا ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں۔ مثلاً ایک شخص بلڈ پریشر کا بیمار ہے۔ اور ڈاکٹر کے نزدیک اس کا روزہ رکھنا اس کے لئے خطرناک ثابت ہو حالانکہ وہ چلتا پھرتا ہوگا۔ باتیں بھی کرتا ہوگا۔

اسی طرح بعض ایسی بیماریاں بھی ہوسکتی ہیں کہ ڈاکٹر یہ فیصلہ دے۔ کہ اس بیماری میں روزہ رکھنا مضر نہیں بلکہ مفید ہوگا۔

پس ہمیں بہانہ بنا کر روزہ نہ چھوڑنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تو کوئی چیز مخفی نہیں اور نہ کسی کی حالت چھپی ہوئی ہے۔ ہم اس کے ساتھ فریب یا چالاکی سے کام نہیں لے سکتے۔

(خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۵۴ تا ۶۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر (بھی) روزوں کا رکھنا اُسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح اُن لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں تا کہ تم (روحانی ترقیات کے لئے اللہ تعالیٰ کا فیض حاصل کرو اور اسی طرح اخلاقی ترقیات کے لئے اس کی برکت سے) اپنے اندر ایک طاقت پیدا کرو (سو تم روزے رکھو) چند گنتی کے دن اور تم میں سے جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو (اُسے) اور دنوں میں تعداد (پوری کرنی) ہوگی اور اُن لوگوں پر جو اس (یعنی روزہ) کی طاقت نہ رکھتے ہوں (بطور

فدیہ) ایک مسکین کا کھانا دینا (بشرطِ استطاعت) واجب ہے (اس کے ایک معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ اُن لوگوں پر جو فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں فدیہ دینا واجب ہے) اور جو شخص پوری فرمانبرداری سے کوئی نیک کام کرے گا تو یہ اُس کے لئے بہتر ہوگا اور اگر تم علم رکھتے ہو تو (سمجھ سکتے ہو کہ) تمہارا روزے رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے۔

رمضان کا مہینہ وہ (مہینہ) ہے جس میں (قرآن کریم) بار بار نازل کیا گیا ہے۔ (وہ قرآن) جو تمام انسانوں کے لئے ہدایت (بنا کر بھیجا گیا) ہے (یعنی پہلا الہام الٰہی جس کے مخاطب تمام بنی نوع انسان ہیں) اور جو کھلے دلائل اپنے اندر رکھتا ہے (ایسے دلائل) جو ہدایت پیدا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی (قرآن میں) الٰہی نشان بھی ہیں اس لئے تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو (اس حال میں) دیکھے (کہ نہ مریض ہو نہ مسافر) اُسے چاہیے کہ وہ اس کے روزے رکھے اور جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو اس پر اور دنوں میں تعداد (پوری کرنی واجب) ہوگی اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے تنگی نہیں چاہتا۔ (اس لئے تم خود اپنے نفسوں کے لئے تنگی نہ چاہو بلکہ اللہ کی دی ہوئی آسانی سے فائدہ اُٹھاؤ) اور (یہ حکم اُس نے اس لئے دیا ہے کہ تم تنگی میں نہ پڑو اور) تاکہ تم تعداد کو پورا کرلو اور اس (بات) پر اللہ کی بڑائی کرو کہ اس نے تم کو ہدایت دی ہے اور تاکہ تم (اس کے) شکرگزار بنو۔

اور (اے رسول) جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو (تُو جواب دے کہ) میں (اُن کے) پاس (ہی) ہوں۔ جب دعا کرنے والا مجھے پکارے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ سو چاہیے کہ وہ (دعا کرنے والے بھی) میرے حکم کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا وہ ہدایت پائیں۔

تمہیں روزہ رکھنے کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانے کی اجازت ہے۔ وہ تمہارے لئے ایک (قسم کا) لباس ہیں اور تم اُن کے لئے ایک (قسم کا) لباس ہو اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنے نفسوں کی حق تلفی کرتے تھے۔ اس لئے اُس نے تم پر فضل سے توجّہ کی اور تمہاری (اس حالت کی) اصلاح کر دی۔ سو اب تم (بلا تامّل) اُن کے پاس جاؤ اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے مقدر کیا ہے اس کی جستجو بھی کرو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہیں صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے اس کے بعد (صبح سے) رات تک روزوں کی تکمیل کرو اور جب تم مساجد میں معتکف ہو تو اُن کے (یعنی

بیویوں کے) پاس نہ جاؤ۔ یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدّیں ہیں اس لئے تم اُن کے قریب (بھی) مت جاؤ۔ اللہ اسی طرح لوگوں کے لئے اپنے احکامات بیان کرتا ہے تاکہ وہ (ہلاکتوں سے) بچیں۔

اس رکوع میں جو رمضان کے متعلق قرآن کریم میں بیان ہوا ہے ایک یہ آیت ہے وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ میں انسان یا بشر کو مخاطب نہیں کیا بلکہ ''عباد'' کو مخاطب کیا ہے اور یہ سارا مضمون اللہ کے ''عبد'' سے تعلّق رکھتا ہے اس عبد سے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الذاریات کی اس آیت میں بھی کیا ہے۔

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذّٰریٰت : ۵۷) فرمایا میں نے انسان کو عبد بننے کے لئے پیدا کیا ہے اس لئے جو شخص حقیقتاً میرا عبد بننا چاہتا ہے اور میری صفات کا مظہر بننے کی خواہش رکھتا ہے اور اس کے لئے مجاہدہ کرنے کیلئے بھی تیار ہے تو اسے یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ مَیں اس کے بہت قریب ہوں۔

چنانچہ جب ہم عبد کی حقیقت یا عبد بننے کی حالت یا عبد بننے کی اہلیت کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک مادی وجود دیا اور اس کو بروئے کار لانے کیلئے مختلف قویٰ عطا فرمائے۔ مادّی قویٰ اور ان کی پرورش کے لئے بہت کچھ چاہیے تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے مادّی قویٰ اور بالواسطہ روحانی قویٰ کی پرورش کے لئے اس کائنات کو بنایا۔ اب کامل قویٰ (مادی لحاظ سے) عطا کرنا، پھر اُن کی ساری حکمتوں کو اور سارے پہلوؤں کو ذہن میں رکھ کر اُن کے لئے ضرورت کی ہر چیز کو پیدا کرنا یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ (ویسے تمثیلاً ہم اپنی زبان میں یہی کہہ سکتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ کی صفات تو بڑی مختلف ہیں۔ ہمیں سمجھانے کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں) پس باریک در باریک طاقتوں اور ان کی نشوونما کے لئے جس چیز کی ضرورت تھی اس کو پیدا کرنے کے لئے انتہائی قرب کی ضرورت تھی کیونکہ جو شخص دُور ہوتا ہے وہ کسی کی ضرورتوں کو پہچانتا اور سمجھتا ہی نہیں اس لئے وہ مادی قویٰ کی نشوونما کے لئے کچھ پیدا ہی نہیں کر سکتا یا اگر پیدا کر سکتا ہے تو وہ ادھوری چیزیں ہوتی ہیں۔ جس طرح مثلاً انسان کی نشوونما کے لئے جس حد تک اس کی ذمہ داری

ہے اس کے متعلق بھی ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ نقص پیدا ہو جاتا ہے یا بھول چوک ہو جاتی ہے۔ ماں اور مامتا کے باوجود اور باپ اپنے پیار کے باوجود تربیت اولاد میں غلطیاں کر جاتا ہے خواہ اولاد کی جسمانی تربیت ہو یا اخلاقی اور روحانی تربیت ہو مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے لوگو! تمہارے عبد بننے کے لئے جن طاقتوں اور جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی وہ ساری کی ساری تمہیں دے دی گئی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اُن کی کامل نشوونما کے لئے جس قسم کے مادی ذرائع کی ضرورت تھی، وہ بھی پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ پس ان طاقتوں اور صلاحیتوں کے علاوہ ان کی نشوونما کے لئے مادی ذرائع کا پیدا کر دینا بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بہت ہی قریب ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے مادّی قویٰ اور ان کی تربیت اور نشوونما کے لئے زمین وآسمان پیدا کئے۔ چنانچہ فرمایا: سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیۃ: ۱۴)

زمین وآسمان میں بے شمار چیزیں ہیں جو انسانی پیدائش سے بھی پہلے پیدا کی گئی ہیں۔ یہ پیدائش یعنی انسان کی قوتوں میں استعدادی کمال کا پایا جانا اور اُن کی نشوونما کے لئے ہر ضروری چیز کا موجود ہونا اللہ تعالیٰ کے قرب کی دلیل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے عبد بننے کے لئے صرف مادّی قویٰ کافی نہیں تھے۔ روحانی صلاحیتوں اور قوتوں کی بھی انسان کو ضرورت تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو روحانی صلاحیتیں بھی عطا فرمائیں۔

پس اللہ تعالیٰ کا عبد بننے کے لئے روحانی قوت اور استعداد کا پیدا کر دینا بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ انسان کے بہت قریب ہے۔

پھر جہاں تک روحانی قوتوں کا تعلّق ہے انسان از خود اُن سے کام نہیں لے سکتا اس لئے روحانی قوتوں کی کمال نشوونما کے لئے ہر آن ہدایتِ باری تعالیٰ کی ضرورت ہے۔

غرض تخلیق کائنات کا یہ ایک لمبا سلسلہ ہے جس کی طرف پہلی آیت میں اشارۃً ذکر کیا گیا ہے اور پھر وضاحت کے ساتھ اس مضمون کے متعلق قرآن عظیم میں ایک لمبا سلسلہ چلتا ہے۔ چنانچہ خالی یہی نہیں فرمایا کہ آدم کو ایک ہدایت دے دی اور انسان کو کہا کہ تم اس کے مطابق روحانی ترقیات کرتے چلے جاؤ بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت انسان کو اپنی نشوونما کے جس درجہ اور جس مقام پر پہنچنا تھا اور اس کے لئے جس قسم کی آسمانی ہدایت کی ضرورت تھی وہ ان کو دے دی گئی۔ پھر اس کے بعد

یکے بعد دیگرے انبیاء آئے۔ انسان دُنیوی لحاظ سے بھی اور روحانی لحاظ سے بھی ترقی کرتا چلا گیا۔ پس جہاں تک آسمانی ہدایتوں کا تعلق تھا اور زمین کے اندر قوتوں کے پیدا کرنے کا سوال تھا اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کے ہر مرحلے اور ہر درجے میں مختلف ہدایتیں نازل کرتا اور قوتیں پیدا کرتا رہا کیونکہ وہ ہر آن اتنا باخبر اور قریب ہے کہ انسان کی ہر بدلی ہوئی حالت کا اُسے علم ہوتا ہے ویسے تو وہ علّام الغیوب ہے۔ ہر چیز اس کے علم میں بھی ہے۔ یہ اور چیز ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کی توجہ بھی انسان کی طرف رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہر بدلی ہوئی حالت کے مطابق اس کی ضرورتوں کے پورا کرنے کا سامان پیدا کیا اور پھر بالآخر قرآن کریم کی شکل میں اُس نے ایک کامل ہدایت حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمائی۔ کیونکہ بعثت نبوی کے وقت انسان اپنے شعور میں اس مقام تک پہنچ چکا تھا اور انسان اس قابل ہو گیا تھا کہ ایک کامل ہدایت اور مکمل شریعت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھا سکے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے لوگو! تم دیکھتے نہیں۔ مَیں نے تمہارے لئے رمضان کے مہینے میں ایک ایسی ہدایت نازل کی ہے جو هُدًى لِّلنَّاسِ ہے جس میں سب بنی نوع انسان کے لئے ہدایت کے سامان موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ پہلی ہدایتیں محدود تھیں اور محدود ہونا بھی ایک نقص ہے اس لئے جب ہم پہلی ہدایتوں کو ناقص کہتے ہیں تو اس معنی میں ناقص کہتے ہیں کہ وہ محدود تھیں بوجہ اس کے کہ اس زمانے کی ضرورتیں محدود تھیں اور بوجہ اس کے کہ انسان اپنی مادی اور روحانی نشوونما میں اپنے کمال کو نہیں پہنچا تھا۔ اس لئے فرمایا اس قرآن عظیم کے ذریعہ وہ علم بیان کر دیئے گئے ہیں جن کا ذکر پہلی ہدایتوں میں نہیں ہے۔ یہ قرآن کریم ہی ہے جو ایک کامل ہدایت کی شکل میں نازل ہوا ہے۔ اس کے نزول سے پہلے انسان کے ذہنی، اخلاقی اور روحانی قویٰ اس قابل نہیں تھے کہ اُن کی نشوونما کے لئے کامل ہدایت نازل ہوتی۔

اس لئے اگرچہ بعض ہدایات کا انہیں اجمالاً علم دیا جاتا رہا لیکن مکمل علم نہیں دیا گیا کیونکہ وہ اس کو کماحقہٗ حاصل کرنے کے قابل نہیں تھے لیکن قرآن عظیم کے زمانے کا انسان اس قابل ہو گیا کہ وہ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى کا حامل بن سکے۔ چنانچہ وہ جو پہلی ہدایتوں میں اجمال پایا جاتا تھا قرآن کریم نے اس کی تفصیل بیان کی گویا انسان کو ایک ارفع مقام پر پہنچ جانے کی وجہ سے قرآن کریم کے ذریعہ

ہدایت کی نئی اور پُر حکمت باتیں بتائی گئیں یعنی وہ ہدایتیں جو مجملاً پہلوں کو دی گئی تھیں وہ تفصیل کے ساتھ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ بنی نوع انسان کو بتادی گئیں۔

پھر قرآن کریم کی تیسری خوبی یہ ہے کہ یہ فرقان ہے۔قرآن کریم نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ قریہ قریہ اور ملک ملک خدا کے رسول آئے۔اللہ تعالیٰ نے اُن کی ضرورتوں اور طاقتوں کے لحاظ سے انہیں آسمانی ہدایت عطا فرمائی۔ چنانچہ پہلے زمانہ میں رسولوں کی کثرت جہاں اللہ تعالیٰ کے قرب پر دلالت کرتی ہے۔ وہاں ضرورتوں اور استعدادوں میں اختلاف بھی ظاہر کرتی ہے ہر علاقہ بلکہ بعض دفعہ تو قریب کے دوشہروں کی ضرورت کے اختلاف کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے رسول مبعوث ہوئے تا کہ خدا کی آواز ہر جگہ پہنچ جائے۔ یہ کام ایک عظیم اور قریب ہستی ہی کر سکتی ہے اور وہی اس کا خیال رکھ سکتی ہے یعنی ہر زمانہ میں ہر علاقہ کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کا انبیاء کو بھیجنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر اور اس کا علم زمان ومکان کی وسعتوں پر محیط ہے۔

پس پہلے زمانہ میں انبیاء علیہم السلام نے اپنے اپنے ملک اور علاقہ کے حالات کے لحاظ سے اور اپنے قویٰ کی نشوونما اور اس کے استحقاق کے لحاظ سے جن چیزوں کو حاصل کیا، اُن میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے رسولوں کو جس ہدایت کی ضرورت تھی وہ اُن کو دی گئی۔ ہندوستان اور چین میں بسنے والوں کو جس ہدایت کی ضرورت تھی وہ ان کو دی گئی۔ ہر دو قسم کی ہدایت خدا کے رسول لے کر آئے مگر ان دونوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مذہبی دُنیا میں دوسرا اختلاف ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک ہدایت نازل ہوئی۔ اس کے ماننے والے مختلف الخیال ہو گئے ہر ایک گروہ نے اپنے مطلب کا ایک حصہ لے لیا اور اس پر فخر کرنے لگ گئے یعنی ایک ہی نبی کی اُمت جب بعد میں بگڑی تو اس نے آپس میں اختلاف کیا اور لوگ مختلف گروہوں میں بٹ گئے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قرآن کریم تمہارے لئے فرقان بن کر آیا ہے۔ وہ تمام مذہبی اختلافات خواہ پہلی قسم سے تعلق رکھتے ہوں یا دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہوں یہ اُن کو دور کرنے والا ہے۔ کیونکہ یہ فرقان ہے۔

جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے دراصل عبد کا لفظ اس آیت کے مفہوم کے سمجھنے کی کنجی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بننے کے لئے جس قسم کی ہدایت کی ضرورت تھی وہ ہدایت دے دی گئی یعنی انسان مختلف

مدارج میں سے گزرا ہے اُسے تاریخ کے مختلف مراحل میں مختلف قسم کی ہدایتوں کی ضرورت تھی وہ اسے دے دی گئیں اور اب اُسے ایک کامل ہدایت خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے۔اس ہدایت پر چلنے کیلئے ،اس کو اپنانے کے لئے اس کی روشنی میں بہ حصہ رسدی اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر کامل بننے کے لئے یعنی اپنی اپنی استطاعت کے مطابق مظہر صفاتِ باری بننے کے لئے اللہ تعالیٰ کے فیض کی ضرورت ہے دراصل انسان کا روحانی قویٰ کا مالک بن جانا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر جو قویٰ پیدا کئے ہیں اُن کی کمال نشوونما کے لئے صرف آسمانی ہدایتوں کا نازل ہونا ہی کافی نہیں ہے۔انسان اُن سے اس وقت تک فائدہ نہیں اُٹھا سکتا جب تک خدا تعالیٰ کا فضل اس کے شاملِ حال نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے فضل کو انسان دعاؤں کے ذریعہ جذب کرسکتا ہے.....

غرض تخلیق کائنات میں اللہ تعالیٰ کا یہی مقصد ہے جس کے پیش نظر اُس نے انسان کو دُنیا میں پیدا کیا۔اس کی قوتوں کی کمال نشوونما کے لئے زمین وآسمان پیدا کئے۔آسمان سے ہدایت نازل فرمائی۔ زبان حال کی دعائیں قبول ہوئیں اور اس رنگ میں پوری ہوئیں کہ انسانی زندگی کے ہر زمانے اور ہر مرحلہ پر یہ بات واضح اور عیاں ہوگئی کہ یہ قرآن کریم ہی جو انسان کو دینی اور دُنیوی ہر دو اعتبار سے صحیح اور حقیقی راہِ عمل دکھاتا ہے۔

غرض یہ کہ جب انسان کو روحانی قویٰ بھی مل گئے اور ایک کامل آسمانی ہدایت بھی مل گئی تو اُسے اپنی زبان سے یہ دعا بھی کرنی پڑے گی کہ اے خدا ہمیں صراطِ مستقیم بھی عطا فرما اور اس پر چلنے کی توفیق بھی بخش ہمیں اپنی صفات کا عرفان بھی عطا فرما اور ہمارے لئے الٰہی صفات کا مظہر بننے کے سامان بھی پیدا کر۔ایسی دعا اور التجا ایک ایسی ہستی ہی سے کی جاسکتی ہے جس کے متعلّق یہ یقین ہو کہ وہ قریب اور مجیب الدعوات ہے۔ چنانچہ یہ بزرگ و برتر ہستی اللہ تعالیٰ ہی کی ہے جس نے قرآن کریم میں فرمایا: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ جیسا کہ مَیں پہلے بتا چکا ہوں لفظ عبد قابل ذکر ہے چنانچہ انسان کی پچھلی تاریخ پر جب ہم غور کرتے ہیں تو تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے بہت قریب ہے اور وہی تاریخ روحانی طور پر بھی اللہ تعالیٰ کے فرمان اور انسانی فطرت کے مطابق بھی اور پھر عقلاً بھی یہ بتاتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنا عبد بننے کے لئے پیدا کیا ہے اور اس کے لئے دُعا کی ضرورت ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد چہارم صفحہ ۴۵۰ تا ۴۶۰)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ یہ بیان فرماتا ہے کہ قرآن کریم ایک عظیم کتاب ہے یہ ھُدًی ہے یعنی احکام شریعت پر مشتمل نازل کی گئی ہے ہدایت کے معنی اس آسمانی شریعت کے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے کسی محبوب نبی اور رسول کے ذریعہ دنیا میں نازل کرتا ہے تا کہ وہ اپنی استعداد کے مطابق اس کی طرف رجوع کر سکیں اور اس کے انعامات کو حاصل کر سکیں اور اس کا قرب پا سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بیان فرمایا ہے یہ ایک ایسی شریعت آسمانی ہے کہ لِلنَّاسِ جس کا تعلّق کسی ایک قوم یا کسی ایک ملک یا کسی ایک زمانہ کے ساتھ نہیں ہر زمان ومکان میں بسنے والے انسانوں سے اس کا تعلّق ہے یہ ان کے لئے ایک کامل اور مکمل شریعت ہے اور ہدایت کے دوسرے معانی کی رو سے اللہ تعالیٰ یہاں یہ بھی بیان فرماتا ہے کہ یہ ایک ایسی شریعت ہے کہ جو شخص ابتدا میں بعض باتوں کو سمجھتے ہوئے اس پر ایمان لاتا ہے اور اپنی سمجھ کے مطابق اس پر عمل کرتا ہے یہ کتاب اس کے دل پر مزید روحانی ترقی کا شوق پیدا کرتی ہے اور مزید روحانی ترقی کی تڑپ کو پورا کرنے کے سامان بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر وقت ایسے انسان کے ساتھ رہتا ہے اور اس کی روحانی راہ نمائی کرتے ہوئے بلند سے بلند مقام تک اسے پہنچاتا چلا جاتا ہے اور ایسے انسان کا اللہ تعالیٰ کے فضل سے انجام بخیر ہو جاتا ہے اور وہ اس کی رضا کی جنّت میں داخل ہو جاتا ہے۔

پھر فرمایا کہ یہ صرف ھُدًی لِّلنَّاسِ ہی نہیں بلکہ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى بھی ہے۔

واضح دلائل اور حکمتیں بتا کر اپنی شریعت (اپنے احکام کو) منوانے والی کتاب ہے دنیا میں بہت سے لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو دین العجائز کو اختیار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے حصہ وافر پاتے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے عقل اور فراست دی ہوتی ہے فکر اور تدبّر کے وہ عادی ہوتے ہیں اگر ان لوگوں کی تسلّی کا سامان بھی اس کتاب میں نہ ہوتا۔ تو وہ ٹھوکر کھا جاتے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ایسے ذہنوں کی ترقی کا سامان بھی اس میں کر دیا ہے یہ کتاب حکمت اور دلائل کے ساتھ اپنے احکام کو منواتی ہے اور یہ کتاب ایسی ہے جو فرقان ہے یعنی حق اور باطل میں تمیز کرنے والی ہے (جہاں تک اعتقادات کا سوال ہے) اور عملِ صالح اور ایسے عمل کے مابین جو فساد سے پُر ہو امتیاز کرنے والی ہے۔ اس کی تعلیم ہمیں بتا دیتی ہے کہ یہ اعمال ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کو محبوب ہیں اور یہ ایسے ہیں جن میں فساد پایا جاتا ہے اور فساد کو پسند کرنے والا اور فساد سے

پیار کرنے والا شیطان ہی انہیں پسند کر سکتا ہے۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی محبّت کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس قسم کے فساد والے اعمال سے تمہیں پرہیز کرنا ہوگا یہ کتاب عملِ صالح اور عمل غیر صالح (جسے عربی زبان میں طالح بھی کہا جاتا ہے) کے درمیان فرق کر کے دکھا دیتی ہے۔

پس یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قدر عظیم کتاب کو ہم نے رمضان کے مہینے میں نازل کرنا شروع کیا تھا شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ اور اسے (سارے کے سارے کو) اپنے اپنے وقت پر رمضان کے مہینے میں نازل کرتے رہے ہیں جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ماہ رمضان میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل علیہ السلام نزول فرماتے اور میرے ساتھ قرآن کریم کا دَور کیا کرتے۔ اس رمضان میں جتنا حصہ قرآن کریم کا نازل ہو چکا ہوتا اس کا دور نزول کے ذریعے جبرائیل علیہ السلام حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے ایک دفعہ پھر دوسری دفعہ پھر تیسری دفعہ نزول ہوتا رہتا تھا اور آخری سال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبرائیل علیہ السلام نے میرے ساتھ دو دفعہ قرآن کریم کا دور کیا ہے۔ غرض اتنی عظیم کتاب کا اس مہینے میں بار بار نزول ہونا اور پھر اسی مہینہ میں نزول ہونا بتاتا ہے کہ یہ ماہ بھی بہت سی برکتیں اپنے اندر رکھتا ہے پس فرمایا کہ یہ مہینہ وہ ہے جس کے بارہ میں قرآن کریم کے احکام بھی پائے جاتے ہیں اس کے علاوہ اس کا قرآن کریم کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے اور جو قرآنی برکتیں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کی ہیں جن کا اختصار کے ساتھ ابھی میں نے ذکر کیا ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم ان برکتوں کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو رمضان کی عبادتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤ۔

رمضان میں انسان رمضان کی عبادات یعنی روزہ وہ نوافل جو کثرت سے پڑھے جاتے ہیں اور وہ دینی مشاغل جن میں انسان مصروف رہتا ہے مثلاً سخاوت ہے کمزور بھائیوں کا خیال رکھنا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینہ میں اس طرف خاص توجہ فرماتے تھے۔ غرض وہ تمام عبادات جن کا تعلق رمضان سے ہے اگر تم بجالاؤ گے تو تین باتیں تمہیں حاصل ہو جائیں گی تین برکتوں کے تم وارث ہو گے اور وہ تین برکتیں یہ ہیں کہ تمہیں ہدایت ملے گی۔ ہدایت تمہارے دلوں میں بشاشت پیدا کرے گی اور یہ شوق پیدا کرے گی کہ ہدایت کے اس مقام پر ٹھہرنا تو ٹھیک نہیں جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ استعداد دی ہے کہ ہم ہدایت کی سیڑھیوں پر درجہ بدرجہ بلند سے بلند تر

ہوتے چلے جائیں تو پھر ہمیں آگے چلنا چاہیے اور مزید رفعتوں کو حاصل کرنا چاہیے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن کریم کے احکام اور اس شریعت کی برکت اور اس پر عمل پیرا ہونے کے نتیجہ میں تم اپنی ہدایت میں ترقی کرتے چلے جاؤ گے۔ رمضان میں یہ دروازے زیادہ فراخی کے ساتھ تمہارے اوپر کھولے جائیں گے پھر تم میں سے جو زیادہ سمجھدار اور فراست رکھتے ہیں اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے مانا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے کامل اور مکمل شریعت ہے اور ہم آنکھیں بند کر کے بھی اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن اے خدا جب تو نے ہمیں عقل اور فراست اور فکر اور تدبّر کا مادہ عطا کیا ہے تو ہماری ان قوتوں اور استعدادوں کو بھی تو تسلّی دے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں پر بھی رمضان کے مہینہ میں بَیِّنٰتٌ حکمتیں جو قرآن کریم کے احکام کی ہیں۔ وہ بھی کھولتا ہے علم قرآن اس رنگ میں بھی عطا کیا جاتا ہے اور رمضان کے مہینہ میں خاص طور پر عطا کیا جاتا ہے۔

پھر چونکہ یہ فرقان ہے ایسے شخص کو جو خلوص نیّت کے ساتھ رمضان کی عبادات بجالاتا ہے اور اس کی عبادات مقبول ہو جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرقان عطا کرتا ہے فرقان کا لفظ جب ہم انسان کے متعلّق استعمال کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے ایک نور عطا کرتا ہے اور اس نور کے استعمال کی توفیق عطا کرتا ہے اور وہ نور اسے قرب الٰہی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ نور ہی نور کی طرف جا سکتا ہے۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ زمینوں اور آسمانوں کا نور اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو رمضان کے مہینہ میں بہتر نور اور کثرت سے نور عطا کرتا ہے اور قرب کی راہیں اس پر کھولتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ اتنی برکتوں والا مہینہ ہے جو تمہاری روحانی اور جسمانی ترقیات کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے اس لئے ہم تمہیں یہ کہتے ہیں کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ جسے اللہ تعالیٰ زندگی اور صحت میں رمضان دکھائے اس کا فرض ہے کہ وہ رمضان سے فائدہ اُٹھائے اس لئے جو شخص بھی رمضان میں زندہ ہو اور صحت مند ہو وہ رمضان کے روزے رکھے اور دیگر عبادات بجالائے کیونکہ رمضان کی عبادت محض یہ نہیں کہ انسان بھوکا رہے بھوکا رہنے سے خدا کو یا خدا کے بندوں کو کیا فائدہ، اگر یہ شخص اس بھوکا رہنے کی حکمت کو نہیں سمجھتا اور اس کے لوازم کو ادا نہیں کرتا۔

رمضان کے مہینہ میں ہم خاص طور پر قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں اور نوافل کی ادائیگی کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص صحت میں رمضان کا مہینہ پائے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ رمضان کی برکتوں سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے روزے بھی رکھے۔ نوافل بھی ادا کرے غرباء کا خیال بھی رکھے خدا تعالیٰ کی راہ میں سخاوت کا مظاہرہ بھی کرے اپنے بھائیوں کی غمخواری اوران سے ہمدردی بھی کرے تمام بنی نوع انسان سے محبت کا سلوک کرے اور اپنی زبان کو اور دوسرے جوارح کو ان اعمال سے بچائے رکھے جو خدا تعالیٰ کو ناراض کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کثرتِ تلاوت اور کثرتِ نوافل اور روزے رکھنے کے نتیجہ میں ہدایت کے، بَيِّنٰتٌ کے اور نُوْرٌ مِّنَ اللّٰهِ کے سامان پیدا کرے گا۔

اللہ تعالیٰ یہاں بیان فرماتا ہے کہ جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو وہ کسی اور وقت رمضان کے روزوں کی گنتی کو پورا کرے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میرا ارادہ ہے کہ اس طرح میں اپنے بندوں کے لئے سہولت کے سامان پیدا کروں مومن وہی ہوتا ہے جو اپنے ارادہ اور خواہش کو چھوڑ دیتا ہے اور خدا کے ارادہ کو قبول کرتا ہے پس یہ مومن کی علامت ہے کہ وہ سفر میں اور بیماری میں اپنی شدید خواہش کے باوجود اپنی اس تڑپ کے باوجود کہ کاش میں بیمار نہ ہوتا یا سفر میں نہ ہوتا روزہ نہیں رکھتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ نیکی اس بات میں نہیں کہ میں بھوکا رہوں بلکہ نیکی یہ ہے کہ میں اپنے ارادہ کو خدا تعالیٰ کے ارادہ کے لئے چھوڑ دوں۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ میں ایک تو اس ارادہ کا اظہار کیا گیا ہے دوسرے اس ارادہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ میں نے رمضان کی عبادتیں تم پر اس لئے واجب کی ہیں اور قرآن کریم کی شریعت تم پر اس لئے نازل کی ہے کہ تم پر میرے قرب کی وہ راہیں کھلیں جو تمہاری روحانی خوشحالی کا باعث ہوں اور جو مشکلات تمہاری روحانی تشنگی کے نتیجہ میں پیدا ہوسکتی ہیں ان سے تم محفوظ ہوجاؤ۔ پس تمہیں اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ اس کے کئی معانی ہوسکتے ہیں لیکن ایک معنی یہ بھی ہیں کہ تا تمہاری زندگی کے یہ چند روز جو تم اس دنیا میں گذارتے ہو اپنے کمال کو پہنچ جائیں کمال کے معنی عربی میں یہ ہوتے ہیں کہ جس غرض کے لئے کوئی چیز پیدا کی گئی ہے وہ غرض پوری ہوجائے اور انسان کو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے خدا تعالیٰ کی بندگی اور عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ سارا انتظام

میں نے اس لئے کیا ہے کہ تا تم اس غرض کو پورا کر لو اور اپنے اس مقصد کو حاصل کر لو جس غرض کے لئے تمہیں پیدا کیا گیا ہے اور جو مقصد تمہارے سامنے رکھا گیا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اگر تم واقعہ میں خلوصِ نیت سے یہ عبادتیں بجالاؤ گے تو میری طرف سے ہدایت اور بینات اور نور کو حاصل کر لو گے لیکن شیطان خاموش نہیں رہے گا وہ کوشش کرے گا کہ تمہیں اس مقام سے گرا دے۔ پس اپنی ہدایت کو قائم رکھنے کے لئے اور ان نعماء کو زوال سے بچانے کے لئے جو اللہ تعالیٰ رمضان کے مہینہ میں تمہیں عطا کرے ایک گُر ہم بتاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ کہ ہدایت اور روشنی اور حکمت سیکھنے کے بعد تمہارے دل میں کبر نہیں پیدا ہونا چاہیے۔ تمہیں یہ خیال نہیں ہونا چاہیے کہ تم نے اپنی کسی خوبی کے نتیجہ میں اس مقام کو حاصل کیا ہے بلکہ جب بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت تم پر نازل ہو تُكَبِّرُوا اللّٰهَ تم اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور اس کی عظمت کو بیان کرو اور اپنے نفس کو بھول جاؤ اس طرح وہ نعمتیں جو تمہیں عطا کی جائیں گی انجام تک تمہارے ساتھ رہیں گی تمہارا انجام بخیر ہوگا اور یہ طریق ہے شکر ادا کرنے کا۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اس کے بغیر تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کر سکتے۔ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے فضل سے کوئی ہدایت یا بینہ یا کوئی نور عطا کرتا ہے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ تمہاری کسی خوبی کے نتیجہ میں تمہیں ملا ہے تو تم شکر کس کا ادا کرو گے تم اپنے نفس کا ہی شکر ادا کرو گے نا لیکن اگر تم اس یقین پر قائم ہو کہ جو ہدایت بھی ہمیں ملتی ہے صراط مستقیم کی شناخت کے رنگ میں یا حکمتوں کے نزول کے رنگ میں یا اُس نور کے رنگ میں جو آسمان سے نازل ہوتا ہے اور انسان کے دل کو منور کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کی راہوں کو کھولتا ہے یہ سب کچھ تمہاری کسی خوبی کے نتیجہ میں نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل کے نتیجہ میں ہے اور اس سے اس کی عظمت اور اس کی کبریائی ثابت ہوتی ہے پس اگر تم ہدایت پانے کے بعد خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کی کبریائی کا اعلان کرو گے اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کی کبریائی کو اپنے دلوں میں محسوس کرو گے اور اپنے نفس کو اس کی راہ میں مٹا دو گے تب تم شکر کرنے کے قابل ہو گے ورنہ تم شکر کے قابل نہیں ہو گے تمہارا شکر زبانوں پر تو ہوگا لیکن تمہارے دل اور تمہارے اعمال اور تمہاری روح اور تمہارے جوارح خدا تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کر رہے ہوں گے۔ پس اگر تم خدا تعالیٰ کا شکر گذار بندہ بننا چاہتے ہو تو جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں کوئی نعمت ملے تُكَبِّرُوا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور عظمت کا اعلان کرو اور اپنے دل اور سینہ میں اس عظمت

کے احساس کو زندہ اور اجاگر اور شدت کے ساتھ قائم کرو اور تم شکر گزار بندے بن جاؤ اور جب تم خدا تعالیٰ کے شکر گزار بندے بن جاؤ گے تو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے وہ تمہیں مزید نعمتیں عطا کرے گا مزید ترقیات کے دروازے تم پر کھولے گا مزید حکمتیں اور علوم قرآنی تمہیں عطا کرے گا اور تمہارے نور میں اور زیادہ نورانیت پیدا کرے گا اور پھر ایک حسین اور مفید چکر اور دائرہ قائم ہو جائے گا۔ تم خدا تعالیٰ سے نعماء حاصل کرتے رہو گے اور اپنی ہدایت اور اپنی فراست اور اپنی روحانیت کے نتیجہ میں ہر موقع پر اپنے نفس کو قربان کر کے اللہ ہی کی عظمت اور کبریائی کا اعلان کرو گے اور اس طرح اس کا شکر ادا کرو گے تو پھر وہ اور نعمتیں تمہیں دے گا پھر تم اور شکر ادا کرو گے تو وہ اور نعمتیں تمہیں عطا کرے گا۔ غرض رمضان کے مہینہ میں ایک ایسا دائرہ شروع ہو جاتا ہے جو غیر متناہی روحانی اور جسمانی، دینی اور دنیوی ترقیات کے دروازے کھولتا چلا جاتا ہے اور انسان کسی مقام پر ٹھہرتا نہیں اور انسان کا دشمن شیطان جو کبھی نفسِ امّارہ کی سرنگ سے اور کبھی بیرونی حملوں کے ذریعہ انسان کو خدا سے دور کرنا چاہتا ہے وہ اپنے تمام حملوں میں ناکام ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمیشہ ہی شیطانی حملوں سے بچائے رکھے اور محفوظ رکھے۔ (خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۹۶۸ تا ۹۷۴)

اس آیت میں یہ بتانے کے بعد کہ قرآن کریم کا رمضان کے مہینہ سے ایک گہرا تعلق ہے ہمیں اس طرف متوجہ کیا ہے کہ رمضان کے مہینہ میں تم تین برکات حاصل کر سکتے ہو اور ان برکات کے حصول کی طرف تمہیں متوجہ ہونا چاہیے۔ ایک یہ کہ قرآن کریم جس میں رمضان کی برکات کا ذکر ہے اور جو رمضان میں بار بار نازل ہوتا رہا ہے وہ ایک کامل ہدایت کے طور پر دنیا کی طرف بھیجا گیا ہے۔ رمضان میں جس حدّ تک ممکن ہو علیحدہ ہو کر قرآن کریم کی تلاوت کی طرف متوجہ ہونے کا ارشاد ہے اور ہر شخص قرآن کریم کی ہدایت یعنی وہ مذہبی تعلیم جو یہ لے کر آیا ہے اسے آسانی سے سمجھ سکتا ہے تو ایک تو یہ هُدًى لِّلنَّاسِ ہے ہر شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ قرآن کریم کی ہدایت کا جو حصہ ہے وہ آسانی سے سمجھ لے اس کی چند ایک مثالیں میں دوں گا سارا قرآن مجید اس ہدایت سے بھرا ہوا ہے مثلاً یہ کہ نماز پڑھو اپنی شرائط کے ساتھ اس حدّ تک ہر شخص سمجھ سکتا ہے بلکہ جو مسلمان نہیں وہ بھی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن کریم نے یہ ہدایت دی ہے کہ بعض مخصوص شرائط کے ساتھ التزام کے ساتھ نماز ادا ہونی چاہیے۔

قرآن کریم میں ایک ہدایت یہ بھی ہے کہ لَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ کہ ناجائز طریقوں

سے ایک دوسرے کے اموال سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا کریں ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ دوسروں کے اموال سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا اور دوسروں کے اموال کو ناجائز نقصان نہیں پہنچانا اس میں وسیع مضمون آجاتا ہے لیکن وسعت میں جائے بغیر اتنی بات کہ دوسروں کے اموال باطل راہوں سے کھانے نہیں میں سمجھتا ہوں کہ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے چھ سات سال کے بچے کے سامنے یہ تعلیم رکھیں تو وہ سمجھ جائے گا کہ قرآن کریم نے یہ ہدایت دی ہے ایک تو ہمیں اس طرف متوجہ کیا کہ ہر مسلمان کو قرآن کریم کی ہدایت کا علم ہونا چاہیے قرآن کیا کہتا ہے قرآن کس چیز سے روکتا ہے تو یہ ایسی چیز نہیں کہ جس کے متعلّق کوئی شخص کہے کہ چونکہ میں پڑھا ہوا نہیں اس لئے ہدایت کا میں علم حاصل نہیں کرسکتا جو پڑھا ہوا نہیں وہ سن کر اس بات کو سمجھ سکتا ہے مثلاً یہاں اس خطبہ کے دوران بھی بہت سے دوست ایسے ہیں کہ جن کو مروّجہ علم جو ہے اسے حاصل کرنے کی توفیق نہیں ملی لیکن وہ بھی اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات واضح ہے اور اس میں کوئی پیچیدگی نہیں پائی جاتی کہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ نماز اپنی شرائط کے ساتھ ادا کرو اور دوسروں کے اموال نہ کھایا کرو یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے چاہے وہ لکھنا پڑھنا جانتا ہے یا نہیں جانتا تو فرمایا یہ هُدًى لِلنَّاسِ ہے ہر شخص اس کی ہدایت کا علم حاصل کرسکتا ہے رمضان کے مہینہ میں کثرت سے تلاوت کرنی چاہیے اور اس نیت سے کرنی چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ قرآن کریم نے جو ہدایتیں دی ہیں ہمیں اس زندگی میں تاکہ یہاں کی زندگی بھی کامیاب ہو اور وہاں کی زندگی بھی پُرسکون اور راحت بخش ہو وہ کیا ہیں؟

دوسری بات جس کی طرف اس آیت میں توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ صرف ہدایت ہی نہیں دیتا بلکہ یہ حکیم کتاب ہے اور حکیم خدا کی طرف سے نازل کی گئی ہے وہ دلائل بھی دیتا ہے تو جن کو دلائل کے سمجھنے کی قوت اور استعداد حاصل ہو تو اس استعداد کو کام میں لاکر رمضان کے مہینہ میں قرآن کریم کی تلاوت کثرت سے کی جائے تو یہ حکمت معلوم کرنے کی بھی کوشش کریں جس سے قرآن کریم بھرا ہوا ہے۔

اور تیسری بات جس کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ فرقان بھی ہے یعنی حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے والا ہے اگر تم خلوصِ نیّت کے ساتھ اور تمام شرائط کو پورا کرتے ہوئے رمضان کے مہینہ میں قرآن کریم پر غور کرو گے اور اس پہلو کی برکت سے بھی حصہ لینے کی کوشش کرو گے تو تمہیں بھی ایک امتیازی مقام اللہ کی طرف سے حاصل ہوگا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ روزہ جو ہے اس روزے کے اندر رمضان کے اندر ساری چیزیں آتی ہیں خاص وقت تک خاص شکل میں کھانے پینے سے رکے رہنا خالی یہی روزہ نہیں ہے بلکہ بہت ساری اور باتیں رمضان سے تعلق رکھتی ہیں احکام رمضان سے تعلق رکھتی ہیں ان کو بجالانا اور خیال رکھنا کہ کوئی غلط چیز نہ ہو جائے تا کہ ہمارا روزہ کامل شکل میں ہمارے ربّ کے حضور پیش ہو۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ اگر اسی رنگ میں روزہ رکھا جائے اور خدا تعالیٰ اسے قبول کر لے تو اس کے نتیجہ میں تنویر قلب حاصل ہوتی ہے اور انسان کا دل منور ہو جاتا ہے یہی فرقان ہے اور اس سے کشف کا دروازہ کھلتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی مادی دنیا میں جس حد تک انسان کی سمجھ اور پہچان اور علم اور نظر اور بصارت میں آ سکتا ہے وہ آ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا دروازہ کھل جاتا ہے یہ تنویر قلب ہے جس پہ تمام اکابر صوفیاء کا اتفاق ہے کہ روزہ کے نتیجہ میں تنویر قلب حاصل ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسا زندہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے وجود کے نور کی نہریں ایسے لوگوں کے لئے جاری کرتا ہے اور اپنے نور کی لہریں انہیں دکھاتا ہے تنویر قلب ہوتی ہے جو حجابات ہیں وہ دُور ہو جاتے ہیں کشف الغطاء ہو جاتا ہے دل میں ایک نور پیدا ہوتا ہے جس حدّ تک انسان کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے ہر ایک نے اپنی استعداد کے مطابق اس نور کو حاصل کرنا ہے اور اس نور کی پیدائش کے بعد انسان کے اس منور دل کا اس ہستی کے ساتھ ایک زندہ اور پختہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے جو نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہے اور پھر وہ اس نور کے جلوے دیکھنے لگتا ہے یہ معنی ہیں تنویر قلب کے اور یہ معنی ہیں کشوف کے اور پہلا درجہ اس کا یہ ہے کہ ایسا شخص اَنَا الْمَوْجُوْدُ کی آواز سنتا ہے کیونکہ تعلّق کا پیدا ہو جانا کوئی فلسفہ تو نہیں یہ تو ایک حقیقت ہے یا اس کا عدم ایک حقیقت ہے کہ یا وہ تعلّق پیدا ہو گیا یا نہیں ہوا یہ کوئی فلسفیانہ خیال نہیں تو روزہ کے نتیجہ میں امتیازی مقام حاصل ہوتا ہے۔ روزہ کے نتیجہ میں وہ مقام حاصل ہوتا ہے جو انسان دوسرے مذاہب سے علیٰ وجہ البصیرت یہ بات کر سکتا ہے کہ ہم نے اسلام کی برکات سے جو نور حاصل کیا ہے وہ تمہیں حاصل نہیں اور ان چیزوں کے لئے پھر دعا کی ضرورت ہے۔ اسی واسطے ان آیات کے ساتھ ہی دعا کی طرف متوجہ کیا کہ اگر تم خلوصِ نیّت کے ساتھ اور کامل عاجزی کے ساتھ دعا کرو گے تو میں اسے قبول کروں گا میں نے بتایا تھا کہ هُدًى لِّلنَّاسِ والا حصہ جو ہے یعنی ہدایت کا معلوم ہو جانا وہ عام ہے ہر

شخص اسے سمجھ سکتا ہے لیکن اس ہدایت پر عمل کرنے کی توفیق پانا مشکل ہے جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ توفیق حاصل نہ ہو تو اگر چہ ہدایت کا سمجھ لینا، علم کا حاصل کر لینا آسان ہے لیکن ہدایت پر عامل ہو جانا بڑا مشکل ہے اس لئے ہمیں دعا کی ضرورت ہے جب تک دعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کو ہم حاصل نہ کریں ہدایت کی راہوں کا علم ہو جانے کے باوجود بھی ہدایت کی ان راہوں پر چلنے کے ہم قابل نہیں ہوتے۔

پھر بَيِّنٰت یعنی حکمت کی باتیں ہیں اس کا تو ہے ہی دعا کے ساتھ تعلّق اپنا تو اس میں کوئی ہے ہی نہیں یعنی جو عام استعداد انسان کو خدا نے دی ہے اس استعداد اور عقل کے نتیجہ میں ہدایت کو حاصل کیا ہے اس پر عمل کرنے کے لئے دعا سے اللہ کی توفیق پانا ضروری ہے لیکن حکمت کی باتیں، رموز جو ہیں ہدایت کے اندر چھپے ہوئے کہ کیوں یہ احکام دیئے گئے ہیں ان کا تعلّق دعا صرف دعا سے ہے قرآن کریم سے علوم کا حاصل ہو جانا طہارت پر منحصر ہے لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ:۸۰) اور وہ تزکیۂ نفس جس کے نتیجہ میں قرآن کریم کے علوم کھلتے ہیں وہ بازار سے نہیں خریدے جا سکتے نہ کسی مدرس سے حاصل کئے جا سکتے ہیں وہ تو خدا تعالیٰ سے ہی مل سکتے ہیں اور دعاؤں سے ہی حاصل کئے جا سکتے ہیں پھر تنویر قلب یعنی پردوں کا ہٹ جانا اور خدا کے نور کا سامنے آ جانا اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق جو دل میں نور پیدا ہوا ہے اس کا اس نور کے ساتھ جو نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہے ملاپ پیدا ہو جانا یا اَنَا الْمَوْجُوْدُ کی آواز سن لینا یہ تو محض اللہ تعالیٰ کے فضل پر ہے اور اسے بھی دعا سے حاصل کیا جا سکتا ہے تو یہ تین چیزیں جن کی طرف اس آیت میں ہمیں متوجہ کیا گیا ہے ہر سہ کے ساتھ دعا لگی ہوئی ہے هُدًى لِّلنَّاسِ والے حصہ کے ساتھ بھی، بَيِّنٰت کے حصہ کے ساتھ بھی، اور فرقان کے حصہ کے ساتھ بھی اسی وجہ سے اکابر مسلمان رمضان کے مہینہ میں ہمیشہ دعاؤں پر بڑا زور دیتے رہے ہیں۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۳۹۸ تا ۴۰۲)

قرآن کریم کا ماہ رمضان سے بڑا گہرا تعلّق ہے اور ماہ رمضان ہمیں ایک موقعہ عطا کرتا ہے کہ ہم قرآن کریم کی ان تین اصولی برکات سے زیادہ سے زیادہ حصّہ لے سکیں استفادہ کر سکیں جو اس آیہ کریمہ میں بیان ہوئی ہیں۔ کثرتِ تلاوت (هُدًى لِّلنَّاسِ) قرآنی تعلیم اور شریعت کے احکام سامنے لائے گی اور انسان کا ذہن انہیں یاد رکھے گا کثرت فکر و تدبّر اور دعاؤں کی کثرت اور عاجزی اور انکساری کا

تحفہ اپنے ربّ کے حضور پیش کرنے سے قرآن کریم کی حکمتیں اور اسرارِ روحانی ایسے شخص پر کھلیں گے نیز اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ایسے سامان پیدا کر دے گا کہ ہر شخص اپنی استعداد اور اخلاص اور صدق و وفا کے مطابق ایک ایسے مقام کو حاصل کرے گا جو اسے غیروں سے ممتاز کر دے گا۔

آج میں هُدًى لِّلنَّاسِ کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں قرآن کریم میں سات سو احکام ہیں اور ان میں سے ہر ایک حکم کو جاننا اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنا ایک مسلمان کا فرض ہے جو شخص جان بوجھ کر (اگرچہ وہ بعض احکام بجالا رہا ہو) بعض احکام کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کا نافرمان اور اس کے غضب کے نیچے ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس مضمون کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”تم ہوشیار رہو اور خدا کی تعلیم اور قرآن کی ہدایت کے برخلاف ایک قدم بھی نہ اٹھاؤ۔ میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ جو شخص قرآن کے سات سو حکم میں سے ایک چھوٹے سے حکم کو بھی ٹالتا ہے وہ نجات کا دروازہ اپنے ہاتھ سے اپنے پر بند کرتا ہے حقیقی اور کامل نجات کی راہیں قرآن نے کھولیں اور باقی سب اس کے ظِلّ تھے۔ سو تم قرآن کو تدبّر سے پڑھو اور اس سے بہت ہی پیار کرو ایسا پیار کہ تم نے کسی سے نہ کیا ہو کیونکہ جیسا کہ خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا اَلْخَيْرُ كُلُّهٗ فِي الْقُرْاٰنِ کہ تمام قسم کی بھلائیاں قرآن میں ہیں یہی بات سچ ہے افسوس ان لوگوں پر جو کسی اور چیز کو اس پر مقدم رکھتے ہیں تمہاری تمام فلاح اور نجات کا سرچشمہ قرآن میں ہے کوئی بھی تمہاری ایسی دینی ضرورت نہیں جو قرآن میں نہیں پائی جاتی تمہارے ایمان کا مصدّق یا مکذّب قیامت کے دن قرآن ہے اور بجز قرآن کے آسمان کے نیچے اور کوئی کتاب نہیں جو بلا واسطہ قرآن تمہیں ہدایت دے سکے خدا نے تم پر بہت احسان کیا ہے جو قرآن جیسی کتاب تمہیں عنایت کی“۔ (کشتی نوح، روحانی خزائن جلد نمبر ۱۹ صفحہ ۲۶۔۲۷)

قرآن کریم کے ان سات سو احکام میں سے اس وقت پہلے تو میں یہی بیان کروں گا کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ کہ جو شخص بھی صحت کی اور روزے کی بلوغت کی حالت میں رمضان کا مہینہ پائے تو اس کا فرض ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی بتائی شرائط کے مطابق روزہ رکھے۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۴۰۶، ۴۰۷)

آج میں بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی دوسری برکت جس کا ذکر اس نے اس آیت میں کیا ہے یہ بیان ہے کہ قرآن کریم صرف ہدایت کی راہ ہی نہیں بتاتا بلکہ حکمت بھی بتاتا ہے دلائل بھی دیتا ہے اوران ہدایت کی راہوں سے جو چیزیں یا ماحول کے دباؤ لے جانے والے ہیں ان پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور ہمیں ان غلط راہوں کے فساد پر آگاہ کرتا ہے اور جو نیکیاں ہیں ان کو بھی بیان کرتا ہوں اصولاً تو وہ ایک ہی ہیں لیکن حالات اور زمانہ کے لحاظ سے عملِ صالح بھی بدلتے رہتے ہیں مثلاً جس وقت منکرِ اسلام نے تلوار سے اسلام کو مٹانا چاہا اس وقت ایک مسلمان کی ذمہ واری کچھ اور تھیں اور جب اس میں ناکام ہو کر ہر قسم کے دجل کے حربوں کو اس کے خلاف استعمال کیا گیا تو اسی وقت ایک مسلمان کی ذمہ داریاں پہلی ذمہ واری سے مختلف ہو گئیں گو اصولی طور پر ان کی ایک ہی ذمہ داری رہی کہ اپنا سب کچھ قربان کر کے اسلام کا دفاع اور اسلام کو غالب کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ اصولی ذمہ واری ہے لیکن ایک زمانہ میں اس اصولی ذمہ واری کی کچھ اور شکل تھی اور دوسرے زمانہ میں اس اصولی ذمہ واری کی شکل کچھ اور بن گئی غرض قرآن کریم نے اپنے احکام کی حکمت اور دلائل بیان کئے قرآن کریم کے اسی فقرہ یا اسی حصہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اور اس کے معنی بیان کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قرآن کریم جو تعلیم دیتا ہے اس کی صداقت کی وجوہات پہلے دکھلا لیتا ہے اور ایک مطلب اور مدعا کو حجج اور براہین سے ثابت کرتا ہے اور ہر ایک اصول کی حقیّت پر دلائل واضح بیان کر کے مرتبہ یقینِ کامل اور معرفتِ تام تک پہنچاتا ہے اور جو جو خرابیاں اور ناپاکیاں اور خلل اور فساد لوگوں کے عقائد اور اعمال اور اقوال اور افعال میں پڑے ہوئے ہیں ان تمام مفاسد کو روشن براہین سے دُور کرتا ہے پھر اسی تسلسل میں آگے جا کر اصولی طور پر آپ نے بیان کیا۔

”بینائی دلی اور بصیرت قلبی کے لئے ایک آفتاب چشم افروز ہے اور عقل کے اجمال کو تفصیل دینے والا اور اس کے نقصان کا جبر کرنے والا ہے“۔(براہین احمدیہ ہر چہار حصص روحانی خزائن جلد ا صفحہ ۸۲)

اور اس آیت کے ایک معنی یہی ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہاں بیان کئے ہیں کہ قرآن کریم ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق اپنے احکام کی حکمتیں اور اس زمانہ کے فساد کو دور کرنے کے لئے جن دلائل کی ضرورت ہے وہ اپنے اندر رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے

ایسے لوگ کھڑے کئے جاتے ہیں جنہیں یہ دلائل سکھائے جاتے ہیں پس اس برکت سے حصہ لینے کے لئے انتہائی جہادِ تزکیہ نفس کے حصول کے لئے اور نہایت متضرعانہ دعائیں اس مجاہدہ کی قبولیت کے لئے ضروری ہیں کیونکہ جب تک اللہ تعالیٰ فضل نہ کرے کوئی شخص اپنی طاقت یا زور یا علم یا فراست یا عقل سے خدا کی نگاہ میں اپنے آپ کو پاک اور مطہر نہیں بنا سکتا اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ فضل کرتا ہے اور جو اس کے فضل سے طہارت اور تزکیہ کے نہایت ہی اعلیٰ مقام کو حاصل کر لیتے ہیں اور ان پر قرآنی انوار اور قرآنی اسرار اور قرآنی معارف کے دروازے کچھ اس طرح کھولے جاتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک خارقِ عادت حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے میں حضور کا ایک اقتباس اس وقت پڑھوں گا لیکن اس کے پڑھنے سے قبل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم نے خود اس مضمون کو بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَ لِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَ لِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (الانعام:۱۰۶)

یعنی ہم نے قرآن کریم کی آیتوں کو کئی طرح پھیر پھیر کے دنیا کے سامنے رکھا ہے۔ایک نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ تو اس طرح ہے کہ مختلف طبائع کو اپیل کرنے والی جو باتیں تھیں وہ مختلف طبائع کے لحاظ سے قرآن کریم نے بیان کر دیں تا کہ کوئی طبیعت خدا کے حضور یہ نہ کہے کہ میری فطرت کو تو تُو نے ایسا پیدا کیا تھا لیکن اس کے مطابق مجھے دلیل نہیں دی گئی اور ایک یہ ہے کہ زمانہ کی ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں سے نئے سے نئے دلائل اور نئے سے نئے حجج اور براہین لوگوں کو بتاتا رہتا ہے اور جن کو وہ یہ دلائل اور براہین سکھاتا ہے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ظِلّی طور پر معلّم بنا دیتا ہے اور اس معلم کا کام یہ ہے کہ دَرَسْتَ تو لوگوں کو سکھلا دے ان کے سامنے بیان کر دے لیکن صرف یہ درس کافی نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ لِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ اور اس کے علاوہ ایک اور سلسلہ ہم نے یہ جاری کیا ہے کہ ایسے علماء ربّانی پیدا ہوتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی خشیت سے معمور اور اس کے تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر قائم ہوتے ہیں اور لِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ اللہ تعالیٰ ایسے علماء کی جماعت کے لئے قرآنی آیات کو کھول کر بیان کر دیتا ہے وہ مطہّر نفس دنیا میں آ کر قرآن کریم کے اسرار کو حاصل کرتے اور پھر ان کا درس دیتے ہیں۔اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو معلم حقیقی کے کامل ظِلّ ہیں احکامِ قرآنی کو کھول کر بیان کرتے ہیں پس معلم تو

اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے لیکن اس دنیا میں اگر کوئی کامل ظِلّ معلم کی حیثیت میں پیدا ہوا تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (الجمعة: ۳) کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اَن پڑھ قوم میں انہی میں سے ایک فرد کو رسول بنا کر بھیجا ہے جو رسالت کے ارفع واعلیٰ مقام پر فائز ہے يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وہ تمام احکام شریعت ان کے اوپر پڑھتا ہے جس بات کا هُدًى لِّلنَّاسِ کے ساتھ تعلق ہے اس کو وہ کھول کر ان کو بتاتا ہے قرآن کریم فرماتا ہے کہ رمضان کے مہینہ میں روزے رکھو دوسری شرائط کو پورا کرو، شور وغوغا نہ کرو، گالیاں نہیں دینی اپنی پوری توجہ قرآن کریم اور اس کی برکات کے حصول کی طرف پھیرنی ہے اپنے نفس کو (اس ماہ میں خصوصاً) مارنے کی کوشش کرنی ہے اور اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں جس مقام کا ذکر ہے اپنی استعداد کے مطابق اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہے وَ يُزَكِّيْهِمْ پھر اپنی قوتِ قدسیہ کے نتیجہ میں وہ ان کے نفوس میں بھی تزکیۂ نفس پیدا کرتا ہے جب یہ تزکیۂ نفس پیدا ہو جاتا ہے یعنی آپؐ کی قوتِ قدسیہ سے فائدہ اُٹھا کر اور آپؐ کے اُسوہ پر عمل کر کے انسان خدا کی نگاہ میں محبوب اور پیارا اور مطہّر بن جاتا ہے تو پھر وہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ کے اسرارِ روحانی ان کو سکھاتا ہے وَ الْحِكْمَةَ اور اس قرآن عظیم کی حکمت کی باتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض کے طفیل ان پر ظہور ہونے لگ جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے کامل اور مکمل ظِلّی معلّم کے فیوض جاری ہوتے ہیں اور قیامت تک ایسے لوگ آپ کے فیض کے نتیجہ میں پیدا ہوتے رہیں گے جس طرح آپ ہی کے فیض کے نتیجہ میں آپ سے قبل آدم سے لے کر آپ کے زمانہ تک خدا تعالیٰ کے مقرب پیدا ہوتے رہے غرض اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ تزکیۂ نفس کے بعد ہی تعلیم الکتاب کا امکان پیدا ہوتا ہے اس کے بغیر نہیں۔ (خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۴۱۶ تا ۴۱۹)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن کریم کا رمضان کے مہینہ سے بڑا گہرا تعلق ہے قرآن کی اصولی برکات میں سے جو فرقان ہونے کی برکت ہے اس سے بھی اگر تم چاہو اور مجاہدہ کرو تو رمضان کے مہینہ میں زیادہ حصہ لے سکتے ہو فرقان کے معنی ہیں وہ چیز جو حق و باطل میں ایک امتیاز پیدا کردے قرآن کریم کے متعلق جب فرقان کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کے یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ یہ ایک کامل اور مکمل ہدایت ہے جو ہر غلط اعتقاد کی نشان دہی بھی کر رہی ہے اور ہر صحیح اعتقاد کی طرف راہ نمائی بھی کر رہی ہے اور اعتقادات کے لحاظ سے حق اور صداقت اور باطل کے درمیان ایک نمایاں امتیاز پیدا کر دیتی

ہے اسی طرح یہ ایسی کامل شریعت ہے جو صدق اور کذب کے درمیان بڑے نمایاں طور پر ایک امتیاز پیدا کرتی ہے ایک سمجھدار کو سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ دکھا دیتی ہے اسی طرح جہاں تک اعمال کا تعلق ہے قرآنی تعلیم بتاتی ہے کہ کس قسم کے اعمال اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صالح اور حمید ہیں اور کس قسم کے اعمال اور کون سے اعمال خدا تعالیٰ کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہیں اور چونکہ یہ ایک کامل اور مکمل ہدایت نامہ ہے اس لئے یہ کتاب بڑی تاثیروں کی مالک ہے اس کتاب سے پہلے بھی شریعتیں نازل ہوتی رہی ہیں لیکن اضافی طور پر قرآن کریم کے مقابلہ میں وہ ناقص تھیں۔ جب انسان اپنی روحانی اور اخلاقی ترقی میں انتہائی مدارج تک پہنچ گیا اور انسان کی بحیثیت انسان استعدادِ روحانی اس قابل ہوگئی کہ وہ کامل شریعت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا سکے تو اس وقت قرآن کریم کا نزول ہوا اور اس نے ہر قسم کے غلط اور صحیح، سچ اور جھوٹ، اعمال صالحہ اور ناپسندیدہ اعمال کے درمیان ایک فرق اور امتیاز پیدا کیا پہلی کتب گو اپنے زمانہ کے لحاظ سے کامل کتابیں تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو حق و باطل میں ہر قسم کا امتیاز پیدا کرنے والی ہو اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ہم سے یہ وعدہ کیا ہے۔ اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (الانفال: ۳۰) اگر تم اپنی راہ نمائی کے لئے قرآن کریم کو چنو گے اور پسند کرو گے اور اختیار کرو گے تو تمہیں بھی ایک امتیازی مقام دیا جائے گا اور تمہیں اللہ تعالیٰ حق و باطل میں امتیاز کرنے کی توفیق دے گا اور قرآن کریم کی روحانی برکات کے طفیل تمہیں ایک نور عطا کیا جائے گا جو صحیح کو غلط سے اور ظلمت کو روشنی سے جدا کرتا چلا جائے گا اور تمہاری راہ کو سیدھا اور آسان کر دے گا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس روحانی تاثیر کے متعلق بہت کچھ لکھا اور فرمایا ہے لیکن میں نے اس موقعہ کے لئے ایک مختصر سا حوالہ لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

''پھر چوتھا معجزہ قرآن شریف کا اس کے روحانی تاثیرات ہیں جو ہمیشہ اس میں محفوظ چلے آتے ہیں یعنی یہ کہ اس کی پیروی کرنے والے قبولیت الٰہی کے مراتب کو پہنچتے ہیں اور مکالمات الٰہیہ سے مشرف کئے جاتے ہیں خدائے تعالیٰ ان کی دعاؤں کو سنتا اور انہیں محبت اور رحمت کی راہ سے جواب دیتا ہے اور بعض اسرارِ غیبیہ پر نبیوں کی طرح ان کو مطلع فرماتا ہے اور اپنی تائید و نصرت کے نشانوں سے دوسری مخلوقات سے انہیں ممتاز کرتا ہے (یعنی ان کیلئے ایک فرقان بنا دیتا ہے) یہ بھی ایسا نشان ہے جو قیامت تک

اُمّتِ محمدیہ میں قائم رہے گا''۔(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۲۲)

غرض اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا کہ قرآن کریم میں بہت بڑی روحانی تاثیرات پائی جاتی ہیں اور تم اپنی زندگیوں کو قرآن کریم کی ہدایات کے مطابق ڈھالو اور ان احکام کے مطابق اپنی زندگی کے دن گزارو جو قرآن نے بتائے ہیں اس کے نتیجہ میں ایک طرف تو تمہاری عقل میں جلا پیدا ہو جائے گا اور دوسری طرف جتنا جتنا تقویٰ تم حاصل کرو گے جس قدر مقام قرب کو تم پالو گے اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے رموز تم پر کھولے گا اور تمہیں اپنا مقرب بنالے گا وہ ایک امتیازی نشان تمہیں دے گا یہ ممتاز مقام ایک مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتا ہے ایک مسلمان کی ہر حرکت اور سکون میں ہمیں ایک امتیاز نظر آتا ہے اللہ تعالیٰ نے ہر حرکت اور سکون کے متعلق ہماری راہ نمائی فرمائی ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۴۲۴، ۴۲۵)

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ہمیں اس طرف توجہ دلائی ہے کہ دیکھو میں تم سے بڑا ہی پیار کرنے والا ہوں میں نے جو احکام تمہیں تمہاری ترقیات کے لئے دیئے ہیں ان میں اس بات کو مدِّ نظر رکھا ہے کہ تمہارے لئے کوئی تنگی نہ پیدا ہو بلکہ آسانی اور سہولت کے ساتھ تم ان ذمہ داریوں کو بجالاتے رہو جو تم پر ڈالی گئی ہیں (یہ اور بات ہے کہ کبھی فطرت بہانہ سہولت کو بھی تنگی سمجھنے لگتی ہے اور انعام کو بھی ایک کوفت محسوس کرتی ہے)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے احکام بھی دیئے ہیں وہ اس لئے دیئے ہیں کہ ہم جسمانی لحاظ سے بھی اور دنیوی زندگی میں بھی اور روحانی طور پر بھی اور اُخروی زندگی میں بھی فلاح کو حاصل کریں اور ان احکام میں اس بات کو مدِّ نظر رکھا ہے کہ ہمارے لئے تنگی اور مجبوری کے حالات نہ پیدا ہوں اور ایسا نہ ہو کہ انسان کو یہ احساس ہو کہ مجھ میں ان احکام کو بجالانے کی قوت اور طاقت تو نہیں ہے لیکن میرا ربّ مجھ سے یہ مطالبہ کر رہا ہے۔

چونکہ یہاں ہمارا محبوب آقا ہمیں رمضان کے متعلق ہدایات دے رہا ہے اس لئے اس نے دو چیزوں کو ہمارے سامنے رکھا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر تم مریض ہو یا سفر پر ہو تو پھر رمضان کے روزے نہیں رکھنے اور جب ہم اسلام کی اور قرآن کریم کی مجموعی تعلیم پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے دیکھو اگر تم مریض ہو تو میں نے مریض کے بہت سے حقوق

قائم کئے ہیں اور اگر تم سفر پر ہو تو میں نے مسافر کے بہت سے حقوق قائم کئے ہیں لیکن ان تمام حقوق کے باوجود گھر میں جو آرام و آسائش ہے وہ سفر میں نہیں مل سکتا اس لئے میں تمہارے لئے سہولت پیدا کرتا ہوں اور تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم سفر میں ہونے کی حالت میں رمضان کے روزے نہ رکھو جو شخص اللہ تعالیٰ کی اس سہولت کی قدر نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کے اس پیار کو نہیں سمجھتا وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قدر محبت اور پیار کا سلوک ہم سے کیا ہے کہ انسان شرم کے مارے اپنی گردن جھکا لیتا ہے اور پھر وہ گردن جھکی ہی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کی پیشانی نیستی کے آثار لئے اپنے ربّ کے حضور سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بہت سے حقوق سفر کا ذکر کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیاتِ قرآنیہ کی نہایت ہی حسین تفسیر بیان کی ہے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں یہ فرماتا ہے کہ کامل نیک وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں اور اس کی رضا کے حصول کے لئے مسافر پر اپنا مال خرچ کرتا ہے سورہ بقرہ ہی کی آیت ۲۱۶ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے جو اموال تم خرچ کرتے ہو یا دوسری نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہیں مثلاً وقت ہے خدمت کرنے کی اہلیت ہے (یہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہیں) اور تم اس کی رضا کے حصول کے لئے اس راہ میں خرچ کرتے ہو ان میں مسافروں کا بھی حق ہے یعنی اگر تم مسافر پر ان چیزوں کو خرچ کرو گے تو اس مسافر پر تمہاری طرف سے احسان نہیں ہوگا بلکہ یہ اس کا حق ہے جو تم ادا کر رہے ہو گے سورۂ نساء کی ۳۷ ویں آیت میں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مسافر کے ساتھ بہت احسان کا سلوک کرو اور سورۃ الاسراء کی ۲۷ ویں آیت میں تو اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو کھول کر بیان کر دیا ہے کہ مسافر کو اس کا حق دو اور اسراف کا رنگ اختیار نہ کرو جیسا کہ فرمایا۔ وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا (بنی اسرائیل: ۲۷) یعنی اسراف سے ورے ورے مسافر کی ہر ضرورت کا خیال کرو یہ تو نہیں کہ مسافر کی خاطر اور اس کی خدمت میں خدا تعالیٰ کے دوسرے احکام کو انسان بھول جائے اسراف سے ورے ورے، ہر خدمت جو ممکن ہو سکتی ہے وہ مسافر کی کرو۔

غرض اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کا حکم دینے کے بعد فرمایا کہ دیکھو جب تم سفر میں ہوتے ہو تو ہم نے تمہارے لئے کس قدر آرام کا ماحول پیدا کیا ہے ہم نے تمہارے بھائیوں کو کہا ہے کہ تم

ہماری محبت کی وجہ سے اور ہماری رضا کے حصول کے لئے جو اموال خرچ کرتے ہو ان میں مسافر کا بھی حق ہے ہم نے اس خرچ کو تمہارا حق قرار دیا ہے اور تمہارے بھائیوں سے مطالبہ کیا ہے کہ تمہارا حق تمہیں ادا کیا جائے پھر یہی نہیں کہ تمہارا حق ادا کیا جائے بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ حق سے زائد دو احسان کرو اور بہت احسان کرو اور اس قدر احسان کرو کہ اسراف سے ورے ورے ہر ممکن خدمت اس کی بجالاؤ۔

ان تمام باتوں کے باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ پھر بھی سفر میں تمہیں تمہارے جیسی سہولت نہیں ملے گی ہم تمہارے لئے سہولت چاہتے ہیں اس لئے ہم نے تمہیں اجازت دے دی ہے اور کہا ہے کہ رمضان کے روزے سفر کی حالت میں نہ رکھا کرو اب دیکھو یہ کتنی پیاری تعلیم ہے اور کس قدر محبت کا اظہار ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم سے کیا ہے۔ اس محبت اور پیار کے اظہار کی وجہ سے ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ایک تو ہم ہر وقت خدا تعالیٰ کی حمد کرتے رہیں خدا تعالیٰ کی کبریائی ہر آن بیان کرتے رہیں اور دوسرے خدا تعالیٰ کی کامل صفات کو ہر وقت اپنے تصوّر میں رکھیں اور جس محبّت کا وہ ہم سے اظہار کرتا ہے اس کا جواب اسی قسم کی محبت سے دیں انسان بشری کمزوریوں سے تو بچ نہیں سکتا لیکن اپنے ماحول میں جس قدر پیار کسی سے کر سکتا ہے جس قدر محبت وہ کسی سے کر سکتا ہے وہ سب سے زیادہ پیار اور محبت شکر کے طور پر اپنے ربّ سے کرے چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت دی ہے اور پھر ہدایت کے ساتھ ہماری سہولتوں اور آسانیوں کا خیال رکھا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم کسی موقع پر بھی کمزوری نہ دکھائیں اور اس کی حمد کرتے ہوئے ان سہل راستوں پر جو مستقیم راستے ہیں اس کے قرب کی طرف بڑھتے چلے جائیں (صراطِ مستقیم ہی ایک سہل راستہ ہے کیونکہ جو چکر اور بل کھاتا ہوا راستہ ہے وہ سہل نہیں ہوا کرتا جو راستہ ایک میل مسافت طے کرانے کی بجائے دس میل کی مسافت طے کرا کے منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے وہ سہل نہیں ہو سکتا)۔

غرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں چونکہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہوں اس لئے میں نے تمہارے لئے ایک صراط مستقیم بنا دیا ہے اور اس راستہ پر بھی جگہ بہ جگہ تم ایسے احکام پاؤ گے کہ جو تمہاری سہولت کا سامان پیدا کر دیں گے تم اس راستہ پر چلتے ہوئے رمضان کے روزے رکھو گے تو تمہارے کانوں میں تمہارے ربّ کی نہایت ہی محبّت بھری آواز آئے گی کہ اگر تم سفر پر ہو تو روزہ نہ

رکھنا میں تمہاری سہولت کے سامان پیدا کرنا چاہتا ہوں اگر مریض ہو (طبیعت بہانہ جُو نہ ہو) انسان واقعہ میں مریض ہو اور ڈاکٹر کہتا ہو کہ روزہ تمہاری صحت کو مستقل طور پر خراب کر دے گا یا تم اس روزے کو برداشت نہیں کر سکتے یا تمہارے لئے مثلاً ہر دو یا تین گھنٹے کے بعد دوا کھانا ضروری ہے تو تم روزے نہ رکھو پھر بعض ایسے مریض بھی ہوتے ہیں جن کو ڈاکٹر کہتا ہے کہ ہر دو گھنٹہ یا تین گھنٹہ کے بعد تم کچھ کھاؤ ورنہ تم مرجاؤ گے ان کی کانسٹی ٹیوشن (Constitution) یعنی جسم کی بناوٹ ایسی ہوتی ہے کہ ان کے معدہ میں غذا نہیں رہتی یہ مستقل نیم بیماری کی قسم ہے ان کو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھانے کی ضرورت پڑتی ہے ایسے مریضوں کو ڈاکٹر کہے گا کہ اگر تم نے اپنی صحت کو برقرار رکھنا ہے اور خود اپنے آپ کو جسمانی طور پر ہلاکت میں نہیں ڈالنا تو تمہیں ہر دو تین گھنٹہ کے بعد کچھ کھانا چاہیے پھر بعض بیماریاں ایسی ہیں جن میں خون کی شکر کم ہو جاتی ہے اور اگر وہ شکر جسم کو نہ ملے تو انسان بے ہوش ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ موت واقع ہو جاتی ہے میں نے دیکھا ہے کہ ایسے لوگ بعض دفعہ آدھ آدھ گھنٹہ کے بعد میٹھے کی طرف دوڑتے ہیں کیونکہ جسم میٹھا مانگ رہا ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ مجھے میٹھا دو ورنہ میں گیا ایسے شخص کو خدا کہتا ہے کہ تم رمضان میں روزہ نہ رکھو اور اس لئے روزہ نہ رکھو کہ تمہارے لئے یہ سیدھا راستہ ہم نے ہلاکت اور سختی اور تنگی پیدا کرنے کے لئے نہیں بنایا بلکہ سہولت اور آسانی کے لئے بنایا ہے ہم اپنے پیار کی وجہ سے جو سہولتیں تمہیں دے رہے ہیں ان کو پیار اور شکر اور حمد کے ساتھ قبول کرو اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو تم ناشکر گزار ہو جاؤ گے۔ (خطبات ناصر جلد دوم صفحہ ۴۳۴ تا ۴۳۷)

قرآن کریم کی اپنی ایک عظمت ہے اور بڑی ہی عظمت ہے۔ اس آیت میں جو میں نے ابھی تلاوت کی ہے یہ بتایا گیا ہے کہ تین باتیں قرآن کریم کی عظمت کو ثابت کرنے والی ہیں۔ ایک تو یہ کہ هُدًى لِّلنَّاسِ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آیت کے اس ٹکڑا کی بہت سی تفسیریں کی ہیں۔ ایک تفسیر آپ نے یہ کی ہے کہ هُدًى لِّلنَّاسِ کا مطلب یہ ہے کہ جو ہدایت لوگ بھول چکے تھے اسے دوبارہ پیش کرنے والا۔ ہدایت تو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے آنی شروع ہوئی اور بہت سی شریعتیں نازل ہوئیں لیکن وہ اُمتیں جن کی طرف مختلف اوقات میں شریعتیں نازل ہوئیں۔ ایک وقت گزرنے کے بعد ان کی زندگی میں روحانی طور پر دو تبدیلیاں آئیں۔ ایک تو یہ کہ روحانی طور پر ارتقاء کے کچھ مدارج وہ طے کر چکے تھے اور روحانی طور پر زیادہ بوجھ کو اُٹھانے کے قابل ہو چکے تھے

اور دوسری تبدیلی یہ آئی کہ جو شریعت ان پر نازل ہوئی تھی اس کو بھی بہت حد تک وہ بھول گئے اور بہت سی بدعات اس میں شامل ہو گئیں۔ پس قرآن کریم نے وہ بنیادی صداقتیں جو پہلی شریعتوں کے اندر پائی جاتی تھیں لیکن پہلی شریعتوں کے مخاطب انہیں بھول چکے تھے وہ ہدایتیں پھر لوگوں کو سکھائیں اور انسان کو ان سے متعارف کرایا۔ یہ هُدًى لِّلنَّاسِ کے ایک معنی ہیں۔

وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى دوسری بات جو قرآن کریم کی عظمت کو ثابت کرتی ہے یہ ہے کہ پہلی شریعتوں اور ہدایتوں میں جو باتیں اور جو صداقتیں مجمل طور پر پائی جاتی تھیں قرآن کریم نے ان کے اجمال کو دُور کیا اور پوری حقیقت کھول کر انسان کے سامنے رکھ دی اور تیسری بات یہ ہے کہ وَالْفُرْقَانِ۔ چونکہ پوری کتاب اور کامل ہدایت جو قرآن میں نازل کی گئی وہ پہلی شریعتوں اور ہدایتوں میں نہیں تھی اس لئے وقت گذرنے پر ان کے اندر اختلاف پیدا ہوا اور چونکہ زمانہ زمانہ کی ہدایت اور ملک ملک کی ہدایت میں فرق تھا اس لئے بنیادی طور پر جو مذہب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی طرف بھیجا گیا تھا اس کے اندر ایک اختلاف پیدا ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ کہا، آپ نے کہا کہ اگر کوئی تجھے تھپڑ لگاتا ہے تو تو بھی اسے تھپڑ لگا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کچھ اور کہا، انہوں نے کہا کہ اگر کوئی تیرے ایک گال پر تھپڑ لگاتا ہے تو تو دوسرا گال بھی آگے رکھ دے۔ پس ہدایت میں اور تعلیم میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی فرق پیدا ہو گیا اور اختلاف پیدا ہو گیا لیکن یہ اختلاف تب پیدا ہوا جب یہود نے حضرت مسیحؑ کے ماننے سے انکار کر دیا اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق ان کی اصلاح کے لئے جو حکم نازل ہوا تھا کہ نرمی اختیار کرو تمہارے اندر سختی زیادہ پیدا ہو چکی ہے۔ چونکہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کو نہیں مانا اس لئے ان کی اس تعلیم کو بھی نہیں مانا اور پہلی تعلیم جو جزوی اور غیر مکمل تھی، جو حقیقی تعلیم کا ایک حصہ تھی اس پر قائم رہے اور حقیقی تعلیم کا جو دوسرا حصہ حضرت مسیحؑ لے کر آئے تھے اس کو ماننے سے انکار کیا اور اس طرح اختلاف پیدا ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ تم خدا تعالیٰ کی طرف سے کیسے ہو سکتے ہو جب کہ پہلی شریعتوں سے اس قسم کے اختلاف کرنے والے ہو حالانکہ انسانی فطرت بھی اپنی ترقی یافتہ حالت میں پہلی شریعتوں کے ساتھ پورے طور پر اتفاق نہیں کر سکتی تھی۔ اس واسطے تیسری بات قرآن کریم میں یہ پائی جاتی ہے کہ اس نے حق و باطل میں کھلا فرق کر کے ان میں تمیز پیدا کر کے تمام پہلی ہدایتوں کے ماننے والوں میں جو اختلاف

پیدا ہو گئے تھے ان کو دور کرنے کا سامان پیدا کر دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کریم کی شکل میں ایک کامل اور مکمل شریعت انسان کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ ان تینوں باتوں کی تفسیر تو لمبی ہے لیکن میں نے مختصراً ان کی طرف اشارے کر کے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

جب کامل شریعت آ گئی اور اس نے فرقان ہونے کا دعویٰ کیا تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اس کی ایک تفسیر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ فرمائی ہے کہ جب خدا تعالیٰ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے یہ پوچھیں کہ اس شریعت پر ہم ایمان لے آئے ہیں اب ہمارے اور پہلوں کے درمیان قرآن کریم نے کیا فرق، کیا تمیز پیدا کی ہے، ہم میں اور پہلی شریعتوں کے ماننے والوں میں شریعتِ اسلامیہ نے کیا امتیاز پیدا کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ کہ پہلوں کو دیکھو وہ میرے قرب سے محروم ہو چکے ہیں میرے دربار سے دھتکارے ہوئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر اور آپؐ کو اُسوہ بنا کر اور قرآن کریم کی تعلیم پر عمل کر کے تمہارا یہ مقام ہے کہ تم ان کی طرح دُور اور مہجور نہیں ہو بلکہ میرے مقرّب ہو فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ تم میں اور تمہارے غیر میں امتیاز یہ ہے کہ میں مسلمان کے قریب ہوں اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ اور جب وہ مجھ سے دعا مانگتا ہے تو میں اس کی دعا کو قبول کرتا ہوں اور اپنے الہام کے ذریعے اس قبولیت کی بہتوں کو بشارت دیتا ہوں لیکن یہ شرط اپنی جگہ قائم ہے کہ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ بشرطیکہ تم میرے حکم کو قبول کرو وَ لْيُؤْمِنُوْا بِيْ اور اپنے ایمان پر حقیقی طور پر ثابت قدم رہو۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ دعا نتیجہ ہے ایک اور چیز کا اور وہ سلسلہ چلتا ہے فضل سے۔ اصل یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شناخت کرتا ہے تو اس میں اور ایک غیر مسلم میں جو امتیاز پیدا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے فضل کو جذب کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کے فضل کو جذب کر کے وہ معرفت حاصل کرتا ہے یعنی خدا تعالیٰ کی صحیح شناخت کرتا ہے، اس کی عظمت اس کے دل میں بیٹھتی ہے اور اس کی کبریائی اور اس کے جلال سے وہ آشنا ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک ہی وقت میں ایک ہی ہستی ''اللہ'' کے متعلق اس کے دل میں محبت اور خوف پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کے نتیجہ میں اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

(خطباتِ ناصر جلد ہفتم صفحہ ۱۴۶ تا ۱۴۸)

رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے وہ قرآن جو تمام انسانوں کے لئے ہدایت بنا کر بھیجا گیا ہے اور جو کھلے دلائل اپنے اندر رکھتا ہے ایسے دلائل جو ہدایت پیدا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی قرآن میں الٰہی نشان بھی ہیں اس لئے تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو دیکھے اسے چاہیے کہ وہ اس کے روزے رکھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ ماہ رمضان کا بہت گہرا تعلق قرآن سے ہے۔ جہاں تک قرآن کے رمضان میں نازل ہونے کا تعلّق ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جبریل علیہ السلام رمضان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر قرآن کا دَور کیا کرتے تھے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساری کی ساری آیات رمضان میں بھی نازل ہوئیں۔ اس لحاظ سے یہ بیان بھی درست ہے کہ سارا قرآن رمضان میں اُترا۔

پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی تین بنیادی صفات کا ذکر کیا ہے۔ پہلی صفت یہ بتائی کہ قرآن هُدًى لِّلنَّاسِ ہے یعنی یہ نوع انسان کے لئے ہدایت کا موجب ہے۔ النَّاس کے لفظ میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت كَافَّةً لِّلنَّاسِ کی طرف ہوئی ہے یعنی مردوں اور عورتوں دونوں کی طرف۔ اسی لئے قرآن کی ہر آیت دونوں کے لئے ہے اور ہر قرآنی حکم میں مرد وزن دونوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ بعض آیات ایسی ہیں جن کا تعلق صرف عورتوں سے ہے اور انہی سے ہوسکتا تھا۔ جیسے حمل اور دودھ پلانے سے متعلق آیات۔ یہ استثنائی احکام ہیں ورنہ ہر آیت النَّاس کے لئے ہے اور اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ قرآن دونوں ہی کے لئے ہدایت کا موجب ہے۔ ہدایت کے حقیقی اور بنیادی معنے یہ ہیں کہ اسلامی تعلیم ان راہوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے جو خدا تک پہنچانے والی ہیں۔ خدا غیر ذاتی نہیں بلکہ ذاتی خدا ہے یعنی ہر وہ شخص جو اسلام پر عمل کرتا ہے وہ خدا سے ایک زندہ تعلّق قائم کرتا ہے۔

دوسری بنیادی صفت قرآن کی وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک محدود دائرہ میں آزادی دے کر انسان کو قرآن کی شکل میں ایسی تعلیم دی ہے جو خدا تک پہنچانے والی ہے۔ انسان کو چونکہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کام کرے اس لئے وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى کی رو سے قرآن ہر بات کی دلیل دیتا ہے۔

تیسری بنیادی صفت قرآن کی یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ الفرقان ہے۔ یہ قرآن پر عمل کرنے والے اور عمل نہ کرنے والے کے درمیان ایک مابہ الامتیاز پیدا کر دیتا ہے۔ اسی لئے ایک سچے مخلص احمدی کی زندگی دوسروں سے مختلف ہوتی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں جب میں ڈیٹن (امریکہ) گیا اور وہاں کے میئر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ڈیٹن کے شہریوں میں سے جو لوگ آپ کی جماعت میں شامل ہوئے ہیں اور جن کی آپ نے تربیت کی ہے وہ دوسرے شہریوں سے مختلف انسان نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے خلاف آج تک کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی اور کسی بھی احمدی کے خلاف کوئی کیس نہیں بنا۔ سو یہ ہے ایک فرقان۔ لیکن اصل فرقان وہ ہے جو خدا کی نگاہ میں فرقان ہو۔ اس کے لئے خدا نے حکم دیا ہے کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ کہ جو بھی اس مہینہ کو پائے وہ روزے رکھے۔ سو رمضان کے روزے مومنوں میں مابہ الامتیاز پیدا کرنے کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہیں ان کی وجہ سے ایک مومن کی رسائی خدا تک ہوتی ہے اور اس کے ساتھ مومن کا ایک زندہ تعلق قائم ہوتا ہے اور یہ زندہ تعلق مابہ الامتیاز پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔

ایک مومن کے دل میں سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ اللہ کی ہستی اور بندہ کی ہستی میں تو بڑا فرق ہے۔ دونوں میں بڑا بُعد ہے۔ یہ فاصلہ کیسے پاٹا جائے گا اور اللہ کے ساتھ بندہ کا تعلّق کیسے قائم ہوگا؟ اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں فرمائی۔ چنانچہ فرمایا: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔

یعنی یہ کہ (اے رسول!) جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو تُو جواب دے کہ میں ان کے پاس ہی ہوں۔ جب دعا کرنے والا مجھے پکارے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ سو چاہیے کہ وہ دعا کرنے والے بھی میرے حکم کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا وہ ہدایت پائیں۔

سو خدا کے ساتھ بندہ کے زندہ تعلق کی ایک زندہ علامت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے ایسے بندہ کی دعا کو بطور خاص قبول کرتا ہے اور رمضان کے روزے رکھنے کے نتیجہ میں یہی وہ مابہ الامتیاز ہے جو ایک مومن کو عطا ہوتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں فرقان کا حامل قرار پاتا ہے۔

یہ تو صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ رمضان میں روزے رکھنے والوں کی دعائیں زیادہ قبول کرتا ہے اور روزے مابہ الامتیاز فرقان پیدا کرنے کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ

رمضان کے علاوہ عام دنوں میں وہ دعائیں قبول نہیں کرتا۔ وہ ہر وقت دعائیں قبول کرتا ہے۔ جب بھی اس کا کوئی بندہ مضطرّ ہوکر اس کے حضور جھکتا اور اس سے دعا مانگتا ہے وہ اس کی دعا کو قبول کر کے اس کے لئے ایک عید پیدا کر دکھاتا ہے۔

اس آیت سے پتہ لگتا ہے کہ ایک عید تو وہ ہے جس کا دروازہ ماہ رمضان میں کھلتا ہے اور ایک عید وہ ہے جو عاجزانہ دعائیں کرنے والے ایک مومن کو ہر وقت حاصل ہوتی رہتی ہے۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ سے بڑھ کر ایک مومن کے لئے اور کیا عید ہوگی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر احمدی کو خدا تعالیٰ سے زندہ تعلق قائم کرنا چاہیے تا کہ قبولیتِ دعا کا حظ اسے حاصل ہو۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ خالق اور مالک ہے کبھی بندے کی مانتا ہے اور کبھی اپنی منواتا ہے اور دونوں ہی حالتیں مومن کے لئے عید کی آئینہ دار ہوتی ہیں اس لئے کہ اس کی اصل عید رضائے الٰہی میں ہوتی ہے۔

(خطباتِ ناصر جلد دہم صفحہ ۱۰۷ تا ۱۱۰)

قرآن کریم کی یہ بھی شان ہے کہ وہ بنیادی اصول ایسی جگہ بیان کر دیتا ہے جہاں اس کے پہلے مضمون کے ساتھ خاص تعلق ہو۔ گو وہ مضمون ماقبل کے ساتھ بندھا ہوا تو نہ ہو لیکن اس کا خاص تعلق ہو۔ رمضان کے ساتھ دعا کا ذکر کر دیا فرمایا: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔

اب دعا صرف رمضان کے مہینے میں ہی تو نہیں کرنی ہوتی لیکن رمضان کے مہینے میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی عبادات کو اکٹھا کر کے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ انسان اگر چاہے تو خاص طور پر اپنے ربّ کریم کی طرف زیادہ خشوع وخضوع اور ابتہال کے ساتھ متوجہ ہونے کے مواقع پاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اُس کی دعائیں عام حالات کی نسبت زیادہ کثرت سے خدا تعالیٰ کے حضور مقبول ہوسکتی ہیں اگر دل میں اخلاص ہو اور کوئی کجی اور فساد نہ ہو لیکن ویسے یہ ایک عام اصول ہے خدا تعالیٰ کے ساتھ تو ہر آن اور ہر گھڑی ہر شئے کا تعلّق ہے اور خدا سے زندہ تعلّق قائم کرنا یہ ایک مسلمان کا فرض ہے۔ خدا تعالیٰ کی خدائی تو اپنا کام کر رہی ہے خواہ انسان اس کی طرف متوجہ ہو یا نہ ہو اس کے جسم میں ہزار ہا تغیر اللہ تعالیٰ کے براہ راست حکم سے پیدا ہو رہے ہیں......

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اگر میرے بندے میرے متعلق پوچھیں یعنی قربِ الٰہی

کے حصول کا خیال آئے کہ وہ کس طرح اپنے ربّ سے تعلقات پیدا کر سکتے ہیں تو ان سے کہہ دو میں تم سے دور تو نہیں ہوں۔ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ میرے قرب کی علامت اور نشان یہ ہے کہ مَیں دعاؤں کو سنتا ہوں اور دعا سننے کے بعد یہ اطلاع دیتا ہوں کہ مَیں نے دعا کو قبول کر لیا ہے۔ ’’اُجِیْبُ ‘‘ میں محض اجابت یعنی قبول کرنا ہی نہیں بلکہ بسا اوقات اس کی اطلاع دینا بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ اطلاع یا تو عملاً ہوتی ہے اور یا لفظاً بھی۔ رؤیا اور کشوف کے ذریعہ یا الہام کے ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ دعا کرنے والے کے روحانی مقام اور ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ کا سلوک ہوتا ہے یہ لمبی تفصیل ہے اس میں اس وقت جانے کا وقت نہیں لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندوں کی دعا کے نتیجہ میں پیار اور قبولیت کی کیفیت تب پیدا ہوگی جب وہ میرا حکم مانیں گے اور مجھ پر ایمان لائیں گے اور ایمان کے تقاضوں کو پورا کریں گے اور میری نازل کردہ ہدایت پر قائم ہو جائیں گے تا کہ جس غرض کے لئے مَیں نے انسان کو پیدا کیا ہے وہ غرض پوری ہو۔

دعا کے سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہر انسان دعا اپنے لئے بھی کرتا ہے اور دوسرے فرد کے لئے بھی کرتا ہے اس سلسلہ میں جیسا کہ پہلے اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ کے ترجمہ میں مَیں بتا چکا ہوں خدا تعالیٰ بتاتا ہے انسان اپنے لئے بھی دعا کرتا ہے۔ دوسرے فرد کے لئے بھی دعا کرتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یَرٰی وَ یُرٰی لَہٗ کہ اللہ تعالیٰ دعا کرنے والے کو خواب کے ذریعہ اطلاع دیتا ہے اور دوسرا آدمی اس کے لئے دعا کر رہا ہو تو اسے بھی اطلاع دیتا ہے کہ اس کے دوست یا بزرگ یا بھائی یا بیٹے یا خلیفۂ وقت کے متعلق دعا قبول ہوگئی ہے اور دعا اجتماعی بھی ہے۔ اجتماعی دعا بعض حالات میں اور بعض زمانوں میں بہت ضروری ہو جاتی ہے اور اگر انسان انفرادی دعائیں اجتماعی دعا پر قربان کر دے تو میری یہ ذاتی رائے ہے اور جو تاریخ مَیں نے پڑھی ہے اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ پھر اپنے لئے نہیں بھی دعا کر رہا ہوتا تب بھی اس کی دعا قبول کر لی جاتی ہے کیونکہ وہ خدا کی مخلوق کے لئے دعائیں کر رہا ہوتا ہے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ آپ نے عرب میں ایک عظیم روحانی انقلاب بپا کر دیا۔ عرب وحشی اور درندہ صفت تھے عمل کرنا تو درکنار اُن کو حسنِ اخلاق کا علم ہی نہیں تھا۔ کتوں اور سُؤروں کی طرح وحشیانہ زندگی گزار رہے تھے لیکن

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت سے قوم کی زندگی کے اندر ایک انقلاب عظیم بپا ہو گیا۔ آپ فرماتے ہیں تمہیں پتا ہے یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا یہ ایک فانی فی اللہ کی راتوں کی عاجزانہ دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے ربّ سے اتنی دعائیں کیں، پہلے عرب کے لئے اور پھر سب بنی نوع انسان کے لئے (کیونکہ اسلام کا پیغام ساری دنیا میں پہنچنا تھا) کہ ایک انقلابِ عظیم بپا ہو گیا ایسا انقلاب جسے آج کی دنیا بھی سمجھنے سے قاصر ہے حالانکہ سائنس بہت ترقی کر چکی ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد ہفتم صفحہ ۳۸۳ تا ۳۸۶)

قرآن کریم نے میں نے پچھلے چند ہفتوں میں ہی یہ بیان کیا ہے اب مختصر کروں گا۔ ایک تو یہ اعلان کیا۔ میرے ساتھ تعلّق پیدا کرنا چاہتے ہو تو مجھے پانے کے لئے تمہیں راکٹ میں بیٹھ کے چاند پہ جانے کی ضرورت نہیں یا کسی اور ستارے یا ساتویں آسمان تک پہنچنے کی ضرورت نہیں۔ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ میں تمہارے پاس ہوں لیکن پاس ہوتے ہوئے بھی دُور ہوں۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ جو مجھے اپنے پاس سمجھے گا مَیں تو پاس ہوں لیکن انسانوں میں سے جو مجھے اپنے پاس سمجھے گا اور پاس سمجھنے کے نتیجہ میں اس کی روح پر میری عظمت اور کبریائی جو ہے وہ سایہ ڈال رہی ہوگی اور میری عظمت اور کبریائی کی خشیت اس کے دل میں پیدا ہوگی اور میری صفات کو دیکھ کے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے گا کہ خدا تعالیٰ سے مانگے بغیر میری زندگی ناکارہ ہے اور اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ وہ دعا کرے گا مجھ سے۔ مجھے پکارے گا میں اس کی دعا کو قبول کرلوں گا۔ اور دوسری طرف یہ کہا۔ اس میں تو ایک اصول بیان کیا نا کہ جو پکارے گا اس کی پکار کو میں قبول کروں گا۔ دوسری طرف یہ کہا کہ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان:۷۸) اب ہماری خدا تعالیٰ کو یہ ضرورت تو نہیں ہے کہ ہم مزدوری کریں اس کی اور فائدہ پہنچائیں اسے۔ اس نے مکان بنانے ہیں ہم راج اس کے جا کے راجگیری کریں اور مزدور اس کی مزدوری کریں تا کہ اس کو فائدہ پہنچے۔ یہ تو نہیں ہمارا اللہ۔ وہ تو كُنْ فَيَكُوْنُ (البقرۃ:۱۱۸) اس کی صفات کی بنیاد یہ ہے کہ ہر صفت کا جلوہ جو ہمارے وقت کا سیکنڈ ہے اس سے شاید کروڑویں حصہ میں ظاہر ہوتا اور وہ چیز بن جاتی ہے۔ تو قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ کس چیز کی پرواہ کا یہاں ذکر ہے۔ اعمالِ صالحہ کہ تمہارے اعمال صالحہ کو میں کیوں قبول کروں۔ اگر تم اس حقیقت سے ناآشنا ہو کہ تمہیں دعا کے ذریعہ میری رحمت کو جذب کرنا چاہیے اس کے بغیر تمہارے

اعمال جو ہیں وہ مقبول اعمال نہیں بن سکتے۔ آگے ہے فَقَدْ كَذَّبْتُمْ تم نے میری صفات کا انکار کر دیا۔ تم نے میری ہدایت پر چلنے سے انکار کر دیا۔ تمہارے اعمال جو تم بظاہر بے تحاشا پیسے خرچ کر کے علیحدہ دوسری جگہ ذکر آیا اس کا، مجھے خوش کرنا چاہتے ہو بالکل خوش نہیں کر سکتے۔ تمہارے اعمال مجھے خوش نہیں کر سکتے۔ جب تک تم دعاؤں کے ذریعہ سے میری رحمت کو جذب کر کے اپنے اعمال صالحہ کو اعمالِ مقبولہ نہ بنالو۔ یہ دو باتیں سمجھانے کے لئے رکھ رہا ہوں میں ایک آپ کے دائیں طرف اور ایک بائیں طرف۔

پھر فرمایا۔ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المؤمن:۶۱) حکم دیا ہے پھر۔ یعنی محض بندہ پر یہ کہہ کے بندہ پر یہ بات نہیں چھوڑی کہ دعا کرتا ہے یا نہیں۔ ایک طرف یہ کہا میں تمہارے قریب ہوں۔ مجھ سے ملنا چاہتے ہو دعائیں کرو۔ میں قبول کروں گا۔ دوسری طرف یہ کہا کہ تم مجھ سے میرا پیار حاصل کرنا چاہتے ہو اس لئے تم اعمالِ صالحہ بجالاتے ہو میری ہدایت کے مطابق جو قرآنی شریعت میں نازل ہوئی، نہیں قبول کروں گا جب تک کہ تم دعا کے ذریعہ سے میرے فضل اور میری رحمت کو حاصل کر کے وہ ہزاروں لاکھوں رخنے اور سوراخ جو تمہارے اعمال میں ہوتے ہیں اور اس قابل نہیں چھوڑتے تمہارے اعمال کو کہ قبول کئے جائیں ان پر دعا کے ذریعہ سے میری مغفرت کی چادر نہ ڈالو۔ میں خود ہی چادر ڈالوں گا ان پر اگر دعا تمہاری قبول ہو جائے گی اور تمہارے اعمال کو اس قابل سمجھ لوں گا کہ میں انہیں قبول کرلوں لیکن یہ دونوں اپنی اپنی جگہ بیان ہیں، حکم نہیں۔ حکم یہ ہے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ دعائیں کرو۔ میں دعاؤں کو قبول کروں گا۔ (خطباتِ ناصر جلد نہم صفحہ ۲۰۰ تا ۲۰۲)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو جواب دے کہ میں ان کے پاس ہی ہوں جب دعا کرنے والا مجھے پکارے تو میں اس کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔ چاہیے کہ دعا کرنے والے بھی میرے حکم کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا کامیابی کی راہیں ان پر کھلیں اور ان کی دعائیں قبول ہوں۔

ماہِ رمضان دعاؤں کا مہینہ ہے خاص طور پر۔ روزے کے علاوہ ہم نوافل پر بھی خصوصاً زور دیتے ہیں اس ماہ میں تراویح ہوتی ہیں وہ نوافل ہیں۔ اصل تو یہ تھا کہ علیحدہ علیحدہ ہر شخص رات کی تنہائی میں اپنے ربّ کے حضور جھکتا اور اس سے دعائیں مانگتا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب آپ

نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے گھروں کی بجائے (مجبوریوں کے نتیجہ میں) مسجد نبوی میں آ کر یا مسجد نبوی کی برکت کے حصول کے لئے تراویح پڑھتے ہیں تو آپ نے ان سب کو اکٹھا کر کے اور باجماعت یہ نوافل شروع کروا دیئے۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں تراویح باجماعت شروع ہوئی۔ انفرادی نوافل (رات کے آخری حصہ میں پڑھنے میں) اپنا ایک مزہ رکھتے ہیں لیکن جماعت میں شامل ہوجاتے ہیں بہت سے وہ لوگ جو انفرادی طور پر اس رنگ میں نوافل ادا نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ جو قرآن کریم کا دور نہیں کر سکتے کیونکہ ان کو قرآن کریم حفظ نہیں، مسجد میں آ کے ایک حافظ کے پیچھے وہ نماز پڑھتے ہیں اور پورے قرآن کریم کا دَور بھی ہوجاتا ہے اور دعائیں بھی کر لیتے ہیں۔ بہت سے دوست ہیں میں جانتا ہوں، جو مثلاً شروع رات میں جو باجماعت تراویح پڑھی جاتی ہیں اس میں بھی شامل ہوجاتے ہیں اور پھر آخری حصہ رات میں بھی اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود ہوتے ہیں۔ رمضان مبارک میں شروع رات میں تو بہت سے نوجوان اور بچے اور بہت سی مستورات بھی شامل ہوجاتی ہیں اس کے اپنے فوائد ہیں لیکن اصل چیز یہ ہے کہ دعاؤں کا عام دنوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ موقع ملتا ہے انسان کو اور قبولیت دعا کے لئے انسان اپنے ربّ کو راضی کرنے کی خاطر اور بہت ساری عبادتیں خاص طور پر اس ماہ میں دوسرے مہینوں کے مقابلہ میں زیادہ بجالاتا ہے۔ مثلاً حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آیا ہے کہ آپ بڑے سخی تھے لیکن رمضان کے مہینہ میں آپ کی سخاوت میں اتنی شدت پیدا ہوجاتی تھی کہ دوسرے مہینوں میں وہ شدت نہیں ہوا کرتی تھی۔ غرباء کا خیال رکھنا نیز مسکینوں کا، جو نسبتاً غریب ہیں ان کو سہارا دینا دعاؤں کے ساتھ، ان کی دنیوی ضروریات کو پورا کر کے۔ تو یہ مہینہ دعاؤں کا مہینہ ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ چیخنے کی ضرورت نہیں میں دُور تو نہیں ہوں کہ زور زور سے چیخ کے مجھے پکارو گے میں قریب ہوں۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ علیحدہ بھی نماز پڑھ رہے ہو یعنی نوافل بالکل خاموشی سے اور بے آواز بھی قرآن کریم نہ پڑھو اور بہت اونچی آواز سے بھی نہ پڑھو۔ ویسے عام طور پر جس طرح پڑھا جاتا ہے نوافل میں اس طرح نہیں بلکہ آواز نکالو منہ سے، سنتِ نبویؐ یہ ہے۔

اس آیت میں ایک اہم چیز بھی ہمیں پتا لگتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ دعا کرنے والا جب مجھے پکارے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ اسلام بنی نوع انسان کا

مذہب ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت كَآفَّةً لِّلنَّاسِ ہے، تمام انسانوں کے لئے ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں ان تمام زبانوں کے بولنے والوں کو مخاطب کر کے خدا تعالیٰ نے کہا اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ تم دعا کرو تم مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ جس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ دنیا کی ہر زبان میں خدا کے حضور عاجزانہ جھک کر دعا کرنے کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اتنا عرصہ گزر گیا چودہ سوسال ہونے کو آئے ہیں۔ اتنے لمبے زمانہ میں بھی عربی زبان جو ہے وہ ساری دنیا کی زبان تو نہیں بن سکی۔ یہ صحیح ہے کہ بعثتِ نبوی کے وقت عربی ایک چھوٹے سے خطّہ میں بولی جاتی تھی لیکن جس وقت اسلام کا اثر اور رسوخ پھیلا اس وقت مثلاً مصر جو عربی بولنے والا نہیں تھا وہاں عربی بولی جانے لگی۔ اسی طرح جو اس وقت مراکو اور الجزائر وغیرہ ممالک ہیں یہ افریقہ کے ممالک ہیں ان میں بھی اسلامی تمدّن کے اثر کی وجہ سے عربی بولی جانے لگی۔ اسی طرح مشرق کی طرف بہت سے ممالک ہیں جن میں عربی زبان رائج ہوگئی لیکن ہر انسان تو عربی زبان نہیں بول سکتا۔ جس وقت قرآن کریم نازل ہوا اور یہ آیت اُتری اس وقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں چھوٹا سا خطّہ تھا انسانوں کا جو عربی بولنے والا تھا۔ کہا یہ گیا اس وقت کہ تم دعا کرو میں قبول کروں گا اور مخاطب ہیں قرآن کریم کے تمام بنی نوع انسان۔ اس آیت کے ٹکڑے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر زبان میں خدا تعالیٰ کے حضور دعا کی جاسکتی ہے اور کی جانی چاہیے۔ کی جاسکتی ہے کیونکہ کہا گیا سب کو مخاطب کر کے پکارو مجھے، تو جو عربی جانتا نہیں وہ کیسے پکارے گا عربی میں وہ تو اپنی زبان میں ہی پکارے گا اور دوسرے دعا کرنی چاہیے اس لئے بھی کہ اگر کسی کو ٹوٹی پھوٹی عربی آتی بھی ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جھک کے اپنی ضرورتوں کو اس زبان میں ادا نہیں کر سکتا تو اللہ تعالیٰ تو علّام الغیوب ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن بندے کو تو تسلی تب ہوتی ہے جب وہ اپنی زبان میں اپنا مافی الضمیر دوسرے کے سامنے بیان کر دے۔ اس لئے جماعت احمدیہ کا مسلک یہ ہے کہ نماز میں بھی حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسنون عربی دعائیں اسی طرح عربی میں پڑھنی چاہئیں۔ ہر مسلمان کو وہ عربی عبارتیں یاد ہونی چاہئیں خواہ وہ بچہ ہو خواہ اس کے معنی اس نے ابھی سیکھے ہوں یا نہ سیکھے ہوں لیکن نماز میں ان دعاؤں کے علاوہ جو ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ورثہ میں ملیں اور جن سے ہمارا عشق اور پیار کا تعلق ہے (اس لئے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے وہ دعائیں نکلتی تھیں

یہ ہمارا پیار کا تعلق ہے) وہ پڑھ لینے کے بعد ہم اپنے ربّ کے حضور اپنی زبان میں دعا کرنے کو جائز سمجھتے ہیں اور ضرورت کے وقت یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ ایک یوگوسلاوین عربی کی دعائیں پڑھنے کے علاوہ اپنی زبان میں بھی دعا کرے۔ ایک انگریز انگریزی میں بھی دعا کرے۔ ایک البانین، البانین زبان میں بھی دعا کرے۔ ایک افریقن جس کی زبان تحریر میں بھی ابھی نہیں آئی لیکن اہلِ افریقہ اسے بولتے ہیں وہ اپنی زبان میں دعائیں کریں تا کہ وہ ایک قریبی تعلّق محسوس کریں اپنے پیدا کرنے والے ربّ کے ساتھ۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ جس زبان میں بھی دعا میرے سامنے کی جائے گی اسے میں قبول کروں گا۔ شرائط یہ ہیں کہ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ ۔ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ دو معنی میں ہے۔ قرآن کریم نے اور قرآن کریم کی تفسیر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قبولیت دعا کے لئے جو شرائط بیان فرمائی ہیں وہ بھی ایک حکم ہے اس کو قبول کریں۔ دعا کو دعا کی شرائط کے ساتھ کریں اور دوسرے یہ کہ کسی قسم کا ظاہری یا باطنی شرک نہیں کرنا۔ ایک شخص مشرک ہے اور وہ دعا کرتا ہے خدا سے تو اس سے قبولیت کا وعدہ یہاں نہیں لیکن وہ خالق مالک بھی ہے وہ ان کی بھی بعض دفعہ سن لیتا ہے۔ بڑا دیالو ہے وہ۔ لیکن کہا یہ گیا ہے کہ میرے پیار کو حاصل کرنا ہے اگر تو جو شرائط میں نے دعا کے لئے قائم کی ہیں ان کے مطابق دعا کرو۔

اور جو اسلام کے احکام ہیں قرآنی احکام ہیں ان کے مطابق اپنی زندگیوں کو گذارو۔ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ اور خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اس کے ساتھ ذاتی تعلق پیدا کرو جس کا ایک ذریعہ عاجزانہ دعائیں بھی ہیں۔ تو تمہیں کامیابی اور ہدایت مل جائے گی۔

قرآن کریم نے محض یہ نہیں کہا کہ دعائیں کرو میں قبول کروں گا بلکہ قرآن کریم نے ایک عالم کا عالم دعاؤں کا ہمارے سامنے کھول کے رکھ دیا ہے۔ اس میں سے (جو ایک لمبا مضمون ہے) کچھ حصے میں نے چنے ہیں آج کے خطبہ کے لئے۔ اللہ تعالیٰ سورہ بقرہ میں فرماتا ہے:۔ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرۃ :۲۰۲) یہاں دعاؤں کی بنیاد رکھی گئی۔ یہاں یہ فرمایا گیا کہ دنیوی نعماء کے حصول کے لئے بھی دعائیں کریں اور اُخروی نعماء کے حصول کے لئے بھی دعائیں کرو اور وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ کا فقرہ ورلی زندگی اور اخروی زندگی کو باندھ دیتا ہے کیونکہ اسی زندگی کی بنیاد پر اخروی زندگی کی جنتوں کا انحصار ہے تو بہت بڑا عالم ہمارے سامنے رکھ دیا گیا۔

فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً دنیا کی ساری نعمتیں جو خدا تعالیٰ نے انسان کے لئے پیدا کی ہیں تم ان کے حصول کے لئے دعائیں کرو۔صرف یہ کہہ کر کہ دعائیں مانگو خاموشی نہیں اختیار کی بلکہ کیا دعائیں مانگو اس کے اوپر بھی بڑی وسیع روشنی ڈالی گئی ہے۔ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً کے دو پہلو ہیں۔ایک ایسی نعمتیں ہیں ہماری اس ورلی زندگی سے تعلّق رکھنے والی جن کا تعلّق خود ہمارے نفس کے ساتھ ہمارے وجود کے ساتھ ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو بے شمار قوتیں اور استعدادیں عطا کی ہیں ان کے لئے دعائیں مانگو کہ اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق پروان چڑھیں اور ان قوتوں کو اس لئے دیا گیا انسان کو کہ جو یہ کہا گیا تھا کہ تمہاری خدمت پر ہر شے کو مامور کیا گیا ہے وہ ہر شئ سے خدمت لینے کے قابل ہو جائے۔ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیۃ:۱۴) تمہیں ہر طاقت دے دی گئی تا تم ہر شے سے خدمت لے سکو تو دعا مانگو کہ اس قدر عظیم نعمتیں جو تمہیں ملیں، آنکھ ہے خدا تمہیں توفیق دے کہ آنکھ سے بہترین اور اعلیٰ ترین اور پورے کا پورا فائدہ اٹھانے والے بنو تم۔ یہ دعا خدا تعالیٰ سے مانگو۔ بہت سے آنکھوں والے ہیں جو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی آنکھوں سے فائدہ نہیں اٹھا رہے اور اندھے کے اندھے اس دنیا سے گزر جاتے ہیں۔قرآن کریم میں بہت جگہ ان کا ذکر آیا ہے۔کان ہیں جن سے ایک تو تمہارا اپنا مشاہدہ تعلّق رکھتا ہے ایک تو تمہارا اپنا حصولِ علم تعلق رکھتا ہے مثلاً کلاس میں بیٹھا ہوا طالبِ علم اگر کان کھول کے نہ رکھے تو فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔تو رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (طٰهٰ:۱۱۵) کی دعا میں یہ ساری چیزیں آ گئیں۔تو یہ جتنی نعمتیں ہیں ان سب کے حصول کے لئے دعا کرو۔انسان یہ دعا کرے اپنے ربّ سے کہ اے خدا! جو تُو نے مجھے قوتیں اور استعدادیں دی ہیں اپنے فضل سے مجھے یہ توفیق عطا کر کہ میں اپنی ہر قوت اور استعداد کی نشوونما کروں اور اسے کمال تک پہنچاؤں اور ان سے بہترین فائدہ تیری رضا کے حصول کے لئے میں حاصل کروں اور اپنے نفس کی اس کامل اور صحیح نشوونما کے بعد جب خدا تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہو جائے انسان کے تو جو دنیا کی نعمتیں ہیں ان کو حاصل بھی کروں اس رنگ میں جو تجھے پسند ہو اور استعمال بھی کروں اس طریق پر جو تیری رضا کے حصول میں ممد اور معاون ہو۔ بہت سارے لوگ ہیں جو غلط طریق سے خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو حاصل کر کے گناہگار بن جاتے ہیں اور بہت سے لوگ ہیں جو صحیح طریق پر تو خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو حاصل کرتے ہیں لیکن غلط استعمال کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کو ناراض کر دیتے ہیں۔تو ایک نہ ختم ہونے والا سمندر ہے دعاؤں کا

فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً کے اس فقرے کے اندر جو خدا تعالیٰ نے بیان کر دیا۔

وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً اور خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں جو میں نے نعماء عطا کیں جو رحمت اور فضل موسلا دھار بارش کی طرح تم پر نازل ہوئے وہ تمہاری دُنیوی اور ورلی زندگی کے ساتھ ہی تو تعلق نہیں رکھتے اُخروی زندگی کے ساتھ بھی ان کا تعلّق ہے بلکہ اُخروی زندگی کے ساتھ ہی ان کا صحیح تعلق ہے اور یہ ساری چیزیں اسی لئے تمہیں دی گئی ہیں کہ تم اپنی آخرت کو سنوارو۔ اس واسطے دعا کرو کہ اے خدا! ہمیں جہنّم کے عذاب سے بچا اور یہ دنیا کی نعمتیں ہمیں اُخروی زندگی کی جنتوں کی راہوں پر چلا کر ان جنتوں تک پہنچانے والی ہوں تجھے ناراض کر کے ہمیں جہنّم کی طرف لے جانے والی نہ ہوں۔

میں نے بتایا کہ یہ دُعا جو ہے اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ یہ ایک ایسی دعا ہے جس میں دُعا کا ایک عالم کا عالم کھولا گیا اور ہمیں اس چھوٹی سی آیت میں بہت کچھ خدا تعالیٰ نے بتا دیا کہ کیا مانگنا ہے کس طرح مانگنا ہے پھر اسی سے آگے ہم چلتے ہیں اس دروازے میں داخل ہو کر۔ سورۂ تحریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

رَبَّنَاۤ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَ اغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (التحریم :۹) اے ہمارے ربّ ہمارا ''نور'' ہمارے فائدے کے لئے کامل کر دے اور ہمیں معاف فرما تو ہر چیز پر قادر ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم کمزور انسان ہیں گناہ بھی سرزد ہوتے ہوں گے غلطیاں اور کوتاہیاں بھی ہوں گی ہمارے گناہوں، غلطیوں اور کوتاہیوں کو اپنی مغفرت کی چادر سے ڈھانپ لے اور ہمیں اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا اپنے دائرہ استعداد کی انتہائی روحانی رفعتوں تک اپنے فضل سے پہنچا دے اور ہم تیرے حضور عاجزی سے متضرعانہ دعا کرتے ہیں کہ تو خود (جو ہر چیز کے کرنے پر قادر ہے) ہماری اس بات میں مدد کر کہ جو تو نے ہمیں نور دیا وہ نور مکمل ہو جائے ہماری زندگی میں اور جن انتہاؤں تک پہنچنا ہمارے لئے مقدر تھا ہمیں وہاں تک پہنچا ہماری غلطیاں کوتاہیاں روک نہ بن جائیں اور تیری رضا کی انتہا کو ہم حاصل نہ کر سکیں۔

پھر ایک اور وسیع مضمون ہے دعاؤں کا۔ وہ یہ کہ ہر نبی اپنی اُمّت کو بشارتیں دیتا ہے۔ سارے قرآن کریم کو پڑھ لو کہیں اختصار سے ذکر ہے بعض جگہ تفصیل سے بھی ذکر آ گیا ہے۔ تو ہر نبی اپنی اُمّت کے لئے یا ان کے لئے یا ان لوگوں کے لئے جو اس کا کہا مان کر خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرتے

ہیں بشیر ہے انہیں بشارتیں دینے والا ہے وعدے ہیں جو ان انبیاء کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ نے ان کی اُمتوں سے کئے سب سے زیادہ وعدے بڑی وسعتوں والے بڑی گہرائیوں والے بڑی رفعتوں والے بڑے عظیم وعدے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اُمّتِ محمدیہ کو دیئے گئے ہیں۔

پچھلے ایک خطبہ میں میں نے بتایا تھا کہ نبی اپنی اُمّت کے لئے صرف بشیر ہی نہیں ہوتا بلکہ نذیر بھی ہوتا ہے کیونکہ ہر بشارت کے ساتھ شرائط ہیں اور نبی ہوشیار کرتا ہے اور تنبیہ کرتا ہے کہ اگر تم نے ان شرائط کو پورا نہ کیا تو تمہارے حق میں جو بشارتیں دی گئی ہیں وہ پوری نہیں ہوں گی۔ مثلاً آپ کو سمجھانے کے لئے ایک آیت میں اس وقت لے لیتا ہوں وعدہ دیا گیا اُمّتِ محمدیہ کو، اور یہ ایک عظیم وعدہ ہے۔ اعلان کیا گیا اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (اٰل عمران: ۱۴۰) زندگی کے ہر شعبہ میں فوقیت ہمیشہ تمہیں ہی حاصل رہے گی مگر ایک شرط لگائی اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ اگر تم ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہوگے۔ یہ وہ نذیر والا حصہ آ گیا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ میں تو وعدے تو بے شمار ہیں اور انسان کی کوتاہیاں اور کمزوریاں اور غفلتیں بھی کم نہیں۔ اس واسطے دعاؤں کا سہارا لینا ضروری ہے۔ اسی واسطے کہا گیا قُلۡ مَا یَعۡبَؤُا بِکُمۡ رَبِّیۡ لَوۡ لَا دُعَآؤُکُمۡ (الفرقان:۷۸) اس میدان میں ہمیں قرآن کریم نے یہ دعا سکھائی رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدۡتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَ لَا تُخۡزِنَا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ (اٰل عمران: ۱۹۵) کہ اے ہمارے خدا (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں، آپ کے سمندر میں تو سارے پچھلے انبیاء مدغم ہو جاتے ہیں کیونکہ نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ ہی ان کو ملا تھا یعنی قرآن کریم کا ایک حصہ اور قرآن کریم کی برکتوں کا ایک حصہ ہی ان کو دیا گیا تھا، تو جو) تیرے رسولوں کے ذریعے ہمیں وعدے ملے ہیں ہمیں وہ سارا کچھ دے ایسے حالات پیدا کر دے ہمیں توفیق دے کہ ہم ان شرائط کو پورا کرنے والے بنیں جن شرائط کی ادائیگی ان وعدوں کے ساتھ لگائی گئی ہے اور وہ تمام وعدے ہمارے ہماری نسلوں کی زندگی میں پورے ہوں اور یہ نہ ہو کہ قیامت کے دن جب خدا کے حضور ہم سب اکٹھے ہوں تو کہا جائے کہ بشارتیں تو تمہیں بہت دی گئیں وعدے تو خدا تعالیٰ نے تم سے بہت عظیم کئے تھے لیکن اے نادانو! تم نے اپنی غفلتوں، کوتاہیوں اور گناہوں کے نتیجہ میں اور خدا تعالیٰ کے احکام کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان وعدوں سے حصہ نہ لیا اور اس طرح ہم قیامت کے دن ذلیل اور رُسوا ہو کے رہ جائیں۔

تو ایک یہ دعا ہے جو بڑی وسعتیں اپنے اندر رکھتی ہے کہ اے خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے

ذریعہ تو نے بے انتہا بشارتیں ہمیں دیں، ہم سے وعدے کئے (''وعدہ'' کے لفظ کے ساتھ بھی قرآن کریم نے امت محمدیہ کو بشارتیں دی ہیں) ایسا کر اور ہمیں توفیق دے کہ ہم شرائط کو پورا کریں ہم تیری راہ میں وہ قربانیاں دیں جن کا تو ہم سے مطالبہ کرتا ہے ہم تیرے پیار کے حصول کے لئے اپنے نفسوں پر اس موت کو طاری کریں جو تیری محبت کو پیدا کرنے والی ہے اور ایک نئی زندگی جس کے نتیجہ میں تیری طرف سے عطا ہوتی ہے اور وہ سارے وعدے ہماری زندگیوں میں بھی پورے ہوں جس طرح ہمارے بزرگوں کی زندگیوں میں جنہوں نے تیری راہ میں قربانیاں دی تھیں وہ پورے ہوئے اور یہ نہ ہو کہ ہم قیامت والے دن اپنی کوتاہیوں کے نتیجہ میں ذلیل ورسوا ہو کر رہ جائیں۔

انسانی زندگی کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اس زندگی میں ہدایت کے ساتھ گمراہی بھی لگی ہوئی ہے یعنی ایک شخص ہدایت پالے تو ضروری نہیں ہوتا کہ مرتے دم تک وہ ہدایت پر قائم رہے۔عرب کا ایک حصہ مرتد ہو گیا اور ہزاروں ارتداد کی حالت میں مر گئے۔اسلام نے دعا سکھائی اس سلسلے میں کہ خاتمہ بالخیر کی دعا کیا کرو خاتمہ بالخیر کی دعا دراصل اس آیت میں ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (آل عمران:۹)

اے ہمارے رب! تو ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو کج نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت کے سامان عطا کر یعنی ہدایت دینا بھی خدا کا کام ہے۔قرآن کریم نے کہا ہے کہ جسے خدا پسند کرتا ہے اسی کو ہدایت کی راہ پر چلا دیتا ہے۔ پھر ہدایت کے حصول کے بعد ٹھوکروں کے دروازے کھلے ہیں۔ارتداد کا دروازہ۔اسلام سے باہر نکلنے کا دروازہ۔اسی طرح کھلا ہے جس طرح اس شخص کے لئے اسلام میں داخل ہونے کا دروازہ کھولا گیا۔اس واسطے هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اے خدا! تیری رحمت اور تیرے فضل کے بغیر ہم ہدایت پر قائم رہتے ہوئے خاتمہ بالخیر تک نہیں پہنچ سکتے۔ تجھ سے استدعا کرتے ہیں کہ جس طرح تُو نے ہمارے لئے ظلمات سے نکل کر اپنی رضا کی روشنی میں داخل ہونے کے سامان پیدا کر دیئے تیرے ہی فضل کے ساتھ ایسا ہو کہ مرتے دم تک ہم تیرے قدموں میں پڑے رہیں۔ تیرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پیار کا جو تعلّق ہے وہ ٹوٹنے نہ پائے کہ تیری رحمت اور تیری عطا کے بغیر یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی ایک بنیادی دعا ہے جو قرآن کریم نے ہمیں سکھائی ہے یہ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً دونوں کے ساتھ تعلّق رکھتی ہے کہ دنیا میں گمراہی اور ناراضگی

نہ ہو اور مرتے دم تک ہم ہدایت پر قائم رہیں اور ظالموں کے گروہ میں شامل نہ ہو جائیں لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (الاعراف: ۴۸) بھی کہا گیا ہے۔

ایک ذمہ داری مسلمان کی یہ تھی کہ وہ اسلام کو دنیا میں پھیلائے، اس کی تبلیغ کرے نمونہ بنے دوسروں کے لئے کیونکہ بغیر نمونے کے دنیا توجہ نہیں کرتی۔ تو یہ بھی بہت وسیع ذمہ داری ہے اور ہر مسلمان کا تعلق اس ذمہ داری کے نتیجہ میں ہر غیر مسلم کے ساتھ ہے۔ جہاں تک ممکن ہو۔ یہ نہیں کہ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ مشرق و مغرب و شمال و جنوب کے ہر غیر مسلم کے پاس جا کے تبلیغ کرے لیکن مجموعی طور پر اُمّتِ مسلمہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ غیر مسلموں تک اسلام کے حسن کو اور اللہ تعالیٰ کے نور کو پھیلانے والے ہوں اور اس کے لئے اُسوہ چاہیے اور اس کے لئے جذب چاہیے ایسا نمونہ جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچنے والا ہو۔ یہ دُعا سکھا دی۔ یہ دعائیں قرآن کریم میں یا تو اس رنگ میں ہیں کہ پہلے انبیاء کو وہ دعا سکھائی گئی اور قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا اس غرض سے کہ ہم بھی اس سے فائدہ اٹھانے والے ہوں۔ اللہ تعالیٰ سورۂ ابراہیم میں فرماتا ہے۔

فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْۤ اِلَيْهِمْ (ابراہیم: ۳۸) لوگوں کے دل ان کی طرف جھکا دے اس دعا کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ دل جیتنے کی توفیق ہمیشہ اُمّتِ مسلمہ کے ہر گروہ کو عطا کرتا چلا جائے، محبت کے ساتھ، پیار کے ساتھ، خدمت کے جذبہ کے ساتھ، نیک نمونہ بن کر ایک ایسا اسوہ نظر آئے، ایک فرقان، ایک تمیز پیدا کرنے والی بات ایک احمدی مسلمان میں غیر مسلم کو نظر آئے کہ وہ مجبور ہو جائے اس طرف مائل ہونے پر اور اس کی طرف جھک کے اس سے پوچھنے پر کہ میرے اور تیرے میں جو فرق ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ بس بات شروع ہو گئی تبلیغ کی وہ مسلمان اسے کہے گا۔ میں تو ایک عاجز انسان، میں تو ایک نالائق انسان ہوں۔ مگر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پیار کرنے والا انسان۔ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے والا انسان، میں قرآن کریم کی اس تعلیم پر عمل کرنے والا انسان ہوں کہ دنیا میں جو دُکھی ہیں ان کے دُکھوں کو دور کروں اور سکھ کے سامان جہاں تک میری طاقت میں ہے میں پیدا کروں۔ میں نے خدا کو پایا اور اس کے نور کو دیکھا اس کی آواز کو سنا۔ اس کی طاقت اور قدرت کے کرشمے میں نے اپنی زندگیوں میں مشاہدہ کئے۔ ان ساری چیزوں نے میری زندگی میں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ تم ایسا کرو گے تمہاری زندگی میں بھی یہ تبدیلی پیدا

ہو جائے گی۔ تو فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْۤ اِلَيْهِمْ یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ اے خدا! ہمیں توفیق عطا کر کہ ہم اس قابل ہوں کہ تیری خاطر اور تیرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر ایک جہاں کے دل جیتیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں لا کر رکھ دیں۔

پھر جو ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ اُمّتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے۔ وہ صرف ایک نسل سے تو تعلق نہیں رکھتی نسلاً بعد نسلٍ یہ ذمہ داری اٹھانی ہے قیامت تک یہ ذمہ داری اٹھانی ہے اس واسطے آنے والی نسلوں کے لئے دعا کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے:-

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ (ابراہیم:۴۱) کہ اے خدا مجھے بھی عمدگی سے نماز ادا کرنے کی توفیق دے اور میری آنے والی نسل کو بھی۔ میری ذُرّیت کو بھی کہ ہم عمدگی سے نماز ادا کریں یعنی اس طور پر نماز ادا کرنے والے ہوں کہ تو ہم سے راضی ہو جائے اور ہماری ذُرّیت اس طور پر نماز ادا کرنے والی ہو کہ تو ان سے راضی ہو جائے۔ مگر اپنی طاقت سے ہم یہ کر نہیں سکتے ہماری اس دعا کو قبول کر رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ اور اس دعا کو قبول کر کہ ہم نماز ادا کرنے والے ہوں عمدگی کے ساتھ اور ہماری ذُرّیت اور ہماری ہر دعا کو قبول کر جو تیرے نور کو پھیلانے والی اور دنیا سے اندھیروں کو دور کرنے والی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و احسان کو دنیا کے سامنے اس رنگ میں پیش کرنے والی ہو کہ وہ مؤثر بن جائے اس دنیا کے لئے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور آپ کی شان کو ابھی پہچانتی نہیں۔

باہمی تعلّقات ہیں۔ بھائی چارہ بنا دینا اُمّتِ مسلمہ کو ایک خاندان بنا دیا۔ اور سورۂ حشر آیت ۱۱ میں ہمیں یہ دعا سکھائی کہ ہمیں اور ہم سے پہلے آنے والے بھائیوں کو بخش دے۔ جو پہلے بزرگ گزرے ہیں (صرف اپنے زمانہ میں بسنے والے نہیں) بلکہ اس تعلّق کو اگلے اور پچھلوں کے ساتھ باندھا گیا ہے دراصل اور ہمارے دلوں میں مومنوں کا کینہ کبھی پیدا نہ ہو۔ بڑی عجیب دعا ہے سارے فتنوں کو دور کرنے والی۔

بعض دفعہ انسان حق لے کر بعض دفعہ حق چھوڑ کر فتنہ دُور کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ اغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا (الممتحنة:٦) اے ہمارے ربّ ہمیں مغفرت کی چادر میں ڈھانپ لے اور ہماری غلطیاں اور کمزوریاں اگر کوئی ہوں بھی تو ایسے رنگ کی نہ

ہوں کہ کفار کے لئے ٹھوکر اور گمراہی اور تجھ سے دور جانے کا ذریعہ بن جائیں۔ ہمیں غیروں کے لئے اچھا نمونہ قائم کرنے کی توفیق عطا کر۔

انسان کا اپنا نفس ہے وَ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ (بخاری کتاب الصوم) اپنے نفس کے لئے بھی دعائیں کرنا ضروری ہے۔ ورنہ انسان اللہ تعالیٰ کی نعماء کو حاصل نہیں کرسکتا۔ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (البقرۃ:۲۵۱) اے ہمارے ربّ ہم پر قوتِ برداشت نازل کر صبر عطا کر اور ہمیں ثباتِ قدم عطا کر اور منکر مخالف کے خلاف ہماری مدد کر۔ صبر کے معنی عربی زبان اور قرآنی محاورہ میں بڑے وسیع ہیں۔صبر کے معنی ہیں عقلی قوانین اور شریعت کے احکام کی روشنی میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنا یہ ہے صبر اور مختلف شکلوں میں یہ ہماری زندگی میں ابھرتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی مصیبت نازل ہوجائے تو اس پر بھی صبر کرتا ہے انسان میدانِ جنگ ہو تو مومنانہ شجاعت کے مظاہرے کو عربی زبان اور قرآنی اصطلاح صبر کہتی ہے۔ میدانِ جنگ میں اور ثباتِ قدم۔ اگر قضاو قدر کے امتحان و ابتلا میں مبتلا ہو کوئی شخص جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں تمہیں آزماؤں گا۔تو ایسے امتحان کے وقت بشاشتِ قلب سے اس ابتلاء کو برداشت کرنا یہ بھی صبر ہے اور اپنی زبان کو قابو میں رکھنا یہ بھی صبر ہے۔ بے موقع اور بے محل بات سے رُکے رہنا۔زبان کو قابو میں رکھنا اس کو بھی صبر کہتے ہیں۔یعنی ہر پہلو سے جہاں نفس کو قابو میں رکھنا ہو عقل کے قانون کے ماتحت یا شریعت کے احکام کے نتیجہ میں۔عربی زبان اور قرآن کریم کی اصطلاح اسے صبر کہتی ہے۔

تو رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا میں یہ دعا ہوئی کہ اے خدا! ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنے نفس کو اس طرح قابو میں رکھیں کہ کبھی بھی وہ بے قابو ہو کر تیری ناراضگی مول لینے والا نہ بن جائے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا کرے۔ (خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۲۹۳ تا ۳۰۴)

اس آیہ کریمہ میں روزہ کے متعلق ایک بڑے حسین پیرایہ میں ہمیں یہ بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں صوم (روزہ) کسے کہتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر یہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہیں روزہ رکھنے کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانے کی اجازت ہے۔

عرب کے دستور کے مطابق اور ان کے خیال کی رو سے روزے کے دنوں میں ایسا فعل رات کو بھی

جائز نہیں خیال کیا جاتا تھا فرمایا وہ تمہارے لئے ایک قسم کا لباس ہیں۔یعنی تقویٰ کا ایک پیرہن تم ان کے ذریعہ حاصل کرتے ہو۔اسی طرح تم بھی ان کے لئے تقویٰ کا پیرہن ہو۔گویا تم ایک دوسرے کے لئے تقویٰ اللہ کے بعض تقاضوں کے پورا کرنے کا ذریعہ بنتے ہو۔

اس کے بعد فرمایا عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم اپنے نفسوں کی حق تلفی کرتے تھے یہ حق تلفی کرنے کے معنی نئے ہیں۔کیونکہ پہلی بار غالباً حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ نے تفسیر صغیر میں یہ معنی بیان فرمائے ہیں۔ورنہ پہلے مفسر اس کا کچھ اور ہی ترجمہ وتفسیر کیا کرتے تھے۔

تو فرمایا مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے نفسوں کی حق تلفی کرتے تھے اور جہاں تک تسکین نفس کی تمہیں اجازت دی گئی ہے۔تم اس سے بھی پرہیز کرتے تھے۔یہ دیکھ کر اس نے اپنے فضل سے اپنا یہ حکم تمہارے لئے کھول کر بیان کر دیا۔اور عَفَا عَنْكُمْ اس طرح تمہاری حالت کی اصلاح کر دی اور تمہاری عزّت کے سامان کر دیئے۔

یہاں خدا تعالیٰ نے ایک بنیادی اصول کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کی رضا کی راہوں کی تعیین اگر بندہ اپنے طور پر کرنے لگے۔تو وہ اپنے حقوق بھی تلف کر جاتا ہے اور دوسروں کے حقوق کا تو کہنا ہی کیا۔اس لئے دین کے معاملہ میں یہ ضروری تھا کہ قرب کی راہوں اور شریعت کے اصول کی تعیین آسمان سے وحی الٰہی کے ذریعہ کی جائے۔ورنہ انسان غلطیاں کرے گا۔اور اپنے بھی اور دوسروں کے حقوق بھی تلف کر دے گا۔

تو فرمایا فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ اسی لئے ہم نے تمہارے حقوق کی حفاظت کے لئے اس شریعت کو نازل کیا ہے اور تمہارے فائدے کے لئے ہی سب احکام اُتارے گئے ہیں۔پس اب تم بلاخوف لَوْمَةَ لَائِمٍ اپنی بیویوں کے پاس جاؤ۔وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر کیا ہے۔اس کی جستجو کرو۔

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ کے دو اور معنی بھی ہیں۔اوّل بغی کے معنی طلب کرنے کے ہوتے ہیں اور کتاب ان فرائض کے مجموعہ کو کہتے ہیں جو وحی کے ذریعہ بطور شریعت انسان کو دیا جاتا ہے۔ فرمایا کہ تم روزے اس نیّت سے رکھو۔یا یہ کہ ہم نے روزوں کو تم پر اس لئے فرض کیا ہے کہ تا تم یہ

سبق سیکھو کہ کتاب اللہ (یعنی آسمانی شریعت) کو اور اس کے تمام احکام کو اپنا مطلوب بنانا ہے۔ گویا وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض تمہارے لئے مقرر کئے ہیں۔ ان کو اپنا مطلوب اور مقصود بناؤ۔ (اس کی قدرے زیادہ تفصیل میں آئندہ جا کر بیان کروں گا۔ جہاں روزہ کی حکمت بیان کی جائے گی)۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزے کے دو حصے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان اس بنیادی اصل کو اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا۔ کہ ہم نے روزے کو اس لئے فرض کیا ہے تا تم یہ سمجھ لو اور خوب پہچان لو کہ تمہاری ترقیات کے لئے یہ ضروری ہے کہ تم سب فرائض کو اپنی زندگی کا مقصود اور مطلوب ٹھہراؤ۔ ابتغاء کا ایک اور مفہوم بھی چسپاں ہوسکتا ہے۔ وہ مفہوم ہے تجاوز کر جانا۔

یہ تجاوز کبھی بُرا ہوتا ہے کبھی اچھا یہ دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو یہاں فرمایا وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ کہ اگر تم مقامِ محمود کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو فرائض تک ہی نہ ٹھہر جانا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھنا اور نوافل کے ذریعہ مقامِ محمود کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ اسی لئے رمضان کے روزوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بہت سے نوافل جیسا کہ میں بعد میں بتاؤں گا بیان فرما دیئے ہیں۔

تو وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ کے تیسرے معنی یہ ہیں کہ تم فرائض کے علاوہ نوافل کی طرف بھی متوجہ رہنا۔ اس کے بغیر تمہیں مقامِ محمود حاصل نہیں ہوسکتا۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کھاؤ اور پیئو یہاں تک کہ تمہیں صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے اس کے بعد صبح سے رات تک روزوں کی تکمیل کرو۔

ماہ رمضان کے ساتھ جو فرض تعلّق رکھتا ہے وہ ہے روزہ رکھنا۔ اب یہاں ہمیں یہ بتایا کہ روزہ صبح سے لے کر شام تک رکھنا ہوگا اور اس روزے کے وقت میں جہاں کھانے پینے سے رُکنا ہوگا وہاں جنسی تعلّقات سے بھی احتراز ضروری ہوگا۔

ہر مومن بالغ اور عاقل کے لئے ضروری ہے کہ وہ روزہ رکھے اگر وہ بغیر جائز عذر شرعی روزہ نہیں رکھے گا تو وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک گنہگار ٹھہرے گا۔ (خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۶۸ تا ۷۰)

میں نے فاسق فاجر کے متعلق کہا تھا کہ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (المؤمن: ۵۱) قرآن کریم نے اعلان کیا کہ جو مومن اور مسلم نہیں ناٹ مسلم (Not Muslim) ہیں ان کی دعا اور چیخ و پکار

ضائع ہو جاتی ہے قبول نہیں کی جاتی۔ مومن کے متعلق کیا کہا؟ مومن کے متعلق یہ کہا وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ جو میرے بندے بن جائیں حقیقی معنی میں میرے ہو جائیں تو ان کے دل میں تڑپ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعاؤں کو قبول کرے اور ہم سے ہم کلام ہو۔

پس قرآن کریم نے یہ بھی فرمایا میں تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ قرآن کریم نے یہ بھی فرمایا کہ میں تمہارے اپنے نفوس اور تمہارے رشتہ داروں سے بھی تمہارے زیادہ قریب ہوں۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ جو پکارے گا مجھے مومن اور مسلم اس کو میں جواب دوں گا اور ان کو بھی چاہیے کہ وہ میرے حکم کو قبول کریں یعنی سچے مومن رہنے کی، سچے مسلمان بننے کی کوشش کرتے رہیں اور ایمان پر مضبوطی سے قائم رہیں تا کہ قبولیّتِ دعا کے نتیجہ میں ہدایت پر اور زیادہ پختہ ہو جائیں۔ یہ ہدایت کوئی ایسی ٹھوس چیز نہیں کہ جو بس ایک دفعہ مل گئی ایک جیسی ہر ایک کو مل گئی اور ختم ہو گیا معاملہ بلکہ اس ساری زندگی میں بھی ہدایت میں، قربِ الٰہی میں، خدا تعالیٰ کے پیار کے حصول میں اس کی رضا کی جنتوں کا جو تخیل ہے کہ آدمی کو حاصل ہو جاتی ہیں اس کی رضا کی جنّتیں وہ اس میں ٹھہرتی نہیں بلکہ ہر آن، ہر روز، ہر مہینے میں اس میں زیادتی ہونی چاہیئے اور جو سچا حقیقی مومن ہے ہوتی ہے زیادتی اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد جس جنّت کا وعدہ دیا گیا ہے اس میں عمل کوئی نہیں۔ قرآن کریم کی آیات اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر ہمیں بتا رہی ہے کہ عمل میں وہاں لیکن امتحان نہیں یعنی عمل ہے اس کی جزا ملے گی، وہاں یہ خطرہ نہیں ہے کہ امتحان میں کوئی شخص فیل ہو جائے گا اور جنّت سے نکال دیا جائے گا۔ یہ خطرہ نہیں ہے اطمینان کی زندگی ہے، خدا کا پیار جو ہے وہ ہر روز بڑھتا چلا جائے گا۔

یہاں تو یہ کہا گیا تھا جو دعا کرنے والا مجھے پکارے تو اس کی دعا قبول کرتا ہوں یہاں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ ہر مسلمان مومن کو ضرور مجھے پکارنا چاہیئے۔ ایک اصول بیان کیا۔ سورۂ مومن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المؤمن:۶۱) دعائیں کرو مجھ سے، پکارو مجھے۔ وہاں حکم دیا ہے اور اتنا زور دیا ہے دعا کرنے پر کہ مومن مسلمانوں کو کہا کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ تم میرے حضور عمل کی دنیا میں کچھ پیش کر رہے ہو۔ نماز پڑھ رہے ہو، زکوۃ دے رہے ہو، دوسرے نیک اعمال بجالا رہے ہو مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ (الفرقان:۷۸) اگر تم دعا نہیں کرو گے تمہارے دوسرے اعمال بھی قبول

نہیں کئے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری پرواہ کیا کرتا ہے۔

تو وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ کے مقابلے میں مومن کو یہ بشارت دی گئی کہ خدا تعالیٰ دعائیں قبول کرے گا۔ یہ انذاری پہلو مومن کے سامنے رکھا گیا کہ اگر دعا نہیں کرو گے خدا تعالیٰ تمہاری پرواہ نہیں کرے گا اور ان دو چیزوں کے بعد حکم دیا گیا اُدْعُوْنِيْٓ دعا کرو مجھ سے، میں قبول کروں گا۔ یہ پہلی بشارت ہے جو بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ کے ماتحت ملی۔ (خطباتِ ناصر جلد نہم صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۳)

اللہ تعالیٰ کی ہستی کے متعلق جو بات اس وقت میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سنتا اور انہیں قبول کرتا ہے، سورۃ المؤمن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المؤمن:۶۱) (مجھے پکارو میں تمہاری دعا سنوں گا) اسی طرح سورۃ البقرہ میں اس نے فرمایا اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرۃ:۱۸۷) (جب دعا کرنے والا مجھے پکارے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں) لیکن دعا کی قبولیت کے بارہ میں یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ جب دعا اس کی تمام شرائط کے ساتھ کی جائے تو اللہ تعالیٰ اپنی تمام حکمتوں کے ساتھ اسے قبول کرتا ہے۔ یعنی ضروری نہیں کہ دعا اسی طرح قبول ہو جس طرح بندہ مانگتا ہے بلکہ خدا تعالیٰ اس کی دعا کو اس شکل میں قبول کرتا ہے جو دعا کرنے والے کے حق میں بہتر ہو کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دعا کرنے والے کے حق میں کیا بہتر ہے اور کیا بہتر نہیں ہے۔

پس دعا قبول ضرور ہوتی ہے لیکن ہوتی اس شکل میں ہے جو خدا تعالیٰ کے علم میں دعا کرنے والے کے لئے بہتر ہو نہ کہ اس شکل میں جس میں بندہ اپنی نادانی سے اس کے پورا ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ پھر سورۃ النّمل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ (النّمل:۶۳) یعنی بتاؤ کون کسی بے کس کی دعا کو سنتا ہے جب وہ خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ میں اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب بشارت دی ہے اور وہ یہ کہ تم دعا کرتے چلے جاؤ ایک دن وہ ضرور قبول ہوگی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ انسان مضطرّ ہونے کی حالت میں دعا مانگے اور وہ قبول نہ ہو۔ مضطرّ کی دعا کی قبولیت ایک نہ ایک دن ظاہر ہو کر رہتی ہے یعنی اس کی تکلیف بہرحال دور کر دی جاتی ہے۔ پس السُّوْٓءَ کا دعاؤں کے نتیجہ میں

دور کیا جانا مومنوں کے دل کا مستقل سہارا ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد ششم صفحہ ۱۴۱، ۱۴۲)

آیت ۲۰۱، ۲۰۲ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

ترجمہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ کہتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں اس دنیا کے آرام و آسائش دے اور آخرت کے متعلق ان کو نہ کوئی یقین ہوتا ہے اور نہ دعائیں ہوتی ہیں نہ اس کے لئے کوشش ہوتی ہے۔ ان کی ساری توجہ اور ان کے اعمال کا سارا دائرہ اس دنیا تک محدود رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آخرت میں ان کا کچھ بھی حصہ نہیں ہوتا۔ ایک تو لوگوں کا گروہ یہ ہے۔

انسانوں کا ایک دوسرا گروہ ہے جو یہ دعا کرتا ہے۔ فرمایا: ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں اس دنیا کی زندگی میں بھی آرام و آسائش اور کامیابی و فلاح عطا کر اور اُخروی زندگی میں بھی خوشحالی کے سامان، کامیابی کے سامان اور اپنی رضا کے حصول کے سامان پیدا کر۔ اس طرح پر ہر دو جنتوں کا ہمیں وارث بنا، دنیوی جنّت کا بھی اور اُخروی جنّت کا بھی اور ہر دو جہنم سے ہمیں محفوظ کر، دنیوی جہنم سے بھی اور اُخروی جہنم کی آگ اور اس آگ کے عذاب سے بھی ہمیں بچا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ دوسری آیت وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً جو ہے، اس میں رَبَّنَا کا لفظ پورے پورے شعور کے ساتھ اور اس کے معنی کو سمجھتے ہوئے بولا گیا ہے اور اس میں توبہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ''رَبَّنَا'' اور مانگتے ہیں صرف اس دنیا کے آرام و آسائش کو، نہ انہیں ربّ کی معرفت حاصل ہوتی ہے نہ اس کے معنی کو وہ پہچانتے ہیں اور نہ اپنے زندگی کے مقصود کا انہیں احساس ہوتا ہے اور نہ اس کے لئے وہ کوشاں ہوتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے

فرمایا کہ توبہ کا جو اشارہ ہے اس میں، یہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان ایک وقت تک اللہ کے علاوہ، ربّ حقیقی کے علاوہ بعض دیگر ارباب بھی اپنے سامنے رکھتا ہے۔ اس نے حقیقی ربّ، ربّ کریم کو چھوڑ کے یا اس کے ساتھ ہی دوسرے خدا، ارباب بنا لئے ہیں۔ تو یہاں جو اشارہ ہے توبہ کا اس کے یہ معنے ہیں کہ جو ہم نے بہت سے ارباب اس سے پہلے بنائے ہوئے تھے اب ہم ان کو چھوڑتے ہیں اور ان سے تعلق جو تھا ہمارا اس سے توبہ کرتے ہیں اور اے ربّ حقیقی! رَبَّنَا! ہم تیری طرف آتے ہیں اس توبہ کے بعد۔ اور جب یہ حقیقی معنے میں استعمال ہو دعا میں تو اس میں درد بھی ہے اس احساس کی وجہ سے کہ غیر اللہ کو ربّ بنائے رکھا اور سوز و گداز بھی ہے اس غم کی وجہ سے کہ جو ربّ حقیقی تھا اس سے پورا اور کامل اور حقیقی اور ذاتی تعلق ہم نے قائم نہیں کیا اور اس ہستی کو جو ربّ ہے اور بتدریج کمال کو پہنچانے والی اور پرورش کرنے والی ہے اس سے ہم دور رہے اور اس حقیقت کو نہیں پہچانا کہ انسان کی زندگی کا ایک مقصد تھا اور یہی دنیا سب کچھ نہیں تھی۔ مرنے کے بعد زندہ رہنا تھا انسان کی روح نے اور خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو بتدریج ارتقائی ادوار میں سے گزرنے کے بعد پہلے سے زیادہ حسن میں، پہلے سے زیادہ لذت والی خاصیت رکھنے میں ہمیں وہ نعماء ملتی تھیں اور ان کو ہم بھول گئے اور اسی کو سب کچھ سمجھ لیا تو اس درد اور سوز و گداز کے ساتھ انسان کہتا ہے رَبَّنَا اے ہمارے حقیقی ربّ! اے ربّ کریم!! ہم بھٹکے ہوئے تھے، ہمیں تو نے روشنی دکھائی اور اب ہم تیری طرف لوٹتے ہیں۔ اس معنی میں اس ندا اور التجا میں توبہ کا ایک پہلو بھی ہے لیکن جو رَبَّنَا کہنے والے اس گروہ سے تعلّق رکھتے ہیں جن کا ذکر پہلی آیت میں ہے انہیں تو غیر اللہ سے (انہوں نے جو ارباب بنا لئے اللہ کے علاوہ ان سے) انہیں چھٹکارا نہیں ملا، وہ اللہ پر بھی ایمان لاتے ہیں بظاہر، اپنے حیلوں پر اور دغا بازیوں پر بھی بھروسہ رکھتے ہیں جھوٹ اور افتراء پر ان کا توکّل ہے۔ اپنے علم اور قوت پر ان کو گھمنڈ ہے، اپنے حسن یا مال یا دولت پر ان کو فخر ہے، چوری اور راہزنی اور فریب کو انہوں نے اپنا ربّ بنایا ہوا ہے اور ساتھ ہی ربِّ حقیقی کو بھی پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس دنیا کا مال ہمیں دے، مال حلال ہو یا حرام ہو ہمیں دنیا کا مال چاہیے، اس دنیا کا اقتدار دے خواہ وہ تیرے بندوں کی خدمت کرنے والا ہو یا نہ ہو، جو حیلے اور دغا بازیاں ہم کریں، جو جھوٹ اور افترا ہم باندھیں، جو علم ہم نے حاصل کیا ہو، جو قوت تو نے ہمیں عطا کی ہے اس کو صحیح استعمال کریں یا غلط ہماری منشاء کے مطابق ان کا نتیجہ نکال اور اس دنیا میں ہمیں کامیاب کر،

ہمارے ذاتی حسن، جسمانی حسن کے لوگ عاشق بنیں اور حقیقی حسن جو اخلاق کا حسن، روح کا حسن ہے وہ ہم میں پیدا ہو یا نہ ہو وغیرہ وغیرہ، سینکڑوں بُت ہیں جو بنائے ہوئے ہیں۔ ربّ کے علاوہ سینکڑوں ربّ ہیں جن کی پرستش کرتے ہیں اور جو ربّ حقیقی ہے اس کی دھندلی سی تصویر کو جس کی حقیقت اور معرفت ابھی انہوں نے حاصل نہیں کی اس کو بھی اپنے سامنے رکھتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور دعا یہی ہوتی ہے کہ یہی دنیا ہے سب کچھ اس دنیا میں صحیح یا غلط طور پر ہمارے رفعتوں کے سامان دنیوی لحاظ سے کر دے اور ہمیں اونچا کر دے، ہماری قوت کو زیادہ کر دے خواہ وہ ظالمانہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارے فریب کو اور ہماری چوری کو ننگا نہ ہونے دے اور جو ہم فائدہ حاصل کریں چوری کے ذریعہ سے وہ مال ہمارے پاس ہی رہے اصل مالک کے پاس واپس نہ جانے پائے۔

یہ دعا ہے ان کی جب وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا کی چیز ہمیں دے دے اس حال میں کہ آخرت کا، خدا کے پیار کا، خدا کی نعمتوں کا ان کے دماغ میں صحیح تصوّر قائم نہیں ہوتا۔ وہ جو رَبَّنَآ کہا گیا ہے۔ پہلی آیت میں جس کا تعلّق مانگنے والوں کا تعلّق، وہ ندا کرنے والوں کا تعلّق صرف اس دنیا اور اس دنیا کی زندگی کے ساتھ ہے لیکن یہ جو دوسرا گروہ ہے وہ تو ربِّ حقیقی کو ماننے والا ہے اور غیر اللہ سے کامل طور پر قطع تعلّق کرنے کے بعد جو حقیقی مولا اور ربّ ہے اس کی طرف وہ رجوع کرنے والا ہے اور اسی کے سامنے سرِ نیاز کو جھکانے والا ہے اور اس کے علاوہ ہر شے کو مرے ہوئے کیڑے جتنی بھی وقعت نہیں دیتا۔

تو جو رَبَّنَآ یہاں دو آیتوں میں ہے ان کے معانی میں فرق ہے ایک معنی وہ ہیں جو ایک دنیادار، دماغ کے ذہن میں ہیں اور جو حقیقی معنے نہیں، جس میں خدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے رَبَّنَآ کی ندا نہیں کی جاتی۔

اور ایک دوسرے معنی ہیں جو ایک عارف کی ندا ہے، جو خدا تعالیٰ کی ذات اور صفات کی معرفت رکھنے والے کی دعا ہے جو خدا کے علاوہ ہر شے سے بیزار ہونے والے کی دعا ہے جو ہر چیز اپنے ربّ سے پانے کی امید رکھنے والے کی دعا ہے اور وہ دعا یہ نہیں کہ صرف یہ دنیا مجھے چاہیے۔ دعا یہ ہے کہ اے خدا! اس دنیا کی وہ چیز مجھے نہ دے جو آخرت کی نعماء سے مجھے محروم کرنے والی ہو۔ صرف وہ نعماء اس دنیا کی مجھے دے جو بتدریج تیری ربوبیت کے سایہ میں تیری بہتر سے بہتر نعماء تک لے جانے

والی اور تیرے پیار کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے میں میری ممد اور معاون ہونے والی ہے۔
حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔

انسان اپنے نفس کی خوشحالی کے واسطے دو چیزوں کا محتاج ہے دنیا کی مختصر زندگی اور اس میں آنے والے مصائب، شدائد، ابتلا وغیرہ جو ہیں ان سے وہ امن میں رہے۔ (یہ بیان میں اپنے الفاظ میں کر رہا ہوں) اور دوسرے یہ کہ فسق و فجور اور روحانی بیماریاں جو انسان کو اللہ تعالیٰ سے دُور لے جاتی ہیں، دنیوی نعمتوں کا غلط استعمال، دنیوی نعمتوں کا مہلک استعمال جن کے نتیجہ میں جسمانی بیماریاں بھی پیدا ہوتی ہیں جن کے نتیجہ میں ذہنی تنزل بھی پیدا ہوتا ہے، جن کے نتیجہ میں اخلاق بھی جل کے راکھ بن جاتے ہیں، جن کے نتیجہ میں وہ روحانی طاقتیں جو اس لئے انسان کو دی گئی تھیں کہ اللہ تعالیٰ زمین سے اٹھا کر اسے آسمانوں پر لے جائے وہ ضائع ہو جاتی ہیں اور بعض دفعہ تو بعض لوگ جو ایک حدّ تک رفعتیں حاصل کرتے ہیں وہاں سے گرتے ہیں زمین پر اور ریزہ ریزہ کر دیئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے۔ تو فسق و فجور اور روحانی بیماریاں جو اسے خدا سے دور لے جانے والی ہیں وہ اس سے نجات پاوے۔

دو چیزوں کی اپنی خوشحالی کے لئے انسانی نفس کو ضرورت ہے۔ مصائب اور شدائد اور ابتلا ان سے امن میں رہے اور فسق و فجور اور روحانی بیماریوں سے نجات اسے حاصل ہو۔

پس دوسری آیت میں اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً جو کہا گیا ہے دنیا کا حسنہ یعنی دنیا سے تعلق رکھنے والی خدا کی نگاہ میں جو اچھی چیز انسان کو ملتی ہے وہ یہ ہے کہ کیا جسمانی اور کیا روحانی، انسان ہر ایک بلا اور گندی زیست اور ذلّت سے محفوظ رہے یعنی خدا ہر ایک پہلو سے، دنیا کا ہو یا آخرت کا، اسے ہر بلا سے محفوظ رکھے اور جس رنگ میں خدا دیکھنا چاہتا ہے انسان کو اور اس کے اعمال کو اس رنگ میں اسے اعمالِ صالحہ بجالانے کی توفیق عطا ہو۔

یہ ہے فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً کے معنی جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کئے ہیں اور وَ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً کے معنے آپ نے یہ کئے کہ دنیوی حسنہ کا اس طور پر استعمال کہ جس کے نتیجہ میں اُخروی حسنات انسان کو ملیں اور آپ فرماتے ہیں آخرت کا جو پہلو ہے وہ دنیا کی حسنہ کا ثمرہ ہے۔ اس تمثیل میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دنیا کی حسنات کو ایک درخت کی شکل میں پیش کیا

اور اُخروی زندگی کی حسنات کو ان درختوں کے پھل کی حیثیت سے پیش کیا تو جو خدا کا مومن بندہ اور معرفتِ الٰہی رکھنے والا ہے وہ دعا کرتا ہے رَبَّنَا! اے ہمارے ربّ! توبہ کرتے ہوئے تیری طرف واپس لوٹتا ہوں، تیرے غیر کو کچھ چیز نہیں سمجھوں گا، کامل بھروسہ تجھ پر رکھوں گا، ساری امیدیں تجھ سے وابستہ رہیں گی میری، مجھے جو اس دنیا میں تو نے (جیسا کہ قرآن کریم نے اعلان کیا) اَن گنت نعماء سے نوازا ہے ان کے استعمال کی صحیح توفیق دے۔ جس کے نتیجہ میں میری قوتیں اور استعدادیں صحیح نشوونما حاصل کر کے ایسے اعمالِ صالحہ بجالانے والی ہوں جو تجھے پسندیدہ ہوں جن پر تو مجھے انعام بھی دے، مقبول اعمال صالحہ کی مجھے توفیق دے اور اس کی شکل یہ بن جاتی ہے کہ اگر دنیا کے اعمال اور دنیا کی جدوجہد اور مجاہدہ حَسَنہ جسے کہا گیا ہے وہ درخت ہے تو اُخروی حَسَنہ جو ہے وہ ان درختوں کے پھل ہیں، اس لئے جب یہ شکل بنی تو ضمناً یہ بات بھی ہمارے سامنے آ گئی کہ اسلام جو ہے وہ رہبانیت ان معنی میں کہ دنیا کی بہت سی جائز چیزوں کو بھی چھوڑ دینا، اس کو جائز نہیں سمجھتا۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ دنیا کو چھوڑ اور میرے پاس آ۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز کا صحیح استعمال کر اور میرے پاس آ۔ اگر چھوڑے گا ناشکرا ہوگا اور خدا کے نزدیک ناشکرا اور کافر ہم معنے لفظ ہیں اور اگر دنیا کو چھوڑے گا نہیں میرے بتائے ہوئے طریق پر میری نعمتوں کو استعمال نہیں کرے گا، میری عطا کردہ قوتوں کو میرے بتائے ہوئے طریق پر خرچ نہیں کرے گا تو جنّت سے نکال دوں گا تجھے۔ دنیا کو چھوڑنا نہیں، دنیا میں رہ کر خدا کا بننا ہے، خدا کا ہو کر خدا کے لیے دنیوی زندگی گزارنی ہے، یہ ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً دنیا میں جو حسنہ ملتی ہیں جو چیزیں جو نعماء ملتی ہیں وہ سب اُخروی حسنہ کے حصول کا سامان پیدا کرنے والی ہیں۔ موٹی مثال ہے صحت جسمانی۔ صحت کا ہونا خدا تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے اور ایک صحت مند بدمعاشیوں میں بھی اپنی صحت خراب کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کی ناراضگی کو مول لیتا ہے لیکن خدا کا صحت مند بندہ خدا کے حضور اپنی صحت کے نتیجہ میں ایثار و اخلاص کے وہ کارنامے دکھاتا ہے کہ انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ مثلاً صحابہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو کسریٰ اور قیصر سے جنگیں ہوئیں ان میں (تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے) اتنا فرق ہوتا تھا تعداد میں۔ مسلمانوں کی تعداد اس قدر کم اور کسریٰ کی حکومت جو بہت بڑی ایمپائر تھی اس وقت کی دنیا میں اور قیصر کی حکومت جو بہت بڑی ایمپائر تھی اس وقت کی دنیا میں ان کی فوجیں پانچ گنا سات گنا بعض

دفعہ آٹھ گنا زیادہ ہوتی تھیں۔ اگر پانچ گنا زیادہ بھی ہوں اور ساڑھے سات گھنٹے لڑائی ہو دن میں تو ہر ڈیڑھ گھنٹے کے بعد نئی تازہ دم فوج مسلمان کے سامنے آجائے گی اور ایک مسلمان ساڑھے سات گھنٹے لڑتا رہے گا ہر ڈیڑھ گھنٹے کے بعد تازہ دم فوج میں سے کسریٰ اور قیصر کی فوجوں کا ہر سپاہی صرف ڈیڑھ گھنٹہ لڑے گا۔ مسلمان سپاہی ساڑھے سات گھنٹے ان کے مقابلہ میں لڑ رہا تھا۔ یہ شکل بنی لڑائی میں۔ میں نے بڑا سوچا اور بڑا ہی حیران ہوا ہوں کہ کس قدر صحت اور عزم ایک مسلمان کو خدا تعالیٰ نے دیا۔ اگر عزم ہو اور صحت نہ ہو تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر صحت ہو اور عزم نہ ہو تو کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے کہا ہے کچھ ہو نہیں سکتا۔ اب میں کہتا ہوں کچھ نہیں ہوگا تو ان کو صحت بھی دی خدا نے۔ عزم بھی دیا خدا نے۔ تو صحتِ جسمانی دنیوی حَسَنہ ہے اس دنیا سے جسم کا تعلّق ہے۔ خدا کہتا ہے مجھ سے مانگو صحت اس لئے نہیں کہ عیاشی میں اسے ضائع کرو گے اس لئے مانگو کہ میری راہ میں اس کو خرچ کرو گے اور میرے پیار کو حاصل کرو گے۔ ہر دنیوی نعمت کی ایسی ہی مثال ہے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

صحت کے علاوہ عزّت ہے، دنیوی مال و دولت ہے۔ دنیا کی اولاد ہے خاندان ہیں، عافیت کی فضا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہر چیز جو ہے خدا کہتا ہے مجھ سے مانگو لیکن مجھ سے لے کر میری خوشنودی کے لئے میری بتائی ہوئی راہ پر اسے خرچ کرو۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ کی تفسیر یہ کی ہے کہ انسانی تجربہ بتاتا ہے کہ جہنم اس دنیا کی بھی ہے۔ جہنم وہ بھی ہے جو مرنے کے بعد ہے (اللہ محفوظ رکھے)۔ خدا تعالیٰ ان پر اپنے قہر کی تجلی نازل کرنا چاہے گا جہنم میں بھیج دے گا۔

تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ انسان کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اس ورلی زندگی کے ساتھ طرح طرح کے عذاب اور تکلیفیں لگی ہوئی ہیں۔ خوف کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ خون خرابہ، لڑائی ہو جاتی ہے۔ یہاں میں بعض دفعہ کھیتوں کے کنارے، زمیندار آدھے مرلے پر بھی لڑ مرتے ہیں۔ فقر و فاقہ کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک غربت ہے جو ورثہ میں ملتی اور آگے اگلی نسل کو ورثہ میں چھوڑی جاتی ہے۔ ایک غربت ہے جو ایک امیر آدمی دیوالیہ ہو جاتا ہے اور وہ جو لاکھوں کا مالک ہوتا ہے وہ چند لقموں کے کھانے کی بھی توفیق نہیں رکھتا، مانگنا پڑتا ہے اس کو، بیماریاں ہیں، کوشش انسان کرتا ہے، اس کے مختلف اور سینکڑوں میدان ہیں، ناکامیاں بھی سینکڑوں

ہیں۔ ذلّت وادبار کے اندیشے ہیں۔ ہزار قسم کے دوسرے دکھ ہیں۔ اولاد بیوی وغیرہ کے متعلق تکلیف ہے۔ بچہ بیمار ہوجائے رات کا چین اٹھ جاتا ہے۔ بیوی کے ساتھ ناراضگی پیدا ہوجائے وہ پریشانی کا باعث بن جاتی ہے۔ پھر رشتے داریاں ہیں اور رشتہ داروں کے ساتھ معاملات میں الجھن پیدا ہوجاتی ہے۔ کبھی ورثہ کی کبھی یہ کہ مجھ سے پیار کا اتنا سلوک نہیں کیا جتنا کسی دوسرے رشتہ دار سے کردیا وغیرہ وغیرہ۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں یہ ساری تکالیف اور پریشانیاں جو ہیں یہ دنیا کی جہنّم ہے اور مومن دعا کرتا ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً کہ اے خدا! اس دنیا کی آگ سے ہمیں بچا۔ ہر قسم کی تکلیف، دکھ درد پریشانی جو ہے اس سے تو ہمیں محفوظ رکھ اور ہماری زندگی کبھی بھی تلخ نہ ہو اور انسان یہ دعا کرتا ہے کہ اے خدا! تو ہمیں صحت سے رکھ، ہم سب کو ساری جماعت کو خدا صحت سے رکھے۔ ہر نماز میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ ساری جماعت کو خدا صحت سے رکھے اور بیماروں کو شفا دے۔ ہمیں وعدے دیئے گئے کہ تمہارے مال میں کثرت بخشی جائے گی اولاد میں کثرت بخشی جائے گی۔ (خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۴۱۹ تا ۴۲۶)

اسلامی شریعت ایک کامل شریعت ہے اس میں انسان کے لئے کسی قسم کی تنگی اور حرج نہیں ہے بلکہ یہ اعلان کیا گیا ہے کہ یہ شریعت ہر پہلو سے تمہارے لئے بزرگی اور شرف کے سامان پیدا کرتی ہے۔

اسلامی شریعت جہاں روحانی ترقیات پر روشنی ڈالتی ہے اور ان کے حصول کے لئے ہدایت دیتی اور نصیحت کرتی ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی جو دنیوی نعماء ہیں ان سے بھی انسان کو محروم نہیں کرتی اور اس کے لئے ہمیں یہ دعا سکھائی۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ دنیا کی حسنات کے لئے کوشش کرنے کا بھی حکم ہے۔ ہماری دعا تدبیر اور تدبیر دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم شریعت کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق حسناتِ دنیا کے حصول کی کوشش کرو لیکن صرف اپنی کوششوں پر بھروسہ نہ رکھو بلکہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات کی ہدایت دے اور پھر ایسے طریقوں سے تمہیں وہ دنیوی حسنات عطا کرے جو تم پر خدا تعالیٰ کے قرب کی راہیں کھولنے والی ہوں اور خدا سے دُور لے جانے والی نہ ہوں۔

پس تم دعا کرو کہ حقیقی معنے میں جو حسنات ہیں وہ تمہیں ملیں یعنی محض کوشش اور تدبیر ہی نہ کرو بلکہ

دعا بھی کرو۔ چنانچہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً کے الفاظ میں خدا نے خود ہی دعا بھی سکھا دی اور چونکہ دنیا کی اس مختصر سی زندگی کے بعد ایک نہ ختم ہونے والی اُخروی زندگی ملنی ہے اس لئے ساتھ ہی وَ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً اُخروی حسنات کے ملنے کا بھی ذکر کر دیا اور پھر وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ کے الفاظ میں اُخروی زندگی کی تکالیف سے بچنے کا بھی ذکر ہے۔ بہرحال جب ہم دنیوی لحاظ سے سوچتے ہیں تو اسلامی تعلیم ہمارے لئے دنیوی حسنات اور شرف اور بزرگی کے سامان پیدا کرتی ہے بشرطیکہ انسان کی تدابیر دعاؤں کی بنیاد پر استوار ہوں۔

دنیوی حسنات میں سے مثلاً تجارت ہے۔ اسلام میں تجارت کے جو اصول بتائے گئے ہیں ان پر عمل پیرا ہو کر تجارتیں کامیابی سے چلتی ہیں۔ اگرچہ کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت تو دعا ہے لیکن اس کے جو دوسرے اصول بتائے ہیں ان کو بھی مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً دیانت داری ہے اسلام نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ لین دین میں دیانت داری سے کام لو اور کوئی کھوٹ نہ ہو نہ طبیعت میں کھوٹ ہو اور نہ مال میں تو اس سے تجارت خوب چمکتی ہے۔ چنانچہ دنیا کی تجارت کی تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں تجارت میں وہی افراد اور قومیں کامیاب نظر آتی ہیں جن کی ساکھ قائم تھی۔ وہ جو کچھ کہتے تھے اس کے مطابق مال سپلائی کرتے تھے لیکن اگر یہ ساکھ نہ ہو تو تجارت چل نہیں سکتی۔ مثلاً چند دن ہوئے اخبار میں یہ خبر آئی تھی کہ فیصل آباد میں حکومت نے مسالے بنانے والی ایک کمپنی پر چھاپہ مارا تو اخبار کے کہنے کے مطابق انہیں پتا لگا کہ ایک من ہلدی میں صرف تین سیر ہلدی ہے اور باقی گند ڈالا ہوا ہے۔

پس یہ جو تجارتی بددیانتی ہے اور اشیاءِ خوردنی میں کھوٹ کی ملاوٹ ہے اس سے تجارت چمکتی نہیں۔ اسی لئے جن خطوں میں تجارتی لحاظ سے بددیانت دماغ ہیں ان کی تجارت کا گراف اس طرح بنتا ہے کہ شروع میں وہ بڑی دیانتداری کے ساتھ اچھی طرح گاہکوں کو دیتے ہیں لیکن جب ان کی تجارت چمک اٹھتی ہے تو پھر وہ دھوکا دہی کے ذریعہ سے پیسے کمانے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ دیوالیہ ہو جاتے ہیں کیونکہ جب لوگوں کو پتہ لگتا ہے کہ مثلاً ہلدی کے علاوہ اس میں مضرِ صحت چیزیں بھی پڑی ہوئی ہیں تو لوگ ایسا مال نہیں خریدیں گے۔

آج کی دنیا میں ترقیات کا ایک بہت بڑا حصہ بین الاقوامی تجارت سے وابستہ ہے اور بین الاقوامی

تجارت صرف ساکھ پر قائم ہے مثلاً یہاں کا آدمی انگلستان سے مال منگواتا ہے اور انگلستان والا پاکستان سے مال منگواتا ہے یا اس سے بھی دور دراز کے علاقے ہیں وہاں سے سامان آتا اور جاتا ہے۔ اگر اس میں دیانتداری سے کام نہیں لیا جائے گا تو شاید عارضی طور پر کچھ فائدہ ہو جائے لیکن انجام کار پریشانیاں اٹھانی پڑیں گی۔ انکوائریاں ہوں گی۔ مقدمے چلیں گے۔ پس مستقل کامیابی اس قسم کی بددیانت تجارت میں ہمیں نظر نہیں آتی۔

تجارت کے لئے فراست کی بھی ضرورت ہے اور یہ تو ہے ہی اللہ کی عطا اور دعا ہی سے مل سکتی ہے یا دعا سے قائم رہ سکتی ہے۔ ایک بزرگ صحابی جو کسی زمانے میں مکّہ اور مدینہ کی گلیوں میں پیٹ پر پتھر باندھ کر پھرتے تھے مگر بعد میں ان کے اموال میں اللہ تعالیٰ نے بہت برکت ڈال دی اور وہ اسی کتاب کی وجہ سے تھی جسے خدا تعالیٰ نے نازل کیا اور فرمایا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اس میں تمہاری بزرگی اور شرف کے سامان رکھے گئے ہیں۔ پس صحابہ رضوان اللہ علیہم کو جو بزرگی اور عزّت حاصل ہوئی تھی وہ اس کتاب کے ذریعہ ملی تھی۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کے حضور جھک کر اور خدا سے برکات حاصل کر کے تجارت میں بھی فراست پائی تھی چنانچہ اس بزرگ صحابیؓ کے متعلق آتا ہے کہ جب مدینہ میں اموال آئے اور وہاں بڑی دولت جمع ہوگئی اور تجارت کی ایک بہت بڑی منڈی بن گئی تو اس منڈی میں ایک صبح کو کچھ تجّار ایک لاکھ اونٹ لے کر آ گئے تو انہوں نے جا کر سودا کیا۔ ان کے دوست ایک اور صحابیؓ نے کہا میں باہر گیا ہوا تھا میں نے ان اونٹوں کو باہر دیکھا تھا لیکن چونکہ اس بات کی اجازت نہیں کہ منڈی میں آئے بغیر سودے ہوں اس لئے میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی لیکن میری نیّت یہ تھی کہ جب یہ اونٹ منڈی میں آجائیں گے تو میں خریدوں گا لیکن تم پہلے پہنچ گئے اس لئے تم نے خرید لئے۔ انہوں نے کہا کہ اب تم لے لو۔ کہا کس دام پر۔ بولے جس دام میں میں نے لئے ہیں سوائے اس کے کہ ان کی نکیلیں مجھے دے دو۔ تو اگر ایک نکیل کی قیمت ایک روپیہ ہو تو چند منٹوں میں ان کو ایک لاکھ روپے کا فائدہ ہو گیا۔ اگر نکیل اٹھنّی سمجھ لی جائے تب بھی پچاس ہزار روپے کا فائدہ ہو گیا۔

پس جو خداداد فراست ہے اس کا اثر دنیوی مال و دولت کی تجارت میں بھی نظر آتا ہے۔ اس کا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً کے ساتھ تعلق ہے۔ تاریخ اسلام میں ہمیں اس قسم کی کئی مثالیں ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی تجارت بھی خوب چمکی اور اسی طرح ہر دوسری چیز میں

بھی جو دنیوی حسنات میں شامل ہے انہوں نے بہت ترقی کی۔ مثلاً زراعت ہے اس میں مسلمانوں نے بہت ترقی کی۔ سپین میں مسلمانوں نے بڑی ترقی کی اگرچہ مسلمانوں کو وہ ملک چھوڑنا پڑا اور اس وقت ان پر بڑا ظلم ہوا لیکن اپنے زمانۂ حکومت میں انہوں نے درختوں پر بعض ایسے پیوند کئے جو حیرت انگیز تھے۔

انہوں نے بادام وغیرہ کے درختوں پر گلاب کا کامیاب پیوند کیا چنانچہ جس طرح آڑو اور بادام کے بڑے بڑے درخت ہوتے ہیں اسی طرح وہاں گلاب کے درخت تھے جن پر گلاب کے پھول لگتے تھے۔ غرض شجرکاری اور پھول اُگانے اور ترکاریاں وغیرہ لگانے کے میدان میں مسلمانوں نے جو ترقی کی اس کو دیکھ کر اب بھی دنیا حیران رہ جاتی ہے۔ یہ بھی ایک حیرت انگیز دنیوی حسنہ ہے جو اسلام کی تعلیم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔ (خطباتِ ناصر جلد ہفتم صفحہ ۲۸۷ تا ۲۹۰)

کوشش کے ساتھ ساتھ اسلام نے دعا کرنے پر بھی زور دیا اور یہ دعا سکھادی رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً اس دعا میں صرف یہی نہیں کہا کہ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً بلکہ آخرت کی بھلائی کے ساتھ ساتھ دنیا کی بھلائی چاہنے کی بھی دعا سکھلا دی۔ ظاہر ہے دُنیا کی حسنات ہم نے دنیوی مخلوقات سے حاصل کرنی ہیں۔ انہی سے فائدہ اٹھا کر اپنی آخرت سنوارنی ہے۔ اس لئے اسلام نے یہ اعلان کیا کہ مذہب افیون نہیں ہے۔ وہ شخص بڑا بیوقوف ہے جو یہ کہتا ہے کہ مذہب اسلام بھی افیون کا کام دیتا ہے۔ اسلام نے تو یہ کہا ہے کہ دنیا کی ہر چیز انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے اور انسان کی خدمت پر لگا رکھی ہے لیکن خدا تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النّجم: ۴۰) کی رو سے انسان کو اتنا فائدہ ملے گا جتنا وہ اسکے لئے کوشش کرے گا۔ تب سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (النجم: ۴۱) کی رو سے اور عام قانون کے مطابق کوشش نتیجہ خیز ہوگی۔ انسان کو محنت کا پھل مل جائے گا ایک شخص مثلاً ہزار یونٹ کوشش کرتا ہے اس کو ہزار یونٹ کا پھل مل جاتا ہے۔ میں عام تقدیر کے مطابق بات کر رہا ہوں جو اس دُنیا میں کارفرما ہے خاص تقدیریں جن کو ہم معجزات کہتے ہیں اُن کے متعلّق میں بات نہیں کر رہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ افیون کھا کر سو نہ جانا اور تقدیر کا یہ مطلب نہ لینا کہ ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم نے اپنی جھولیاں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوق سے فائدہ اُٹھا کر بھرنی ہیں تو تمہاری جھولیاں تبھی بھریں گی جب تم اس کے لئے محنت، کوشش

اور مجاہدہ کرو گے۔ محنت نہیں کرو گے تو تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ (خطباتِ ناصر جلد پنجم صفحہ ۴۹۹)

اللہ تعالیٰ سورہ بقرہ میں فرماتا ہے:۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ یہاں دعاؤں کی بنیاد رکھی گئی۔ یہاں یہ فرمایا گیا کہ دنیوی نعماء کے حصول کے لئے بھی دعائیں کریں اور اُخروی نعماء کے حصول کے لئے بھی دعائیں کرو اور وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ کا فقرہ وَرلی زندگی اور اُخروی زندگی کو باندھ دیتا ہے کیونکہ اسی زندگی کی بنیاد پر اخروی زندگی کی جنتوں کا انحصار ہے تو بہت بڑا عالم ہمارے سامنے رکھ دیا گیا۔ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً دنیا کی ساری نعمتیں جو خدا تعالیٰ نے انسان کے لئے پیدا کی ہیں تم ان کے حصول کے لئے دعائیں کرو۔ صرف یہ کہہ کر کہ دعائیں مانگو خاموشی نہیں اختیار کی بلکہ کیا دعائیں مانگو اس کے اوپر بھی بڑی وسیع روشنی ڈالی گئی ہے۔ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً کے دو پہلو ہیں۔ ایک ایسی نعمتیں ہیں ہماری اس وَرلی زندگی سے تعلق رکھنے والی جن کا تعلق خود ہمارے نفس کے ساتھ ہمارے وجود کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو بے شمار قوتیں اور استعدادیں عطا کی ہیں ان کے لئے دعائیں مانگو کہ اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق پروان چڑھیں اور ان قوتوں کو اس لئے دیا گیا انسان کو کہ جو یہ کہا گیا تھا کہ تمہاری خدمت پر ہر شے کو مامور کیا گیا ہے وہ ہر شے سے خدمت لینے کے قابل ہو جائے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثية:۱۴) تمہیں ہر طاقت دے دی گئی تا تم ہر شے سے خدمت لے سکو تو دعا مانگو کہ اس قدر عظیم نعمتیں جو تمہیں ملیں، آنکھ ہے خدا تمہیں توفیق دے کہ آنکھ سے بہترین اور اعلیٰ ترین اور پورے کا پورا فائدہ اٹھانے والے بنو تم۔ یہ دعا خدا تعالیٰ سے مانگو۔ بہت سے آنکھوں والے ہیں جو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی آنکھوں سے فائدہ نہیں اٹھا رہے اور اندھے کے اندھے اس دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں بہت جگہ ان کا ذکر آیا ہے۔ کان ہیں جن سے ایک تو تمہارا اپنا مشاہدہ تعلّق رکھتا ہے ایک تو تمہارا اپنا حصولِ علم تعلق رکھتا ہے مثلاً کلاس میں بیٹھا ہوا طالبِ علم اگر کان کھول کے نہ رکھے تو فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ تو رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (طٰہٰ:۱۱۵) کی دعا میں یہ ساری چیزیں آ گئیں۔ تو یہ جتنی نعمتیں ہیں ان سب کے حصول کے لئے دعا کرو۔ انسان یہ دعا کرے اپنے ربّ سے کہ اے خدا! جو تو نے مجھے قوتیں اور استعدادیں دی ہیں اپنے فضل سے مجھے یہ توفیق عطا کر کہ میں اپنی ہر قوت اور استعداد کی نشوونما کروں اور اسے کمال تک پہنچاؤں اور ان سے بہترین فائدہ تیری رضا کے حصول

کے لئے میں حاصل کروں اور اپنے نفس کی اس کامل اور صحیح نشوونما کے بعد جب خدا تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہو جائے انسان کے تو جو دنیا کی نعمتیں ہیں ان کو حاصل بھی کروں اس رنگ میں جو تجھے پسند ہو اور استعمال بھی کروں اس طریق پر جو تیری رضا کے حصول میں ممد اور معاون ہو۔ بہت سارے لوگ ہیں جو غلط طریق سے خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو حاصل کر کے گناہگار بن جاتے ہیں اور بہت سے لوگ ہیں جو صحیح طریق پر تو خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو حاصل کرتے ہیں لیکن غلط استعمال کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کو ناراض کر دیتے ہیں۔ تو ایک نہ ختم ہونے والا سمندر ہے دعاؤں کا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً کے اس فقرے کے اندر جو خدا تعالیٰ نے بیان کر دیا۔

وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً اور خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں جو میں نے نعماء عطا کیں جو رحمت اور فضل موسلا دھار بارش کی طرح تم پر نازل ہوئے وہ تمہاری دُنیوی اور ورلی زندگی کے ساتھ ہی تو تعلّق نہیں رکھتے اُخروی زندگی کے ساتھ بھی ان کا تعلّق ہے بلکہ اُخروی زندگی کے ساتھ ہی ان کا صحیح تعلّق ہے اور یہ ساری چیزیں اسی لئے تمہیں دی گئی ہیں کہ تم اپنی آخرت کو سنوارو۔ اس واسطے دعا کرو کہ اے خدا! ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا اور یہ دنیا کی نعمتیں ہمیں اخروی زندگی کی جنتوں کی راہوں پر چلا کر ان جنتوں تک پہنچانے والی ہوں تجھے ناراض کر کے ہمیں جہنم کی طرف لے جانے والی نہ ہوں۔

میں نے بتایا کہ یہ دعا جو ہے اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ یہ ایک ایسی دعا ہے جس میں دعا کا ایک عالم کا عالم کھولا گیا اور ہمیں اس چھوٹی سی آیت میں بہت کچھ خدا تعالیٰ نے بتادیا کہ کیا مانگنا ہے کس طرح مانگنا ہے پھر اسی سے آگے ہم چلتے ہیں اس دروازے میں داخل ہو کر۔ (خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۲۹۷، ۲۹۸)

پس رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً کی جب دُعا سکھائی گئی تو اس کے ایک معنے یہ ہوئے کہ ہم خدا سے یہ کہیں کہ اے خدا! ہم نے انتہائی محنت اور انتہائی تدبیر کر دی دُنیا کمانے کے لئے ہم نے اپنی تدبیر کو انتہا تک پہنچا دیا اور اسی طرح دعا کو بھی انتہا تک پہنچا دیا ہے اور اب اس مقام پر کھڑے ہو کر ہم یہ کہتے ہیں رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً کہ اے ہمارے رب! ہماری تدبیر اور ہماری دُعا تیرے فضل اور تیری رحمت کے بغیر نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی اس لئے تو اپنے فضل سے اس کا نتیجہ پیدا کر اور اس

دُنیا کی حسنات میں ہمیں شریک اور حصہ دار بنا اور ہمیں اس کا وارث قرار دے تا کہ ہم دُنیا کی نعمتوں کو حاصل کر کے اور پھر ان نعمتوں کو تیری راہ میں قربان کر کے اپنی روحانی اور اُخروی حسنات کے لئے سامان پیدا کریں۔

غرض حقیقت یہی ہے کہ دُنیا کی حسنات کے بغیر اُخروی حسنات مل نہیں سکتیں۔ میں اس کی ایک مثال دے دیتا ہوں تا کہ بچے بھی سمجھ جائیں۔ جو شخص دُنیا کی حسنات سے کلی طور پر محروم ہو جاتا ہے اس کے اوپر روحانی حکم لگتا ہی نہیں۔ اس کے متعلق لوگ کہہ دیتے ہیں کہ وہ پاگل ہے۔ اس لئے جہاں تک ایک مجنون کی دُنیوی حسنات کے بارے میں محنت اور کمائی کا تعلق ہے یا اس کی کوشش اور مجاہدہ کا سوال ہے وہ یہ کام کر ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ پاگل ہے۔ اس لئے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جسم اور زندگی بخشی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بھائی دیئے، اس کو دوست دیئے اور اس کے اردگرد خیال رکھنے والے انسان بنائے۔ چنانچہ وہ اس کا خیال رکھتے ہیں لیکن جہاں تک اس کی اپنی طاقتوں کا سوال ہے۔ اس کی کسی طاقت کے اوپر کوئی حکم نہیں چلا سکتا۔ وہ اپنے جنون میں کسی آدمی کو قتل کر دیتا ہے تو جج کہتا ہے کہ پاگل تھا اس سے قتل ہو گیا۔ ظلم ہو گیا لیکن اس کے اوپر کوئی الزام نہیں پس جو شخص مجنون ہے اس کے لئے دُنیوی حسنات کی کمائی کے دروازے بند ہیں اور چونکہ دُنیوی حسنات کی کمائی کے دروازے اس کے لئے بند ہیں اسی لئے اُخروی حسنات کی کمائی کا دروازہ بھی اس کے لئے نہیں کھولا جائے گا۔

پس ہم ایسے شخص کو مرفوع القلم کہہ دیتے ہیں۔ ہم اس پر نہ نیکی کا حکم لگاتے ہیں اور نہ بدی کا، نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس نے مالی قربانی دی اور نہ یہ کہ اُس نے مالی قربانی نہیں دی مثلاً اگر کوئی مجنون یا مرفوع القلم آدمی اپنے باپ کی تجوری کو کُھلا پائے اور وہاں سے دس ہزار روپے نکال کر جنون کی حالت میں کسی مستحق کو دے دے تو یہ نیکی شمار نہیں ہوگی کیونکہ اس نے جنون میں آ کر ایسا کیا ہے یہ نیکی نہیں جنون ہے۔

غرض یہ ایک حقیقت ہے اور قرآن کریم نے اسے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے کہ دُنیوی حسنات کے بغیر اُخروی حسنات کے سامان پیدا نہیں ہوتے، اس لئے کہ اُخروی حسنات کے سامان اللہ تعالیٰ کی راہ میں دُنیوی نعمتوں کو خرچ کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ جس کے پاس نعمت ہی کوئی نہیں

وہ خرچ بھی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ جو شخص نامرد ہے وہ پاک باز ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اُسے طاقت ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو چار قسم کی طاقتیں اور صلاحیتیں بخشی ہیں اور ان کے اوپر اُخروی نعمتوں کا انحصار ہے، یہ طاقتیں ماں ہیں اُخروی نعمتوں کے حصول کی، ان کے بغیر کوئی اُخروی نعمت نہیں مل سکتی۔

(خطباتِ ناصر جلد ۴ صفحہ ۲۲۲، ۲۲۳)

پس یہاں عمل ہے اور امتحان ہے اور دوسری زندگی میں عمل تو ہے (نکمّا پن نہیں کہ پوستیوں کی طرح افیم کھا کر بیٹھ گئے اور اونگھتے رہے) عمل ہے مگر امتحان نہیں۔ یہاں عمل ہے اور امتحان ہے۔ وہاں عمل ہے اور ترقیات کے دروازے کھلے ہیں۔ وہاں پیچھے ہٹنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے آگے ہی آگے بڑھنا ہے ہر روز زیادہ ترقیات ملتی ہیں اور ہر روز زیادہ عمل کی توفیق ملتی ہے۔ پس یہ شکل ہے ایک مومن کی زندگی کی۔ پھر دنیا میں اُس کے اعمال بھی یہی رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اور دوسری دُنیا میں بھی اُس کے اعمال یہی رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں انسان مومن صالح، خدا کا محبوب اور مقرب دو قسم کا عمل کرتا ہے۔ ایک عمل ہے اُس کا شکر ادا کرنے کے لئے اور ایک عمل ہے مزید شکر کے سامان کے حصول کے لئے یعنی پہلے سے زیادہ ملے اور زیادہ وہ شکر ادا کرے۔ ہمیں اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً کی دعا سکھائی کہ ہمیں ایسے اعمال کی توفیق عطا کر کہ اس دنیا کی حسنات بھی ہمیں ملیں (مثلاً درخت لگے ہوئے ہوں اور گرمی کم ہو۔ یہ دنیا کے حسنات میں سے ہے) اور ہمیں ایسے مقبول اعمال کی توفیق عطا کر کہ تیری جنّتیں ہمیں یہاں سے جانے کے بعد حاصل ہوں۔ جنتوں کے ہم حقدار ٹھہریں وہاں جانے کے بعد ایک ہی زندگی ہے یہاں ہمارے سامنے دو زندگیاں ہیں۔ ایک اس دنیا کی زندگی اور ایک اُس دنیا کی زندگی اس لئے اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً ہمیں سکھایا لیکن اُس دنیا میں ایک ہی زندگی ہے یعنی جنّت کی زندگی اور اس میں امتحان نہیں ہے لیکن ترقیات ہیں اس لئے وہ ایک ہی قسم کے اعمال ہیں۔ وہ اعمال شکر بھی ہیں اور مزید ترقیات کے حصول کے بھی ہیں یہاں فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً کی جو دعا ہے وہ شکر کے لئے ہے اور ناکامیوں سے بچنے کے لئے بھی ہے کہ جو تو نے دنیا کی نعمتوں کے حصول کے دروازے ہمارے لئے کھولے ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے اور ہمیں توفیق دے کہ ان پر تیرا شکر ادا کرسکیں اور کبھی محروم نہ رہ

جائیں۔ بہرحال یہ مومن کی زندگی کی تصویر ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ مومن جب حقیقی مومن بن جاتا ہے تو اس کا قدم آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ استقامت اور صراطِ مستقیم قریباً ایک مفہوم میں استعمال ہو جاتے ہیں۔ پس استقلال کے ساتھ اور استقامت کے ساتھ کام کرتے چلے جانا یہ مومن کی زندگی کی ایک نمایاں علامت ہے۔

(خطباتِ ناصر جلد ۵ صفحہ ۴۸۱، ۴۸۲)

آیت ۲۰۵ تا ۲۰۷ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۵﴾ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۶﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۷﴾

اسلامی تعلیم نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ وہ اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ عربی زبان میں فساد کا لفظ صلاح کے مقابلے پر آتا ہے اور معنی کے لحاظ سے دونوں لفظ آپس میں متضاد ہیں۔

صلاح کے لفظ کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ انسانی حقوق و واجبات کو ادا کیا جائے اور حقوق و واجبات کی ادائیگی کی اہلیت بھی ہو۔اس کے مقابلے میں فساد کے معنے یہ ہونگے کہ حقوق و واجبات کی اہلیت نہیں۔ یا اُنہیں جان بوجھ کر ادا نہیں کیا جا رہا۔ تاہم اہلیت نہیں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق واجب قرار دیا اور اہلیت پیدا نہیں کی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں اہلیت تو رکھی تھی لیکن اس کی نشوونما نہیں ہوسکی اور نشوونما اس لئے نہیں ہوسکی کہ جس شخص کو وہ خداداد قوتیں ملی تھیں اس نے ان کی نشوونما کی طرف توجہ نہیں کی اور خود گناہگار بنا یا ماحول نے اسے نشوونما کا موقع نہیں دیا۔اس کے لئے سامان میسر نہیں آسکے۔اس لئے اس کی نشوونما نہیں ہوسکی۔

بہرحال فساد کے حقیقی اور بنیادی معنی ادائیگی حقوق کی اہلیت کے فقدان نیز حقوق و واجبات کے ادا

نہ کرنے کے ہوتے ہیں۔اس کے مقابلے میں صلاح کے معنی بنیادی طور پر یہ ہیں کہ حقوق وواجبات کے ادا کرنے کی اہلیت بھی ہو اور حقوق وواجبات ادا بھی کئے جائیں۔

غرض فساد اور صلاح کے معنوں پر میں نے پچھلے خطبہ میں بھی مختصراً روشنی ڈالی تھی اور بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا فساد کا وہ خوشکن اور حسین نتیجہ نہیں نکلتا جو صلاح کا نکلتا ہے اور جو اس دنیا کو بھی جنّت میں تبدیل کر دیتا ہے کیونکہ اگر انسانوں کے حقوق وواجبات ادا نہ ہوں۔اگر انسان انسان کے حقوق پامال کر رہا ہو تو وہ جنّت پیدا نہیں ہو سکتی جو اس صورت میں پیدا ہوتی ہے کہ جب ہر شخص کے جو بھی حقوق اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں وہ اس کو مل جائیں۔

پھر میں نے اپنے گذشتہ خطبہ میں یہ بھی بتایا تھا کہ فطرتی اہلیت یعنی وہ قوتیں اور استعدادیں جو انسان کو دی گئی ہیں وہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بننے کے لئے دی گئی ہیں۔صلاح میں ہمیں صفات باری تعالیٰ کا عکس نظر آتا ہے۔فساد اس کے الٹ ہے۔کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفات کے مقابلے پر آتا ہے، اس کے اعمال کا وہ نتیجہ تو نہیں ہو سکتا جو اس شخص کے اعمال کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے جس کے اعمال اللہ تعالیٰ کی صفات کی مظہریت کے جلوے دکھا رہے ہوں۔

چنانچہ سورۂ بقرہ کی ان آیات میں جن کی میں نے ابھی تلاوت کی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّعۡجِبُکَ قَوۡلُہٗ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا تمہیں دنیا میں ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جو بظاہر بڑی اچھی باتیں کرتے ہیں۔سیاست کے متعلق، سیاسی حقوق کے متعلق، معاشرہ میں حسن پیدا کرنے کے متعلق اور اقتصادی حقوق کو ادا کرنے کے متعلق بڑی دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں۔جن میں حقیقت تھوڑی اور لفّاظی زیادہ ہوتی ہے اور پھر یہی نہیں بلکہ وَ یُشۡہِدُ اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیۡ قَلۡبِہٖ وہ ساتھ ہی ساتھ قسمیں بھی کھاتے ہیں اور اپنی ہر بات پر خدا تعالیٰ کو گواہ ٹھہراتے ہیں۔وہ ہر ایک سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ دیکھو! جس طرح ہماری زبان سے یہ باتیں نکل رہی ہیں اسی طرح ہمارا دل بھی خلوص سے پُر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَ ہُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ایسا شخص سخت جھگڑالو ہوتا ہے۔یہ اس کی خصوصیت ہوتی ہے۔یہ اس کی طبیعت ہوتی ہے جو اس کی لچھے دار تقریروں کے بعد ہر ایک کے سامنے ظاہر ہو جاتی ہے۔اس کے برعکس کوئی بھی شخص جو صلاح چاہتا ہے۔وہ اَلَدُّ الۡخِصَامِ کے زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتا کیونکہ صلاح

خلوص اور ایثار پر مبنی ہوتی ہے۔ایسا شخص دوسرے کے جذبات کا خیال رکھتا اور اس کے لئے ہر ممکن قربانی بھی دیتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے خلوص اور ایثار کے بغیر باہمی جھگڑے ختم نہیں ہوتے۔مگر جو شخص جھگڑالو ہوتا ہے وہ ایثار کی جڑیں کاٹتا ہے۔وہ دوسرے کی ہر بات کو اپنی بے عزتی پر محمول کرتا ہے۔ کہنے والے کے ذہن میں وہ بات نہیں ہوتی مگر یہ اس کی بات کو نئے رنگ میں دوسرے لوگوں کے دماغ میں ڈال دیتا ہے۔جس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں اشتعال پیدا ہو اور وہ جھگڑا کریں۔اب یہ تو ظاہر ہے کہ جھگڑے کے نتیجہ میں فساد ہوتا ہے۔صلاح تو پیدا نہیں ہوتی۔

پس يُعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی رو سے اس کا دعویٰ تو صلاح کا ہوتا ہے لیکن اس کے قول اور فعل کا تضاد نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ گو بعض چیزیں تو لوگ اپنی منافقت کی وجہ سے چھپا لیتے ہیں۔تاہم جو چیز چھپائے نہیں چھپتی۔ وہ ان کا اَلَدُّ الْخِصَامِ ہونا ہے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا کرنے لگ جاتے ہیں اور اس سے ان کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

اب آج کل جو سیاسی فساد ہمارے ملک میں رونما ہے اگر آپ اسے غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے پس پردہ اَلَدُّ الْخِصَامِ کی خصوصیات کارفرما ہیں۔مثلاً ا اور ب دو سیاسی پارٹیاں ہیں ''ا'' کہتی ہے ''ب'' نے میرے خلاف یہ کہا ہے اور ''ب'' ''ا'' کے خلاف الزام لگاتی ہے کہ تم نے جو بات کہی ہے اس کا مطلب یہ ہے۔ چنانچہ جھگڑا کرنے کے لئے اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو شخص اَلَدُّ الْخِصَامِ کے گروہ میں ہے وہ خواہ کتنا ہی مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کے زمرہ میں آجائے اور خواہ کتنی ہی چرب زبانی سے کام لے اور بظاہر بڑی ہی پسندیدہ باتیں کرے اور قسمیں کھا کھا کر کہے میں بڑا مخلص ہوں۔ملک کا استحکام میرا مقصد ہے اور یہ ہے اور وہ ہے۔ یا وہ یہ کہے کہ ہم بھی دنیا میں غلبہ اسلام چاہتے ہیں، اسلامی معاشرہ کے لحاظ سے برسرِ اقتدار جماعت کی طرح ہم بھی مساواتِ محمدی چاہتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے بعد ذرا سی بات میں نہ وہ مساوات باقی رہتی ہے اور پھر جہاں تک انسان کے اقتصادی حقوق کا تعلق ہے نہ وہ حقوق کی ادائیگی باقی رہتی ہے۔نہ وہ حبُّ الوطنی باقی رہتی ہے اور نہ ہی پاکستان کے استحکام کا خیال باقی رہتا ہے۔وہ لڑائی شروع کر دیتا ہے کہتا ہے اچھا تمہارا مطلب یہ ہے یا جو تم نے فقرے کہے ہیں،

اس میں تم نے ہمیں گالیاں دی ہیں۔ کہنے والے کی بات کچھ اور ہوتی ہے مگر یہ اس میں سے اپنے مفسدانہ مطلب کی بات نکالتا ہے اور اسے گالی بنا لیتا ہے اور پھر اپنے حریف کو بغیر مطلب کے بے نقط گالیاں دینے لگ جاتا ہے۔ ہمیں یعنی امت محمدیہ کے ان افراد کو جن کے دل میں اللہ تعالیٰ نے خلوص پیدا کیا ہے اور جو اپنے دل میں غلبۂ اسلام کی تڑپ رکھتے ہیں اور ملکی اتحاد چاہتے ہیں اور نیکی اور تقویٰ کی راہوں کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑی کوفت ہوتی ہے۔ ہمارے دل میں بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے کہ یہ کیا مسخرہ پن ہے۔ یہ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ ایک طرف مذہب سے، دوسری طرف ملک سے، تیسری طرف معاشرہ سے اور چوتھی طرف اقتصادی حقوق کی ادائیگی سے۔

پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے لوگ جن کی زبان بظاہر بہت میٹھی اور باتیں بڑی اچھی معلوم ہوں۔ اصولی طور پر وہ دعوے بھی بڑے کریں کہ ہم یہ ہیں، ہم وہ ہیں۔ ہم یہ کرنا چاہتے ہیں اور ہم وہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا شروع کر دیں یعنی ایک طرف زبان بڑی میٹھی بھی ہے اور دوسری طرف وہ تلوار کی تیز دھار بھی ہے۔ ایسا شخص اپنے دعویٰ میں سچا نہیں ہوتا۔ وہ عملاً فسادی ہوتا ہے۔

(پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا) وَ اِذَا تَوَلّٰى یہ وہ لوگ ہیں کہ جس وقت ان کو کسی سیاسی جماعت کی قیادت ملے۔ (دراصل تَوَلّٰى کے معنے صرف صدر مملکت یا بادشاہِ وقت کے نہیں ہوتے بلکہ ہر چھوٹی موٹی قیادت پر تَوَلّٰى کا لفظ بولا جاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب بھی ان کو کسی قسم کے چھوٹے یا بڑے دائرہ میں قیادت مل جائے) تو سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا کے مصداق بن جاتے ہیں۔ ملک میں خوب دورے کرتے پھرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ملک میں فساد اور بدامنی پیدا ہو۔

پھر فرمایا: يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ آیت کے اس ٹکڑے میں اللہ تعالیٰ نے اقتصادی اور معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی فرمائی ہے۔ مالک اور مزدور یا صاحب اقتدار اور حزب اختلاف کے جھگڑوں کی نوعیت کو اس چھوٹے سے فقرے میں بیان کر دیا ہے۔ دراصل میرے پچھلے خطبہ کی تمہید اسی فقرے کے معانی اور مفہوم کو بیان کرنے کے لئے تھی۔ اس حصہ آیت یعنی يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ کے تینوں لفظ بڑے اہم ہیں۔ ان کے معانی اگر ہمارے ذہن میں حاضر ہوں تو پھر اس فقرے کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔

عربی زبان میں لفظ اَهْلَكَ یا اَلْهَلَاكُ کے تین معنے بیان ہوئے ہیں۔ یہ معنے میں نے مفردات

امام راغبؒ سے لئے ہیں۔ اس لفظ کے ایک معنے انہوں نے ’’کسی چیز کا انسان کے ہاتھ سے نکل جانا‘‘ کے کئے ہیں۔ اگرچہ وہ چیز تلف نہیں ہوتی، ضائع نہیں ہوتی لیکن وہ ایک انسان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ تو اس معنی میں بعض دفعہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں چیز ہلاک ہوگئی یا مثلاً یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی دولت میں سے اس قدر سونا ہلاک ہوگیا۔ عربی محاورہ میں اس کے معنے ہونگے رات کو چور آیا اور سونا چرا کر لے گیا۔ اگرچہ ایک انسان کے ہاتھ سے تو وہ سونا نکل گیا لیکن سونا تو ضائع نہیں ہوا۔ وہ تو اپنی شکل میں موجود ہے۔ اور نہ ہی سونے کی خصوصیت میں کوئی فرق پڑا۔ وہ بازار میں مارکیٹ کے نرخ پر بک جائے گا اور چور کو اس کے پیسے مل جائیں گے یا کسی سنار کے ہاتھ میں یہ مال حرام چلا جائے گا اور وہ اس سے کسی کی بیوی یا لڑکی کے لئے زیور بنا دے گا۔ غرض سونا چونکہ ایک بڑی قیمتی دھات ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی قیمت میں اس قسم کی ہلاکت سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن جب یہ چوری ہو جاتا ہے تو گویا جو اس کا مالک تھا اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کا جو حق دار نہیں تھا اس کے پاس چلا گیا۔ پس اس معنی میں عربی زبان میں اَهْلَكَ یا اَلْهَلَاكُ کا لفظ بولا جاتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز مثلاً سونا ہے وہ ضائع نہیں ہوا لیکن ایک آدمی کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ میں چلا گیا۔ جس کے ہاتھ سے نکلا اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس شخص کا سونا ہلاک ہوگیا۔

اس کے دوسرے معنے ہیں هَلَاكُ الشَّيْءِ بِاِسْتِحَالَةٍ وَ فَسَادٍ یعنی کوئی چیز خراب ہونے کی وجہ سے ہلاک ہوگئی۔ مثلاً کھانے کے متعلق جب عربی میں یہ کہیں گے کہ هَلَكَ الطَّعَامُ تو اس کے معنے ہوں گے کھانا خراب ہوگیا ہمارے جلسہ سالانہ پر صبح دال کی دیگیں پکتی ہیں بعض دفعہ اگر وہ بچ جائیں تو دوسرے وقت تک وہ ابل رہی ہوتی ہیں ایسے موقع پر عربی میں کہیں گے هَلَكَ الطَّعَامُ کھانا ہلاک ہوگیا یعنی خراب ہوگیا۔

پھر اِسْتِحَالَۃٌ کے ایک معنی تَحَوَّلَ مِنْ حَالٍ اِلٰی اٰخِرٍ کسی چیز کی حالت بدل کر دوسری حالت میں آگئی۔ دراصل هَلَكَ الطَّعَامُ کے بنیادی معنی بھی یہی ہیں تاہم اس کی شکل تھوڑی سی بدلی ہوئی ہے۔ اِسْتِحَالَۃ کے دوسرے معنے صَارَ مَحَالًا کے ہوتے ہیں اور محال کے معنے باطل کے ہیں یعنی ایسی چیز جو ہر جہت سے فساد کی مقتضی ہو عربی زبان میں محال کہلاتی ہے۔

اَهْلَكَ یا (اَلْهَلَكُ) کے تیسرے معنے موت کے ہوتے ہیں۔ یعنی انسانی زندگی میں بنیادی تبدیلی کا رونما ہونا ہم تو روح کو زندہ سمجھتے ہیں ہم روح اور مادی اجزاء کے ملاپ کو دنیوی زندگی سمجھتے ہیں۔ اس ملاپ کے نتیجہ میں ایک نئی چیز پیدا ہوتی ہے اور وہ انسان ہے جسے اس دنیا کا عقل اور شعور دیا گیا ہے۔ جب انسان کی یہ کیفیت باقی نہ رہے تو اس پر موت وارد ہو جاتی ہے۔ البتہ جسم کے ذرے بالکل ضائع نہیں ہو جاتے یہ موت والی ہلاکت بھی ایک خاص معنی میں استعمال ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اسی واسطے امام راغبؒ نے اس کو علیحدہ تیسری شکل میں ہمارے سامنے رکھا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ صلاح کا دعویٰ کرنے والے بڑے بڑے لوگ ہیں۔ یہ درحقیقت دنیا میں فساد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہر قسم کی (ہر سہ معنی میں) ہلاکت کی تدبیریں کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ جن لوگوں کا کسی چیز کا حق بنتا ہے ایسے سامان پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں وہ چیز نہ رہے یعنی وہ چیز تو قائم رہے مگر جس کا اس پر حق تھا اس کے پاس نہ رہے دوسرے یہ کہ جو چیز ان کے پاس ہو اس کے اندر خرابی پیدا ہو جائے جیسا کہ مثلاً (ذرا سوچنے کی بات ہے) بلیک مارکیٹنگ ہے۔ یہ کھانے میں پیدا ہونے والی خرابی تو نہیں لیکن انسان کے ہاتھ میں مثلاً نقدی ہے اس میں یہ خرابی پیدا ہوگئی کہ پہلے ایک روپے میں مثلاً تین سیر آٹا ملتا تھا مگر بلیک مارکیٹنگ کے نتیجہ میں اسی روپے سے ڈیڑھ سیر آٹا ملتا ہے۔ پس اس روپے کا جو استعمال اور استفادہ ہے اس کے اندر خرابی پیدا ہوگئی۔ گو یہ دال کے ابلنے والی خرابی تو نہیں ہے مگر روپے کی قدر یا قیمت میں خرابی کے مترادف ضرور ہے۔

پھر یہ کہ ایسی صورت میں صلاح کی بجائے فساد کی حالت پیدا ہو جاتی ہے مثلاً یہ کارخانوں کی جو تالہ بندی ہے اس سے بھی فساد پیدا ہوتا ہے۔ اس سے صلاح کی حالت فساد کی حالت میں بدل جاتی ہے اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے مزدوروں کو کام کرنے کی جو قوتیں اور طاقتیں عطا فرمائی ہیں کارخانے داران کا وہ حق ادا نہیں کر سکتے۔ مگر جتنا وہ کام کر سکتے تھے تالہ بندی کے نتیجہ میں اس کے دروازے بھی الٹے بند ہو گئے۔ دوسرا کام ان کو کوئی ملا نہیں تو ظاہر ہے وہ خود بھوکے رہیں گے۔ ان کے بچے بھوکے رہیں گے جیسا کہ میں نے بتایا ہے۔ حالتِ صلاح کی بنیادی کیفیت یہ ہے کہ حقوق ادا ہوں لیکن جس مزدور کے اوپر تالہ بندی کے نتیجہ میں کام کا دروازہ بند کر دیا گیا تو ایک طرف اس کی طاقتوں اور قوتوں کی نشوونما رک گئی دوسری طرف اس کے حقوق کی ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اور

بھی زیادہ مفلوک الحال ہوگیا۔ پس هَلَاكُ الشَّيْءِ بِاسْتِحَالَتِهٖ وَ فَسَادٍ کی رو سے صلاح یعنی امن کے حالات میں تالہ بندی کے نتیجہ میں فساد کی کیفیت پیدا کرنا ہلاکت ہے اور یہ عمل سراسر باطل ہے اور حق کے صریحاً خلاف ہے۔ اس سے باہمی طور پر ہم آہنگی نہیں بلکہ دوری پیدا ہو جاتی ہے۔

میں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو بنیادی طور پر استعدادیں بخشی ہیں اور اس دنیا کی ہر چیز کو استعدادوں کے ذریعہ استعمال کے لئے پیدا کیا ہے اس کا نام ہم تسخیرِ عالمین رکھتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تمہارے لئے ہم نے اس عالمین کی ہر چیز کو مسخر کر دیا ہے دنیا کی ہر چیز کو تمہارا خادم بنا دیا ہے۔ تمہاری قوتوں سے اثر قبول کرنے کے لئے اس کائنات کی ہر چیز کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک خاصیت رکھ دی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بار بار فرمایا ہے کہ تم کوشش کرو اور ان سے فائدہ اٹھاؤ۔

اَهْلَكَ یا اَلْهَلَاكُ کے تیسرے معنے موت کے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے جب فساد ہوتا ہے تو مزدور مارا جاتا ہے اور مارا وہ جاتا ہے جو معصوم ہوتا ہے۔ مثلاً پچھلے دنوں خواہ مخواہ زبان کا جھگڑا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ہنگامے ہوئے جلوس نکالے گئے۔ اب جس وقت جلوس نکلتا ہے تو وہ بیچارا غریب مزدور جسے پانچ روپے دے کر کہا کہ جا کر جلوس نکالو یا کسی کے خلاف غلط باتیں بتا کر کہا کہ جا کر جلوس نکالو دراصل وہ گنہگار نہیں وہ تو دھوکا خوردہ اور فریب خوردہ ہے۔ گناہگار وہ ہیں جو غریب آدمیوں کو دھوکا اور فریب دیتے ہیں۔ چنانچہ جب جلوس نکلتے ہیں تو مرتے ہیں تو بیچارے مزدور۔ جو لوگ انہیں دھوکا دیتے ہیں وہ پیچھے مزے سے بیٹھے ہوتے ہیں۔

پس یہ جو موت ہے یہ صریح طور پر فساد ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ بغیر حق کے کسی کی جان نہیں لینی۔ اس لئے ان بیچاروں کی جان لینے کا تو حق ہی نہیں بنتا لیکن ہنگامہ کھڑا کر کے شکل ایسی بنا دی کہ جان لینے والوں نے کہا کہ ان کو مارو۔ حالانکہ وہ فسادی نہیں ہوتے فسادی تو پیچھے کوئی اور دماغ ہے کوئی جیب ہے جس میں پیسے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ فسادی ہے۔ اس کے اوپر فساد کو دور کرنے والی تلوار چلنی چاہیے نہ کہ اس بیچارے معصوم پر جس کا دراصل قصور نہیں ہے کیونکہ وہ یا تو دھوکے میں آ کر یا اپنی غربت کی وجہ سے یا پھر اس وجہ سے کہ پہلے اس کے حقوق ادا نہیں ہوئے جلوس میں شامل ہوتا ہے جس شخص کو اس کے حقوق مل چکے ہیں وہ پانچ روپے کی خاطر فساد نہیں کرے گا۔ وہ

اتنی تھوڑی سی رقم کی خاطر اپنی موت کو دعوت نہیں دے گا۔فساد کرنے پر وہی شخص آمادہ ہوگا جسے یا تو بہکایا، ورغلایا گیا ہو یا جس کے حقوق تلف کئے گئے ہوں اور اس کو اس حالت میں کر دیا گیا ہو کہ وہ فساد میں کود پڑے یعنی خدا تعالیٰ نے اس کی جو حالت بنائی تھی اس کو بدل کر اس حالت میں کر دیا جائے کہ وہ مجبوراً پیسے لے کر فسادی گروہ میں شامل ہو جائے۔اب یہ تو ظلم ہے کہ جنہوں نے دوہرا گناہ کیا وہ تو چھوڑ دیئے جائیں لیکن جو درحقیقت معصوم تھے وہ گولیوں کا نشانہ بن جائیں۔ویسے ہم تو خدا تعالیٰ کے عاجز بندے ہیں۔اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے۔اس کا علم کامل ہے وہ جانتا ہے کہ کون فسادی ہے اور کون نہیں ہے لیکن بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ایسے شخص کا بھی گناہ کا منشاء نہیں ہوتا بلکہ وہ دھوکے میں آجاتا ہے۔جس طرح حضرت آدم علیہ السلام شیطان کے دھوکے میں آگئے تھے یہ مزدور بیچارے بھی دھوکے میں آجاتے ہیں اور بعض اپنی قیمتی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

بہرحال يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ میں يُهْلِكَ کے یہ تین معنے ہیں۔میں نے بتایا تھا کہ اس وقت صرف ہمارے ملک ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ کی حالت ہمیں نظر آتی ہے۔قرآن کریم کی اس پیشگوئی کے مطابق ہمیں ہر جگہ فتنہ وفساد دکھائی دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو مفسد ہے وہ ہلاکت کے سامان پیدا کرتا ہے۔چنانچہ اردو میں جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص ہلاکت کے سامان پیدا کرتا ہے یا عربی زبان میں کہیں اَهْلَكَ تو اس کے تین معنے ہوتے ہیں۔ایک یہ کہ جن چیزوں پر ان کا (مزدور کا) حق تھا اور جو ان کو ملی تھیں وہ ان سے چھین لی جائیں اور وہ کسی اور کے پاس چلی جائیں۔یہ معنے آج کی دنیا پر چسپاں ہوتے ہیں۔دوسرے معنے کچھ تھوڑے سے اختلاف اور شاخوں کے ساتھ تَحَوَّلَ مِنْ حَالٍ إِلَى اُخَر اور صَارَ مَحَالًا کے لحاظ سے یہ ہیں کہ مفسد ہلاکت کے اسباب پیدا کر دیتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔جن سے اللہ تعالیٰ پیار نہیں کرتا بلکہ ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔تیسرے معنے موت کے ہیں۔مفسد بے گناہوں کی موت کے سامان بھی پیدا کر دیتا ہے۔غرض تینوں معنوں میں ہلاکت کا لفظ اس دنیا کے فساد کے ماحول پر چسپاں ہوتا ہے لیکن آگے ہلاکت کے بنیادی طور پر عقلاً اور مشاہدۃً دو مفعول بن سکتے ہیں ایک ”حرث“ کی ہلاکت اور دوسرے نسل کی ہلاکت۔عربی زبان کے لحاظ سے حرث کے جو معنے ہیں

اور جس رنگ میں اسے اس آیت میں رکھا گیا ہے اس سے ایک بڑا عجیب مفہوم پیدا ہوتا ہے اور درحقیقت یہ لفظ ایک وسیع معنوں کی نشاندہی کر رہا ہے۔ چنانچہ حرث کے معنی عربی زبان میں صرف کھیتی کے نہیں ہوتے۔ ویسے کھیتی کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے یعنی جو محروث ہے اسے بھی حرث کہتے ہیں لیکن اس کے اصل معنے کھیتی کے نہیں ہوتے۔ اس کے اصل معنے مادی ذرائع پیداوار کے ہیں۔ جن کے اندر انسان کا اپنی محنت سے ایسی تبدیلیاں پیدا کرنا مقصود ہے کہ وہ انسان کی فلاح کے سامان کا ذریعہ بن جائیں تاہم یہ لفظ جب زمین میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنے ہوتے ہیں۔

اِلْقَاءُ الْبَذْرِ فِي الْاَرْضِ وَ تَهَيُّؤُهَا لِلزَّرْعِ یعنی کھاد وغیرہ ڈال کر اور ہل وغیرہ چلا کر زمین کو کاشت کے قابل بنا دینا یعنی جو اس سے ہم نے پیداوار لینی ہے زمین کو اس کے قابل بنا دینا اسی طرح کھیتی کو یا کمائی کو جو ہم اس سے حاصل کرتے ہیں اس کو بھی حرث کہتے ہیں۔ تاہم اس کا اصل اور بنیادی مفہوم یہ ہے کہ مادی ذرائع کو اپنی کوشش کے نتیجہ میں اس قابل بنا دینا کہ اس سے ہم اپنی انفرادی اور خاندانی اور ملکی اور عالمگیر فلاح و بہبود کے سامان پیدا کر سکیں۔ یہ ہیں حرث کے اصل معنے۔ ویسے جب عربی میں ہم یہ کہتے ہیں کہ حَرَثَ نَاقَتَهٗ تو اس کے معنے ہوتے ہیں اِذَا اسْتَعْمَلَهَا یعنی اونٹنیوں کا استعمال کیا اور اونٹنیوں کا استعمال تو ان کی سواری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اونٹ بڑا مفید جانور ہے۔ اس کا گوشت کھائیں تب فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کی کھال کو استعمال کریں تب فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کی ہڈیوں کو مختلف کاموں میں استعمال کریں تب فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کے دودھ کو استعمال کریں تب فائدہ پہنچتا ہے یا پھر اس پر سواری کریں خصوصاً خلوص نیت کے ساتھ حج کے لئے جائیں تب فائدہ پہنچتا ہے۔ چنانچہ ایک صحابی سے کسی نے پوچھا کہ فلاں موقع پر تم نے اپنی اونٹنیوں کا کیا کیا تھا۔ تو انہوں نے کہا حَرَثْنٰهَا ہم نے ان کا موقع کے لحاظ سے استعمال کیا یعنی ان پر سواری کی۔

یہ سارے معنے امام راغبؒ نے کئے ہیں نیز وہ لکھتے ہیں:۔ ’’كَمَا أَنَّ بِالْاَرْضِ زَرْعٌ مَابِهٖ بَقَاءُ اَشْخَاصِهِمْ ‘‘ یعنی زمین مادی ذرائع پیداوار کی علامت ہے۔ سورج کی شعاعیں زمین کے اندر جذب ہونے کے بعد ہمارے کام آتی ہیں۔ زمین سے مراد یہ سارا کرۂ ارض اور اس کی ہوا وغیرہ ہے اسے قرآن کریم کی رو سے الارض کہا جاتا ہے اور یہ ذرائع پیداوار کی ایک علامت ہے۔ پس قرآن کریم نے زمین کو ذرائع پیداوار کی ایک علامت ٹھہرایا ہے۔

چنانچہ ان معنوں کی رو سے حرث سے یہ مراد لی جائے گی کہ زمین سے ایسا کام لیا جائے جس سے انفرادی اور اجتماعی بقاء کے سامان پیدا ہو جائیں۔ اس کو اصل میں حرث کہتے ہیں۔ اب زمین سے کام لینے کا مطلب یہ ہے انسان کی جو جسمانی طاقتیں ہیں انکی کمال نشوونما کے لئے ذرائع پیداوار سے کام لیا جائے کیونکہ جب تک انسان کی جسمانی طاقتیں اپنے نشوونما کے کمال تک نہیں پہنچتیں اس وقت تک دوسری صلاحیتیں اور استعدادیں مثلاً ذہنی، اخلاقی اور روحانی استعدادوں کی نشوونما ممکن ہی نہیں جسمانی طاقت دوسری استعدادوں کے پنپنے کے لئے بنیاد کا کام دیتی ہے مثلاً انسانی جسم میں دماغ کے اندر کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو ایسے شخص کو ہم کہتے ہیں کہ یہ مجنون ہو گیا ہے۔ اس خاص قسم کی خرابی کے نتیجہ میں نہ وہ ذہنی نشوونما حاصل کر سکتا ہے نہ اخلاقی اور روحانی نشوونما حاصل کر سکتا ہے یا جب کوئی شخص لنگڑا ہو جائے یا کسی اور وجہ سے معذور ہو جائے تو وہ جسمانی طاقتوں کے نشوونما نہ پانے کی وجہ سے ذہنی اور اخلاقی استعدادوں کی نشوونما سے ایک حد تک محروم ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایسا شخص جہاد میں شامل نہیں ہو سکتا۔ وہ جہاد کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔ جہاد میں شامل نہ ہو کر انسان صرف اخلاقی اور روحانی قوتوں کی نشوونما ہی سے محروم نہیں ہوا وہ ذہنی قوتوں کی نشوونما سے محروم ہو گیا۔

انگریزی کا محاورہ ہے یو لِو ٹو لرن (You live to learn) یعنی زندگی کا ہر مشاہدہ ہمارے لئے بڑا اہم ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ہمارے لئے معلم کے طور پر بنایا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہمیں کچھ نہ کچھ ضرور سکھاتا ہے۔ اگر ہماری جسمانی طاقتیں کسی لحاظ سے ہمارے مشاہدات کو ایک حد تک محدود کر دیں تو ہماری ذہنی نشوونما اتنی وسیع نہیں ہو سکے گی جو دوسری صورتوں میں ممکن ہے۔

پس حرث کے معنے بنیادی طور پر یہ ہیں کہ بنیادی ذرائع پیداوار کو ایسے رنگ میں استعمال کرنا کہ انسان کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں اپنے اپنے دائرہ استعداد میں اپنے نشوونما کے کمال کو پہنچ جائیں۔

جہاں تک نسل کی ہلاکت کا سوال ہے۔ نسل کے معنے ولد یا اولاد ہی کے نہیں ہوتے نسل کے بنیادی اور حقیقی معنے جس سے آگے شاخوں کی طرح دوسرے معنے نکلتے ہیں (امام راغبؒ لکھتے ہیں) یہ ہیں اَلْاِنْفِصَالُ عَنِ الشَّیْءِ کسی چیز سے علیحدہ ہو کر اس کا حصہ نہ رہنا نسل کہلاتا ہے۔ یعنی اس رنگ میں حصہ نہ رہنا ورنہ تو بہت سے پہلوؤں کے لحاظ سے حصہ رہتا ہے اسی وجہ سے جو شخص جگہ کو جلدی جلدی چھوڑے تو ہم کہتے ہیں وہ دوڑ رہا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں نَسَلَ ۔ یَنْسَلُ اِذَا سَرَعَ یعنی جب آدمی

تیزی سے دوڑنے کے نتیجہ میں جلدی جلدی جگہ بدلتا ہے تو اس کو نسل کہتے ہیں۔ امام راغبؒ نے مفردات میں ایک عجیب محاورہ دیا ہے۔ دراصل میں اسی چیز کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ امام راغبؒ نے مفردات میں لکھا ہے کہ نسل کا لفظ اس محاورے میں استعمال ہوا ہے۔

اِذَا طَلَبْتَ فَضْلَ اِنْسَانٍ
فَخُذْ مَا نَسَلَ لَكَ مِنْهُ عَفْوًا

یعنی اگر تم کسی آدمی کی بزرگی کو دیکھنا چاہو تو تم اس کے حسن سلوک کو دیکھو جو رضائے الٰہی کے لئے وہ تم سے کر رہا ہے۔ تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ وہ کس قسم کا انسان ہے۔ دراصل عَفْوًا کے معنے ہوتے ہیں رضائے الٰہی کے حصول کے لئے حسن سلوک کرنا۔ کیونکہ عَفْوًا کہیں تو اس سے اَلْقَصْدُ لِتَنَاوُلِ الشَّيْءِ مراد ہوتی ہے۔ پس مَا نَسَلَ لَكَ مِنْهُ عَفْوًا کے معنے ہوں گے جو اس نے تجھ سے حسن سلوک کیا عفو کے طور پر یعنی کسی چیز کے حصول کے لئے تو چونکہ انسانی فضل رضائے الٰہی ہی کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ جو شخص رضائے الٰہی کے حصول کے لئے تجھ سے حسن سلوک کرتا ہے اس سے اس کا فضل ظاہر ہوتا ہے۔

اسی طرح نسل کے معنے چھوڑ دینے کے بھی ہوتے ہیں مثلاً جب شہد اپنے چھتے سے خود بخود نکلے تو اس شہد کو اَلنَّسِيْلَةُ کہتے ہیں یعنی اس کو آگ کے اوپر گرم کر کے نہیں نکالا جاتا بلکہ بعض دفعہ وہ خود بخود بہہ نکلتا ہے۔ ہمارے پاس بہت سارے دوست شہد لے آتے ہیں یا ہم خود اپنے باغ سے چھتّے اترواتے ہیں۔ چنانچہ ہم شہد نکالنے کے لئے یہ آسان طریق اختیار کرتے ہیں کہ ایک ململ کے کپڑے میں چھتے کا شہد والا حصہ باندھ کر لٹکا دیتے ہیں اور نیچے برتن رکھ دیتے ہیں۔ اس طرح شہد اپنے ہی وزن سے کشش ثقل کی وجہ سے بہہ نکلتا ہے غرض جس شہد کو نکالنا نہ پڑے بلکہ خود بخود بہہ نکلے۔ اس کو نَسِيْلَةٌ کہتے ہیں۔ اسی طرح جب دودھ دینے والے جانوروں کے تھنوں سے دودھ نکالا نہ جائے بلکہ خود بخود بہہ نکلے تو ایسے دودھ کو اَلنَّسَلُ کہتے ہیں۔ بعض عورتوں کے پستان سے بھی دودھ بہہ نکلتا ہے اور کپڑوں کو خراب کر دیتا ہے عورتیں سمجھتی ہیں کہ ان کے کپڑے خراب ہو گئے اسی طرح بھینس یا بکری کا دودھ بھی بعض دفعہ خود بخود گرتا رہتا ہے۔

پس اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز جو خود بخود علیحدہ ہو جائے وہ نَسِيْلَةٌ کہلاتی ہے۔ اس جگہ نسل

کے معنے ہوں گے کہ انسان کی وہ قوتیں اور طاقتیں جن سے اس کے اعمال خود بخود فطری بہاؤ کے ساتھ سرزد ہوتے ہیں مثلاً ایک صاف شفاف اور ٹھنڈے اور لذیذ پانی کے چشمے سے جس طرح پانی خود بخود بہہ نکلتا ہے اسی طرح انسان کے اعمال اس کی طاقتوں سے خود بخود بہہ نکلتے ہیں.........اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو طاقتیں اور استعدادیں دی ہیں جتنا جتنا ہم ان کا استعمال کرتے اور ان کی نشوونما کرتے چلے جاتے ہیں اتنا اتنا وہ چشمہ سے بہنے والے پانی کی طرح خود ہی فلوآؤٹ (Flow out) یعنی ابل کر باہر نکل رہی ہوتی ہیں اور اسی معنی میں نسل کا لفظ استعمال ہوتا ہے یعنی انسانی قوتوں اور استعدادوں سے افعال اور اعمال خود بخود سرزد ہونے لگتے ہیں مثلاً مال ہے، روپیہ پیسہ ہے سوائے چند کنجوس لوگوں کے جو دنیا میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں باقی لوگ اپنے مال و دولت کو خرچ کرتے ہیں۔ روپیہ خرچ کے ذریعہ خود بخود ہماری جیبوں سے علیحدہ ہوتا رہتا ہے۔ اب مثلاً آپ اپنے بچے کو پڑھانے کے لئے استاد مقرر کرتے ہیں اور اسے روپے دیتے ہیں تو گویا اس طرح آپ کے ہاتھ سے روپیہ نکل گیا یا مثلاً گندم ہے آپ اسے کھاتے ہیں اسے کنزیوم (Consume) کر جاتے ہیں گندم کی شکل میں کھاتے ہیں اس سے آپ کو مثلاً چلنے کی طاقت مل گئی آپ نے آٹھ میل سیر کی۔ کچھ طاقت آپ کے جسم سے نکل گئی۔ انسانی وجود کے اندر ساری قوتیں بند تو نہیں رہتیں۔ وہ انسانی جسم سے باہر نکل رہی ہوتی ہیں۔ غرض جسمانی طاقتوں کے آؤٹ فلو (Out flow) کو باندھ دیا ہے نشوونما کے ساتھ۔ ہم جتنا جتنا ان طاقتوں کو استعمال کرتے ہیں اتنا ہی یہ چیزیں نشوونما میں ممد و معاون بن جاتی ہیں۔

پس بنیادی طور پر یہی دو چیزیں اس دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر رہی ہیں مثلاً ایٹم کی ایجاد ہے۔ ایٹم پاور کی ایجاد ہے۔ دوسری مادی چیزیں ہیں جنہوں نے مختلف شکلیں اختیار کر رکھی ہیں۔ پھر یہ ساری یونیورس ہے۔ یہ ذرائع پیداوار کی علامت ہے۔ ذرائع پیداوار کے اندر نسل یعنی انسانی طاقتیں تبدیلیاں پیدا کرتی ہیں اور اس طرح یہ کام کی چیزیں بن رہی ہیں۔ گویا آسمان سے لے کر زمین تک ہم نے انسانی ہاتھ کا تصرف دکھا دیا مثلاً انسان چاند پر پہنچ گیا۔ اب چاند پر پہنچنے کے لئے آسمان سے کوئی اڑن کھٹولا تو نہیں آ گیا تھا۔ یہ انسان کی استعدادیں اور قوتیں تھیں جو پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہی تھیں یعنی سائنس دانوں نے فزکس کے اصول پر سائنسی تحقیق کی ان قواعد اور قوانین کے مطابق عمل کیا جو خدا تعالیٰ نے بنائے ہوئے ہیں تو وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے۔ اب مثلاً جو

حساب دان سائنٹسٹ ہیں انہوں نے اپنی دریافت اور ایجاد کی بنیاد حساب پر رکھی۔ حساب بھی ایک سائنس اور فلسفہ بن گیا ہے۔ چنانچہ وہ ازروئے حساب سوچ رہے تھے فکر و تدبر کر رہے تھے۔ خود ہمارے ڈاکٹر سلام بھی فکر و تدبر میں لگے رہتے ہیں اس کی کچھ خصوصیتیں علم طبعی سے ملتی ہیں۔ تاہم جہاں تک سائنسی تحقیق میں حساب کا تعلق ہے سائنس دان بے شمار اربعے لگاتے ہیں اور بڑی لمبی لمبی ضربیں اور تقسیمیں کرتے ہیں۔ یہ چونکہ بڑا لمبا حساب بن جاتا ہے اس لئے انسان نے اس کو آسان کرنے کے لئے ایک مشکل سا مضمون بنا دیا ہے جسے الجبرا کہا جاتا ہے۔ چونکہ مجھے یہ مضمون سکول کے زمانے میں مشکل لگتا تھا اس لئے میں نے اسے مشکل کہہ دیا ہے۔ بہرحال حساب کے مضمون کو آسان کرنے کے لئے لوگوں نے الجبرا بنا دیا۔ اور اس کی علامتیں بنالیں مثلاً کہہ دیا ا۔ب۔ج کا یہ مطلب ہے اور پھر لوگ اس سے اصولاً کچھ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ چنانچہ سائنس دانوں نے انہی اصول وقواعد کے مطابق کچھ نتائج اخذ کئے اور چاند پر جانے کے قابل ہو گئے یا زمین میں اٹامک انرجی کو استعمال کرنے لگے۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرض سائنس دانوں نے اپنی خداداد طاقتوں اور قوتوں کو قوانین قدرت کے مطابق استعمال کیا۔ آخر ایٹم کی طاقت کا پتہ کیسے لگا؟ یہ انسان کی طاقت تھی، یہ اس کی استعداد تھی جو اس کے جسم سے باہر نکل آئی گویا اس کی طاقت کی نسل ہو گئی۔ اس کا انفصال ہو گیا۔ یہ باہر نکلی اور باہر نکلتی چلی جا رہی ہے۔ یہ ایک چشمہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اسی طرح جب تک انسان زندہ ہے اس کی طاقتیں باہر نکلتی چلی جائیں گی۔ یہ ایک تبدیلی ہے جو مسلسل رونما ہوتی چلی جائے گی۔

پس حَرْثٌ سے مراد مادی ذرائع ہیں اور نسل انسان کی محنت ہے۔ انسان اپنی طاقتوں کو کام پر لگاتا ہے۔ یہ دو بنیادی چیزیں ہیں یہ دو بنیادی نعمتیں ہیں جو انسان کو دی گئی ہیں۔ انسان اپنی فطرتی اہلیت کے صحیح استعمال کرنے پر ان سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن مفسد ان ہر دو قسم کی نعمتوں کو ہلاک اور برباد کر دیتا ہے۔ ہلاکت کے سامان پیدا کرتا ہے وہ کبھی ایٹم بم سے زمین کی پیداوار کو ختم کر دیتا ہے کبھی وہ کیمیکل اجزاء چھڑک کر اچھے پودوں کو ضائع کر دیتا ہے۔ ایسے مفسد آدمی نے ایک وقت میں کہا یہ تھا کہ اس نے یہ کیمیکل اجزاء اس لئے بنائے ہیں کہ وہ ان سے مضرت رساں کیڑوں کو ہلاک کرے گا لیکن جب وہ تحقیق کرتے ہوئے ایسے کیڑوں پر پہنچا جو مفید ہیں مضرت رساں نہیں تو ایسے مفسد اور

ناشکرے انسان نے ان کیڑوں کو بھی ہلاک کر دیا۔ اب مثلاً یہ اینٹی بائیوٹک وغیرہ قسم کی دوائیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ معاف کرے کبھی مجبوری ہو تو استعمال کرنی پڑتی ہیں مگر ان کے غلط استعمال سے بے شمار کیڑے جو مفید اور زندگی رکھنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں مثلاً انسان کے معدے، جگر اور انتڑیوں میں پیدا کیا ہے اور وہ نظام ہضم میں ممد ومعاون ہیں۔ یہ ایک نابینا ہتھیار (اینٹی بایوٹک ادویہ) انسان کے جسم میں جو مضرت رساں کیڑے ہیں یعنی پیچش اور ہیضہ کے کیڑے ہیں ان کا بھی قتل عام کر دیتا ہے اور جو مفید کیڑے ہیں اُن کا بھی قتل عام کر دیتا ہے۔

بہرحال میں بتا یہ رہا ہوں کہ یہ ہماری استعدادیں ہیں جو باہر نکلیں ان کا صحیح استعمال کرنے والے خدا تعالیٰ کی نگاہ میں صالح کہلائے اور ان کا غلط استعمال کرنے والے مفسد کہلائے قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم ان مفسدوں کے کاموں کا بھی جائزہ لو، غور اور تحقیق کرو اور ان کے دل اور معدہ کو پھاڑ و یعنی ان کی تھیوریز جس رنگ میں روبہ عمل ہیں اور ان کی طاقتیں جس رنگ میں باہر نکل کر کام کر رہی ہیں اور جس رنگ میں ان کی استعدادیں مادی اشیاء میں کام کر رہی ہیں ان کو غور سے دیکھو تو تمہیں نظر آئے گا کہ ہلاکت کی تینوں قسمیں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ یہ ہے مفسد جسے قرآن کریم نے بھی کہا ہے۔

اب جہاں تک مادی ذرائع پیداوار کا تعلق ہے اس کی ایک تو بہت خطرناک شکل ایٹم کی طاقت کے غلط استعمال کی شکل میں نظر آتی ہے۔ دوسرے کارخانوں کا بند رہنا ہے۔ کارخانہ بھی ایک ذریعہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کی بہتری کے لئے پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی اور اس نے مادی ذرائع کو بروئے کار لا کر کارخانہ قائم کر دیا۔ اب جس دن کارخانہ بند رہا اس دن کی پیداوار سے نہ صرف مزدور بلکہ بنی نوع انسان اور ملک بھی محروم ہو گیا۔ ایک کارخانہ مثلاً دو لاکھ گز کپڑا ایک دن میں تیار کرتا ہے اگر وہ کارخانہ تالہ بندی یا ہڑتال کی وجہ سے ایک دن بند رہتا ہے تو اس ملک کے باشندے دو لاکھ گز کپڑے سے محروم ہو گئے۔ غرض اقتصادی اور معاشرتی لحاظ سے اس کے کیا نتیجے نکلے یہ ایک الگ اور مستقل مضمون ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ فساد پیدا ہو گیا۔ حقوق کی ادائیگی پر یہ چیز بہرحال اثر انداز ہو گی مثلاً کپڑے کی پیداوار کم ہونے کی وجہ سے قیمتیں بڑھ جائیں گی وہ غریب آدمی جو یہ سوچ رہا تھا کہ اب میرے پاس اتنے پیسے ہو گئے ہیں کہ میں اپنے بچوں کو کپڑے بنادوں۔ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں رہیں گے کیونکہ کپڑے کی قیمت زیادہ ہو گئی اب اس کے پاس

اتنے پیسے نہیں رہے کہ وہ کپڑا خرید سکے۔ پھر وہ کہے گا کہ میں پانچ دن اور مزدوری کرتا ہوں تا کہ بچوں کے کپڑے بن جائیں.....

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جہاں تک حَرْثٌ کا تعلق ہے لوگ فساد پیدا کرنا چاہتے ہیں یعنی ذرائع پیداوار سے انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر جتنی پیداوار حاصل کر سکتا ہے اس کے راستے میں وہ روک بن جاتے ہیں۔ انسانی طاقتوں اور قوتوں کے استعمال میں مخل ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ذرائع پیداوار کے ساتھ جب تک محنت شامل نہ ہو اس وقت تک کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ چنانچہ انسانی قوتوں اور استعدادوں کے تعطل کی وجہ سے انسان کو گویا بھوکا مار دیا۔ اس کی قوتوں کی نشوونما میں روک پیدا کر دی۔ اس کا جتنا دماغ تھا اس کے مطابق اس کے لئے سامان نہیں پیدا کئے۔ مثلاً ایک غریب آدمی ہے اس کے گھر ایک ذہین بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ دسویں تک تو وہ اسے جوں توں کر کے پڑھاتا ہے مگر پھر اس کی غربت آڑے آتی ہے بچے کو پڑھائی چھوڑنی پڑتی ہے۔ اب وہ لڑکا جو مثلاً ڈاکٹر سلام کا ہم پلہ بن سکتا تھا اس کا دماغ اور اس کی ذہانت ضائع ہو جاتی ہے۔ وہ کلرکی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ ہمارے پھوپھا جان حضرت نواب محمد علی خان صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دفعہ دھوبی کے لئے اشتہار دیا تو ایک بی۔اے یا ایم۔اے پاس کی درخواست آ گئی وہ تو خیر پڑھ گیا تھا پھر بھی اس کو ملازمت نہ ملی لیکن کسی بیچارے کو تو مزید پڑھنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔

پس یہ نسل کشی ہے۔ نسل کشی کا صرف یہی مطلب نہیں ہوتا کہ غلط فیملی پلاننگ کی جائے یا بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیا جائے یا انہیں بھوکا رکھ کر مار دیا جائے یا جس طرح بعض ظالم عیسائی بادشاہ کیا کرتے تھے کہ پہلے وہ عیش کرتے اور پھر ناجائز بچوں کو قتل کر کے تہہ خانوں میں پھنکوا دیتے یہ اور اس طرح کے ہزاروں ظلم ہیں جو انسان انسان پر کر رہا ہے۔ غرض قوتوں اور استعدادوں کا ضیاع بھی نسل کشی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے درحقیقت بنیادی طور پر ہمیں دو ہی چیزیں دی ہیں اور ایک ایسی بڑی نعمت ہے جو نہ ہمارے تصور میں آ سکتی ہے اور نہ اس کی وسعتوں کا احاطہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس پر اللہ تعالیٰ کا کما حقہ شکر ادا کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو انسان کے اندر یعنی انسانی فطرت کے اندر جو استعدادیں پیدا کیں اور ان استعدادوں کی کامل نشوونما ہے۔ تسخیر کائنات کے لئے اور دوسرے انسان کی بہبود کے لئے تخلیق کائنات یعنی اس عالمین کی مادی اشیاء یا ذرائع پیداوار ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ہیں یعنی مادی

ذرائع پیداوار اور ان سے کماحقہ مستفید ہونے کے لئے۔ دو۔ انسانی قوتیں اور استعدادیں۔ ایک کو قرآن کریم کہتا ہے حرث اور دوسرے کو نسل۔ ایک وہ ہے جس کو انسان تیار کرتا ہے۔ پھر اس سے کچھ حاصل کرتا ہے۔ بعض دفعہ اچھی نیت سے بعض دفعہ بری نیت سے بہرحال انسان جس چیز کو تیار کرتا ہے اس سے پیار کرتا ہے۔ مثلاً زمین کو تیار کرتا ہے تاکہ اس سے گندم حاصل کرے، کپاس حاصل کرے وغیرہ وغیرہ۔ وہ کارخانوں کو تیار کرتا ہے کارخانے بھی مادی چیزوں کی تیاری کی جگہ ہیں۔ کچھ اینٹیں ہیں، کچھ لوہا ہے، کچھ مشینری ہے۔ یہ ساری چیزیں مل کر کارخانے کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ تاکہ انسان اس سے مثلاً کپڑا پیدا کرے یا اس سے کھاد پیدا کرے یا لوہا پیدا کرے یا اس میں موٹریں بنائے۔ وغیرہ۔ اب تو بے شمار قسم کی چیزیں بننے لگی ہیں۔ بے شمار سے مراد یہ ہے کہ ہم ان کو گن نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ کو تو ان سب کا علم ہے۔

غرض ایک مادی ذرائع پیداوار اور دوسرے انسانی استعدادیں۔ یہ دو بنیادی چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہیں اور ایک مفسد ان دونوں کی ہلاکت کا موجب بنتا ہے یا ہلاکت کی کوشش میں مشغول نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم مفسد بھی بنو یعنی جو مادی ذرائع پیداوار ہیں ان کو تم ہلاک کرو۔ ان کو تم ضائع کرو۔ دوسرے جو تمہیں استعدادیں دی ہیں ان سے تم غفلت برتو اور ان کی نشوونما نہ کرو۔ ان کا صحیح استعمال نہ کرو اور پھر یہ سمجھو کہ میں تمہارے ان بداعمال اور مفسدانہ اعمال کا صالحانہ اعمال جیسا نتیجہ نکال دوں گا تو یہ خیال غلط ہے۔ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ مفسدوں سے پیار نہیں کرتا یعنی جو لوگ حرث اور نسل کو فساد میں مبتلا اور معرض ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں انہیں اللہ تعالیٰ کا پیار تو نہیں ملے گا۔ اس کے نتیجہ میں انہیں اللہ تعالیٰ کا قہر ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی جہنم انہیں ملے گی۔ اللہ تعالیٰ کا پیار اور اس کی رضا کی جنّتیں تو ان کو نہیں ملیں گی۔

(خطباتِ ناصر جلد چہارم صفحہ ۳۴۱ تا ۳۴۲)

قرآن کریم کا ایک حکم یہ ہے کہ فساد نہ کرو اور قرآن کریم کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں سے پیار نہیں کرتا بلکہ ایسے لوگ اس کے غضب کے نیچے آجاتے ہیں فساد کے لغوی معنی ہیں حد اعتدال سے نکل جانا معنی کی اس وسعت کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کریم کے ہر حکم سے بغاوت فساد ہے کیونکہ قرآن کریم کا ہر حکم استقامت اور اعتدال پر قائم رکھتا ہے فساد کئی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے اور

کسی شکل میں بھی وہ ہمارے محبوب کو محبوب نہیں۔ اللہ تعالیٰ سورۃ بقرہ میں فرماتا ہے کہ دنیا میں بعض لوگ بھی پائے جاتے ہیں کہ جب وہ باتیں کرتے ہیں تو ان کی باتیں پسندیدہ معلوم ہوتی ہیں وہ ملک اور قوم کے خیر خواہ دین کے بھائی اور خدا سے پیار کرنے والے سمجھے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ۔

یعنی جب بھی اسے موقع اور طاقت ملے وہ فساد پیدا کرنے کی غرض سے سارے ملک میں دوڑتا پھرتا ہے اور اس طرح حرث اور نسل کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کے بہت سے معنی ہو سکتے ہیں۔

ایک معنی یہ بھی ہیں ایسا شخص جو خود کو ملک اور قوم کا ہمدرد اور خیر خواہ ظاہر کرتا ہے ان ذرائع اور اسباب پر ضرب لگاتا ہے جو دنیوی لحاظ سے قومی تعمیر کے کام آنے والے ہیں اور اُخروی لحاظ سے وہ کسی کو ان جزاؤں اور ان انعامات کا وارث کرتے ہیں جن کے لئے خدا تعالیٰ کا ایک مومن بندہ اس دنیا میں اس امید پر بوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں خدا تعالیٰ کے فضل سے بہت بڑھ کر کھیتی کو کاٹے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ۔ (الشوریٰ:۲۱)

کہ جو شخص آخرت کے انعامات کے لئے اس دنیا میں کام کرتا ہے اسے بہت ملے گا اس نے جو کام کئے ہیں ان سے بھی بہت زیادہ ملے گا اور جو اس دنیا کے لئے کام کرتا ہے اسے بھی ہم عام قانون کے ماتحت محروم نہیں رکھیں گے اس کو بھی ہم اس دنیا میں اس کے کام کا اجر دیں گے۔

لغت نے یہاں حَرْثٌ کے معنی تعمیری کاموں کے بھی کئے ہیں یعنی ایسے کام جن کے نتیجہ میں ملک اور قوم کی تعمیر ہوتی ہے پس جو لوگ قوم کی املاک کو نقصان پہنچاتے ہیں توڑ پھوڑ کے ذریعہ یا لوٹ کے ذریعہ یا کوئی اور خرابی پیدا کرنے کے نتیجہ میں، وہ خدا تعالیٰ کے اس حکم کو توڑنے والے ہیں کیونکہ جہاں عقل، اخلاق اور قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ کسی دوسرے کی املاک کو یا قومی املاک کو نقصان پہنچایا جائے وہاں شریعت اسلامیہ اس سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ اس بات سے روکتی ہے کہ ان اموال کو نقصان پہنچایا جائے جو دوسروں کے ہیں یا خود اپنے ہیں کیونکہ اموال کے متعلق اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ اصل ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے اسی لئے اسلام نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس نے کہا ہے کہ جان تیری نہیں جان تو خدا کی ہے تجھے کس نے حق دیا ہے کہ تو جان کو لے چاہے وہ تیری اپنی ہی کیوں نہ ہو اور اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اپنی

پلیٹ اور رکابی میں اتنا سالن نہ ڈالو کہ اس میں سے ایک لقمہ بھی ضائع ہو جائے کیونکہ کھانے کا جو لقمہ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہے وہ تمہارا نہیں تم تو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے کھا رہے تھے اس نے تمہیں اس لقمہ کو ضائع کرنے کا اختیار نہیں دیا غرض کھانے کے ایک لقمہ کا ضیاع بھی خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند کیا ہے کجا یہ کہ لاکھوں روپیہ کی املاک کو ضائع کر دیا جائے۔

پس دوسرے کی املاک کو نقصان پہنچانے یا ان پر قابض ہو جانے کی اسلام اجازت نہیں دیتا یہی وجہ ہے کہ کوئی ایک مہینہ ہوا میں نے اعلان کیا تھا کہ ربوہ میں ہر وہ دکان دار یا مکان والا جس نے غیر کی زمین پر (جو نہ تو اس کی ذاتی ملکیت ہے اور نہ اس نے وہ کرایہ پر لی ہے) دکان یا مکان بنایا ہوا ہے تو اسے اپنا وہ مکان یا دکان ۳۰؍نومبر تک اٹھا لینی چاہیے اور یہ میعاد اس لئے دی گئی تھی کہ ایسا کرنے پر کچھ وقت لگتا ہے اور ایسا حکم نہیں ملنا چاہیے جو طاقت سے بالا ہو اعلان کرتے وقت میرا اندازہ تھا کہ اس عرصہ میں ایسی دکانیں اور مکان اٹھائے جا سکتے ہیں اور کاروبار سمیٹے جا سکتے ہیں اب تو رمضان کی ذمہ داری بھی آ گئی ہے رمضان کے مقدس مہینہ میں خصوصاً کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور نہ جلسہ سالانہ کے بابرکت ایام میں اس بات کی اجازت کسی کو دی جا سکتی ہے کہ قرآن کریم کے احکام کے خلاف دوسرے کی ملکیت پر ناجائز تصرف قائم رکھے ابھی تک جو رپورٹ مجھے ملی ہے وہ یہی ہے کہ دوست اس طرف متوجہ ہوئے ہیں اور انشاء اللہ کل ۳۰؍نومبر تک یعنی وقت کے اندر اندر ناجائز طور پر تعمیر کردہ دکانیں اور مکانات خالی کر دیئے جائیں گے جو ایسا نہیں کرے گا وہ خدا تعالیٰ کے اس انذار کے مطابق کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (القصص:۷۸) یعنی اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے خلفاء اس کے صلحاء اور نیک بندوں کی محبت سے محروم ہو جائے گا اور اگر کوئی ایسا ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ہدایت دے امید تو یہی ہے کہ ایسا ہم میں سے کوئی نہیں نکلے گا۔

فساد جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ اس سے مراد روحانی اور مذہبی فساد بھی ہے جب ملک میں بدامنی کے حالات پیدا کر دیئے جائیں تو وہ لوگ جو اپنے اوقات کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں اور اس کے ذکر میں خرچ کرنا چاہتے ہیں وہ اپنی روحانی غذا کے حصول کی طرف اپنی توجہ اس طرح قائم نہیں رکھ سکتے جس طرح وہ دوسرے حالات میں رکھ سکتے ہیں ان کے لئے

بہت سی فکریں اور پریشانیاں پیدا کر دی جاتی ہیں غرض قرآن کریم نے فساد کو پسند نہیں کیا اسی طرح فرماتا ہے: فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (الاعراف:۷۵)

اگرچہ یہ آیت حضرت صالحؑ کی قوم ثمود سے تعلق رکھتی ہے لیکن جہاں پرانے انبیاء کی زبان سے اصولی احکام بیان ہوتے ہیں ان کا تعلق ہر مسلمان سے بھی ہے اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں جان بوجھ کر فساد مت کرو گویا اللہ تعالیٰ نے فساد کی طرف مائل ہونے کو اس کی نعمتوں کی ناشکری قرار دیا ہے اور فرماتا ہے اگر تم خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھو اور اس کے شکر گزار بندے بنو تو پھر تم فساد نہیں پیدا کر سکتے اس لئے کہ (جیسا کہ میں نے بتایا ہے) نہ جان تمہاری اپنی ہے، نہ مال اپنا ہے، نہ مکان اپنا ہے، نہ زمین اپنی ہے ہر چیز خدا تعالیٰ کی ملکیت ہے اللہ تعالیٰ ہی ان سب کا حقیقی مالک ہے ان اشیاء میں کسی فرد یا قوم کو اس حد تک تصرف کرنے کی اجازت ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ نے اس فرد یا قوم کو اجازت دی ہو ورنہ نہیں پس یہ ساری نعمتیں ہیں تم خدا کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرو، اگر تم فساد کرو گے، توڑ پھوڑ سے کام لو گے، لوٹ مچاؤ گے، لوگوں کی جانوں کو یا ان کے اوقات کو نقصان پہنچانا چاہو گے تو تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر رہے ہو گے مثلاً ایک شخص ہے اس نے آٹھ گھنٹے محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالنا ہے اور تم نے ایسے سامان پیدا کر دیئے ہیں کہ وہ اپنے کام پر جا نہیں سکتا فساد کی وجہ سے اس کے رستے رک گئے ہیں تو اس کے بچے بھوکے رہیں گے گویا خدا تعالیٰ نے اسے ایک نعمت دی تھی اور تم اس نعمت سے اسے محروم کرنے والے بن گئے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ نعمت خداوندی کو یاد رکھتے اور اس کا شکر بجا لاتے ہیں وہ فساد نہیں کیا کرتے بلکہ اپنے مال کی، اپنی جانوں اور اپنے ہمسائیوں۔ بھائیوں۔ ہم ملک ہم قوم اور دنیا میں بسنے والے ہم عصروں کی جانوں کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کے اموال کی حفاظت کرتے ہیں کیونکہ ہر چیز اور ہر مخلوق جو ان کی بصیرت اور بصارت کے سامنے آتی ہے اسے وہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے نہ وہ خود کو محروم کرنا چاہتے ہیں نہ دوسروں کو محروم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۴۰۷ تا ۴۱۰)

آیت ۲۰۸ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۸﴾

یہ حکم سننے کے بعد کہ ایک کامل اور مکمل شریعت کا نزول ہو چکا اور ایک حقیقی اور سچے تعلق باللہ کا سامان پیدا ہو گیا اس لئے اے نوعِ انسان فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسیہ کے نتیجہ میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جنہوں نے اپنے نفوس کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے حصول کے لئے بیچ ہی ڈالا اور عمر بھر کا سودا کر لیا یہ نہیں کہ آج ایک عہد باندھا اور کل اسے توڑ دیا۔ یہ نہیں کہ آج تو اپنے ربّ سے ایک سودا کیا اور کل اسے فسخ کیا اور بلکہ عمر بھر کے لئے انہوں نے اپنی جانوں اور اپنے نفوس کا اپنے ربّ کی رضا کے لئے سودا کر لیا اور اس طرح پر انہوں نے اپنے اس ربّ کی رأفت اور رحمت کے جلوے دیکھے جو ان لوگوں کے لئے رؤوف ہے جو اس کے حقیقی بندے بن جاتے ہیں اور اس قدر حسین جلوے دیکھے کہ ان کی وجہ سے اُمم سابقہ اُمت مسلمہ پر رشک کریں۔

جس نفس کے سودے کا یہاں ذکر ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو جو اندرونی اور بیرونی اعضاء دیئے گئے ہیں اسے جو باطنی اور ظاہری قوتیں اور استعدادیں عطا ہوئی ہیں وہ اس غرض کے لئے ہیں کہ انسان اپنے ربّ سے سودا کر لے یعنی یہ عطا ہے وہ ظاہری اعضاء کے لحاظ سے ہو یا باطنی اور روحانی قوتوں اور استعدادوں کے لحاظ سے ہو، ہے ہی اس غرض کے لئے کہ انسان اپنے ربّ سے ایک زندہ اور سچا تعلق پیدا کر لے اور اس کی نعمتوں کا وارث بنے۔ جو قوتیں اور استعدادیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہیں ان کی اصل غرض یہی ہے کہ ایک اسے اللہ تعالیٰ کی کمال معرفت حاصل ہو جائے دوسرے اس معرفت کے نتیجہ میں حقیقی پرستش اور عبودیت پر دوام اسے مل جائے اور تیسرے اللہ تعالیٰ کے حسن و احسان کے جلوے دیکھنے کے بعد وہ اس کی محبت میں فنا ہو جائے۔ انسانی فطرت بھی اسی کی گواہی دیتی ہے اور اس پر شاہد ہے کہ انسان نے جب بھی اپنے اعضاء کو جو خدا تعالیٰ کی عطا تھے اور اپنی قوتوں اور استعدادوں کو جو روحانی ارتقاء کے لئے اسے دی گئی تھیں غلط راہوں پر استعمال کیا تو اس کے نفس نے تسلی نہیں پائی۔ ہم ایک موٹی مثال لے لیتے ہیں آج کی دنیا میں انسان نے خداداد قوتوں اور طاقتوں کے استعمال سے ذرّے کی طاقت (جسے ایٹامک انرجی Atomic

Energy کہتے ہیں) کا علم حاصل کیا یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک ذرّہ میں جو قوت چھپا رکھی تھی انسان نے خدا تعالیٰ کی دی ہوئی عقل، فراست اور سائنس (انسان جو سائنس کے تجربے کرتا ہے ان میں بھی اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہی روشنی پیدا ہوتی ہے) کے نتیجہ میں اس کا علم حاصل کیا لیکن جہاں اس نے اس کا ایک حد تک صحیح استعمال کیا یعنی اس نے اسے انسان کے فائدہ کے لئے استعمال کیا وہاں بڑی حد تک اس کا استعمال اس رنگ میں بھی کیا کہ وہ انسان کی ہلاکت کا موجب بن جائے۔

اب دیکھو یہ ایک قوت ہے اور ہمیں نظر آ رہا ہے کہ انسان نے اس کا ایک حد تک غلط استعمال کیا ہے اور اس غلط استعمال یا غلط استعمال کے امکان کے خلاف وہ لوگ بھی آئے دن مظاہرے کر رہے ہیں جو خدا تعالیٰ کے بھی منکر ہیں۔ ایٹمی قوت کے غلط استعمال کے خلاف یہ مظاہرے اس بات پر شاہد ہیں اور ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ انسانی فطرت ان چیزوں کو پسند نہیں کرتی۔ ابھی ان لوگوں کو خدا تعالیٰ کی ہستی کا علم نہیں ابھی انہوں نے اس کا عرفان حاصل نہیں کیا اس کے باوجود ان کے اندر سے یہی آواز نکل رہی ہے کہ ان قوتوں اور استعدادوں کو غلط طریق پر استعمال نہیں کرنا۔ انہیں اس کے صحیح استعمال کا پتہ بھی نہیں لیکن اس کے غلط استعمال کے خلاف احتجاج جاری ہے۔ اسی طرح اور ہزاروں مثالیں ہیں کہ جب انسان اپنے اندرونی اور بیرونی اعضاء کو یا اپنی ظاہری اور باطنی قوتوں اور استعدادوں کو اس رنگ میں استعمال کرتا ہے کہ وہ اپنے ربّ سے دور ہو جاتا ہے تو انسانی فطرت اندر سے اس کے خلاف احتجاج کرتی ہے اور کہتی ہے کہ تم یہ کیا کر رہے ہو اور یہ اس بات پر شاہد ہے کہ یہ تمام قویٰ اور قوتیں اور طاقتیں اور استعدادیں انسان کو اس لئے ملیں کہ وہ اس مقصد کو حاصل کر لے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی معرفت اسے حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا دائمی مقام اسے حاصل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے حسن و احسان کے جلوے دیکھ کر اس کی محبت کا شعلہ اس طور پر انسان کے صحنِ سینہ میں بھڑکے کہ اس کا وجود بالکل فنا ہو جائے کیونکہ اس کے بغیر وہ دلی سکون اور اطمینان اور خوش حال زندگی کا احساس اپنے اندر نہیں پاتا۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۵۱۹ تا ۵۲۱)

آیت ۲۱۸ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ

كَبِيْرٌ ۚ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۗ وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۸﴾

تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھر جائے اور راہِ ارتداد اختیار کرے پھر وہ طبعی موت مرے اس حالت میں کہ وہ ارتداد کے ذریعہ سے جس کفر میں داخل ہوا تھا (ایمان کو چھوڑ کے) اس کفر پر وہ قائم تھا۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایمان کی حالت میں جو نیکیاں کی تھیں اور جو بظاہر قربانیاں دی تھیں لیکن بعد میں ارتداد اختیار کیا تو حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وہ نیک اعمال بھی ان کے کسی کام نہیں آئیں گے اور اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ان کی نیکیوں کا بدلہ ثواب اور خدا تعالیٰ کی رضا کی شکل میں نہیں ملے گا۔ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ اور ایسے مرتد جو ہیں وہ اَصْحٰبُ النَّارِ ہیں، اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ہیں۔ دوزخی ہیں، دوزخ کی آگ میں پڑنے والے ہیں اور لمبا عرصہ اس میں رہنے والے ہیں۔

(خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۸۴، ۸۵)

آیت ۲۱۹ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۗ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۹﴾

جس تجارت کی طرف میں تمہیں بلاتا ہوں اور جس کی طرف تمہاری راہنمائی کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کے لئے اپنی جانوں کو مجاہدہ میں ڈالو۔ اور تمہارا یہ مجاہدہ اور تمہارا یہ جہاد اموال کے ذریعہ سے بھی ہو۔ اور تمہارے نفوس کے ذریعہ سے بھی ہو ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اور اگر تمہیں حقیقت کا علم ہو جائے تو تم سمجھ جاؤ کہ دراصل اسی چیز میں تمہاری بھلائی ہے۔

اس خَيْرٌ لَّكُمْ کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ آیت ۲۱۹ میں یوں فرمائی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۗ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ کہ

وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے مجاہدہ کیا اس رنگ میں کہ انہوں نے خواہشات نفسانی کو خدا تعالیٰ کی خاطر چھوڑا۔اس رنگ میں کہ انہوں نے اپنے پیدا کرنے والے کی خوشنودی کے حصول کے لئے گناہوں سے اجتناب کیا۔(هَاجَرُوْا) اور انہوں نے اپنے ماحول، اپنے املاک (اپنی جائدادوں) اپنے کنبہ اور اپنے شہر اور اپنے علاقہ کو خدا تعالیٰ کی خاطر ترک کیا۔اور خدا تعالیٰ کی رضاء کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے گئے۔ وَجَاهَدُوْا اور انہوں نے خدا تعالیٰ کی محبت کے حصول کے لئے نیکی کے راستوں پر شوق اور بشاشت کے ساتھ قدم مارا۔ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ یہی وہ لوگ ہیں جو امید رکھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت انہیں حاصل ہو جائے گی۔

اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھ سکتے ہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت انہیں ضرور مل جائے گی۔ پھر اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ جو شخص بدیوں کو ترک نہیں کرتا اور نیکیوں کو اختیار نہیں کرتا۔ وہ یہ امید نہیں رکھ سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس سے رحمت کے ساتھ سلوک کرے گا۔ یہ امید کہ میرا ربّ میرے ساتھ رحمت کا سلوک کرے گا وہی رکھ سکتا ہے جو بدیوں کو ترک کرتا اور نیکی کی راہوں کو اختیار کرتا ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۴۳۹، ۴۴۰)

آیت ۲۳۲ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَّ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَاۤ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۲﴾

وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا خدا تعالیٰ کی جو آیات ہیں انہیں معمولی سمجھ کے محل تمسخر اور استہزا نہ بناؤ کیونکہ اس کے بغیر ان آیات کے سمجھنے کے بغیر تم خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں کر سکتے، خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل کئے بغیر تم خدا تعالیٰ کا ذکر نہیں کر سکتے، خدا تعالیٰ کا ذکر صحیح رنگ میں کئے بغیر تم حقیقی نجات اور کامیابی اور فلاح نہیں حاصل کر سکتے اپنی زندگی میں۔

اس آیت میں پھر آیات اللہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ہمارے سامنے یہ مضمون بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ آیات اللہ کو محلِ استہزا نہ بناؤ بلکہ خدا تعالیٰ کی جو مادی دنیا میں صفات ظاہر ہوئی ہیں۔ اس مادی دنیا میں نعماء باری جو ہیں ان کو سمجھو اور ان کی معرفت حاصل کرو تا کہ ان کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی صفات کی معرفت حاصل کر سکو تو نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ یہ قرآن کریم کے محاورہ میں جسمانی روحانی ہر دو قسم کی نعمتوں پر بولا جاتا ہے (یہاں چونکہ مقابلہ ہوا ہے ہدایت کے ساتھ اس لئے، ویسے تو خدا تعالیٰ کی روحانی نعمتیں اور اس کا کلام بھی بڑی نعمت ہے اور جو انسان کو صلاحیتیں دی گئی ہیں وہ بڑی نعمتیں ہیں) لیکن یہاں چونکہ کتاب و ہدایت کا ذکر بعد میں آیا ہے اس لئے یہاں مراد ہوگی ہر دو جہان کی ہر چیز جس کا ذکر سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیۃ: ۱۴) میں آتا ہے یعنی ہر چیز انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے تم ان کے متعلق علم حاصل کرو اور ان کے حسن کو دیکھو، دیکھو کہ کس طرح خدا تعالیٰ نے بعض چیزوں کو لاکھوں سال پہلے پیدا کیا اس معنی میں ارتقائی دور میں سے گذرنے کے لئے ان میں حرکت پیدا کی اور پھر بعض چیزیں ایسی ہیں جو کئی لاکھ سال کے بعد اس شکل میں آئیں جس شکل میں آج انسان ان سے فائدہ اٹھاتا ہے یہ بھی خدا تعالیٰ کی نعمتیں ہیں نعماء ہیں ان کو یاد کرو اور یاد رکھو اور ان کے علاوہ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ (البقرۃ: ۲۳۲) خدا تعالیٰ نے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تمہارے لئے ایک کامل کتاب نازل کی ہے ایک ہدایت کاملہ تمہیں دی اور ایک حکمت کی کتاب یعنی ایسی شریعت جو فطرت کے مطابق ہے اور بات حکم سے نہیں بلکہ حکمت سے منواتی ہے یعنی ہر حکم جو ہے شریعت کا اس کی وجہ قرآن کریم نے بیان کی کہ یہ حکم تمہارے کس فائدے کے لئے ہے اس لئے تمہیں یہ حکم دیا گیا ہے یہ تمہارے اوپر کوئی چٹی نہیں ہے کوئی بیگار نہیں لی جا رہی تم سے جس کو قربانی کہا جاتا ہے وہ تم اپنے نفس کے لئے قربانیاں دے رہے ہو اس کا فائدہ تمہیں پہنچے گا، تمہاری نسلوں کو پہنچے گا کسی چیز سے تمہیں محروم نہیں کیا جا رہا۔ جو مال کی مثلاً قربانی ہے اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ خدا مال کو لیتا ہے تا کہ بڑھا کر واپس کرے۔ غرض قرض نہیں رکھتا وہ (یہ عجیب قربانی ہے کہ پانچ روپے لئے اور پانچ سو دے دیئے اور انسان کہے کہ ہم نے خدا کی راہ میں بڑی مالی قربانیاں دے دیں) مگر یہ اس کی شان ہے جو سب سے بڑا ہے کہ وہ اسی کو قربانی سمجھتا

اور اپنے پیار سے اپنے بندے کو نوازتا ہے۔تو انسان خدا کا جو ذکر کرتا ہے وہ صحیح ذکر صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ اس کی صفات کا علم ہو اور صفات کے علم کے لئے ہر قسم کی تحقیق (علمی تحقیق جو ہے وہ) ضروری ہے یعنی جو خدا نے پیدا کیا اس کی عظمت جاننے کی کوشش کرنا اس کی جو پیدائش ہے اس کے دستِ قدرت سے جو چیز نکلی ہے اس میں بھی بڑی عظمت ہے اس میں بھی بڑا حسن ہے اس میں بھی بڑی افادیت ہے اور یہ خدا تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہر ضروری چیز کو پیدا کیا۔ جب تک ان چیزوں کا علم نہ ہو۔صحیح طور پر انسان اپنی فطرت پر اپنی صفات پر اللہ تعالیٰ کی صفات کا رنگ چڑھا نہیں سکتا۔تو خالی یہ نہیں کہا کہ ذکر کرو بلکہ ذکر کا طریقہ بھی بتایا کہ ذکر کا مطلب یہ ہے۔

ایک بچے کا سُبْحَانَ اللهِ کہنا ذکر کی ابتدا تو کہلا سکتا ہے مگر ذکر نہیں کہلا سکتا یا ایک کم علم اور ان باتوں کی طرف توجہ نہ کرنے والے بالغ انسان کا سُبْحَانَ اللهِ کہنا ثواب تو ہے لیکن خدا تعالیٰ جس رنگ میں اس سے پیار کرنا چاہتا ہے وہ پیار اس کو تبھی حاصل ہوسکتا ہے جب وہ خدا تعالیٰ کے حسن اور اس کے رنگ کو پہچانے اور اس کی عظمت اور اس کا جلال اور اس کی رفعت اور اس کی شان جو ہے اور اس کی قدرتوں کے جو جلوے ہیں اور ان میں جو حسن ہے اور جو احسان خدا تعالیٰ بے شمار شکلوں اور صورتوں میں ایک فردِ واحد کی ذات پر کر رہا ہے اس کا علم اسے حاصل ہوتا ہے۔تب اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت کا ایک چشمہ پھوٹتا ہے جس سے وہ بھی سیراب ہوتا ہے اور اس کا خاندان اور نسل بھی سیراب ہوتی ہے اور بہت سارے دوسرے بھی اس سے فائدہ اٹھانے والے بن جاتے ہیں۔اسلام یہ نہیں کہتا کہ جو دنیوی علوم ہیں ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔اسلام یہ کہتا ہے کہ دنیوی علوم کی ہر برانچ ہر شعبہ کا جاننا اس لئے ضروری ہے کہ اگر تم مومن ہو اور خدا کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہو تو جب تک تمہیں ان باتوں کا علم نہیں ہوگا تم خدا تعالیٰ کی صحیح معرفت بھی حاصل نہیں کر سکتے مثلاً ستاروں کا علم ہے، افلاک کا علم ہے تو یہ سمجھنا کہ رات کو بچے بھی دیکھتے ہیں۔بچپن میں میرے خیال میں ہر بچہ کبھی سوچتا ہوگا کہ میں گنوں کتنے ستارے مجھے نظر آ رہے ہیں جو گن نہیں سکتا بالکل چھوٹی عمر میں بچے کہہ دیتے ہیں (ماں یا باپ کو) کہ مجھے یہ ستارہ لا کے دو۔یعنی ان کو پتا کچھ نہیں ہوتا لیکن نظر آ رہا ہے۔لیکن جب تک افلاک کا یہ علم نہ ہو کہ کس قدر وسعت خدا تعالیٰ کی اس پیدائش میں ہے جس کو ہم زمین و آسمان کہتے ہیں اب تک جو علم انسان نے بہت دور دیکھنے والی دوربینیں ہیں ان سے حاصل کیا ہے اور وہ سائنس کے نئے

طریقے یہ ہیں وہ جو پہلے شیشے سے دیکھنے والے طریقے تھے وہ اب نہیں رہے۔ بہت زیادہ آگے بڑھ چکا ہے انسان۔ جو اَب تک معلوم کیا وہ بھی یہ ہے کہ اس ہر دو جہان میں ان آسمانوں میں بے شمار ایسے قبائل ہیں۔ ستاروں کے بے شمار ایسے قبیلے ہیں جن کو یہ گیلیکسیز (Glaxies) کہتے ہیں گیلیکسی ستاروں کے ایک ایسے قبیلے کا نام ہے جو اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتا ہے اور بے شمار سورجوں پر مشتمل یہ قبیلہ بحیثیت مجموعی ایک نامعلوم جہت کی طرف حرکت کر رہا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جو دوسری گیلیکسیز دوسرے قبائل ہیں ان کا ایک مستقل وجود ہے قبیلے ہونے کے لحاظ سے اور قبیلہ ہونے کے لحاظ سے۔ اس کے اندر ان گنت (یعنی جس کو انسان گن نہیں سکا) سورج ہیں اور ان سورجوں کے گرد ستارے گھوم رہے ہیں۔ تو سورج بھی ان گنت ہیں تو جو ان کے ساتھ ستارے مل جائیں تو ان کی تعداد کیا بن جاتی ہے، بے شمار گیلیکسیز، بے شمار قبائل ہیں۔ ہر گیلیکسی میں بے شمار سورج ہیں اور پھر حرکت کر رہے ہیں یہ، اور ان کی حرکت متوازی نہیں بلکہ ہر آن ایک دوسرے سے پرے ہو رہا ہے ہر قبیلہ، ہر گیلیکسی اور درمیان میں ان کا فاصلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے اور سائنسدان کہتے ہیں کہ جب دو گیلیکسیز میں یعنی ستاروں کے ایسے قبیلے میں جس کے اندر بے شمار سورج ہیں جن کے گرد دوسرے ستارے پھر رہے ہیں اتنی جگہ ہو جائے کہ ایک گیلیکسی بے شمار ستاروں کی وہاں سما سکے تو وہاں کُنْ فَیَکُوْنُ سے ایک نئی گیلیکسی (ستاروں کا قبیلہ) پیدا ہو جاتی ہے۔ بے شمار سورجوں پر مشتمل ایک نئی گیلیکسی وہاں پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ کہنا کہ اس علم کی ایک مومن متقی کو ضرورت نہیں غلط بات ہے۔ قرآن کہتا ہے لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰہِ ھُزُوًا خدا تعالیٰ کی مخلوق جو ہے اس کی گہرائیوں میں جو جاتے ہیں وہی معرفت صفاتِ باری حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر آدمی تو ان گہرائیوں میں جا نہیں سکتا۔ اتنا بڑا علم ہے یہ اور اس میں پھر خدا کی ایک اور شان نظر آتی ہے۔ پھر ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ یہ ساری بے شمار گیلیکسیز (ان گنت قبائل جو ہیں یہ) قانون کی پابندی کر رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان کے لئے جو قانون اور قواعد بنائے ہیں۔ ان کے پابند ہیں۔ آپس میں نہ لڑتے ہیں نہ جھگڑتے ہیں۔ کبھی یہ نہیں ہوا کہ ایک قبیلہ کا ستارہ دوڑ کے دوسرے قبیلے میں چلا جائے یا ادھر کا ادھر آ جائے یا ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں بلکہ جو حکم ہے وہ کر رہے ہیں اور پھر یہ کہ (ایک تو نئی گیلیکسیز پیدا ہو رہی ہیں) جو موجود ہیں ان کی صفات میں زیادتی

ہو رہی ہے خدا تعالیٰ کی صفات کے جلووں کے نتیجہ میں جس شخص کو صرف اتنا علم ہی حاصل ہو جائے باقی (سمجھیں آپ) بالکل اندھیرا ہے۔ صرف یہ روشنی اس کے سامنے آئی ہے اپنے ربّ کے متعلق تب بھی اس کے دل سے نکلتی ہے تکبیر کہ خدا سب سے بڑا ہے بڑا ہی بلند ہے اور سُبْحَانَ اللّٰہِ۔ ایسا قانون بنا دیا کہ جتنا گہرائیوں میں بھی جاؤ یہ پتا لگتا ہے کہ کوئی عیب اس کے فعل میں نظر نہیں آتا اور کوئی تضاد ہمیں وہاں نظر نہیں آتا۔ قرآن کریم میں کئی جگہ کہا ہے۔ سورۃ ملک میں بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات اور اس کے جلووں میں تمہیں کوئی تضاد نظر نہیں آئے گا۔ یہ بڑا لطیف مضمون ہے۔

ایک ہے سائنس، آپ یہ کہیں گے کہ ہر ایک کیسے ہر سائنس پر عبور حاصل کرلے۔ ایک ہے وہ سائنس جس کی تحقیق میں ایک جماعت سائنس دانوں کی مشغول ہوتی ہے اور بڑے پیسے خرچ کرتی رہی ہے دنیا۔ انتہائی قیمتی آلات بناتے ہیں مثلاً ستاروں کا جو یہ علم ہے اس کے لئے کروڑوں کروڑوں ڈالر کی انہوں نے دوربینیں بنائی ہیں ستاروں کو دیکھنے کے لئے۔ ہر علم کی ان باریکیوں اور گہرائیوں میں تو ہر انسان نہیں جاسکتا لیکن جو ان کے اندر بنیادی اصول کام کر رہے ہیں وہ ہمیں ایک دوسرے سے سیکھنا چاہیے تاکہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور جلال کا جو سایہ ہے وہ ہماری روح کے اوپر پڑے اور ہم بھٹکنے سے محفوظ ہو جائیں۔ پھر ایٹم کی طاقت ہے ایک ذرے کے اندر اتنی طاقت خدا تعالیٰ نے بند کر کے رکھ دی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک طرف وسعت اتنی کہ گیلیکسیز کا شمار نہیں اور ہر گیلیکسی میں اتنے سورج کہ کسی ایک گیلیکسی کے سورجوں کی تعداد بھی ہم پتا نہیں لگا سکے اور دوسری طرف ایک ذرہ (ایٹم) لے لو اس کے اندر اتنی طاقت خدا تعالیٰ نے بند کی ہوئی ہے کہ انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس کی طاقت جو ہے وہ انسان کو فائدہ بھی پہنچا رہی ہے لیکن غلط استعمال کے نتیجہ میں ہلاکت کا بھی سامان پیدا کر رہی ہے۔ خدا تعالیٰ کا اگر ذکر کرے انسان یعنی یہ علم جب اس کے سامنے آئے اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ کی عظمت اور خدا تعالیٰ کی معرفت بھی اسے حاصل ہو اور عظمت کا جلوہ بھی اس پر ظاہر ہو تو پھر وہ سمجھے گا کہ خدائے قادر و توانا نے جو یہ عظیم چیز پیدا کی ہے اس سے خدا کی مخلوق کو ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے لیکن اندھی ہے دنیا جو خدا کی معرفت حاصل کرنے کی بجائے خدا کے بندوں کو دکھ دینے کے سامان پیدا کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے دماغوں کو ہدایت عطا کرے اور خدا ایسے سامان پیدا کرے کہ سارے ہی انسان خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے والے ہوں۔

گیلیکسیز کے متعلق ابھی جو میں نے آپ کو بتایا اس کے نتیجہ میں جب انسان کے سامنے یہ باتیں آئیں تو اس میدان کے سائنسدانوں میں سے ایک حصہ جو پہلے دہریہ تھا انہوں نے کہا اب ہمیں خدا تعالیٰ کی ہستی پر یقین آ گیا ہے۔ یہ جو نئی گیلیکسیز پیدا ہوئیں تو یہ چیزیں سائنس دانوں کو اس طرف لا رہی ہیں۔ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا یعنی خدا تعالیٰ کی جو آیات ہیں (اور خدا تعالیٰ کے دستِ قدرت سے پیدا ہونے والی ہر چیز قرآن کریم کی اصطلاح میں خدا تعالیٰ کی آیات میں سے ایک آیت ہے نشان ہے۔ ایک ایرو (Arrow) ہے جو خدا تعالیٰ کی ذات کی طرف اور اس کی صفات کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے) ان کو محلِ استہزا نہ بناؤ کہ تم خدا کی طرف آنے کی بجائے اس سے دور ہونے لگ گئے بلکہ ان چیزوں کو ذریعہ بناؤ خدا تعالیٰ کی صفات کو سمجھنے اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال کی معرفت حاصل کرنے کا تا کہ اس کے نتیجہ میں جو ایک عظیم ہدایت خدا تعالیٰ نے (مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ) نازل کی ہے جو حکمت سے پُر اور دلیل دے کے انسانی عقل کی تسلی کرتی اور اسے سمجھاتی ہے کہ تمہارے فائدے کے لئے یہ سارے احکام دیئے گئے ہیں، اسی طرح جس طرح تمہارے فائدے کے لئے ہر دو جہان کی ہر چیز پیدا کی گئی ہے یعنی ایک ہی خدا دنیا کی ہر چیز کو انسان کے فائدے کے لئے پیدا کرے اور اس کے متعلق انسان یہ سمجھے کہ جو اس نے اپنی وحی کے ذریعہ شریعت اور ہدایت نازل کی اس کا کوئی حکم انسان کو دکھ دینے کے لئے ہے یا اس کے فائدے میں نہیں ہے یہ تو ایسی نامعقول بات ہے کہ میرے خیال میں اگر سمجھایا جائے تو ایک بچے کو بھی آسانی سے سمجھ آ جائے گی یہ بات۔ اتنی بڑی دنیا جس کے ایک حصے، چھوٹے سے نقطے کا میں نے ذکر کیا ہے وہ تو اس نے پیدا کی انسان کے فائدہ کے لئے اور بے شمار چیزیں ایسی بنا دیں کہ انسان فائدہ ان سے حاصل کرتا ہے، فائدہ حاصل کرتا چلا جاتا ہے اور نئی سے نئی چیز اس کے علم میں آتی ہے اور اس کو پھر افسوس ہوتا ہے کہ میں نے پہلے کیوں نہیں یہ علم حاصل کیا۔ پہلے اس سے فائدہ حاصل کر لیتا لیکن اس کے مقابلہ میں جو اس نے انسان کی ہدایت کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل شریعت نازل کی وہ انسان کے فائدے کے لئے نہیں یا اس میں کوئی ایک بھی ایسا حکم ہے جو اس کے فائدے کے لئے نہیں۔ یہ نامعقول بات ہے۔ انسانی عقل، انسانی فطرت اسے قبول نہیں کرے گی۔ اس واسطے خدا تعالیٰ نے اس آیت میں پہلے دنیا کی نعماء کا ذکر کیا کہ ہر چیز انسان کے فائدے

کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ خدا تعالیٰ نے کہا دیکھو ہر چیز جو ہے وہ نعمت کے طور پر پیدا ہوئی ہے تو اس سے تمہیں نتیجہ نکالنا پڑے گا کہ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ اس کی طرف سے آنے والی کامل ہدایت بھی خدا تعالیٰ کی طرف ہی لے جانے والی ہے وہ بھی ایک نعمت روحانی ہے اس کو ہم ہدایت، شریعت، حکمت، اس کو ہم ایک حسین تعلیم، اس کو ہم انسان کو ایک بہترین انسان بنانے والی، اس کو ہم ایک وحشی کو متمدن، متمدن کو با اخلاق، با اخلاق کو روحانی انسان بنانے والی تعلیم سمجھتے ہیں، اس طرح جس طرح دنیا کی ہر چیز سَخَّرَ لَكُمْ کے ماتحت انسان کے فائدے کے لئے ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کا ہر حکم انسان کے فائدے کے لئے ہے اور جو شخص یہ نہیں سمجھتا وہ بد قسمت اور محروم ہے کہ خدا تعالیٰ اسے دینا چاہتا ہے اور وہ لینے سے انکار کر رہا ہے۔

مگر اس زمانہ میں یہ اندھی دنیا خدا سے دور جا چکی ہے اور خدا کی طرف واپس انہیں لے آنے کا کام جماعتِ احمدیہ کے سپرد کیا گیا ہے اور اس کے لئے جماعت کو نمونہ بننا چاہیے اور نمونہ بننے کے لئے ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ کی معرفت انہیں حاصل ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیوی علوم بھی سیکھیں اور قرآن کریم کے علوم بھی سیکھیں اور خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل کریں اور اس کے پیار کو پائیں اور جو پیار کے دَر اس نے محض اپنی رحمت سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کے اوپر کھولے وہ دَر ان کی زندگی میں عملاً ان پر کھلے ہوں اور خدا تعالیٰ کے ہر رنگ کا پیار انہیں ملے۔ (خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۷۴ تا ۸۱)

آیت ۲۳۴ وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۗ وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّاۤ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ

اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اسی طرح عورتوں کا اپنے بچوں کو دودھ پلانے کا مسئلہ ہے۔ انسان نے ایک وقت میں یہ کہہ دیا کہ اس کے بڑے فائدے ہیں دوسرے وقت میں کہہ دیا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جب کہا ماں کا دودھ پلانے کے فائدے ہیں یا جس نے کہا فائدے ہیں تو اس نے گویا قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق کہا کیونکہ دودھ بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور ہر چیز میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے فائدہ رکھا ہے اسلئے ظاہر ہے کہ ماں کی چھاتیوں کے دودھ میں بچے کے لئے فائدہ ہے۔ مگر جب اس دودھ کو بے فائدہ قرار دے کر عورتوں کی ایک یا دو نسلوں کی صحتیں اپنی تھیوریز اور اصول بیان کر کے اور اُن پر عمل کروا کر خراب کر دیں تو پھر انسان نے بڑے آرام سے یہ کہہ دیا کہ اوہ ہو! ہم سے غلطی ہو گئی تھی۔ اب تو ہماری نئی ریسرچ یہ ہے کہ اگر ماں بچے کو دودھ نہ پلائے گی تو نہ بچہ صحتمند ہوگا اور نہ زچگی کے بعد ماں کی صحت عود کرے گی۔ اور یہ سب کچھ اس انداز میں کہا کہ گویا انسان نے ہلاکت کا کوئی کام ہی نہ کیا تھا۔

میں پہلے بھی کئی دفعہ بتا چکا ہوں کہ قرآن کریم نے جو فیملی پلاننگ (خاندانی منصوبہ بندی) کی ہے اس کی اپروچ (Approach) اور طریق تعلیم آجکل کے سائنسدانوں، ڈاکٹروں اور سیاستدانوں سے بالکل مختلف ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جو شخص اپنے بچے کی رضاعت کو مکمل کروانا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ دو سال تک بچے کو ماں کا دودھ پلائے اور دودھ پلانے کے زمانہ میں عورت کو حمل نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح دو بچوں کے درمیان قریباً ۳ سال کا وقفہ پڑ جاتا ہے۔ اب کل ہی ایک دوست ملنے کے لئے آئے تو انہوں نے ایک کتاب کا ذکر کیا جو حال ہی میں چھپی ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ بچے کی نوے فیصد سے زیادہ ذہنی طاقتیں دو سال کے اندر بتدریج ترقی کر رہی ہوتی ہیں گویا نوے فیصد سے زیادہ ذہنی طاقت پہلے دو سال کے اندر نشوونما پاتی ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جسے قرآن کریم نے رضاعت کا زمانہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ماں بچے کو دو سال تک دودھ پلائے۔ دودھ ویسے بھی بڑی اچھی غذا ہے لیکن ماں کا دودھ بچے کی نشوونما کے لئے بہترین غذا ہے مگر ایک وقت میں ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس طرح ماں بھی بیمار ہو جائے گی اور بچے کو بھی فائدہ نہ ہوگا۔

جب دیکھا کہ اس طرح عورتوں کی صحت تباہ ہو رہی ہے تو پھر کہہ دیا کہ اس میں فائدہ ہے اور پھر اب حال ہی میں یہ کہہ دیا کہ بچے کے نوے فیصد سے زیادہ ذہنی قویٰ دوسال کے اندر نشوونما پاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسال تک اس کو بہترین غذا ملنی چاہیے تا کہ اس کے دماغ کی بہترین نشوونما ہو اور بہترین غذا ماں کا دودھ ہے۔

پس قرآن کریم کی تعلیم پر لوگوں نے اعتراض شروع کر دیئے پھر وہ اعتراض واپس لے لئے۔ پھر خود ہی ریسرچ کی اور قرآن کریم نے جو پُر حکمت تعلیم دی تھی اسکی تائید میں باتیں کرنی شروع کر دیں۔ (خطباتِ ناصر جلد ۵ صفحہ ۴۹۵ تا ۴۹۷)

آیت ۲۴۶ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۶﴾

کیا کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنے مال کا ایک اچھا ٹکڑا کاٹ کر بطور قرض دے تا کہ وہ اس مال کو اس کے لئے بہت بڑھائے اور اللہ ہی ہے جو بندہ کے مال میں تنگی یا فراخی پیدا کرتا ہے اور آخر تمہیں اس کی طرف لوٹایا جائے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور تم جو مال بھی پیش کرتے ہو وہ اسی کا ہے اسی سے تم نے لیا اور اسی کو پیش کر دیا۔ اپنے پاس سے تو تم نے کچھ نہیں دیا۔ نہ تمہارا مال اپنا، نہ تمہاری جان اپنی، نہ عزت اپنی، نہ وقت اپنا، اور نہ عمر اپنی، غرض تمہارا اپنا کچھ بھی نہیں۔ محض خدا تعالیٰ کی دین تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہی یہ سب کچھ تمہیں دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ فضل کیا جیسا کہ وہ اس آیت میں فرماتا ہے کہ اگر تم میری دین اور میری عطاء میں سے کچھ مجھے دو گے تو میں تمہیں اس کا ثواب دوں گا دراصل غور کے ساتھ دیکھا جائے تو ہماری سب عبادتیں اللہ تعالیٰ کی سابقہ عطاؤں پر بطور شکر کے ہوتی ہیں۔ یہ محض اس کا فضل ہے کہ وہ ادائے شکر پر مزید احسان کرتا ہے اس طرح شکر اور عطائے الٰہی کا ایک دور اور تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ دیتے ہو تو وہ اسے بطور قرض کے لیتا ہے اور قرض دی ہوئی رقم خرچ نہیں سمجھی جاتی دیکھو اس دنیا میں بھی ایک بھائی دوسرے بھائی کو قرض دیتا ہے مثلاً ایک شخص کے پاس دس ہزار روپیہ ہے اس کا بھائی

اسے کہتا ہے بھائی مجھے اس میں سے تین ہزار روپیہ بطور قرض حسنہ دے دو۔ میں چند ماہ کے بعد اسے واپس کر دوں گا تو اب یہ تین ہزار روپے خرچ تو نہیں ہوئے اس کے پاس دس کا دس ہزار ہی رہا۔ کیونکہ یہ تین ہزار بھی کچھ عرصہ کے بعد اسے واپس مل جائیں گے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو کچھ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیتے ہو وہ خرچ نہیں ہوتا۔ نہ وہ ضائع ہوتا ہے کیونکہ وہ خدا تعالیٰ نے قرض کے طور پر لیا ہے وہ اسے واپس کرے گا اور پھر اس شان سے واپس کرے گا جو ایک قادر اور رزاق خدا کے شایان شان ہے۔

وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ ۖ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ میں اللہ تعالیٰ نے تین بڑے لطیف مضامین بیان کئے ہیں۔ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ کے ایک معنی ہیں۔ يَسْلُبُ قَوْمًا وَّيُعْطِيْ قَوْمًا (المفردات راغب کتاب القاف صفحہ ۳۹۱) یعنی جسے چاہے غریب کر دیتا ہے اور اس کا مال لے کر دوسرے کو دیتا اور اسے امیر کر دیتا ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں۔ يَسْلُبُ تَارَةً وَّيُعْطِيْ تَارَةً (المفردات راغب کتاب القاف صفحہ ۳۹۱) یعنی جب چاہے ایک شخص کا مال چھین لیتا ہے اور جب چاہے پھر اسے اموال عطا کر دیتا ہے۔ تیسرے معنی قبض کے یہ ہیں۔ تَنَاوُلُ الشَّيْءِ بِجَمِيْعِ الْكَفِّ (المفردات راغب کتاب القاف صفحہ ۳۹۱) گویا اس آیت میں يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بیان کی گئی ہے اور پہلے معنی کی رو سے اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا اظہار ایک بنیادی اقتصادی مسئلہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جسے اقتصادیات میں تقسیم پیداوار کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یعنی ملک کی پیداوار آگے مختلف افراد کے ہاتھوں میں کس طرح پہنچے گی اور ملکی پیداوار کی تقسیم کے متعلق آزاد اقتصادیات میں بھی اور ایک حد تک بندھی ہوئی اور مقید اقتصادیات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک وقت تک ایک شخص جس چیز کو بھی ہاتھ لگاتا ہے سونا بن جاتی ہے لیکن پھر بغیر کسی ظاہری سبب اور وجہ کے اس شخص پر فراخی کی بجائے تنگی آجاتی ہے وہی شخص ہوتا ہے وہی سرمایہ ہوتا ہے۔ وہی حالات ہوتے ہیں وہی کاروبار ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس سے برکت چھین لیتا ہے وہ جہاں بھی ہاتھ ڈالتا ہے اسے نقصان ہی نقصان ہوتا ہے اس کی مالی حالت تباہ ہو جاتی ہے اور وہ مفلس و قلاش ہو جاتا ہے ابھی چند دن ہوئے ایک دوست مجھے ملنے کے لئے آئے۔ وہ تاجر ہیں انہوں نے مجھے بتایا کہ ایک وقت تھا اللہ تعالیٰ نے میرے اموال اور میرے کاروبار میں برکت ڈال دی تھی اس نے مجھے وافر رزق دیا تھا اور اس قسم کے حالات پیدا کر

دیئے تھے کہ میں جو بھی کام کرتا رہا اس کے نتیجہ میں مجھے مال میں فراخی نصیب ہوئی لیکن اب اس قسم کے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ گو کام میں اب بھی وہی کرتا ہوں جو پہلے کرتا تھا لیکن اب مجھے وہ نفع نہیں ہوتا جو پہلے ہوتا تھا۔غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اصل قادر ذات جو اپنے ارادہ کے ساتھ اس دنیا میں تصرف کر رہی ہے وہ میری ہی ذات ہے اور کوئی نہیں میں ہی ہوں جو تقسیم پیداوار کے سلسلہ میں ایسی تاریں ہلا دیتا ہوں کہ ایک شخص کے پاس وہی کاروبار ہوتا ہے وہی سرمایہ ہوتا ہے لیکن اس قسم کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ پہلے وہ بہت کما رہا ہوتا ہے اور اب وہ کم کمانے لگ جاتا ہے۔اس کی برکت اللہ تعالیٰ کسی دوسرے کو دے دیتا ہے اور اس کو حاصل ہونے والا نفع اب دوسرے کو ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ لاہور میں ہم کچھ عرصہ رہے ہیں وہاں ہم نے دیکھا کہ کبھی کوئی ریسٹورنٹ مقبول ہو جاتا تھا اور کبھی کوئی ایک ریسٹورنٹ کی مینجمنٹ (Mangement) اور انتظام بھی وہی ہوتا تھا۔عمارت بھی وہی ہوتی تھی۔فرنیچر بھی وہی ہوتا تھا باقی سہولتیں بھی وہی ہوتی تھیں۔اس کے کھانا پکانے والے بھی وہی ہوتے تھے۔اور ایک عرصہ تک وہ ہوٹل اپنے مالکوں کے لئے بہت زیادہ آمد کا موجب بنا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے یکدم کوئی ایسی تبدیلی پیدا ہو جاتی جو انسان کے اختیار اور سمجھ سے باہر ہے۔اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی مقبولیت جاتی رہی۔لوگوں نے وہاں جانا چھوڑ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مالک کو وہ ہوٹل بند کرنا پڑا اگر انسان اپنے ماحول پر گہری نظر ڈالے اور فکر و تدبر سے کام لے تو اسے اس قسم کی سینکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں کوئی ظاہری سبب نظر نہیں آتا لیکن یکدم برکت چھن جاتی ہے۔اسی طرح بعض اوقات اموال اور کاروبار میں برکت دے دی جاتی ہے اور اس کا کوئی ظاہری سبب نہیں ہوتا۔ایک انسان عرصہ تک ابتلاء اور مصائب میں مارا مارا پھرتا ہے اور بڑی تکلیف میں زندگی گزارتا ہے ایک دن اللہ تعالیٰ اس پر رحم کر دیتا ہے اور اس کے اموال اور اس کے کاروبار میں برکت ڈال دیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اس پر فراخی اور کشائش کا دور آ جاتا ہے ابھی چند دن ہوئے مجھے اس قسم کی بھی ایک مثال ملی ہے ایک دوست مجھے ملنے کے لئے آئے انہوں نے مجھے بتایا کہ میں ایک غریب گھرانہ کا فرد ہوں میری آمد بہت کم تھی اور گزارہ مشکل سے ہوتا تھا لیکن ایک دن اللہ تعالیٰ نے کچھ اس قسم کی تبدیلی پیدا کر دی کہ اب میرے کاروبار میں برکت ہی برکت ہے اور خدا تعالیٰ بہت کچھ دے رہا ہے میری غربت اور افلاس کی حالت دور ہو گئی

ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے رزق میں فراخی پیدا ہوگئی ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مال کو روک رکھنا کہ وہ کسی خاص فرد کو نہ ملے یا مال کو حکم دینا کہ فلاں کے پاس چلے جاؤ۔ یہ صرف میرا کام ہے اور کسی کا نہیں اور اگر یہ میرا کام ہے تو جب بھی کوئی شخص میری راہ میں خرچ کرے گا تو اسے امید رکھنی چاہیے کہ میں جس نے اپنی قدرت کی تاریں ساری دنیا میں پھیلا رکھی ہیں اسے مایوس نہیں کروں گا بلکہ اس کے مالوں میں اور اس کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ برکت ڈالتا چلا جاؤں گا۔

دوسرے معنی یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ کے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کسی ملک یا کسی خاندان یا کسی فرد کے سرمایہ یا جائیداد کی پیداوار میں اضافہ کر دیتا ہے یا کمی کر دیتا ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ مال یہاں سے لیا اور وہاں رکھ دیا اس سے لیا اور اسے دے دیا۔ پہلے معنوں کی رو سے تو یہ تھا کہ مال کسی سے لیا اور دوسرے کو دے دیا ایک کے کاروبار میں بے برکتی ڈالی اور دوسرے میں برکت ڈال دی۔لیکن ان معنوں کی رو سے یہ شکل ہوگی کہ اللہ تعالیٰ بغیر اس کے کہ کس کے کاروبار اور اموال میں بے برکتی ڈالے۔ وہ دوسرے کے کاروبار اور اموال میں زیادتی اور افزائش پیدا کر دیتا ہے یا دوسرے کے کاروبار اور اموال میں زیادتی کئے بغیر اس کے اموال اور کاروبار کو کم کر دیتا ہے مثلاً ایک زمیندار ہے اس کی زمین بنجر تھی اس میں کوئی پیداوار نہیں ہوتی تھی یا اگر ہوتی تھی تو بہت کم۔ اللہ تعالیٰ نے سمندروں سے پانی کو بادلوں کے ذریعہ اُٹھایا پھر وہ بادل ایسی جگہ برسے کہ بعض دریاؤں میں طغیانی آگئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس طغیانی کے پانی کو اس شخص کی بنجر زمین میں پھیل جانے کا حکم دیا یہ پانی اپنے ساتھ پہاڑوں سے پیداوار بڑھانے والی مٹی کے اجزا لے آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان ذرات ارضی کو حکم دیا کہ اس شخص کی زمین میں ٹھہر جاؤ۔ تمہارا سفر ختم ہو چکا چنانچہ وہ ذرات ارضی اس کی بنجر زمین میں ٹھہر گئے اور اس طرح جس ایکڑ سے وہ شخص بمشکل دو تین من گندم سالانہ پیدا کرتا تھا اور ادھی پچدھی کھا کر گزارا کرتا تھا اسی زمین میں اتنی طاقت اور زندگی پیدا ہوگئی کہ اب اس میں پندرہ پندرہ من گندم سالانہ پیدا ہونے لگی۔ اسی طرح ایک اور زمیندار ہے اس کی زمین بڑی اچھی ہے اس میں بہت زیادہ پیداوار ہوتی ہے اور اس کی زرخیزی مالک کی آمد میں بہت اضافہ کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جو آسمان سے حکم بھیج کر غریب اور مفلس لوگوں کو مالدار بنا دیتا ہے اور مالداروں کو مفلس اور قلاش بنا دیتا ہے اس زرخیز زمین میں تھور اور

سیم پیدا کر کے اسے بنجر بنا دیتا ہے اور اس طرح اس کی آمد کم ہو جاتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ کسی مالدار کو مفلس اور قلاش بنا دینا یا کسی غریب اور مفلس کو مالدار اور غنی بنا دینا میرے اختیار میں ہے اس لئے اگر تم مجھ سے کوئی سودا کرو گے تو اس میں تمہیں کوئی گھاٹا نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں قادر مطلق اور رزاق ہوں۔

پھر قبض کے معنی مضبوطی سے پکڑ لینے کے بھی ہوتے ہیں اور مضبوطی سے اس شئے کو پکڑا جاتا ہے جس کے متعلق فیصلہ ہو کہ اسے چھوڑنا نہیں۔ کیونکہ اگر اسے چھوڑا تو نقصان ہوگا۔ ان معنوں کے رو سے اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہ بیان فرماتا ہے کہ جو مال تم میرے سامنے بطور ہدیہ پیش کرو گے میں اسے مضبوطی سے پکڑ لوں گا یعنی اسے ضائع نہیں ہونے دوں گا یہ میرا تمہارے ساتھ وعدہ ہے جسے میں بہرحال پورا کروں گا ان معنوں کی رو سے اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو بڑی امید دلاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ غنی ہے اور اسے تمہارے اموال کی حاجت نہیں لیکن تمہاری پاک نیتوں اور محبت اور فنا فی اللّٰہی کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی رحمت سے تمہیں نوازتا ہے اور شکر اور پیار کے ساتھ تمہاری مالی قربانیوں کو قبول کرتا ہے اور مضبوطی کے ساتھ انہیں پکڑ لیتا ہے اور انہیں ضائع نہیں ہونے دیتا بلکہ وَ يَبْصُۜطُ اپنی بے پایاں عطا بھی اس میں شامل کرتا ہے اور انہیں بڑھا کر اور وسعت دے کر کہیں سے کہیں لے جاتا ہے اور وہ تمہیں اس دنیا میں بھی اپنی عطائے کثیر کا حقدار بنا دیتا ہے اور جب تم لوٹ کر اس کی طرف جاؤ گے تو وہ بڑے پیار سے تمہیں کہے گا یہ لو اپنے مال جو تم نے میری راہ میں خرچ کئے تھے دیکھو میں نے تمہارے لئے انہیں کس قدر بڑھایا اور ان میں کس قدر کثرت اور وسعت بخشی۔ پس خوش ہو کر اپنے ربّ کے ساتھ کبھی کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔

(خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۱۵۰ تا ۱۵۴)

اس میں جو مضمون بیان ہوا اس میں سے میں نے چھ باتیں اٹھائی ہیں۔ پہلی بات یہ کہی گئی کہ مَنْ ذَا الَّذِيْ کیا کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنے مال کا ایک اچھا ٹکڑا کاٹ کر دے؟ کیا کوئی ہے؟ یہ اعلان ہے انسانیت کی طرف حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رنگ میں مالی قربانی کا اعلان غالباً تاریخِ انبیاء میں پہلی دفعہ کیا۔ مَنْ ذَا الَّذِيْ کیا کوئی ہے؟ اس وقت تو جن کی پرستش کرتے تھے، بتوں کی رؤسائے مکہ، ان کے لئے بھی خرچ نہیں کرتے تھے،

ان پر بلکہ ان کی وجہ سے پیسے بناتے تھے اور آمد پیدا کرتے تھے۔ وہ دولت کمانے کا ذریعہ تھے اس دنیا میں۔ وہ اخروی زندگی میں کچھ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں تھے اور یہ اعلان، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع میں اُمتِ محمدیہ کے جو چودہ سو سال گزرے ہیں اس میں تمام خدا تعالیٰ کے مقرب مصلح اور ولی جو ہیں، یہ آواز دیتے رہے ہیں کیونکہ مختلف خطہ ہائے ارض میں ایک چکر کے اندر مسلمانوں کے گروہ غافل ہوتے رہے۔ خدا تعالیٰ کی راہ میں مالی قربانی کے میدان میں اور ان کو یہی کہا گیا۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ کیا کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربانی دینے والا ہو؟

تاریخ کی باتیں تو دور کی باتیں ہیں، ہماری اپنی زندگی کی ابتدا میں جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ساری دنیا میں اسلام کو غالب کرنے کے منصوبہ پر عمل پیرا ہونے کے لئے ایک جماعت کو قائم کیا تو اس وقت جو ہماری شروع کی تاریخ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں دو آنے پیش کرنا بھی بڑا بار محسوس کرتا تھا، اس وقت کا ایک مسلمان، ایمان تھا، دعویٰ تھا، لیکن بہت سارے ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ وہ مالی قربانی کو بالکل بھول چکا تھا۔ اس واسطے ہمیں نظر آتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو آپ پر شروع میں ایمان لائے اور انہوں نے مالی قربانی میں حصہ لینا شروع کیا تو جس نے دو آنے دیئے یا چار آنے دیئے، ان کے نام بھی اپنی کتابوں میں لکھ کے قیامت تک ایک دعا حاصل کرنے کی زندگی انہیں بخش دی۔

ایک خاندان ایک اور ضمن میں میرے سامنے آیا۔ ایک شخص اپنے اخلاص سے لنگر خانے میں کام کرتا تھا باورچی کا اور اس کو تین روپے تنخواہ ملتی تھی مہینے کی اور کھانا لنگر خانے میں ملتا ہی ہے ہر ایک کو، اس کا حق ہے اور تین روپے کے اوپر اگر وصیت بھی ہے تو پانچ آنے سے کچھ کم رقم بنتی ہے۔ ماہانہ۔ یہ قربانی تھی لیکن اصل قربانی یہ تھی کہ اپنی زندگی ایک طرح وقف کی ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ فضل کیا کہ اس کے بچوں میں سے پانچ کے متعلق تو مجھے علم ہے کہ ہر ایک آٹھ، دس ہزار ماہانہ کمانے لگ گیا ہے۔ جس کا باپ تین روپے سے خدمتِ سلسلہ اور خدمتِ مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کر رہا تھا۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ کیا کوئی ہے؟ یہ نعرہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لگایا۔ اور یہ ایک نعرہ ہے جس کا ایک پہلو یہ ہے کہ لوگ مالی میدان میں خدمت کا شوق بھول چکے ہیں اور ان میں شوق پیدا

کیا گیا اور دوسرا پہلو یہ ہے، (جو آگے اگلی باتیں میں بتاؤں گا ان میں وہ نمایاں ہوتا ہے) دوسری بات اس میں یہ کی کہ مالی قربانی کرنے والے کیا ایسے ہیں کہ جو اپنے مال کا ایک اچھا ٹکڑا کاٹ کر دیں؟ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا پھر جیسا کہ میں نے بتایا کہ وہ جو دو دو آنے دینے والے تھے ان میں سینکڑوں ہزاروں نے، جب جائیداد بنائی تو اس کا ایک حصہ دے دیا اور ایسے بھی ہیں جنہوں نے، جب ضرورت پڑی تو قریباً سارا مال ہی پیش کر دیا۔

تو اچھا ٹکڑا کاٹ کر دیا۔ دو آنے سے وسعت پیدا ہوئی اور ہزاروں لاکھوں کی رقم ایک وقت میں دینے والے پیدا ہو گئے۔ یعنی اب جماعتِ احمدیہ کے اخلاق اور کردار کا یہ حال ہے روحانی ترقی کے نتیجہ میں کہ صد سالہ جوبلی میں بعض دوستوں نے لاکھوں میں وعدے لکھوائے ہیں۔ پھیلا ہوا ہے وہ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے وعدہ کیا ہے ہم ہر سال ایک لاکھ روپیہ دیتے چلے جائیں گے۔ تو انہوں نے یا ان کے آباء نے آنوں میں قربانی دی خدا تعالیٰ نے دولت کے پہاڑ ان کے قدموں میں لا کے رکھ دیئے اور دل میں جو جذبہ تھا قربانی کا اس میں اور جوش پیدا کیا اور اگلی نسل نے آنوں کی قربانی کے مقابلے میں لاکھوں کی قربانی دینی شروع کر دی۔

تیسری بات اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہے کہ اگر تم اپنے مال کا ایک اچھا ٹکڑا نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے اس کے حضور پیش کر دو گے فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے بہت بہت بڑھائے گا۔ آپ میں سے جو مشاہدہ کرنے والے ہیں اور غور اور فکر اور دوربینی سے اپنے ماحول کا جائزہ لینے والے ہیں ان کے سامنے بہت ساری ایسی مثالیں آئیں گی کہ جو اَضْعَافًا كَثِيْرَةً بہت بہت بڑھا کر پیش کرنے والے ہیں۔

ابھی جو اٹلی اور برازیل کی مساجد کے لئے خدام الاحمدیہ چاہتی تھی کہ ہمیں اجازت دی جائے ہم قربانی پیش کریں، تو لنڈن کے ایک احمدی نوجوان نے کئی سو پونڈ اپنے بنک سے قرض لے کر دے دیئے۔ پہلے وعدہ لکھایا، پھر اس کو خیال آیا کہ وعدے سے تو کچھ نہیں بنتا، بنک سے کہا مجھے قرض دے دو۔ اس کا لین دین بنک والوں سے اچھا تھا، انہوں نے قرض دے دیا اور (صحیح مجھے یاد نہیں) شاید ایک ہفتہ ہی گزرا تھا (بہت کم وقت گزرا تھا) کہ اسی بنک کی طرف سے اس کو چٹھی آئی کہ پچھلے سال ہم نے تمہارا انکم ٹیکس ادا کرنے کے لئے جو رقوم کاٹی تھیں غلطی سے زائد کاٹ لی تھیں اور یہ اب ہم تمہیں

واپس کر رہے ہیں اور بالکل وہ رقم جو اس نے چندے میں دے دی تھی اس کا چیک دیا۔ تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک چھپی ہوئی دولت جو تھی وہ اس کو لوٹا دی اور عملاً ذہنی لحاظ سے اس کو کوئی کوفت یا تکلیف بھی نہیں ہوئی۔ یہ بھی تکلیف نہیں اللہ تعالیٰ نے پہنچائی کہ میں نے آہستہ آہستہ بنک کو جو قرض واپس کرنا ہے وہ کیسے کروں گا؟ بہت ساری جگہ لمبا سلسلہ چل پڑتا ہے قرض کی ادائیگی میں اور وہ دے دیا۔ بہت ساری مثالیں ہیں ایسی۔

تو تیسری بات اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ جو شخص اپنے مال کا ایک اچھا ٹکڑا کاٹ کر خدا تعالیٰ کے حضور پیش کر دیتا ہے خدا تعالیٰ فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (یہ میں اب ترجمہ نہیں کر رہا، مفہوم بیان کر رہا ہوں) بہت بہت اضافہ کر کے اس کا مال اسے لوٹاتا ہے۔

یہ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً دو رنگ میں سامنے آتا ہے۔ ایک اس دنیا میں، اس زندگی میں اور ایک مرنے کے بعد۔ مرنے کے بعد جو فدائیت اور ایثار خدا تعالیٰ قبول کر لیتا ہے اس کا بدلہ جو ہے وہ تو ساری دنیا بھی اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتی۔ اتنی دولت ہے وہ، اتنی قیمت ہے اس عطا کی۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (پہلے تو مومنوں کو کہا نا مَنْ ذَا الَّذِيْ میرے حضور قربانی پیش کرے گا قَرْضًا حَسَنًا کی شکل میں۔ پھر بشارت دیتا ہے کہ میں اسے بڑھاؤں گا۔ جیسا کہ میں نے ذرا مختصراً تفصیل سے بتایا یعنی اختصار بھی ہے تھوڑی تفصیل بھی ہے) کہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ کہ اس دنیا میں جو اموال خدا بندوں کو دیتا ہے وہ لیتا ہے، دیتا بھی ہے اور اسے بڑھاتا بھی ہے۔ یہاں ''لیتا بھی ہے'' (یہ عربی کا محاورہ ہے، قرآن کریم کی بہت ساری آیات سے بھی یہ ہمیں پتہ لگتا ہے) کے معنی ہم یہ کریں گے۔ ''وہ لیتا بھی ہے اور کبھی نہیں بھی لیتا''۔

بعض دوسری جگہ اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ جو بس دنیا کے ہو رہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے اچھا! پھر دنیا لے لو اور ان کو انذار یہ ہے کہ آخری زندگی میں پھر جو تمہارا حال ہوگا خدا کی پناہ۔ پھر تمہیں پچھتاوا ہوگا کہ کیوں ہم نے یہ حرکت کی۔

تو اللہ تعالیٰ بعض سے نہیں لیتا، بعض سے لیتا ہے، جن سے وہ لیتا ہے ان کی شکل دو طرح سامنے آتی ہے، دو شکلیں بنتی ہیں۔ ایک یہ کہ يَبْصُۜطُ جو مال لیتا ہے اس میں بڑھوتی کرتا ہے اور ایک یہ شکل ہے کہ مال لیتا ہے اور بڑھوتی نہیں کرتا۔ سزا کے طور پر ہو تو وہ انعام نہیں نا ملتا۔

جو شخص اپنے مال کے بھروسے پر اور اس کو ذریعہ بنا کر خدا تعالیٰ کے منصوبہ کو نا کام کرنے کی کوشش کرے، جب ایسے گروہ سے دولت اللہ تعالیٰ واپس لیتا ہے تو بڑھا کے دینے کا تو سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تو سزا ملی ہے ان کو۔ تو وَ یَبۡصُۜطُ کے بھی دو معنی ہوں گے یعنی ایک ذکر جس کا نہیں کیا لیکن اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں کہ ''وہ بڑھاتا ہے'' اور ساتھ اس کے یہ کہ ''وہ چاہے تو نہیں بھی بڑھاتا''۔ اور جن کا مال وہ لیتا ہے اور اپنے فضل اور اپنی رحمت سے یہ مالی قربانی وہ قبول کرتا ہے اور اس قربانی کو قبول کرنے کے نتیجہ میں یَبۡصُۜطُ وہ ان کی دولت کو، ان کے اموال کو، مادی اموال کو بھی، مادی دولت کو بھی اور روحانی طور پر بھی جو نعمتیں ہیں ان میں وہ برکت ڈالتا ہے اور بہت بڑھوتی ہے ان میں۔

یہ جو میں نے دوسری زندگی کے متعلق کہا ہے کہ وہ بھی اس میں شامل ہے اس کی طرف یہی آیت اشارہ کر رہی ہے کیونکہ اسے ختم کیا (چھٹی بات یہ بتائی)۔ آخر تمہیں اسی کی طرف لوٹایا جائے گا۔ وَ اللّٰہُ یَقۡبِضُ وَ یَبۡصُۜطُ ۪ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ اور جب اس کی طرف لوٹایا جائے گا تو جو اموال خدا نے تمہارے قبول کئے ہوں گے۔ جب تم پیش کرو گے اللہ تعالیٰ قبول کرے گا۔ جب قبول کرے گا ان میں بڑھوتی کرے گا۔ جب بڑھوتی کرے گا تو اس زندگی میں بھی وہ اس کا بدلہ دیتا ہے لیکن مرنے کے بعد جو ہے بدلہ وہ تو اس قدر حسین اور وسعتیں رکھنے والا ہے کہ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ (اٰلِ عمران: ۱۳۴) کہ آسمان و زمین کی دولت ایک آدمی کی جنّت کی دولت کے برابر ہے۔

(خطباتِ ناصر جلد نہم صفحہ ۴۷۰ تا ۴۷۴)

آیت ۲۴۸ وَ قَالَ لَہُمۡ نَبِیُّہُمۡ اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ بَعَثَ لَکُمۡ طَالُوۡتَ مَلِکًا ؕ قَالُوۡۤا اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہُ الۡمُلۡکُ عَلَیۡنَا وَ نَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡکِ مِنۡہُ وَ لَمۡ یُؤۡتَ سَعَۃً مِّنَ الۡمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰىہُ عَلَیۡکُمۡ وَ زَادَہٗ بَسۡطَۃً فِی الۡعِلۡمِ وَ الۡجِسۡمِ ؕ وَ اللّٰہُ یُؤۡتِیۡ مُلۡکَہٗ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۴۸﴾

ہمارے ہاں کہتے ہیں ''اللہ مالک ہے'' یہ محاورہ بڑا پیارا ہے حقیقت یہی ہے کہ اللہ ہی مالک ہے۔ اللہ کے سوا وہ کونسی ہستی ہے جو کسی چیز کی بھی مالک ہو اور جو بھی غلبہ اور طاقت ملتی ہے وہ خدا تعالیٰ سے ہی

ملتی ہے۔ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ (البقرۃ:۲۴۸) اللہ جسے چاہتا ہے طاقت اور غلبہ اور حکومت دیتا ہے۔ حکومت سے مراد صرف کسی قوم یا ملک کی بادشاہت نہیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہر ایک گھر کا ایک بادشاہ ہے۔ اپنے ماحول کا ایک بادشاہ ہے سکول کا ایک بادشاہ ہے یعنی اپنے اپنے ماحول میں ہر ایک کو طاقت اور غلبہ حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مُلک اور طاقت اور غلبہ اور بادشاہت تو اللہ کی ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی حکمتِ کاملہ سے اپنے بندوں میں سے بعض کو کسی نہ کسی رنگ میں غلبہ یا اثر ورسوخ دیتا ہے۔ طاقت عطا کرتا ہے اس لئے تم اس طاقت اور غلبہ اور اثر کو اسی طرح استعمال کرو جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور جس طرح اس نے ایک اور آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (فاطر:۱۴) لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ (التغابن:۲) یعنی اللہ تعالیٰ ربّ ہے۔

ساری بادشاہت اور غلبہ اور طاقت اس کو حاصل ہے جہاں تک تمہارا تعلق ہے لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ تم اپنی زندگیوں کو اس طرح گزارو کہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہت اور اس کے مالک ہونے کا احساس دنیا میں پیدا ہو اور یہ احساس پیدا ہو کہ وہ تمام تعریفوں کا مستحق ہے کیونکہ جو اس کے بندے بن جاتے ہیں وہ ایسے کام کرتے ہیں کہ انسان کو مجبور ہو کر ان کی تعریف کرنی پڑتی ہے اور جب انسان کو مجبور ہو کر اللہ کے بندوں کی تعریف کرنی پڑتی ہے تو اللہ جس نے اس بندہ کو پیدا کیا کس قدر تعریف اور حمد کا مستحق ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی طاقت کے استعمال میں تمام بدیوں سے اپنے آپ کو اس طرح بچائے کہ انسانی عقل اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ جس اللہ کی طرف یہ منسوب ہونے والا ہے اس کی حمد۔ اس کی تعریف الفاظ اور بیان سے باہر ہے۔ ایسے انسان میں تکبّر نہیں پیدا ہوتا کیونکہ جب انسان اس یقین پر قائم ہو کہ تمام طاقت اور غلبہ اور بادشاہت اللہ کی ہے۔ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اللہ کی منشا اور ارادہ سے ملتا ہے تو پھر اس کی اپنی تو کوئی خوبی نہ رہی۔ اس لئے اس کی زبان پر اپنی بڑائی کی بجائے لَا فَخْرَ کا نعرہ ہوتا ہے۔ یعنی وہ کہے کہ مجھ میں کوئی فخر کی بات نہیں۔ میں اپنے اندر کوئی خوبی نہیں پاتا۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے رحم اور فضل سے مجھے یہ عطا کیا ہے اور ایسا شخص کوئی ایسا کام نہیں کرسکتا جو اللہ کی مخلوق کو دکھ پہنچانے والا ہو۔ ایسا انسان کبھی ظالم نہیں ہوگا کیونکہ وہ اس یقین پر کھڑا ہوگا کہ بادشاہت اللہ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ ہونے کی حیثیت

سے (باپ ہونے کی حیثیت سے، ماں ہونے کی حیثیت سے، ماسٹر ہونے کی حیثیت سے یا پرنسپل ہونے کی حیثیت سے، اپنی جماعت کے صدر یا سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے یا دوسری ہزار حیثیتوں میں) انسان کو طاقت اور غلبہ ملتا ہے صرف کسی ملک یا قوم کی بادشاہت کی حیثیت سے ہی نہیں۔ انسان یہ کہتا ہے کہ یہ طاقت اور غلبہ تو دراصل خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک ہے اس نے مجھے طاقت اور غلبہ میں جس کا وہ منبع اور سرچشمہ اور حقیقی مالک ہے اس لئے شامل کیا ہے کہ میں اس کی مخلوق کی بھلائی کے کام کروں۔ ایسا انسان ظلم کر ہی نہیں سکتا۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۵۸۵ تا ۵۸۷)

آیت ۲۵۰ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾

اب میں اس واقعہ کو لیتا ہوں جو گزشتہ ستمبر میں ہماری قوم اور ہمارے ملک پر گزرا۔ ۶ ستمبر کو ہمارے ہمسایہ ملک بھارت نے نہایت ظالمانہ طور پر اور فریب سے کام لیتے ہوئے پاکستان پر حملہ کیا۔ سترہ دن تک یہ جنگ لڑی گئی۔ یہ جنگ عام معمولی جنگوں کی طرح نہیں تھی بلکہ اس میں ہمیں بعض ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو اسے ایک خاص قسم کی جنگ بنا دیتی ہیں کیونکہ دوران جنگ پاکستانی قوم پر اللہ تعالیٰ کے مختلف اقسام کے افضال اور برکتیں نازل ہوتی نظر آئیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے۔

اے دل تو نیز خاطر ایناں نگاہ دار
کاخر کنند دعویٰ حُبّ پیمبرم (درثمین فارسی صفحہ ۱۰۷)

آپؑ نے ایک موقعہ پر فرمایا

”اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک سورۃ بھیج کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قدر اور مرتبہ ظاہر کیا ہے اور وہ سورۃ ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (الفیل:۲) یہ سورۃ اس حالت کی ہے کہ جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مصائب اور دُکھ اٹھا رہے تھے اللہ تعالیٰ اس حالت میں آپ کو تسلّی دیتا ہے کہ میں تیرا مؤید و ناصر ہوں۔

اس میں ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے کہ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے ربّ نے اصحاب الفیل کے ساتھ کیا کیا۔ یعنی اُن کا مکر اُلٹا کر اُن پر ہی مارا اور چھوٹے چھوٹے جانور ان کے مارنے کے لئے بھیج دیئے۔ ان جانوروں کے ہاتھوں میں کوئی بندوقیں نہ تھیں بلکہ مٹی تھی بھیگی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں۔ اس سورۂ شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خانہ کعبہ قرار دیا ہے اور اصحاب الفیل کے واقعہ کو پیش کر کے آپ کی کامیابی اور تائید اور نصرت کی پیشگوئی کی ہے۔ یعنی آپ کی ساری کارروائی کو برباد کرنے کے لئے جو سامان کرتے ہیں اور جو تدابیر عمل میں لاتے ہیں۔ ان کے تباہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ ان کی ہی تدبیروں کو اور کوششوں کو اُلٹا کر دیتا ہے کسی بڑے سامان کی ضرورت نہیں ہوتی جیسے ہاتھی والوں کو چڑیوں نے تباہ کر دیا ایسا ہی یہ پیشگوئی قیامت تک جائے گی۔ جب کبھی کوئی اصحاب الفیل پیدا ہوگا تب ہی اللہ تعالیٰ ان کے تباہ کرنے کے لئے ان کی کوششوں کو خاک میں ملا دینے کے سامان کر دیتا ہے.....

اس وقت اصحاب الفیل کی شکل میں اسلام پر حملہ کیا گیا ہے مسلمانوں کی حالت میں بہت کمزوریاں ہیں اسلام غریب ہے اور اصحاب فیل زور میں ہیں مگر اللہ تعالیٰ وہی نمونہ پھر دکھانا چاہتا ہے چڑیوں سے وہی کام لے گا۔“ (الحکم ۱۷؍جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہاں ہمیں بتایا ہے کہ جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اور ناموس کا سوال پیدا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مسلمان کہلانے والوں کی کمزوریوں کو نظر انداز کر دے گا اور اپنے اس مقدس بندے کی عزت اور ناموس کی خاطر اس کے دشمنوں کو تباہ اور برباد کر دے گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بتایا گیا تھا کہ

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پناہ گزین ہوئے قلعہ ہند میں“ (تذکرہ نیا ایڈیشن صفحہ ۴۰۴)

سو پاکستان وہ قلعہ ہند ہے جس پر بھارت نے حملہ کیا تو خدا تعالیٰ کے فرشتے آسمان سے اُترے اور مسلمانوں کی تائید میں اترے اس کے نتیجہ میں بھارت کو ذلّت آمیز شکست دیکھنی پڑی۔ جس کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔ بھارت اور پاکستان کا فوجی لحاظ سے کوئی باہم مقابلہ تھا ہی نہیں۔ آج کل جنگی نقطۂ نگاہ سے ہوائی جہازوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور بھارت کے ہوائی جہاز ہم سے چھ گنا زیادہ تھے اور پھر وہ ہمارے جہازوں سے اچھے تھے۔ تیز رفتار تھے اور ان کے پیچھے بڑی ٹریننگ تھی لیکن خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ کہ میں یہ اذن آسمان سے نازل کرتا ہوں کہ یہ تھوڑی تعداد والے جہاز بڑی تعداد والے جہازوں پر غالب آئیں گے اور یہ ایک حقیقت ہے ایک واقعہ ہے جسے ہم نے دیکھا اور خود مشاہدہ کیا حالانکہ یہ ایک ایسی بات ہے جسے بظاہر انسانی عقل تسلیم نہیں کرتی لیکن جو واقعہ ہمارے آنکھوں کے سامنے ہوا۔ اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

پاکستان کی فضائیہ کے پاس جنگی جہاز بڑی کم تعداد میں تھے پھر بھی انہوں نے ایک ایسی حکومت سے مقابلہ کیا جس کے پاس ان سے چھ گنا زیادہ جنگی جہاز تھے انہوں نے اپنی تعداد کے برابر یا اس کے کچھ زیادہ دشمن کے جہازوں کو تباہ کر دیا اور ہمارے صرف بارہ ہوائی جہاز دشمن کے حملہ سے تباہ ہوئے۔ ہمارے ایک ہوا باز نے ایک وقت میں دشمن کے پانچ جہاز مار گرائے۔ جب اخباری نمائندہ اس کے پاس انٹرویو کے لئے آیا تو اس نے کہا میرا کوئی کمال نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے مجھے تو صرف اتنا علم ہے کہ ایک وقت میں بھارت کے پانچ جہاز میرے سامنے زاویہ بنا کر لڑے میں بھی ان کے پیچھے اسی زاویہ میں مڑ گیا پھر یکدم میرے سامنے اندھیرا آ گیا میں نے اپنے جہاز کا ایک خاص بٹن دبا دیا اور کچھ دیر کے بعد مَیں نے دیکھا کہ ان میں سے چار جہاز نیچے آ رہے تھے اس نے یہ بھی کہا مجھے اپنے کارنامہ پر نہ کوئی فخر ہے اور نہ میں اسے اپنی ذات سے منسوب کرتا ہوں یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جو اس نے اس وقت فرمایا۔ (خطابات ناصر جلد ۱ صفحہ ۲۲ تا ۲۴)

آیت ۲۵۱، ۲۵۲ وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ فَهَزَمُوْهُمْ

بِاِذْنِ اللّٰهِ ۟ۙ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

یہ دعا قرآن کریم میں روایتاً ہی بیان ہوئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ ہی انبیاء علیہم السلام کو دعائیں سکھاتا رہا ہے اور جب ان کو قرآن کریم میں دوہرایا گیا ہے تو اسی غرض سے دوہرایا گیا ہے کہ ایک مسلمان بھی ان دعاؤں کی طرف متوجہ ہو اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دعا میں یہ سکھایا ہے کہ یہ دعا کیا کرو کہ اے خدا! ہمیں کمال صبر عطا کر اور ہمیں ثبات قدم بخش۔ پاؤں میں کبھی لغزش نہ آئے اور وہ جو تیرے اور تیرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر اور مخالف اور تیری توحید کے خلاف اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے خلاف منصوبے باندھنے والے اور سازشیں کرنے والے ہیں ان کے مقابلہ میں خود ہماری مدد کو آتا کہ تیری توحید قائم ہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت کو انسان کا دل تسلیم کرنے لگے اور وہ آپ کی برکات اور فیوض سے حصہ لے۔

اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا۔ اَفْرِغْ کے اصل معنی تو یہ ہیں کہ جب کنوئیں سے ڈول میں پانی نکالا جائے تو اس کو اس طرح اُنڈیلا جائے کہ وہ خالی ہو جائے۔ یعنی پورے کا پورا پانی ڈال دیا جائے۔ پس اس ڈول کو خالی کر دینے کو افراغ کہتے ہیں۔ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا کے یہ معنی ہوں گے کہ ہمیں صبر کا کمال عطا کر ہم پر سارے کا سارا صبر نازل کر۔

قرآنی محاورہ میں صبر کے بہت سے معانی ہیں۔ صبر کے ایک معنی یہ ہیں کہ اپنے نفس کو سختی کے ساتھ احکام شریعت کا پابند بنایا جائے اور ہوائے نفس اور نفسانی خواہشات کے خلاف کمال مجاہدہ کیا جائے۔ یعنی اوامر کی اتباع اور پیروی اور تعمیل احکام اور جو نواہی ہیں ان سے پورے طور پر بچنا اور اپنے نفس کے خلاف مجاہدہ کرنا کہ وہ کہیں ہوائے نفس کا شکار نہ بن جائے اور یہ سب کچھ رضائے الٰہی کی خاطر کرنا۔

تو یہ دعا ہے کہ اے خدا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا ہمیں اس رنگ میں کمال صبر عطا کر کہ ہم تیری

شریعت کے کامل اور سچے متبع بن جائیں اور وہ راہیں جو تیری ناراضگی کی طرف لے جانے والی ہیں ان راہوں کو اپنے نفس پر کُلّی طور پر مسدود کر لیں۔ ہوائے نفس کا شکار نہ بنیں اور یہ اس لئے نہ کریں کہ ہمیں دنیا کے اموال ملیں اور ہمارے دل میں اس دنیا کی لذتوں کی جو خواہش ہے وہ پوری ہو بلکہ یہ اس لئے کریں کہ ہمیں تیری رضا مل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا کی یہ دعا کرتے رہا کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں توفیق دے کہ اوامر پر کاربند رہو اور نواہی سے بچتے رہو کہ عمل کی توفیق اسی وقت ملتی ہے جب اللہ تعالیٰ دیتا ہے اور دعا سے اسے حاصل کرنا چاہیے۔

صبر کے ایک معنی یہ ہیں (اگر اس پہلے معانی کو دو کہہ دیں یعنی شریعت کے احکام کی پابندی اور نواہی سے بچنا تو) اس کے تیسرے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو مصائب آئیں ان سے انسان گھبرائے نہیں بلکہ انہیں بشاشت کے ساتھ برداشت کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تم میری شریعت پر عمل کرو گے اور منکر سے بچو گے۔ جب تم میری بتائی ہوئی تعلیم کی دنیا میں اشاعت کرو گے۔ جب وہ دنیا جو نفس پرستی اور عیش پرستی میں محو ہے ان کو ان کی برائیوں سے روکو گے تو یقیناً وہ تمہارے خلاف ہر قسم کے منصوبے کریں گے۔ سازشیں کریں گے ان کے شر سے بچنے کیلئے مجھ سے دعا کرو۔ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا کہ اے ہمارے ربّ! ہم تیرے منہ کی خاطر تیرے حکم پر کاربند ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور تیری ناراضگی کے خوف سے تیری بتائی ہوئی نواہی سے بچتے ہیں لیکن ہمیں یہ اندھی دنیا ستانے لگ جاتی ہے۔ ہمیں دکھ دینے لگ جاتی ہے یہ نہیں چاہتی کہ تیرا بول بالا ہو۔ تیری شریعت قائم ہو۔ یہ اندھی دنیا نہیں چاہتی کہ اسلام کی جو مسرتیں ہیں وہ انہیں ملیں کیونکہ اس طرح انہیں دنیا کی مسرتیں اور لذتیں اور عیش چھوڑنے پڑتے ہیں۔ ہم تجھ سے یہ التجا کرتے ہیں کہ اگر اس راہ میں مصائب آئیں جیسا کہ الٰہی جماعتوں پر آیا کرتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے فضل سے یہ توفیق دینا کہ ہم ان مصائب کے مقابلہ میں صبر سے کام لیں اور ہمارے دل گھبرا نہ جائیں اور ہم ان مصائب کے وقت ایسا نمونہ دکھائیں کہ دنیا پر ان کا اچھا اثر ہو اور دنیا یہ سمجھنے لگے کہ جب خدا کے اتنے کمزور بندے ہر قسم کے مصائب کو برداشت کر رہے ہیں تو ضرور کوئی بات ہے ان کی توجہ اس طرف پھرے کہ یہ تہی دست اور قوتوں سے خالی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے کوئی ایسی قوت اور طاقت ہے جس قوت اور طاقت کا انسان مقابلہ نہیں کر سکتا۔

پس صبر کے ایک معنی ہیں دشمن کے منصوبوں اور سازشوں کا حوصلے اور جرأت کے ساتھ مقابلہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ یہ دعا کرتے رہا کرو کہ اے ہمارے ربّ! اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا جو منصوبے اسلام کے خلاف باندھے جائیں جو سازشیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کی جائیں تو ہمیں حوصلہ اور جرأت عطا کر کہ ہم ان کا مقابلہ کریں اور انہیں تیرے فضل سے ناکام بنا دیں۔

پھر صبر کے چوتھے معنی اس امتحان کے ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا لیتا ہے کیونکہ قرآن کریم میں بڑی وضاحت سے یہ بیان ہوا ہے کہ صرف ایمان کا اقرار اور دعویٰ یا اعلان جو ہے وہ تمہارے کام نہیں آئے گا۔ تمہارے ایمان کی صداقت کو پرکھنے کیلئے تمہارا امتحان لیا جائے گا اور وہ امتحان مختلف طریقوں سے ہوگا۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حوادث زمانہ کی شکل میں امتحان کا پرچہ ڈالے گا۔ بچے فوت ہو جائیں گے۔ حوادث آئیں گے فصلیں تباہ ہو جائیں گی۔ تجارتوں میں گھاٹے پڑیں گے لوگ طعنے دیں گے کہ مسلمان ہو گئے، احمدی ہو گئے دیکھو! تمہیں کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو خالی دعویٰ کافی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ تمہارا امتحان لے گا اور تمہیں حوادثِ زمانہ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس وقت پورے صبر سے ان حوادث کو برداشت کرنا تمہارا کام ہے۔ تمہارا سینہ ایسے امتحان کے وقت تنگ نہیں ہونا چاہیے بلکہ تمہارے سینہ میں ایک بشاشت پیدا ہونی چاہیے کہ خدا نے میرا امتحان لیا اور خدا نے اپنے فضل سے مجھے توفیق دی کہ میں اس کے اس امتحان میں کامیاب ہو جاؤں۔ فَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ دعا کرتے رہو اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا کہ اے ہمارے ربّ! تو جب بھی ہمارا امتحان لینا چاہے ساتھ ہمیں اس کی توفیق بھی دے کہ ہم تیرے اس امتحان میں کامیاب بھی ہوں اور جو ہمارے حقیر اعمال ہیں ان کا نتیجہ تیری خوشنودی اور رضا کی شکل میں نکلے۔ صبر کے پانچویں معنی ہیں زبان پر قابو رکھنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ دعا کرتے رہو اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا کہ اے خدا! ہمیں اس بات کی قوت بخش کہ ہم اپنی زبان کو اپنے قابو میں رکھیں اور اسلام کی اشاعت میں اور اسلام کے حق میں جو جدوجہد کی جائے اس کے وہ پہلو جو اخفاء میں رکھے جانے چاہئیں ہم انہیں اخفاء میں رکھیں، ان کو ظاہر نہ کریں اور تو نے ہماری زبان پر جو پابندیاں لگائی ہیں ہم صبر کے ساتھ ان پابندیوں کو اُٹھانے والے ہوں۔ صبر کے چھٹے معنی ہیں برداشت کے ساتھ انتظار کرنا، بے صبری نہ دکھانا۔

سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ دعا کرتے رہا کرو کہ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا اے ہمارے ربّ! ہمیں کمال صبر عطا کر۔ تو نے ہم سے بہت سے وعدے کئے ہیں جو اپنے وقت پر پورے ہوں گے ایسا نہ ہو کہ ہمارے نفس جلدی کی خواہش کریں اور وہ یقین جو ایک مومن کے دل میں اپنے ربّ کے وعدوں پر ہونا چاہیے وہ یقین قائم نہ رہے اور ہم بے صبری دکھائیں اور پھر بے صبری کے نتیجہ میں ایسے بول بول دیں یا ایسے اعمال کر لیں جو تجھے ناراض کر دیں اور ہم تیری بشارتوں سے محروم ہو جائیں۔ پھر تو کوئی اور قوم یا کوئی اور نسل پیدا کرے جو تیرے وعدوں کی حامل ہو۔ جن کے حق میں تیری بشارتیں پوری ہوں۔ اے خدا! ایسا نہ ہو بلکہ ہمیں صبر کے ساتھ انتظار کرنے کی توفیق عطا کر اور ہمیں اس میں بھی کمال بخش تا ہم بے صبری کی مضرات سے بچنے والے ہوں اور صبر کے ساتھ تیرے وعدوں کا انتظار کرنے والے ہوں کیونکہ تو اپنے وعدوں کا سچا ہے تو نے آسمانوں پر یہ فیصلہ کیا کہ اسلام کو تمام دنیا میں غالب کرے گا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت سب انسانوں کے دلوں میں بٹھائے گا۔ اس آسمانی فیصلے کا اس دنیا میں اجراء تو ضرور ہوگا لیکن اپنے وقت پر ہوگا۔ اس کیلئے ہمارے امتحان لئے جائیں گے اس کیلئے ہم سے مجاہدے طلب کئے جائیں گے۔ اس کے لئے ہمیں مصائب میں سے گزرنا پڑے گا۔ اس کیلئے ہمیں ان منصوبوں اور سازشوں کے خلاف تدابیر کرنی پڑیں گی جو اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کی جا رہی ہیں۔ اے خدا تو ہمیں ہر حالت میں اور ہر معنی میں صبر کی توفیق عطا کر رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا صبر کے جو مختلف معنی مفردات راغب میں بیان کئے ہیں وہ دراصل مختلف آیات قرآنی کی تفسیر ہی ہیں اور جب ہم قرآن کریم پر غور کرتے ہیں تو ان معانی کو خود قرآن کریم میں پاتے ہیں جیسا کہ سورہ یونس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاتَّبِعۡ مَا يُوۡحٰۤى اِلَيۡكَ وَاصۡبِرۡ حَتّٰى يَحۡكُمَ اللّٰهُ ‌ۚ وَهُوَ خَيۡرُ الۡحٰكِمِيۡنَ (یونس:۱۱۰)

اس میں پہلے معنی جو شریعت کے احکام پر سختی سے کاربند رہنے کے ہیں۔ اس کی طرف اشارہ ہے کہ جو وحی تمہاری طرف کی گئی ہے۔ قرآن کریم کی شریعت نے جو احکام تمہارے سامنے رکھے ہیں ان کی اتباع کرو۔ وَاصۡبِرۡ اور پورے مجاہدہ کے ساتھ، پورے زور کے ساتھ اپنے نفسوں کو احکام شریعت کا جو دائرہ ہے اس کے اندر باندھے رکھو اور قید رکھو۔ بے قیدی کی زندگی نہ گزارو۔ یعنی اتباعِ وحی محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں صبر سے کام لو۔ یعنی پورے طور پر اپنے نفسوں پر زور دے کر شریعت کی

پابندی کرو اور شریعت کا جُوا اپنی گردن پر رکھو اور بے قید زندگی گزارنے کی کوشش نہ کرو۔ وَ اصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ اور اس میں چھٹے معنی بھی آ جاتے ہیں جو میں نے ابھی بیان کئے ہیں کہ تم صبر کے ساتھ انتظار کرو۔ ہوگا وہی جو خدا نے چاہا اور پسند کیا۔ ہوگا وہی جس کا اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے لیکن ہوگا وہ اپنے وقت پر۔ اس واسطے بے صبری نہ دکھاؤ۔ صبر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کر لے....

صبر کے ایک معنی مصائب کو خدا کی راہ میں برداشت کرنا اور ان پر گھبراہٹ ظاہر نہ کرنا ہے۔ اس کے متعلق سورۂ لقمان میں فرمایا۔ وَ اصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمان:۱۸) کہ تجھے خدا کی راہ میں جو تنگی وترشی، دکھ اور مصیبت پہنچے اس پر صبر سے کام لے اور یقیناً یہ بات ہمت والے کاموں میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں ہی کو پسند کرتا ہے جن کے اندر ایک عزم ہوتا ہے جن کے اندر یہ یقین ہوتا ہے کہ میں خدا کے لئے اپنی زندگی گزار رہا ہوں اور جو شخص خدا کے لئے اپنی زندگی کو گزارتا ہے وہ نا کام اور نامراد نہیں ہوا کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی بشارتیں اس کے حق میں پوری ہوتی ہیں اور وہی جماعت آخر کار دنیا میں کامیاب ہوتی ہے جس جماعت کے متعلق خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ ہو کہ وہ اسے کامیاب کرے گا......

میں نے کہا ہے کہ صبر کے ایک معنی یہ ہیں کہ زبان کو قابو میں رکھا جائے۔ زبان زیادہ تر اس وقت بے قابو ہوتی ہے جس وقت ایک دوسری بے قابو زبان انسان پر اندھا دھند وار کر رہی ہوتی ہے۔ طبیعت میں ایک جوش اور غصہ پیدا ہوتا ہے اور زبان سختی کے مقابلہ میں سختی کی طرف جھک جاتی ہے لیکن ہمارا خدا ہمیں کہتا ہے فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (طٰهٰ:۱۳۱) جو کچھ بھی وہ کہتے ہیں تمہیں غصہ تو آئے گا۔ تمہارے نفسوں میں جوش تو پیدا ہوگا۔ تمہاری زبان بے قابو ہونے کے لئے تڑپ رہی ہوگی مگر اس زبان پر وہ لگام ڈالے رکھو جو لگام میں نے تمہیں دی ہے۔ اسے بے قابو نہ ہونے دو.....

ان آیات میں جو میں نے بعد میں دوستوں کے سامنے رکھی ہیں اللہ تعالیٰ نے صبر کے مختلف معانی اور اس کی حکمتیں بیان کی ہیں رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا الخ دعائیہ الفاظ میں ہے ہمیں اس طرف متوجہ کرنے کیلئے اور ہمارے دل میں ایک تڑپ پیدا کرنے کیلئے کہ ہمیں صبر کے حصول کیلئے دعا کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ نحل (آیت:۱۲۸) میں فرماتا ہے: وَاصْبِرْ صبر کرو لیکن اللہ کی توفیق کے بغیر تم صبر نہیں کر سکو گے۔ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ اللہ کی مدد کے بغیر تم صبر کر نہیں سکتے اس واسطے جب

ہمارے اس حکم کی تعمیل کرنا چاہو کہ صبر سے کام لو تو تمہارے لئے ضروری ہو کہ خدا کے حضور جھکو کہ اے خدا! تو نے ہمیں (ان تمام معانی میں جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے) صبر کرنے کا حکم دیا ہے لیکن ہم کمزور بندے جانتے ہیں اور تو بھی جانتا ہے کہ اپنے طور پر صبر کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں اس لئے تو ہماری مدد کر۔ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ کے تقاضا کے مدِّ نظر اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھا دی کہ رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا الخ اے ہمارے ربّ! ہمیں کمال صبر عطا کر کیونکہ خود ہی دوسری جگہ فرمایا تھا۔

وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ اللہ کی مدد کے بغیر صبر نہیں ہوسکتا۔ صبر کے حصول کے لئے خدا تعالیٰ کی مدد کو اگر ہم اپنے الفاظ میں حاصل کرنے کی کوشش کریں تو الفاظ کے نقص کی وجہ سے شاید اس کو پا نہ سکیں۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی دعا کے ذریعہ صبر کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اور چونکہ خدا تعالیٰ کے کلام میں جو دعائیں ہوتی ہیں وہ کامل ہوتی ہیں اس لئے اس کامل دعا کے نتیجہ میں اگر ہم خلوص نیت کے ساتھ اور عاجزی اور تضرع کے ساتھ اس دعا کو کریں اس حقیقت اور ان معانی کو سمجھتے ہوئے جو اس میں بیان کئے گئے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ دعا ہمارے حق میں پوری ہو جائے گی اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے خود وہ دعا سکھا دی یہ بتانے کے بعد کہ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ صبر خدا کی مدد کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اللہ کی مدد کیسے حاصل کرنی ہے؟ خدا تعالیٰ کہتا ہے دعا میں تمہیں سکھا دیتا ہوں جو یہ ہے۔ رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا اب اس سے فائدہ اُٹھانا تمہارا کام ہے اور اللہ تعالیٰ یہاں فرماتا ہے کہ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ (النحل:۱۲۸) کہ جب خدا کی مدد اور خدا کے فضل سے اس دعا کی قبولیت کے نتیجہ میں جو صبر کے حصول کے لئے ہم نے تجھے سکھائی ہے تو صبر کی طاقت پائے تو وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ دشمن کے جو حالات ہیں وہ تجھے اس غم میں نہ ڈالیں کہ کہیں اسلام کو وہ نقصان نہ پہنچا دیں اور جو تدبیریں وہ کرتے ہیں ان کی وجہ سے تو کوئی تکلیف محسوس نہ کرے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب میری ہدایت کے مطابق تم صبر کرو گے تو میں تمہارے اس غم کو دور کرنے کے سامان پیدا کر دوں گا کہ کہیں دشمن اپنی مخالفانہ تدابیر میں کامیاب نہ ہو جائے اور تمہیں دل کے اس درد اور دل کے اس احساس سے بھی نجات دے دوں گا کہ مِمَّا يَمۡكُرُوۡنَ (النحل:۱۲۸) ان کی جو سازشیں ہیں ان سے اسلام کو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو کہیں نقصان نہ پہنچ جائے۔ نہ ان کے مکر کامیاب ہوں گے نہ ان کے منصوبے اپنی مراد کو پہنچیں گے۔ اگر تم میری ہدایت کے مطابق صبر سے کام لو گے اور اس صبر کو دعا کے

ذریعہ سے کمال طور پر حاصل کرلو گے تو پھر جو دشمن کے منصوبے اور سازشیں ہیں وہ کامیاب نہ ہوں گی۔ تمہیں جو خوف اور غم ہے وہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ یاد رکھو کہ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (البقرہ: ۱۵۴) اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے.........

دوسرے اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ صبر کرو اور صبر پر دوام کے حصول کے لئے بھی دعا کرو یعنی یہ بھی دعا کرو کہ تمہیں کمال صبر کی توفیق ملے اور یہ بھی دعا کرو کہ تمہیں صبر پر دوام کی توفیق بھی ملے۔ ہمیشہ ملتی رہے یہ نہیں کہ چند سال تو خدا کے لئے تکالیف برداشت کرلیں اور پھر دل ٹوٹ گیا اور ہمت ہار بیٹھے اور جو کچھ حاصل کیا تھا وہ بھی کھو بیٹھو اور انجام بخیر نہ ہوا۔ اس واسطے ثبات قدم کے لئے دعائیں کرتے رہا کرو اور ثبات قدم خدا کے فضل سے اس کو ملتا ہے جو صبر سے کام لیتا ہے۔

سورہ محمد میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (محمد: ۸) اے مومنو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو یقیناً تمہیں اس کی مدد حاصل ہو جائے گی اور جب اس کی مدد حاصل ہوگی تو تمہیں ثباتِ قدم بھی مل جائے گا۔ یہاں اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ کا فقرہ استعمال کیا گیا ہے اور مفرداتِ راغب ہمیں بتاتی ہے کہ جب قرآن کریم نے یہ محاورہ استعمال کیا ہو کہ انسان اگر اللہ کی مدد کرے۔ وہ اللہ جو کہ قادر مطلق اور غنی اور بے نیاز ہے اس کو اللہ کی مدد ملتی ہے تو جب یہ محاورہ استعمال کیا گیا ہو کہ جو شخص اللہ کی مدد کرے تو یہ نتیجہ نکلے گا یا وہ نتیجہ نکلے گا تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی مدد کا محتاج ہے بلکہ اس کے معنی ہوتے ہیں۔

اوّل یہ کہ اس کے بندے کی مدد کرے۔ دوسرے یہ کہ اس کے دین کی مدد کرے۔ تیسرے یہ کہ اپنی مدد کرے اللہ کی قائم کردہ حدود کی حفاظت کرنے سے اپنی مدد کرے اس عہد کی رعایت کرنے سے جو اس نے اپنے ربّ سے باندھا ہے پس اللہ کی مدد کرنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اللہ کے احکام کا جُوا اپنی گردن پر رکھ لے اور جن باتوں سے اللہ نے اسے روکا ہے ان سے وہ بچے، یہ معنی ہیں اللہ کی مدد کرنے کے اور یہی معنی جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں صبر کرنے کے ہیں۔ یعنی صبر اور نصرت ایک مفہوم کے لحاظ سے قریباً ہم معنی ہیں تو اللہ تعالیٰ اگرچہ یہاں نصرت کا لفظ استعمال کرتا ہے لیکن اس معنی میں استعمال کرتا ہے جس معنی میں صبر کے لفظ کو بھی استعمال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں

بالفاظ دیگر یہ فرمایا کہ اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ اگر تم صبر سے کام لو گے یَنۡصُرۡکُمۡ تو وہ تمہاری مدد کو آئے گا اور اُس کی مدد کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں نیکیوں پر دوام حاصل ہو جائے گا۔ تمہیں مصائب کے برداشت کرنے کی اور دکھوں اور سازشوں اور دشمن کے مکر کے برداشت کرنے کی اور زبان کو قابو میں رکھنے کی دائمی قوت عطا ہو جائے گی، ثبات قدم عطا ہوگا یعنی یہ نہیں کہ ایک سال تو نہیں طاقت ملی اور اگلے سال پھر تم جہنم میں چلے جاؤ بلکہ جب تم اللہ کی جنّت میں داخل ہو جاؤ گے تو تمہارا ثباتِ قدم تمہیں اس جنّت سے پھر نکلنے نہیں دے گا کیونکہ وقت جو بھی تقاضا کرے گا تم اس کو پورا کرنے والے ہو گے۔

آج کا دن اسلام کے غلبہ کے لئے جو تقاضا کرتا ہے ہماری جماعت کا فرض ہے کہ وہ اس کو پورا کرے اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر صبر سے کام لو گے تو تمہیں ثباتِ قدم عطا ہوگا۔ پھر تم نیکیوں پر ایک دوام پاؤ گے اور رضائے الٰہی کے حصول کے بعد تمہیں اس کی ناراضگی کبھی نہیں ملے گی۔

پھر فرمایا: وَ انۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ اسلام کا جو منکر اور مخالف ہے وہ اسلام کو کمزور کرنے کیلئے جو بھی تدبیر کرے اس کے خلاف ہماری مدد کر۔

غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں مدد تو کرتا ہوں لیکن میں مدد ان لوگوں کی کرتا ہوں جو میرے احکام کو مانتے اور میری خاطر اور میرے حضور ہر قسم کی مطلوبہ قربانیوں کو پیش کرتے ہیں اور تم اس کی توفیق بھی مجھ سے ہی پا سکتے ہو اس لئے تم دعا کرتے رہا کرو۔ رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ

پس میں آج اس دعا کے کرنے کی تحریک کر رہا ہوں۔ اس دعا کے جو وسیع معانی ہیں میں نے ان کو ایک حد تک بیان کر دیا ہے۔ ان معانی کو ذہن میں رکھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور جس حد تک ممکن ہو یہ دعا کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ دن میں کم از کم ۳۳ بار یہ دعا کیا کریں۔ اس پر زیادہ وقت نہیں لگے گا اور یہ کام زیادہ قربانی نہیں چاہتا لیکن اگر آپ ان معانی کو ذہن میں رکھ کر یہ دعا کریں تو یہ بات بڑی برکتوں کا موجب ہوگی۔ (خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۵۰۵ تا ۵۱۵)

اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ اے ہمارے ربّ ہم پر قوتِ برداشت نازل کر صبر عطا کر اور ہمیں ثباتِ قدم عطا کر اور منکر مخالف کے خلاف ہماری مدد کر۔ صبر کے معنی عربی زبان اور قرآنی محاورہ میں بڑے وسیع ہیں۔ صبر کے معنی ہیں عقلی قوانین

اور شریعت کے احکام کی روشنی میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنا یہ ہے صبر اور مختلف شکلوں میں یہ ہماری زندگی میں ابھرتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی مصیبت نازل ہو جائے تو اس پر بھی صبر کرتا ہے انسان میدانِ جنگ ہو تو مومنانہ شجاعت کے مظاہرے کو عربی زبان اور قرآنی اصطلاح صبر کہتی ہے۔ میدانِ جنگ میں اور ثبات قدم۔ اگر قضا و قدر کے امتحان و ابتلا میں مبتلا ہو کوئی شخص جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں تمہیں آزماؤں گا۔ تو ایسے امتحان کے وقت بشاشتِ قلب سے اس ابتلاء کو برداشت کرنا یہ بھی صبر ہے اور اپنی زبان کو قابو میں رکھنا یہ بھی صبر ہے۔ بے موقع اور بے محل بات سے رکے رہنا۔ زبان کو قابو میں رکھنا اس کو بھی صبر کہتے ہیں۔ یعنی ہر پہلو سے جہاں نفس کو قابو میں رکھنا ہو عقل کے قانون کے ماتحت یا شریعت کے احکام کے نتیجہ میں۔ عربی زبان اور قرآن کریم کی اصطلاح اسے صبر کہتی ہے۔

تو رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا میں یہ دعا ہوئی کہ اے خدا! ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنے نفس کو اس طرح قابو میں رکھیں کہ کبھی بھی وہ بے قابو ہو کر تیری ناراضگی مول لینے والا نہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا کرے۔ (خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۳۰۴)

آیت ۲۵۴ تِلۡكَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ‌ۘ مِنۡهُمۡ مَّنۡ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعۡضَهُمۡ دَرَجٰتٍ‌ؕ وَاٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ الۡبَيِّنٰتِ وَاَيَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ وَلٰـكِنِ اخۡتَلَفُوۡا فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ كَفَرَؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلُوۡا ۚ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ ﴿۲۵۴﴾

اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن عظیم میں نبوت اور رسالت کے متعلق بہت سی بُنیادی باتیں بتائی ہیں۔ مَیں اس وقت اُن میں سے بعض کا ذکر کروں گا۔ پہلی بات ہمیں یہ بتائی گئی ہے کہ انبیاء اور مرسلین میں بعض کو بعض پر فضیلت بخشی گئی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تِلۡكَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ اس کے علاوہ بھی انبیاء کی ایک دوسرے پر فضیلت کا ذکر آتا ہے لیکن قرآن کریم نے اس کی

تفصیل نہیں بتائی البتہ بعض باتیں بتائی ہیں اور بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض باتوں کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی مثلاً تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (جو تیسرے سپارے کی پہلی آیت ہے اِس) میں فضیلت کی ایک وجہ یہ بیان ہوئی ہے کہ بعض انبیاء صاحب شریعت ہوتے ہیں اور بعض انبیاء صاحبِ شریعت نہیں ہوتے۔ شاید بعض دوسری جگہ کوئی دوسری وجہ فضیلت بیان ہُوئی ہو لیکن اِس وقت میرے ذہن میں مستحضر نہیں لیکن قرآن کریم سے ہمیں یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ فضیلت کی بعض وجوہ کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی باوجود اِس کے کہ بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت بخشی گئی ہے پھر بھی ہمیں یہ بتایا گیا ہے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرۃ:۲۸۶) یعنی فی نفسِ رسالت رسول اور رسول میں فرق نہیں کرنا۔ اِسی قسم کی بعض دُوسری آیات میں بھی اِسی قسم کا مفہوم بیان ہوا ہے۔

پس فضیلت بھی ہے اور ان رُسُل میں فرق بھی نہیں کرنا یعنی نفسِ رسالت میں کوئی فرق نہیں ہے جو صاحب شریعت رسول ہے اور جو صاحب شریعت رسول نہیں ان دونوں رسالتوں میں نفسِ رسالت میں کوئی فرق نہیں دونوں رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنی حکمت کاملہ سے مختلف زمانوں اور مختلف ممالک میں بسنے والی قوموں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ ان میں ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسے بھی ہیں جن کو ساری دُنیا کی طرف سارے زمانوں کیلئے اور تمام بنی نوع انسان کی ہدایت کیلئے بھیجا گیا۔ بایں ہمہ نفسِ رسالت میں ان میں اور دیگر رُسُل میں کوئی فرق نہیں۔

پس فضیلت بھی ہے نفسِ رسالت میں کوئی فرق بھی نہیں ہے۔ یہ رُسُل کے بعض بنیادی حقائق ہیں جن کی تفصیل میں مَیں اِس وقت نہیں جاسکتا چنانچہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر قرآن عظیم صرف رسول کہتا تو نفسِ رسالت میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی فرق نہ رہتا یا حضرت یحییٰؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان نفسِ رسالت میں کوئی فرق نہ رہتا اگرچہ فضیلت اپنی جگہ پر ہوتی لیکن اتنی نمایاں فضیلت کہ جو تمام انبیاء سے آپ کو ممتاز کردے اس کی ہمیں سمجھ نہ آتی۔ اس لئے قرآن کریم نے جہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول کہہ کر رسالت کے مقام پر تمام رُسُل اور انبیاء کے برابر کھڑا کردیا وہاں آپ کو ایک اور اعلیٰ مقام عطا فرمایا جس کا ذکر سورۂ احزاب کی آیت ۴۱ میں موجود ہے۔ اِس لحاظ سے آپ رسول بھی ہیں

اور خاتم الانبیاء بھی ہیں۔خاتم الانبیاء یا ختم المرسلین ختم نبوّت یا ختم رسالت کا جو مقام ہے اسے اسلامی اصطلاح میں مقام محمدیت کہتے ہیں اور اس میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منفرد ہیں۔یہ وہ فضیلت نہیں جس کا فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ میں ذکر ہے۔نسبتی فضیلت میں بھی نسبتی لحاظ سے اوّل اور آخر ہوتا ہے۔اگر نفسِ رسالت میں کوئی فرق نہ ہو اور چشم تصور میں تمام انبیاء ایک میدان میں کھڑے ہوں تو مشرق کی طرف سے دیکھیں گے تو شمال والا آخری ہوگا۔جنوب کی طرف سے دیکھیں گے تو جو نبی غربی کونے میں ہے وہ آخری نبی ہوگا۔پس ایک تو یہ نسبتی طور پر آخری ہے۔اس میں کسی فضیلت کا ذکر نہیں بلکہ یہ ایک نسبتی چیز ہے جس زاویہ سے آپ دیکھیں گے مقابلہ کی انتہا آخری بن جاتی ہے۔

پس فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ایک بنیادی حقیقت ہے اور لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ بھی اپنی جگہ ایک بنیادی حقیقت ہے دراصل حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پیدا کرنے والے ربّ کے حضور جو منفرد مقام حاصل تھا اس کے اظہار کے لئے آپ کو خاتم النبیّین کہا گیا ہے خاتم النبیّین یعنی مقام محمدیت قُرب اتم کا مقام ہے۔بالفاظ دیگر آپ صفات باری کے مظہر اتم تھے۔یہ شرف صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا ہے دوسرا کوئی نبی اس مقام تک پہنچ نہیں سکا۔کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ رسالت میں ایک لاکھ بیس ہزار رسول شامل ہیں۔ان میں ہم نے کوئی فرق نہیں کرنا لیکن مقام محمدیت کے لحاظ سے آپ کو جو منفرد مقام حاصل ہے وہ صفات باری کے مظہر اتم ہونے کا مقام ہے اس مقام کو انسانوں کے مقابل میں انسان کامل کہتے ہیں اور قرب کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے قریب تر دوسرا کوئی شخص خدا کے پیار کے حصول میں آپ سے زیادہ اور قریب تر ہوا نہ ہوسکتا ہے غرض اس مقام محمدیت کو بیان کرنے کے لئے مختلف اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔

پس سورۂ احزاب کی آیت ۴۱ میں ایک تو یہ فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے رسولوں کی طرح ایک رسول ہیں اور اس جہت سے رسول رسول میں فرق کرنے کی اجازت نہیں دی گئی اور دوسرے آپ خاتم النبیّین ہیں اس جہت سے آپ بے مثل و مانند ہیں اور کوئی رسول آپ کے ہم پلہ نہیں۔اس حیثیت میں کسی کو آپ کے ساتھ منسلک کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔اس مقامِ محمدیت کے لحاظ سے آپ تمام رسولوں میں منفرد و ممتاز ہیں۔

پھر سورہ احزاب کی اس آیہ کریمہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (الاحزاب:۴۱) کہ ہر چیز کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس بیان کا ایک گہرا اور ضروری تعلق حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ختمِ نبوت یعنی مقام محمدیت کے ساتھ ہے ورنہ بظاہر یہ کہہ کر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جسمانی طور پر کسی مرد کے باپ نہیں لیکن (۱) اللہ کے رسول ہیں اور (۲) خاتم النبیّین ہیں اور پھر یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کو ہر ایک چیز کا علم ہے اس میں کوئی حکمت ہونی چاہیے۔ اس میں کوئی فلسفہ ہونا چاہیے؟ اس میں کسی گہرے اور عمیق مضمون کا بیان ہونا چاہیے؟ چنانچہ میرے نزدیک علاوہ اور معانی کے ایک معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیۂ کریمہ میں فرمایا کہ خاتم النبیّین کے خود معنے نہ کرنا ختم نبوت کے معنے تمہارا پیدا کرنے والا ربّ تمہیں بتائے گا۔ اگر خود معنے کرو گے تو غلطی کھاؤ گے اسلئے خود قرآن کریم نے اس کے معنی کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ جس کے ایک معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش ربّ کریم تک رفعت روحانی بخشی۔ قرآن کریم کی ہر آیت اور ہر فقرے اور فقرے کے ہر لفظ کے بہت سے بطون ہوتے ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس کے ایک معنے یہ کئے ہیں کہ ایک وہ رسول جو ارفع ہے اپنے درجات کے لحاظ سے اور منفرد ہے رفعت روحانی میں۔ کوئی رسول اس مقام میں آپ کا شریک نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم:۵) کہ تخلّق باخلاق اللہ کے مقام میں کوئی دوسرا انسان تو کیا کوئی دوسرا نبی بھی آپ کا مقابلہ نہیں کرسکتا بلکہ کوئی انسان آپ کے بلند مقام کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ آپ کا مقامِ محمدیت ہے جس میں آپ تمام رسولوں میں افضل ہیں۔ قرآن کریم نے بیان فرمایا کہ آپ کا کلام خدا کا کلام اور آپ کا ظہور خدا کا ظہور اور آپ کا آنا خدا کا آنا ہے (پہلے آسمانی نوشتوں نے بھی اسی رنگ میں اس مفہوم کو بیان کیا ہے) فرمایا جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ (بنی اسراءیل:۸۲) اس آیۂ کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حق کے لفظ سے اللہ تعالیٰ قرآن عظیم کی آخری اور کامل شریعت اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہر سہ مراد ہیں۔ ان پر حق کا لفظ حقیقی طور پر چسپاں ہوسکتا ہے۔

قرآن کریم نے مقام محمدیت یعنی مذکورہ منفرد مقام کو مختلف طریقوں اور مختلف زاویوں سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ ہم عاجز بندوں کو تصویری زبان میں مقامِ محمدیت کی حقیقت کے سمجھانے کے لئے

اللہ تعالیٰ نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج سے نوازا۔ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ محمدیت مقام خاتم النبیین اور اس نسبت سے دوسرے انبیاء کے ساتھ آپ کا تعلق بڑی وضاحت سے ظاہر ہوجاتا ہے۔ اس کو حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنے تفسیر صغیر کے نوٹوں میں بھی بیان فرمایا ہے اور وہ یہ کہ ''معراج'' میں مقامِ محمدیت کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور اس کی امت مسلمہ کے سامنے یہ تصویر رکھی گئی کہ اہل زمین جو نبی نہیں عوام ہیں (اور امت محمدیہ کے فرد ہوں یا دیگر تمام بنی نوع انسان ہوں ان کو ہم کہیں گے وہ اہل زمین ہیں یعنی زمین میں بسنے والے انسان ہیں) اور جنہیں روحانی رفعت کا وہ مقام حاصل نہیں جسے ہم رسالت کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ آپ نے گویا اہل زمین کو فرمایا کہ اپنے زمینی مقام سے اوپر نگاہ کرو تمہیں پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام نظر آئیں گے تمہیں دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام نظر آئیں گے (واضح رہے کہ ہر آسمان پر ایک ایک یا دو دو کا گروہ علامت کے طور پر ہے یعنی وہ سارا گروہ جو حضرت آدم علیہ السلام کا مقام رکھتا ہے اُن کے لئے پہلا آسمان ہے جن کی روحانی رفعت حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے ساتھ نسبت رکھتی ہے اُن کے لئے دوسرا آسمان ہے۔ وعلیٰ ھذا القیاس) تمہیں تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام نظر آئیں گے۔ چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام نظر آئیں گے۔ پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام نظر آئیں گے۔ چھٹے آسمان پر صاحبِ شریعت حضرت موسیٰ علیہ السلام نظر آئیں گے۔ ساتویں آسمان پر غیر شرعی نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام نظر آئیں گے اور اس سے بھی اوپر یعنی عرش ربّ کریم پر حضرت محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ گویا حقیقت معراج میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام عرشِ ربّ کریم ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا جو تمام صفات کاملہ حسنہ سے متصف ہے اُس نے اپنے نہایت ہی پیار کے ساتھ مظہر اتم الوہیت بنا کر اپنی دائیں طرف آپ کو بٹھایا۔ یہ ہے مقامِ ختمِ نبوت جو حقیقت معراج میں تصویری زبان میں بتایا گیا ہے۔ جسے ایک عام انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام، دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام، تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام، چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام، پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام، چھٹے آسمان پر

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں گے اور اس کے بھی اوپر مقامِ محمدیت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدائے ذوالعرش کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے ہیں، یہ شرف آپ کے مقام کے لحاظ سے اور اس محبت کی وجہ سے ہے جو آپ کو اپنے خدا سے تھی اور اس پیار کی وجہ سے جس سے آپ کو نوازا گیا تھا۔ یہ ہے وہ مقامِ ختم نبوت جو خدا تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا۔

اب اہل زمین جب اس تصویر میں زمین سے آسمانوں کی طرف دیکھیں گے تو جیسا کہ میں نے بتایا ہے ایک ایک نبی (اور ایک آسمان پر دو نبیوں) کا ذکر آیا ہے وہ محض نبیوں کے گروہ کی علامت کے طور پر ہے کیونکہ اگر واقع میں ایک لاکھ بیس ہزار پیغمبر دنیا کی طرف آئے تو پھر تو پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ بہت سے اور انبیاء بھی ہوں گے۔ اسی طرح دوسرے حتیٰ کہ ساتویں آسمان پر بھی بہت سارے انبیاء ہوں گے۔ تاہم ساتویں آسمان تک پہنچ کر یہ سارے انبیاء ختم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد صرف ایک وجود ہوگا۔ وہ اپنے ربّ سے اتنا پیوست اور ایک جان ہوگا کہ اس کا آنا خدا کا آنا اور اس کا کلام کرنا خدا کا کلام کرنا اور اس کی حرکات خدا کی حرکات متصور ہوں گی۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس مضمون کو بھی بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا جنگ بدر کے موقع پر کنکریوں کی جو مٹھی پھینکی گئی تھی وہ دعاؤں کے نتیجہ میں نہیں بلکہ آپ کے اس قرب الٰہی کے نتیجہ میں تھی اور آپ کے صفات باری کے مظہر اتم ہونے کی وجہ سے تھی۔ یہ آپ کے بلند مقام کا کرشمہ تھا کہ وہ کفار کی آنکھوں میں پڑی اور اُن کی تباہی کا باعث بن گئی سرداران مکّہ میدان جنگ میں اپنی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے یہ ایک مستقل اور لمبا مضمون ہے۔ اس وقت اس کے بیان کا موقع نہیں۔

میں بتا یہ رہا ہوں کہ یہ مقام یعنی عرش ربّ کریم پر مقامِ محمدیت یا مقام ختم المرسلین یا مقامِ خاتم النبیین اس تصویر میں اور حقیقتاً بھی اتنا اعلیٰ اور ارفع مقام ہے کہ وہاں تک کوئی اور انسان پہنچ ہی نہیں سکتا۔ یہی وہ مقام اور صاحبِ مقام ہے جس کی خاطر اس ساری کائنات کو پیدا کیا گیا ہے۔ حدیث قدسی لَوْ لَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ (موضوعات کبیر صفحہ ۵۹) اسی حقیقت کی مظہر ہے اور اسی لئے یہ وہ مقام ہے جو حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت بھی ملا ہوا تھا جب آدم ابھی معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بھی خاتم النبیین تھے جب کہ آدم کا وجود مٹی میں کروٹیں لے رہا تھا۔ یہی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ہے۔ یہی تو آپ کا آخری مقام ہے۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ

اَحَدٍ مِّنْ رُسُلِهٖ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولوں میں سے ایک رسول کہا گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جو سورۂ احزاب کی آیۂ کریمہ میں وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ کے الفاظ میں بیان ہوا ہے جس کے بعد آپ کو خاتم النبیین قرار دیا گیا ہے یعنی آپ رسول ہیں مگر ایسے رسول کہ آپ خاتم النبیّین بھی ہیں اور اس لحاظ سے آپ تمام رسولوں سے منفرد ہیں۔ غرض ایک طرف فرمایا رسول رسول میں فرق نہیں کیا جا سکتا باوجود فضیلت کے فرق نہیں کیا جا سکتا۔ آخر فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کی آیت کو لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ کی آیت یا آیت کے ٹکڑے نے منسوخ تو نہیں کر دیا کیونکہ قرآن کریم کی کوئی آیت کوئی فقرہ کوئی لفظ کوئی شعشہ کوئی زیر اور کوئی زبر منسوخ نہیں ہوتی اور نہ کبھی ہوئی ہے۔

پس فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اپنی جگہ پر صحیح اور لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ اپنی جگہ پر درست ہے۔ لفظ رسالت میں کوئی فرق نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسول بھی ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رسالت کے اعتبار سے آپ میں اور آدم میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا لیکن آپ محض ایک رسول ہی نہیں بلکہ آپ خاتم النبیین بھی ہیں۔ خاتم النبیین کے ارفع مقام کے لحاظ سے کسی اور نبی کو یہ جُرأت نہ ہو سکتی کہ وہ اس ارفع واعلیٰ مقام کا دعویدار بنے۔ اس میں آپ منفرد ہیں۔ آپ کا مقام خدائے ذوالجلال کے داہنی جانب عرش ربّ کریم پر ہے۔ جسے ہم مقامِ محمدیت کہتے ہیں۔ اس معنی میں حقیقتاً آپ ایک عظیم الشان آخری نبی ہیں اور ہم علیٰ وجہ البصیرت آپ کے آخری نبی ہونے پر ایمان لاتے ہیں وہ آخری مقام جو آپ کو معراج میں دکھایا گیا اور آپ نے اس کی جو تصویر کھینچی ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور آپ کو آخری نبی مانتے ہیں۔ ہم تو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ قرآن کریم یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قسم کے عظیم رؤیا اور کشوف اور عظیم روحانی تجربات سے انکار کریں۔ اس معنی میں آپ تمام انبیاء پر فضیلت رکھتے ہیں کیونکہ آپ خاتم الانبیاء ہیں اور یہی معنی آپ پر چسپاں ہوتے ہیں۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ اپنی جگہ درست۔ مگر مقامِ محمدیت مقامِ ختم نبوت جس کا سورۂ احزاب میں ذکر ہے۔ اس مقامِ محمدیت میں منفرد ہونے کے لحاظ سے آپ آخری نبی ہیں اور خاتم النبیین اور خاتم المرسلین ہیں۔

(خطباتِ ناصر جلد پنجم صفحہ ۷۹ تا ۸۶)

آیت۲۵۶ اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۬ۚ لَا تَاۡخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّ لَا نَوۡمٌ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ ۚ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرۡسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ ۚ وَ لَا یَـُٔوۡدُہٗ حِفۡظُہُمَا ۚ وَ ہُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ﴿۲۵۶﴾

ہاں میں یہ بتادوں کہ قرآن کریم کا ہی ذکر ہے اس آیت میں جس میں ہے۔ وَ قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا (طٰہٰ:۱۱۵) یہ دعا ہمیں سکھائی گئی ہے قرآن کریم نے کہ اے ہمارے رب! ہمیں علم میں بڑھاتا چلا جا۔ اس سے بھی پتہ لگتا ہے کہ قرآن عظیم غیر محدود علوم کا خزانہ ہے کیونکہ اگر وہ محدود ہوں تو اس وقت جب وہ پہلی ساری باتیں ختم ہوگئیں اس کے بعد اس دعا کا کوئی فائدہ نہیں لیکن قیامت تک آنے والے انسان کو یہ دعا سکھائی قرآن کریم نے کہ یہ دعا کرتے رہو کہ اے خدا! ہمیں قرآنی علوم میں بڑھاتا ہی چلا جا۔ قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا۔

اور یہ بھی ہمیں بتایا اللہ تعالیٰ نے کہ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ (یہ سورۃ بقرہ کی ۲۵۶ ویں آیت کا ایک ٹکڑا ہے) اس سے پہلے اس آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ جو کچھ انسان کے سامنے ہے اور جو کچھ انسان کے پیچھے ہے یعنی جو کچھ اس کے علم میں ہے اور جو کچھ وہ اپنے عدم علم کی وجہ سے جانتا نہیں، جاہل ہے اُس سے، وہ سب کچھ ہی اللہ تعالیٰ جانتا ہے یعنی جو کچھ بھی ہے خواہ وہ انسان جانتا ہو یا نہ جانتا ہو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ اللہ تعالیٰ کائنات کو پیدا کرنے والا، کائنات کی کنہ کو جاننے والا ہے اور اس کی مرضی کے سوا اس کے علم کے کسی حصہ کو بھی کوئی شخص پا نہیں سکتا۔ تو ہر علم میں جو زیادتی ہوتی ہے وہ خدا تعالیٰ کی منشا اور مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ ایک دہریہ سائنس دان جب کوئی Problem حل کر رہا ہو یا اپنا کوئی فارمولا بنا رہا ہو اور اس کو سمجھ نہ آ رہی ہو، دماغ میں اندھیرا ہو اور ایک تڑپ اس کے اندر پیدا ہوتی ہے کہ کہیں سے مجھے روشنی ملے، تو وہ تڑپ ایک غافل کی دعا کی مانند ہے اور اللہ تعالیٰ ایسا ہی سمجھتا اور اس کے دماغ میں روشنی پیدا کر دیتا

ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُس جگہ کسی آیت کا حوالہ نہیں دیا۔ابھی مَیں نے جو کہا تھا نا کہ کسی آیت کا حوالہ آپ دیں کہ وہ ہے کسی نہ کسی آیت کی تفسیر۔ پہلے میرے دماغ میں یہ بات نہیں تھی تب آپ سے باتیں کرتے ہوئے یہ آیت آ گئی سامنے، وہی مثال اس کی کہ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ۔اسی کی تفسیر کرتے ہوئے آپ نے وہ لکھا ہے کہ کوئی دہریہ، کوئی کمیونسٹ، کوئی بت پرست، کوئی بدمذہب علم کے میدان میں ترقی کرتے ہوئے جب ترقی کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کی منشا کے مطابق ترقی کرتا ہے اس کی منشا کے بغیر ترقی نہیں کرتا اور انسان اللہ تعالیٰ کی مرضی کے سوا اُس کے علم کے کسی حصہ کو بھی پا نہیں سکتا۔اور اس سے اگلا ٹکڑا آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم آسمانوں پر بھی اور زمین پر بھی حاوی ہے۔کائنات کا اس کے علم نے احاطہ کیا ہوا ہے وہ اس کا پیدا کرنے والا ہے اس کے اندر جو کچھ بھی خواص پائے جاتے ہیں، جو کچھ خواص میں کمی ہوتی ہے، جو بڑھوتی ہوتی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اس کے امر سے یا اس کے خلق سے وہ چیز ہو رہی ہے۔وہ اس سے پوشیدہ اور چھپی ہوئی نہیں۔وہ انسانوں کی طرح نہیں کہ آج یاد کر لیا یا سن لیا اور کل کو بھول گیا خدا نہ کرے آپ میں سے بعض بھول ہی جائیں کہ میں آپ کو کیا نصیحت یہاں کر کے گیا ہوں کہ قرآن کریم کا علم حاصل کرتے رہنا ہے اسے بھولنا نہیں۔

(خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۵٦۸ تا ۵۷۰)

پس جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ مخلوق کے ساتھ شدید تعلق رکھنے کے باوجود یعنی ہر ایک جان کی جان، ہر ہستی کا سہارا اور ہر ہستی کو قائم رکھنے کے باوجود وہ الگ ہے۔وہ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ہے۔ اَلۡحَیُّ کے معنے نیست سے ہست کرنے اور الۡقَیُّوۡمُ کے معنی اس کو قائم رکھنے والی ہستی کے ہوتے ہیں۔وہ اَلۡحَیُّ ہے انسان کو زندگی دیتا ہے۔وہ الۡقَیُّوۡمُ ہے اس کی زندگی کو قائم رکھتا ہے اور اس میں ایک پہلو تو اللہ کی ذات سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا اس کی مخلوق سے۔الۡقَیُّوۡمُ کی رو سے وہ سہارا بنتا ہے ہر ایک چیز کا، تب وہ قائم رہتی ہے لیکن اس تعلق کے باوجود وہ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ (الشوریٰ:۱۲) بھی ہے اور اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ (الاعراف:۵۵) بھی ہے۔وہ سب سے برتر اور تمام مخلوق سے وراء الوراء بھی ہے اور تقدس کے مقام پر جلوہ گر ہے اور اس طرح الگ کا الگ بھی رہا، وہ انسان کے ساتھ مل بھی گیا۔اس نے انسان کے ساتھ تعلق بھی قائم کیا۔انسان نے اس کے پیار کی باتیں بھی سنیں۔انسان نے اس کی

قدرت کے زبردست ہاتھ کے کرشمے بھی دیکھے۔ گویا وہ دور ہونے کے باوجود انسان کے قریب بھی آ گیا۔ انسان کیا ہے؟ خدا کی ایک عاجز مخلوق ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے عاجز بندے سے شدید تعلق بھی قائم کر لیا۔ وہ اپنے بندے کی جان کی جان بھی بن گیا اور اس کی ہستی کا سہارا بھی بن گیا۔ اس کے باوجود وہ الگ کا الگ بھی رہا اور مخلوق کے ساتھ مخلوط نہیں ہوا اور اس کائنات میں سب کچھ پیدا کر کے پھر بھی وہ مخلوق کا عین نہیں بلکہ وہ اپنی ذات میں اکیلا اور حقیقی تقدس اور توحید کے مقام پر جلوہ افروز ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد ہفتم صفحہ ۲۱۰ تا ۲۱۱)

آیت ۲۵۷ تا ۲۵۸ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر جائز نہیں کیونکہ ہدایت اور گمراہی کا باہمی فرق خوب ظاہر ہو چکا ہے۔ پس سمجھ لو کہ جو شخص اپنی مرضی سے نیکی سے روکنے والے کی بات ماننے سے انکار کرے اور اللہ پر ایمان رکھے تو اس نے ایک نہایت مضبوط قابلِ اعتماد چیز کو جو کبھی ٹوٹنے کی نہیں مضبوطی سے پکڑ لیا اور اللہ بہت سننے والا اور بہت جاننے والا ہے۔ اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے دوست نیکی سے روکنے والے ہیں وہ انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ لوگ آگ میں پڑنے والے ہیں وہ اس میں رہیں گے۔ پھر فرمایا۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین میں کوئی جبر نہیں۔ دین کے معنی لغت عربی نے یہ کئے ہیں اَلطَّاعَةُ وَالْجَزَاءُ اطاعت کرنا یا اعمال پر جزا کا دیا جانا۔ وَاسْتَعِيْرُ لِلشَّرِيْعَةِ اور استعارۃً اسے شریعت اور مذہب کے لئے بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اطاعت کے معنی کو اس آیت میں ظاہر کیا ہے وَ اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ کہ انہوں نے اپنی اطاعت خدا

کے لئے جوانہوں نے اطاعت کی، خدا کے حکم کو مانا اس میں انہوں نے اخلاص کا ثبوت دیا۔ مخلص ہوکر اطاعت کی اور مفردات راغب میں ہے کہ اس کے معنے جو الطَّاعَةُ اطاعت کے ہیں۔ فَاِنَّ ذٰلِكَ لَا يَكُوْنُ فِي الْحَقِيْقَةِ اِلَّا بِالْاِخْلَاصِ کہ حقیقی اطاعت اخلاص کے بغیر ممکن نہیں اور اخلاص جو ہے وہ جبر کے نتیجہ میں پیدا نہیں ہوتا۔ وَالْاِخْلَاصُ لَا يَتَأَتّٰى فِيْهِ الْاِكْرَاهُ جبر کے نتیجہ میں اخلاص نہیں پیدا ہوتا اور نہ ہوسکتا ہے اور اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے حقیقی اطاعت نہیں ہوتی اور حقیقی اطاعت نہ ہونے کی وجہ سے کوئی جزا سزا کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

دین کے معنی اطاعت اور جزا یا شریعت کے ہیں لیکن یہاں دین کا لفظ نہیں بلکہ اَلدِّيْنُ کا لفظ ہے یعنی وہ اطاعت جس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد شریعتِ اسلامیہ میں کرتا ہے۔ وہ اطاعت جو اللہ تعالیٰ کی محبت سے اس کے عرفان سے اس کی معرفت حاصل کرنے کے بعد دلوں میں پھوٹتی اور جوارح سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ وہ اطاعت ہے جس کا مطالبہ اسلام کرتا ہے اور یہ وہ اطاعت ہے جس پر اللہ تعالیٰ وہ انعامات عطا فرماتا ہے جس پر ان جنتوں کا خدا تعالیٰ نے وعدہ دیا گیا ہے، جس کی بشارتیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہیں اور اگر اس کے معنی شریعت کے ہوں تو اَلدِّيْنُ کے معنے ہوں گے کامل شریعت جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے نوعِ انسانی کے ہاتھ میں دیا گیا۔

یہاں یہ بات بڑی وضاحت سے بیان کر دی گئی ہے کہ اطاعتِ حقیقی کا امکان ہی نہیں جبر کے ذریعہ سے۔ کیونکہ اس کی بنیاد اخلاص پر، اس کی بنیاد خدا تعالیٰ کے پیار پر، اس کی بنیاد خدا تعالیٰ کی معرفت کے حصول پر، اس کی بنیاد حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی بن کر خدا تعالیٰ کی محبت کے حصول پر ہے اور جبر کے ساتھ اگر کسی سے ایمان کا اعلان کروایا جائے یا جبر کے ساتھ اگر کسی سے نیکیاں کروائی جائیں یا جبر کے ساتھ کوئی شخص یہ کہے کہ میرا دل بھی تصدیق کرتا ہے کہ اسلام ایک صداقت اور بنی نوع انسان کے شرف کے لئے آیا ہے تو اس کے نتیجہ میں وہ جو علام الغیوب ہے وہ ہستی تو کوئی جزا اس کے اوپر نہیں اس کو دے سکتی۔ تو اس اطاعت و جزا کو میں نے ایک مفہوم میں بریکٹ کر دیا ہے کہ اطاعت کے ساتھ جزا کا تعلق ہے خالص اطاعت موعودہ جزا کی بشارت دیتی ہے یعنی جو مقبول اعمال ہیں اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنی رضا کی جنتوں میں داخل کرتا، ان سے پیار

کرتا، ان کا دوست بن جاتا ہے، ان کو جیسا کہ اگلی آیت میں ہے اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے۔ ان راہوں کو منور کرتا ہے جو انہیں خدا تعالیٰ کے پیار کی طرف لے جانے والی ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے قرب کی راہیں ہیں وہ ان پر کھولی جاتی ہیں، ان پر چلنے کی انہیں توفیق عطا کی جاتی ہے۔ یہ چیزیں جبر سے نہیں ہوتیں اور نہ اس قسم کی کوئی جزا یا ثواب مل سکتا ہے جو جبراً کروائے جائیں۔

یہاں خدا تعالیٰ نے ایک دلیل بڑی واضح کر کے دے دی قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ضلالت اور گمراہی کا فرق کھول کر بیان کر دیا۔ ہر شخص جو اپنی فطرتی قوتوں کی صحیح نشوونما کرنے والا ہے اگر اسے صحیح غور وفکر کی توفیق ملے تو وہ اس نتیجہ پہ پہنچے گا بغیر کسی جبر کے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین اس کی بھلائی اور خیر کے لئے ہے لیکن جو شخص ہوائے نفس کے بندھنوں میں خود کو باندھ لے اور شیطان کا غلام ہو جائے تو ظاہری اور مادی سختیاں اور جبر وتشدد جو ہے وہ شیطان کی رسیاں ہیں جو انسان کے لئے تیار کی ہیں، گمراہ کرنے کے لئے انسان کو، ان کو تو نہیں کاٹا کرتیں۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے جو اکراہ کے معنی ہیں کہ دوسرے کو مجبور کرنا حالانکہ وہ کراہت محسوس کرتے ہیں دین اسلام سے لیکن مجبور کرنا کہ اس کے برعکس تم اپنی محبت کا اعلان کرو اس پر بعض اور آیات قرآنی بھی روشنی ڈالتی ہیں سورۃ نحل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (النحل:۱۰۷) جو لوگ بھی اپنے ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا انکار کریں سوائے ان کے جنہیں کفر پر مجبور کیا گیا ہو لیکن ان کے دل ایمان پر مطمئن ہوں وہ گرفت میں نہ آئیں گے (جن کا دل مطمئن ہے) ہاں وہ جنہوں نے اپنا سینہ کفر کیلئے کھول دیا ہو ان پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا غضب نازل ہوگا اور ان کے لئے بڑا بھاری عذاب مقدر ہے اور پھر فرماتا ہے اس کے بعد اور ایسا اس سبب سے ہوگا، اگلی آیت میں ہے کہ انہوں نے اس ورلی زندگی سے محبت کر کے اسے آخرت پر مقدم کر لیا اور نیز اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کفر اختیار کرنے والے لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا تو ایک شخص کفر کی راہوں کو اختیار کرتا ہے۔ ایک شخص دنیا سے اندھی محبت رکھتا ہے اور دنیا کو اپنے پیارے ربّ کے لئے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ایک شخص مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْكُفْرِ ہے اور شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا اس کا اس کے اوپر اطلاق ہوتا ہے اس کے متعلق

خدا یہ اعلان کرتا ہے کہ عَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ خدا کا غضب ایسے لوگوں کے اوپر نازل ہوتا ہے اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے عذابِ عظیم مقدر کیا یعنی جو شخص اپنی مرضی سے دنیا سے پیار کرنے والا کفر کی راہوں کو اختیار کرنے والا اور کفر پر شرحِ صدر رکھنے والا ہے یہ تصویر کھینچ دی نا اس آیت نے اب اگر کوئی شخص جبراً اس کے منہ سے یہ کہلوائے کہ میں ایمان لایا یا اگر کوئی جبراً اس شخص سے نماز پڑھوائے تو وہ تو اسے یہ کہے گا جبر کرنے والا کہ خدا تجھے جنّت میں لے کر جائے گا لیکن خدا کی وحی اور خدا کا کلام اسے یہ سنا رہا ہوگا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ کہ یہ جو کہتے ہیں کرتے رہیں لیکن میرا فیصلہ یہ ہے کہ تیرے اوپر میرا غضب نازل ہوگا اور تیرے لئے میں نے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔ اس سے ہمیں پتا لگتا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے اور قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ کے معنی کیا ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے کہ جب دل میں ایمان نہیں تو جبر جو صرف ظاہر پر کیا جاسکتا ہے وہ بے نتیجہ ہے اور کسی کا یہ خیال کرنا کہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ اسلام کے حق میں یا اس شخص کے لئے جس پر جبر کیا گیا ہے نکل آئے گا قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق نہیں ہے۔

ایک اور جگہ سورۂ مومنون میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ آیت تو میں نے ایک لی ہے جو میں اب پڑھوں گا لیکن اس کے علاوہ کچھ آیتیں آئی ہیں ان کا میں ترجمہ صرف سناؤں گا آپ کو تا کہ مضمون آپ کے ذہن میں آجائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ (المؤمنون: ۷۱، ۷۲) کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو جنون ہے (مگر ایسی بات نہیں) بلکہ وہ ان کے پاس حق لے کر آیا ہے اور ان میں سے اکثر لوگ حق کو ناپسند کرتے ہیں۔ اگر حق ان کی خواہشات کی اتباع کرتا تو آسمان اور زمین اور جو ان کے اندر بستے ہیں تباہ ہو جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ان کے پاس ان کی عزت کا سامان لے کر آئے ہیں اور وہ اپنی عزت کے سامان سے اعراض کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مجرم یقیناً جہنم کے عذاب میں مدتوں مبتلا رہیں گے۔ ان کے عذاب میں وقفہ نہیں ڈالا جائے گا اور وہ اس میں مایوس ہو جائیں گے اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے اور وہ پکاریں گے کہ اے مالک (جو دوزخ کے داروغہ کا نام ہے) تیرے ربّ کو چاہیے کہ ہمیں موت دے دے۔ (آگے سے مالک ان کو جواب دے گا اور) کہے گا تم دیر تک اس میں رہو گے۔ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ (الزخرف: ۷۹)

اور خدا ان سے کہتا ہے ہم تمہارے پاس حق لے کر آئے تھے لیکن تم میں سے اکثر حق سے نفرت اور کراہت کرتے تھے۔ وہ شخص جو دل سے یہ نفرت اور کراہت کرنے والا ہے حق سے، زبان سے کچھ کہلوا لینا اس سے نہ اس کی بہتری کے لئے ہے نہ اسلام کی بہتری کے لئے ہے۔

یہ دو آیات میں نے اس لئے آپ کے سامنے رکھی ہیں کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ میں ایک کراہت کو دور کرنے کا جبراً ذکر کیا ہے تو اور دونوں جگہ ایک جگہ وَ اَكْثَرُكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ اور دوسری جگہ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا یعنی حق سے کراہت کرنے والے اور کفر کے لئے شرح صدر رکھنے والے اور مطمئن، ان کے دل مطمئن ہیں کفر پر اور شرحِ صدر ہے ان کا کفر پر اور حق سے وہ کراہت رکھنے والے ہیں۔ یہ ہے ان کی کیفیت ان آیات میں بتائی گئی۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین کے معاملہ میں ایسے لوگوں کو جبراً تم مسلمان نہیں بنا سکتے جبراً تم نیکیاں نہیں کروا سکتے کیونکہ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ دلائل کے ساتھ اور بینات کے ساتھ حقیقت کو واضح کر دیا گیا اور کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ سورۂ یونس میں فرماتا ہے:-

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا (یونس:۱۰۰) اگر جبر کرنا ہوتا اگر جبر کو جائز رکھنا ہوتا تو انسان پر کیوں چھوڑا جاتا جبر، خدا تعالیٰ خود جبر کرتا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس:۱۰۰) اور اگر اللہ تعالیٰ ہدایت کے معاملہ میں اپنی ہی مشیت کو نافذ کرتا تو جس قدر لوگ زمین پر موجود ہیں وہ سب کے سب ایمان لے آتے۔ پس جب خدا تعالیٰ مجبور نہیں کرتا تو کیا تُو لوگوں کو (محمد صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں) مجبور کرے گا وہ مومن بن جائیں یعنی جن کے دلوں میں حق سے اتنی کراہت جو کفر کے لئے اس قدر شرحِ صدر رکھتے ہیں وہ زبردستی تو ان کے دل نہیں بدلے جاسکتے نہ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا کی جو کیفیت ہے وہ دور کی جاسکتی ہے۔ نہ یہ جبراً اکراہ سے کراہت دور نہیں کی جاسکتی۔ اس کو دور کرنے کے لئے بینات اور دلائل ہیں جو خدا تعالیٰ نے بڑی کثرت کے ساتھ اسلام کے حق میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے۔ دلائل قرآنی جو ہیں وہ اتنی وسعت ہے ان میں کہ قیامت تک خدا تعالیٰ کے اس کلام سے ایک کے بعد دوسرا، ایک کے بعد دوسرا، روشن ستارہ نکلتا چلا آتا ہے انسان کی ہدایت کے لئے۔ اور علوم کے میدانوں میں، عقلی علوم کے میدانوں میں روحانی علوم کے میدانوں میں ایک روشنی جو ہے وہ پیدا ہوتی چلی جارہی ہے اور قرآن

کریم کی ہر نئی تفسیر جو ہر نئے زمانہ کی ضروریات کو پورا کرنے والی ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو ثابت کرنے والی اور آیت کی شان کو قائم رکھنے والی ہے اور خدا تعالیٰ کی فعلی شہادت اور آسمانی نشانات جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دنیا پر ظاہر ہوئے اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک ممتد ہے اور خدا تعالیٰ کے نیک بندے اُمتِ محمدیہ میں ایک ایک وقت میں بعض دفعہ لاکھوں کی تعداد میں مختلف خطوں میں پیدا ہوئے جنہوں نے خدا تعالیٰ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل آپ کی قوتِ قدسیہ کے نتیجہ میں اور آپ کی صداقت اور شان کو ظاہر کرنے کے لئے معجزات دکھائے انسان کو۔ اور یہ سلسلہ جو ہے وہ میں نے جیسا کہ بتایا قیامت تک ممتد ہے لیکن اس قدر دلائل سننے کے بعد اس قدر نشانات دیکھنے کے بعد بھی جس کا دل حق سے کراہت رکھتا اور جس کا سینہ بشاشت سے کفر کو قبول کرتا ہے اس پر جبر کر کے تو نہیں منوایا جا سکتا۔

پھر جیسا کہ میں نے بتایا یہاں یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ جو نیکی ہے اس کا بدلہ تو خدا تعالیٰ نے دینا ہے اگر میں یا آپ کسی پر جبر کر کے اس سے نیکی کے کام کروائیں تو وہ میرے سامنے ہاتھ پھیلائے گا تا کہ مجھے بدلہ دو تم نے جو مجھ سے یہ کام کروائے ہیں مجھے خدا کی رضا کی جنتوں کا پروانہ لکھ کے دو۔ تو کون ایسا انسان ہے جو کسی دوسرے انسان کو ایسے پروانے لکھ کے دینا شروع کر دے اور خدا تعالیٰ ان کو مان بھی لے۔ بدلہ تو خدا نے دینا ہے اور خدا ظاہری اعلان کو دیکھ کر تو بدلہ نہیں دیتا۔ خدا تعالیٰ تو، بعض بدبخت ایسے لوگ بھی ہیں کہ جن کے اعمال انسان کی نگاہ میں بڑے پیارے اور مخلصانہ ہوتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ انہیں قبول نہیں کرتا بوجہ کسی ایسی خباثت کے جو ان اعمال کے پیچھے پوشیدہ ہوتی ہے اور ان کے منہ پر مار دیئے جاتے ہیں ان کے اعمال نامے۔ حدیثوں میں کثرت سے اس کا ذکر ہے تو جس نے بدلہ دینا ہے اور جو علام الغیوب ہے اور جس پر کوئی زبردستی کر کے اس کے قانون اس کی خواہش اور منشاء کے خلاف کچھ کروا نہیں سکتا۔ اس سے کیسے جزا دلوائی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکھف: ۳۰) کا اعلان کیا۔ خدا تعالیٰ نے تو یہ کہا کہ اپنی مرضی سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور مجھ سے اگر پیار حاصل کرنا چاہتے ہو تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت کرو، اپنی مرضی سے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد بھی کوئی زبردستی نہیں کیونکہ اگر مسلمان ہونے کے بعد کوئی زبردستی

ہوتی تو اسلام کے اندر نہ فاسق کوئی ہوتا نہ منافق کوئی ہوتا۔ اپنی مرضی سے اخلاص کے ساتھ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت جو کامل محبت کا تقاضا کرتی ہے جس کے نتیجے میں خدا تعالیٰ کا پیار ملتا ہے اس کی معرفت ملتی جس کے نتیجہ میں خدا کا عرفان حاصل ہوتا خدا کے لئے دل میں محبت کا ایک سمندر موجزن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد خدا تعالیٰ اس قابل سمجھتا ہے اس پاک بندے کو جو اس پاک کی خاطر خود کو پاک بناتا ہے کہ اس سے وہ پیار کرے اپنی رضا کی جنتوں میں اسے داخل کرے تو لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔

پہلوں نے بھی باوجود اس کے کہ بہت سی غلط قسم کی روایتیں بھی ان کے پاس پہنچ چکی تھیں لیکن جو حقیقت تھی وہ بھی انہوں نے کھول کے بیان کر دی۔ ان میں سے چند حوالے اس وقت میں پڑھ کے سناؤں گا آپ دوستوں کو۔ ہمارے ایک مشہور بزرگ مفسر قرآن ہیں امام رازی۔ یہ ساتویں صدی ہجری کے ہیں۔ ان کی وفات ہوئی یعنی چھٹی کہنا چاہیے زیادہ زندگی انہوں نے گذاری چھٹی میں، ۶۰۶ ہجری میں۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے نیچے وہ لکھتے ہیں بعض حوالے دے کر پہلوں کے کہ خدا تعالیٰ نے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کی تفسیر کرتے ہوئے:۔

خدا تعالیٰ نے ایمان کی بنیاد جبر و اکراہ پر نہیں رکھی بلکہ ہر انسان کی طاقت اور اختیار پر رکھی ہے۔ توحید کے متعلق فیصلہ کن اور واضح بیان دینے کے بعد فرمایا کہ ان دلائل کی توضیح کے بعد کافروں کے لئے کفر پر قائم رہنے کا کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ اس کو ایمان پر مجبور کر دیا جائے (یعنی جتنے دلائل دیئے جانے چاہیے تھے وہ دے دیئے گئے۔ حق آ گیا نا، جاء الحق اور معجزات بھی دکھائے گئے اور کوئی وجہ نہیں کہ یہ ایمان نہ لائیں۔ اب جو وہ ایمان نہیں لاتے تو ایک ہی صورت رہ جاتی ہے باقی کہ ان کو مجبور کیا جائے کہ وہ ایمان لائیں لیکن وہ کہتے ہیں) اور کسی پر جبر و اکراہ دنیا میں جو دارالابتلا اور دارالامتحان ہے جائز نہیں کیونکہ دین میں جبر و اکراہ کا مطلب یہ ہوگا کہ ابتلا اور امتحان کا مقصد باطل ہو گیا۔ اسی فرمان کی طرح دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا (آیت کا میں ترجمہ کروں گا) کہ جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کفر اختیار کرے اور ایک دوسری سورۃ میں فرمایا کہ اگر تمہارا ربّ جبر کرنا چاہتا تو زمین کے تمام لوگ ایمان لے آتے لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں اور پھر ایک اور جگہ فرمایا کہ شاید کہ تو تباہ کر دے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ

نَّفۡسَكَ (الشعراء:۴) شاید کہ تو تباہ کر دے اپنی جان کو اس فکر سے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ اگر ہم انہیں مجبور کرنا چاہتے تو ہم ان پر آسمان سے کوئی ایسا نشان نازل فرما دیتے کہ اس کے سامنے ان کی گردنیں جھکنے پر مجبور ہو جاتیں اور اس معنی کی تائید اس فرمان سے بھی ہوتی ہے کہ ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے (جو اسی آیت میں لَآ اِكۡرَاهَ فِي الدِّيۡنِ کے آگے ہے قَدۡ تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَيِّ اس کی طرف اس کے معنی کر رہے ہیں) اور اس معنی کی تائید اس فرمان سے بھی ہوتی ہے کہ اس کے بعد ہے (لَآ اِكۡرَاهَ فِي الدِّيۡنِ کے بعد ہے) کہ ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے یعنی اس کے دلائل ظاہر ہو چکے ہیں اور اس کے بعد ان کو ایمان کی طرف لانے کے لئے کوئی طریق باقی نہیں رہا۔ (یعنی ہر وہ طریق جو کسی کو کنونس (Convince) کرنے کے لئے جو کسی کو سمجھانے کے لئے جو کسی پر ہدایت کھولنے کے لئے ممکن تھا وہ طریق اختیار کیا گیا وہ دلائل دے دیئے گئے معجزات دکھا دیئے گئے) اور یہ جائز نہیں، کوئی طریق باقی نہیں رہا سوائے جبر کے اور یہ جائز نہیں کیونکہ یہ ذمہ داری کے خلاف ہے (کہ ہر آدمی پہ جو ذمہ واری ہے کہ اپنی مرضی سے کرے یہ اس کے خلاف ہے جو بنیادی۔ پہلے میں نے بتایا تھا کہ یہ جو انسان کی پیدائش کا منصوبۂ باری ہے اس کے خلاف ہے)۔

پھر یہ لکھتے ہیں کہ: ''لَآ اِكۡرَاهَ فِي الدِّيۡنِ کا بعض کے نزدیک یہ مطلب بھی ہے جو شخص جنگ کے بعد دین میں داخل ہوا ہو اس کے متعلق یہ نہ کہو کہ وہ مجبور ہو کر دین میں داخل ہوا ہے''۔

اسلام جب آیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری دنیوی کمزور حالت میں رہے لمبا عرصہ مکی زندگی میں، تیرہ سال پھر مدینے ہجرت کر کے تشریف لے گئے۔ پھر وہاں حملہ آور ہوئے رؤسائے مکہ اور انہوں نے سارے عرب کو اپنے ساتھ ملا یا اور یہ فیصلہ کیا کہ اسلام کو دنیا سے مٹا دیں گے اس وقت تو وہی چند مسلمان تھے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو چکے تھے، تو دفاعی جنگیں اسلام کو لڑنی پڑیں۔ دفاعی جنگیں بھی لڑیں لیکن جنگ کی بعض شکلیں معجزانہ صورتیں بھی اختیار کر جاتی ہیں عقلمند آدمی کے لئے مثلاً بدر میں تین سو کچھ صحابہ کا نہتے، نہ کپڑے ٹھیک، نہ ہر ایک کے پاس جوتا بھی تھا اور اس کے مقابلے میں بڑے کرّ وفر کے ساتھ رؤسائے مکہ حملہ آور ہوئے تھے لیکن ان کا سر وہاں کٹ گیا اور شکست کھائی اور وہ واپس آئے اس وقت بہتوں نے سمجھا ہو گا کہ اتنی کوشش جو کی ہے جب تک اس چھوٹی سی جماعت کے پیچھے کوئی زبردست خدائی ہاتھ نہ ہو اس وقت تک یہ چیز نہیں ہے، یہ نظارہ

نہیں ہماری آنکھیں دیکھ سکتیں تو وہ ایمان لے آئے تو لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا بعض لوگوں نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ جنگ کے بعد اس قسم کی دلی تبدیلی پیدا ہو جانے کے نتیجہ میں اگر کافر کچھ، مومن بھی ہو جائیں تو یہ نہ کہو کہ جنگ کی وجہ سے مجبور ہو گئے وہ۔ جنگ کی وجہ سے مجبور نہیں ہوئے جنگ تو دفاعی کی گئی تھی جنگ میں تو کمزوری کی حالت میں جب وہ جنگ کی گئی تھی۔ ظاہری حالات میں اس جنگ میں جیتنا ناممکنات میں سے تھا لیکن اس جنگ نے بعض عقلمندوں کو ایک نشان دکھایا خدا کا اور اس نشان میں انہیں خدا تعالیٰ کا ہاتھ نظر آیا۔ اس ہاتھ کو انہوں نے پکڑا اور وہ اسلام کی طرف آ گئے۔ تو ایسوں کو یہ نہ کہو کہ تم دل سے ایمان نہیں لائے مجبور ہو گئے ہو۔ اس کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں۔ کیونکہ جب وہ جنگ کے بعد دین میں داخل ہونے کے لئے راضی ہو گئے دل سے اور اس کا اسلام صحیح ہوا تو وہ مجبور نہیں کہلائیں گے۔ مطلب یہ ہوا کہ تم ایسے لوگوں کو اکراہ و جبر کی طرف منسوب نہ کرو۔

اس کی مثال دوسری جگہ یہ ملتی ہے (یہ امام رازیؒ ابھی فرما رہے ہیں) جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص تمہیں سلام کہے تم اسے یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں صرف ظاہر سے اسلام کا اعلان کر رہا ہے۔

علامہ آلوسی ہیں۔ ان کی ایک تفسیر ہے روح المعانی۔ وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ، ان کی وفات ہوئی ہے ۱۲۷۰ء میں۔ تو مختلف روایتیں جو ان تک پہنچیں مختلف تفاسیر ان کا ذکر کر کے وہ کہتے ہیں: ”اس آیت کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ دین کے متعلق خدا کی طرف سے کسی قسم کا جبر نہیں بلکہ اس کا سارا دارومدار اختیار اور رضا پر ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر ابتلا اور امتحان کا وجود ہی بے فائدہ ہو جائے اور یہ آیت ویسی ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا کہ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے“۔

اور تفسیر المنار، محمد عبدہٗ کی ہے وہ درس دیتے تھے ان کے شاگرد نے لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”ابن جریر نے بہت سی روایات جمع کی ہیں جن میں ہے کہ جاہلیت میں عورتیں نذر مانا کرتی تھیں“۔ (جاہلیت کے زمانہ میں یہودی مذہب اور عیسائی وہاں بستے تھے۔ مدینے میں بھی تھے تو یہ مدینے کی بات ہے) ”جاہلیت میں عورتیں نذر مانا کرتی تھیں کہ ہم اپنے بچوں کو یہودی بنا دیں گے تا کہ وہ زندہ رہیں“۔ (جن عورتوں کے بچے مر جاتے تھے وہ حب اٹھرا کھانے کی بجائے نذر مانتی تھیں کہ یہودی بنا دیں گے تا کہ وہ زندہ رہیں)۔ ”پھر مسلمانوں کو اسلام نصیب ہوا تو انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے ان بچوں کو جو اہلِ کتاب کے دین پر ہیں مجبور کریں کہ وہ اسلام لے آئیں“۔ (جو بچے

یہودیوں نے لے لئے تھے) اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن جریر یہ کہتے ہیں بہت سی روایات جمع کی ہیں اور یہ ان کا آپس میں پھر جھگڑا ہو گیا نا۔ جو اصل ماں باپ تھے وہ کہتے تھے کہ پہلے اسلام تھا ہی نہیں۔ ہم نے یہودی مذہب کو اپنے سے بہتر سمجھا اور نذر مانی۔ اب یہودی مذہب سے زیادہ اچھا ایک کامل اور مکمل مذہب ہمیں مل گیا ہے اسلام کی شکل میں اب تمہارے پاس کیوں رہنے دیں اپنی اولاد کو۔ یہ اختلاف ان میں پیدا ہو گیا اور اس اختلاف کا فیصلہ کیا۔ یعنی اس آیت کے نزول کی وجہ جو ہے وہ یہ بیان کرتی ہیں روایات۔ اور سعید بن جبیر کی روایت میں ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے اترنے پر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لوگوں کو اختیار دیا ہے اگر وہ چاہیں وہ بچے جو یہودی لے چکے تھے یا عیسائی خاندان لے چکے تھے اگر وہ چاہیں تو تمہیں ترجیح دیں اور تم میں داخل ہو جائیں۔ اگر وہ چاہیں تو وہ ان کو ترجیح دیں اور ان میں داخل رہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی تفسیر جو انہوں نے کی وہ کہتے ہیں۔ ’’میں کہتا ہوں کہ یہ حکم‘‘۔ بڑا ان کے دماغ نے یہاں کام کیا ہے۔ ’’میں کہتا ہوں کہ یہ حکم اس دین کا ہے جس کے متعلق اس کے دشمن‘‘، اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے کو اس دین کا دوست خیال کرتے ہیں۔ ’’میں کہتا ہوں‘‘۔ میں پڑھتا ہوں دوبارہ۔ ’’میں کہتا ہوں کہ یہ حکم ہے اس دین کا جس کے متعلق اس کے دشمن اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ طاقت اور تلوار کے ساتھ کھڑا ہوا اور وہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا (طاقت کے بل بوتے) اس حال میں کہ طاقت اور وہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا اس حال میں کہ طاقت اس کے دائیں ہوتی اور جو اسے قبول کرتا وہ نجات پا جاتا اور جو اسے قبول نہ کرتا تو تلوار اس کا فیصلہ کر دیتی‘‘۔

کہتے ہیں یہ اُس مذہب نے فیصلہ دیا ہے جس کی روایتیں ہیں۔ ’’ہم پوچھتے ہیں کہ کیا یہ تلوار اس وقت بھی کام کر رہی تھی جب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں چھپ چھپ کر نماز ادا کیا کرتے اور جب کہ اسلام لانے پر مسلمان کو قسم قسم کے عذاب دیئے جاتے اور کوئی نہ تھا جو ظالموں کو ظلم سے روکے۔ حتیٰ کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ یا کیا وہ کہتے ہیں کہ جبر و اکراہ مدینہ میں استعمال کیا گیا بعد اس کے کہ اسلام سربلند اور غالب ہو چکا تھا اور یہ آیت تو اس غلبہ کے ابتدائی دور میں نازل ہو چکی تھی‘‘۔ آیت کا نزولِ زمانہ جو ہے وہ امام بخاری کے نزدیک ۳ھ میں غزوۂ احد ہے اور یہ اس سے پہلے آیت نازل ہو چکی تھی۔ تو بالکل ابتدائی زمانہ میں تھی اس

وقت کب عروج ہوا تھا؟ وہ تو جنگ احزاب میں بھی پیٹ پہ پتھر باندھ کے پھرتے تھے اور جانوں کی فکر لگی ہوئی تھی اور منافق جو تھے وہ ریشہ دوانیوں میں تھے اور یہود جو تھے وہ اپنا فتنہ تیز کرنے کی کوشش میں تھے۔ اس وقت تو بڑی کمزوری کی حالت تھی ۳ھ میں اور مکّہ کے کفار ہمیشہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بنو نضیر نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور دو دفعہ آپ کو ہلاک کرنے کی تدبیر کی۔ یہ وہ زمانہ ہے اس آیت کے بعد یہ واقعات ہوئے ہیں حالانکہ وہ مدینہ میں آپ کی پناہ میں رہ رہے تھے۔ آخر حضور نے ان کا محاصرہ کیا اور وہ ہار کر مدینہ سے نکل گئے اور جن مسلمانوں نے اجازت مانگی تھی جب یعنی ان کی شرارتوں کی وجہ سے ان کو مدینہ چھوڑنا پڑا تو مسلمانوں نے جب وہ جانے لگے تو مسلمانوں نے اجازت مانگی ہم اپنے بچے جو ہیں وہ ان کے پاس نہیں رہنے دیتے اور جن مسلمانوں نے اجازت مانگی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو جو یہودی ہو چکے تھے مجبور کر کے مسلمان بنائیں انہیں اس کی اجازت نہ فرمائی۔

یہ اُستاد امام شیخ محمد عبدہٗ نے لکھا ہے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ ''دراصل وہی پہلا دن تھا جس میں مسلمانوں کو کسی قدر جبر و اکراہ کا خیال آیا۔'' یہ محمد عبدہٗ نے لکھا ہے اپنی تفسیر میں ''دراصل وہی پہلا دن تھا جس میں مسلمانوں کو کسی قدر جبر و اکراہ کا خیال آیا اور اسی دن یہ فرمان نازل ہوا کہ دین میں جبر و اکراہ جائز نہیں''۔

استاد امام شیخ محمد عبدہٗ نے فرمایا کہ ''عام مذاہب میں خصوصاً عیسائیوں میں یہ دستور تھا کہ وہ لوگوں کو جبراً اپنے مذہب میں داخل کرتے اور یہ مسئلہ دراصل دین کی نسبت سیاست سے زیادہ تعلق رکھتا ہے کیونکہ ایمان جو دین کا اصل اور جوہر ہے اس کے معنی ہیں نفس کا جھک جانا اور فرمانبردار ہو جانا۔ اور ناممکن ہے کہ یہ جھکنا اور یہ فرمانبرداری جبر اور زبردستی سے پیدا ہو۔ یہ صرف وضاحت اور دلیل سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے جب اکراہ و جبر کی نفی فرمائی تو فرمایا قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ کہ ظاہر ہو چکا ہے کہ اس دین میں ہدایت فلاح اور نور کی طرف پیش قدمی ہے اور جو مذاہب اس کے خلاف ہیں وہ گمراہی اور بے راہ روی میں مبتلا ہیں''۔

یہ چند ایک مثالیں میں نے اس وقت دینی تھیں۔ اسلام نے بڑی وضاحت سے دلائل دے کر سمجھا کر حقیقت کھول کر پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ اس عظیم دین میں اس کامل دین میں اس مکمل دین

میں اس حسین تر دین میں بنی نوع انسان پر عظیم احسان کرنے کی طاقت رکھنے والے دین نے دین کے معاملہ میں جبر کو جائز قرار نہیں دیا۔ نہ مذہب کے معاملہ میں جائز قرار دیا نہ کسی مسلمان کے ذہن میں یہ بات پیدا ہونے دی کہ اطاعتِ حقیقی جبر سے بھی کروائی جاسکتی ہے یعنی ہماری عقلوں کو بھی یہ باور کروایا کھول کے بیان کیا ایک لحظہ کے لئے بھی کوئی عقلمند سوچ نہیں سکتا کہ جبراً حقیقی اطاعت کروائی جاسکتی ہے۔ جبراً ظاہری اطاعت کا تو امکان ہے لیکن جبراً حقیقی اطاعت جب دل میں بشاشت پیدا ہو جب سینوں میں شرح پیدا ہو فراخی اور وسعت پیدا ہو جب روح میں نور پیدا ہو جب انسان کے وجود میں خدا تعالیٰ کا پیار سمندر کی لہروں کی طرح موجزن ہو جائے۔ یہ جبر سے ہوسکتا ہے؟ تو ہمیں جب کہا خدا نے کہ جب یہ ناممکن ہے کہ جبر اور اکراہ اور زور کے ساتھ اور طاقت کے ذریعہ سے کسی کے دل میں تبدیلی پیدا کی جائے تو ہر وہ ازم یا ہر وہ مذہب جو اس کے برعکس خیال کرتا ہے وہ خدا کی مرضی کے خلاف باتیں کر رہا ہے۔ اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی۔

(خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۱۱۵ تا ۱۲۷)

ایک وقت میں ایسے لوگ خود اسلام کے اندر پیدا ہو گئے جو اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ اسلام کو اپنی اشاعت کے لئے تلوار کی طاقت اور زور کی ضرورت ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نہ تو اسلامی دلائل کا علم رکھتے تھے اور نہ وہ کوئی ایسا روحانی مرتبہ رکھتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض سے حصہ لے کر دُنیا کو نشانات دکھانے کے قابل ہوتے۔ غرض جہالت اور عدمِ قابلیت کے نتیجہ میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیل سکتا ہے.........

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ یعنی جو ہدایت ہے اور جو ضلالت ہے اس کے درمیان ایک بیّن اور نمایاں فرق کر کے بتا دیا گیا ہے اسی مفہوم کو سورۃ بقرہ ہی میں ایک دوسری جگہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ (البقرۃ:۱۸۶) کہ جو علومِ دین ایسے تھے جن سے دُنیا واقف نہیں تھی قرآن کریم ان علوم کو لانے والا ہے چونکہ یہ هُدًى لِّلنَّاسِ ہے اور بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى جن دینی ہدایات میں اجمال پایا جاتا تھا اور کچھ پہلو ضرورت زمانہ کی وجہ سے پہلے نمایاں نہیں کئے گئے تھے قرآن کریم نے اس اجمال کی تفصیل بتائی اور اُن مشتبہ چیزوں کی وضاحت کر دی اور پھر فرمایا یہ الفرقان ہے قرآن کریم حق اور باطل میں ایک امتیاز پیدا کرتا ہے کیونکہ

قرآن کریم یا اسلامی شریعت میں اس قدر زبردست دلائل ہیں اور اسلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشانات کا اتنا وسیع سمندر عطا کیا گیا ہے کہ ان دلائل اور ان آسمانی نشانات کے بعد اسلام کو اپنی اشاعت کے لئے کسی مادی طاقت اور قوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہاں جو لوگ دلائل سے غافل اور آسمانی نشانات کے حصول کی اہلیت نہیں رکھتے وہ دھوکا کھاتے ہیں۔

قرآن کریم نے دلیل کے ساتھ (چند باتیں میں نے بیان کی ہیں ورنہ قرآن کریم کے سارے دلائل تو میں اس وقت بیان نہیں کرسکتا) انسان کے سامنے یہ بات بڑی وضاحت اور زور سے رکھی کہ اسلام کو، قرآن کریم کو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا دین پھیلانے کے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے فرمایا لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ دین کے بارہ میں جبر جائز نہیں لیکن انسان بھی کیا عجیب ہے اس عظیم اعلان کے باوجود اور اس عظیم اعلان کے حق میں زبردست دلائل کے ہوتے ہوئے جبر کرنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

ہم ایک کہاوت سُنا کرتے تھے کہ کسی آدمی کو موقع مل گیا اُس نے ایک غیر مسلم کو قابو کیا اور چُھرا نکال کر کہنے لگا پڑھ کلمہ۔ وہ حیران کہ یہ کیا بات ہوئی کہ چھرے کے زور پر مجھے کہتا ہے پڑھ کلمہ۔ خیر اُس نے کوئی دلیل اپنی چاہی اور کہا مجھے سمجھاؤ تو سہی مگر اُس نے کہا یا تو کلمہ پڑھو یا میں چھرے سے تمہاری گردن کاٹتا ہوں۔ چنانچہ جب اُس نے یہ دیکھا کہ یہ شخص سنجیدگی کے ساتھ چھری کی دھار پر مجھے اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنا چاہتا ہے تو چونکہ اُس نے جان بچانی تھی اس لئے کہنے لگا اچھا تو پھر پڑھاؤ کلمہ تو وہ آگے سے کہنے لگا اوہو! کلمہ تو مجھے بھی نہیں آتا۔ تو بڑا خوش قسمت ہے تیری جان بچ گئی ورنہ یا تو کلمہ پڑھتا یا میں تجھے مار دیتا۔ پس جبر کے زور سے اسلام منوانے والے، اسلام کی حقانیت کے روشن نشانات سے خود بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک بڑا پرانا اور مشہور قصہ ہے لیکن اس میں یہی بتایا گیا ہے کہ جس شخص کو اسلام کے حسن و احسان کا علم نہیں وہ چھرے یا تلوار یا طاقت یا ایٹم بم سے دل کے عقائد بدلنے کی کوشش کرے گا۔ حالانکہ دین کے بارہ میں جبر سے کام لینے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے کئی تفسیری معنے لئے جاسکتے ہیں۔ دین کے معنے اگر دل سے اطاعت کے لئے جاویں اور یہ لُغت عربی کی رو سے صحیح ہیں۔ تو یہ واضح ہے کہ اطاعت میں جبر ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اطاعت کا تعلق اخلاص سے ہے

اور اخلاص کا تعلق دل سے ہے اور دل کا کوئی تعلق طاقت کے ساتھ نہیں یعنی زبان سے تو زبردستی کہلوایا جا سکتا ہے اگر کوئی بزدل قابو آ جائے لیکن دلی اخلاص کے ساتھ زبردستی اطاعت نہیں کروائی جا سکتی۔ اس کے لئے اخلاقی اور روحانی طاقتیں ہیں جن کی ضرورت پڑا کرتی ہے۔

(خطباتِ ناصر جلد ششم ۳۵۸ تا ۳۶۱)

آیت ۲۶۵ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶۵

اسی واسطے جب انسان بظاہر نیکی کر رہا ہو اور بظاہر تقویٰ کا مظاہرہ کر رہا ہو اس وقت بھی اگر حقیقی تقویٰ نہیں ہے تو وہ نیکی نہیں رہتی مثلاً صدقہ ہے، صدقات دینا نیکی کا کام ہے (صدقہ کے مختلف معانی ہیں مَیں اس وقت ان معانی میں نہیں جاؤں گا) بظاہر یہ نیک کام ہے لیکن اگر اس کے ساتھ تقویٰ نہیں، اگر صدقات بجالانے والا متقی نہیں، اگر وہ تقویٰ کی راہوں کو اختیار نہیں کرتا اور تقویٰ کی شرائط کو پورا نہیں کرتا تو صدقات نیکی نہیں رہتے۔

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى اگر صدقات بھی ہیں اور منّ اور اذٰی بھی ہے تو پھر وہ نیکی نہیں رہیں گے اس لئے تقویٰ ضروری ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد ہفتم صفحہ ۸۸)

آیت ۲۷۳ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝۲۷۳

اے رسول! لوگوں کو ہدایت کی راہ پر لانا تیرے ذمہ نہیں ہے یہ تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے وہ جسے چاہتا ہے ہدایت کی راہ پر لے آتا ہے۔ قرآن کریم کی یہ بھی ایک عجیب شان ہے۔ ہم اپنے ایک خاص مضمون

کے لئے آیاتِ قرآنیہ سے ایک ایک فقرہ اٹھاتے ہیں تو بظاہر ایسا لگتا ہے کہ شاید تکرار ہے اور ایک ہی بات کو دہرایا گیا ہے۔ بات دہرائی نہیں جاتی بلکہ ایک نئے پیرایہ میں ایک نئی بات بتائی جاتی ہے۔ سورۃ بقرۃ کی آیت کے اس ٹکڑے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے رسول! ہدایت دینا تیرا کام نہیں ہے یہ خدا کا کام ہے وہ جس کے اعمال قبول کرے گا اسے ہدایت یافتہ گروہ میں شامل کر دے گا۔

(خطباتِ ناصر جلد ہفتم صفحہ ۲۲۴، ۲۲۵)

آیت ۲۷۴ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۴﴾

تو قرآن کریم کی ایک آیت بڑی وضاحت سے بتا رہی ہے کہ وقف زندگی بھی مجاہدہ کی ایک قسم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۷۴ میں فرمایا کہ ہمارے احکام کے مطابق عمل کر کے اُمت محمدیہ میں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جنہیں دین کی خدمت میں لگایا گیا ہوگا۔ اور مشاغل دنیا سے انہیں روک دیا گیا ہوگا۔ (اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ) تو بتایا کہ ان کو تمام ان مشاغل سے روک دیا جائے گا کہ جو سبیل اللہ کے مشاغل نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں کے علاوہ دنیا کمانے اور دنیا کی عزت حاصل کرنے کے تمام راستے ان پر بند کر دیئے جائیں گے۔

تو جن لوگوں پر اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کا اطلاق ہوتا ہے وہ بھی مجاہدین ہیں۔ ایک قسم کا مجاہدہ اور جہاد کرنے والے ہیں۔

اس آیت کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ لوگ جن پر دشمن، مخالف، منکر دنیا کی راہیں بند کر دیتا ہے۔ آئے دن ہمارے سامنے ایسی مثالیں آتی رہتی ہیں کہ بعض لوگ بعض احمدیوں کو صرف احمدیت کی وجہ سے نوکری نہیں دیتے یا امتحانوں میں اچھے نمبر نہیں دیتے کہ وہ ترقی نہ کر جائیں۔ یا اگر تاجر ہیں تو ان کی تجارت میں روک ڈالتے ہیں۔ اگر زمیندار ہیں تو طرح طرح سے ان کو تنگ کرنے کی کوشش

کرتے ہیں۔ خصوصاً جہاں نئے احمدی ہوں اور تعداد میں بھی تھوڑے ہوں وہاں اس قسم کا سلوک اکثر کیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں پر خدا کے لئے دنیا کی تمام راہیں اگر بند ہو جائیں تو قرآنی محاورہ کے مطابق وہ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے گروہ میں شامل ہوتے ہیں۔

(خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۴۴۴، ۴۴۵)

آیت ۲۸۷ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَ اعْفُ عَنَّا ٙ وَ اغْفِرْ لَنَا ٙ وَ ارْحَمْنَا ٙ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۷﴾

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا میں ہر دو پہلو بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کسی پر طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ یہاں طاقت سے مراد دائرۂ استعداد ہی ہے جس پر میں متعدد بار روشنی ڈال چکا ہوں۔ پس کسی کا جتنا دائرۂ استعداد یا دائرۂ صلاحیت یا دائرۂ قوت و طاقت ہو، اس سے زیادہ بوجھ فرد، گروہ یا نوع پر نہیں ڈالا گیا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ دائرہ استعداد میں جتنی بھی طاقت تھی، اس پر پورا سو فیصد بوجھ ڈال دیا گیا اور انسان کو اس کا مکلّف بنا دیا گیا۔ اللہ اس سے کم پر راضی نہیں ہوتا اور نہ وہ اس کا مطالبہ کرتا ہے اور جو طاقت سے باہر ہے وہ اس کا بھی مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ اپنے کسی بندے پر اس وجہ سے بھی خوش نہیں ہوگا کہ اس نے اپنے بھائیوں سے طاقت سے زیادہ مطالبہ کیا لیکن طاقت اور اس دائرہ کے اندر ذمہ داریوں کا جو زیادہ سے زیادہ بوجھ ڈالا جا سکتا ہے، وہ ڈالتا ہے چونکہ قوت وطاقت کی نشوونما ہوتی رہتی ہے اس لئے افراد کے بوجھ اور ان کی ذمہ داریاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ تیری وحی سے منہ پھیر لیتے ہیں وہ بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک تو مُقِرّ اور ایک وہ جو ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود اپنی ذمہ داریوں کو جان بوجھ کر یا غفلت کے نتیجے میں نباہنے کی کوشش نہیں کرتے اور ان کا حال یہ ہے وَ اَعْطٰى قَلِيْلًا وَّ اَكْدٰى (النّجم: ۳۵) کہ تھوڑا سا

دیتے اور بقیہ کے متعلق بخل کرنے لگتے ہیں۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا میں جو بات بتائی گئی تھی وہ یہاں کھول کر بتادی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تھوڑا دینے پر راضی نہیں بلکہ وہ طاقت کے مطابق پورا دینے پر راضی اور خوش ہوتا اور اس کی جزا دیتا ہے۔ باقی اس کی رحمت وسیع ہے وہ اپنے بندوں سے بعد میں جزا سزا کے وقت جو چاہے سلوک کرے (''بعد میں'' سے یہ مراد ہے کہ اس زندگی کے بعد اُخروی جزا کا وقت یا اِسی زندگی میں جزا کا وقت یعنی ایک محدود کوشش کا نتیجہ نکلنے کا وقت) وہ مالک ہے جو مرضی ہو کرے اسکے متعلق ہم بات نہیں کیا کرتے لیکن جو خدا نے ہمیں کہا اور تعلیم دی ہے، ہم سے جو چاہتا اور خواہش رکھتا ہے اور جس بات پر وہ کہتا ہے کہ میں راضی ہوتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ جتنا دے سکتے ہو اُتنا دے دو تو میں راضی ہوں گا ورنہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بوجھ ڈالا ہے اور اس کو پسند نہیں کرتا کہ انسان اپنی قوت اور طاقت کے مطابق کام نہ کرے بلکہ اس سے کم کرے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کی لغوی بحث میں امام راغب نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کی طاقت سے جو زائد ہے، وہ اس کا مکلّف نہیں لیکن اس دائرے کے اندر مکلّف ہے۔ سورۂ نجم میں یہی چیز کھول کر بیان کردی گئی ہے کہ تھوڑا دینا اور بقیہ کے متعلق بخل کرنا۔ اگر تمہاری قوتِ استعداد سو اکائی ہو اور تم خدا کی راہ میں خدا کے بتائے ہوئے طریق اور اسکی تعلیم کے مطابق اور اس کی شریعت کے اصول کے لحاظ سے ننانوے اکائیاں دے دو اور ایک کے متعلق روگردانی اور بغاوت کا طریق اختیار کرو تو تم باغی ہو۔ اگر بھول جاؤ تو تم خدا تعالیٰ کے بعض فضلوں کو کھونے والے ہو سوائے اس کے کہ پھر ایک اَور کوشش کرو یعنی استغفار اور دعاؤں اور خدا کے سامنے عاجزانہ تڑپنے کی۔ یہ ایک اَور کوشش ہے جو اِس کمی کو پُورا کرتی ہے پس کوشش بہر حال کرنی پڑے گی....

اللہ تعالیٰ سورۂ نجم کی ان دو آیات کے بعد ان لوگوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے جو کچھ دیتے اور بقیہ کے متعلق بخل کرتے ہیں کہ کیا اِن کو علم نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے۔ جو پہلی الہامی کتب میں بھی نظر آتا ہے۔ یعنی اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ وَزَرَ کے ایک معنے تو گناہ کے ہیں لیکن میں جو تفسیر کر رہا ہوں وہاں گناہ کے معنی چسپاں نہیں ہوتے۔ میری تفسیر کے مطابق بوجھ کے معنے ہیں یعنی خدا تعالیٰ کا یہ اٹل قانون ہے کہ کوئی جان دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی جس کی استعداد پچاس اکائیاں ہے وہ اسّی اکائیوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی جو پچاس اور ساٹھ کے درمیان فرق ہے یا پچاس اور سَو

کے درمیان فرق ہے وہ تو دوسرے کا بوجھ ہے (جس کی طاقت زیادہ ہے اور) اس کے اوپر نہیں پڑسکتا۔ اس کی جان پر اتنا ہی بوجھ پڑے گا جتنا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کے مطابق اٹھانے کے قابل ہے اس سے زیادہ نہیں لیکن اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ میں نے جو کوتاہی کی، میں نے جو غفلت کی، میں نے جو کمزوری دکھائی اور جو قربانی مجھے پیش کرنی چاہیے تھی، میں نے پیش نہیں کی تو کوئی اَور شخص اس کی خاطر اس کمی کو پورا کر دے گا۔ یا ناممکن ہے اس واسطے کہ اس میں بھی تو اپنی اِستعداد سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی اہلیت نہیں ہے اگر اس کی ذمہ داری اسّی اکائیاں ہے تو اسّی اکائیوں پر اس کی طاقت ختم ہوگی۔ وہ دوسرے کی دس اکائیاں کہاں سے پوری کرے گا اگر اس کی طاقت سو اکائیاں ہے تو سو اس نے دے دینی ہیں ایک سو دس وہ کہاں سے لائے گا۔

پس اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی یہ ایک اٹل قانون ہے۔ اگر زید اپنی پوری طاقت کے مطابق خدا کے حضور پیش نہ کرے تو زید کی طاقت کے اظہار یعنی محنت اور جانفشانی میں جو کمی رہ گئی ہے یہ کمی کوئی دوسرا پوری نہیں کرسکتا کیونکہ اس کا اپنا ایک دائرۂ استعداد ہے اور اس دائرۂ استعداد کی انتہا تک اس کی ذمہ داری ہے۔ دوسرے کی ذمہ داری وہ کیسے اُٹھائے گا۔ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ دوسرے کا بوجھ تو وہ اُٹھا ہی نہیں سکتا یہ ناممکن ہے کیونکہ یہ اٹل قانون ہے کہ انسان دوسرے کا بوجھ اور ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکتا۔ زید بکر کی ذمہ داریاں نہیں اُٹھا سکتا اور بکر زید کی ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکتا۔ ہر شخص کو اپنی ذمہ داریاں خود ہی ادا کرنی پڑیں گی اور ادا بھی اس طرح نہیں کرنی ہوں گی کہ کچھ دیا اور بقیہ کے متعلق بخل کر دیا بلکہ ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اپنی طاقت کو انتہا تک پہنچا کر اس کا آخری حصہ تک ادا کرنا پڑے گا کیونکہ دوسرا کوئی ہے ہی نہیں جو کمی کو پورا کر سکے۔ عقلاً بھی کوئی دوسرا اس کمی کو پورا نہیں کرسکتا۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کیونکہ جو دوسرا ہے اس کو جتنی طاقت دی گئی تھی اس کے مطابق کام کرنے کی تو اس کی اپنی ذمہ داری تھی اور دوسرے کی ذمہ داری اُٹھانے کی اسے طاقت ہی نہیں ملی۔ اس کی طاقت کا کوئی حصہ ایسا نہیں رکھا گیا جس کے بارہ میں اسے کہا گیا ہو کہ تو دوسرے کی ذمہ داری اٹھالے۔ وہ دوسرے کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔ ہرگز نہیں اٹھا سکتا۔ پس جو قوم اپنے مقام کی انتہا کو پہنچنا چاہے، اس کے ہر فرد کی ایسی تربیت ہونی چاہیے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو انتہا تک پہنچانے والا ہو۔ فرض کرو ایک لاکھ کی کوئی قوم ہے اگر ان میں سے نوّے ہزار اپنے دائرہ استعداد

کے مطابق یعنی لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا میں جس قسم کے مکلّف ہونے کا ذکر ہے اس کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کو اپنے دائرہ استعداد کی انتہا تک پہنچادے اور دس ہزار نہ پہنچا ئیں تو جو کام دس ہزار سے رہ گیا ہے، کسی اَور کی طاقت ہی نہیں ہے کہ وہ پورا کر سکے۔ یہ بالکل ناممکن ہے خدا تعالیٰ نے اس کو پورا کرنے کی طاقت ہی نہیں دی پس اگر یہ کمی رہ گئی تو ایک لاکھ آدمی اپنے مقام کی انتہا کو نہیں پہنچ سکے گا کیونکہ دس ہزار نے کمزوری دکھا دی۔ (خطبات ناصر جلد چہارم صفحہ ۲۳ تا ۲۶)

تمہاری وسعت کے مطابق تم پر بار ڈالا جائے گا اس میں کسی فلسفے کی ضرورت نہیں ہے۔ شریعت میں اتنی لچک ضرور ہونی چاہیے کہ ہر فرد کی طاقت کے مطابق اس کی ہدایتیں بدلتی چلی جائیں۔ قرآن کریم کے بہت سے احکام میں سے مثلاً روزہ کو لے لو۔ ایک صحت مند بچہ ہے اور نظر آ رہا ہے کہ وہ پہلوان بننے والا ہے لیکن دس سال کی عمر میں خدا تعالیٰ نے اُسے فرمایا کہ روزہ نہیں رکھنا کیونکہ ابھی تم میں روزے کی طاقت پیدا نہیں ہوئی۔ اب امریکہ میں جو نئے تجربے کئے گئے ہیں وَاللّٰهُ اَعْلَمُ کب تک ان کو صحیح سمجھا جائے گا۔ ان تجربات کی رُو سے اٹھارہ سال کی عمر تک انسان کھانے کے اعتبار سے بچہ متصور ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے غذا کا ایک فارمولا بنایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر تک کا بچہ (کھانے کے لحاظ سے وہ بچہ ہے) جس وقت جس چیز کی جتنی مقدار میں خواہش کرے وہ اسے ملنی چاہیے۔ تب اس کی (جسمانی) صحیح نشوونما ہوسکتی ہے اسی واسطے اٹھارہ سال کی عمر سے کم کے بچوں کو عادت ڈالنے کے لئے تو کچھ روزے رکھوانے چاہئیں لیکن ایک مہینہ کے لگا تار روزے نہیں رکھوانے چاہئیں کیونکہ رمضان کے لئے وہ عمر بلوغت نہیں ہے رمضان کا تعلق انسان کی روح سے بھی ہے مثلاً تنویرِ قلب ہوتی ہے۔ رُوح میں روشنی اور بشاشت پیدا ہوتی ہے۔ انسان پر اگر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو جائے تو وہ روحانی طور پر ترقی کر کے کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے۔......

بہرحال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا یَخَافُ رَهَقًا کہ اے انسان! خواہ تیری صحت کیسی ہو! خواہ تیری عمر کتنی ہو! خواہ تیرا ماحول کیا ہو! تیری طاقت کے خلاف یا تیری طاقت سے بڑھ کر بوجھ تمہارے اوپر نہیں ڈالا جائے گا۔ (خطباتِ ناصر جلد ششم صفحہ ۵۰۵ تا ۵۰۷)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تفسیر سورۃ اٰلِ عمران

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آیت ۸، ۹ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۞ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۞

وہی ہے جس نے تجھ پر ایک کامل کتاب نازل کی ہے جس کی بعض آیتیں تو محکم آیتیں ہیں جو اس کتاب کی جڑ ہیں اور کچھ اور ہیں جو متشابہ ہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو فتنہ کی غرض سے اور اس کتاب کو اس کی حقیقت سے پھیر دینے کے لئے ان آیات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو اس کتاب میں سے متشابہ ہیں حالانکہ اس کی تاویل اور تفسیر کو سوائے اللہ کے اور علم میں کامل دستگاہ رکھنے والوں کے کہ جو کہتے ہیں کہ ہم اس کلام پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہی ہے کوئی نہیں جانتا اور عقلمندوں کے سوا کوئی بھی نصیحت حاصل نہیں کرتا۔ اے ہمارے رب تُو ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو کج نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت کے سامان عطا کر یقیناً تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے۔

جیسا کہ ہم احمدی جانتے ہیں قرآن کریم کے بے شمار بطون ہیں اور اس وجہ سے قرآنِ عظیم کی

بڑی شان ہے۔ میں نے ان آیات میں سے ۹ باتیں منتخب کی ہیں جن کے متعلق میں مختصراً کچھ بیان کروں گا.......

جو دو آیات میں نے پڑھی ہیں ان میں سے پہلی کے ساتھ آٹھ باتوں کا تعلق ہے اور پھر آگے دعا ہے۔ پہلی بات جو اس آیت سے ہمیں پتہ لگتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کیا کہ ایک کامل کتاب نازل کی جارہی ہے اور اس کی دلیل یہ دی کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ بھی ہیں اور اٰیٰتٌ مُتَشٰبِهٰتٌ بھی ہیں۔ اس میں قرآن کریم کے کمال کی دلیل دی گئی ہے۔ ایک تو اس میں ایسی آیات ہیں کہ جو ابدی صداقتوں پر مشتمل ہیں۔ ایسی آیات ہیں کہ ظاہری طور پر ان کے دو معنی نہیں ہو سکتے بلکہ ان کے ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں اور وہ کھلی کھلی صداقتیں ہیں مثلاً خدا تعالیٰ کے متعلق جو قرآن کریم نے کہا کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (الاخلاص: ۲) یہ ایک ابدی صداقت ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق بنیادی چیز ہے کہ خدا ایک ایسی ہستی ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ اب اس کی تاویل نہیں ہوسکتی۔ خدا ایک ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ پس اس میں ابدی صداقتیں بھی بیان ہوئی ہیں اور دوسرے اس میں وہ باتیں بھی بیان ہوئی ہیں جن کے ان ابدی صداقتوں کی روشنی میں مختلف معانی ہو سکتے ہیں۔ بہت سے صحیح معانی ہیں جن کے اوپر ابدی صداقتوں کی روشنی پڑتی ہے اور وہ ان کو منور کر رہی ہوتی ہے۔ ایک معنی بھی درست اور دوسرا بھی درست اور تیسرا بھی درست اور ہزارواں بھی درست اور شاید لاکھواں بھی درست کیونکہ خدا تعالیٰ کے جلوے بے شمار ہیں اور یہ اسی کا کلام ہے اس کے اندر بھی اس کے بے شمار جلوے چھپے ہوئے ہیں اور بے شمار اسرارِ روحانی اس کے اندر پائے جاتے ہیں جو اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح پیشگوئیاں ہیں اگر قرآن کریم ایک کامل کتاب نہ ہوتی اور اس کا تعلق قیامت تک پیدا ہونے والے انسان سے نہ ہوتا تو اس میں ایسی پیشگوئیاں بھی نہ ہوتیں جن کا تعلق قیامت تک کے انسان سے ہے اور جن کا تعلق بعد میں آنے والے زمانوں سے ہے اور جیسا کہ قرآن کریم نے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نے، خدا تعالیٰ کی فعلی شہادت نے ہمیں بتایا ہے ساری ہی پیشگوئیاں اپنے اندر اخفا کا کچھ پہلو رکھتی ہیں۔ متشابہات کے بھی یہی معنی ہیں اور اس زمانہ کے حالات، چودھویں صدی کے حالات جو پہلی صدیوں سے مختلف ہیں اس زمانہ کے لئے قرآن کریم کی تفسیر ایسی ہے جس کا تعلق اس زمانہ سے ہے لیکن یہ تفسیر ابدی صداقتوں کی روشنی

میں ہوگی اور آیات محکمات سے باہر نہیں جاسکتی بلکہ وہ ڈیٹرمن (Determine) کرتی ہیں۔ وہ معیّن کرتی ہیں کہ کونسی تاویل یا تفسیر کسی آیت کی درست ہے اور کونسی نہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ایک کامل کتاب ہے جو نوعِ انسانی کو دی گئی ہے اور ہمیشہ کے لئے ان کی رہنمائی کرے گی۔ کبھی ایسا نہیں ہوگا کہ انہیں قرآن کے علاوہ کسی اور ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت پیش آئے۔ قرآن کریم نے آئندہ کی خبریں دی ہیں اور ہر صدی کے متعلق قرآنِ کریم میں پیشگوئیاں پائی جاتی ہیں جو اپنے وقتوں پر ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً چانداور سورج گرہن ہونے کی پیش گوئی تیرہ سو سال کے بعد جا کر پوری ہوئی۔ اب اگر انسان پر قرآن کریم کی حکومت تیرہ سو سال پر پھیلی ہوئی نہیں تھی تو قرآن کریم میں تیرہ سو سال کے بعد پوری ہونے والی کسی پیشگوئی کی ضرورت نہیں تھی اور اگر قرآن کریم کی حکومت قیامت تک پھیلی ہوئی نہیں ہے تو قیامت تک کی پیشگوئیاں اس میں نہیں ہوں گی لیکن قیامت تک پھیلی ہوئی پیشگوئیاں اس میں موجود ہیں۔ قرآن کریم کے نزول پر، اس کامل کتاب کے نزول پر اب قریباً چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ اس کا ماضی بھی عملاً یہ بتاتا ہے کہ مستقبل میں بھی خدا تعالیٰ اس کے ذریعہ سے انسان کے ساتھ یہی سلوک کرے گا کہ نئی سے نئی باتیں قرآن کریم کی پیشگوئیوں کے مطابق ظہور میں آئیں گی اور پیشگوئیاں پوری ہوں گی، جب نئے مسائل پیدا ہوں گے قرآنِ کریم کی نئی تفسیر خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو سکھائے گا، اپنے مقربین اور اپنے محبوب بندوں کو اور پھر وہ ان مسائل کو حل کریں گے۔ پس قرآن کریم میں اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ کے علاوہ اٰیٰتٌ مُتَشٰبِھٰتٌ کا پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم ایک کامل اور مکمل کتاب ہے۔

خدا کہتا ہے کہ یہ ایسی مکمل اور کامل کتاب ہے جس میں مُتَشٰبِھٰتٌ بھی پائی جاتی ہیں اس معنی میں کہ وَ مَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ‍ؔ وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِي الۡعِلۡمِ يَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا۔ اس معنی میں جو متشابہات تھیں، جو قرآن کریم کی عظمت بیان کرنے والی اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعتوں کی طرف اشارہ کرنے والی تھیں منافق انہی متشابہات کی غلط تاویل سے فائدہ اٹھاتا ہے اور جو دنیا کی روشنی کے ذرائع تھے منافق ان کے ذریعے خود اپنے آپ کو بھی اندھیروں میں لے جاتا ہے اور دوسروں کو بھی اندھیروں کی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے اور جو مومن ہے وہ ایسا نہیں کرتا لیکن قرآن کریم نے مُتَشٰبِھٰتٌ سے پہلے مُّحۡکَمٰتٌ کہا ہے کیونکہ پہلے تو اس کی عظمت ہے یعنی ایک کامل

کتاب ہونا اور اس کا مدلل ہونا اور ابدی صداقتوں پر اس کا مشتمل ہونا۔ پس دوسری بات یہ ہے کہ قرآن عظیم میں اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ پائی جاتی ہیں جن میں کوئی استعارہ نہیں اور جو کسی تاویل کی محتاج نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ مُّحۡکَمٰتٌ کے معنی ہیں کہ جن میں کوئی استعارہ نہیں پایا جاتا اور جو کسی تاویل کی محتاج نہیں ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ اس کے اندر ابدی صداقتیں ہیں اور بینات ہیں۔ بَیِّنٰتٌ، مُّحۡکَمٰتٌ ہیں۔ ایک ظاہر چیز ہے جس میں کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ میں ایک ایسی کتاب ہوں جو بالکل مُبِیۡنٌ ہوں، ظاہر ہوں اور کوئی چیز مجھ میں چھپی ہوئی نہیں ہے، وہ ان آیات محکمات کے متعلق ہی کہا گیا ہے۔ یا وہ تفاسیرِ قرآنی جو ان متشابہات سے تعلق رکھتی ہیں جن کا تعلق ماضی سے تھا جس وقت وہ واقع ہو گیا تو وہ مُبِیۡنٌ کے اندر شامل ہو گئیں۔

تیسری بات ہمیں یہ پتہ لگتی ہے کہ قرآن عظیم میں اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ بھی ہیں جو تاویل کی محتاج ہیں۔ ان مُتَشٰبِهٰتٌ کی بہت سی باتیں بعض استعارات کے پردہ میں محجوب ہیں اور اپنے اپنے وقت پر آ کر کھلتی ہیں اور جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا تھا یہ قرآن کریم کی عظمت ہے، بہت بڑی عظمت! کہ وہ ایک ایسا کلام ہے جس نے قیامت تک کے لئے انسان کی بہتری کے سامان کر دیئے۔ ہر صدی کا، ہر زمانے کا، ہر علاقے کا، ہر ملک کا انسان قرآن کریم کا محتاج اور اس کی احتیاج سے وہ کبھی بھی آزاد نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ میں ابھی بتا چکا ہوں مُتَشٰبِهٰتٌ میں پیشگوئیاں بھی ہیں اور مُتَشٰبِهٰتٌ میں قرآن کریم کی وہ تفسیر بھی ہے جو زمانہ زمانہ سے تعلق رکھتی ہے لیکن وہ ابدی صداقتوں کی روشنی میں ہے اس سے باہر نہیں اور ابدی صداقتوں کی ضد نہیں ہے بلکہ ان کی تائید کرنے والی ہے۔ یہ ایک لمبا مضمون ہے میں مختصر کروں گا۔ یہ تین باتیں ہو گئیں۔

چوتھی بات ہمیں یہ پتہ لگتی ہے کہ قرآن کریم ایک عظیم کتاب ہے لیکن پھر بھی جن کے دلوں میں کجی اور نفاق ہے وہ ان آیات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو متشابہ ہیں۔ یہ ان آیات سے پتہ لگتا ہے ایک تو وہ ان آیات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو متشابہ ہیں اور محکمات کی طرف نظر ہی نہیں اٹھا کر دیکھتے یعنی جو چیز واضح ہے، قطعی ہے، جس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں اس کو تو چھوڑ دیتے ہیں اور جس میں تاویل ہو سکتی

ہے، جس کے ایک سے زائد معنی ہو سکتے ہیں، جس کے سیکھنے کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کا فضل نازل ہو تب خدا تعالیٰ خود وہ معانی سکھاتا ہے وہ ان متشابہات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور پھر یہ کہ ان کے پیچھے پڑ کر ایک ایسی تاویل کرتے ہیں جو غلط ہوتی ہے۔ وہ حقیقت سے دور لے جانے والی ہے۔ آیات محکمات سے پرے لے جانے والی، اس کی ضد اور اس سے متضاد ایک تفسیر اور تاویل کر دیتے ہیں اور ان کا جو ارادہ ہوتا ہے، ان کی جو نیت ہوتی ہے وہ بھی شیطانی ہوتی ہے۔ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وہ فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، آیاتِ قرآنیہ کے معانی کو ان کی حقیقت سے دور لے جاتے ہیں اور آیاتِ محکمات کی ضد میں ان سے متضاد ایک معنی کر رہے ہوتے ہیں اور نیت ان کی ہوتی ہے فتنہ پیدا کرنا اور دعویٰ ان کا یہ ہوتا ہے کہ ہم تو صالحین کا گروہ ہیں ہم تو مصلح ہیں، ہم تو اصلاح چاہتے ہیں۔

پانچویں بات اس آیت سے یہ پتہ لگی کہ اٰیٰتٌ مُّتَشٰبِهٰتٌ کی تفسیر اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ۔ خدا نے اعلان کر دیا کہ متشابہات کی تفسیر خدا کے سوا اور کوئی جانتا ہی نہیں۔ کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اپنی عقل یا فراست سے قرآن کریم کی اٰیٰتٌ مُّتَشٰبِهٰتٌ یعنی متشابہ آیات کی تفسیر کر سکتا ہوں۔ کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ سوائے خدا تعالیٰ کے ان کی تاویل کوئی نہیں جانتا۔

لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ انسانوں میں سے وہ گروہ جو میرے ساتھ تعلق رکھنے والا ہے وہ گروہ جو علم میں کامل دستگاہ رکھنے والا ہے۔ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ بطونِ قرآنی کو جانتے ہیں۔ یہ اعلان کیا خدا تعالیٰ نے کہ اللہ کے سوا کوئی جانتا نہیں اور جو علم میں کامل دستگاہ رکھنے والے ہیں وہ بطونِ قرآنی کو جانتے ہیں۔

اور ساتویں بات ہمیں یہ پتہ لگی کہ وہ اس لئے جانتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یہ اسرارِ روحانی سیکھتے ہیں۔ وہ اس کلام پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا اور ان کا یہ اعلان ہوتا ہے کہ ہم اپنی طرف سے تفسیر نہیں کر رہے بلکہ ان اٰیٰتٌ مُّتَشٰبِهٰتٌ کی تفسیر خدا تعالیٰ ہمیں سکھاتا ہے اور تب ہم بتاتے ہیں۔ کوئی انسان اپنی طاقت سے اپنے زور سے اپنی فراست اور اپنی عقل سے اٰیٰتٌ مُّتَشٰبِهٰتٌ کی صحیح تفسیر بیان ہی نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا

فضل اس کے اوپر نازل ہو اور خدا تعالیٰ کی رحمت کے نتیجہ میں وہ یہ تفسیر سیکھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے نتیجہ میں وہ رَاسِخٌ فِی الْعِلْمِ بن جائے۔

خدا تعالیٰ سے علم حاصل کرنے کے لئے قرآن پر کامل ایمان ضروری ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن کامل نہیں وہ شخص اللہ تعالیٰ سے تفسیر سیکھ ہی نہیں سکتا۔ اٰمَنَّا بِهٖ ہم اس کلام پر ایمان لائے۔ ہم ایمان لائے کہ یہ کامل کتاب ہے اور اس بات پر بھی ایمان لائے کہ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا یعنی جو اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور جو اٰيٰتٌ مُتَشٰبِهٰتٌ ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور وہ ذات وہ ہستی جس کی ذات اور صفات میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا اس کے کلام میں بھی کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ اس بات پر وہ ایمان لاتے ہیں اور خدا تعالیٰ ان کو ایسے معانی سکھاتا ہے جو قرآن کریم کے دوسرے حصوں سے متضاد نہیں۔ وہ تفسیر نہ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ سے متضاد ہے اور نہ اٰيٰتٌ مُتَشٰبِهٰتٌ کے ان دیگر معانی سے متضاد ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو یا کسی اور کو اس زمانہ میں یا کسی اور زمانہ میں سکھائے کیونکہ اس کی ذات میں اور اس کے علم میں تضاد نہیں ہے اور اس کی سکھائی ہوئی تعلیم میں بھی تضاد پیدا نہیں ہو سکتا۔

جس کو یہ چیز مل گئی، خدا تعالیٰ کی رحمت جس کی معلم بن گئی اس کو کامیابی کی ہر کلید مل گئی۔ آج صبح میں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک چھپی ہوئی کتاب میرے سامنے پڑی ہے اس کا جو سرورق ہے یعنی پہلا صفحہ جس پر نام لکھا ہوتا ہے اس کا اوپر کا حصہ تو میری نظر نے نہیں پکڑا لیکن اس کے نیچے فارسی کا ایک بڑا عجیب شعر ہے وہ شعر مجھے بھول گیا لیکن اس کے بعض الفاظ مجھے یاد ہیں اور مفہوم پوری طرح یاد ہے۔ وہ شعر نور یست سے شروع ہوتا ہے اور پہلا مصرع ختم بھی نور یست پر ہوتا ہے۔ پہلے مصرع کے معنی یہ ہیں کہ نور تو وہ نور ہے جو ایسے شخص کو ملے جو اپنے نفس پر، اپنی ذات پر ایک موت وارد کرتا ہے اور فنا فی اللہ ہو جاتا ہے وہ نور، نہ کہ سعیٔ بسیار، کلیدِ کامرانی ہے یہ دوسرے مصرعے میں ہے۔ دوسرے مصرعے کے شروع میں سعیٔ بسیار اور آخر میں کلیدِ کامرانی ہے۔ انسانی تدابیر اور انتہائی کوشش کامیابی کی چابی نہیں، کامیابی کی چابی یہ ہے کہ اپنے اوپر ایک موت وارد کر لینے کے بعد، فنا فی اللہ ہو جانے کے بعد انسان کو ایک نور عطا ہو جائے۔ پھر وہ جس میدان میں بھی قدم اٹھاتا ہے کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے۔

اس آیت کے معاً بعد جو دوسری آیت ہے یعنی رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا اس میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ دیکھو اتنی عظیم کتاب اتنی شاندار کتاب اتنی وسعتوں والی کتاب کہ جس کی حکومت بعثتِ نبویؐ سے اور نزولِ قرآن سے لے کر قیامت تک پھیلی ہوئی ہے کج دل لوگ اس کو بھی اپنی اور دوسروں کی (جس پر ان کا اثر ہوتا ہے) ہلاکت کا باعث بنا دیتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی رحمت سے جو علم حاصل کیا جائے اس کے سوا باقی ہر چیز متشابہ نہیں بلکہ مشتبہ ہے اور بلندیوں کی طرف لے جانے والی نہیں بلکہ گہرائیوں میں گرانے والی ہے۔ اور یہاں جو ذکر ہے کہ جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ وہ لوگ نہیں ہیں جو اسلام پر ایمان ہی نہیں لائے بلکہ ایمان لانے کے بعد کجی پیدا ہوئی اور یا پھر ان کی سابق کجی دور نہیں ہوئی، دونوں شکلیں ہوتی ہیں۔ اتنی عظیم کتاب ہے اور وہ ان کے دلوں کی کجی دور نہیں کر سکی ان کی شامتِ اعمال کی وجہ سے، ان کی بدقسمتی کی وجہ سے، ان کی ذہنی بیماری کی وجہ سے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم اپنے زور سے صراطِ مستقیم پر بھی نہیں چل سکتے اور کجی سے بھی محفوظ نہیں رہ سکتے بلکہ اس کے لئے بھی دعا کی ضرورت ہے۔ اس واسطے نفاق سے اور دل کی کجی سے محفوظ رہنے کے لئے یہ دعا کیا کرو کہ:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔

(خطباتِ ناصر جلد ہفتم صفحہ ۱۱۱ تا ۱۱۸)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کتاب هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے اس میں اس طرف اشارہ کیا کہ تقویٰ کے بلند مقام پر پہنچنے کے باوجود انسان کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی ضرورت رہتی ہے اور اس ضرورت کو یہ قرآن پورا کر رہا ہے۔ متقیوں کے لئے ہدایت کا سامان اس کے اندر پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مضمون کو دعائیہ الفاظ میں دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے کہ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا کہ ہدایت تیرے فضل سے ہمیں حاصل ہو جائے پھر بھی یہ خطرہ لاحق رہے گا کہ ہمارے دلوں میں کسی قسم کی کجی نہ پیدا ہو جائے۔ پس ہم تیرے حضور عاجزانہ دعا کے ذریعہ جھکتے ہیں اور یہ التجا کرتے ہیں کہ جب ہمیں ہدایت حاصل ہو جائے، صراطِ مستقیم ہمیں مل جائے، ہمارے دل سیدھے ہو جائیں، تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں کوئی کجی نہ پیدا ہو۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اسی خطرہ کی طرف بارہا متوجہ کیا ہے میں ایک مختصر سا اقتباس اس وقت دوستوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں آپ فرماتے ہیں:۔

”بعض ایسے بھی ہیں کہ اوّل ان میں دل سوزی اور اخلاص بھی تھا مگر اب ان پر سخت قبض وارد ہے اور اخلاص کی سرگرمی اور مریدانہ محبت کی نورانیت باقی نہیں رہی بلکہ صرف بَلْعَمْ کی طرح مکاریاں باقی رہ گئی ہیں اور بوسیدہ دانت کی طرح اب بجز اس کے کسی کام کے نہیں کہ منہ سے اکھاڑ کر پیروں کے نیچے ڈال دیئے جائیں۔ وہ تھک گئے اور درماندہ ہو گئے اور نابکار دنیا نے اپنے دام تزویر کے نیچے انہیں دبا لیا۔ سو میں سچ سچ کہتا ہوں کہ وہ عنقریب مجھ سے کاٹ دیئے جائیں گے۔ بجز اس شخص کے کہ خدا تعالیٰ کا فضل نئے سرے اس کا ہاتھ پکڑ لیوے۔ ایسے بھی بہت ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے ہمیشہ کیلئے مجھے دیا ہے اور وہ میرے درخت وجود کی سرسبز شاخیں ہیں“۔ (فتح اسلام۔ روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۰)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان الفاظ میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ ہدایت پا لینے کے بعد اس وہم میں مبتلا ہو جانا کہ اب ہمارے لئے ابتلاء آ ہی نہیں سکتا اور شیطان کا ہم پر کامیاب وار ممکن ہی نہیں یہ غلط ہے۔ متقی بن جانے کے بعد بھی انسان کو ہدایت کی ضرورت رہتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی کہ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا اس میں اس طرف بھی اشارہ کیا کہ کجی سے بچنے اور ہدایت پر قائم رہنے کیلئے جن ہدایتوں کی، جن تعلیمات کی ضرورت ہے وہ قرآن کریم میں پائی جاتی ہیں۔ پس ایسے مواقع کے لئے جو دعائیں قرآن کریم نے سکھائی ہیں جو طریق اس نے بتائے ہیں جو تعلیمیں اس نے دی ہیں ان سے فائدہ اُٹھاؤ اور دعاؤں کے ذریعہ اور تدبیر کے ذریعہ یہ کوشش کرو کہ ہدایت پانے کے بعد پھر پاؤں نہ پھسلے اللہ تعالیٰ کی رضا کی جنت میں داخل ہونے کے بعد کہیں ایسا نہ ہو کہ رضا کی ان جنتوں سے نکال دئے جاؤ۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۳۰،۳۱)

آیت ۱۵ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۵﴾

خواہشات نفسانی کا ذکر بہت سی جگہ قرآن کریم میں آیا اور یہ بتایا گیا ہے کہ جو شیطانی اثر ہیں

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ اَہوائے نفس خوبصورت کر کے دکھائے جاتے اور ان کا پیار شیطان انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے۔

هَوٰی کا لفظ اس سے ملتے جلتے معنی کا ہے۔ اَہوائے نفس بھی ہم کہتے ہیں۔ خواہشات نفس بھی ہم کہتے ہیں۔ هَوٰی کے معنی ہیں مَيْلُ النَّفْسِ اِلَى الشَّهْوَةِ شہوت کی طرف، خواہشات کی طرف انسان کا میلان جو ہے عربی میں اسے اَلْهَوٰی کہتے ہیں۔ مفردات راغب میں آیا ہے وَقَدْ عَظَّمَ اللّٰهُ ذَمَّ اِتِّبَاعِ الْهَوٰی کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی بڑی اہمیت بیان کی اور اس پر بڑا زور دیا کہ اتّباع الهوى۔ خواہشات نفسانی کی اتباع بڑی مذموم چیز ہے، بہت بُری چیز ہے، بہت گندی چیز ہے۔ بڑا زور دیا گیا ہے اس پر اور قرآن کریم کا دعویٰ تھا کہ مَیں ہر چیز کھول کھول کے بیان کرنے والا ہوں، قرآن کریم نے بہت جگہ شہوات نفسانی جن کو ترک کرنے کا حکم ہے ’’ہجرت‘‘ میں۔ اور یہ اہواء جو ہیں ان کے جو مضرات ہیں جس وجہ سے اس کی برائی کی گئی ہے اللہ تعالیٰ کے کلام میں، ان کے اوپر روشنی ڈالی گئی ہے۔ میں نے اس خطبہ میں چند باتیں ان آیات قرآنی میں سے لی ہیں کہ شہوات نفسانی کی اتباع کرنے والے کس قسم کی محرومیوں میں خود کو ڈالنے والے اور اللہ تعالیٰ کے کن انعاموں سے وہ محروم ہو جاتے ہیں۔

اس مضمون کے تعلق میں (اَہوائے نفس یا خواہشات نفس یا شہوات نفس ایک ہی چیز ہے) پہلی چیز یہ بتائی گئی ہے کہ روحانی رفعتوں کے حصول سے شہوت نفس یا اَہوائے نفس محرومی کا باعث بن جاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ نے سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۷ میں بیان کیا ہے۔ وَ لَوْ شِئْنَا اگر ہم چاہتے تو اسے رفعتیں اور بلندیاں عطا کرتے۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں (تلاوت کرتے ہوئے میرے ذہن میں آیا کہ بالکل یہ معنی ہیں) وَ لَوْ شِئْنَا اگر ہماری مرضی پر وہ چلتا (’’ہم چاہتے‘‘ تبھی ہوتا نا جب ہماری مرضی پر چلتا) لَرَفَعْنٰهُ اُسے روحانی رفعتیں حاصل ہو جاتیں لیکن وہ ہماری مرضی پر نہیں چلا بلکہ اَہوائے نفس کی اس نے اتباع کی وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وہ زمین پر گر پڑا رفعتیں حاصل کرنے کی بجائے۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ یہ قرآن کریم کا ہے اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ رفعتوں سے محرومی اسے ملی اور زمین پہ اسی طرح، زمین کا کیڑا جس طرح زمین پہ چل رہا ہوتا ہے وہ اس کی حالت بن گئی۔

انسان زمینی گراوٹ کے لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ انسان کو مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا

لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریٰت:۵۷) (کی آیت جس کی طرف اشارہ کرتی ہے) آسمانوں کی بلندیوں کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت دی امّت مسلمہ کو کہ جب تم میں سے کوئی عاجزی، انکساری اور تواضع کی راہوں کو اختیار کرے گا رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَى السَّمَآءِ السَّابِعَةِ (کنزالعمال جلد ۲ صفحہ ۲۵) ساتویں آسمان کی بلندیاں اسے حاصل ہو جائیں گی۔

یہاں یہ فرمایا اگر وہ ہماری مرضی کی راہوں کو اختیار کرتا لَرَفَعْنٰهُ ہم نے اس کے لیے بلندیاں مقدّر کیں ہوئی تھیں لیکن اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وہ تو زمین پر گر پڑا، زمین کا کیڑا بن گیا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ اور اپنے اَہوائے نفس کی اتباع اس نے کرنی شروع کر دی۔

دوسری چیز جس سے کہ حصول میں روک بنتی ہے اتباع اَہوائے نفس وہ یہ ہے۔ شہوات نفسانی کی پیروی کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب ہوتی ہے۔ سورۃ الانعام آیت ۱۵۱ میں اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اَہوائے نفس کی اتباع کا، پیروی کا مرتکب ہوگا اتنا ظلم کر رہا ہوگا اپنے نفس پر کہ اللہ تعالیٰ نے جو آیات اس کی بہتری کے لیے نازل کی ہیں ان کی وہ تکذیب کر رہا ہے۔ اَہوائے نفس کی پیروی تکذیب آیات باری ہے۔ یہ اعلان کیا گیا ہے۔ ’’آیات‘‘ جو ہیں قرآن کریم میں دو معنی میں استعمال ہوئی ہیں۔ دنیوی انعامات مثلاً ایٹم کے ذرّے میں وہ طاقت جو آج انسان نے معلوم کی اور روحانی انعامات جو اللہ تعالیٰ نازل کرتا ہے اور فرمایا ہے کہ موسلا دھار بارش کے قطروں کی طرح میری آیات، انعامات جو ہیں، نعماء جو ہیں وہ تم پر نازل ہو رہی ہیں۔ ہر آیت کا انکار ہو رہا ہے۔ ایٹم کے ذرّے ہی کو لو جو انسان کی بھلائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے تخلیق کی اسے انسان کی تباہی کے لیے استعمال کرنے کے ہتھیار بنا لئے۔ تو اہوائے نفس کا نتیجہ تکذیب آیات اور ناشکری آیاتِ باری کی ہے۔

تیسرے یہ کہ خواہشات نفس کی جو پیروی کرے وہ اللہ تعالیٰ کی دوستی اور اس کی مدد اور پناہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ سورۃ الرعد کی آیت ۳۸ میں یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ بڑا سخت نقصان ہے یہ۔ اس دنیا کی دوستیاں تو تم دیکھتے ہو روز آج دوستی ہے کل دشمنی میں بدل جاتی ہے۔ جس کو آج سر پہ اٹھایا کل اسے زمین پر گرا دیا۔ جس کے لیے آج اپنی جانیں لاکھوں کی تعداد میں قربان کرنے لیے تیار ہو گئے، اس کی جان لے لی اگلے روز تو خواہشات نفس کی پیروی اللہ کی

دوستی اور اس کی پناہ سے محروم کر دیتی ہے۔

اور چوتھی بات یہ بتائی گئی کہ گری ہوئی خواہش کی پیروی اختیار کرنا، ہوائے نفس کی پیروی اختیار کرنا دل کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیتا ہے پھر تو ''میں ہی میں'' ہو جاتا ہے نا۔ انانیت جوش مارتی ہے۔ یہ خواہش ہے، پوری ہونی چاہیے۔ وہ خواہش ہے، پوری ہونی چاہیے۔ ایک اور خواہش ہے وہ پوری ہونی چاہیے۔ جب خواہشات کی اتباع شروع ہوگئی تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ پھر خواہشات کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ جو سب سے زیادہ امیر اس وقت ہماری دنیا میں پایا جاتا ہے اس کے دل میں پھر بھی یہ خواہش ہے کہ کچھ اور مال مجھے مل جائے لیکن جو خدا کے بندے ہیں وہ مال لٹایا کرتے ہیں، فقیر بن کے ہاتھ پھیلایا نہیں کرتے۔ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے جھکنے والے ہیں، غیر اللہ کے سامنے جھکنے والے نہیں ہوا کرتے اور قرآن کریم سورۃ الکہف کی آیت ۲۹ میں یہ مضمون بیان کرتا ہے کہ گری ہوئی خواہش کی پیروی اختیار کرنے والا انسان ایسا دل رکھتا ہے جو اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے اور جو دل ایک لحظہ کے لیے اپنے ربّ کی یاد سے غافل ہوا اس نے ہلاکت مول لی۔

پانچویں بات خدا تعالیٰ نے، پانچواں پہلو اس کا یہ بتایا ہے کہ ہوائے نفس کی پیروی اختیار کرنے سے ایمان بالآخرت جاتا رہتا ہے یعنی قیامت پر ایمان کہ ایک اور زندگی ہوگی جہاں جواب طلبی ہوگی، جہاں انعامات ملیں گے، جہاں ایک ابدی زندگی عطا کی جائے گی، جہاں ایسی جنتیں ہونگی جن کی نعماء کا حسن اور نور اور لذت ہمارے جسمانی اعضا اور حواس جو ہیں وہ سوچ بھی نہیں سکتے، ہماری عقل میں نہیں آسکتے۔ تو ہوائے نفس کی پیروی اختیار کرنا آخرت اور قیامت پر ایمان لانے میں روک بن جاتا ہے۔ پھر ایسا شخص جو اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑا ہوا ہے، وہ کہتا ہے یہی زندگی سب کچھ ہے، جو کچھ جس طریق سے مل سکے حاصل کرو اور وہ اپنی روح کو، اپنے وجود کو ان جنتوں سے محروم کر دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے پیدا کیں جو قرآن کریم کی اتباع اس رنگ میں کرتے ہیں جس رنگ میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھائی۔

(خطباتِ ناصر جلد نہم صفحہ ۲۹۹ تا ۳۰۲)

آیت ۲۰ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۫ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۲۰

آج کل قرآن کریم پڑھنے اور سکھانے کے لئے (اس سے متعلق دوسرے مضامین بھی اس میں پڑھائے جاتے ہیں) جو کلاس یہاں جاری ہے اس کے سامنے میں نے یہ بات رکھی تھی کہ اس محبت کی وجہ سے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھی اور ان بشارتوں کے طفیل جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے دیں اور اسلام کے عالمگیر غلبہ کی پیشگوئیاں (جو آپ کے ایک روحانی فرزند کے ذریعہ پوری ہونی تھیں) آپ کو عطا کیں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قرآن کریم کے ایسے علوم سکھائے کہ عقل دنگ اور حیران رہ جاتی ہے۔ اس اصولی بات کو سمجھانے کیلئے میں نے کلاس کے سامنے قرآن کریم کی ایک آیت کا ٹکڑا رکھا تھا اور وہ یہ تھا۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ میں نے بتایا تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت کے ٹکڑے کے بڑے ہی لطیف حسین اور عجیب مختلف اور متعدد معانی کئے ہیں جو تفسیری معانی ہیں۔ اس سلسلہ میں مَیں نے کلاس کے سامنے جو باتیں اس وقت تک بیان کر دی ہیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:۔

''اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ یعنی سب دین جھوٹے ہیں مگر اسلام''

(ضمیمہ انجام آتھم روحانی خزائن جلد ۱۱ صفحہ ۳۱۴)

۲۔ اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ کے یہ معنی ہیں۔

''دین سچا اور کامل اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہے اور جو کوئی بجز اسلام کے کسی اور دین کو چاہے گا وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں زیاں کاروں میں سے ہوگا''۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۸۵)

۳۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ کے یہ معنی ہیں کہ

''اسلام کے سوا اور کوئی دین قبول نہیں ہوسکتا اور یہ نرا دعویٰ نہیں تاثیرات ظاہر کر رہی ہیں کہ اگر کوئی اہل مذہب اسلام کے سوا اپنے مذہب کے اندر انوار و برکات اور تاثیرات رکھتا ہے تو پھر وہ آئے ہمارے ساتھ مقابلہ کر لے''۔ (الحکم ۱۷/نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۷)

میں نے انہیں یہ بتایا تھا کہ قرآن کریم کی یہ روحانی تاثیرات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ختم نہیں ہوگئیں بلکہ آپ کے بعد آپ کی جماعت میں جو سلسلہ خلافت قائم کیا گیا ہے اس سے بھی یہ وابستہ ہیں اور آج بھی یہ دعوت مقابلہ قائم ہے۔

۴۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت کے چوتھے تفسیری معنی یہ کئے ہیں کہ

''وہ دین جس میں خدا کی معرفت صحیح اور اس کی پرستش احسن طور پر ہے وہ اسلام ہے''۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۱۵)

۵۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک معنی یہ کئے ہیں کہ

''سچا اسلام یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی ساری طاقتوں اور قوتوں کو مادام الحیات وقف کر دے تا کہ وہ حیات طیبہ کا وارث ہو''۔ (الحکم ۱۶/اگست ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

۶۔چھٹے معنی اس آیت کے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ کئے ہیں کہ

''اسلام کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اس کی تمام طاقتیں اندرونی ہوں یا بیرونی سب کی سب اللہ تعالیٰ ہی کے آستانہ پر گری ہوئی ہوں''۔

(حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدت الوجود پر ایک خط)

۷۔ساتویں معنی اس آیت کے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ کئے ہیں کہ:۔

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو سچا دین جو نجات کا باعث ہوتا ہے اسلام ہے''۔

(الحکم ۲۴/اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

۸۔آٹھویں معنی اس آیت کے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ کئے ہیں کہ

''سچے اسلام کا یہ معیار ہے کہ اس سے انسان اعلیٰ درجہ کے اخلاق پر ہو جاتا ہے اور وہ ایک ممیز

شخص ہوتا ہے‘‘۔ (البدر ۱۴؍نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۳)

ان معانی پر میں نے نسبتاً تفصیلی (بہت تفصیل سے بھی نہیں اور بہت اختصار سے بھی نہیں) روشنی ڈال کر اپنے بچوں اور بھائیوں کو بتایا تھا کہ کس طرح علم کا ایک دریا ہے جو بہتا چلا جاتا ہے چونکہ اور بھی بہت سے معانی ہیں جو رہ گئے ہیں اس لئے ان میں سے بعض کے متعلق میں اس خطبہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

۹۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ کے یہ معنی ہیں ’’اسلام اس بات کا نام ہے کہ قرآن شریف کی اتباع سے خدا کو راضی کیا جاوے۔‘‘

(البدر ۱۶؍اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

جو دین مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے اور جو شریعت کامل ہے وہ قرآن کریم میں ہے پس اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ میں یہ فرمایا کہ اگر تم اپنے ربّ کو راضی کرنا چاہتے ہو اگر تم اس کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو اگر تم اس سے تعلق محبت قائم کرنا چاہتے ہو تو تمہارے لئے صرف یہی راہ ہے کہ قرآن کریم کی پوری اتباع کرو اور اس یقین پر قائم ہو جاؤ کہ ہماری تمام روحانی، اخلاقی، دینی اور دنیوی ضرورتوں کو پورا کرنے کے سب سامان قرآن کریم میں موجود ہیں اور اگر ہم ان روحانی اسباب سے فائدہ اٹھائیں اور ان پر عمل کریں تو ہم اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کی تفصیل میں جانے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ پہلوں نے اپنے رنگ میں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے مقام کے مطابق اس کی بڑی وضاحت سے اپنی کتب اور تقاریر میں تشریح کی ہے قرآن کریم ایک کامل اور مکمل شریعت ہونے کی وجہ سے ہماری تمام روحانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے تمام ان راستوں کی نشان دہی کرتا ہے جن پر چلنا ضروری ہے ہر وہ بات ہمیں سکھاتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے اور ہر وہ بات ہمارے سامنے وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ جس کو اگر ہم اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو مول لینے والے ہو جائیں یعنی قرآن کریم نے کامل اور مکمل طور پر احکام کو بیان کیا ہے اوامر کو بھی کھول کر ہمارے سامنے رکھا ہے اور نواہی پر بھی روشنی ڈالی ہے یعنی اس نے بتایا ہے کہ یہ کام نہیں کرنا ورنہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے گا غرض قرآن شریف کی اتباع اور صرف قرآن شریف کی اتباع ہی ہے جس سے ہم اپنے رب کو راضی

کر سکتے ہیں۔

۱۰۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دسویں تفسیری معنی اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ کے یہ کئے ہیں کہ

''اسلام اس بات کا نام ہے کہ بجز اس قانون کے جو مقرر ہے اِدھر اُدھر بالکل نہ جاوے''۔ (البدر ۱۳؍مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۵۹)

پہلے معنی یہ تھے کہ جو راستہ دکھایا گیا ہے اس پر چلو اب دوسرے معنوں میں بتایا گیا ہے (گو یہ معنی اپنی ترتیب کے لحاظ سے دسویں ہیں لیکن نویں معنی اور یہ معنی دونوں پہلو بہ پہلو کھڑے ہیں) کہ قرآن کریم کے علاوہ کسی اور راہ کو اختیار نہ کریں، نہ عقیدہ میں بدعت، نہ عبادت میں بدعت نہ عمل میں بدعت۔ قرآن کریم سے باہر نہ جائیں جو صراط مستقیم قرآن کریم نے بتایا ہے اس کے علاوہ کسی راہ کو اختیار نہ کریں اپنی طرف سے اپنے پر مشقتیں نہ ڈالیں ہر قسم کی روحانی، ایمانی، عملی بدعتوں سے پرہیز کریں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے بھی بعض بزرگ ایسے ہوئے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علاقہ میں بدعات کے خلاف جہاد کرنے کا حکم فرمایا اور توفیق عطا کی کہ وہ کامیابی کے ساتھ بدعات کے خلاف جہاد کریں بدعت کا تعلق سارے احکام قرآن کے ساتھ ہو جاتا ہے بعض بدعات ایسی ہیں جو ہوائے نفس یا شیطانی اثر کے نیچے نماز کے ساتھ لگ گئی ہیں اسی طرح روزے کی بدعتیں بھی ہیں اسی طرح حج کی بدعتیں بھی ہیں اسی طرح زکوٰۃ کی بدعتیں بھی ہیں ہر حکم جو خدا تعالیٰ نے ہمیں دیا شیطان نے پوری کوشش کی کہ اس کے ساتھ کچھ ایسی چیزیں بعض لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دے کہ جو حقیقت سے دور اور خالص بدعت ہیں۔ پس اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ کے یہ معنی ہیں کہ جو قانون اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے اس سے زائد، اس سے باہر، اس کے مخالف کوئی قانون نہیں بنانا کیونکہ نہ عقلاً (اگر اپنے عقائد پر صحیح طور پر قائم ہوں تو ہماری عقل بھی یہی کہے گی) نہ شرعاً کوئی ایسی چیز عمل یا عقیدہ قرب الٰہی تک پہنچا سکتی ہے جس کا حکم قرآن حکیم نے نہ دیا ہو کیونکہ قرآن کریم ایک مکمل شریعت کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے لیکن بہت سی بدعتیں عبادات ہیں، بہت سی بدعتیں ایمانیات کے متعلق آہستہ آہستہ ہم میں آ گئیں اور خدا تعالیٰ کے بندے چودہ سو سال میں کھڑے

ہوتے رہے ان کے ذمہ خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ کام لگایا گیا کہ ان بدعتوں کو پکڑو اور حقیقت و صداقت سے جھٹکا دے کر علیحدہ کرو اور پرے پھینک دو ان کی مخالفتیں بھی ہوئیں، ان کو ایذائیں بھی پہنچیں، اِن کو دکھ بھی دیئے گئے، ان پر افتراء بھی باندھے گئے، ان پر اتہام بھی لگائے گئے لیکن خدا کے وہ پیارے بندے خدا کے حکم کے ماتحت اس فرض کو ادا کرتے رہے جو ان کے کندھوں پر ڈالا گیا تھا۔ غرض اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ کے ایک معنی یہ ہیں کہ کتاب اللہ کے برخلاف جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب بدعت ہے اور اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۱۱۔ گیارھویں معنی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ کئے ہیں کہ

''یہ اسلام ہے کہ جو کچھ خدا کی راہ میں پیش آوے اس سے انکار نہ کرے''۔

(البدر ۱۲ر دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۳)

یہ تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک فقرہ میں اس ٹکڑہ کے تفسیری معنی کئے ہیں لیکن جہاں آپ نے یہ تفسیری ترجمہ کیا ہے وہاں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مختلف قسم کی تکلیفیں اور مشقتیں اور دکھ سہنے پڑتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے متعدد جگہ اس پر روشنی ڈالی ہے ایک مشقت شریعت کی ہے مثلاً یہ مستحب بلکہ بڑا اچھا ہے کہ جس نے مقام محمود ظلی طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل حاصل کرنا ہو اسے تہجد کی نماز ادا کرنی چاہیے لیکن اگر سردی ہو تو لحاف سے نکلنا بڑی مشقت طلب بات ہے لیکن وہ اپنے رب کی رضا کے حصول کے لئے کوئی پرواہ نہیں کرتا اور اس کی عبادت تنہائی کی گھڑیوں میں دنیا سے پوشیدہ رہتے ہوئے بجا لاتا ہے اور صرف اس لئے بجالاتا ہے کہ اس کا رب اس سے خوش ہو جائے یا مثلاً گرمی کا موسم ہو گرمی میں نیند کا بہت کم وقت ملتا ہے اور انسان کو ضروری کاموں کے بعد سونے کے لئے بمشکل دو اڑھائی گھنٹے ملتے ہیں میں نے دیکھا ہے کہ میں صبح کی نماز سے قبل بمشکل ڈیڑھ سے اڑھائی گھنٹے تک سو سکتا ہوں دوست کہتے ہیں کہ آپ صبح کی نماز کے بعد سویا نہ کریں صحت اچھی رہے گی لیکن وہ میرے حالات کو جانتے نہیں میں اگر صبح کی نماز کے بعد نہ سوؤں تو میں بیمار ہو جاؤں کیوں جتنی نیند قانون قدرت کے مطابق مجھے لینی چاہیے وہ پوری نہ ہو اس لئے مجبوراً مجھے سونا پڑتا ہے۔

اسی طرح نماز کی پابندی ہے نماز باجماعت کے لئے پانچ وقت مسجد میں جانا بہر حال مشقت طلب

ہے اس سے انکار نہیں پھر روزہ ہے اس میں بھی مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے زکوٰۃ ہے اس میں بھی مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ انسان (اگر وہ مثلاً زمیندار ہے) سوچتا ہے کہ راتوں کو میں جاگا ہل چلائے کھیتوں میں پانی دیا جب ساری دنیا سائے کی تلاش میں تھی میں دھوپ میں خدا تعالیٰ کے رزق کی تلاش میں گہائی کر رہا تھا دانے نکال رہا تھا میں سارا دن دھوپ میں بیٹھا رہتا تھا اب یہ پیسہ جو مجھے ملا ہے یہ میں کسی اور کو دے دوں؟ شیطان آ کر کہتا ہے کہ قربانیاں ساری تم نے دیں پھر تم اس پیسہ کو کسی دوسری جگہ خرچ کیوں کرو لیکن وہ یہ سوچتا ہے کہ میرے رب نے مجھے توفیق دی کہ میں رزق حلال کے حصول کے لئے یہ مشقت برداشت کروں اور میں اپنے رب سے دعا کرتا ہوں کہ اس مشقت سے حاصل شدہ جو مال ہے اس سے میں صرف اس دنیا کا فائدہ حاصل نہ کروں بلکہ اُخروی زندگی کا بھی فائدہ حاصل کروں وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقِ۔

پس ایک یہ مشقّت ہے جو انسان کو دوسری دنیا کے فوائد کے حصول کے لئے برداشت کرنی پڑتی ہے اگر اس کی نیت نیک ہو جس وقت وہ گرمی میں جا کر اپنی کھیتی باڑی کا کام کر رہا ہوتا ہے اس کے دماغ میں یہ آیت آ رہی ہوتی ہے قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا (التوبہ :۸۱) یعنی اس گرمی سے زیادہ وہ گرمی ہے اس سے بچاؤ کی کوئی صورت کرنی چاہیے اگر وہ نیت کرے تو باقی سب چیزیں تو جیسے پنجابی میں کہتے ہیں ’’جھونگے وچ مل جان گیاں‘‘ اصل چیز یہی ہے کہ خدا کی رضا کو حاصل کیا جائے اور گرمی میں اس لئے برداشت نہیں کرتا کہ میرے بچے یا میں پیٹ بھر کر کھاؤں بلکہ یہ مَیں اس لئے برداشت کرتا ہوں کہ اس کے نتیجہ میں جو مال حلال مجھے ملے اس کا ایک بڑا حصہ خدا کی راہ میں خرچ کروں اور دوسری زندگی میں اپنے لئے آرام کی جنتوں اور رضا کی جنتوں اور رحمتوں کی جنتوں کے سامان کر لوں ایک مشقت تو یہ ہے اور ایک مشقت ہے حوادث زمانہ کی اللہ تعالیٰ قانون قدرت کے مطابق انسان کو ابتلاء میں ڈالتا ہے بعض کو اس کی مصلحت سمجھ آتی ہے اور بعض کو سمجھ بھی نہیں آتی مثلاً جوان بچہ فوت ہو گیا اب یہ ایک حادثہ ہے یا مثلاً ایک زمیندار نے روئی اکٹھی کی تھی کسی حادثہ کی وجہ سے اس کو آگ لگ گئی اور مالی نقصان ہو گیا اس طرح کے ہزاروں حوادث ہیں جو کبھی آندھی کی شکل میں آتے ہیں کبھی مینہ کی شکل میں آتے ہیں کبھی وباؤں کی شکل میں آتے ہیں کبھی اس قسم کے حادثات پیش آتے ہیں کہ مثلاً شادی کرنے جا رہے تھے کہ رستہ میں موٹر کا ایکسیڈنٹ (Accident) ہو جاتا ہے اور

دولہا مرجاتا ہے یا دلہن مرجاتی ہے یہ ساری حوادث زمانہ کی تکلیفیں ہیں ایک مومن بندہ اپنے رب پر اعتراض نہیں کرتا بلکہ جس وقت اس قسم کا حادثہ اسے پیش آئے وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پڑھ رہا ہوتا ہے وہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھ رہا ہوتا ہے۔ اپنے خالق کے لحاظ سے وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حادثہ خواہ میرے لئے کتنا تکلیف دہ ہو مگر اس کے نتیجہ میں میرے ربّ کے اوپر کوئی حرف نہیں آتا اس کی حمد اور اس کی تعریف اسی طرح قائم ہے اس لئے وہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے جسم کو، میرے دل کو، میرے دماغ کو، میری آنکھوں کو ایسا بنایا ہے کہ جوان بیٹا اگر مرجاتا ہے تو دل میں درد بھی اٹھتا ہے، آنکھوں میں آنسو بھی آتے ہیں دماغ میں پریشانی بھی پیدا ہوتی ہے مگر اِنَّا لِلّٰهِ ہم سب اللہ کے ہیں یہ بھی اللہ کا تھا اللہ نے اسے اپنے پاس بلا لیا میں بھی اللہ کا ہوں اور ایک دن میں بھی اس کے پاس چلا جاؤں گا خدا اگر اپنی رحمت کے سامان پیدا کرے تو میں اور میرا بیٹا اس کی جنتوں میں پھر اکٹھے ہو جائیں گے چند دن چند سال یا کچھ عرصہ اس ملاپ کے لئے انتظار کرنا اور خدا کی خاطر اور اس کی رضا کے حصول کے لئے کرنا کوئی بڑی قربانی نہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ غرض ایک مشقت تکلیف اور دکھ انسان کو حوادث زمانہ کے نتیجہ میں برداشت کرنا پڑتا ہے اور ایک وہ دکھ ہے جو الٰہی سلسلوں کے مخالفین پہنچاتے ہیں ایک مسلمان کو اس ابتلا میں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ دیکھو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ تھوڑی تعداد میں تھے غریب تھے جنگ کی کوئی تربیت انہیں نہیں تھی ان کے پاس جنگ کا کوئی سامان نہ تھا اچھی تلواریں نہیں تھیں گھوڑے نہیں تھے کچھ بھی نہ تھا اور دشمن نے یہ سمجھا کہ ان نہتوں اور بے بسوں کو ہم اچھی تلواروں کے استعمال سے کاٹ کے رکھ دیں گے اور فنا اور نابود کر دیں گے تب اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کو کہا کہ میری خاطر ان تکالیف کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور میرا تم سے یہ وعدہ ہے کہ تم کمزور سہی تم غریب سہی تم نہتے سہی تم بے سروسامان سہی لیکن میں تمہاری پیٹھ کے پیچھے کھڑا ہوں گا اس لئے تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں آخر غلبہ تمہیں حاصل ہوگا۔

غرض کئی قسم کے دکھ ابتلا اور مشقت انسان کو خدا کی راہ میں پیش آتی ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ جو کچھ خدا کی راہ میں پیش آئے اس سے انکار نہ کرے اور آپ نے یہ فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر آپ کے سوانح پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ

نظر آتا ہے کہ آپ نے خدا کی راہ میں اپنی جان کی کبھی پرواہ نہیں کی جنگ بدر میں جب کفار مکہ مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے تھے تو آپ مدینہ میں نہیں بیٹھے رہے بلکہ جس طرح دوسرے مسلمان میدان میں گئے آپؐ بھی میدان میں گئے اور آپ ہی سب سے زیادہ دشمن کے حملہ کا نشانہ ہوتے تھے کیونکہ دشمن یہ جانتا تھا کہ اگر اس ایک شخص (علیہ السلام) کو (نعوذ باللہ) ہم نے قتل کر دیا تو پھر کسی اور کوشش کی ضرورت نہیں رہے گی اسلام ختم ہوجائے گا صحابہؓ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے اور تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ شدید تر حملہ دشمن کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ہوتا تھا اور بہادر ترین صحابہؓ وہ سمجھے جاتے تھے جو آپؐ کے قرب میں رہتے تھے مثلاً حضرت ابوبکرؓ کے متعلق تاریخ گواہی دیتی ہے کہ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ یہ سب سے زیادہ بہادر شخص ہے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب میں رہنا چاہیے لیکن آپ کوئی تدبیر اپنی حفاظت کی نہیں کرتے تھے آپ کے پاس دنیوی سامان ہی کیا تھا؟ تدبیر کیا کرنی تھی بہرحال آپ نے اپنی عصمت اور حفاظت کا کوئی سامان نہیں کیا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ چونکہ آپ اپنا سب کچھ خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور اپنی زندگی اور اپنی موت اور اپنا ہر سانس اور عبادتیں وغیرہ سب کچھ خالص خدا تعالیٰ ہی کے لئے سمجھا اس یقین کے ساتھ کہ یہ اللہ کا حق ہے جو اسے دیتا ہوں میرا اپنا تو کچھ بھی نہیں جانتے ہو خدا تعالیٰ نے اس کے جواب میں کیا کیا؟ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ خدا نے کہا وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدۃ:۶۸) چونکہ آپ ہر وقت اپنی جان اپنے رب کے حضور پیش کر رہے تھے اس لئے خدا نے کہا میں تمہاری حفاظت کا ذمہ دار ہوں اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت کے ساتھ اور نہایت ارفع شان کے ساتھ اس بات کو دنیا کے سامنے ظاہر کر دیا کہ خدا تعالیٰ ہی آپ کا محافظ اور معین اور آپ کو بچانے والا تھا دشمن کا کوئی حربہ آپ کے خلاف کارگر نہیں ہوا اور آپ کے نفس کو، آپ کی ذات کو، آپ کے جسم کو خدا تعالیٰ نے بچایا اور محفوظ رکھا نیز آپ کی اُمت کو بھی اپنی حفاظت میں رکھا۔

دنیا میں بڑے بڑے انقلاب بپا ہوئے بعض ملکوں سے اسلام مٹایا گیا یہ تو درست ہے لیکن یہ کہ اسلام دنیا سے مٹ جائے اس میں کبھی بھی شیطان کامیاب نہیں ہوا نہ ظاہری طور پر نہ روحانی طور پر کیونکہ اُمت مسلمہ میں ہر وقت اور ہر زمانہ میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قرب کو

حاصل کرنے کے بعد اس کی سکھائی ہوئی ہدایت اور اس کے بتائے ہوئے علوم قرآنیہ کے نتیجہ میں اسلام کی شمع کو روشن رکھتے رہے ہیں کبھی تعداد کم تھی اور کبھی زیادہ لیکن کوئی زمانہ ایسا نہیں کہ جس کے متعلق تاریخ نے یہ شہادت نہ دی ہو کہ اس زمانہ میں خدا کے نیک بندے اسلام کے جھنڈے کو بلند کر رہے تھے کتنی عظیم عصمت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی کہ آپ نے کہا خدا کی راہ میں قربانی دینے سے میں ہچکچاتا نہیں اور اپنی حفاظت کرنے کی مجھے ضرورت نہیں کیونکہ آپ نے اپنے نفس پر شفقت نہیں کی اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ پر انتہائی شفقت کی اسی طرح جو لوگ احکام قرآنی کے بجالانے میں اپنے نفسوں پر شفقت نہیں کرتے مثلاً یہ نہیں کہتے کہ باہر ٹھنڈ ہے ہم گرم کمرہ میں بڑے آرام سے لیٹے ہوئے ہیں ہم لحاف سے باہر کیوں نکلیں وہ یہ نہیں کہتے کہ کمرہ میں ٹھنڈ ہے اور باہر اتنی شدید گرمی ہے باہر نکلا تو بیمار ہو جاؤں گا اس لئے میں ظہر کی نماز کے لئے مسجد میں کیوں جاؤں وہ یہ نہیں کہتے کہ خدا نے رزق دیا ہے اس کو استعمال کرنا چاہیے ہم رمضان کے مہینہ میں بھی دوسرے مہینوں کی طرح خوب کھائیں گے اور شیطان یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے تمہیں اپنے آپ کو محروم نہیں کرنا چاہیے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی عطا سے ایک خاص وقت کے اندر اپنے آپ کو محروم کرتا ہے وہ خدا کے حکم سے کرتا ہے کیونکہ اصل عطا جو خدا سے کسی کو حاصل ہوتی ہے وہ کامل اطاعت اور فرماں برداری کی عطا ہے وہ اس ذہنیت کی عطا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی عطا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو نہیں ملتی کہ وہ خوشی اور بشاشت کے ساتھ ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کرتا چلا جائے۔غرض احکام کی بجا آوری، نواہی سے پرہیز حوادث زمانہ کی تکلیفوں اور مخالف طاقتوں سے جو دکھ پہنچتے ہیں ان کو خندہ پیشانی اور بشاشت سے قبول کرنا چاہیے خدا کی راہ میں جو پیش آئے اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے کوئی یہ نہ کہے کہ مجھے نہیں منظور اور موسیٰ علیہ السلام کی امت کی طرح مثلاً یہ نہ کہے کہ ایک کھانے سے تو تسلی نہیں ہوتی بہت سے کھانوں کا انتظام کیا جائے ہمیں بھی تربیت کے لئے حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ نے ایک کھانے کی تلقین کی ہوئی ہے یہ صحیح ہے کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے بعض گھروں میں ایک سے زائد کھانے پک جاتے ہیں طبائع میں اتنا اختلاف ہے کہ ہمارے بعض بچے گوشت کھاتے نہیں اور ہمیں اس سے بعض دفعہ تکلیف بھی ہوتی ہے اور ان کے لئے دال بہرحال پکانا پڑتی ہے میں بھی گھر میں دو تین کھانے پکے ہوں تو ایک کھانا جو مجھے پسند آ

جائے اور میری طبیعت کے موافق ہو لے لیتا ہوں اور کھا لیتا ہوں ہمارا ایک بچہ ہے وہ گوشت بالکل نہیں کھاتا وہ دال لے لے گا یا دال کی بجائے آلو کا بھرتہ لے لے گا اور اسے کھائے گا بہر حال یہ بھی ایک مشقت ہے بظاہر یہ ایک معمولی چیز ہے لیکن انسان کا نفس اسے دھوکہ دیتا ہے اور اسے کہتا ہے تو یہ نہ کر تو تکلیف میں کیوں پڑتا ہے؟ بہر حال خدا کی راہ میں جو بھی مشقت تکلیف اور دکھ برداشت کرنا پڑے خوشی اور بشاشت سے اسے برداشت کرے اور ''نہ'' نہ کرے بعض لوگ ''نہ'' کر کے ایک اور قسم کی مشقت اپنے اوپر ڈال لیتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو احکام الٰہی کی بجا آوری اور نواہی سے بچنے کے لئے مشقت برداشت نہیں کرتے اور اپنے جذبات کو قربان نہیں کرتے اللہ تعالیٰ ان سے اور قسم کی قربانی لے لیتا ہے ایک شخص اپنے بچہ کی صحیح تربیت نہیں کرتا وہ غافل ہوتا ہے۔ کہتا ہے ''وڈے ہو کے آپے عادت ہو جاوے گی ہن اس نوں صبح نماز دے واسطے کیوں جگاواں'' یا دوپہر کی گرمی میں ''نماز دے واسطے مسجد وچ کیوں بھیجاں آپے جدوں سیانا ہو جاوے گا نماز پڑھ لیا کرے گا'' حالانکہ ماں کے لئے تو چالیس سال کا آدمی بھی بچہ ہوتا ہے بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے اچھا تم میرے لئے اس بچہ کو مشقت میں نہیں ڈالنا چاہتے اور یہ جذبات کی قربانی ہے (ماں بھی جذبات کی ایک قربانی دے رہی ہوتی ہے) جو تم میری خاطر نہیں کرنا چاہتے۔ تمہارے لئے یہ بچہ ابتلا بن گیا ہے میں اس ابتلا کو تمہارے ساتھ کیوں رکھوں میں اسے اٹھا لیتا ہوں چنانچہ وہ اسے موت دے دیتا ہے پھر دھوپ کی گرمی اور صبح کی نیند کہاں جاتی ہے۔

غرض جو لوگ خود کو خدا کے دین کی راہ میں آنے والی مشقتوں کے سامنے خوشی سے پیش کر دیتے ہیں اور دکھ اٹھا لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان دکھوں سے کہیں بڑے دکھوں سے انہیں محفوظ کر لیتا ہے اور جو ایسا نہیں کرتے ان کی اصلاح کے لئے دوسرے سامان پیدا کرتا ہے کیونکہ بغیر امتحان کے، بغیر ابتلاؤں کی برداشت، بغیر دکھوں کے اٹھانے کے کوئی شخص خدا تعالیٰ کی رضا کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے ایمان کا امتحان لینا ضروری ہے۔

۱۲۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ کے بارھویں معنی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ کئے ہیں کہ ''اسلام ایک موت ہے جب تک کوئی شخص نفسانی جذبات پر موت وارد کر کے نئی زندگی نہیں پاتا اور خدا ہی کے ساتھ بولتا، چلتا، پھرتا، سنتا، دیکھتا نہیں وہ مسلمان نہیں ہوتا''۔ (الحکم ۱۷؍جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

یہاں آپ نے یہ فرمایا کہ دین حقیقی وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل فرماں برداری کی جائے اور اس کی کامل فرماں برداری کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو اپنے نفسانی جذبات قربان کرنے پڑتے ہیں اور اپنے نفس پر ایک موت وارد کرنی پڑتی ہے اور خدا تعالیٰ نے چونکہ کہا ہے عِنْدَ اللّٰهِ یعنی جب وہ جذبات پر موت وارد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس قربانی کو قبول کرتا ہے اور جب وہ قربانی قبول کرتا ہے تو وہ کیا کرتا ہے؟ پھر اس کے ہاتھ باقی نہیں رہیں گے نہ اس کی آنکھیں باقی رہیں گی نہ اس کے جوارح اپنے رہیں گے اس کے جذبات پر موت وارد ہو جائے گی اور جذبات ہی ہیں جو جوارح کو حرکت میں لاتے ہیں مکھی میرے منہ پر آ کر بیٹھتی ہے اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں سے جو گدگدی ہوتی ہے وہ مجھے برداشت نہیں اس لئے جب میں تنگ آ جاتا ہوں تو میرا ہاتھ فوراً اٹھتا ہے اور اس مکھی کو اڑا دیتا ہوں یہ میں ایک جذبہ کے ماتحت ہی کرتا ہوں اور جس وقت اللہ تعالیٰ کے لئے ایک انسان اپنے نفس پر موت وارد کر لیتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کہتا ہے اے میرے بندے! تو نے اپنے جذبات پر میرے لئے، میری رضا کے حصول کے لئے ایک موت وارد کر لی ہے۔ میں تجھے ایک نئی زندگی دیتا ہوں اب تو مجھ میں ہو کے بولے گا مجھ میں ہو کے سنے گا مجھے میں ہو کے تو اپنے ہاتھوں کو حرکت دے گا اور مجھ میں ہو کے تیرے پاؤں آگے قدم بڑھائیں گے وہ جس طرف بھی اُٹھیں گے وہ میری ہی طرف ہوگی کیونکہ نفس پر تو موت وارد ہوگئی ہے غرض اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ کے ایک معنی یہ ہیں کہ نفس کو پوری طرح کچل دیا جائے کوئی جذبہ اپنا نہ رہے تمام جذبات نفسانی خدا تعالیٰ کے ماتحت ہو جائیں اس کے لئے قربان ہو جائیں اس کے قدموں میں گر جائیں ایک موت وارد ہو جائے اور بندہ اپنے ربّ سے یہ امید رکھے کہ وہ ایک نئی زندگی اس کے بدلہ میں عطا کرے گا۔

غرض حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کریم کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کی جو اس طرح تفسیریں کی ہیں ان پر جب ہم غور کرتے ہیں اور ان کی وسعت اور گہرائی ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ تَبَارَكَ مَنْ عَلَّمَ وَتَعَلَّمَ

(خطبات ناصر جلد دوم صفحہ ۲۱۸ تا ۲۲۸)

ہمارا مذہب اسلام ہے اسی نام سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امّت کے متعلق پہلوں کو

اطلاع دی گئی تھی۔ اسلام کے ایک لغوی معنی ہیں اور ایک اصطلاحی معنی ہیں۔ ہر لفظ تو ہم نہیں کہہ سکتے لیکن ایک زبان کے بہت سے الفاظ لغوی معنے بھی رکھتے ہیں اور اصطلاحی معنے بھی رکھتے ہیں۔ اصطلاحی معنی لغوی معنی کو محدود کرتا ہے۔

اسلام کے لغوی معنے ہیں کسی چیز کا پہلے مول دے دینا، سودا کر لینا، قیمت دینا، وصول کرنا، دراصل تجارت دونوں طرف سے ہی ہے یا کسی کو اپنا آپ سونپ دینا یا صلح کرنا اور لڑائی جھگڑا دور کرنا ان معنوں میں عربی زبان اسلام کے لفظ کو استعمال کرتی ہے۔ (خطبات ناصر جلد پنجم صفحہ ۴۵)

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (اٰلِ عمران:۲۰) بعثت نبوی کے بعد (صلی اللہ علیہ وسلم) دین تو اب ایک ہی رہ گیا جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کہہ کر اس آیت میں پکارا ہے اور کوئی اس کے علاوہ دین نہیں، کوئی ایسی ہدایت جو قرآن کریم سے متضاد ہو یا اس سے مخالف ہو یا اس سے مختلف ہو ایسی نہیں جو انسان کو ان راہوں کی طرف ہدایت دے سکے جو راہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کی طرف لے جانے والی ہیں۔ اس اعتقاد پر ہم احمدی کھڑے کئے گئے ہیں اور اس اعتقاد پر ہم احمدی قائم ہیں کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ .....

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ خدا تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی دین ہے۔ اسلام کے علاوہ اور کوئی دین نہیں اور ہم احمدی اپنے دین پر قائم ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اس راستہ سے ہٹا نہیں سکتی۔ زبردستی کر کے نمازیں نہیں چھڑوا سکتی۔ ہم سے روزے نہیں چھڑوا سکتی نیز دیگر جو سات سو احکام ہیں انہیں نہیں چھڑوا سکتی اور وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا (اٰلِ عمران:۸۶) جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین پسند کرے گا وہ اپنے لئے یا کسی اور کے لئے فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ (اٰلِ عمران:۸۶) دینِ اسلام کے سوا کوئی اَور دین خدا تعالیٰ کو مقبول نہیں ہے، پسندیدہ نہیں ہے۔ وَ ھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (اٰلِ عمران:۸۶) اور وہ قیامت کے دن گھاٹے میں پڑے گا۔

(خطباتِ ناصر جلد نہم صفحہ ۷۳ تا ۷۸)

آیت ۲۱ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ

وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۱﴾

سورۃ آل عمران کی اس آیت سے قبل جو آیت ہے اس کو اس طرح شروع کیا گیا ہے کہ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (اٰل عمران:۲۰) کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک اصل دین اس کی کامل فرمانبرداری ہے اور آیت کا جو حصہ میں نے پڑھا ہے اس کے شروع میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ دین کے معاملہ میں جھگڑا کریں تو انہیں اپنے عملی نمونہ سے بتاؤ کہ تمہارا دین کیا ہے اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ تم اپنا سارا وجود خدا کے لئے سونپ دو اور اپنا سب کچھ اس کے حضور پیش کر دو اور جس طرح ہمارا اللہ ربّ العالمین ہے اے اس کے ماننے والو! تم خادم العالمین بن جاؤ۔ یہاں ایک بڑا لطیف نکتہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک تو علمی بحثیں ہوتی ہیں لیکن دین کے معاملہ میں علمی بحثوں کے علاوہ اور ان سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انسان اپنے عملی نمونہ سے اپنے مقام پر قائم ہو۔

اللہ تعالیٰ نے دین کی روح اور اس کی اصل اور اس کی بنیاد یہ بتائی ہے کہ انسان اللہ کے لئے اور اللہ میں فنا ہو کر اپنی زندگی کو گذارے۔ کامل فرمانبرداری، ایک ایسی اطاعت جو اس کے معمولی سے معمولی حکم سے بھی باہر لے جانے والی نہ ہو، وہ اطاعت جو کامل ہو، وہ اطاعت جو انسان کے وجود کا اس کے اعمال کا اس کے خیالات کا اس کی سوچ کا اور اس کی عادات کا احاطہ کئے ہوئے ہو، اللہ کی ایسی اطاعت کرنا یہ اصل چیز ہے جو خدا تعالیٰ کے حضور پیش کرنی چاہیے۔ پہلے آنے والے مذاہب کا بھی یہی مطالبہ تھا کہ جو خدا کہتا ہے وہ مانو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے جو کامل اور مکمل شریعت انسان کو دی گئی اس کا بھی یہی مطالبہ ہے کہ جو خدا کہتا ہے اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالو۔ فرق یہ ہے کہ پہلوں کے زمانہ میں خدا تعالیٰ نے ان کی استعدادوں اور طاقتوں کو دیکھتے ہوئے پورا بوجھ ان کے کندھوں پر نہیں ڈالا تھا کیونکہ وہ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ (اٰل عمران : ۲۴) یعنی شریعتِ کاملہ محمدیہ کا صرف ایک حصہ انہیں دیا گیا تھا لیکن جو بھی دیا گیا تھا اس کے متعلق ان سے مطالبہ یہ تھا کہ جو تم سے کہا جاتا ہے وہ تم کرو اور جو ان سے کہا جاتا تھا وہ ایسے احکام تھے جو کامل نہیں تھے کیونکہ اس وقت وہ کامل احکام کے بوجھ کو اُٹھانے کے قابل نہیں تھے ان میں اتنی استعداد نہیں تھی۔ پھر جب انسان کامل شریعت کو اُٹھانے کے قابل ہو گیا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک

کامل شریعت اس کے سامنے رکھی اور جو کہا جاتا ہے وہ کرو کی شکل بدل گئی لیکن مذہب کی جو روح تھی وہ وہی رہی کہ جو خدا کہتا ہے وہ کرو۔

ایک لحاظ سے یہ چیز آسان بھی ہے اسی واسطے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے فارسی کلام میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ خدا کو پالینا تو ایسا مشکل نہیں ہے وہ جان مانگتا ہے جان دے دو (کامل اطاعت) کامل اطاعت سے انسان اللہ تعالیٰ کے ان فضلوں کا وارث بن جاتا ہے جن کے متعلق خدا کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ اس اطاعت کے نتیجہ میں وہ اس پر نازل ہوں گے۔ پہلوں پر وہ فضل نازل نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ جو ان سے کہا گیا تھا جو ان سے مانگا گیا تھا۔ جس کا ان سے مطالبہ کیا گیا تھا وہ اس سے بہت کم تھا جس کا مطالبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اُمت یعنی نوعِ انسانی سے کیا ہے لیکن پہلوں سے جو کہا گیا تھا، جو ان سے مطالبہ کیا گیا تھا وہ لوگ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے پیروکار یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو ماننے والے اگر اُن مطالبات کو پورا کرتے جو اُن سے کئے گئے تھے تو وہ اُن فضلوں کے وارث بن جاتے جو ان مطالبات کے پورا کرنے اور کامل فرمانبرداری کے نتیجہ میں ان کو ملنے تھے اور جن کی بشارت ان کو دی گئی تھی۔ پھر ایک ایسی شریعت جس نے انسانی فطرت کا احاطہ کیا ہوا ہے اور فطرت کے عین مطابق ہے اور ایک کامل شکل میں انسان کے تمام قویٰ کو طاقت دینے کی اہلیت رکھنے والی ہے۔ پوری کی پوری شریعت جو انسان کے لئے مقدّر تھی وہ ایک کامل اور عظیم ہستی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انسان کو ملی اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ اسلام لاؤ یعنی خدا میں فنا ہو کر اپنے سارے وجود کو اُس کے سُپرد کر دو پھر تمہیں اتنے فضل ملیں گے کہ پہلوں کا تصور بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ قرآن کریم کی اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ لوگوں کو کہہ دے کہ میں تو اپنے تمام وجود کو خدا کے حضور پیش کرنے والا ہوں اور جو میرے حقیقی متبع ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری کرنے والے ہیں لیکن چونکہ انسان اپنے اندر بشری کمزوریاں بھی رکھتا ہے اس واسطے ذَکِّرْ کا حکم ہے کہ قرآن کریم نے جو مطالبے کئے ہیں، چھوٹے چھوٹے بھی اور بڑے بڑے بھی ان کی یاددہانی ہوتی رہے ورنہ انسان بھول جاتا ہے، اس کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔ شیطان وساوس پیدا کر دیتا ہے اور عملی کمزوریاں پیدا ہو جاتی

ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اعتقاداً بڑے ہی مخلص احمدی ایسے بھی ہیں جو اعمال کی طرف توجہ نہیں کر رہے لیکن اعتقادی لحاظ سے وہ اتنے مخلص ہیں کہ اگر اعتقاد پر جان دینے کا موقع ہو تو وہ اپنی جان بھی دے دیں گے اور سب کچھ قربان کر دیں گے لیکن عملاً خود ان کی زندگیوں میں سستی پائی جاتی ہے۔ یہ اندرونی تضاد اور کنٹراڈکشن (Contradiction) ہے اور اندرونی تضاد کامیابی تک نہیں پہنچاتا۔ (خطباتِ ناصر جلد ششم صفحہ ۳۷۷ تا ۳۷۹)

آیت ۳۲، ۳۳ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝

محبت اور دشمنی کے بنیادی اصول ان دو آیات میں بیان کئے گئے ہیں۔ خدا تعالیٰ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتا ہے کہ یہ اعلان کر دو اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تمہارا یہ دعویٰ اسی صورت میں سچا ثابت ہوگا کہ میری پیروی کرو۔ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے قصور تمہیں بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ تو کہہ کہ اتباعِ نبوی میں یہ صداقت مضمر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے ہوئے تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہو اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی بھی اطاعت کرتے ہو لیکن اگر وہ یہ بات نہ مانیں اور اپنی محبت یا دشمنی کی بنیاد اس بنیاد پر نہ رکھیں کہ کفر کے نتیجہ میں محبت باری سے محرومی اور اتباع کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا حصول ہے تو انہیں جاننا چاہیے کہ کافروں سے تو اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ میں ایک دعویٰ کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ وہی کرے گا جو حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔ حقیقی معنی میں وہی کرے گا۔ ویسے جو دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے ہیں دعویٰ ظاہری طور پر وہ بھی کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کے خواہاں ہیں۔ یہاں اس دعویٰ کے ساتھ اس آیت کا جو مضمون ہے وہ یہ بات بھی بتا رہا ہے کہ ہر مقصود کے حصول کے لئے ایک

سیدھا راستہ ہے صراطِ مستقیم ہے۔صرف روحانی مقاصد کے حصول کے لئے نہیں بلکہ دنیا کی زندگی میں مقصد دنیوی ہو یا دینی اس زندگی سے تعلق رکھنے والا ہو یا اخروی زندگی سے تعلق رکھنے والا ایک راہ سیدھی ہے جو اس مقصد کے حصول کے لئے خدا تعالیٰ نے معین کی ہے اور اس راہ پر چلے بغیر انسان وہاں پہنچ نہیں سکتا، اپنے مقصد کو حاصل نہیں کرسکتا۔ جو شخص مثلاً ربوہ سے سرگودھا جانا چاہے اگر وہ لائل پور کی، فیصل آباد کی سڑک پر ادھر منہ کر کے فیصل آباد کی طرف، چلنا شروع کردے تو وہ سرگودھا نہیں پہنچے گا۔ خدا تعالیٰ نے ہر مقصد کے حصول کے لئے ایک معین راستہ مقرر کیا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے کلام کی اصطلاح میں صراطِ مستقیم ہے تو اللہ تعالیٰ یہاں یہ فرماتا ہے کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم خدا سے پیار کرتے ہو اور خدا کا پیار لینا چاہتے ہو۔ تمہیں سوچنا چاہیے کہ خدا کا پیار کن راہوں پر چل کر یا کس صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر تمہیں مل سکتا ہے۔ یہ کامل اور مکمل کتاب انسان کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے آتی اور اسے کہتی ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کروایا کہ اگر تم خدا تعالیٰ کی محبت حاصل کرنا چاہتے ہو فَاتَّبِعُوْنِيْ۔

فَاتَّبِعُوْنِيْ میں دراصل تین باتیں بیان ہوئیں ہیں۔ ایک تو اس میں یہ اعلان ہے کہ تمہارا ابھی یہ دعویٰ ہے کہ تم خدا کا پیار حاصل کرنا چاہتے ہو اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی دعویٰ کہ مجھے خدا کا پیار چاہیے۔ دوسری بات یہاں یہ بیان ہوئی ہے کہ خدا تعالیٰ کے پیار کے حصول کے لئے خود اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سیدھی راہ بتائی جو اس کی رضا اور اس کے پیار تک پہنچاتی ہے اور تیسرے یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس راہ پر گامزن ہو کر اپنے مقصد کو حاصل کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے انتہائی پیار کو وصول کرنے والے ہیں یہ تین باتیں فَاتَّبِعُوْنِيْ کے اندر بیان کی گئی ہیں۔

تو بتایا یہ گیا کہ دیکھو تمہارے دل میں بھی تڑپ ہے کہ خدا کا پیار حاصل کرو تمہاری اپنی استعداد کے مطابق وہ تڑپ اور وہ جذبہ تھا۔ میرے دل میں بھی تڑپ تھی کہ میں خدا کے پیار کو اور اس کی محبت کو حاصل کروں۔ میرا یہ جذبہ اور میری یہ خواہش میری اپنی استعداد اور طاقت کے مطابق تھی۔ نزولِ قرآن سے پہلے ہی آپ خدا کے حضور جھکتے اور دعائیں کرنے والے تھے اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ پھر خدا نے میری اس تڑپ کو دیکھ کے مجھے ایک راستہ بتایا اور کہا کہ اس راستے

پر چل۔تو میرے پیار کو حاصل کرے گا۔خدا کے حکم سے مَیں نے وہ راہ اختیار کی اور خدا کے فضل سے میں نے خدا کی رحمتوں کو اور اس کی رضا کو اور اس کے پیار کی جنتوں کو حاصل کیا۔اس قدر وسعت کے ساتھ اور قوت کے ساتھ گہرائیوں والی محبت انتہائی طور پر جو محبت انسان کرتا ہے وہ مَیں نے کی خدا سے اور خدائے عظیم خدا تعالیٰ جو جلال والا اور قدرتوں والا ہے اس نے اس قدر نعمتیں مجھے دے دیں کہ انسان کے تصور میں بھی وہ نہیں آ سکتیں۔

تو فَاتَّبِعُوْنِيْ میرے دل میں تڑپ تھی۔ مجھے ایک راہ دکھائی گئی۔ مجھے کہا گیا اس پہ چلو خدا کو پالو گے اس کے پیار کو پالو گے۔ میں اس راہ پر چلا۔آپ کی طرف سے یہ اعلان قرآن کریم نے کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے شہادت دی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یہ ہے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ (الانعام:۵۱) یہاں تو یہ تھا میری اتباع کرو۔ وہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا، خدا تعالیٰ کی شہادت کے طور پر ہے یہ، اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ میں تو صرف اس وحی کی اتباع کرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر نازل ہوتی ہے اس کے علاوہ اور کسی چیز کے پیچھے نہیں لگتا۔تو کامل اتباع کا اعلان خدا تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم میں کروایا کہ یہ اعلان کردو تو خدا جب کہتا ہے اعلان کرو تو خدا تعالیٰ شہادت دے رہا، گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ یہ سچی بات ہے، یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ خدا تعالیٰ کی شہادت اس پر گواہی دے رہی ہے کہ جو وحی نازل ہوئی اس سے ایک ذرہ بھر نہ دائیں ہٹے نہ بائیں ہٹے۔ وہ ایک سیدھا راستہ تھا اس پر آپ گامزن ہوئے۔ اس کو چھوڑا نہیں۔ اس کو ایک لحظہ کے لئے بھی فراموش نہیں کیا اور اس پر چلنے میں کوئی سستی اور غفلت نہیں برتی اور آخر خدا تعالیٰ کی محبت کو پالیا اور پایا بھی اس شان کے ساتھ اس عظمت کے ساتھ، اس رفعت کے ساتھ، اس وسعت کے ساتھ کہ آپ سے پہلے کسی نبی نے خدا تعالیٰ کی اس قسم کی محبت کو حاصل نہیں کیا تھا۔

تو یہاں یہ تین باتیں میں کہہ رہا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں اور یہ دلیل دی ہے کہ تمہارے دل میں اگر واقعہ میں خدا تعالیٰ کے لئے پیار ہے تو اس پیار کا جو مطالبہ ہے وہ یہ ہے کہ تم خدا تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کا نمونہ یہ ہے کہ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۲) ایک کامل نمونہ تمہارے سامنے ہے جس نے ہر حکم کی پورے طور پر سچے طور پر اپنے سارے دل کے ساتھ اطاعت

کی اور وہ حکم بجالائے ان کی اتباع کرو یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ جس طرح حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ۔ خدا تعالیٰ کی وحی کی اتباع کر کے خدا تعالیٰ کے پیار اور محبت کو حاصل کیا تھا۔ تم بھی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چل کر خدا تعالیٰ کی نازل ہونے والی قرآن کریم کی شکل میں وحی کے مطابق زندگی گزار کے خدا تعالیٰ کے پیار کو حاصل کرلو گے۔

وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور شان اور ہے۔ آپ کے علاوہ ہر امتی جو ہے آپ کی اتباع کرنے والا اس میں کمزوریاں بھی ہوں گی، تڑپ بھی ہوگی، خدا سے ملنے کی لیکن بشری کمزوریاں بھی سرزد ہوں گی گھبرائے گا وہ۔ اسے ایک بشارت کی ضرورت ہے آگے سے آگے بڑھنے کے لئے اور وہ بشارت یہاں دے دی گئی۔ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ تمہارے قصور تمہیں بخش دے گا اگر اصرار نہ کرو گے تو بہ کرو گے۔ اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے۔

فرمایا اعلان کردو اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ کہ اِتَّبِعُوۡنِیۡ جب کہا گیا تو اس کے معنی ہی یہ ہیں یعنی کہا یہ گیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو اللہ تعالیٰ کا پیار تمہیں حاصل ہوجائے گا۔ آگے قرآن کریم نے ہی اس کی تفسیر کی کہ اِتَّبِعُوۡنِیۡ میں جس اتباع کا ذکر ہے اس کے معنی یہ ہیں اَطِیۡعُوا اللّٰہَ خدا تعالیٰ کی کامل اطاعت کرو اور اس رنگ میں اطاعت کرو وَ الرَّسُوۡلَ رسول کی اطاعت کرو اس رنگ میں اطاعت کرو جس رنگ میں رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کی وحی کی اطاعت کی۔ یہ ہے محبت جو انسان خدا تعالیٰ سے کرتا ہے اور یہ ہے جزا محبت کے رنگ میں جسے انسان خدا تعالیٰ سے حاصل کرتا ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے ہمیں۔ لیکن جو اس راستے پر چلنے سے انکار کرے لَا یُحِبُّ الۡکٰفِرِیۡنَ تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی دشمنی وہ مول لے گا اور خدا تعالیٰ اسے اپنا دشمن سمجھے گا۔

تو دوستی محبت یا دشمنی اور عداوت اس رنگ میں ہے قرآن کریم کے نزدیک، میں نے بتایا یہ اصولی اور بنیادی چیز ہے جو یہاں بیان کی گئی ہے کہ محبت کرنا خدا سے اس معنی میں ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوہ بنا کر آپ کے نقشِ قدم پر چلا جائے اور اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت کی جائے۔ اسی رنگ میں جس رنگ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی کامل اطاعت کی۔ اس فرق کے ساتھ کہ انہوں نے اپنی استعداد اور قوت کے مطابق اپنے رب کی اطاعت کی اور آپ کے متبعین نے اپنی اپنی قوت اور استعداد کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنی ہے لیکن کرنی ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کے نقشِ قدم پر چل کے۔ یہ تو وہ محبت ہے جسے اسلام بتا تا ہے۔ محبت خدا سے، محبت خدا کے رسول سے کامل اتباع کامل محبت کے نتیجے میں ہی پیدا ہوگی نا۔

فَاتَّبِعُوْنِيْ میں ایک اور اعلان کیا گیا تھا یعنی کامل اطاعت کرو خدا کی محبت حاصل کرنے کے لئے اور کامل اتباع تم کر نہیں سکتے جب تک مجھ سے بھی کامل محبت نہ کرو تو یہاں دو محبتیں ہیں۔ ایک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا اس لئے کہ خدا کی نگاہ میں آپ کی عظمت بہت شان رکھتی ہے اور آپ کے نقشِ قدم پر چلنا اس کے لئے کہ اس طرح پر اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق خدا تعالیٰ کا پیار حاصل کیا جا سکے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے مطابق زندگی نہیں گزارنا چاہتا لیکن خدا سے پیار کرنا چاہتا ہوں خدا کا پیار حاصل کرنا چاہتا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ اعلان کیا ''تم خدا کا پیار حاصل نہیں کرو گے۔'' اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ جو اس بتائے ہوئے طریق کا انکار کرتا ہے وہ خدا کی دشمنی مول لیتا ہے۔ اس کی محبت حاصل نہیں کرتا۔

قرآن کریم نے متعدد جگہ اس کی تفسیر میں یہ بتایا کہ یہ یہ یہ چیزیں ہیں، اعمال ہیں جن کے نتیجے میں خدا تعالیٰ کا غضب بھڑکتا ہے۔ وہ میں بتاؤں گا ان آیات کو جب لوں گا کہ اس میں یہ بھی ہے کہ یہ وہ باتیں ہیں جن سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر پرہیز کرتے رہے۔ آپ کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو اس قسم کا ہو کہ جو خدا کو پسند نہیں خدا تعالیٰ نے بہت سی باتیں بتائیں اور کہا کہ جو اس قسم کے ہیں اعمال ان سے خدا محبت کرتا ہے۔ مثلاً فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (البقرۃ:۱۹۶) اعمال صالحہ کو احسن رنگ میں جو بجالاتے ہیں خدا تعالیٰ ان سے پیار کرتا ہے۔ یہ بھی ایک عام اصولی بات ہے لیکن اس کی نسبت تفصیلی بات ہے اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھی لیکن وہ تو تفصیل ہے اس وقت میں بتا یہ رہا ہوں کہ یہ فیصلہ کرنا کہ کوئی شخص خدا یا رسول سے محبت کرتا ہے یا دشمن ہے یہ انسان کا کام نہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کا کام ہے اور اس کا نہایت حسین طور پر اعلان کیا گیا ہے ان آیات میں جن کی تفسیر اس وقت میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے۔

(خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۵۹۲ تا ۵۹۷)

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا پیار حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی اتباع کرنے والا نہ ہو۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کوئی شخص چھوٹی سے چھوٹی روحانی رفعت حاصل نہیں کر سکتا حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے پر کھڑا ہو کر اور ہر شخص اپنی استعداد، صلاحیت کے مطابق انتہائی دائرۂ استعداد میں انتہائی رفعت حاصل کر سکتا ہے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اور اس کا گر یہ بتایا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو اللہ تعالیٰ کا پیار تمہیں حاصل ہو جائے گا۔ (خطباتِ ناصر جلد نہم صفحہ ۲۴۷)

قرآن کریم نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع اور فرمانبرداری کا حکم دیا ہے اور ہم سے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کی رُو سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے جو اسوۂ حسنہ رکھا ہے اپنے دائرہ استعداد میں اس کی پیروی کرتے ہوئے اپنے اندر صفاتِ باری کے مظہر بنیں گے اور دُنیا کو حسن واحسان کے جلوے دکھائیں گے تو ہم اللہ تعالیٰ کی محبت کو حاصل کر لیں گے۔

چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنا (انسان کو خدا کا محبوب بنا دیتا ہے)۔

''جب ایک انسان سچے دل سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہے اور آپ کی تمام عظمت اور بزرگی کو مان کر پورے صدق وصفا اور محبت اور اطاعت سے آپ کی پیروی کرتا ہے یہاں تک کہ کامل اطاعت کی وجہ فنا کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ تب اس تعلق شدید کی وجہ سے جو آپ کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ وہ الٰہی نور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اُترتا ہے۔ اس سے یہ شخص بھی حصہ لیتا ہے.....اور اس کے ہر ایک عضو میں سے محبتِ الٰہی کا نور چمک اُٹھتا ہے تب اندرونی ظلمت بکلی دور ہو جاتی ہے۔ علمی رنگ سے بھی اس میں نور پیدا ہو جاتا ہے اور عملی رنگ سے بھی نور پیدا ہو جاتا ہے۔'' (روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۶۸۰، ۶۸۱)

(خطاباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۵۹۵)

آیت ۶۵ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ

دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝۶۵

اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:-

’’قرآنی تعلیم کا دوسرا کمال کمالِ تفہیم ہے یعنی اُس نے اُن تمام راہوں کو سمجھانے کے لئے اختیار کیا ہے جو تصور میں آ سکتے ہیں۔ اگر ایک عامی ہے تو اپنی موٹی سمجھ کے موافق اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور اگر ایک فلسفی ہے تو اپنے دقیق خیال کے مطابق اس سے صداقتیں حاصل کرتا ہے اور اس نے تمام اصولِ ایمانیہ کو دلائل عقلیہ سے ثابت کر کے دکھلایا ہے اور آیت تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ میں اہل کتاب پر یہ حجت پوری کرتا ہے کہ اسلام وہ کامل مذہب ہے کہ زوائد اختلافی جو تمہارے ہاتھ میں ہیں یا تمام دُنیا کے ہاتھ میں ہیں، ان زوائد کو نکال کر باقی اسلام ہی رہ جاتا ہے۔‘‘ (جنگِ مقدس، روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۲۸۹)

اِس آیت کریمہ میں بہت سی باتوں کی طرف ہمیں توجہ دلائی گئی ہے ایک یہ کہ قرآن کریم قیامت تک کے لئے ہدایت نامہ ہے اور ہم لوگ جو جماعتِ احمدیہ سے تعلق رکھتے ہیں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کی کوئی ایک آیت بھی یا کوئی ایک لفظ بھی یا کوئی ایک حرف بھی یا کوئی ایک زیر اور زبر بھی منسوخ نہیں ہوسکتی۔ جماعت احمدیہ کا یہ مذہب اور عقیدہ ہے کہ جس رنگ میں قرآن کریم حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اُسی شکل میں بغیر کسی ردّ و بدل کے یہ ہم تک پہنچا ہے اور اپنی اسی اصلی اور حقیقی شکل میں قیامت تک قائم رہے گا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ لفظ قُلْ کا مخاطب کون ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے پہلے مخاطب تو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں لیکن چونکہ یہ قیامت تک کے لئے ایک ہدایت ہے اس واسطے یہ حکم صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے تعلق نہیں رکھتا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آپ کے وصال کے بعد اس آیت کو یا اس حکم کو جو قُلْ میں آیا ہے لوگ اسے منسوخ سمجھتے۔ دراصل اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر متبع کو کہا گیا ہے کہ وہ بیان شدہ مضمون کے مطابق اہل کتاب کو دعوت دے۔

پس جیسا کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ فرض تھا کہ آپ اس آیت کی روشنی میں اہلِ کتاب کو دعوت دیتے اور جیسے آپ اپنی زندگی میں احسن طور پر بجالائے اسی طرح ہر سچے مسلمان کا

جو خدا تعالیٰ پر ایمان لاتا اور قرآن کریم کو ہمیشہ کے لئے ہدایت اور شریعت سمجھتا ہے اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اس حکم کے ماتحت اہلِ کتاب کو اسلام کی طرف اس رنگ میں دعوت دے جس رنگ میں کہ یہاں مضمون بیان ہوا ہے۔

دوسری بات جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ (حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس چھوٹے سے اقتباس میں جو اشارے ہیں میں انہی کی وضاحت کروں گا) قرآن کریم نے توحید باری تعالیٰ کے بارہ میں زبردست دلائل بیان کئے ہیں اور بتایا ہے کہ تمام مذاہب توحید کے قیام کے لئے آئے تھے اور تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ ۔ یہ محض ایک دعوت نہیں کیونکہ عیسائیت میں مثلاً بعض ایسے لوگ ہیں کہ جو تثلیث کے قائل ہیں اور ان پر تو بظاہر تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ کا اطلاق نہیں ہوتا اور اہلِ کتاب میں سے مثلاً یہودیوں میں سے بعض وہ لوگ ہیں جنہوں نے اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنائے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے بزرگوں کو قریباً خدا کا درجہ دے دیا تھا۔ ایسے لوگوں کے ساتھ بات کرتے ہوئے بھی تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ کا یہ نعوذ باللہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ مسلمان بھی اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے قائل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس بات کے ثبوت میں اس قدر زبردست عقلی اور نقلی ثبوت دیئے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا اہلِ کتاب میں سے کوئی فرقہ اگر کسی کو مقام خدائی دے یا خدا بنا دے یا خدا کا بیٹا بنا دے تو قرآن کریم اس بات کی ذمہ داری لیتا ہے اور قرآن کریم کی شریعت نے اس ذمہ داری کو احسن طور پر نبایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کہنے والے لوگ غلطی پر ہیں اسی طرح ایک ایسے عیسائی مخاطب کو جو تثلیث کا قائل ہے اُس پر یہ ثابت کیا ہے کہ تثلیث کا عقیدہ غلط ہے خدا واحد و یگانہ ہے اور یہ عقائد اختلافی جن کا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس اقتباس میں ذکر کیا ہے یہ وہ زوائد یا غلط باتیں ہیں جو لوگوں نے اپنے مذہب میں شامل کر لیں لیکن اسلام نے کہا کہ میں دُنیا پر یہ بات ثابت کروں گا کہ یہود و نصاریٰ اور ایسے ہی دوسرے مذاہب جن پر کتابیں اُتری تھیں لیکن اُنہوں نے ان میں ملاوٹ کر دی اُن میں تحریف کر دی یا اُن میں تبدیلی کر کے ان کی شکل کو بگاڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توحید کی راہ سے بھٹک گئے۔ کوئی زیادہ بھٹکا اور کوئی کم بھٹکا لیکن جو بھٹک گیا وہ تو بھٹک گیا قران کریم نے اس آیت میں یہ ذمہ داری لی ہے کہ وہ یہ ثابت کرے گا کہ توحید سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ ہے ہر نبی توحید کے

قیام ہی کے لئے آیا تھا اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں باوجود ظاہری اختلاف کے ہمارا اور تمہارا کوئی اختلاف نہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ وہ دلائل ساطعہ اور حجج قاطعہ کے ساتھ یہ ثابت کرے گا کہ اے اہل کتاب! تم غلط راہ پر ہو۔ اس جگہ اور چیزیں تو بعد کی باتیں ہیں لیکن تبلیغ یہاں سے شروع کی کہ اس بات پر ہمیں اور تمہیں اکٹھا ہونا پڑے گا اور ہم تمہیں ثبوت دیں گے۔ چنانچہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم دُنیا کے ہاتھ میں پکڑا کر اور زبردست دلائل دے کر یہ ثابت کر دیا کہ نہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا عقیدہ صحیح ہے اور نہ تثلیث یعنی ایک اور دو اور تین خدا (ایک تین اور تین ایک) ہیں۔ یہ سب نامعقول باتیں ہیں اور انسانی فطرت اور اس کی ضمیر کے خلاف عقیدے ہیں۔ لفظی طور پر ساری کتب سماویہ کے کچھ حصے محفوظ ہوتے ہیں ہر چیز تو نہیں بدل جاتی اُن مذاہب کی جن کو ہم اہل کتاب کہتے ہیں (ویسے بعض ایسے مذاہب بھی ہیں جن کو بد مذہب کہا جاتا ہے اُن کو ان کی فطرت کی طرف ہم توجہ دلائیں گے)۔ اور ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم جیسی عظیم کتاب ہمارے ہاتھ میں دے کر اور اس کی بہترین تفسیر کر کے دُنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ واقع میں یہ کلمہ ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ ہم سوائے خدائے واحد کے کسی کی عبادت نہ کریں۔ ہم صرف خدائے واحد و یگانہ کی عبادت کرنے والے ہوں۔ یہ ہے بنیادی طور پر مشترک عقیدہ جس کے بغیر مذہب لاشئی محض ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں اگر خدا ہی نہیں تو پھر مذہب کوئی چیز نہیں انسان کی اپنی عقل کے ڈھکوسلے ہیں اور بس۔ اور اگر خدا ہے اور یقیناً ہے تو وہ ایک ہی ہے باقی سارے عقائد وساوس اور توہمات ہیں اور سب غلط اور بے ہودہ ہیں اور قرآن کریم نے ان کی غلطی کو ثابت کیا ہے۔ اس لئے جیسا کہ میں نے بتایا ہے قُلْ کو ہم منسوخ نہیں سمجھ سکتے ہم احمدی یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کا کوئی لفظ منسوخ نہیں۔ چودہ سو سال گزر گئے اور آج بھی قرآن کریم ہر ایک کے کان میں کہتا ہے قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ۔

پس جب ہم اس نقطۂ نگاہ سے امت محمدیہ کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو پہلے دن ہی سے مقربین الٰہی کا ایک گروہ ہمیں نظر آتا ہے جن کو قرآن کریم کا علم اور اس کے اسرار روحانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئے اور اُنہوں نے کسی مذہب کے مقابلے میں کبھی یہ وہم پیدا نہیں ہونے دیا کہ قرآن کریم خود بنیادی طور پر اور دوسرے مذہب کے مقابلہ میں بھی توحید خالص کو ثابت نہیں کرتا لیکن اس آیت میں

اہلِ کتاب کے مقابلہ میں قرآن کریم کی یہ قوت اور یہ طاقت اور اس کے یہ دلائل اشارۃً بیان ہوئے کہ قرآن کریم توحیدِ خالص کو قائم کرنے والا ہے۔

پس مخلصین اور مقربین کا جو گروہ اُمتِ محمدیہ میں پہلے دن سے آج تک پیدا ہوتا رہا ہے اُنہوں نے یہ ثابت کیا کہ قرآن کریم کا کوئی لفظ واقع میں منسوخ نہیں۔ محض یہی نہیں کہ اس نے مخاطب کر دیا اور مخاطب تھا کوئی نہیں، پھر تو فضا اور ہوا کو مخاطب کیا نا! دراصل ہر سچا مسلمان اس کا مخاطب ہے اور ذمہ دار ہے اس بات کا کہ وہ عیسائیوں اور یہودیوں کو اس بات کا قائل کرے کہ خدائے واحد و یگانہ کا تصور ہم میں قدر مشترک ہے اور یہ کہ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اس میں تین باتیں بیان ہوئی ہیں ایک یہ کہ قرآن کریم نے قُلْ کہہ کر کس کو مخاطب کیا ہے؟ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے محبوب مطہرین کو حکم دیا ہے کہ وہ یہ پکاریں يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ لیکن اگر کوئی ولی اللہ ہی نہیں اور اس قُلْ کا مخاطب ہی نہیں تو مخاطب پھر کس کو کیا گیا ہے درآنحالیکہ قرآن کریم کا تو کوئی لفظ بھی منسوخ نہیں ہوسکتا اس واسطے قرآن کریم کے مخاطب چاہیے جو جی ہوں قرآن کریم کہتا ہے کہ اہل کتاب سے کہو اور اُن کو اِس بات کی دعوت دو کہ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ۔ تَعَالَوْا میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ثابت کریں کہ توحید خالص کے خلاف لوگوں کے جو عقیدے ہیں وہ غلط اور بے بنیاد ہیں۔ بالکل نامعقول اور غیر فطری ہیں بلکہ اُن کی اپنی مذہبی کتب کے خلاف ہیں کیونکہ اُن کے مذہبی عقائد بدل گئے۔ اس کی نشاندہی اسلام نے کی اور پھر امت محمدیہ بھری ہوئی ہے ان مطہرین کے گروہ سے کہ جو ہر زمانہ اور ہر قوم میں اور ملک ملک میں اور شہر شہر میں پیدا ہوتے رہے اور وہ اس بات کے اہل تھے کہ قرآن کریم اُن کو مخاطب کر کے کہتا کہ تمہیں ہم کہتے ہیں کہ جاؤ اور عیسائیوں، یہودیوں اور دوسرے اہل کتاب کو پکارو اور انہیں ایک کلمہ پر اکٹھے کرو جو ہمارے اور ان کے درمیان قدرِ مشترک کے طور پر ہے۔ ایسی صورت میں وہ آدمی جو تثلیث کا قائل ہے وہ کہے گا کہ کہاں ہے قدر مشترک؟ مَیں اس نکتے کو دہرا دیتا ہوں تا کہ ہمارے بچے بھی سمجھ جائیں۔ عیسائیوں کا وہ فرقہ جو کہتا ہے تین خدا ہیں جب وہ اس آیت پر پہنچے گا تو وہ کہے گا کہ تین خداؤں کو ماننے والے تو اس کو مشترک نہیں سمجھتے کہ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ پس اِس میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ امت محمدیہ کے مطہرین کا

کام ہے اور اہلیت اُن کو خدا تعالیٰ نے عطا کی ہے اس بات کی کہ وہ یہ ثابت کریں کہ واقعہ میں یہ مشترک ہے اور ثابت کریں عقلی دلائل کے ساتھ اور ثابت کریں خود اُن کی کتب کے حوالوں کے ساتھ۔ چودہ سو سال سے امت محمدیہ اپنی شاہراہِ تاریخ پر چلتی رہی ہے اور لاکھوں کروڑوں انسان ایسے نظر آتے ہیں جو اس بات کے اہل تھے اور انہوں نے یہ ثابت کیا کہ قُلْ کا لفظ یوں ہی استعمال نہیں ہوا بلکہ اس کے مخاطب ہمیشہ خدا تعالیٰ نے موجود رکھے ہیں اور اگر اس کے باوجود لوگ ان دلائل کو نہ مانیں اور اپنی فطری فراست کے خلاف بات کرنے کے لئے تیار ہو جائیں اور جو دوسرے نشان خدائے واحد و یگانہ کی ہستی کو ثابت کرنے کے لئے ضروری ہیں وہ دیکھیں پر نہ دیکھیں۔ محض عقلی دلائل کافی نہیں بلکہ ہمارا زندہ خدا اپنے وجود پر آسمانی نشانوں کے ذریعہ مہر ثبت کرتا ہے۔ اپنی زندہ طاقتیں انسانوں کے سامنے ظاہر کرتا ہے اور انسان مجبور ہو جاتا ہے یہ ماننے پر کہ واقعی خدا تعالیٰ ہے کیونکہ وہ اپنی ہستی کے نشان دکھاتا ہے اور شمار نہیں ہو سکتا اُن آسمانی نشانوں کا جو امت محمدیہ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ملے۔ اُن کا بالکل شمار نہیں ہو سکتا اور یہ مَیں کوئی مبالغہ نہیں کر رہا واقعہ میں شمار نہیں ہو سکتا......

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر اہلِ کتاب ان عقلی اور نقلی دلائل کے باوجود اور ان زبردست آسمانی نشانوں کے باوجود اس کلمہ کی طرف سے اُس صداقت کی طرف نہ آئیں جو ایک مسلمان اور غیر مسلم اہلِ کتاب میں مشترک ہے اور وہ یہی ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ اللہ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو ربّ بنائیں۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا۔ پھر اگر وہ پھر جائیں اور خدا کے علاوہ اور معبود بنالیں اور شرک کرنے لگیں تو فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ وہ اُن (اہل کتاب) کو کہہ دیں کہ تم گواہ رہو بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ہم مسلمان ہیں خدا تعالیٰ کے کامل فرمانبردار ہیں اور خدائے واحد و یگانہ کی پرستش کرنے والے ہیں۔ اس لئے جب جماعتِ احمدیہ کے افراد خدا تعالیٰ کے ان فضلوں کو دیکھتے ہوئے قرآن کریم کو سمجھنے کے بعد عقلی اور نقلی دلائل سے اپنی جھولیاں بھر لینے کے بعد اور آسمانی نور کی چادر میں اپنے آپ کو لپیٹ لینے کے بعد اور آسمانی نشانات دنیا کے سامنے پیش کر کے خدا تعالیٰ کی توحید اور اسلام کی حقانیت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت قائم کرنے کے اہل ہو جانے کے بعد پھر بھی دنیا اگر ان کو مسلمان نہ سمجھے تو یہ ان کی مرضی ہے۔ جماعت احمدیہ کو یہ حکم ہے کہ فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا ایسے لوگوں سے کہہ دیں تم گواہ رہو کہ ہم

اعلان کر رہے ہیں بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔ ہم مسلمان ہیں۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ جماعت احمدیہ خدا تعالیٰ کے اس حکم کے ماتحت اور ان تمام باتوں کے باوجود آج یہ اعلان کر رہی ہے کہ ہم قرآن کریم کی اِس آیت کے مطابق مسلمان ہیں۔ ہم دُنیا میں یہ اعلان کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں کیونکہ ہم خدا تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں ہم خدا تعالیٰ کی کامل اطاعت کرنے والے ہیں۔ اگر ہم کامل اطاعت کرنے والے نہ ہوتے تو خدا تعالیٰ کے پیار اور اُس کی رضا کو کیسے پا لیتے، خدا کی توحید کو دُنیا میں قائم کرنے کے اہل کیسے ہو جاتے۔ اس واسطے دُنیا بے شک کہے کہ احمدی مسلمان نہیں یہ اُن کی مرضی ہے زبردستی تو کسی پر نہیں کی جا سکتی لیکن قرآن کریم کی یہ آیت ایک احمدی کو یہ کہتی ہے کہ تم دُنیا میں یہ اعلان کر دو اور ان کو مخاطب کر کے کہو کہ تم گواہ رہو کہ جو علامتیں مسلمانوں میں پائی جانی چاہئیں وہ ہم میں پائی جاتی ہیں اس لئے ہم مسلمان ہیں۔ (خطباتِ ناصر جلد ششم صفحہ ۳۹۱ تا ۳۹۹)

پچھلے دنوں میں نے بتایا تھا کہ زمانہ آ گیا ہے کہ نوع انسانی کے سب افراد ایک قوم کی طرح ہو جائیں اور سارے کے سارے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں ”سعادت مند لوگ ایک ہی مذہب پر اکٹھے ہو جائیں گے اور تفرقہ دور ہو جائے گا اور مختلف قومیں دنیا کی ایک ہی قوم بن جائیں گی۔“ (چشمہ معرفت۔ روحانی خزائن جلد نمبر ۲۳ صفحہ ۸۴)

مختلف قوموں کے ایک قوم بن جانے کی تعلیم قرآن کریم نے دی ہے یعنی ایسی تعلیم دی ہے کہ انسانی فطرت اسے قبول کرتی ہے اور سب انسان اگر وہ سمجھیں یا انہیں ہم سمجھائیں تو ہو نہیں سکتا کہ اس تعلیم کے نور اور اس کے حسن کے ماننے سے انکار کریں۔ قرآن کریم کی ساری ہی تعلیم ایسی ہے لیکن دو ایک موٹی موٹی باتیں اس وقت میں آپ کے سامنے رکھوں گا۔

بنیادی بات یہ رکھی گئی انسان کے سامنے تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ جو ہے وہ نوع انسانی کو ایک کرنے کا حکم ہے کہ سارے کے سارے انسان ایک خدا کی پرستش کرنے لگیں۔ سارے کے سارے انسان ایک خدا کی اس وقت پرستش کرنے لگیں گے جب ایک خدا کی معرفت انہیں حاصل ہو جائے گی۔ سارے کے سارے انسان خدائے واحد و یگانہ کی اس وقت پرستش کریں گے جس وقت خدا تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی شناخت انہیں مل جائے گی اور یہ شناخت انسان کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کے طفیل ملی.....میرے نزدیک (جو میں

دیکھ رہا ہوں) پندرہویں صدی تمام اقوام کے ایک ہو جانے کی صدی ہے اور تمام اقوام کے ایک ہو جانے کے یہ معنی ہیں کہ وہ تمام اقوام جو اسلام سے باہر ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گی جو مہدی کے ہاتھ میں ہے اور تمام وہ قومیں جو اسلام کے اندر ہیں تمام تفرقے مٹا کر اور عداوتوں کو چھوڑ کر پیار اور عاجزی کی راہوں کو اختیار کرتے ہوئے اس جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گی۔ نوع انسان ایک قوم بن جائے گی۔ یہ ہوگا یہ ہو کر رہے گا۔ بہت سے لوگ اسے آج ناممکن سمجھیں گے مگر دیکھنے والے دیکھیں گے اور مشاہدہ کرنے والے مشاہدہ کریں گے کہ خدا نے جو بشارتیں دی ہیں وہ اپنے وقت پر ضرور پوری ہوں گی۔

اقوام عالم کو جو ایک قوم بنا ہے اس کے لیے پہلا اصول یہ قائم کیا گیا کہ ''خدا ایک ہے''۔ اس نے تمہیں پیدا کیا تمہاری جو بھی قابلیتیں، استعدادیں ہیں اسی کی عطا ہیں کس مقصد کے لیے پیدا کیا اور مقصد یہ ہے کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذّٰریٰت:۵۷) اس کے بندے بن جاؤ اور خدا تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس زمانہ میں انسان اپنے مقصد حیات کو سمجھنے لگے گا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی زندگی کے دن گزارے گا۔

دوسرا اصول جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا، وہ یہ تھا کہ کامل مساوات انسانوں کے درمیان قائم کی جائے کوئی قوم سُپر (Super) اعلیٰ نہیں ہے۔ ساری قومیں ایک جیسی حیثیت رکھتی ہیں خدا تعالیٰ کی نگاہ میں ایک عزّت اور دین اسلام کی رو سے ایک ایسا احترام پانے والی ہیں۔ قوم قوم میں کوئی فرق نہیں سارے بشر برابر ہیں (بشر کے معنی عربی میں مرد اور عورت کے ہیں) عظیم اعلان یہ کہ بشر بشر میں فرق لیکن ارشاد باری ہوا۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکھف:۱۱۱) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کی عظمت خدا تعالیٰ نے یہ قائم کی کہ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ (موضوعاتِ کبیر حرف اللام صفحہ ۵۹) یہ کائنات تیری خاطر پیدا کی گئی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم جس کو اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں سے بڑھ کر استعدادیں دیں کامل استعدادیں جو کسی اور کو نہیں دی گئیں۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کے لیے خدا تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ساری کی ساری استعدادیں آپ کی کامل نشو و نما پا گئیں۔ آپ کامل انسان بھی بنے، آپ کامل بادشاہ بھی بنے، آپ کامل آقا بھی بنے، آپ کامل ہادی بھی بنے، آپ کامل شریعت لانے والے بھی بنے، آپ کامل طور پر عَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ بھی

ٹھہرے۔ سب اپنی جگہ درست لیکن آپ کے منہ سے خدا تعالیٰ نے یہ اعلان کروایا۔ قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کہ بشر ہونے کے لحاظ سے مجھ میں اور تم میں اے مردو! اور اے عورتو! کوئی فرق نہیں۔ عظیم مساوات ہے اور اس کا ایک پہلو یہ ہے جو دوسری جگہ زیادہ واضح کیا گیا ہے وَ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ جو عدم مساوات انسانوں کے درمیان ہے اس کی سب سے زیادہ بھیانک شکل انسانی تاریخ میں یہ ہے کہ مذہبی لحاظ سے بعض کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا درجہ دے دیا گیا اور بعض کو انسان نے اپنے فیصلے کے مطابق کم درجہ دے دیا یعنی خدا تعالیٰ کا فیصلہ نہیں انسان کا اپنا ہی فیصلہ ہے۔ اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اتنا خون خرابہ ہوا مذہب کے نام پر کہ الامان حالانکہ اسلام نے کہا یہ تھا وَ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔کوئی انسان کسی دوسرے کو (خدا کے علاوہ) ربّ نہیں بنائے گا۔ ربّ ایک ہی ہے۔ جس کے معنے یہ تھے کہ کسی چیز کے حصول کے لیے اپنی کسی ربوبیّت کے حصول کے لیے کسی انسان کے پاس نہیں جائے گا نہ اس کے سامنے جُھکے گا نہ اپنی تکالیف دور کرنے کے لیے اس کے اوپر بھروسہ کرے گا وغیرہ وغیرہ لیکن بنا لیے انسانوں نے ارباب۔ لیکن اب زمانہ آ گیا کہ تمام وہ ارباب جو اللہ کے علاوہ مذہبی دنیا میں بنائے جاتے تھے ان کا خاتمہ کر دیا جائے اور اسی کو ہمارے دلوں میں گاڑنے کے لیے قرآن کریم نے اعلان کیا۔ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ (النّجم:۳۳) خود اپنے کو اور اپنوں میں سے کسی کو پاکباز نہ قرار دیا کرو تا کہ وہ ارباب نہ بن جائیں۔ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى اس بات کا فیصلہ کرنا کہ کون متّقی ہے اور کون نہیں خدا کا کام ہے بندے کا کام ہی نہیں ہے۔ جب بندے کو یہ طاقت ہی نہیں دی گئی کہ کون پرہیز گار ہے، کون خدا تعالیٰ کی منشا کے مطابق اس کی تعلیم کے مطابق اپنی زندگی کے دن گزار رہا ہے اور کون نہیں، بندے کا کام نہیں کہ کہے فلاں متّقی اور فلاں پرہیز گار۔ بڑی خرابیاں پیدا ہوئیں اور ہو رہی ہیں اس وجہ سے فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ یہ ایک ہی مضمون ہے جسے مختلف طرفوں سے خدا تعالیٰ نے ہمارے سامنے پیش کر کے ہماری عقلوں میں جلا اور روشنی اور نور پیدا کیا ہے هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۔قوموں کے باہمی تعلقات تھے قرآن کریم کہتا ہے، کوئی قوم کسی قوم کو حقیر نہ سمجھے۔ یو۔این۔او کا ویٹو توختم کر دیا گیا۔ سُپر پاورز (Super Powers) نہیں رہیں اس آیت کے بعد۔ جب بنیں خرابی پیدا ہوئی۔ جو خرابیاں دور کرنا چاہتے تھے، جن خرابیوں سے بچانا چاہتے تھے اس سے زیادہ خطرناک خرابیاں اس ویٹو پاور نے پیدا کر دیں اور اس تصوّر نے کہ بعض

تو میں بعض دوسروں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ (خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۶۹۱ تا ۶۹۵)

آیت ۷۷ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۷﴾

اللہ تعالیٰ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔قرآن کریم کی اصطلاحی لُغت میں بتایا گیا ہے کہ جب لفظِ محبت کا فاعل انسان ہو اور یہ مفہوم ہو کہ انسان نے اللہ تعالیٰ سے محبت کی تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قُرب کے حصول کے لئے اُس نے کوشش کی اور جب قرآن کریم میں اِس لفظ کو اِس طرح استعمال کیا جائے کہ اللہ نے اپنے بندے سے محبت کی تو اِس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو پسند کیا اور اُس کو اپنے انعامات اور رحمتوں سے نوازا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو اپنے عہد کو پُورا کرتے ہیں اور تقویٰ کی راہوں کو اختیار کرتے ہیں وہ متقی ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے متقیوں سے یقیناً محبت رکھتا ہے اور اپنے انعامات اور رحمتوں سے انہیں نوازتا ہے۔

اپنے عہد کو پورا کرنے کے کیا معنی ہیں؟ عہد کے معنی ہیں حفاظت اور نگہداشت اور بار بار اور ہر حالت میں کسی چیز کی حفاظت کرنا اور مفرداتِ راغبؒ نے اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ کے معنی یہ کئے ہیں اَوْفُوْا بِحِفْظِ الْاَيْمَانِ اپنے عہد کی حفاظت کرو، اپنے ایمان کی حفاظت کرو اور ایمان کے معنی مفرداتِ راغبؒ نے یہ کئے ہیں کہ کبھی یہ اِسم کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اِسْمًا لِلشَّرِيْعَةِ الَّتِيْ جَاءَ بِهَا مُحَمَّدٌ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ ۔یعنی ایمان اُس شریعت کا نام ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم لے کر آئے۔ جو شریعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کریم کی شکل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس شریعت کا نام اور اِسم ''ایمان'' ہے۔لفظِ ایمان بطور اِسم اِس معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پس اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ کے یہ معنی ہوں گے کہ شریعت محمدیہ نے جو احکام اوامر ونواہی کی شکل میں دیئے ہیں اُن کی نگہداشت کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی کام کے نہ کرنے کا حکم ہو اور غلطی سے تم وہ عمل بجالاؤ جس سے روکا گیا ہے اور کسی کام کے کرنے کا حکم ہو اور غفلت سے تم اُسے چھوڑ دو اور عمل نہ کرو۔ پس فرمایا کہ جو شریعت محمدیہ کے احکام کی پابندی کرتے ہیں اور اِس عہد کی حفاظت کرتے ہیں یعنی ہر وقت چوکس اور بیدار رہ کر اِس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کوئی حکم بجا آوری سے رہ نہ جائے اور کسی نہی کا انسان غفلت کے نتیجہ میں مرتکب نہ ہو جائے۔ وَ اتَّقٰى اور جو تقویٰ کو اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ایسے

متقیوں پر اپنے انعامات اور رحمتیں نازل کرتا ہے ایمان کی حفاظت کے تین رُخ ہیں ایک مومن مذہبی رنگ میں اُس وقت مومن کہلاتا ہے جب اُس میں تین باتیں پائی جائیں۔ایک تو یہ کہ وہ دِل سے حق کو حق سمجھے۔دوسرے زبان سے حق کا اقرار کرے اور تیسرے اِسی کے مطابق یعنی حق اور ہدایت کے مطابق اُس کے جوارح یعنی اُس کی عملی قوتیں عمل میں مصروف ہوں۔یہ لُغوی باتیں مَیں اِس لئے بتا رہا ہوں کہ گفتگو کے دوران مَیں نے محسوس کیا ہے کہ یہ چیزیں بہت سے دوستوں کے ذہن میں نہیں ہیں۔ایک تو مَیں یہ بتا رہا ہوں کہ ایمان نام ہے شریعتِ محمدیہ کا۔جس طرح میرے سامنے دوست بیٹھے ہیں۔ان کے اپنے اپنے نام ہیں۔میرا نام ناصر ہے۔اِسی طرح ایمان شریعت محمدیہ کا نام ہے۔ دوسرے مَیں نے بتایا کہ تین چیزیں اِس میں پائی جاتی ہیں یعنی زبان کا اقرار اور دِل کی تصدیق یعنی حق کو حق سمجھنے کی کیفیت قلبی اور ذہنی اور جو قوائے عملیہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کئے ہیں ان کے ذریعہ سے بھی عمل اِس تصدیق ، اِس حقیقت ، اِس حقانیت ، اِس ہدایت اِس شریعت کے مطابق ہو اور مفردات راغبؒ میں لکھا ہے ان تینوں میں سے ہر ایک کو ایمان کہا جاتا ہے۔وَيُقَالُ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنَ الْاِعْتِقَادِ وَالْقَوْلِ الصِّدْقِ وَ الْعَمَلِ الصَّالِحِ اِيْمَانًا اور تقویٰ کے معنی ہیں کہ اپنے نفس کو اُن باتوں سے محفوظ رکھنا جو گناہ ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں اور اِتَّقٰى فَلَانٌ بِكَذَا اِذَا جَعَلَهٗ وِقَايَةً لِّنَفْسِهٖ۔اس واسطے ہم تقویٰ کے معنی یہ کیا کرتے ہیں کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو کا مطلب ہے کہ اللہ کو اپنے لئے ڈھال کے طور پر حفاظت کا ذریعہ بناؤ۔پس اللہ تعالیٰ نے یہاں پر فرمایا کہ جو شریعت محمدیہ یعنی ایمان کی نگہداشت اور حفاظت کرتا ہے یعنی شریعت محمدیہ پر ایمان رکھتے ہوئے یہ حفاظت کرتا ہے کہ اُس کا نفس کوئی ایسا کام نہ کرے جس کی شریعت محمدیہ نے اجازت نہیں دی اور کوئی ایسا کام کرنے سے رہ نہ جائے جس کا حکم اُس شریعت کی طرف سے دیا گیا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوئی اور اس کے ساتھ جو تقویٰ کی راہوں کو اختیار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اپنے لئے بطور ڈھال کے اور ذریعۂ حفاظت بنا لیتا ہے یعنی دُعائیں کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل ہو اور خدا تعالیٰ کی پناہ میں وہ آجائے تا کہ شیطان کے ہر قسم کے حملوں سے وہ محفوظ رہ سکے تو ایسے متقیوں سے اللہ تعالیٰ محبت رکھتا ہے یعنی اپنے انعاموں اور اپنی رحمتوں اور اپنی رضا سے انہیں نوازتا ہے.........

خدا تعالیٰ کی ناراضگی سے محفوظ رہنے کے لئے اور غفلت کے نتیجہ خدا تعالیٰ کے قہر کے وارث ہونے سے بچنے کے لئے تقویٰ تعویذ کا کام دیتا ہے اور حفاظت کرتا ہے اور ہر قسم کے فِتن اور فسادات سے اور ہر قسم کی بداعمالیوں سے محفوظ رہنے کے لئے تقویٰ ایک مضبوط قلعہ کا کام دیتا ہے۔ جو تقویٰ کی چار دیواری کے اندر داخل ہو گیا وہ اس قِسم کے فتنوں اور فسادوں اور بدعملیوں اور کوتاہیوں اور غفلتوں سے محفوظ ہو گیا اور تقویٰ کی باریک در باریک راہیں ہیں۔ انسان انسان کے لحاظ سے تقویٰ میں فرق ہے۔ بعض انسانوں کی استعدادیں موٹی موٹی ہیں بعض کی استعدادیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ باریکیوں میں جاتے ہیں اور زیادہ روحانی ترقیات کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی باریک راہوں پر چلنے کی قوت بھی دی اور تقویٰ کی باریک راہوں کی شناخت بھی عطا کی۔ تقویٰ کی یہ باریک راہیں ان کی روحانی خوبصورتی کے لطیف نقوش اور خوشنما خدّ و خال ظاہر کرنے والی ہیں۔ جیسا کہ مَیں نے بتایا تقویٰ کی اصل یہ ہے کہ وہ فتنہ وفساد اور ظُلم اور نواہی میں مبتلا ہونے کے خطرہ سے حفاظت کا کام دیتا ہے اور جب انسان ہر پہلو سے متقی بن جائے یعنی کسی پہلو سے بھی کوئی گناہ اور گندگی اُس کے قریب نہ آئے تو چونکہ گندگی اور بدصورتی سے اُس نے خود کو محفوظ کر لیا اس لئے روحانی طور پر اُس کے جو نقوش اور خدّ و خال تھے وہ نمایاں ہو کر سامنے آ گئے اور اُبھر آئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے متقیوں سے مَیں پیار کرتا ہوں اور قرآن کریم پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اللہ کے پیار کرنے کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنے انعامات اور اپنی رحمتوں اور فضلوں سے نوازتا ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں خود بتایا کہ متّقی پر اللہ تعالیٰ کے کس قسم کے فضل نازل ہوتے ہیں کون سے انعام ہیں جو اسے دیئے جاتے ہیں کن رحمتوں سے اُنہیں نوازا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ (الانفال:۳۰) فرمایا کہ جو شیطانی حملوں سے بچنے کے لئے مجھے پناہ بنا لیتے ہیں اور ڈھال بنا لیتے ہیں میں اُن لوگوں سے اس رنگ میں محبت کرتا ہوں یعنی اس طور پر میرے انعام اور رحمتیں اُن پر نازل ہوتی ہیں کہ اُن میں اور اُن کے غیر میں ایک امتیاز پیدا کیا جاتا ہے۔ مومن اور غیر مومن میں روحانی حُسن کے لحاظ سے تو بہرحال فرق ہے لیکن ظاہر میں بھی وہ پہچانے جاتے ہیں اور دنیاوی لحاظ سے صاحب فراست انسان پہچان لیتا ہے کہ یہ شخص کِس قِسم کا ہے۔ اُن کے اخلاق میں، اُن کے بات کرنے کے طریق میں، اُن

کے تخاطب میں، اُن کے سلوک میں اُن کے دِل میں خالقِ خُدا کے لئے جو پیار اور ہمدردی ہے وہ ظاہر ہو رہی ہوتی ہے اور ایک نمایاں فرق ہوتا ہے۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ جو ابھی زیر تربیت احمدی ہیں بوجہ اس کے کہ نئے نئے جوان ہوئے یا بوجہ اس کے کہ وہ احمدیت میں نئے نئے داخل ہوئے ہیں اُن میں بھی تھوڑی سی تربیت کے بعد اس رنگ کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ فوراً پتہ لگ جاتا ہے بعض دفعہ دوست اپنے ساتھ اپنے دوستوں کو لے آتے ہیں اور ایک دو فقروں میں ہی میں سمجھ جاتا ہوں کہ اِن کو بہت سی تربیت کی ضرورت ہے یعنی ابھی احمدیت کی تربیت، اسلام کی تربیت، ایمان کی تربیت کے حصول کی ابتدا انہوں نے نہیں کی۔ گفتگو ہے، چلنے کا طریق ہے۔ چلنے کے طریق سے مجھے یاد آیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک شخص کو نماز میں شامل ہونے کے لئے دوڑتے ہوئے آتے دیکھ کر فرمایا اَلْوَقَارَ اَلْوَقَارَ کہ تمہاری چال میں ایک مومن کا وقار نہیں نظر آتا تو معلوم ہوا کہ مومن کی چال ایک غیر مومن کی چال سے امتیاز رکھتی ہے ان کے درمیان ایک فرقان پایا جاتا ہے۔ پھر مثال کے طور پر کپڑوں کی نگہداشت ہے۔ ٹھیک ہے چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بہت سی کمزوریاں ہیں بہت سے مومنوں سے بھی کمزوریاں سرزد ہو جاتی ہیں لیکن ایک امتیاز ہے۔ اکثریت کو جب ہم دیکھتے ہیں تو جو مومن ہے وہ کپڑے کو اُس سے بہتر جو عمل صالح ہے اُس پر ترجیح نہیں دے گا اور مَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یہ آپ کا اُسوہ ہے کہ میری زندگی اور میرے رہن سہن میں تمہیں کوئی تکلّف نظر نہیں آئے گا اور آپ نے دیکھا ہوگا اور یہ مَیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جو احمدی ایسے ہوں جن میں یہ چھوٹی سی کمزوری ہو اس کو بھی دُور ہونا چاہیے کیونکہ اُس سے فرقان میں اور امتیاز میں فرق آتا ہے بعض لوگ ہوتے ہیں کہ کپڑا پہنا ہوگا اور مٹی پر بیٹھنے سے پرہیز کریں گے۔ حالانکہ کئی دفعہ زمین پر بغیر کپڑا بچھائے بیٹھنا ثواب کا موجب بن جاتا ہے، یا اگر اُن کے کپڑوں پر کہیں مٹی لگ جائے تو فوراً جھاڑ پھونک شروع کر دیتے ہیں اور اپنے کپڑوں سے مٹی اڑانے لگ جاتے ہیں۔ جس چیز سے بنے ہیں اُسی سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ بہر حال بعض دفعہ مٹی پر بیٹھنا بھی ثواب کا کام بن جاتا ہے ایک دفعہ مجھے یاد ہے سٹھیالی میں ہمارے احمدیوں کے دو گروہوں میں آپس کا اختلاف پیدا ہوا اور وہ نامعقول حد تک پہنچ رہا تھا۔ ہم وہاں گئے لمبا قصّہ ہے مختصر کروں گا تو میں نے دونوں گروہوں کے لیڈروں کو کہا آؤ چلو میرے ساتھ اُن کے ساتھی ایک دوسرے کو غصّہ

دلانے کی باتیں کر کے بھڑکا رہے تھے اور وہ صلح کی طرف مائل نہیں ہو رہے تھے، مَیں اُن کو باہر لے گیا۔ ایک کھیت میں ہم آرام سے بیٹھ گئے اور میرے دماغ کے کسی کونہ میں بھی یہ خیال نہیں آیا کہ کپڑوں کو مٹی لگ جائے گی۔ زمین پر بیٹھ گئے اُن سے باتیں شروع کیں آدھ پون گھنٹہ میں آرام کے ساتھ اُن کی صلح ہو گئی، کیونکہ اکیلے تھے اور اُن کو جوش دلانے والا کوئی نہیں تھا کپڑے کی صفائی ضروری ہے لیکن یہ سمجھنا کہ کپڑے کو صاف ستھرا رکھنا کہ مٹی بھی نہ لگے یہ اتنا بڑا ثواب ہے کہ اس سے بڑھ کر اَور کوئی ثواب ہی نہیں، یہ غلط ہے۔ جب تکلّف بیچ میں آجائے گا تو کپڑے کی صفائی بھی گناہ بن جائے گی، یعنی اس حد تک صفائی کہ مٹی لگی ہی نہ ہو کوئی داغ نہ لگا ہوا ہو یہ صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں نظر آتا ہے کہ ایسا زمانہ بھی تھا کہ وہ کوئی کپڑا ابھی نہیں بچھا سکتے تھے نماز کا وقت ایسی جگہ آ گیا ہے کہ مسجد نہیں جا سکتے وہیں زمین پر ہی نماز پڑھ لیتے تھے کیونکہ جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا (مسلم کتاب المساجد)۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ بڑی بے تکلّف زندگی ہے جو اسلام نے ہمارے سامنے پیش کی ہے جو قرآنی ہدایت نے ہمیں بتائی ہے۔ پس جو شخص تقویٰ سے کام لیتا ہے یعنی جن برائیوں سے جن کمزوریوں سے اسلام نے روکا ہے اُن سے بچتا ہے اور ان راہوں کو اختیار کرتا ہے۔

(خطباتِ ناصر جلد پنجم صفحہ ۳۵ ۷ تا ۴۱ ۷)

آیت ۹۳ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۝۹۳

اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو بار بار اور مختلف پیرایہ میں انفاق پر ابھارا ہے ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ ۔ یہاں انسان کو اس طرف متوجہ کیا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور یہ اس کی مہربانی ہے کہ وہ اپنی عطا میں سے ایک حصہ واپس مانگتا ہے اس وعدہ پر کہ وہ اس انفاق پر اور اس خرچ پر اپنی طرف سے ثواب دے گا چیز اسی کی ہے لیکن جہاں بے شمار فضل اور نعمتیں اس نے اپنے بندے پر کی ہیں وہاں اس نے یہ بھی فضل کیا کہ جو دیا اس میں سے کچھ واپس مانگا اور جن لوگوں نے اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کے حضور اس کے دیئے ہوئے میں سے کچھ پیش کر دیا تو اس کے بدلہ میں اس نے ثواب بھی دیا۔

اس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ کہ اس حقیقت کے باوجود وہ لوگ جو ہماری نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے اور ناشکرے بن جاتے ہیں اور ہماری آواز پر لبیک نہیں کہتے اور ہمارے کہنے کے مطابق خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ حقیقتاً وہ اپنے نفسوں پر ہی ظلم کرنے والے ہیں۔ پس اس آیت میں اس طرف بھی توجہ دلائی تھی کہ جو کچھ تم سے مانگا جارہا ہے وہ بھی تمہارا نہیں گھر سے تو کچھ نہ لائے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی عطا میں سے کچھ مانگ کے تمہارے لئے مزید نعمتوں کے دروازے کھولنا چاہتا ہے اگر پھر بھی تم ناشکر گزار بندے بنے رہو تو بڑے ہی ظالم ہو۔ اپنے نفسوں پر بڑا ہی ظلم کرنے والے ہو۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کہ جس خرچ کا ہم مطالبہ کرتے ہیں جان مال دوسری سب وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہیں اور وہ کہتا ہے کہ اس میں سے کچھ مجھے واپس لوٹاؤ تاکہ میرے ثواب کو حاصل کرو اور یہ خرچ فی سبیل اللہ ہونا چاہیے یعنی ان راہوں پر ہونا چاہیے جو راہیں اللہ تعالیٰ نے خود بتائی ہیں بعض دفعہ خرچ کی بعض راہیں انسان کی اپنے نفس سے محبت بتاتی ہے محبت نفس اسے کہتی ہے کہ یہاں خرچ کرو وہاں خرچ کرو اور آرام حاصل کرو دنیوی لذتوں میں سے کچھ حصہ پاؤ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ خرچ کرو تو یہ مراد نہیں ہوتی کہ نفس کو بتائی ہوئی راہ پر خرچ کرو اور اس طرح بعض دفعہ خاندان خرچ کرواتا ہے بعض جاہل اور ناسمجھ لوگ خاندان کی جھوٹی عزت کی خاطر ناقابل برداشت قرض اٹھالیتے ہیں اور برادری کو خوش کرنے کیلئے افراط کررہے ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خرچ کرو مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ اس چیز سے جو ہم نے تمہیں دی ہے تو ہمارا یہ مطلب نہیں کہ اس راہ میں خرچ کرو جو تمہاری برادری تمہیں بتائے۔ اسی طرح خودی، تکبر، نمائش کا احساس خرچ کی بعض راہیں بتاتا ہے تو ان کے اوپر خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کا مطالبہ نہیں اس آیت میں یہ فرمایا کہ جب ہم کہتے ہیں خرچ کرو تو اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ فی سبیل اللہ خرچ کرو ان راہوں پر خرچ کرو جو ہم نے متعین کی ہیں اور جن کی نشاندہی ہم نے کی ہے۔

جو آیت شروع میں میں نے پڑھی تھی کہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ اس میں ایک تیسرا مضمون بیان ہوا ہے اور اس میں ہمیں یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ جب قرآن کریم کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ تعلیم ایسی ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے اس کے کیا معنی ہیں؟ مِمَّا تُحِبُّوْنَ

میں تدریجی ترقیات کی طرف اشارہ ہے اور اس کی وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ اگر تم اپنی قربانیوں میں بتدریج اضافہ کرتے چلے جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی کامل نیکی کو حاصل کرسکو گے اگر ایسا نہیں کرو گے تو نیکی کو تو حاصل کرلو گے۔ اللہ تعالیٰ ثواب تو تمہیں دے گا مگر یہ ثواب نچلے درجہ کا ہوگا کامل نیکی نہیں کہلائے گا۔ پس یہاں یہ فرمایا ہے کہ جس چیز سے تم محبت کرتے ہو اور جس کے چھوڑنے اور قربانی کرنے پر تم تکلیف محسوس کرتے ہو اس کو خرچ کرنے کا ہم مطالبہ کررہے ہیں۔ ایک شخص جو سالہا سال سے اپنی آمدنی کا سولہواں حصہ جماعت کے کاموں کے لئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا چلا آرہا ہے یہ خرچ اس کے بجٹ کا ایک حصہ بن گیا ہے اور یہ ایسی رقم نہیں رہی کہ جس کے خرچ پر اس کو یہ احساس ہوا کہ اگر میں یہ رقم خرچ نہ کرتا تو فلاں فلاں چیز خرید سکتا دنیوی فائدہ حاصل کرتا۔

تو مِمَّا تُحِبُّوْنَ میں یہ اشارہ کیا کہ اس انفاق میں ترقی کرتے چلے جاؤ جب سولہویں حصہ کی عادت پڑ جائے تو پھر (اللہ تعالیٰ خود امام وقت کو سکھاتا ہے) تحریک جدید کا مطالبہ ہو جائے گا تا کہ تمہیں وہ مال جو تم خرچ کرو محبوب مال معلوم ہو اس کی عادت نہ پڑ چکی ہو بلکہ خرچ کرتے ہوئے تمہیں دکھ کا احساس ہو تم کہو کہ یہ مال میں خرچ کررہا ہوں لیکن اس کے نتیجہ میں میری فلاں ضرورت پوری نہیں ہو گی اور یہ سوچو کہ فلاں ضرورت کیا اگر کوئی بھی ضرورت پوری نہ ہو اور میرا ربّ مجھ سے راضی ہو جائے تو میں خرچ کرتا چلا جاؤں گا اس وقت تمہارا خرچ مِمَّا تُحِبُّوْنَ میں سے ہوگا۔ پھر جب اس کی بھی عادت پڑ جائے گی وقف جدید کی تحریک شروع کردی جائے گی جب اس کی عادت پڑ جائے گی فضل عمر فاؤنڈیشن سامنے آجائے گی اور اگر یہ بھی نہ ہو تو وصیت کی طرف انسان کی توجہ جائے گی کہ سولہواں حصہ تو میں دیتا چلا آیا ہوں اور سولہواں حصہ دینے سے مجھے یہ احساس نہیں باقی رہا کہ میں نے اپنے محبوب مال میں سے کچھ دیا ہے۔ کیونکہ اس انفاق کی تو مجھے عادت پڑ گئی ہے اس واسطے آؤ اب وصیت کریں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کو اس کی خوشنودی کو اس کے فضل کی جنتوں کو پہلے سے زیادہ حاصل کریں۔

پھر وصیت میں تو سات درجے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رکھے ہیں۔ جب دسویں حصے کی عادت پڑ جائے تو نواں حصہ دینا شروع کردو جب نواں حصہ دینے کی عادت پڑ جائے تو آٹھواں حصہ دینا شروع کردو جب آٹھواں حصہ دینے کی عادت پڑ جائے تو ساتواں حصہ دینا شروع کردو تیسرے حصہ تک اسی طرح کرتے جاؤ۔ (اگر کسی وقت تمہیں یہ احساس ہو کہ جو تمہاری پہلی

قربانیاں ہیں وہ طبیعت اور عادت کا ایک جزو بن گئی ہیں اور مِمَّا تُحِبُّوْنَ والی بات نہیں رہی) تو ہدایت کی راہوں پر آگے سے آگے لے جانے کا راستہ اس آیت میں دکھایا گیا ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ اوراس سے ہمیں پتہ لگتا ہے کہ جب قرآن کریم کے شروع میں ہمیں بتایا گیا تھا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے یہ کتاب اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ تو ایک مثال ہے بیسیوں مثالیں ایسی ہیں کہ تقویٰ کے کسی ایک مقام پر اللہ تعالیٰ حقیقی مومن اور متقی کو کھڑا نہیں رہنے دیتا بلکہ اس کے دل میں ایک جوش اور ایک جذبہ پیدا کرتا ہے کہ جب اس سے مزید ترقی کی راہیں کھلی ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی محبت کے مزید جلوے میں دیکھ سکتا ہوں تو کیوں میں یہاں کھڑا رہوں مجھے آگے بڑھنا چاہیے۔

مِمَّا تُحِبُّوْنَ میں ہر دو قسم کے مومن شامل ہیں ایک وہ جو اپنی فطرتی استعداد کے مطابق ایک جگہ ٹھہرنا پسند نہیں کرتے اور آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر فضل کرتا ہے اور نئی سے نئی راہیں ان پر کھولتا چلا جاتا ہے اور ایک وہ لوگ ہیں جن کی اقتصادی حالت یا جن کی ایمانی حالت اس قسم کی ہوتی ہے کہ وہ فرائض کو ادا کرتے ہوئے بھی کوفت محسوس کرتے ہیں۔ فرائض کی ادائیگی بھی ان کی عادت کا ان کی فطرت کا ان کی طبیعت کا ایک جزو نہیں بنتی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بھی فضل کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں بھی ہم مِمَّا تُحِبُّوْنَ سے خرچ کرنے والوں میں شمار کرلیں گے یعنی ان لوگوں میں جو قربانی اور ایثار کے جذبے کو رکھتے ہوئے، اپنے مال کو یا دوسری اللہ تعالیٰ کی عطا یا کو اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں کیونکہ تم اقتصادی حالات کی وجہ سے یا اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے ابھی تک سولہواں حصہ دینے میں بھی تکلیف محسوس کرتے ہو اور جو مال دیتے ہو اس کو چھوڑنے کے لئے تمہارا نفس بشاشت سے تیار نہیں ہوتا۔ اس حصہ مال کے ساتھ بھی تمہاری محبت بڑی شدید ہوتی ہے اس طرح تم سچی قربانی دے رہے ہو میری راہ میں اس لئے میں تمہیں ثواب دوں گا۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۴۸ تا ۵۱)

آیت ۹۷، ۹۸ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ

غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۸﴾

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ بیت اللہ کی از سر نو تعمیر کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ عہد لیا کہ وہ اور ان کی نسل ایک لمبے عرصہ تک خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی زندگیوں کو وقف کر کے ان ذمہ داریوں کو نباہیں گے جو بیت اللہ کی تعمیر سے تعلق رکھتی ہیں اور تدبیر اور دعا سے یہ کوشش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل کو توفیق عطا کرے کہ جب خدا تعالیٰ کا آخری شارع نبی دنیا کی طرف مبعوث ہو تو وہ اسے قبول کریں اور اسلام کے قبول کرنے کے بعد جو انتہائی قربانی اس قوم کو خدا تعالیٰ کے نام کے بلند کرنے کیلئے دینی پڑے وہ قربانی خدا تعالیٰ کی راہ میں دیں۔

میں نے بتایا تھا کہ بیت اللہ کے ساتھ بہت سی اغراض اور بہت سے مقاصد وابستہ ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہمیں نظر آتا ہے۔ اور جن کا تعلق حقیقتاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ہے۔ یہ آیات جو میں نے ابھی تلاوت کی ہیں جب ان کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو ہمیں مندرجہ ذیل مقاصد نظر آتے ہیں جن مقاصد کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی از سر نو تعمیر کروائی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل سے قریباً اڑھائی ہزار سال تک وہ قربانیاں لیتا چلا گیا۔ پہلی غرض وُضِعَ لِلنَّاسِ بیان ہوئی ہے۔ دوسری مُبٰرَكًا تیسرے هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ میں ایک مقصد بیان ہوا ہے۔ چوتھے اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ پانچویں مَقَامُ اِبْرٰهِيْمَ چھٹے وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ساتویں وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ۔ آٹھویں جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ نویں وَ اَمْنًا دسویں وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى گیارہواں مقصد طَهِّرَا بَيْتِيَ میں بیان کیا گیا ہے۔ بارہواں مقصد لِلطَّآئِفِيْنَ تیرہواں عٰكِفِيْنَ کے لفظ میں بیان ہوا ہے۔ چودہواں مقصد وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ کے اندر بیان کیا گیا ہے۔ پندرہواں مقصد رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا میں بیان کیا گیا ہے۔ سولہواں مقصد وَ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ میں بیان کیا گیا ہے۔ سترھواں مقصد رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا میں بیان کیا گیا ہے۔ اٹھارواں مقصد السَّمِيْعُ کے اندر بیان ہوا ہے۔ انیسواں مقصد الْعَلِيْمُ کے اندر بیان ہوا ہے۔ بیسواں مقصد وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ میں بیان ہوا ہے۔ اکیسواں مقصد وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا میں بیان ہوا ہے بائیسواں مقصد وَ تُبْ عَلَيْنَا میں بیان ہوا ہے اور تیئیسواں مقصد رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

میں بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ

وہ پہلا گھر جو لِلنَّاسِ وضع کیا گیا ہے بنایا گیا ہے مکہ میں ہے۔مختلف روایات اور قرآن کریم کی آیات میں جو مفہوم مختلف جگہوں میں بیان ہوا ہے۔اس سے میرے ذہن نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جب ہمارے آدم کی پیدائش اور بعثت ہوئی (میں نے ہمارے آدم کے الفاظ اس لئے استعمال کئے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمایا ہے کہ لاکھ کے قریب آدم اس دنیا میں پیدا ہوئے ہیں جو آدم پہلے گذرے تھے۔ان کی اولاد میں سے بعض کو اولیائے اُمت نے اپنے کشف میں دیکھا بھی ہے۔جس کا انہوں نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے) اس وقت دنیا ایک مختصر سے خطہ میں آباد تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے سب انسانوں کے لئے اپنی حکمت کاملہ سے آدم پر یہ وحی فرما کر بیت اللہ کی تعمیر کروائی ایک گھر بنوایا اور اس گھر کو تمام بنی نوع انسان کے ساتھ متعلق کر دیا جو اس آدم کی اولاد میں سے تھے۔لیکن بعد میں جب یہ نسل بڑھی اور پھیلی اور دنیا کے مختلف خطوں کو انہوں نے آباد کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحانی اور ذہنی نشوونما کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر قوم اور ہر خطہ میں علیحدہ علیحدہ نبی بھیجنے شروع کئے تا ان کو ان راہوں پر چلانے کی کوشش کریں جن راہوں پر چل کر خدا تعالیٰ کا ایک بندہ اپنی استعداد کے مطابق عبودیت کی ذمہ داریوں کو نباہ سکتا ہے اور احادیث سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اس دنیا میں ایک لاکھ سے اوپر انبیاء گذرے ہیں تو جس آدم کی اولاد اس طرح منتشر اور متفرق ہو گئی تھی علیحدہ علیحدہ قوم بن گئی تھی جن کے اپنے اپنے نبی تھے انہوں نے اس گھر کی طرف توجہ دینی چھوڑ دی جو خدا کا گھر اور تمام بنی نوع انسان کے لئے کھڑا کیا گیا تھا اور اس سے اس قدر بے توجہی برتی کہ حوادثِ زمانہ کے نتیجہ میں اور مرمت اور آبادی نہ ہونے کی وجہ سے اس گھر (بیت اللہ) کے نشان تک مٹ گئے لیکن جب اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء پورا ہونے کا وقت آیا کہ پھر تمام دنیا عَلٰی دِیۡنٍ وَّاحِدٍ جمع کر دی جائے۔تو اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو از سر نو تعمیر کرنے اور اس گھر کی حفاظت کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل کو وقف کر دینے کا فیصلہ کیا تا ایک قوم اس بیت اللہ سے تعلق رکھنے والی ایسی پیدا ہو جائے جن کے اندر وہ تمام استعدادیں پائی جاتی ہوں جو اس قوم میں پائی جانی چاہئیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کی پہلی مخاطب ہو۔چنانچہ اڑھائی ہزار سال تک دعاؤں

کے ذریعہ سے اور وقف کے ذریعہ سے ایک ایسی قوم تیار ہوئی جو اگر خدا تعالیٰ کی بن جائے تو اس کے اندر تمام وہ استعدادیں پائی جاتی تھیں جو روحانی میدانوں میں بنی نوع انسان کی راہ نمائی اور قیادت کر سکے اور چونکہ یہ استعدادیں اور قوتیں اپنے کمال کو پہنچ چکی تھیں ان کے غلط استعمال سے فتنہ عظیمہ بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ اس لئے جب تک وہ گمراہ رہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت سے مخالفت کی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی ایذا پہنچائی کہ پہلی کسی اُمت نے اپنے نبی کو اس قسم کی ایذا نہیں پہنچائی غرض ان کے اندر استعدادیں بڑی تھیں ایک وقت تک وہ چھپی رہیں۔ایک وقت تک شیطان کا ان پر قبضہ رہا لیکن جب وہ سوئی ہوئی استعدادیں بیدار ہوئیں اور انہوں نے اپنے ربّ کو پہچانا تو دنیا نے وہ نظارہ دیکھا کہ اس سے قبل کبھی بھی انسان نے خدا تعالیٰ کی راہ میں اس قسم کی قربانیوں کا نظارہ نہیں دیکھا تھا۔غرض یہ وہ قوم تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانیوں اور ان کی دعاؤں اور ان کی نسل کی قربانیوں اور ان کی دعا کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔

غرض وُضِعَ لِلنَّاسِ کا مفہوم حقیقی معنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ تمام اغراض و مقاصد جو بیت اللہ سے متعلق ہیں وہ حقیقی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق رکھنے والے ہیں لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ میں اس گھر کی جو میرا گھر ہے از سرِ نو تعمیر ان اغراض کے پیش نظر کروا رہا ہوں اور اس کے لئے تمہیں قربانیاں دینی پڑیں گی۔

غرض پہلا مقصد جس کا تعلق بیت اللہ سے ہے یہ ہے کہ یہ بیت اللہ وہ سب سے پہلا خدا کا گھر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کے دینی اور دنیوی فوائد رکھے ہوئے ہیں۔ وُضِعَ لِلنَّاسِ یعنی تمام لوگوں کی بھلائی کیلئے اس کی تعمیر کی گئی ہے۔ یہاں سے دنیا کی اقوام بلا امتیاز رنگ، بلا امتیاز نسل اور قطع نظر ان امتیازات کے جو ایک کو دوسرے سے علیحدہ کر دیتے ہیں تمام اقوام عالم اس گھر سے دنیوی فوائد بھی حاصل کریں گی اور دینی فوائد بھی حاصل کریں گی۔ یہ پہلی غرض ہے اس گھر کی از سرِ نو تعمیر سے۔

دوسری غرض بیت اللہ کی تعمیر سے یہ ہے کہ ہم ایک اپنے گھر کو (بیت اللہ کو) مُبٰرَكًا بنانا چاہتے ہیں اور مُبٰرَكًا اس مقام کو کہتے ہیں جو نشیب میں ہو اور اگر بارش ہو تو چاروں طرف کا پانی وہاں آ کر

جمع ہو جائے۔ چونکہ یہاں بارش کے موضوع پر اللہ تعالیٰ بات نہیں کر رہا۔ بلکہ انسان کی دینی اور دنیوی ترقیات اور بہبود کے متعلق بات ہو رہی ہے اس لئے یہاں مُبٰرَكًا کے معنی دو ہیں۔ایک یہ کہ تمام اقوام عالم کے نمائندے اس گھر میں جمع ہوتے رہیں گے اور دوسرے یہ کہ ہم نے بیت اللہ کو اس لئے تعمیر کروایا اور اسے معمور رکھنے (آباد رکھنے) کا فیصلہ کیا ہے کہ یہاں ایک ایسی شریعت قائم کی جائے گی یہاں ایک ایسا آخری شریعت والا نبی مبعوث کیا جائے گا کہ جس کی شریعت میں تمام ہدایتیں اور صداقتیں (روحانی) جو مختلف اقوام کی شریعتوں میں متفرق طور پر پائی جاتی تھیں پھر اکٹھی کر دی جائیں گی اور کوئی ایسی صداقت نہ ہوگی جو اس شریعت سے باہر رہ گئی ہو۔

پس فرمایا کہ روحانی لحاظ سے ہم اس ''بیت اللہ'' کو مُبٰرَكًا بنانا چاہتے ہیں اور ہماری یہ غرض ہے کہ یہ مولد ہوگا ایک ایسی شریعت کا کہ تمام انبیاء کی شریعتوں میں جو ہدایتیں متفرق طور پر پائی جاتی ہوں گی وہ اس میں اکٹھی کر دی جائیں گی اور اس کے ساتھ برکت بھی ہوگی یعنی وہ تمام چیزیں جو پہلوں کے لئے ضروری نہیں تھیں اور وہ انہیں برداشت نہیں کر سکتے تھے وہ صداقتیں بھی اس میں بیان ہوں گی اور ایک کامل اور مکمل شریعت ہوگی جو تمام قوم کے فائدہ کے لئے قائم کی جائے گی اور یہ جو گھر ہے اور یہ جو بیت اللہ ہے یہ اس کامل اور مکمل اور ابدی شریعت کے لئے اُمَّ الْقُرٰى ٹھہرے گا۔

تیسری غرض بیت اللہ کے قیام کی هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ میں بیان کی گئی ہے۔آپ اس بات کو مدنظر رکھیں کہ ان آیات کے شروع میں بیان کیا گیا تھا۔ وُّضِعَ لِلنَّاسِ کہ تمام دنیا، تمام اقوام اور تمام زبانوں کے لئے ہم اس گھر کو بنا رہے ہیں تمام اقوام کے ساتھ اس کا جو تعلق ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بار بار دہرایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تیسری غرض اس گھر کی تعمیر سے یہ ہے کہ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ تمام جہانوں کے لئے ہدایت کا موجب یہ بنے۔ لفظ هُدًى کے معنوں میں بھی عَالَمِيْن کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کیونکہ عقل اور فراست اور علم اور معارف جو مشترک طور پر سارے انسانوں کا حصہ ہیں ان کو ہدایت کہتے ہیں۔اس کے بغیر آگے روحانی علوم چل ہی نہیں سکتے کیونکہ جس میں مثلاً عقل نہ ہو وہ پاگل ہو جائے اس کو مرفوع القلم کہتے ہیں یعنی اب اس کے اوپر شریعت کا حکم نہیں رہا غرض عقل بنیاد ہے شریعت کی اور ان معانی کی جو اس لفظ ہدایت کے اندر پائے جاتے ہیں۔پس اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ فرمایا کہ ہم اس گھر کے ذریعہ سے ثابت کریں گے کہ تمام اقوام

عالم عقل کے لحاظ سے اور فراست کے لحاظ سے اور معارف کے لحاظ سے اور علوم کے لحاظ سے ایک جیسی قابلیت رکھتے ہیں۔کسی قوم کو اس لحاظ سے کسی دوسری قوم پر برتری نہیں ہے۔

اس میں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے کہ جس زمانہ میں حقیقتاً هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ کا جلوہ دنیا پر ظاہر ہوگا یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اس وقت بعض قومیں دنیا میں ایسی بھی پیدا ہو جائیں گی جو یہ کہنے لگیں گی کہ ہم زیادہ عقل مند ہیں۔ہمارے اندر زیادہ فراست اور علوم حاصل کرنے کی زیادہ قابلیت ہے اور بعض قومیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہی اس غرض سے ہے کہ وہ ہماری محکوم رہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس گھر کے ذریعہ سے ہم ثابت کریں گے کہ اپنی عقل اور فراست اور بنیادی علوم کے لحاظ سے قوم،قوم میں تمیز نہیں کی جاسکتی۔اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور اس غرض کو حاصل کرنے کے لئے جس عقل کی،جس فراست کی،جن معارف کی اور جن علوم کی ضرورت تھی وہ سب اقوام کو برابر دئے ہیں یعنی ان کے اندر برابر کی استعدادیں ہیں۔فرد فرد کی استعداد میں تو فرق ہوسکتا ہے لیکن کسی ایک قوم کو دوسری قوم پر برتری حاصل نہیں۔

دوسرے معنی هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بیت اللہ کے مقام سے قرآن کریم کا نزول شروع کرے گا کیونکہ مفردات راغب میں ہے کہ هَدَايَة کے ایک معنی یہ ہیں کہ وہ آسمانی ہدایت کہ جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ذریعہ اور پھر قرآن کریم کے نزول کے ساتھ بنی نوع انسان کو بلایا ہو کہ اِدھر آؤ یہ ہدایت کے راستے ہیں ان پر چلو تب مجھ تک پہنچ سکتے ہو۔تو ہدایت کے معنی میں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلے تمام انبیاء ایک سے شریک ہیں لیکن هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ کے معنی حقیقی طور پر سوائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی نبی پر چسپاں نہیں ہوتے کیونکہ باقی تمام انبیاء اپنے زمانوں اور اپنی اقوام کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔پس یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بیت اللہ قرآن کریم کے نزول کی جگہ ہے یہاں سے قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوگا۔اس غرض سے ہم اس کی حفاظت کر رہے ہیں اور اس کی تطہیر وغیرہ کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔

هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ کے تیسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بیت اللہ ایک ایسا مقام ہے کہ یہاں اس شریعت کی ابتدا ہوگی جو انسان پر غیر متناہی ترقیات کے دروازے کھولے گی کیونکہ

ہدایت کے تیسرے معنی امام راغب کے نزدیک یہ ہیں کہ ایک شخص جب ہدایت کی راہوں پر چل کر بعض اعمال صالحہ بجالاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کو مزید ہدایت کی توفیق عطا کرتا ہے تو ہر عمل صالحہ کے نتیجہ میں بہتر اور جو اللہ تعالیٰ کو نسبتاً زیادہ محبوب عمل صالحہ ہے اس کی توفیق اس کو مل جاتی ہے یعنی تدریجی طور پر انسان کو روحانی ترقیات کے مدارج پر چڑھاتی چلی جائے گی اور اس اُمت پر اس کے ذریعہ سے غیر متناہی ترقیات کے دروازے کھولے جائیں گے اور پھر یہ فرمایا کہ بیت اللہ کے قیام کی غرض یہ ہے کہ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (اپنے چوتھے معنی کے لحاظ سے) ایک ایسی اُمت مسلمہ پیدا کی جائے گی جس کو اللہ تعالیٰ کے وہ انعامات ملیں گے جو ان سے پہلے کسی اُمت کو نہیں ملے اور قیامت تک بنی نوع انسان کو اس قسم کے کامل اور اکمل اور مکمل ثواب اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمتیں ملتی چلی جائیں گی کیونکہ ہدایت کے چوتھے معنی امام راغب نے یہ لکھے ہیں۔

اَلْهِدَايَةُ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَى الْجَنَّةِ

چونکہ ان کے نزدیک صرف آخرت میں ہی جنت ملتی ہے اس لئے انہوں نے ”فِي الْاٰخِرَةِ“ کے الفاظ (میرے نزدیک) اپنے اس عقیدے کی وجہ سے زائد کردئے۔ ورنہ لغوی لحاظ سے اس کے یہی معنی ہیں اَلْهِدَايَةُ اِلَى الْجَنَّةِ یعنی جس غرض کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے وہ غرض اسے حاصل ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ یہ جنت صرف اُخروی زندگی میں ہی نہیں بلکہ اس دنیوی زندگی میں بھی ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ فرمایا تھا کہ بیت اللہ کو ہم اس لئے کھڑا کر رہے ہیں اور اس کی حفاظت کے ہم اس لئے سامان پیدا کر رہے ہیں کہ یہاں ایک ایسی اُمت جنم لے گی جو ثواب اور جزا ان کو ملے گی اور خدا تعالیٰ کی رضا کی جو جنت ان کے نصیب میں ہوگی وہ پہلی قوموں کے نصیب میں نہیں ہوئی ہوگی یعنی بہترین نتیجہ جو انسانی روحانی عمل کا نکل سکتا ہے وہ اس اُمت کے اعمال کا نکلے گا کیونکہ جو شریعت ان کو دی گئی ہے وہ ہر لحاظ سے کامل اور مکمل ہے۔ پہلوں کی شریعتیں چونکہ نسبتی طور پر ناقص تھیں۔ اگر ان پر پورے طور پر عمل بھی کیا جاتا تو ان کا نتیجہ عقلاً بھی وہ نہیں نکل سکتا تھا جو نتیجہ اس عمل کا نکل سکتا ہے جو ایسی شریعت کے مطابق ہو جو پورے طور پر کامل ہو تو اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ فرمایا کہ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ اس گھر سے جس عالمگیر شریعت کا چشمہ پھوٹے گا اس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں اَلْجَنَّةَ ایک کامل جنت انسان کو ملے گی اس دنیا میں بھی اور اُخروی دنیا

میں بھی۔ پس تیسری غرض (جو آگے بعض ذیلی اغراض میں تقسیم ہو جاتی ہے) بیت اللہ کے قیام کی هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ہے۔

چوتھا مقصد اس گھر کی تعمیر کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ ہے۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم خاص قسم کی آیات بینات کا وعدہ انسان کو دیتا ہے یا ان کے متعلق پیشگوئیاں بیان کرتا ہے تو یہاں میرے نزدیک آیات بینات کے عام معنی نہیں ہیں بلکہ یہاں وہ آیات بینات مراد ہیں جو اس پہلے گھر سے تعلق رکھتی ہیں جو ''وُضِعَ لِلنَّاسِ ہے، جو مُبٰرَکًا ہے اور جو ''هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ'' ہے۔ اس مفہوم کے بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا فِيْهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ اور اس کے معنی یہاں یہ ہیں کہ اس گھر سے تعلق رکھنے والی ایسی آیات اور بینات ہوں گی اور یہ گھر ایسے نشانات اور تائیدات سماوی کا منبع بنے گا جو ہمیشہ کے لئے زندہ رہیں گی۔ جو آیات اور بینات پہلے انبیاء یا ان کی قوموں کو دیئے گئے وہ اپنے اپنے وقت پر ختم ہوگئیں اور پہلی اُمتوں میں سے ہر ایک نے کوئی نہ کوئی منطقی اور غیر تسلی بخش دلیل ڈھونڈ کر یہ دعویٰ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق قائم نہیں ہوسکتا کہ انسان اس کے قرب کو، اس کی وحی کو، سچے رؤیا اور کشوف کو اور آئندہ کے متعلق پیشگوئیوں کو حاصل کر سکے تو فرمایا کہ ان دروازوں کو پہلی ہر اُمت نے اپنے پر بند کر لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک ایسی اُمت مسلمہ کا قیام بیت اللہ کی تعمیر سے مدنظر ہے کہ قیامت تک ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے نشانات ظاہر ہوتے رہیں گے اور اپنے نشانات اور استجابت دعا اور قربانیوں کا دنیا میں پھل پانے کے نتیجہ میں وہ اُمت دنیا پر یہ ثابت کرتی رہے گی کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا ایک زندہ خدا ہے۔ ایک طاقت ور خدا ہے۔ وہ بڑا رحم کرنے والا اور پیار کرنے والا خدا ہے وہ ایسے بندوں کو جو اس کے سامنے جھکتے ہیں ضائع نہیں کرتا بلکہ اُن سے تعلق کو وہ قائم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی عزت کو دنیا میں قائم کرنے کے لئے اور دنیا کو یہ بتانے کے لئے کہ یہ میرے محبوب بندے ہیں وہ اس پر وحی کرتا ہے کشوف و رؤیا انہیں دکھاتا ہے وہ اس کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور ایسے بندے اس اُمت میں پیدا ہوتے رہیں گے جو قیامت تک یہ ثابت کرتے رہیں گے کہ ہمارا خدا زندہ خدا ہے اور اس سے تعلق رکھنے والے آیات بینات کو حاصل کرتے ہیں۔

پانچویں غرض اس کا تعلق بیت اللہ سے ہے اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کی ہے کہ یہ **مقام ابراهیم**

ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ دیکھو ہمارے بندے ابراہیم (علیہ السلام) نے اور بہتوں نے اس کی نسل میں سے انقطاعِ نفس کر کے اور تعشق باللہ اور محبت الٰہی میں غرق ہو کر سچے عاشق اور محب کی طرح اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ کا نعرہ لگایا اور دنیا کے لئے ایک نمونہ بنایا۔ ہم نے اس بیت اللہ کی آبادی کا اس لئے انتظام کیا ہے کہ اس کے ذریعہ عشاق الٰہی کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جاتی رہے جو تمام حجابوں کو دور کر کے اور دنیا کے تمام علائق سے منہ موڑ کر خدا تعالیٰ کے لئے اپنی مرضات سے ننگے ہو کر اور تمام خواہشات کو قربان کر کے فنافی اللہ کے مقام کو حاصل کرنے والے ہوں اور اس عبادت کو احسن طریق پر اور کامل طور پر ادا کرنے والے ہوں جس کا تعلق محبت اور ایثار سے ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ عبادت دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ عبادت ہے جو تذلل اور انکسار کی بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہے اور ایک وہ عبادت ہے جو محبت اور ایثار کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ہماری نماز جو ہے یہ اس قسم کی عبادت ہے جو تذلل اور انکسار کے مقام پر کھڑی ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ نماز دعا ہے اور دعا کے لئے انتہائی تذلل اور انکسار کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ جس شخص کے دماغ میں اپنے ربّ کے مقابلہ میں ایک ذرّہ بھی تکبر ہو اس کی دعا کبھی قبول نہیں ہو سکتی۔ پس ہماری نمازیں صرف اس صورت میں عبادت بنتی ہیں کہ جب وہ حقیقتاً تذلل اور انکسار کے مقام پر کھڑی ہوں۔ اس کے مقابلہ میں دوسری عبادت وہ ہے جو محبت اور ایثار کی بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ عبادت جس کا تعلق تعمیر کعبہ سے ہے۔ جس کا تعلق حفاظت کعبہ سے ہے اور جس کا تعلق بیت اللہ کے لئے خود کو اور اپنی اولاد کو وقف کر دینے کے ساتھ ہے اور اس کے لئے دعائیں کرنے کا تعلق ہے یہ محبت والی عبادت ہے اور خدا تعالیٰ کی محبت اور خدا تعالیٰ کے عشق کا جو مظاہرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا وہ عدیم المثال تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ مقام ابراہیم ہے اس مقام سے ہم ایک ایسی اُمت پیدا کریں گے جو لاکھوں کی تعداد میں ہو گی اور ہر زمانہ میں پائی جاتی ہو گی اور اس اُمت کے کسی فرد کا اگر تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کے ساتھ مقابلہ کرو گے تو اس کو ان سے کم نہیں پاؤ گے۔

نبی کریم صلی اللہ وسلم کی قوت قدسیہ کے نتیجہ میں اس قوم نے پیدا ہونا تھا لیکن اس قوت قدسیہ کے جو اثرات ہیں ان کو دنیا میں مؤثر طریق پر پھیلانے کے لئے قریباً اڑھائی ہزار سال پہلے خانہ کعبہ کی

بنیاد از سر نو رکھی گئی تھی تو یہاں یہ فرمایا کہ ظاہری شکل حج کے ارکان کی، اس عبادت کی خود ہی ایسی ہے جس کا تعلق محبت سے ہے۔ مثلاً طواف کرنا ہے۔ اب یہ تخیل قریباً ساری اقوام میں پایا جاتا ہے کہ جب کسی کے لئے جان کی قربانی دینا ہوتی ہے تو اس کے گرد گھومتے ہیں۔ ہمارے بعض بادشاہوں کے متعلق بھی آتا ہے کہ ان میں سے کسی کا بچہ بیمار تھا۔ اس نے اس کا طواف کیا اور دعا کی میری زندگی اس کو مل جائے۔ پس جان قربان کرنے کا جو تخیل ہے وہ طواف کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ یہاں فرماتا ہے کہ یہاں سے ایک ایسی قوم پیدا کی جائے گی جو ہر وقت اپنے محبوب کے گرد گھومتی رہے گی اور اس کے آستانہ کا بوسہ لیتی رہے گی۔ ایک طرف وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یاد کو تازہ رکھنے والی ہوگی اور دوسری طرف وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ کو نہایت شان کے ساتھ ظاہر کرنے والی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی ایک قوم پیدا کر دی۔ صرف پہلے زمانہ میں ہی نہیں صرف عرب میں بسنے والوں میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر خطہ میں اور قیامت تک ہر زمانہ میں جو ابراہیمی عشق اور جو ابراہیمی محبت اپنے ربّ کے لئے رکھیں گے وہ اس کی راہ میں ہر قسم کی قربانیاں دینے والے ہوں گے۔ (خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۶۲۶ تا ۶۳۴)

چھٹی غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا بیت اللہ کی تعمیر کی چھٹی غرض یہ ہے کہ جو بھی اس کے اندر داخل ہوگا یعنی ہر وہ شخص جو ان عبادات کو بجالائے گا جن کا تعلق بیت اللہ سے ہے دنیا اور آخرت کے جہنم سے وہ خدا کی پناہ میں آ جائے گا اور اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ پس چھٹی غرض بیت اللہ کی تعمیر کی یہ ہے کہ اللہ کا ایک ایسا گھر بنایا جائے کہ جس کے ساتھ بعض عبادات تعلق رکھتی ہوں اور جو شخص بھی خلوص نیت کے ساتھ اور کامل اور مکمل طور پر ان عبادات کو بجالائے گا اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے۔ کہ اس کے تمام پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا جائے گا اور نارِ جہنم سے وہ محفوظ ہو جائے گا۔

ساتویں غرض بیت اللہ کی اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بتائی ہے کہ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد یا اہل عرب پر ہی یہ فرض نہیں کہ وہ بیت اللہ کا حج کریں بلکہ بیت اللہ کی تعمیر کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ اقوام عالم بیت اللہ کے حج کے لئے اس مقام پر جمع ہوں (میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمام اغراض مقاصد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی تعمیر کے وقت ہی بتا دیئے گئے

تھے جیسا کہ بہت سے قوی قرائن اس کے متعلق قرآن کریم سے ملتے ہیں) غرض اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ کہا کہ یہ خدا تعالیٰ کا ایک ایسا گھر ہے کہ تمام اقوام عالم پر جو مجھ پر ایمان لائیں گی اور میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائیں گی اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر میری اطاعت کا جُوا اپنی گردنوں پر رکھیں گی ان کے لئے حج بیت اللہ فرض قرار دیا جائے گا اور اس طرح اس جگہ کو مرجع خلائق اور مرجع عالم بنادیا جائے گا۔

آٹھویں غرض یا آٹھواں مقصد بیت اللہ کی تعمیر کا یہ بتایا کہ یہ مَثَابَةً ہے۔ اس لفظ میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ دنیا کی اقوام فرقہ فرقہ بن گئی ہیں اور جس وقت یہ فرقہ بندی اپنی انتہا کو پہنچ جائے گی اس وقت ایک ایسا رسول مبعوث کیا جائے گا جو بیت اللہ کی اس غرض کو پورا کرنے والا ہوگا اور ان متفرق اقوام کو ایک مرکز پر لا جمع کرے گا۔ وہ سب کو عَلٰی دِیْنٍ وَّاحِدٍ لے آئے گا۔ پس یہاں بتایا کہ باوجود اس کے کہ تفرقہ ایک وقت پر اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ اس وقت ایک ایسے رسول کو مبعوث فرمائے جو تمام اقوام کو اُمَّةً وَّاحِدَةً بنادے۔

نواں مقصد یہاں یہ بیان کیا کہ اَمْنًا یعنی یہ گھر جو ہے یہ اَمْنًا لِلنَّاسِ ہے۔ یہاں اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے اپنے اس گھر کو ایسا بنانا چاہا ہے کہ اس کے ذریعہ اور صرف اس کے ذریعہ دنیا کو امن نصیب ہوگا کیونکہ صرف یہ ایک گھر ہوگا جسے بیت اللہ کہا جا سکتا ہے اس کو چھوڑ کر اور ان تعلیموں کو نظر انداز کر کے جن کا تعلق اس گھر سے ہے دنیا کی کوئی تنظیم امن عالم کے لئے کوشش کر کے دیکھ لے وہ کبھی اس میں کامیاب نہیں ہوگی۔ حقیقی امن دنیا کو صرف اس وقت اور صرف اسی تعلیم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں مل سکتا ہے جو تعلیم وہ نبی دنیا کے سامنے پیش کرے گا جو خانہ کعبہ سے کھڑا کیا جائے گا۔

امن کے ایک دوسرے معنی کے لحاظ سے اَمْنًا لِلنَّاسِ کے معنی یہ بھی ہیں کہ دنیا روحانی طور پر اطمینان قلب صرف مکہ معظّمہ اور صرف اس آخری شریعت کے ساتھ پختہ تعلق پیدا کرنے کے نتیجہ میں حاصل کر سکے گی جو آخری شریعت مکہ میں ظاہر ہوگی اور تمام اقوام عالم کو پکار رہی ہوگی اپنے ربّ کی طرف اور چونکہ اطمینانِ قلب ہر انسان کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے فطری تقاضوں کو وہ تعلیم پورا کرنے والی ہو اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جتنی قوتیں اور استعدادیں پیدا کی ہیں ان سب کی راہ نمائی اور نشوونما کرنے کے قابل ہو پس یہاں یہ فرمایا کہ مکہ گھر ہوگا ایک ایسی تعلیم کا جو حقیقی

طور پر دنیا کو اطمینانِ قلب پہنچانے والی ہوگی یعنی ہر دو معنی یہاں چسپاں ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دنیا کو اگر امن نصیب ہوسکتا ہے تو وہ مکہ کی وساطت سے دوسرے یہ کہ دنیا کی ارواح اگر اطمینانِ قلب حاصل کرسکتی ہیں۔ دنیا کی عقلیں اگر تسلی پاسکتی ہیں تو صرف اس تعلیم کے نتیجہ میں جو مکہ میں نازل ہوگی۔

دسویں غرض اور دسواں مقصد ان آیات میں خانہ کعبہ کا اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا ہے۔ کہ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى اس سے پہلی ایک آیت میں مَقَامُ اِبْرٰهِيْمَ کا ذکر تھا۔ اس سے مراد یہ تھی کہ یہ مقام ایسا گھر ہے جہاں بنیاد ڈالی گئی ہے اس حقیقی عبادت کی جو محبت اور ایثار اور عشق الٰہی کے چشمہ سے بہہ نکلتی ہے اور اِتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى میں اس عبادت کا ذکر ہے جو تذلل اور انکسار کے منبع سے پھوٹتی ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا کہ بیت اللہ کی تعمیر کی ایک غرض یہ ہے کہ ایک ایسی قوم پیدا کی جائے جو تذلل اور انکسار کے ساتھ اپنے ربّ کی عبادت کرنے والی ہو اور جو تذلل اور انکسار کی عبادت کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام کے ظل ساری دنیا میں قائم کرے اور اشاعت اسلام کے مراکز کو قائم کرنے والی ہو۔

گیارھویں غرض تعمیر بیت اللہ کی یہ بیان کی گئی ہے کہ طَهِّرَا بَيْتِيَ اور اس میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ خانہ کعبہ کو ظاہری صفائی اور باطنی طہارت کا سبق سیکھنے کے لئے ساری دنیا کے لئے بطور ایک جامعہ اور یونیورسٹی اور ایک مرکز کے بنایا جائے۔

بارھویں غرض تعمیر کعبہ کی یہ بتائی گئی ہے کہ لِلطَّآئِفِيْنَ یعنی اقوام عالم کے نمائندے بار بار یہاں جمع ہوا کریں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قریباً اڑھائی ہزار سال پہلے یہ بتایا تھا کہ تمام اقوامِ عالم کے نمائندے بار بار یہاں آئیں گے طواف کرنے کے لئے بھی اور دوسری ان اغراض کے پورا کرنے کے لئے بھی جن کا تعلق خانہ کعبہ سے ہے۔

تیرھواں مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ وَالْعٰكِفِيْنَ خانہ کعبہ اس غرض سے از سرِ نو تعمیر کروایا جارہا ہے کہ اس کے ذریعہ سے ایک ایسی قوم پیدا کی جائے جو اپنی زندگیاں خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کرنے والے ہوں اور اس طرح بیت اللہ کے مقاصد کو پورا کرنے والے ہوں۔

چودھواں مقصد یہاں یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ایک ایسی قوم

پیدا کی جائے جو توحید باری پر قائم ہو اور جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری سے اپنی زندگیوں کو گزارنے والی ہو۔

پندرھواں مقصد یہ بیان ہوا ہے کہ بَلَدًا اٰمِنًا۔ امن کا لفظ ان آیات میں تین مختلف مقاصد کے بیان کے لئے اللہ تعالیٰ نے استعمال کیا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اس گھر کو دنیا کے ظالمانہ حملوں سے اپنی پناہ میں رکھیں گے اور کوئی ایسا حملہ جو خانہ کعبہ کو مٹانے کے لئے کیا جائے گا وہ کامیاب نہیں ہوگا بلکہ حملہ آور تباہ و برباد کر کے رکھ دیئے جائیں گے تا دنیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرے کہ وہ نبی جسے ہم یہاں سے مبعوث کرنا چاہتے ہیں وہ بھی خدا تعالیٰ کی پناہ میں ہوگا اور دنیا کی کوئی طاقت اس کی ذات کو ہلاک یا اس کے مشن کو ناکام نہیں کر سکے گی اور تا دنیا یہ بھی نتیجہ نکالے کہ جو شریعت نبی معصوم کو دی جائے گی وہ ہمیشہ کے لئے ہوگی اور خدا تعالیٰ اس کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوگا۔

سولھویں غرض جو خانہ کعبہ سے وابستہ ہے وہ یہ ہے کہ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ اس میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتایا کہ میں بیت اللہ کو از سر نو تعمیر کروا رہا ہوں اس غرض سے بھی کہ تا بیت اللہ اور اس کی برکات کو دیکھ کر دنیا اس نتیجہ پر پہنچے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے پر موت وارد کرتے ہیں اور اس کے ہو کر اس کی راہ میں قربانی دیتے ہیں اور دنیا سے کٹ کر صرف اسی کے ہی ہو رہتے ہیں ان کے اعمال ضائع نہیں ہوتے بلکہ شیریں پھل انہیں ملتا ہے اور عاجزانہ اور عاشقانہ اعمال کے بہترین نتائج ان کے لئے مقدّر کئے جاتے ہیں۔

سترھویں غرض بیت اللہ کے قیام کی یہ بتائی کہ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا بیت اللہ کی تعمیر کی ایک غرض یہ ہے کہ تا دنیا یہ جانے اور پہچانے کہ روحانی رفعتوں کا حصول دعا کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے۔ جب دعا میں انسان کا تضرع اور ابتہال انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور موت کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تب فضل الٰہی آسمان سے نازل ہوتا ہے اور معرفت کی راہیں بندہ پر کھولی جاتی ہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ نے یہاں بیت اللہ کے قیام کی غرض بتائی کہ یہاں ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو دعا اپنی تمام شرائط کے ساتھ کرے گی اور دعا میں ان پر ایک موت کی سی کیفیت وارد ہوگی اور ان کا وجود کلیۃً فنا ہو جائے گا اور پانی بن کر آستانہ ربّ پر بہہ نکلے گا اور وہ جانتے ہوں گے کہ ہم اپنے اعمال کے نتیجہ میں (محض اعمال کے نتیجہ میں) کچھ حاصل نہیں کر سکتے جب تک ہم دعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے

فضل کو جذب نہ کریں اس لئے انتہائی قربانیاں دینے کے بعد بھی وہ اپنی قربانیوں کو کچھ چیز نہ سمجھیں گے اور ہر وقت اپنے ربّ سے ترساں اور لرزاں رہیں گے اور انتہائی قربانیوں کے باوجود ان کی دعا یہ ہوگی کہ جو کچھ ہم تیرے حضور پیش کر رہے ہیں وہ ایک حقیر سا تحفہ ہے۔ تیری شان تو بہت بلند ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ تیرے حضور ہمارا یہ تحفہ قبول ہونے کے لائق نہیں لیکن تو بڑا رحم کرنے والا ربّ ہے ہمارے اس حقیر تحفہ کو قبول فرما اور ہماری غفلتوں اور ہماری حقیر مساعی کو چشم مغفرت سے دیکھ اور رحمت کے سامان پیدا کرتا کہ ہماری مساعی اور کوششیں تیرے حضور قبول ہو جائیں۔غرض اس قسم کی قوم پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی۔

اٹھارہواں مقصد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خانہ کعبہ کی از سر نو تعمیر سے اٹھارہواں مقصد یہ ہے کہ دنیا یہ جانے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کے حضور اس رنگ میں دعائیں کرتے ہیں وہی ہیں جو اپنے ربّ کی صفت سمیع کا نظارہ دیکھتے ہیں اور پھر دنیا دیکھتی ہے کہ ہمارا ربّ جو ہے وہ سننے والا ہے۔ وہ ہماری دعاؤں کو سنتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں نے تمہاری دعاؤں کو سنا۔ پس خانہ کعبہ کے قیام کے نتیجہ میں خدائے سمیع کی معرفت دنیا حاصل کرے گی۔

انیسواں مقصد یہ ہے کہ دنیا اس کے ذریعہ سے خدائے علیم کی معرفت حاصل کرے گی یہ نہیں ہو گا کہ بندہ نے اپنے علم ناقص کے نتیجہ میں جو دعا کی اسے اللہ تعالیٰ نے اسی رنگ میں قبول کر لیا بلکہ بندہ دعا کرے گا اور دعا کو انتہا تک پہنچائے گا تو اس کا ربّ اس کی دعا کو سنے گا اور قبول کرے گا مگر قبول کرے گا اپنے علم غیب کے تقاضا کو پورا کرتے ہوئے یعنی جس رنگ میں وہ دعائیں قبول ہونی چاہئیں اس رنگ میں۔ بعض دعاؤں کا رد ہو جانا یا بعض دعاؤں کا اس شکل میں پورا نہ ہونا جس رنگ میں کہ وہ کی گئی ہیں یہ ثابت نہیں کرے گا کہ خدا سمیع نہیں ہے یا قادر نہیں ہے بلکہ وہ یہ ثابت کرے گا کہ خدا تعالیٰ ہی کی ذات علام الغیوب ہے۔ تو خانہ کعبہ کی بنیاد اس لئے رکھی گئی کہ خدا تعالیٰ کے بندے خدائے علیم سے متعارف ہو جائیں اور اس کو جاننے لگیں اور پہچاننے لگیں۔

بیسویں غرض یہاں یہ بیان کی گئی ہے کہ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ یعنی اُمت مسلمہ ہماری ذریت میں سے بنائیو۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بتایا ہے کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی طرف مبعوث ہوں تو آپ کی قوم اُمَّةً مُّسْلِمَةً بننے کی اہلیت رکھتی ہو اور ابراہیمی دعاؤں

کے نتیجہ میں وہ اُمَّةً مُّسْلِمَةً بن بھی جائے گی اور اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ وہ نبی جس کا وعدہ دیا گیا ہے کہ وہ مکہ میں پیدا ہوگا مگر تم دعا کرتے رہو کہ اے خدا! ہماری اور ہماری نسلوں کی کسی غفلت اور کوتاہی کے نتیجہ میں کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرے نزدیک ہم اس قابل نہ رہیں کہ وہ وعدہ ہمارے ساتھ پورا ہو بلکہ کسی اور قوم میں وہ نبی مبعوث ہو جائے تو فرمایا میری اولاد کو ہی اُمت مسلمہ بنانا۔ پہلے مخاطب وہی ہوں اور سب کے سب قبول کرنے والے بھی وہی ہوں۔

پس یہاں یہ بتایا ہے کہ وہ اُمت جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) کی ذریت سے پیدا ہونے والی ہے وہ اُمت مسلمہ بنے۔ اس نبی کا انکار نہ کرے۔ اس نبی پر ایمان لا کر جو ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر پڑیں وہ ان کو نباہنے کی قوت اور استعداد رکھنے والی ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ان کو ایسی ہی قوم بنانا چاہتے ہیں اور اسی غرض سے ہم نے خانہ کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کروائی ہے۔

اکیسواں مقصد یہاں یہ بیان فرمایا کہ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا اس میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ مکہ معظمہ سے ایک ایسا رسول صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوگا جو دنیا کی طرف اس وقت آئے گا جب وہ اپنی روحانی اور ذہنی نشوونما کے بعد ایسے مقام پر پہنچ چکی ہوگی کہ وہ کامل اور مکمل شریعت کی حامل بن سکے۔ ایسی شریعت جس میں پہلی شریعتوں کے مقابلہ میں لچک ہے۔ ایسی شریعت جس میں مناسب حال عمل کرنے کی تعلیم دی گئی ہو اور ایسی شریعت جو ہر قوم اور ہر زمانہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہو۔ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا ہمارے مناسب حال جو کام اور جو عبادتیں ہیں جو ذمہ داریاں ہیں وہ ہمیں دکھا اور سکھا۔ یعنی قرآنی شریعت کو ہم پر نازل فرما۔

پس اَرِنَا مَنَاسِكَنَا میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب وہ رسول آئے گا اس کا تعلق دنیا کی ساری اقوام سے ہوگا اور ہر زمانہ سے ہوگا۔ پس دعا کرتے رہو کہ اے ہمارے ربّ قوم قوم کی ضرورتوں اور طبیعتوں میں فرق اور زمانہ زمانہ کے مسائل میں فرق کے پیش نظر شریعت ایسی کامل اور مکمل بھیجنا کہ جو ہر قوم کے فطرتی تقاضوں کو پورا کرنے والی ہو اور ہر زمانہ کے مسائل کو وہ سلجھانے والی ہو۔ قیامت تک زندہ رہنے والی ہو تا جس غرض کے لئے اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی ہے وہ پوری ہو۔

بائیسویں غرض اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ تُبْ عَلَيْنَا۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو آخری شریعت یہاں نازل کی جائے گی اس کا بڑا گہرا تعلق رَبِّ تَوَّابِ سے ہوگا اور اس شریعت کے

پیرو اس حقیقت کو پہچاننے والے ہوں گے کہ توبہ اور مغفرت کے بغیر معرفت کا حصول ممکن نہیں ہے اس لئے وہ بار بار اس کی راہ میں قربانیاں بھی دینے والے ہوں گے اور بار بار اس کی طرف رجوع بھی کرنے والے ہوں گے اور کہیں گے کہ اے خدا! ہماری خطاؤں کو معاف کر دے۔ وہ ایسی قوم ہوگی کہ جو نیکی کرنے کے بعد بھی اس بات سے ڈر رہی ہوگی کہ کہیں ہماری نیکی میں کوئی ایسا رخنہ نہ رہ گیا ہو جس سے ہمارا ربّ ناراض ہو جائے وہ ہر وقت استغفار اور توبہ میں مشغول رہنے والی قوم ہوگی۔

تیئیسواں مقصد اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ کہ ہم محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا مولد اسے بنانا چاہتے ہیں ہم اسے ایسا مقام بنانا چاہتے ہیں کہ جس کے ماحول میں تضرع اور ابتہال کے ساتھ، عاجزی اور انکسار کے ساتھ، عشق اور محبت کے ساتھ کی گئیں دعاؤں کے نتیجہ میں ہم اپنے ایک عبد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو محمدیّت کے مقام پر کھڑا کریں گے اور اس کے ذریعہ سے ایک ایسی شریعت کا قیام ہوگا اور ایک ایسی اُمت کو جنم دیا جائے گا کہ جو زندہ نشان اپنے ساتھ رکھتی ہوگی يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ اور زندہ خدا کے ساتھ اور زندہ نبی کے ساتھ اور زندہ شریعت کے ساتھ ان کا تعلق ہوگا اور ان کو کامل شریعت کا سبق دیا جائے گا لیکن ناسمجھ بچوں کو جس طرح کہا جاتا ہے ان سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ ہم کہتے ہیں اور تم مانو۔ اللہ تعالیٰ ان کی عقل اور فراست کو تیز کرنے کے لئے اپنے احکام کی حکمت بھی ان کو بتائے گا اس نبی کے ذریعہ اور اس طرح وہ کچھ ایسے پاک کر دئے جائیں گے کہ اس قسم کی پاکیزگی کسی پہلی قوم کو حاصل نہ ہوئی ہوگی اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہماری عقل بھی تسلیم کرتی ہے کیونکہ اگر پہلی اُمتوں پر نسبتاً ناقص شریعتوں کا نزول ہوا اور اس ناقص راہ نمائی کے نتیجہ میں ان کا تزکیہ ہو تو وہ تزکیہ کامل نہیں وہ ان کی فطرت کے مطابق ان کی استعداد کے مطابق، ان کی قوت کے مطابق تو ہے لیکن وہ کامل تزکیہ نہیں ہے کیونکہ جو تعلیم انہیں دی گئی ہے وہ کامل نہیں کیونکہ ان کی استعداد ابھی کامل نہیں۔ پھر جب وہ قوم پیدا ہوگئی جو کامل شریعت کی حامل ہونے کی استعداد رکھتی تھی تو ان میں سے جن لوگوں نے انتہائی قربانیاں دے کر اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس کے تمام احکام پر عمل کر کے اور تمام نواہی سے بچتے ہوئے اس کے حضور گریہ وزاری میں اپنی زندگی گزاری ان کو جو تزکیہ نفس حاصل ہوگا (محض خدا تعالیٰ کے فضل سے نہ کہ ان کے اعمال کے نتیجہ میں) وہ ایک ایسا کامل تزکیہ ہوگا۔ وہ ایک ایسی مکمل طہارت اور پاکیزگی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی ایسی

خوشنودی اور رضا ہوگی کہ اس قسم کی رضا پہلی قوموں نے حاصل نہیں کی ہوگی۔

پس اللہ تعالیٰ یہاں فرماتا ہے کہ تیئیسویں غرض بیت اللہ کے قیام کی یہ ہے کہ ایک خیر الرسل صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی طرف مبعوث کیا جائے اور پھر انسان کو اس ارفع مقام پر لا کھڑا کیا جائے جس ارفع مقام پر کھڑا کرنے کے لئے ہم نے اسے پیدا کیا تھا۔ (خطبات ناصر جلد اول صفحہ ۶۴۳ تا ۶۴۴)

بیت اللہ کے قیام کی پہلی غرض اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں جیسا کہ میں نے اپنے پہلے ایک خطبہ میں بیان کیا تھا یہ بتائی ہے کہ وُضِعَ لِلنَّاسِ یہ اللہ کا گھر اس لئے از سرِ نو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ سے تعمیر کروایا جا رہا ہے کہ تمام اقوام عالم کے دینی اور دنیوی فوائد اس بیت اللہ سے وابستہ کر دیئے جائیں اور ظاہر ہے کہ یہ اڑھائی ہزار سالہ زمانہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے درمیان گزرا اس زمانہ میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ بیت اللہ سے تمام اقوام عالم دینی اور دنیوی فوائد حاصل کر رہی ہیں۔ بہت سی قومیں اس وقت ایسی بھی تھیں جو بیت اللہ یا مکہ کے جغرافیہ سے بھی واقف نہیں تھیں۔ اکثر اقوام عالم وہ تھیں کہ جن کے دلوں میں بیت اللہ کی کوئی محبت نہیں تھی۔ وہ اس کی طرف کھنچے ہوئے نہیں آتے تھے۔ ان کی نگاہ میں اس کی کوئی عزت اور احترام نہیں تھا اور انہیں یہ یقین نہیں تھا کہ بیت اللہ سے بعض ایسی برکات اور فیوض بھی وابستہ ہیں کہ اگر ہم ان کو جانیں اور پہچانیں تو ہم ان برکات اور فیوض سے حصہ لے سکتے ہیں لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو یہی گھر جسے دنیا بھول چکی تھی دنیا نے اس کو پہچان لیا اور اس کی برکات کو جان لیا اور دنیا کے دل میں اکنافِ عالم میں بسنے والی اقوام کے سینہ میں اس کی محبت پیدا ہوگئی اور وہ تمام وعدے پورے ہونے لگے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ربّ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ربّ نے اور ہمارے ربّ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کئے تھے۔

اب میں یہ بتاؤں گا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ وعدہ (وُضِعَ لِلنَّاسِ کا) کس طرح اور کس شکل میں پورا ہوا ظاہر ہے کہ چونکہ وعدہ تمام اقوام کے لئے تھا اور وعدہ یہ تھا کہ تمام بنی نوع انسان مکہ سے برکت حاصل کریں گے اور عقلاً یہ ممکن نہیں کہ شریعت کاملہ کے نزول کے بغیر ایسا ہو اس لئے قرآن کریم کی کامل شریعت کا نزول اس وعدہ کے پورا ہونے سے قبل ضروری تھا۔ قرآن کریم نے دعویٰ کیا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (البقرۃ:۳) یہ قرآن ایک کامل اور مکمل شریعت ہے....

یہی کتاب اَلْکِتٰبُ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ نساء میں فرمایا کہ

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّكُمْ ۔(النساء:۱۷۱)

اے تمام بنی نوع انسان سنو کہ ایک کامل رسول کامل صداقت لے کر تمہارے ربّ کی طرف سے تمہارے پاس پہنچ چکا ہے۔تمہارا ربّ جس نے تمہیں ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا تھا نشوونما اور ارتقا کے مختلف مدارج میں سے تمہیں گزارتا ہوا وہ اس مقام پر تمہیں لے آیا ہے کہ اپنی کامل جنتوں میں تمہیں داخل کرے۔سن لو کہ یہ رسول آ گیا فَاٰمِنُوْا جو وہ کہتا ہے اس پر ایمان لاؤ زبان سے بھی، دل سے بھی اور اپنے جوارح سے بھی تم اسے مانو اور اس کی تعلیم پر عمل کرو۔اگر تم اس کامل رسول پر ایمان لاؤ گے اور جو اکمل شریعت ہے اس کے مطابق تم اپنی زندگیاں گزارو گے تو تم خیر اُمت بن جاؤ گے اور جب تم خیر اُمت بنو گے اور صرف اس وقت جب تم خیر اُمت بنو گے تو تم اس قابل ہو گے کہ تمام بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچا سکو تمہارے ذریعہ سے تمام اقوام اور ہر زمانہ کے لوگ دینی اور دنیوی فوائد حاصل کریں گے جب تک تم اس مقام کو نہیں پاتے ساری دنیا اور دنیا کے ہر حصہ میں بسنے والی اقوام تم سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتیں اور جب تک تم سے ساری اقوام عالم فائدہ نہ اٹھا سکیں اس وقت تک نہیں کہا جا سکے گا کہ تم کو (اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) تمام دنیا کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور جب تک تمہارے متعلق یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ تمہیں تمام دنیا کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس وقت تک وہ وعدہ نہیں پورا ہوگا کہ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ۔

اس واسطے اٰمِنُوْا تم اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے قرآنی شریعت پر ایمان لاؤ۔اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالو۔تم خیر اُمت بن جاؤ گے۔پس نزول قرآن کے ذریعہ وُضِعَ لِلنَّاسِ کا مقصد حاصل ہوا اللہ تعالیٰ سورۃ آل عمران میں فرماتا ہے کہ كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ ۔(ال عمران:۱۱۱)

اس آیت میں دراصل یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ابراہیمی پیشگوئی اور وعدہ کے مطابق اُمت محمدیہ بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کر دی گئی ہے اور ایک اُمت ایسی تیار ہو چکی ہے جو اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ہے۔وہ تمام بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔اور اس کی دلیل یہاں یہ دی ہے کہ یہ خیر اُمت ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ہے تمام دنیا کی بھلائی کے لئے

اسے پیدا کیا گیا ہے اور یہ دلیل یوں ہے کہ اگر آپ تمام دنیا کی شریعتوں پر غور کریں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ تمام شریعتیں اس قوم کی استعداد کے مطابق نازل ہوتی رہی ہیں جس قوم کی طرف ان کو نازل کیا جاتا رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی طرف جو شریعت بھیجی گئی اس شریعت سے ہمیں پتہ لگتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی روحانی استعدادیں اور صلاحیتیں کیا تھیں جو شریعت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف نازل ہوئی اس سے ہمیں پتہ لگتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کی روحانی صلاحیتیں اور استعدادیں کیا تھیں۔ باقی سارے انبیاء کی قوموں کا بھی یہی حال تھا بہرحال اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو شریعت بھی جس قوم کی طرف نازل کی جاتی ہے وہ اس قوم کی روحانی صلاحیتوں اور استعدادوں کو مدنظر رکھ کر نازل کی جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی فرد یا کسی قوم پر وہ بوجھ نہیں ڈالتا جس کو وہ برداشت نہ کر سکے۔

دوسری حقیقت جو بڑی واضح ہے وہ یہ ہے کہ قرآنی شریعت پہلی تمام شریعتوں کے مقابلہ میں اکمل اور اتم اور کامل اور مکمل ہے۔ اگر آپ پہلی شرائع کے احکام (اوامر ونواہی) کو قرآن کریم کے احکام کے مقابلہ پر رکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم میں چھ سات صد سے زائد احکام (اوامر ونواہی) اس اُمت کے لئے نازل کئے گئے ہیں ان کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر معدودے چند احکام کا نزول ہوا۔ پھر سینکڑوں ایسے احکام قرآنیہ ہیں جو پہلی کسی شریعت میں بھی ہمیں نظر نہیں آتے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلی شرائع کے احکام (اوامر ونواہی) محدود تھے بوجہ اس کے کہ اس قوم کی استعدادیں محدود تھیں جس کی طرف انہیں نازل کیا گیا تھا اور قرآن کریم کا ایک کامل اور مکمل شریعت ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ بنی نوع انسان اس زمانہ میں جب قرآن کریم نازل ہوا کامل روحانی استعدادوں کے حامل تھے ورنہ قرآن کریم ان کی طرف نازل نہ ہوتا۔......

غرض وُضِعَ لِلنَّاسِ ایک مقصد بیت اللہ کی تعمیر کا تھا اور چونکہ یہ اس لحاظ سے بڑا ہی اہم ہے کہ باقی سارے مقاصد کا اس پہلے مقصد کے ساتھ یا پھر جو آخری مقصد رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ میں بیان ہوا میرا اس کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور میں چاہتا تھا کہ اس مقصد کو تفصیل کے ساتھ بیان کروں تا کہ آپ اچھی طرح سمجھ جائیں کہ وُضِعَ لِلنَّاسِ کی پیشگوئی پوری نہیں ہوسکتی تھی جب تک ایک ایسی اُمت دنیا میں پیدا نہ ہوجائے جو خیر الامم ہو اور وہ اُمت پیدا نہیں ہوسکتی

تھی جب تک کہ قرآن کریم کی شریعت جو کامل اور اکمل ہے اس کا نزول نہ ہو جائے اور ہر شریعت کا نزول قوم کی استعداد کے مطابق ہوتا ہے قرآن کریم کی شریعت چونکہ ہر پہلو اور ہر لحاظ سے کامل اور مکمل ہے اس لئے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں (اور اس کے علاوہ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے) کہ وہ اقوام جو اس زمانہ میں اور پھر قیامت تک اس کی مخاطب تھیں اور مخاطب رہیں گی وہ اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کے لحاظ سے قرآن کریم کی حامل ہو سکتی تھیں اور قرآن کریم کی تربیت کو قبول کرنے کے بعد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض اور برکات سے حصہ لینے کے بعد ان کی شکلیں ان کے حلیے کچھ اس طرح بدلے کہ ایک حقیقت بین نگاہ میں وہ نئے انسان بن گئے یعنی ان کی جو پہلی شکل تھی یا جو پہلے نقوش تھے ان کا کوئی حصہ باقی نہ رہا بلکہ نئے نقوش ابھر آئے جس طرح ریشم کا کیڑا جب ریشم بنا چکتا ہے تو اگر انسان اس کو موقع دے اور ریشم کا وہ جال جو اس نے اپنے اِرد گرد بنایا ہوا ہوتا ہے اس میں سے باہر نکل آئے تو وہ پہلا کیڑا نہیں رہتا بلکہ اس کا پہلا سر۔ پہلی آنکھیں اور پہلا حلیہ بالکل بدل جاتا ہے پہلے اس کے پر نہیں ہوتے لیکن ۲۴ یا ۴۸ گھنٹوں کے اندر اندر اس کے پر نکل آتے ہیں۔ نیا سر پیدا ہو جاتا ہے، نئی آنکھیں پیدا ہو جاتی ہیں بالکل یہی مثال ان لوگوں کی ہے کہ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے پہلے وہ زمین کے کیڑے تھے اور بعد میں ان کو اللہ تعالیٰ نے نئی بصارت دی، نئی آنکھیں دیں، نئے دماغ دیئے۔ پرواز کی نئی قوت عطا کی پھر وہ آسمان کی وسعتوں میں اڑنے لگے اور جب یہ قوم پیدا ہو گئی تو وُضِعَ لِلنَّاسِ کا وعدہ بھی پورا ہو گیا۔

(خطباتِ ناصر جلد اوّل صفحہ ۶۴۹ تا ۶۶۰)

میں بتا رہا ہوں کہ ان آیات کریمہ میں تئیس مقاصد تعمیر بیت اللہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ وہ بعثت نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کس طرح پورے ہوئے پچھلے ایک خطبہ میں وُضِعَ لِلنَّاسِ کی تفسیر اس پس منظر میں میں نے پیش کی تھی۔

دوسرا مقصد جو ان آیات میں بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ مُبَارَكٌ ہے میں نے بتایا تھا مُبَارَكٌ کا لفظ یہاں دو معنوں میں لیا جا سکتا ہے۔ اوّل یہ کہ خانہ کعبہ اقوام عالم کے نمائندوں کی قیام گاہ بنے گا اور تمام اقوام سے ایسے لوگ یہاں جمع ہوتے رہیں گے جو روحانی میدانوں کے شیر ہوں گے۔ بہادری کے ساتھ ثابت قدم رہنے والے ابطال کی یہ قیام گاہ ہو گی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اس

معنی میں بیت اللہ ساری دنیا کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل مُبَارَكًا کبھی نہیں ہوا یعنی اقوام عالم کے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل خانہ کعبہ کی، اس بیت اللہ کی محبت اس رنگ میں کبھی پیدا نہیں ہوئی کہ یہ اس کی طرف کھچے چلے آتے اور خانہ کعبہ میں کوئی ایسا سامان بھی نہ تھا کہ اگر اقوام عالم کے نمائندے وہاں پہنچتے تو ان کے دلوں کی تسکین کا وہ باعث بنتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اس لحاظ سے دنیا کا نقشہ بدل گیا اقوام عالم کے دلوں میں ایک طرف بیت اللہ کی محبت پیدا ہوئی تو دوسری طرف ایسے سامان بھی پیدا ہو گئے کہ لوگ وہاں جائیں اور روحانی یا منقولی یا عقلی یا دینی علوم سیکھیں اور وہ ایسے علوم ہوں جو تمام قوموں کو ہر زمانہ کے رہنے والوں کو دینی اور دنیوی فوائد پہنچا سکیں اس معنی کے لحاظ سے تاریخی ثبوت اتنا واضح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ اس غرض کو پورا کیا گیا ہے کہ اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرے معنی مُبَارَكًا کے جو یہاں چسپاں ہوتے ہیں یہ ہیں کہ مکہ کو مولد بنایا جائے گا ایک ایسی شریعت کا جس میں وہ تمام بنیادی صداقتیں اور ہدایتیں جمع کر دی جائیں گی جو انبیاء سابقین کی شریعتوں میں متفرق طور پر پائی جاتی تھیں۔ صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی شریعت ہے جس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں نے تمام پرانی صداقتوں کو اپنے اندر جمع کیا ہوا ہے۔ قرآن کریم سے قبل کسی شریعت نے بھی ایسا دعویٰ نہیں کیا اور نہ وہ ایسا دعویٰ کر سکتی تھی۔ کیونکہ ان کو نازل کرنے والا خدا جانتا تھا کہ ان شرائع کا نزول خاص قوموں اور ایک خاص زمانہ تک کے لئے ہے۔

قرآن کریم نے یہ دعویٰ مختلف آیات میں کیا ہے۔ جن میں سے بعض میں اس وقت اپنے دوستوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سورۃ الانعام میں فرماتا ہے: وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الانعام: ۱۵۶) یعنی یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے اور ایک ایسی شریعت ہے جو مُبَارَكٌ ہے تمام آسمانی کتابوں کی خوبیاں اور ان کی بنیادی صداقتیں گویا بہہ کر اس کے اندر آ گئی ہیں۔ اب تم اس کتاب مبارک کی کامل پیروی کرو (اِتَّبِعُوْهُ) اس سے تمہیں دو فائدے پہنچیں گے۔ ایک تو یہ کہ تم خدا کی پناہ میں آ جاؤ گے خدا تمہاری ڈھال بن جائے گا اور وہ تمام شیطانی وساوس سے تمہیں بچائے گا کیونکہ اس کتاب مبارک کی اتباع کے بغیر تقویٰ کی صحیح راہوں کا عرفان بھی حاصل نہیں ہوتا اور ان پر چل کر اللہ تعالیٰ کی کامل حفاظت کے اندر بھی انسان نہیں

آ سکتا اور دوسرا نتیجہ اس کا یہ نکلے گا کہ تُرْحَمُوْنَ اللہ تعالیٰ کے رحم کے تم مستحق ٹھہرو گے اور اس کے انعامات بے پایاں کے نتیجہ میں جسمانی اور روحانی آسودگی حاصل ہوگی۔ اسی طرح دوسری جگہ (سورۃ الانعام میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا۔ (الانعام: ۹۳) یعنی یہ قرآن عظیم الشان کتاب ہے جسے ہم نے اتارا ہے پہلی تمام اُمتوں کی ہر قسم کی برکات کی جامع ہے۔ (مُبٰرَكٌ) اور ان بشارتوں اور پیشگوئیوں کے مطابق نازل ہوئی ہے، جو اس کتاب کے متعلق پہلی کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ نیز ان تمام شرائع سابقہ کی بنیادی صداقتوں اور ہدایتوں پر مہر تصدیق ثبت کرنے والی ہے (اس کے اندر ان کو جمع کر دیا گیا ہے) اسی طرح ابراہیمی قربانیوں اور دعاؤں کا یہ ثمرہ ہے اس لئے تم اہل مکہ اور اہل عرب کو خبردار کرو کہ جس اکمل شریعت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا ہوا اور موجودہ شریعت تم پر نازل ہوگئی۔ اگر تم اس سے منہ پھیرو گے تو جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ تمہیں پہلے سے خبردار کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کے غضب کے تم مورد بنو گے اور عَذَابُ النَّارِ کی طرف گھسیٹ کر تمہیں لے جایا جائے گا۔

اس آیت میں بڑی وضاحت سے یہ مضمون پایا جاتا ہے کہ مُبٰرَكًا کا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور ابراہیم کی پیشگوئیوں کے ساتھ ہے لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا میں یہ مضمون بڑی وضاحت سے بیان ہوا ہے۔

تو ہر دو معنی کے لحاظ سے یہ خانہ خدا مُبٰرَكٌ اس وقت بنا جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے دنیا کے دل میں مکہ کی محبت پیدا کی گئی اور دنیا کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مکہ میں شریعت اسلامی کا نزول ہوا۔

تیسری غرض تعمیر کعبہ کی ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی کہ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ تمام جہانوں کے لئے اسے ہدایت کا مرکز بنایا جائے گا۔ یعنی یہاں ایک ایسی شریعت نازل ہوگی جس کا تعلق کسی ایک قوم یا کسی ایک زمانہ کے ساتھ نہ ہوگا بلکہ عَالَمِيْنَ کے ساتھ ہوگا۔ تمام اقوام کے ساتھ ہوگا۔ تمام اکنافِ عالم کے ساتھ ہوگا تمام جہانوں کے ساتھ ہوگا اور تمام زمانوں کے ساتھ ہوگا۔

اس سلسلہ میں پہلی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ پہلی کتب سماوی کے نزول کے وقت انسان کی کمزور استعدادیں اس لائق نہ تھیں کہ وہ کامل اور مکمل شریعت کی متحمل ہوسکتیں۔ اس لئے ان میں سے

کسی کا بھی یہ دعویٰ نہ تھا کہ وہ تمام اقوام عالم اور ہر زمانہ کے لئے ہیں لِلْعٰلَمِیْنَ ہونے کا دعویٰ قرآن سے پہلے کسی شریعت نے نہیں کیا۔ صرف قرآن کریم نے ہی یہ دعویٰ کیا ہے اور صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی دنیا کو پکار کر کہا کہ میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔ قرآن کریم میں بہت سی آیات اس مضمون کی پائی جاتی ہیں۔ میں نمونہ کے طور پر چند ایک یہاں بیان کروں گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ۔ (النحل: ۹۰) یعنی ہم نے تیرے پر وہ کتاب اتاری ہے جس میں ہر ایک چیز اور ہر ایک تعلیم کو بیان کر دیا گیا ہے، جو ہم بنی نوع انسان کی روحانی ترقیات کے لئے بیان کرنا چاہتے تھے یعنی ہمارے علم کامل میں جو تعلیمیں بنی نوع انسان کی اعلیٰ روحانی ترقیات کے لئے ضروری تھیں وہ ہم نے اس کتاب میں بیان کر دی ہیں اور دوسری جگہ فرمایا مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام: ۳۹) بنی نوع انسان کی کامل استعدادوں کی صحیح نشوونما کے لئے جس چیز کی بھی ضرورت تھی وہ اس میں بیان ہوگئی ہے اور کوئی تعلیم اس کے باہر نہیں رہی اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ دعویٰ کیا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (المائدۃ: ۴) یعنی قرآن کریم کے ذریعہ دین اپنے کمال اور روحانی نعمتیں اپنے انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔ اب صرف اسلام کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی رضا کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

> ''اس آیت میں صریح یہ بیان ہے کہ قرآن شریف نے ہی کامل تعلیم عطا کی ہے اور قرآن شریف کا ہی ایسا زمانہ تھا جس میں کامل تعلیم عطا کی جاتی۔ پس یہ دعویٰ کامل تعلیم کا جو قرآن شریف نے کیا۔ یہ اُسی کا حق تھا۔ اِس کے سوا کسی آسمانی کتاب نے ایسا دعویٰ نہیں کیا۔ جیسا کہ دیکھنے والوں پر ظاہر ہے کہ تورات اور انجیل دونوں اس دعویٰ سے دستبردار ہیں''۔ (دیباچہ براہین احمدیہ حصہ پنجم روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۴)

.....میں نے بتایا تھا کہ ہدایت کے چار معنی لغت میں بیان ہوئے ہیں۔ پہلے معنی کے متعلق جو خطبہ چھپا ہے اس میں کچھ تھوڑا سا ابہام ہے۔ اس کی میں وضاحت کر دیتا ہوں۔ ہدایت کے پہلے معنی یہ ہیں کہ عقل اور فراست کو جس راہنمائی کی ضرورت ہے اسے بھی ہدایت کہتے ہیں۔ یعنی عقل اور فراست میں اور علوم کے حصول میں اور اس کی تحقیق میں بھی انسان میں جو طاقتیں ودیعت کی گئی ہیں

محض وہ کافی نہیں بلکہ ان کے لئے بھی آسمان سے کسی ہدایت کی ضرورت ہے۔

تو یہ ہدایت قدرِ مشترک ہے تمام انسانوں میں، اس کا کسی مذہب کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔ اس قدرِ مشترک کی راہنمائی بھی قرآن کہتا ہے کہ میں کرتا ہوں اور عقل تو خود اندھی ہے اگر نیر الہام اس کے ساتھ نہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ بتانے کے لئے کہ جسمانی قابلیتیں اور روحانی استعدادیں کافی نہیں ہوتیں جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہو کر آسمان سے اس کی ہدایت کا سامان پیدا نہ کیا جائے۔......قرآن یہ کہتا ہے کہ علاوہ بعض دوسری ہدایتوں کے جو آسمان سے نازل ہوتی ہیں ہم عقل کی بھی راہنمائی کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس مضمون کو بڑے لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ وحی والہام کے ذریعہ انسانی عقلوں کو اللہ تعالیٰ تیز کرتا ہے اور پھر ذہن رسا سے جو علوم پرورش پاتے ہیں قرآن کریم ان سے خادموں کی طرح خدمت لیتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

''خدا تعالیٰ کی ہستی اور خالقیت اور اس کی توحید اور قدرت اور رحم اور قیومی اور مجازات وغیرہ صفات کی شناخت کے لئے جہاں تک علوم عقلیہ کا تعلق ہے استدلالی طریق کو کامل طور پر استعمال کیا ہے اور اس استدلال کے ضمن میں ...تمام علوم کو نہایت لطیف وموزوں طور پر بیان کیا ہے....اور....علوم مذکورہ سے ایک ایسی شائستہ خدمت لی ہے جو کبھی کسی انسان نے نہیں لی''۔ (سرمہ چشم آریہ، روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۷۲، ۷۳ حاشیہ)

اور یہ قرآن کریم کا کمال ہے کہ باقی ادیان تو رائج الوقت علوم کے سامنے دب سکتے ہیں لیکن اسلام ہی ایک ایسا دین ہے اور قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو کسی عقلی علم کے سامنے دبتی نہیں بلکہ اس کو خادم سمجھتی اور اس سے خدمت لیتی ہے۔

ہدایت کے دوسرے معنی شریعت کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہو۔

تو هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ شریعت جو عالمین کے لئے، تمام جہانوں اور تمام زمانوں کے لئے ہے اور صرف قرآن کریم ہی هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ہے اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو مخاطب کر کے فرمایا اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (الاعراف:۱۵۹) قرآن کریم بھرا پڑا ہے اس مضمون سے کہ وہ تمام جہانوں اور تمام زمانوں کے لئے ہے۔ یہ صرف ایک دعویٰ نہیں بلکہ

ایک نا قابلِ تردید صداقت ہے جس کی وضاحت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الفاظ میں سنیئے۔ حضورؑ فرماتے ہیں

”جس قدر معارف عالیہ دین اور اس کی پاک صداقتیں ہیں اور جس قدر نکات و لطائف علم الٰہی ہیں جن کی اس دنیا میں تکمیل نفس کے لئے ضرورت ہے۔ ایسا ہی جس قدر نفس امّارہ کی بیماریاں اور اس کے جذبات اور اس کی دوری یا دائمی آفات ہیں یا جو کچھ ان کا علاج اور اصلاح کی تدبیریں ہیں اور جس قدر تزکیہ اور تصفیہ نفس کے طریق ہیں اور جس قدر اخلاق فاضلہ کے انتہائی ظہور کی علامات وخواص ولوازم ہیں یہ سب کچھ باستیفائے تام قرآن مجید میں بھرا ہوا ہے اور کوئی شخص ایسی صداقت یا ایسا نکتہ الٰہیہ یا ایسا طریق وصول الی اللہ یا کوئی ایسا نادر یا پاک طور مجاہدہ و پرستش الٰہی کا نکال نہیں سکتا جو اس پاک کلام میں درج نہ ہو“۔

(سرمہ چشم آریہ۔ روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۴۷ حاشیہ)

اس کی تفصیل آگے حضورؑ نے بیان فرمائی ہے۔ پس قرآن کریم کا ہی یہ دعویٰ ہے کہ انسانی نفس کو روحانی کمالات تک پہنچانے کے لئے جس جس ہدایت اور صداقت کی ضرورت تھی وہ سب میرے اندر پائی جاتی ہے، اگر تم میری اتباع کرو گے تو روحانی بیماریوں سے محفوظ ہو جاؤ گے اور روحانی ترقیات کے دروازے تم پر کھولے جائیں گے اور تم اپنے نفس کا کمال حاصل کرلو گے۔

.......اور دوسرے قرآن کریم کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ فرمایا ہے کہ قرآن کریم کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ میں غیر محدود انوار کے، میں غیر محدود برکات کے، میں غیر محدود مقامات قرب کے دروازے اپنے ماننے والوں اور قرآن کریم کی اتباع کرنے والوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیار کرنے والوں پر کھولتا ہوں چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (التحریم:۹)

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسلام کی اتباع اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کے نتیجہ میں اس دنیا میں نور عطا ہوتا ہے، وہ نور جس طرح اس دنیا میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا ہے اور ان کی راہنمائی کرتا ہے اور روحانی راہوں کو ان پر روشن کرتا رہتا

ہے اسی طرح دوسری دنیا میں بھی یہ نور مومن سے جدا نہیں ہوگا اور یہ نہ سمجھ لینا کہ قرآن کریم کی کامل اتباع کے نتیجہ میں صرف اس دنیا میں غیر محدود رحمتوں کے دروازے کھلتے ہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی ان رحمتوں پر کوئی حد بندی نہیں لگائی جاسکتی۔ اس وقت بھی رحمتوں کے یہ دروازے کھلے رہیں گے کیونکہ دوسری جگہ فرمایا ہے کہ جو اس دنیا میں اندھا ہوگا وہ اس دنیا میں بھی بینائی کے بغیر ہوگا۔ یہاں اس کے مقابل یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ جو اس دنیا میں روشنی اور نور رکھتا ہوگا وہ نور اس دنیا میں بھی اس کے ساتھ جائے گا اور یہ نہیں کہ اس دنیا میں روحانی ترقی کے دروازے تو ایسے شخص پر کھلے رہیں گے اور وہاں جاکے صرف فصل کٹنے کے بعد جو اس کے پھلوں کے کھانے کا وقت ہوتا ہے۔ صرف ویسا ہی وقت ہوگا پھر اور مزید ترقی اسے نہیں ملے گی۔ جو پہلے اس نے حاصل کر لی ان نعمتوں سے صرف وہی حظ اور سرور حاصل کرتا رہے گا۔ یہ بات نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے انسانی روح کے لئے ایسے سامان پیدا کر دئے ہیں کہ جو نور وہ قرآن کریم کی متابعت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اس دنیا میں حاصل کرتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ وہاں بھی اس کی ترقیات کے دروازے کھولتا رہے گا اور اس کی راہوں کو روشن کرتا چلا جائے گا اور کہیں بھی اس راہ نے ختم نہیں ہونا۔ کیونکہ بندے اور خدا کے درمیان جو فاصلے ہیں ان کی انتہا نہیں۔ پس بندے اور خدا کے درمیان جو مقامات قرب ہیں ان کی حد بندی اور تعین کیسے کی جاسکتی ہے؟ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

’’اس آیت میں یہ جو فرمایا کہ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہیں گے کہ ہمارے نور کو کمال تک پہنچا یہ ترقیات غیر متناہیہ کی طرف اشارہ ہے یعنی ایک کمال نورانیت کا انہیں حاصل ہوگا، پھر دوسرا کمال نظر آئے گا اس کو دیکھ کر پہلے کمال کو ناقص پائیں گے پس کمال ثانی کے حصول کے لئے التجا کریں گے اور جب وہ حاصل ہوگا تو ایک تیسرا مرتبہ کمال کا ان پر ظاہر ہوگا پھر اس کو دیکھ کر پہلے کمالات کو ہیچ سمجھیں گے اور اس کی خواہش کریں گے۔ یہی ترقیات کی خواہش ہے جو اَتۡمِمۡ کے لفظ سے سمجھی جاتی ہے۔ غرض اسی طرح غیر متناہی سلسلہ ترقیات کا چلا جائے گا۔ تنزل کبھی نہیں ہوگا‘‘۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۴۱۲، ۴۱۳)

تو قرآن کریم نے ایسا دعویٰ بھی کیا، قرآن کریم نے ایسا کر کے بھی دکھایا یعنی ہزاروں لاکھوں

مقدس بندے خدا تعالیٰ کے اسلام میں ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اسلام سے نور حاصل کر کے جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے روشنی حاصل کر کے، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے عشق سے ایک چنگاری لے کر ایسا نور حاصل کیا کہ وہ اس دنیا میں غیر متناہی ترقیات کے حامل ہوئے اور جو انہیں اُخروی زندگی میں ملے گا جس کا وعدہ ان سے کیا گیا ہے اس کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے جیسا کہ احادیث میں بیان ہوا ہے کہ وہ ایسی عجیب نعمتیں ہیں کہ ان کا تصور بھی انسان یہاں نہیں کر سکتا۔

ہدایت کے چوتھے معنی جیسا کہ میں نے بتایا تھا۔ انجام بخیر ہونے کے ہیں یعنی جنت کے مل جانے کے اور مقصد حیات کے حصول کے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (البقرۃ:۶) کہ وہ لوگ جو قرآن کریم کی تعلیم پر عمل کرنے والے ہیں اس پر وہ مضبوطی سے قائم ہیں اور ان کے ربّ کی ربوبیت کاملہ نے جس کامل ہدایت کو نازل کیا وہ اس ہدایت کے اوپر قائم ہیں۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ فلاح کا لفظ عربی زبان میں کامل کامیابی کو کہتے ہیں کہ جس کے مقابلہ میں کوئی کامیابی کامیابی نہیں رہتی جس میں کسی قسم کا کوئی نقص نہ ہو جس میں کسی قسم کی کوئی خامی نہ ہو جو بھرپور کامیابی ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ فرمایا کہ جو لوگ اپنے ربّ کی (جو انسان کی ربوبیت کرتا ہوا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ایک خاص بلند مقام پر ان کو لے آیا اور کامل استعدادیں اور کامل صلاحیتیں ان کو عطا کیں) ہدایت پر قائم ہیں۔ وہ ایک حقیقی اور کامل فلاح اور کامیابی کو پاتے ہیں اور پہلی تمام اُمتوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔

تو اس وقت اس خطبہ میں میں نے تعمیر کعبہ سے تعلق رکھنے والے دو مقاصد کے متعلق کچھ بیان کیا ہے۔ ایک یہ کہ (مُبٰرَكًا) اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ کعبہ کو مبارک بنائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ ہر دو معنی میں بیت اللہ مبارک بن گیا اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ یہاں ایک ایسی ہدایت بھیجے جو هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ہو۔ شریعت کے کمال کی وجہ سے بھی اور اپنے افاضہ کے لحاظ سے بھی اور یہ وعدہ بھی قرآن کریم کے ذریعہ پورا ہوا ہے۔ ورنہ مکہ میں تو کوئی اور شریعت تھی ہی نہیں لیکن جو دوسری شریعتیں ہیں انہوں نے بھی نہ یہ دعویٰ کیا۔ اور نہ وہ یہ دعویٰ کر سکتی تھیں قرآن کریم نے ہی یہ دعویٰ کیا ہے اور قرآن کریم نے اس دعویٰ کو عملی میدان میں ثابت بھی کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسلام میں ہزاروں لاکھوں ایسے مقدس وجود پیدا ہوئے جن کی زندگیاں دلیل ہیں اس بات پر کہ

جو بھی قرآن کریم کی اتباع کرتا اور اس ہدایت کے پیچھے چلتا ہے جسے خدا تعالیٰ نے هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ قرار دیا ہے وہ خدا تعالیٰ کی انتہائی برکتوں سے حصہ لیتا اور اس کا انجام بخیر ہوتا ہے اور انسانی نفس کو کمال تک پہنچانے کے لئے اور اس کے تزکیہ کو پورا کرنے کے لئے جس چیز کی بھی ضرورت ہے وہ قرآن کریم میں پائی جاتی ہے کیونکہ ان لوگوں نے قرآن کریم پر عمل کیا اور خدا تعالیٰ کی نگاہ میں ان کا وجود مبارک اور کامل وجود بنا اور اللہ تعالیٰ کی فعلی شہادت اس بات پر گواہ ہے کہ فی الواقع یہ لوگ خدا تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں اور روحانی میدانوں میں ہر لحظہ اور ہر آن ان کا قدم آگے ہی آگے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس گروہ میں شامل کرے۔

(خطباتِ ناصر جلد اوّل صفحہ ۶۶۴ تا ۶۷۵)

چوتھی غرض تعمیر کعبہ سے یہ تھی یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا چوتھا وعدہ یہ تھا کہ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ میں نے بتایا تھا کہ اس فقرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ خدا کا یہ گھر ایسی آیات و بینات اور ایسے نشانات اور تائیدات سماوی کا منبع بنے گا جو ہمیشہ کے لئے زندہ رہیں گی یعنی اس تعمیر سے ایسی امت مسلمہ کا قیام مدنظر تھا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے نشان قیامت تک دنیا پر ظاہر ہوتے رہیں۔

قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ صرف اسی کی اتباع کے نتیجہ میں قیامت تک کے لئے یہ دروازہ کھولا گیا ہے اور یہ کہ ہر قوم اور ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جو اس کی برکتوں سے حصہ لیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ اپنے نشانوں کو ظاہر کرتا رہے گا۔

آیات بیّنات پہلے انبیاء کو بھی دیئے گئے تھے لیکن وہ ایسی آیات بینات تھیں جن کا تعلق صرف ان کی قوم اور ان کے زمانہ سے تھا۔ تمام بنی نوع انسان سے ان کا تعلق نہ تھا اور ہر زمانہ سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا لیکن ان آیات میں تو مضمون ہی یہ بیان ہوا ہے کہ یہ وہ مقاصد ہیں جن کا تعلق تمام بنی نوع انسان کے ساتھ ہے ہر قوم اور ہر زمانہ کے ساتھ ہے اسی لئے اس مضمون کی ابتدا ہی اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (اٰل عمران:۹۷) میں لِلنَّاسِ کے ساتھ کی گئی ہے تو اگرچہ آیات بینات پہلی امتوں کو بھی دیئے گئے لیکن ایسی آیات بینات جن کا تعلق ہر قوم اور ہر زمانہ سے تھا وہ صرف اور صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ

صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ (العنکبوت:۵۰) اس آیۂ کریمہ میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسیہ سے ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جنہیں کامل علم اور کامل معرفت عطا ہوتی رہے گی اور اس کامل معرفت کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں اپنے ربّ کے لئے کامل خوف بھی پایا جائے گا اور اس کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں اپنے ربّ کے لئے کامل محبت بھی پیدا کی جائے گی اور وہ اپنے ربّ کی قدر کرنے والے ہوں گے تو ایسے لوگ چونکہ پیدا ہوتے رہیں گے اس لئے وہ آیات بینات جن کا قرآن کریم کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم مجسّم ہے آیات بینات سے۔ وہ ان کے سینوں سے نکلتے رہیں گے۔ اور اس روشنی سے دنیا ہمیشہ منور ہوتی رہے گی لیکن کچھ لوگ امت مسلمہ میں ایسے بھی پیدا ہوں گے جو ظالم ہوں گے اور قرآن کریم کے فیوض کے ان دروازوں کو اپنے پر بند کرنے والے ہوں گے ایسے لوگوں کے ذریعہ سے بے شک اللہ تعالیٰ کی آیات بینات ظاہر نہیں ہوں گی لیکن اُوْتُوا الْعِلْمَ یعنی وہ لوگ جنہیں کامل علم عطا کیا جائے گا وہ ہمیشہ اُمت مسلمہ میں پیدا ہوتے رہیں گے اور آیات بینات کا دروازہ قیامت تک امت مسلمہ پر کھلا رہے گا۔

یہ صرف ایک دعویٰ نہیں ہے بلکہ تاریخ اسلام اس بات پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی سچائی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ثابت کرنے کے لئے زمین اور آسمان اور ہر زمانہ کو نشانوں سے بھر دیا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

”دوسری علامت سچے مذہب کی یہ ہے کہ مردہ مذہب نہ ہو بلکہ جن برکتوں اور عظمتوں کی ابتدا میں اس میں تخم ریزی کی گئی تھی وہ تمام برکتیں اور عظمتیں نوع انسان کی بھلائی کے لئے اس میں اخیر دنیا تک موجود رہیں تا موجودہ نشان گزشتہ نشانوں کے لئے مصدّق ہو کر اس سچائی کے نور کو قصہ کے رنگ میں نہ ہونے دیں۔ سو میں ایک مدت دراز سے لکھ رہا ہوں کہ جس نبوت کا ہمارے سید و مولیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا تھا اور جو دلائل آسمانی نشانوں کے آنجناب نے پیش کئے تھے وہ اب تک موجود ہیں اور پیروی کرنے والوں کو ملتے ہیں تا وہ معرفت کے مقام تک پہنچ جائیں اور زندہ خدا کو براہ راست دیکھ لیں۔ (مجموعہ اشتہارات جلد ۲ صفحہ ۳۱۱)

.....میں بتا یہ رہا ہوں کہ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ کا جو وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وعدے کو پورا کرنے والے ہیں اور تاریخ اس بات پر شاہد ہے پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں دنیا نے اللہ تعالیٰ کے لاکھوں نشانات کا مشاہدہ کیا ہے اور آپؑ کے بعد آپ کے خلفاء کے ذریعہ سے بھی اور دوسرے جو بزرگ جماعت احمدیہ میں پائے جاتے ہیں ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نشان ظاہر کرتا رہتا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی برکت کے طفیل آپ کے ماننے والوں پر یہ حقیقت بھی وضاحت کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے کہ اس قسم کی باتیں عام طور پر ظاہر نہیں کرنی چاہئیں کیونکہ ان کے نتیجہ میں انانیت پیدا ہوتی ہے اور بعض دفعہ یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو انسان مول لینے والا نہ ہو جائے۔

تو قرآن کریم سے نیز جو نمونہ اولیاء امت کا تاریخ میں محفوظ ہے اور جو سلوک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشاق اور اپنی رضا کی راہوں میں فدا ہونے والوں سے اللہ تعالیٰ کرتا رہا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تمام اقوام میں اور ہر زمانہ میں آیاتِ بینات موجود ہیں اور ان کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے۔ دوسرے مذاہب نہ ایسا دعویٰ کر سکتے ہیں اور نہ اسے ثابت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

پانچویں غرض تعمیر کعبہ سے یہ بتائی گئی تھی۔ مَقَامُ اِبْرٰهِيْمَ اور یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اس ابراہیمی مقام کے ذریعہ سے عشاقِ الٰہی کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جاتی رہے گی جو تمام دنیوی علائق سے منہ موڑ کر خدا کی رضا پر اپنی تمام خواہشات کو قربان کر کے مقام فنا کو حاصل کرنے والی ہوگی۔ سوچا جائے تو اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ کے نتیجہ میں ہی مقام ابراہیم کا حصول ممکن ہوتا ہے ورنہ نہیں۔ یہ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ اور ''مقامِ ابراہیم'' کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ تو چونکہ اُمتِ محمدیہ میں اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ کا ایک سمندر ہمیشہ موجزن رہتا ہے اس لئے اُمتِ محمدیہ میں ممکن ہو گیا ہزاروں لاکھوں ایسے بزرگوں کا پایا جانا کہ جو مقامِ ابراہیم کو حاصل کرنے والے ہوں دراصل مقامِ ابراہیم مقامِ محمدیّت کا ظلّ ہے۔ عین اس مقام تک پہنچ جانا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہے یہ تو ممکن نہیں لیکن اس کے بعد جو دوسرا مقام ہے وہ مقام ابراہیم ہے۔ ایک ظلّ کی شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ سے حصہ لیا ہے۔ قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میرے ماننے والوں میں ایسے لوگ کثرت سے

پیدا ہوں گے جو فنا کے اس مقام کو حاصل کرنے والے ہوں گے۔........

یہ وہ مقامِ ابراہیم ہے جس کا وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا۔ اس کی بشارت اپنے ربّ کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پائی اور خدا تعالیٰ جو سچے وعدوں والا ہے اس نے اپنے اس وعدے کو سچا ثابت کر دکھایا اور امت مسلمہ میں لاکھوں وجود ایسے پیدا کئے جو مقام ابراہیم تک پہنچنے والے تھے۔

چھٹا وعدہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا وہ ان آیات کے اس ٹکڑے میں بیان ہوا ہے ''وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا'' میں نے بتایا تھا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو بیت اللہ میں داخل ہوگا یعنی ان عبادات کو بجالائے گا جن کا تعلق خدا تعالیٰ کے اس گھر سے ہے۔ دنیا اور آخرت کے جہنم سے خدا کی پناہ میں آجائے گا اور اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دئے جائیں گے اور نارِ جہنم سے وہ محفوظ ہو جائے گا وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔ جو اس گھر میں داخل ہوگا اس آگ سے محفوظ ہو جائے گا (جو خدا تعالیٰ نے منکروں کے لئے بھڑکائی ہے) چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۃ نمل میں فرماتا ہے وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ (النحل:۹۰) یعنی اسلامی ہدایت کے مطابق اعمالِ صالحہ بجالانے والوں کو اللہ تعالیٰ بہتر اور احسن بدلہ دے گا اور نفخ صُور کی گھڑی میں ایسے لوگ خوف جہنم سے محفوظ رہیں گے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ ان کو یہ بشارت دے گا کہ تمہیں نار جہنم کی طرف نہیں لے جایا جائے گا بلکہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا اس واسطے کسی قسم کا خوف نہ کرو۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ (الحجر:۴۶، ۴۷) متقی لوگ یقیناً باغوں اور چشموں والے مقام میں داخل ہوں گے انہیں کہا جائے گا کہ تم سلامتی کے ساتھ بے خوف وخطر ان میں داخل ہو جاؤ تو یہ امن ہے جو قرآن کریم کے ذریعہ سے اس کے کامل متبعین کو ملتا ہے۔ فرمایا تھا ''مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا'' عین یہی الفاظ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائے اور فرمایا کہ ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (الفتح:۲۸) کہ تم مسجد حرام میں امن کے ساتھ داخل ہو گے اور وہ وعدہ پورا ہوا۔

ایک تو اس کی ظاہری تفسیر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے سامان پیدا کئے اور بغیر جنگ کے کفار مکہ

نے (جنہوں نے اپنی ساری عمر یں اسلام کو مٹانے کے لئے صرف کر دی تھیں) ہتھیار ڈال دیئے اور فرشتوں نے جن کا آسمان سے نزول ہوا ان کے دلوں میں اس قدر خوف پیدا کر دیا کہ لڑائی کی ان کو ہمت ہی نہ پڑی۔

لیکن اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ تم ہی وہ امت ہو جو اس وعدہ کو پورا کرنیوالی ہو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا جو اس میں داخل ہوگا وہ امن میں آجائے گا تمہارے ذریعہ سے وہ وعدہ پورا ہوا میں اس کی وضاحت کر چکا ہوں کہ یہ تمام وعدے وہ ہیں جن کا تعلق تمام بنی نوع انسان سے ہے۔ ہر قوم اور ہر زمانہ کے ساتھ کسی خاص قوم یا کسی خاص زمانہ کے ساتھ یہ مخصوص نہیں ہیں تو مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا کے معنی یہ ہوئے کہ خواہ دنیا کی کسی قوم سے ہی تعلق نہ رکھتا ہو یا کسی زمانہ میں ہی رہنے والا کیوں نہ ہو جو شخص بھی مناسکِ حج خلوص نیت سے ادا کرے گا وہ نارِ جہنم سے محفوظ ہو جائے گا۔ چنانچہ حدیث میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ حَجَّ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ (ترمذی کتاب الحج باب ماجاء فی ثواب الحج و العمرۃ) (یاد رکھیں کہ يَرْفَثَ اور يَرْفِثُ اور يَفْسُقُ اور يَفْسِقَ دونوں طرح عربی زبان میں یہ الفاظ بولے جاتے ہیں) کہ جو شخص گندی اور فحش باتوں سے پرہیز کرے یعنی جو شخص حج کرے اور مناسک حج ادا کرتے ہوئے فحش کلامی سے بچتا رہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اندرونہ اس قدر پاکیزہ ہو کہ فحش بات اس کی زبان پر آ ہی نہ سکتی ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ باقی گیارہ ماہ کچھ دن تو ہر قسم کی فحش کلامی کرتا رہے صرف ان دنوں رفث سے بچے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس کا اندرونہ اتنا پاک ہو چکا ہو اور گندگی اس کے سینہ سے اتنی دور ہو چکی ہو کہ فحش بات، گندی بات اس کے منہ پر آ ہی نہ سکے اور جو حق اور صلاح کے طریق سے خروج نہ کرے یعنی شرعی حدود سے باہر نہ ہو ان کی پابندی کرنے والا ہو اور اطاعت کا حق ادا کرنے والا ہو۔ تو جو شخص اس خالص نیت کے ساتھ اور ان خالص اعمال کے ساتھ اور ان پاکیزہ آداب کے ساتھ حجِّ بیت اللہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا اس سے وعدہ ہے کہ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور جس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے وہ یقیناً نار جہنم سے بچا لیا گیا۔

ایک اور طرح بھی انسان اس دنیا میں بھی اور اس دنیا میں بھی نار جہنم سے بچ جاتا ہے اور وہ

اس طرح کہ مَنْ دَخَلَہٗ جو مقامِ ابراہیم میں داخل ہو" كَانَ اٰمِنًا " اللہ تعالیٰ کی امان میں اور امن میں آجاتا ہے۔.......

ساتواں وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ کہا گیا تھا کہ صرف تیری نسل پر ہی یہ حج فرض نہ رہے گا بلکہ ایک ایسا نبی یہاں مبعوث کیا جائے گا جس کی شریعت عالمگیر ہوگی اور اس شریعت کے نزول کے بعد اقوام عالم پر حج کو فرض کر دیا جائے گا اور اس طرح اس خانۂ خدا کو مرجع خلائق اور مرجع عالم بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہ وعدہ پورا نہیں ہوا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور قرآنی شریعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تب اس شریعت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان پر حج کو فرض کر دیا۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ج فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ (البقرۃ:۱۹۸) کہ اے بنی نوع انسان! تم یاد رکھو کہ حج کے مہینے سب کے جانے پہچانے ہیں پس جو شخص حج کو اپنے پر فرض سمجھتے ہوئے حج کرنے کا پختہ ارادہ کرے وہ حج کے ایام میں (جیسا کہ دوسرے دنوں میں) کوئی شہوت کی بات یا کوئی نافرمانی کی بات یا کسی قسم کے جھگڑے کی بات نہ کرے یہ اس کے لئے جائز نہ ہوگا اور پھر فرمایا کہ جو کام بھی تم کرو گے اللہ ضرور اس کی قدر کو پہچان لے گا۔ وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ تمہارا تعلق سفید نسل سے ہے یا تمہارا تعلق سیاہ نسل سے ہے۔ بلکہ خواہ تم کسی بھی قوم کے فرد کیوں نہ ہو، کسی بھی خطہ زمین کے رہنے والے کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے حج کو خدا کے کہنے کے مطابق اپنے لئے ضروری عبادت سمجھو گے اور جب وہ شرائط تمہارے حق میں پوری ہو جائیں گی جن کا تعلق حج کرنے کے ساتھ ہے اور اس فریضہ کو فریضہ جانتے ہوئے تم حج کرو گے اور حج کے دوران بھی ان تمام ہدایتوں کا پاس کرو گے جو ہدایتیں اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں تمہیں دی ہیں تو پھر اے تمام بنی نوع انسان! یہ سن لو کہ نیکی کا جو کام بھی تم کرو گے اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں تمہاری قدر قائم ہو جائے گی۔ وہ تمہاری نیکی کو پہچانے گا۔ کوئی چیز اس کی نظر سے غائب نہیں ہے اور اس قدر کے نتیجہ میں اس کی بے شمار نعمتوں کے تم وارث ہو گے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ حج بیت اللہ صرف ظاہری مناسک حج کا ہی نام نہیں بلکہ ہر عبادت اسلامی کے پیچھے اس کی ایک روح ہے ظاہری عبادت جسم کا

رنگ رکھتی ہے۔اس کے پیچھے ایک روح ہے جو شخص روح کا خیال نہ رکھے اور صرف جسم پر فریفتہ ہو وہ ایک مردہ کی پرستش کرنیوالا ہے۔اس کو ان عبادات کا جن کی روح کا خیال نہیں رکھا گیا۔کوئی ثواب نہیں ملے گا۔ بلکہ اس کے ساتھ اس کے ربّ کا وہی سلوک ہوگا جو ایک مردہ پرست کے ساتھ ہونا چاہیے۔
(خطباتِ ناصر جلد اوّل صفحہ ۶۷۸ تا ۶۸۸)

قرآن عظیم نے بتایا ہے کہ اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ کی رو سے وہ گھر جو شریعت کے قیام کے لئے پہلے پہل انسان کو ملا تھا، وہ مکہ میں ہے اور اس وجہ سے مکہ کو قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق اُمّ القریٰ کہتے ہیں۔جس طرح ماں سے اس کے بچے وابستہ ہوتے ہیں اسی طرح وہ شہر جس سے بہت سے دوسرے شہر وابستہ ہوتے ہیں اُمّ القریٰ (یعنی بستیوں کی ماں) کہلاتا ہے اور یہ حیثیت مکہ مکرمہ کو حاصل ہے۔قرآن کریم کی دو بنیادی صفات ہیں۔ایک یہ کہ قرآن عظیم پہلی صداقتوں کا جامع ہے اور دوسرے یہ کہ ان صداقتوں کو بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہے جن تک پہلوں کی پہنچ نہیں تھی۔ چونکہ مکہ مکرمہ کا تعلق اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيۡ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (ال عمران:۹۷) کی رو سے تمام پہلی شریعتوں سے ہے اور قرآن کریم کے متعلق آیا ہے کہ پہلے انبیاء پہلی کتب اور پہلی قوموں کو حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو بشارتیں دی گئی تھیں وہ ان کو پورا کرنے والا ہے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہر نبی کو بتایا گیا تھا اور آپ کی بشارت دی گئی تھی) اس لئے گویا قرآن عظیم ان بشارتوں کا مصدّق ہو کر بھیجا گیا ہے۔ جہاں تک پہلی بشارتوں کی تصدیق کا تعلق ہے قرآن کریم جس امت پر نازل ہوا اور جس کی بدولت عظیم ذمہ داریاں ان پر ڈالی گئیں مکہ مکرمہ اس لحاظ سے ان کے لئے اُمّ القریٰ بنا اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ نوعِ انسانی کی عام اور وسیع اور کامل ہدایت کے لئے مدینہ کو اپنا مرکز بنایا تھا۔اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل مدینہ نوعِ انسان کے لئے اُمّ القریٰ بن گیا۔ چنانچہ مؤطا امام مالکؒ کی ایک حدیث بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ پہلے مکہ کو حرم بنایا گیا تھا اور اب میرے ذریعہ مدینہ کو حرم بنایا گیا ہے۔

پس مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ ہم مسلمانوں کے لئے امّ القریٰ کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی یہ وہ مراکز ہیں جن سے دنیا کے سارے شہروں کا تعلق ہے اور جہاں سے دنیا کی رہنمائی کی مہم شروع ہوئی۔

اُمّ القریٰ کی یہ اصطلاح ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ قرآنی ہدایت اور شریعت کو مستحکم کرنے اور اسلام کو پھیلانے کی غرض سے مکہ اور مدینہ کے ماتحت بہت سے اور مراکز بھی بنیں گے۔ چنانچہ جب ہم اپنی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر کئی ایسے مراکز نظر آتے ہیں جن کا تعلق مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سے ہے مثلاً سپین ہے۔ سپین میں اسلامی حکومت کا جو دارالخلافہ تھا (ایک دوجگہ بدلا بھی ہے تاہم ایک وقت میں جو بھی دارالخلافہ تھا) وہ یورپ میں اسلام کے نور کو پھیلانے اور اسلام کی اشاعت کیلئے مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اسی طرح تاشقند وغیرہ علاقوں میں جو مجدد پیدا ہوئے یا افریقہ کے صحراؤں سے تعلق رکھنے والے جو مجددین اور اولیاء اللہ آئے ان کے مرکز خانہ کعبہ ہی کے طفیل اور اس کے ظلّ کے طور پر اس غرض کیلئے بنے تھے کہ اسلام کی اشاعت ہو۔ گویا ایسی جگہیں اپنے اپنے دائرہ اور اپنے اپنے زمانہ کے لحاظ سے اشاعت اسلام کا مرکز بن گئیں اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اُمّ القریٰ ٹھہرے۔ (خطباتِ ناصر جلد پنجم صفحہ ۳۴۱ تا ۳۴۲)

تعمیر نو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ نے کروائی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قریباً دو ہزار سال قبل اس میں تئیس مقاصد ملحوظ تھے۔ اور میں نے بتایا کہ سارے کے سارے مقاصد ایسے تھے جن کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے نہیں تھا نہ اس زمانہ سے تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبل کا زمانہ تھا۔ نہ اس زمانہ سے تھا جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے بعد کا زمانہ محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کی بعثت تک کا زمانہ تھا بلکہ یہ سارے ہی مقاصد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کی بعثت سے تعلق رکھتے تھے اور جو چار بنیادی فرائض آپ کے تھے اور جو مقاصد تھے آپ کی بعثت کے، ان چاروں سے تعلق تھا ان مقاصد کا۔ مثلاً قرآن کریم نے ہمیں بتایا کہ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ کہ نوع انسان جو ہے ساری کی ساری، سب انسانوں کیلئے پہلا گھر، افادیت کے لحاظ سے، خدا تعالیٰ کی نعمتوں کے حصول کے لحاظ سے، دنیوی ترقیات کے لحاظ سے، روحانی رفعتوں کے لحاظ سے، جو تعمیر کیا گیا جس کی بنیاد رکھی گئی، وہ بیت اللہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ اعلان بعثت نبوی سے قریباً دو ہزار سال پہلے کیا اس وقت جبکہ دنیا کی آبادی کی اکثریت شاید خانہ کعبہ کا نام بھی نہیں جانتی تھی جس وقت یہ اعلان ہوا یہ دعا خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس وقت سکھائی تو اس وقت یا جو باتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے

بتائیں اس وقت تو نوع انسانی میں سے ایک چھوٹے سے حصہ کا تعلق تھا خانہ کعبہ سے۔ اکثریت تو ایسی تھی یا ان کو علم ہی نہیں تھا، علم تھا تو ان کو کوئی تعلق ہی نہیں تھا، کوئی پیار ہی نہیں تھا، خانہ کعبہ کے ساتھ تو ان کا کوئی مقصد ہی وابستہ نہیں تھا نہ دنیوی اور نہ دینی۔

پھر وہ عظیم رسول دنیا کی طرف آیا جس نے یہ اعلان کیا قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف:۱۵۹) دنیا کے ہر خطے میں بسنے والے مردو! اور عورتو! اللہ تعالیٰ نے تم سب کی طرف مجھے رسول بنا کر بھیج دیا۔ اور آج کے بعد تمہاری ہر قسم کی فلاح اور بہبود مجھ سے وابستہ ہوگئی اور اس تعلیم کے ساتھ جو میں لے کے تمہاری طرف آیا ہوں یہ پہلا ہے جو اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ۔ النَّاس کے لئے۔......

عربی زبان میں اَلنَّاس یا اِنْس یا انسان یہ سارے لفظ مرد و زن ہر دو کے لئے بولے جاتے ہیں یعنی عورت کے لئے بھی اور مرد کے لئے بھی اور اگر سیاق و سباق مضمون کا محض مرد کو منتخب نہ کرتا ہو یا محض عورت کے لئے اس مضمون کو بیان کرنا ظاہر نہ کرتا ہو تو ہر دو مراد ہوں گے۔ تو یہاں یہ اعلان کیا گیا کہ دنیا کی ہر عورت اور ہر مرد سن لے کہ میں ساری دنیا کی طرف رسول بن کے آ گیا۔ پھر آپ نے کہا کہ رسول کے معنے پیغام لایا ہوں ایک، اس کی بنیاد کیا ہے، کیا وہ پیغام ہے، اس کی حقیقت کیا ہے تمہیں جو میں کہتا ہوں کہ لوگو سنو کہ میں تمہاری طرف آیا ہوں، تمہارا فائدہ کیا ہے؟ آپؐ نے کہا رحمت اللعالمین بن کے آیا ہوں۔

تم میں سے ہر مرد اور ہر عورت کے لئے میں رحمت بن کر آیا ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مقاصد کا آخری مقصد جو میں نے منتخب کیا تھا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق ابھی آؤں گا اس طرف لیکن بتا میں یہ رہا ہوں کہ پہلا مقصد بتاتا ہے کہ ان لوگوں نے جن کو کہا گیا تھا کہ یہ سارے انسانوں کے لئے ان کی فلاح و بہبود کے لئے ان کی بھلائی کے لئے ان کی خیر کے لئے پہلا گھر جو بنایا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں از سر نو اس کی تعمیر ہو رہی ہے وہ خانہ کعبہ ہے۔..........

وُّضِعَ لِلنَّاسِ سے جو استدلال کئے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ تمام اقوام عالم بلا امتیاز رنگ و نسل، بلا دیگر امتیازات کے جو انسان انسان کو ایک دوسرے سے علیحدہ اور ممتاز کر دیتے ہیں اور ان میں تفرقہ

اور انتشار پیدا کر دیتے ہیں دینی اور دنیوی فوائد حاصل کریں گے۔

(خطاباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۴۲۷ تا ۴۳۰)

آیت ۱۰۲ تا ۱۰۵، ۱۰۹، ۱۱۱ وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ
فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۲﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ
عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ
اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ
اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ
تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا
لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اسی سفر میں غرناطہ ایک جگہ ہے۔ وہاں ایک بہت پرانا محل ہے۔ بڑا خوبصورت وہ آخری شہر جس نے جب شکست کھائی تو سارے سپین سے مسلمانوں کو مٹا دیا گیا۔ وہاں ایک کھڑکی میں ہم کھڑے دیکھ رہے تھے تو ہمارا جو گائیڈ تھا وہ کہنے لگا وہ سامنے پہاڑ میں آپ کو غاریں نظر آتی ہیں۔ ان کے اندر جپسیز (Gepsies) رہتے ہیں اور وہ کہنے لگا (وہ کہتا تھا کہ میں عرب خاندان کا عیسائی ہوں۔ زبردستی ہمیں عیسائی بنالیا گیا تھا اس وقت) کہ ان جپسیز کو اس وقت شرف انسانی، عزت اور احترام ملا جب مسلمان یہاں کے حاکم بن گئے اور مسلمان حکومت میں ان پہ زبردستی نہیں کی نہ مذہب میں نہ ان

کی عادات میں، نہ رہن سہن کے طریقے میں۔ انہوں نے کہا ہم ان غاروں میں رہیں گے مسلم حکومت نے کہا ٹھیک ہے وہیں رہو، تم انسان ہو تمہاری بہرحال عزت کی جائے گی، تمہارا احترام کیا جائے گا اور پہلے بھی عیسائی حکومت کے ماتحت اور بعد میں بھی عیسائی حکومت کے ماتحت ان لوگوں کو وہ عزت نہیں ملی جو خدا چاہتا ہے کہ انسان، انسان سے سلوک کرے اور جو قرآن کریم میں بیان ہوا کہ آپس میں باہمی پیار اور محبت کے ساتھ اس طرح رہنا چاہیے اس کے مطابق مسلمانوں نے زندگی گزاری اور اس کے مطابق انہوں نے وہاں حکومت بھی کی اور تھوڑے ہوتے ہوئے کثرت پر بھاری ہوئے خدا تعالیٰ کے فضلوں اور اس کی رحمتوں سے کیونکہ ان کے دل خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے پر تھے، اور فدائی تھے خدا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ ان کی ذہنیت یہ تھی کہ اِفۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ (الصّٰفّٰت: ۱۰۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے صاحبزادے سے یہ پوچھا کہ یہ میں نے خواب دیکھی ہے تو بتاؤ تم کیا کہتے ہو؟ بڑا عجیب جواب ہے جو انہوں نے دیا یہ نہیں کہا کہ اگر آپ نے خدا تعالیٰ کا منشا یہ معلوم کیا اپنی رؤیا میں کہ مجھے ذبح کر دیں تو ذبح کر دیں۔ حضرت اسماعیل نے یہ جواب دیا کہ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ جو بھی خدا تعالیٰ کا حکم ہے وہ کرو۔ اِفۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ انسان کی نیت بتاتا ہے، انسان کا تقویٰ بتاتا ہے، خدا تعالیٰ کے لئے انسان کی محبت بتاتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کردہ حسن اور نور بتاتا ہے۔ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ وہ ہے جو اسلام ایک مسلمان میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

پھر کچھ عرصے کے بعد بگاڑ پیدا ہوا اور وہ لوگ ہدایت پر اس طرح قائم نہ رہے جس طرح اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ وہ ہدایت پر قائم رہیں۔ جب تھوڑے تھے اکثریت پر غالب آئے۔ جب بہت ہو گئے تو مقابلہ نہ کر سکے اور ایک شہر کے بعد دوسرا شہر عیسائیوں نے فتح کرنا شروع کیا اور اتنا دکھ ہوتا ہے پڑھ کے ان کی تاریخ کو کہ جب عیسائی حملہ کرتے تھے کسی مسلمان شہر پر تو کسی علاقے کے مسلمان نواب صاحب عیسائیوں کے ساتھ مل کے اس شہر کو فتح کرنے میں ان کے ممد ہوتے تھے اور وہ عیسائیوں کے ہاتھ میں چلا جاتا تھا۔ قرطبہ بھی جو آج سے سات سو چوالیس سال پہلے فتح کیا گیا اور عیسائیوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس وقت بھی ایک بہت بڑے علاقے کے مسلم حاکم عیسائیوں سے ملے ہوئے تھے اور مسلمانوں کے خلاف انہوں نے قرطبہ کے اوپر چڑھائی کی اس لئے تا کہ قرطبہ جو مسلمانوں کا علاقہ

ہے وہ عیسائیوں کے ہاتھ میں چلا جائے۔

قرآن کریم کے سارے احکام ایسے ہیں جن پر ہمیں عمل کرنا چاہیے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ اس حکم کو توڑ دیا۔ خدا نے بھائی بھائی بنایا تھا۔ خدا نے اس اخوت کو، اس اتحادِ روحانی اور جسمانی کو اپنی نعمت قرار دیا تھا اور حکم یہ تھا کہ یہ خدا کی رسی ہے اسے مضبوطی سے پکڑو، گرفت جو ہے وہ ڈھیلی نہ ہو جائے اس پر۔ اس حکم کو نہیں مانا اور بھی کئی حکم نہیں مانے ہوں گے لیکن یہ تو نمایاں طور پر تاریخ ہمارے سامنے رکھتی ہے کہ اس حکم کو نہیں مانا اور ایک ایک کر کے علاقے اور صوبے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلتے رہے اور عیسائیوں کے قبضے میں جاتے رہے حالانکہ خود قرآن کریم میں یہ دعا پڑھتے تھے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا (اٰلِ عمران: ۹) اے خدا ہدایت دینا بھی تیرا کام ہے وہ مل گئی ہمیں۔ اے خدا! ہدایت پر قائم رکھنا بھی تیرا کام ہے۔ ہم عاجزانہ تیرے حضور جھکتے اور دعا کرتے ہیں کہ ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں میں کوئی کجی نہ پیدا ہو جائے۔ ہمارے دلوں کی حفاظت کر شیطان کے حملوں سے شیطان کا وار ہم پر کامیاب نہ ہو۔

اس دعا کو جماعت احمدیہ بڑی کثرت سے پڑھے۔ ہمارا یہ فرض ہے کیونکہ جو کام اس وقت ہونے والا ہے اس دنیا میں اور جو جماعت احمدیہ کے سپرد کیا گیا ہے وہ ایک نسل کا کام نہیں۔ ایک صدی تو قریباً گزر گئی چند سال باقی رہ گئے، کئی نسلیں آئیں اور گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی، انہیں ثباتِ قدم عطا کیا، ہدایت پر قائم رہے، قربانیاں دیتے رہے، قربانیوں میں آگے بڑھتے رہے، اللہ تعالیٰ کے فضلوں کو پہلے سے زیادہ حاصل کرتے رہے۔ اب ہم ہیں، ہمیں ہر وقت فکر رہنی چاہیے، ایک تو اپنے متعلق کہ خدا تعالیٰ ہمیں ٹھوکر سے بچائے۔ ہمیں دوسروں کے لئے فتنہ بھی نہ بنائے۔ اس سے بھی ہمیں بچائے۔ ہماری نسلوں کو بھی اس ارفع اور اعلیٰ مقام قرب پر قائم رکھے کہ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی دینی اور دنیوی نعماء انسان کو ملتی ہیں۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (اٰل عمران: ۹) کثرت سے پڑھیں اور چوکس اور بیدار ہو کر اپنی زندگیاں گزاریں اور کم عمر نسل کی تربیت چھوٹی عمر سے ہی شروع کر دیں۔ (خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۷۳۹ تا ۷۴۱)

اور جو شخص اللہ کی پناہ لے لے تو (سمجھو کہ) اسے سیدھی راہ پر چلا دیا گیا۔ اس لئے اے ایماندارو! اللہ کا تقویٰ اس کی تمام شرائط کے ساتھ اختیار کرو اور زندگی کے آخری سانس، موت کی گھڑی تک اللہ تعالیٰ کے کامل فرمانبردار بنے رہو۔

اور تم سب (کے سب بغیر کسی استثناء کے) اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور پراگندہ اور متفرق مت ہو اور اللہ کا احسان (جو اس نے) تم پر (کیا) ہے یاد رکھو کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کے احسان سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارہ پر تھے مگر اس نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیات (وہدایات) کو بیان کرتا ہے تا کہ تم (راہِ) ہدایت (اور صراط مستقیم پر چل کر کامیابیوں) کو پالو۔......آگ خواہ کسی قسم کی ہو وہ نیک بندوں کو بظاہر جلانے کے لئے ناسمجھ، جاہل اور خدا سے دور لوگوں کی طرف سے جلائی گئی ہو لیکن جو محبت کا نور بن گئی یا وہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کے قہر کی آگ ہو۔ ہر دو صورتوں میں اس سے بچنے کا طریق اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں (۱) اعتصام باللہ اور (۲) تقوی اللہ بتایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم اللہ کی حفاظت کو حاصل کرو تو اس آگ سے بچ جاؤ گے خواہ وہ خدا کے غضب کی آگ ہو یا مومنوں کا امتحان لینے کے لئے آگ جلائی گئی ہو۔ ہر دو صورتوں میں یہ خدا تعالیٰ کی پناہ ہی ہے جو اس آگ کی تپش اور اس سے جھلس جانے سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے زورِ بازو سے اس آگ سے محفوظ نہیں رہے تھے جو ان کو جلانے کے لئے بھڑکائی گئی تھی اور نہ ہی حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ اپنی ذاتی قوت اور طاقت یا اپنی دولت اور اقتدار کے نتیجہ میں کفار کی بھڑکائی ہوئی آگ سے محفوظ رہے تھے۔ یہ تو خدائے ذوالعرش کا فضل تھا جس نے یہ اعلان فرمایا تھا تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ (اللّھب: ۲) اللہ تعالیٰ نے ہر دو موقعوں پر فرشتوں کو بھیجا چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے لئے وہ آگ ٹھنڈک اور سلامتی کا باعث اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کامیابی اور ترقی کا ذریعہ بن گئی۔ پھر اس نبی کی قوم نے (یونسؑ کی قوم) جو ساری کی ساری خدا کے غضب سے محفوظ ہو گئی تھی اس نے (تمثیلی زبان میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ) اپنے آنسوؤں سے خدا کے پاؤں کو پکڑ لیا تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان کو قہری عذاب سے بچایا تھا۔

پس ان آیات میں ایک چیز جو نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب تم اپنے آپ کو یا کسی اور کو آگ کے کنارہ پر کھڑا دیکھو گے تو اس آگ سے بچاؤ کا ایک ہی طریقہ ہے جو تمہیں اپنی تاریخ میں بھی اور انسانی زندگی میں بھی نظر آئے گا اور وہ ہے اعتصام باللہ اور تقویٰ اللہ۔ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان چمٹ جائے اور اس کی پناہ میں آجائے اور وہ ان کا ذمہ لے لے تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کسی کو کیسے نقصان پہنچا سکتی ہے؟ اگر انسان خدا کو اپنی ڈھال بنالے تو دشمن کے تیر اس تک کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ کیا خدا تعالیٰ کی ڈھال کو چھیدنے والا کوئی تیر اس دنیا میں پایا جاتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔........

ان آیات میں جو دوسری بات نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص مجموعی طور پر اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے کی کوشش کرتا ہے وہ اس کے پیدا کردہ بندوں سے ایسے اختلاف نہیں رکھتا جو ان کے لئے مضرت کا باعث اور قوم و ملک کے اتحاد یک جہتی کے لئے نقصان دہ اور انتشار کا موجب ہوں۔ وہ ایسے اختلافات کو مٹا دیتا ہے کیونکہ اعتصام باللہ کے نتیجہ میں تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ اعتصام کا لازمی نتیجہ ہے۔ اب جو شخص اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ گیا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال اور اس کی صفاتِ حسنہ کی معرفت حاصل کر لی وہ اس کی مخلوق سے نفرت کے ساتھ کیسے پیش آسکتا ہے یا لوگوں کے لئے شفقت اور ایثار کے جذبات کیسے نہیں رکھ سکتا؟

غرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا مومنو! تمہارے اندر تفرقہ نہیں ہونا چاہیے تاہم ایک تفرقہ تو وہ ہے جو فطرتی ہے وہ تو ہونا چاہیے۔ اس قسم کے تفرقہ سے میری مراد فطرتی اختلاف کا پایا جانا ہے یہ اختلاف تو انفرادیت کو اجاگر کرنے والا ہے۔ مثلاً ایک باپ کے بچے ایک قسم کی فطرت، ایک قسم کے اخلاق، ایک قسم کی ذہنیت اور ایک جیسا حافظہ لے کر پیدا نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ ان کی شکلوں میں بھی اختلاف ہوتا ہے لیکن یہاں وہ اختلاف مراد ہے جو بنی نوع انسان کے لئے رحمت کا موجب تھا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت کا اختلاف ان کے لئے رحمت کا موجب ہوگا۔ مگر شیطان آتا ہے اور اس اختلاف کو اس کے لئے رحمت کی بجائے زحمت اور ہلاکت کا موجب بنانے کی کوشش کرتا ہے اس اختلاف سے جو انسان کے لئے رحمت کی بجائے ہلاکت اور تباہی کا باعث ہو، اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے کیونکہ اعتصام کے بعد یعنی جب کہ خدا کو پہچان لیا، اس کے

جلووں میں تنوع کی جھلک کا مشاہدہ کر لیا جب اس کی عظمت اور جلال کے نتیجہ میں اس کا خوف دل میں پیدا ہو گیا اور جب اس کی صفات حسنہ نے دل میں اس کے لئے انتہائی محبت کا سمندر موجزن کر دیا تو اس کی مخلوق کے ساتھ انسان کی شفقت اور پیار خود بخود قائم ہو جانا چاہیے اور قائم ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اعتصام باللہ کا طبعی فطرتی نتیجہ ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ وہ اختلاف جو تفرقے اور انتشار کا باعث ہے وہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ تقویٰ کا فقدان ہے۔ زبان سے دعویٰ کرنا آسان ہے مگر عمل سے ثابت کر دکھانا مشکل ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد چہارم ۴۱۵ تا ۴۲۱)

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا کے ارشاد میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں تین حکم دیئے ہیں۔

۱۔ حبلُ اللہ کے ایک معنی عہد کے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ فرمایا کہ اے مومنو! جنہوں نے خدا کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کے رسول کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنے ربّ سے ایک عہد بیعت باندھا ہے تم اس عہد پر مضبوطی سے قائم رہنا کیونکہ جو لوگ خدا سے عہد باندھ کر بعد میں اسے بھول جاتے ہیں یا اسے توڑ دیتے ہیں اور اس عہد کی ذمہ واریوں کو نبھاتے نہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک دن ان سے اس عہد کے توڑنے یا اس کی ادائیگی میں غفلت برتنے کے متعلق ضرور سوال کرے گا۔

۲۔ دوسرا حکم اس میں یہ ہے کہ حبلُ اللہ کے دوسرے معنی ہیں وہ تمام وسیلے اور ذرائع اور تدابیر جن کو اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے چنانچہ مفرداتِ راغب (کتاب الحاء صفحہ ۱۰۷) میں اس کے یہ معنی دیئے ہیں۔ اَلَّذِیْ مَعَهُ التَّوَصُّلُ بِهٖ اِلَیْهِ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَالْعَقْلِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِمَّا اِذَا اعْتَصَمْتَ بِهٖ اَدَّاكَ اِلٰى جَوَارِهٖ کہ وہ تمام وسیلے اور تدبیریں جن کو جب مضبوطی سے پکڑا جائے اور ان پر عمل کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے قرب تک پہنچا دیتے ہیں۔ جس میں سے انہوں نے بطور مثال کے قرآن کریم اور عقل انسانی کا ذکر کیا ہے اور یہ بتانے کے لئے کہ بہت سی باتیں ہیں جو اس میں شامل ہیں وَغَيْرُ ذٰلِكَ کے الفاظ رکھ دیئے ہیں۔ تین بڑی چیزیں ہیں جو قرب الٰہی کی راہوں کو ہم پر منکشف کرتی ہیں۔ سب سے پہلے سب سے اہم تو قرآن کریم ہے جس نے شریعت کی تمام باتوں کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی زندگی میں قرآن کریم کی تصویر کامل اور مکمل طور پر ہمارے سامنے پیش کی اور

تیسری جگہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور احادیث ہیں۔

جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے اس میں ایک تو وہ ابدی صداقتیں اور بنیادی ہدایتیں ہیں جو اس دن سے کہ قرآن کریم دنیا میں نازل ہوا قابل عمل ہیں اور اس وقت تک قابل عمل رہیں گی کہ دنیا پر قیامت آجائے۔ پھر وقتی اُلجھنوں کو سلجھانے کے لئے قرآن کریم بعض ہدایتیں دیتا ہے جو جزئیات سے تعلق رکھتی ہیں اور جو وقت کا مطالبہ ہوا سے پورا کرتا ہے۔ پہلے زمانوں میں بھی پورا کرتا آیا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں بھی پورا کر رہا ہے اور آپ کے خلفاء کے زمانہ میں بھی پورا کرتا چلا جائے گا اور جیسا کہ پہلے ہوا اگر خدانخواستہ کبھی خلافت کا سلسلہ منقطع ہوا تو اولیاء اللہ پیدا ہوتے رہیں گے جو وقت کے تقاضوں کے مطابق قرآن کریم سے نور لے کر دنیا کے اندھیروں کو دور کرتے رہیں گے۔

تو پہلی چیز تو قرآن کریم ہے جس کے ذریعہ سے جسے پڑھ کے، جسے سمجھ کے، جس کی تفاصیل کا علم حاصل کر کے اور پھر اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھال کر ہم اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکتے ہیں۔ پس پہلے تو یہ بتایا کہ تم نے ایک عہد باندھا ہے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھنا اور ساتھ ہی اسی لفظ میں ایک دوسرے معنی کے لحاظ سے ہمیں یہ بتایا کہ اس عہد کو مضبوطی سے کیسے پکڑا جا سکتا ہے (یعنی قرآنی ہدایت و شریعت پر عمل کر کے اور اسے حرز جان بنا کر)

۳۔ اور حبلُ اللہ کے تیسرے معنی ہیں وصل اور وصال کے، مقام قرب کے حصول کے۔ تو فرمایا کہ جب تم اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاؤ اور تمہیں اس کا قرب حاصل ہو جائے تو اس مقام قرب کی حفاظت کرتے رہنا اور صدق و وفا کے ذریعہ شیطانی حملوں سے اسے بچانا۔

تو پہلے یہ کہا کہ اپنے عہدوں پر مضبوطی سے قائم رہو۔ پھر یہ فرمایا کہ ان عہدوں پر مضبوطی سے قائم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ راستے وہ طریق جو قرآن کریم نے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ نے اور آپ کے ارشادات نے خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے تمہیں بتائے ہیں ان کو لازم پکڑو۔ اس طرح تم خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر لو گے۔ تیسرے یہ حکم دیا کہ جب تم مقام قرب کو پا لو تو پھر بھی تم شیطان سے محفوظ نہیں جب تک کہ اسی حالت میں وفات نہ ہو جائے اور انسان کا انجام بخیر نہ ہو جائے۔ اس سے پہلے شیطان ساری زندگی میں انسان پر حملہ آور ہوتا رہتا ہے۔ اپنی پوری کوشش کرتا

ہے کہ خدا کا وہ بندہ ہے جس نے اعمال صالحہ اور مجاہدات کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل کو جذب کر کے اس کے قرب اور اس کی رضا کو حاصل کیا تھا وہ شیطان اس بندۂ خدا کو اس مقام سے پرے ہٹا دے۔ جیسا کہ مذہب کی تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ خدا کے بعض بندوں نے اس کا قرب حاصل کیا۔ بعد میں شیطان نے ان پر کامیاب حملہ کیا اور مقام رفعت سے گرا کے انہیں نار جہنم میں دھکیل دیا۔ جیسا کہ خود حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض صحابہؓ کے متعلق کہیں گے کہ یہ میرے صحابہ تھے، جہاں تک میرا علم ہے انہوں نے میری باتوں کو سنا اور مانا اور ان پر عمل بھی کیا، ان کو جہنم کی طرف کیوں لے جایا جا رہا ہے۔ تو آپ کو بتایا جائے گا کہ آپ کی وفات کے بعد جو بداعمالیاں ان سے سرزد ہوئیں، آپ ان سے واقف نہیں اور یہ لوگ اس مقام رفعت کو قائم نہیں رکھ سکے، اس مقام سے گر گئے اور آج اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی لعنت کا مورد بن گئے ہیں۔

تو تیسرا حکم ہمیں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا میں اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے کہ جب تم میری رضا کو اس دنیا میں حاصل کر لو، میرے قرب کو پالو، تب بھی مطمئن نہ ہو جانا کہ تمہاری قربانیاں اور مجاہدات جو تم کر چکے ہو وہی کافی ہیں اور میری رضا کے مقام پر قائم رہنے اور اس میں مزید ترقی کرنے کے لئے تمہیں کچھ اور نہیں کرنا۔ اس وقت بھی آگے سے آگے تمہارا قدم جانا چاہیے۔ تمہاری پہلی قربانیاں بعد میں آنے والی قربانیوں کے مقابلہ میں ہیچ نظر آنے لگیں۔ پوری کوشش تمہیں کرنی پڑے گی کہ شیطان تم پر کامیاب حملہ نہ کر سکے حملہ تو وہ ضرور کرتا ہے اور کرتا رہے گا لیکن اصل بات یہ ہے کہ انسان شیطان کے حملوں سے اپنے آپ کو بچائے اور اس کے دام فریب میں اپنے آپ کو نہ آنے دے۔

تو یہ تین معنی وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ کے ہیں اور معانی کی اس ترتیب سے جو میں نے بیان کی ہے اللہ تعالیٰ نے درجہ بدرجہ ہمیں تین سبق دیئے ہیں اور ہوشیار کیا ہے اور متنبہ کیا ہے اور ہمیں ڈرایا ہے اس بات سے کہ اگر تم عہد توڑو گے تب بھی تباہی۔ عہد کے نباہتے وقت قرآن کریم سے منہ موڑو گے تب بھی ہلاکت۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ اور آپؐ کے ارشادات کی عظمت قائم نہیں کرو گے تب بھی شیطان کا کامیاب وار تم پر ہو جائے گا اور پھر جب تم یہ سب کچھ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کر لو گے تو اس وقت بھی مقام خوف رہے گا۔ جب تک تم اس دنیا میں زندہ ہو، جب تک تم اپنے انجام کو نہ پہنچ جاؤ اس وقت تک چوکس اور بیدار رہ کر اپنے مقام رفعت اور مقام روحانیت کی

حفاظت کرنا تمہارے لئے ضروری ہے۔ پس وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا میں اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بتایا کہ اگر تم اس مفہوم کے مطابق جو عربی کے لحاظ سے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا کا ہے۔ ہمارے حکم بجالاؤ گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اندر کوئی ایسا تفرقہ پیدا نہیں ہوگا جو ملت کے شیرازہ کو بکھیر دے اور ترقی کی جو منازل اُمت مسلمہ طے کر رہی ہے اس میں تنزل کا کوئی رخنہ واقع ہو جائے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام لانے سے قبل یا اسلام سے باہر رہتے ہوئے جو لوگ زندگی کے دن گزار رہے ہیں وہ تفرقہ کا شکار ہیں مذہبی اور روحانی لحاظ سے۔ اور ان میں سے کوئی جماعت یا فرقہ ایسا نہیں ہے کہ جو نیکی کے مقام پر کھڑا ہو یا نیکی کے مقام پر کھڑا رہ سکے۔ کیونکہ یہاں نفی کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے عربی کا جو لفظ استعمال فرمایا ہے اس کے مقابلہ میں الفت کا لفظ استعمال کیا ہے اور الفت کے معنی اکٹھے ہو جانے اور محض باہمی مودّت اور پیار کے نہیں بلکہ ایسے اجتماع اور ایسی محبت و پیار کے ہیں جو نیکیوں پر قائم ہو، جو بدیوں پر قائم ہو کر ایک جتھہ بنتا ہے۔ اسے عربی زبان الفت کے لفظ سے یاد نہیں کرتی یہاں الفت کے مقابلہ میں تَفَرَّقُوْا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے اندر اس طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ تمام فرقے جو اسلام سے باہر ہیں یا وہ جو حقیقی اسلام سے باہر ہو جاتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ جو نیکی اور تقویٰ اور طہارت پر قائم ہو۔ بلکہ سارے کے سارے بلا استثنا ضلالت پر قائم ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر اِعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا پر عمل کرو گے تو فرقہ فرقہ نہ بنو گے۔ اور جب بھی تمہارے اندر فرقے نظر آنے لگیں تو سمجھ لینا کہ قوم نے اِعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا پر عمل نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِعْتِصَامُ بِحَبْلِ اللّٰهِ کے نتیجہ میں ایک بڑا انعام جو تمہیں عطا کیا گیا ہے۔ وہ باہمی مودّت اور اخوت ہے دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ساری دنیا کی دولت بھی اگر خرچ کی جاتی تو اس قسم کی الفت جو نیکی پر قائم ہوتی ہے اور نیکی پر قائم رکھتی ہے اس جماعت میں پیدا نہ ہو سکتی۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے اُمت مسلمہ میں اس قسم کی محبت اور اخوت اور الفت کو پیدا کیا ہے اِعْتِصَامُ بِحَبْلِ اللّٰهِ کے نتیجہ میں۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ چونکہ کوئی فرقہ بھی ہدایت پر اور صراط مستقیم پر قائم نہیں تھا اس لئے ان کی مثال ایسی تھی جیسے کہ ایک گڑھا ہو، اس میں بڑی تیز آگ جل رہی ہو اور اس کے کنارہ پر کوئی کھڑا ہو اور یہ خطرہ ہو کہ کہیں وہ اس کے اندر گر نہ جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اس ہدایت عظمیٰ قرآن کو نازل کیا اور اس کے نتیجہ میں انسانوں میں سے ایک گروہ اس جماعت میں داخل ہو کر ایسا بن گیا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اس جلتی ہوئی آگ کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا اور اپنی محبت کی ٹھنڈی چھاؤں میں اسے لا بٹھایا اور رضا کی جنتوں میں اسے داخل کیا۔

یہ واقعہ صرف اس شخص سے پیش نہیں آتا جو کفر سے اسلام لاتا ہے بلکہ اُمت مسلمہ میں شامل ہونے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ اُمت کو ایسے امتحانوں میں ڈالتا رہتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جب ابھی کسی امام کا انتخاب نہیں ہوا تھا اس وقت ساری اُمت مسلمہ اسی قسم کے ایک گڑھے کے کنارے پر کھڑی ہو چکی تھی جو خدا تعالیٰ کی بھڑکائی ہوئی آگ سے پُر تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فضل کیا اور پھر دنیا کو اَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا کا نظارہ دکھایا اور ان کے لئے اس آگ کے کنارے کی بجائے اپنے قرب کی راہوں کو کھول دیا۔

تو جب بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی رسول یا اس کے خلفاء میں سے کوئی خلیفہ وفات پاتا ہے تو اس وقت خدا تعالیٰ کے قائم کردہ سلسلہ کی حالت وہ ہوتی ہے جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے کہ ایک گڑھا ہے جس میں آگ بھڑک رہی ہے اور وہ اس کے کنارے پر کھڑے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آگ کے گڑھے میں گر جائیں گے یا اللہ تعالیٰ کا فضل آسمان سے نازل ہوگا اور ان کو اس آگ سے بچا لے گا۔

ایسے موقع پر (چند گھڑیاں ہوں یا چند گھنٹے ہوں یا چند دن ہوں) شیطان کی ساری طاقت اس کام میں صرف ہو رہی ہوتی ہے کہ خدا کی مقرب جماعت میں فتنہ پیدا کرے اور ان کو آگ میں دھکیل دے اور خدا کی لعنت کا انہیں مورد بنائے اور خدا کے پیار سے انہیں دور لے جائے۔ پس اس وقت شیطانی طاقتیں پورا زور لگا رہی ہوتی ہیں اور ہر قسم کے فتنے جماعت میں پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہوتی ہیں بدظنی کو ہوا دے کر اور کمزور دل خوف سے بھر جاتے ہیں اور ہر تدبیر جس سے الٰہی سلسلہ میں کمزوری پیدا کی جا سکتی ہے وہ تدبیر شیطان اور اس کے ساتھی کر رہے ہوتے ہیں اس وقت اللہ تعالیٰ

اپنے ایک نہایت کمزور بندے پر نگاہ ڈالتا اور اپنے لئے اسے چنتا ہے کیونکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ خلیفہ اللہ تعالیٰ ہی بناتا ہے اگر بندوں پر اس کو چھوڑا جاتا تو جو بھی بندوں کی نگاہ میں افضل ہوتا اسے ہی وہ اپنا خلیفہ بنا لیتے۔لیکن خلیفہ خود اللہ تعالیٰ بناتا ہے اور اس کے انتخاب میں کوئی نقص نہیں۔وہ اپنے ایک کمزور بندے کو چنتا ہے جس کے متعلق دنیا سمجھتی ہے کہ اسے کوئی علم حاصل نہیں، کوئی روحانیت اور بزرگی اور طہارت اور تقویٰ حاصل نہیں۔اسے وہ بہت کمزور جانتے ہیں اور بہت حقیر سمجھتے ہیں۔پھر اللہ تعالیٰ اس کو چن کر اس پر اپنی عظمت اور جلال کا ایک جلوہ کرتا ہے۔اور جو کچھ وہ تھا اور جو کچھ اس کا تھا اس میں سے وہ کچھ بھی باقی نہیں رہنے دیتا اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور جلال کے سامنے کلی طور پر فنا اور نیستی کا لبادہ وہ پہن لیتا ہے اور اس کا وجود دنیا سے غائب ہو جاتا ہے اور خدا کی قدرتوں میں وہ چھپ جاتا ہے تب اللہ تعالیٰ اسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیتا ہے۔اور جو اس کے مخالف ہوتے ہیں انہیں کہتا ہے کہ مجھ سے لڑو اگر تمہیں لڑنے کی تاب ہے۔یہ بندہ بے شک نحیف، کم علم، کمزور، کم طاقت اور تمہاری نگاہ میں طہارت اور تقویٰ سے عاری ہے لیکن اب یہ میری پناہ میں آ گیا ہے اب تمہیں بہرحال اس کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ خدا تعالیٰ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ انتخاب خلافت کے وقت اسی کی منشا پوری ہوتی ہے اور بندوں کی عقلیں کوئی کام نہیں دیتیں۔

اس آیت کا آیت استخلاف کے ساتھ بھی بڑا گہرا تعلق ہے۔وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک اور رنگ میں اسی قسم کا مضمون بیان کیا ہے اللہ تعالیٰ سورۃ النور آیت ۵۶ میں فرماتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النّور:۵۶)

اس وقت یہاں میں ساری آیت کی تفسیر میں نہیں جاؤں گا۔البتہ یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ میں اِعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا کا مفہوم پایا جاتا ہے کہ خلافت کے قائم ہونے پر اللہ تعالیٰ ایسے سامان پیدا کر دیتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اس کے رسول کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اِعْتِصَامُ بِحَبْلِ اللّٰهِ کیا تھا پھر اس کی آواز پر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور اپنے عہد کو سمجھنے لگتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں اور اس کے مطابق خدا تعالیٰ کی تعلیم پر عمل کرنے والے بن

جاتے ہیں۔اور جب ان کو خدا کا پیار مل جاتا ہے تو اگر دنیا کی ساری دولتیں اس کے عوض میں قربان ہو جائیں تب بھی وہ نہیں چاہتے کہ وہ پیار ان سے کھو جائے اور خدا ان سے ایک سیکنڈ یا لمحہ کے لئے بھی ناراض ہو۔ پھر وَ لَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا میں اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے جو وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا میں بیان ہوا ہے تو جس خوف کا آیت استخلاف میں ذکر ہے وہ وہی خوف ہے جس کو یہاں یوں بیان کیا کہ ایک گڑھا ہے، آگ اس میں بھڑک رہی ہے اور اس کے کنارے پر وہ کھڑے ہیں۔اس سے زیادہ اور خوف کیا ہو سکتا ہے جبکہ وہ آگ خدا تعالیٰ کی لعنت کی آگ ہے، اس کے قہر کی آگ، اس کی ناراضگی کی آگ ہے۔

تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس وقت قوم پر ایک نہایت ہی خوف کا وقت ہوتا ہے کہ کہیں وہ اس کے گڑھے میں نہ گر جائیں۔تب خدا تعالیٰ اپنی قدرت کا ایک نظارہ دنیا کو دکھاتا ہے۔خدا تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں، وہ غنی ہے، دنیا میں سب سے بڑا متقی، دنیا میں سب سے بڑا مطہر، دنیا میں سب سے بڑا عالم، دنیا میں سب سے بڑا عاشق قرآن اور عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہلانے والے کا بھی خدا محتاج نہیں ہے بلکہ یہی شخص خدا کا محتاج ہے۔

پس اس وقت اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا نظارہ اس طرح دکھاتا ہے کہ کبھی وہ اپنی قدرت کے اظہار کے لئے اس شخص کو چن لیتا ہے جو قوم کی نگاہ میں بوڑھا ہوتا ہے۔حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کو بہت دفعہ طعنہ دیا گیا کہ بوڑھا آدمی ہے، سمجھ کوئی نہیں۔خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ بوڑھا ہے یا نہیں ہے لیکن ہے میری پناہ میں، میری گود میں، اس واسطے تم اس کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتے۔

کبھی خدا تعالیٰ اپنی قدرت کا اس طرح مظاہرہ کرتا ہے کہ ایک بچے کو چن لیتا ہے۔دنیا کہتی ہے کہ بچہ ہے، قوم تباہ ہو جائے گی، ناسمجھ ہے، کم علم ہے، کم تجربہ ہے مگر خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ بے شک بچہ ہے مگر میں تو بچہ نہیں ہوں۔میں اپنی قدرت اس کے ذریعہ سے ظاہر کروں گا۔تب وہ قدرت ثانیہ کا مظہر ہو جاتا ہے اور پھر وہی بچہ ان لوگوں کا منہ بند کر دیتا ہے جو اسے بچہ سمجھنے والے اور بچہ کہنے والے ہوتے ہیں۔.......

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کام خلیفہ وقت کے سپرد کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک بڑا اہم کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس بات کی نگرانی کریں کہ قوم ''اِعْتِصَامُ بِحَبْلِ اللّٰهِ'' کے مطابق اپنی زندگی کے دن

گزار رہی ہے کہ نہیں۔جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ محض اپنی نعمت کے طور پر اور اپنے فضل اور برکت کے نتیجہ میں ان کے درمیان مودّت اور اُلفت پیدا کرتا اور انہیں بنیان مرصوص بنا دیتا ہے۔

(خطباتِ ناصر جلد اوّل صفحہ ۴۹۸ تا ۵۰۵)

اُمت محمدیہ کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ تاکیدی حکم فرمایا کہ حبل اللہ کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور پراگندہ مت ہو۔حبل اللہ کے ایک معنے تو ان چیزوں کے یا ہدایت کے ان اصول کے ہیں جن پر کاربند ہو کر انسان کو وصالِ الٰہی اور قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے اس لئے حبل اللہ سے مراد مفسرین کے نزدیک قرآنِ عظیم بھی ہے اور اس سے عقلِ سلیم کے اصول جو دراصل فطرتِ صحیحہ انسانیہ کے اصول ہیں وہ بھی مراد لئے گئے ہیں۔اس معنے کے لحاظ سے یہ ارشاد ہے کہ قرآن کریم میں جو اصول ہدایت اور اصول شریعت بیان ہوئے ہیں۔(یعنی جو اصول راہ راست پر چلنے اور صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ودیعت کئے ہیں) وہ عقلِ سلیم اور فطرتِ صحیحہ کے مطابق بھی ہیں۔اس لئے انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ اگر وہ اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہونا چاہتا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے تو وہ شریعت اسلامیہ جو فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (الروم :۳۱) کے مطابق ہے۔ان اصول شریعت یا اصولِ ہدایت کے مطابق اپنی زندگی کے دن گزارے۔حبل اللہ کے دوسرے معنے اللہ کے عہد کے لئے، کئے گئے ہیں۔اس سے مراد یہ ہے کہ جو عہد اللہ تعالیٰ سے باندھا ہے یا جو عہد اللہ تعالیٰ نے باندھا ہے اس کو مضبوطی سے پکڑو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے کون سے عہد باندھے ہیں یا اس کے لئے کون سے میثاق قرار دیئے ہیں؟ قرآن کریم میں اس کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔اس وقت میں صرف ایک بات لے کر اس پر کچھ روشنی ڈالوں گا۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔" مَنْ صَلّٰى صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِيْ لَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ فَلَا تُخْفِرُوا اللّٰهَ فِيْ ذِمَّتِهٖ " (بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فَضْلِ اسْتِقْبَالِ الْقِبْلَةِ) میں یہ حدیث بیان ہوئی ہے۔حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔جو شخص ہماری نماز جیسی نماز پڑھے یعنی جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں ویسے ہی وہ نماز پڑھ رہا ہو اور قبلہ رُخ ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہا ہو اور ہمارے ذبیحہ کو کھا رہا

ہو اور جو چیزیں کھانے کے لحاظ سے حرام ہیں ان سے بچنے والا ہو تو ذٰلِكَ الْمُسْلِمُ ۔ یہ وہ مسلمان ہے (آگے یہ نہیں فرمایا کہ جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے کیونکہ اور بہت ساری شرائط ہیں مثلاً نیت کا تعلق۔ احسان فی العمل کا تعلق ہے انسان پوری شرائط اور انتہائی جدوجہد کے ساتھ اعمالِ صالحہ کو خوش اسلوبی سے انجام دینے والا ہو، وہ اور چیزیں ہیں یہاں یہ فرمایا یہ وہ مسلمان ہے) جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی امان اور حفاظت میں ہے پس اے مسلمانو! جو عہد اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان باندھا ہے کہ تم ہر ایسے شخص کو (محولہ بالا حدیث کی رو سے) مسلمان سمجھتے ہوئے اس کے سیاسی اور معاشرتی حقوق کو ادا کرو گے، اس عہد کو نہیں توڑنا۔ غرض وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا میں ایک اصولی بات بتائی تھی اس کی بہت سی تفسیریں کی گئی ہیں ایک تفسیر حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جو شخص ہماری طرح کی نماز پڑھتا ہے اور قبلہ رخ ہو کر نماز ادا کرتا ہے۔ ویسے ہم ہر دعا کے وقت قبلہ رخ نہیں ہوتے مثلاً عید کی نماز ہے یا خطبہ جمعہ میں بھی امام دعائیں کر رہا ہوتا ہے حالانکہ اس وقت قبلہ کی طرف اس کی پشت ہوتی ہے۔ اس کی روح تو قبلۂ حاجات کی طرف ہی متوجہ ہوتی ہے لیکن اس کا چہرہ دوسری طرف ہوتا ہے اور پشت قبلہ کی طرف ہوتی ہے لیکن نماز ادا کرتے وقت ہم قبلہ رُخ ہوتے ہیں۔

اس میں میرے نزدیک ایک بڑا ہی لطیف اشارہ بھی ہے مسلمانوں میں کئی فرقے پیدا ہو گئے ہم ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے ہیں لیکن بعض لوگ مثلاً مالکی اور غالباً شافعی بھی نماز کے وقت ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں البتہ ایک مسلمان ہاتھ باندھ کر نماز پڑھ رہا ہے یا ہاتھ چھوڑ کر پڑھ رہا ہے اس کا رُخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے۔

پس اِسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا میں یہ اشارہ فرمایا ہے کہ ادائیگی نماز میں بھی اُمت میں اختلاف ہو سکتا ہے اور بعض دیگر چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ادائیگی نماز میں بنیادی چیز یہ ہے کہ قبلہ کی طرف رُخ ہو جس کا قبلہ کی طرف رُخ ہے اسے تم یہ کہہ کر مسلمان کے حقوق سے محروم نہیں کر سکتے کہ تم نے ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی یا ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھی۔ جہاں جس کا زور ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ تم ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہو یا چونکہ (دوسری جگہ کوئی کہے) تم ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے ہو اس لئے تمہیں مسلمانوں کے حقوق سے محروم کیا جائے گا۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ

نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ جس نے قبلہ رُخ ہو کر نماز ادا کی، ہاتھ باندھا یا چھوڑا، اس کے حقوق ایک مسلمان کے حقوق ہیں، یہ ادا ہونے چاہئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ایک عہد باندھا ہے اور اسی کی طرف حدیث کے شارحین کی توجہ گئی ہے کہ یہ ایک عہد ہے جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ پر ڈالی ہے شارحین نے یہ لکھا ہے کہ (جو شخص محولہ بالا حدیث کی رو سے مسلمان کہلاتا ہے) وہ خدائی حفاظت اور امان میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم نے اس کی جان کی بھی حفاظت کرنی ہے تم نے اس کے مال کی بھی حفاظت کرنی ہے۔ تم نے اس کی عزت کی بھی حفاظت کرنی ہے۔ یہ نہیں کہ ایک شخص نماز مسلمانوں والی ادا کرتا ہے اور قبلہ رُخ ہو کر نماز ادا کرتا ہے اور ذبیحہ کھاتا ہے اور غیر ذبیحہ سے پرہیز کرتا ہے، تم اپنی طرف سے کچھ اصول بنا کر اسے گالیاں دینے لگ جاتے ہو۔ خدا معلوم گندہ دہانی مسلمانوں کے ایک گروہ میں کہاں سے آ گھسی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ گندی زبان اور فحش کلامی سے ثواب حاصل ہوتا ہے حالانکہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمایا ہے جس کی شارحین نے بڑی وضاحت سے یہ تشریح کی ہے کہ ہر وہ شخص جو نماز مسلمانوں کی قبلہ رُخ ہو کر پڑھنے والا اور ہماری طرح ذبیحہ کھانے والا ہے اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ سے یہ عہد لیا ہے کہ اس کی جان اور مال اور عزت کی حفاظت کی جائیگی اور جو شخص اس کی جان اور مال اور عزت کی حفاظت نہیں کرتا۔ وہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور آپ کے اسوہ اور قرآن کریم کی ہدایت کے خلاف کرتا ہے آپ نے بڑی تاکید سے فرمایا ہے کہ یہ اللہ کا عہد ہے اس کو نہ توڑنا ورنہ کیا ہوگا؟ آگے کچھ نہیں فرمایا کیونکہ ہر عقلمند آدمی جانتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا عہد توڑتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے جو معاملہ کرتا ہے وہ مالک ہے۔ انسان کو تو لرزاں اور ترساں اپنی زندگی کے دن گزارنے چاہئیں۔

شارحین نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِيْ لَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ میں ذِمَّةُ اللّٰهِ اور ذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ کے معنی یہ ہیں کہ ''اَمَانُهُمَا وَعَهْدُهُمَا'' یعنی ایسا انسان اللہ تعالیٰ اور رسول کی حفاظت اور امان میں اور اللہ تعالیٰ اور رسول نے جو عہد کیا ہے اس عہد کے اندر آ جاتا ہے۔ پھر فَلَا تُخْفِرُوا اللّٰهَ فِيْ ذِمَّتِهٖ کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ فِيْ عَهْدِهٖ۔ اللہ تعالیٰ نے ایک عہد باندھ دیا ہے اس میں خیانت نہیں کرنی اور فَلَا تَتَعَرَّضُوْا فِيْ حَقِّهٖ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ صفحہ ۴۷

جلد ۱) جو حق اس کا قائم کیا گیا ہے۔ اس میں تعرض نہیں کرنا اور اس کو ضائع کر کے فساد کے حالات نہیں پیدا کرنے۔ علاوہ ازیں اس کے یہ بھی معنے ہیں کہ ’’مِنْ مَالِہٖ وَدَمِہٖ وَعِرْضِہٖ‘‘ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ صفحہ ۴۷ جلد ۱) یعنی اس کے مال کی حفاظت بھی اور اس کی جان کی حفاظت بھی اور اس کی عزت کی حفاظت بھی تمہارے ذمہ ہے۔

پس وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا میں اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی ہی حسین اور وسیع تعلیم دی ہے اور اگر اُمتِ مسلمہ اس پر عمل کرے اور یہی خدا اور اس کا رسول چاہتے ہیں تو پھر ایک ایسی حسین فضا اور معاشرہ پیدا ہوتا ہے جس کے متعلق حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ’’اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ‘‘ بھائی بھائی میں اختلاف ہوتا ہے میاں بیوی میں اختلاف ہوتا ہے ماں بیٹی میں اختلاف ہوتا ہے باپ بیٹے میں اختلاف ہوتا ہے خدا تعالیٰ نے اپنی ہر خلق میں اپنی ایک شان ظاہر کی ہے کثرتِ مزاجِ انسانی وحدتِ خالقِ انسانی ثابت کرتی ہے چنانچہ آپ نے فرمایا کہ تمہاری طبیعتوں، مزاج اور عادات کے اندر اختلاف تو ہوتا ہے مثلاً کھانے میں ہزار اختلاف ہوتا ہے جس خاندان میں کھانے والے افراد زیادہ ہوں وہاں بڑی مشکل پڑ جاتی ہے اور کئی دفعہ بعض ناسمجھوں کو اعتراض کا موقعہ بھی مل جاتا ہے۔
(خطباتِ ناصر جلد سوم صفحہ ۴۳۱ تا ۴۳۵)

پس انسان کو ہر دم اور ہر آن اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی ضرورت ہے اسی لئے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا میں ’’حبل اللہ‘‘ کے معنے ہمارے بزرگ صلحاء (لُغت کے ماہرین نے بھی اور مفسرین نے بھی) یہ کئے ہیں کہ وہ ذرائع جو وصلِ الٰہی تک پہنچانے والے ہوں حبل اللہ کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت امام راغبؒ کو بڑی فراست عطا کی تھی اُنہوں نے قرب الٰہی کے ذرائع میں سے نمبر 1 قرآن کریم کو ٹھہرایا ہے یعنی شریعت قرآنیہ جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوئی۔ گو اصل روحانی ذریعہ تو یہی ہے مگر اُنہوں نے ساتھ ہی عقل کو دوسرا ذریعہ قرار دیا ہے۔ عقل خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے اس کا بھی ایک مصرف ہے انسان اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے بشرطیکہ یہ اندھیروں میں بھٹکتی نہ پھرے بشرطیکہ اسے الٰہی رہنمائی حاصل رہے ورنہ جس طرح قانون اندھا ہے اسی طرح عقل بھی اندھی ہے۔ انسان کی عقل نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ آج کا قانون جسے انسانی عقل نے بنایا ہے، وہ اندھا ہے لیکن یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ جس عقل نے اندھا قانون بنایا ہے وہ خود

اندھی کیوں نہیں؟ ظاہر ہے کہ جس عقل نے ایک اندھا قانون بنا دیا ہو وہ خود بھی اندھی ہے کیونکہ نور سے اندھیرے پیدا نہیں ہوتے جہاں بھی اندھیرا نظر آئے گا اُس کے منبع میں بھی اندھیرے ہی کی تلاش کرنی پڑے گی۔ ہماری عقل نور کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے یہ کہتی ہے کہ ظُلمات کا سرچشمہ نور نہیں پیدا کرتا، ظلمت کا سرچشمہ ظلمت ہے۔ پس جو قانون عقل سے نکلا وہ اندھا ہے وہ عقل خود بھی اندھی ہے البتہ اس کے وہ پہلو جو خدا تعالیٰ کے نور سے منور ہو چکے ہوں اور اُن میں بیداری پیدا ہو چکی ہو وہ اندھے نہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ نے وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا میں یہ بُنیادی اور تاکیدی حکم دیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے قرب کی جو راہیں ہیں اور خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے جو ذرائع ہیں اور خدا تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنے کے جو وسیلے ہیں اُن کو مضبوطی سے پکڑے رکھو۔ اگر مضبوطی سے پکڑے رکھو گے تو پراگندہ نہیں ہو گے اور اگر مضبوطی سے نہیں پکڑو گے تو پراگندہ ہو جاؤ گے تمہارے اندر تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر دو باتیں بتائی ہیں ان میں سے ایک کا تعلق قرآن کریم کی ہدایت سے ہے اور دوسری کا عقل سے۔ پھر فرمایا وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔ خدا تعالیٰ کا تم پر یہ احسان ہے کہ اُس نے تمہیں قرآن کریم کی شکل میں ایک ایسی ہدایت دی جس کے نتیجہ میں تمہارے دلوں میں باہمی محبت اور اخوت پیدا ہوئی اور اس کا تعلق شریعت حقّہ کے ساتھ ہے لیکن چونکہ عقل انسانی سے بھی کام لینا ضروری ہے اس لئے فرمایا:-

وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ محض شریعت جو ہے یا قرآن کریم کتابی شکل میں جزدانوں میں بند کر کے رکھ دیا جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ عقل کے ساتھ قرآن کریم کا سمجھنا اور سیکھنا ضروری ہے۔ عقل جب اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہدایت دیتا ہے اس پر عمل کرنا اور اس کے مطابق اعمالِ صالحہ بجا لانا ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ نے شریعت دے دی لیکن شریعت پر عمل کرنا انسان کا کام ہے اور اللہ تعالیٰ فضل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت دعاؤں کے ذریعہ جذب کی جاتی ہے۔ اُمت محمدیہ کے لئے سب سے زیادہ دعائیں تو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کی ہیں آپ نے کسی قوم کو کسی ملک کو اور کسی زمانہ کو نہیں چھوڑا جس کے لئے دعائیں نہ کی ہوں ہمارے اس زمانہ کو بھی نہیں چھوڑا ہمارا یہ ایمان ہے۔ دوسرے لوگ ہمارے ساتھ اتفاق رکھیں یا نہ رکھیں لیکن ہمارا

یہ ایمان ہے اور ہم اسے ظاہر کریں گے کہ مہدی آ گئے اور ہم اُن پر ایمان لائے ہیں۔

(خطباتِ ناصر جلد ششم صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۲)

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ

کہ اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے کہ مختلف قومیں جو آپس میں برسر پیکار تھیں ان میں سے ایک ایک کو لیا اور ان کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ اسلام لانے سے پہلے ان کا آپس کا باہمی تعلق دشمنی اور عداوت کا تعلق تھا اور پھر اسلام لانے کے بعد کا انہی کا آپس کا باہمی تعلق الفت اور اخوت کا تعلق بن گیا۔

اَلَّفَ کے معنے بڑے حسین ہیں اور وہ ہمارے سامنے رہنے چاہئیں۔ مفردات میں آیا ہے اَلْمُؤَلَّفُ مَا جُمِعَ مِنْ اَجْزَاءٍ مُخْتَلِفَةٍ وَرُتِّبَ تَرْتِيْبًا قُدِّمَ فِيْهِ مَا حَقُّهٗ أَنْ يُّقَدَّمَ وَاُخِّرَ فِيْهِ مَا حَقُّهٗ اَنْ يُّؤَخَّرَ۔

مؤلَّف کے معنی انہوں نے بیان کئے ہیں (یعنی جن کی تالیف کی گئی) یعنی جو امت محمدیہ ہے ہمارے اس مضمون کے لحاظ سے۔ کیونکہ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ہے۔ یہ سیسہ پلائی ہوئی مضبوط دیوار ہی نہیں بلکہ اپنے اجزا کی ایک حسین نسبتیں رکھنے والی دیوار ہے۔ یہ نہیں کہ پٹھان جس طرح دیوار بناتے ہیں۔ مٹی کا لوتھڑا ڈالا (جسے پنجابی میں تھوپا کہتے ہیں) اور دیوار کھڑی کر دی۔ بلکہ جس چیز کی جہاں ضرورت ہے وہاں لگائی گئی ہو۔ کیونکہ مؤلّف (مؤلّف یہاں آ جائے گا مسلمان کے معنوں میں یا مؤلفہ اُمتِ محمدیہ) جو اجزا مختلفہ کو جمع کر کے اور ان کو ایسی ترتیب دے کر جسے مقدم رکھنا چاہیے اسے موخّر رکھا گیا ہو اور جسے موخّر ہونا چاہیے اسے موخّر رکھا گیا ہو۔ ان کو جمع کر کے یکجان کر دیا گیا ہے اس معنی میں ایک واضح اصول کی طرف اشارہ ملتا ہے یعنی مسابقت کی جو ہدایت ہمیں دی گئی ہے فرمایا جذبہ مسابقت میں قُدِّمَ فِيْهِ مَا حَقُّهٗ أَنْ يُّقَدَّمَ وَاُخِّرَ فِيْهِ مَا حَقُّهٗ اَنْ يُّؤَخَّرَ کا خیال ہمیں رکھنا پڑے گا۔ ورنہ اسلام کی تعلیم اور ہدایت کے مطابق مسابقت نہیں ہوگی۔

پس اسلام نے الفت و اخوت اسلامی کو ایک بنیادی چیز قرار دیا ہے۔ کوئی ایسا کام ایک احمدی مسلمان کو نہیں کرنا چاہیے جو اللہ کی محبوب اجتماعی ہیئت کذائی پر برے رنگ میں اثر انداز ہو۔ ہر کام

ایسا ہونا چاہیے۔ جو خدا تعالیٰ کی محبت کو زیادہ جذب کرنے والا اور اس اتحاد اور الفت اور اخوت کو زیادہ مضبوط بنانے والا ہو اور اس حقیقت کے باوجود کہ سب ایک جان ہو گئے یہ بھی ضروری ہے کہ جذبہ مسابقت پایا جائے۔ (خطباتِ ناصر جلد چہارم صفحہ ۵۵۹، ۵۶۰)

دو بنیادی صفات جن کا ذکر قرآن وحدیث میں ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اُمّتِ مسلمہ اس معنی میں خیر ہے کہ تمام پہلی اُمتوں کے مقابلے میں اپنی استعداد کے لحاظ سے بھی اور اپنی صلاحیت کی نشوونما کے لحاظ سے بھی اقویٰ ہے۔ زیادہ طاقتور ہے اور ''الْقَوِیّ'' کا مفہوم دراصل یہ بھی ہے کہ جس اُمّت نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی کامل شریعت اور تعلیم کی روشنی میں اس طرح کامل نشوونما دیا ہو اور اپنی قوتوں کا کامل نشوونما کیا ہو کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اسی معنی میں یہ کہا کہ اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی (ترمذی کتاب صفۃ القیامۃ) کہ دینے والا ہاتھ خَیْرٌ کا ہاتھ ہے اور لینے والا ہاتھ ایسا نہیں اور اس کی تفصیل میں نے جتنا ممکن تھا بتائی تھی۔

دوسری صفت جو خَیْرَ اُمَّۃٍ کی بنیادی صفت ہے اور جس کا ذکر قرآن کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات میں ہے وہ یہ ہے کہ وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ کہ (ایک جماعت) ایک گروہ اس اُمّتِ مسلمہ یعنی خَیْرَ اُمَّۃٍ کا ایسا ہونا چاہیے کہ جن کا کام ہی صرف یہ ہو کہ وہ گروہ خیر کی طرف بلانے والا ہو۔

خیر کے ایک معنی یہاں ''قرآن'' کے ہیں کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ایک حدیث کی روشنی میں جس کا میں ذکر کروں گا ایک الہام اس معنی میں ہوا اور حدیث یہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ (بخاری کتاب فصائل القرآن باب خیرکم من تعلّم القرآن وعلّمہ) پس اُمّت مسلمہ کا وہ گروہ جس کے متعلق کہا کہ وہ گروہ ایسا ہونا چاہیے وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ تو يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ کی بنیادی صفت یہ ہے کہ خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ۔ قرآن کریم سیکھنا اور سکھانا اور قرآن کریم کی ساری دنیا میں اشاعت کرنا یہ خَیْرَ اُمَّۃٍ امت مسلمہ کی ایک دوسری بنیادی صفت بیان کی گئی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اسی حدیث اور قرآن کی بعض اور آیات کی تفسیر کے طور پر یہ

الہام ہوا’’ اَلْخَیْرُ کُلُّہٗ فِی الْقُرْاٰنِ ‘‘ (تذکرہ ایڈیشن چہارم صفحہ ۷۸)

پس آیت وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ میں اِلَى الْخَيْرِ سے مراد قرآن عظیم ہے یعنی ایسی امت اور جماعت تم میں ہر وقت رہنی چاہیے جو قرآن عظیم پر کامل عمل کرنے والی ہو جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آیا ہے کہ جب پوچھا گیا کہ آپ کے اخلاق کیسے تھے تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا’’ قرآن‘‘ یعنی قرآن کریم نے جو تعلیم دی جن اصول اور حدود کو قائم کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی وہی نظر آتا ہے اور ہمیں کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگیوں کے لئے اُسوہ بناؤ۔ پس اُمت مسلمہ میں ایک ایسی اُمت اور گروہ بزرگوں کا ہونا چاہیے (بزرگ عمر کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنی عاجزی کے لحاظ سے اور عاجزانہ راہوں کو اختیار کرنے کے لحاظ سے نیز بزرگ ہستی کے اعلان کے بعد اپنے رب سے بے لوث محبت کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی محبت کو حاصل کرنے کے لحاظ سے) جو نمایاں طور پر دوسروں کیلئے قابل تقلید مثال اور اپنی استعداد کے معراج پر پہنچنے کے بعد جتنا کسی انسان کیلئے اُسوہ کا بننا ممکن ہے مثیل بن جانے والے ہوں۔ اصل میں تو’’ اَلْاُسْوَۃ ‘‘ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ ہی ہمارے لئے ایک مثال ہیں ان معنوں میں کہ ہم وہی رنگ اپنے اوپر چڑھا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے جائیں اور اس طرح پر اس نیک مثال کے قائم کرنے کے ساتھ دنیا کو قرآن عظیم کی طرف بلائیں۔.........

’’خَیْر ‘‘ کے متعلق اصل میں مَیں بتا رہا ہوں کہ خیرِ امت جو ہمیں کہا گیا تو اس خیر امت کی بہت سی صفات بیان کی گئی ہیں۔ بعض جگہ لفظِ خیر کو استعمال کر کے، بعض جگہ’’ خَیْر ‘‘ کے معانی کو استعمال کر کے۔ دو بنیادی چیزیں ان دو خطبوں میں مَیں بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک میں نے بیان کی تھی کہ’’ قوی‘‘ ہونا۔ یعنی امت مسلمہ کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا چاہیے کیونکہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ یہ بتاتا ہے۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ کہتی ہے کہ غیر اللہ کے سامنے ہم نے ہاتھ نہیں پھیلانا اور جب تک امت مسلمہ میں اس کی شان کے مطابق یہ صفت پیدا نہیں ہو جاتی اس وقت تک اسلام کی طرف انسان منسوب تو ہو سکتا ہے لیکن اسلام کی عظمت میں انسان حصہ دار نہیں بن سکتا۔

اور دوسرے’’ خَیْر ‘‘ کا بنیادی اصل جو ہمیں بتایا گیا ہے وہ ہے قرآن کریم کو سیکھنا۔ یہ صفت ایسی ہے جو اُمتِ مسلمہ کو كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ بناتی ہے۔ یعنی خیر امت ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ ایک

ایسی اُمت ہے جو قرآن کریم میں سے کتاب مبین کو بھی اور کتاب مکنون کو بھی سیکھتی ہے اور محفوظ رکھتی ہے اور اپنے نمونہ اور خداداد فراست کے ذریعہ یا اگر اللہ تعالیٰ فضل کرے تو اس سے سیکھی ہوئی تعلیم کے ذریعہ دنیا تک قرآن کریم کے نئے سے نئے علوم پہنچاتی رہتی ہے۔ پس یہ خَيْرَ اُمَّةٍ اُمتِ مسلمہ کی ایک بنیادی صفت ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاتا اگر خدا کی نگاہ میں خیر امت بننا ہے تو ایسا بننا پڑے گا۔ (خطباتِ ناصر جلد پنجم صفحہ ۲۹۵ تا ۳۰۶)

میں نے اس وقت قرآن کریم کی آیت کے جس ٹکڑے کی تلاوت کی ہے اس کے ایک حصے کی طرف ہی توجہ دلاؤں گا اور وہ ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہارے لئے ایسے سامان پیدا کئے گئے ہیں کہ تم تمام اُمتوں اور جماعتوں سے زیادہ برکت والی اُمت اور خیر والی جماعت بن سکتے ہو اور یہ اس لئے کہ قرآن عظیم ایک کامل شریعت کی شکل میں نوعِ انسانی کے ہاتھ میں دیا گیا ہے۔ اس میں اُمت مؤمنہ اور امت مسلمہ کے لئے روحانی اور دوسری رفعتوں کے سامان بھی بہت زیادہ مہیا کئے گئے ہیں۔

پس خَيْرَ اُمَّةٍ میں جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ایک بنیادی چیز ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تم سے بڑھ کر، تم سے بہتر اور تم سے افضل کوئی اور گروہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ جس قدر رفعتوں تک پہنچنے کے سامان امت مسلمہ کو دئے گئے ہیں اس قدر رفعتوں تک پہنچنے کے سامان پہلی امتوں کو نہیں دئے گئے تھے۔ چنانچہ خَيْرَ اُمَّةٍ میں ایک بڑا وسیع مضمون بیان ہوا ہے اور دراصل ساری قرآنی تعلیم ہمیں اسی طرف لا رہی ہے۔

تاہم جہاں تک لفظ خیر کا تعلق ہے قرآن کریم میں بعض جگہ اس کے استعمال سے لفظاً اور بعض جگہ معناً یہ بتایا گیا ہے کہ خیر اُمّت کی کیا کیا صفات ہونی چاہئیں۔ اسی طرح حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بھی لفظاً اور معناً ہر دو لحاظ سے خیر اُمّت کی صفات کے متعلق ہمیں بہت کچھ بتایا گیا ہے۔ اس وقت میں ''خَيْر'' کی دو ایسی صفات کی طرف احباب کو توجہ دلانا چاہتا ہوں جن میں خیر کا لفظ معناً بھی استعمال ہوا ہے اور لفظاً بھی۔

چنانچہ خیر اُمت بننے کے لئے ہمیں ایک یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ ہم اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے والے بنیں۔ نہ صرف ہم اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے

والے ہوں بلکہ ہم دنیا جہاں کی ضرورتوں کو پورا کرنے والے بھی ہوں نہ صرف یہ کہ ہم خود دوسروں کے سامنے مدد کے لئے ہاتھ نہ پھیلائیں بلکہ جب ہمارے سامنے دنیا جہاں کے ہاتھ لمبے ہوں اور ہمارے سامنے امداد کے لئے ہاتھ پھیلائے جائیں تو ہم اُن کے ہاتھوں کو ان کی وسعت سے زیادہ بھر دینے والے ہوں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے جس کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے کا تعلق اُمت کے اندر باہمی معاونت کرنے سے ہے اور دوسرے کا تعلق مسلم وغیر مسلم سب کے ساتھ بھلائی کرنے سے ہے۔

آپ نے فرمایا: اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى (مسلم کتاب الصلوٰۃ) گویا اس میں لفظاً بھی اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو ''خیر اُمّت'' میں پنہاں ہے یعنی امت مسلمہ کا ہاتھ، مومنوں کے گروہ کا ہاتھ ہمیشہ عُلیا یعنی بالا رہنا چاہیے۔ اُن کا ہاتھ دینے والا ہونا چاہیے سُفلیٰ یعنی لینے والا نہیں ہونا چاہیے۔ (خطباتِ ناصر جلد پنجم صفحہ ۲۸۲، ۲۸۳)

ہم جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مخاطب کر کے یہ فرمایا ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ یعنی نوعِ انسان کے سب افراد کی بھلائی کے لئے، ان کی خیر خواہی کے لئے اور ان کی خدمت کے لئے تم پیدا کئے گئے ہو۔ یہ بات کہ ''خیر'' کے لفظ کو قرآن کریم کن معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ خود قرآن کریم ہی میں ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے لیکن اس تفصیل کی طرف تو میں اس وقت توجہ نہیں دلا سکتا کیونکہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں مثال کے طور پر ایک دو باتیں بتا دیتا ہوں۔

ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کو بھی خَیر کہا گیا ہے اور اپنے اعمال کو تقویٰ کی بنیادوں پر کھڑا کرنے کو بھی قرآن کریم نے خَیر کہا ہے۔ گویا ہر مسلمان کا جو رشتہ دوسرے مسلمان کے ساتھ ہو وہ دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت رکھنے اور اس کے احکام کی بجا آوری میں ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں اور بہت سی باتیں ہیں تفصیل کی بھی اور اصول کی بھی جنہیں قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ بہرحال اُمّتِ مسلمہ کو بنی نوع انسان کی خیر خواہی کے لئے، ان کی بھلائی کے لئے اور ان کی خدمت کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

یہ جو بھلائی کرنے کا عمل ہے یہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اصولی طور پر خَیر پہنچانے کے

متعلق احکام پر اس حد تک عمل کیا جا سکتا ہے جتنے کی توفیق ملے اور اس خیر اور اس بھلائی کی توفیق کے نتیجہ میں کسی ایک آدمی کو یا چند آدمیوں کو یا ایک محدود گروہ کو فائدہ پہنچ سکتا ہے کیونکہ اس سے زیادہ کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی کا اپنے مال میں اپنے بھائی کو حصہ دار بنانا۔ اب جتنا کسی کے پاس مال ہوگا اسی میں وہ دوسرے کو حصہ دار بنا سکتا ہے۔ جب ہجرت کے بعد مہاجرین اور انصار بھائی بھائی بنائے گئے تو انصار میں سے جس کے پاس جتنا مال تھا اس میں اپنے مہاجر بھائی کو برابر کا شریک کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کسی کے پاس مال تھوڑا تھا اور کسی کے پاس زیادہ تھا لیکن جتنا جتنا تھا وہ کہتے تھے آؤ ہم نصف نصف کر لیتے ہیں لیکن لینے والوں نے کہا کہ ہمیں تمہارا مال لینے کی ضرورت نہیں۔ بعض نے بڑی معمولی معمولی رقمیں قرض کے طور پر لے لیں انہوں نے کہا خدا تعالیٰ نے ہمیں صحت دی ہے، طاقت دی ہے، ہمت دی ہے اور پھر یہ بھی کہ ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے۔ اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى (بخاری کتاب الزکاۃ) دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہر حال اچھا ہے تو ہم کیوں نچلے درجے کو قبول کریں ہم محنت کر کے کھائیں گے بھی اور کوشش کریں گے کہ اپنے بھائیوں کی مالی لحاظ سے مدد بھی کریں۔ غرض یہ مضمون بہت وسیع ہے اور یہ واقعات بڑے ایمان افروز ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں رونما ہوئے۔

میں بتا یہ رہا ہوں کہ مال میں شریک اپنے ضرورت مند بھائی کے لئے بھلائی کے سامان پیدا کرنا۔ یہ بھی خیر کا حصہ ہے لیکن محدود ہے۔ دنیا کے جو اموال ہیں اور دنیا کی جو طاقت ہے اور دنیا کے جو اوقات ہیں۔ یہ سارے محدود ہیں کیونکہ انسان کی زندگی محدود ہے لیکن خدا تعالیٰ کی طاقت غیر محدود ہے۔ وہ غیر محدود طاقتوں کا مالک ہے۔ اس لئے اس کی خیر کا عمل اپنی وسعت اور افادیت کے لحاظ سے سب سے بڑا ہے اور غیر محدود ہے گویا ہر ایک بھلائی خدا سے مانگنے سے تعلق رکھتی ہے۔

انسان دعا کے ذریعہ بھلائی کے سامان پیدا کرتا ہے اپنے معاشرہ میں اور اس زندگی میں جسے وہ اس جہان میں گزار رہا ہے۔ خدا چاہے تو دعا کا اثر ساری دنیا کے انسانوں پر پڑ سکتا ہے۔ اللہ کے لئے تو یہ چیز آسان ہے اس کے سامنے تو کوئی چیز انہونی نہیں۔ پس اگر دعا قبول ہو جائے تو ساری دنیا کی بھلائی کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ (خطباتِ ناصر جلد ہفتم صفحہ ۵۱ تا ۵۳)

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ کہ یہ کتاب اس اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے جو الْعَزِيْزِ

صفت سے متّصف ہے۔ جو غالب ہے اور کوئی اور ہستی اس پر غالب نہیں آ سکتی۔ کیونکہ اس جیسا کوئی ہے ہی نہیں۔عزیز کے ایک معنی اس قسم کی عزت اور طاقت اور غلبہ رکھنے والی ہستی کے ہوتے ہیں کہ جس کے مقابلہ میں اس جیسی قوت اور طاقت اور غلبہ رکھنے والی کوئی اور ہستی نہ ہو۔اس لحاظ سے وہ بے مثل ہو۔

تو اس ٹکڑے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا کہ اس عزیز خدا کی طرف سے جو کتاب نازل کی گئی اس کتاب میں بھی یہ خوبی ہے کہ وہ بے مثل ہے۔ایسی خوبیوں کی حامل، رضاءِ الٰہی کی اس قدر فراخ راہیں دکھانے والی ہے کہ دنیا میں جس قدر کتب سماوی گزری ہیں وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اور نہ کسی انسان کی طاقت میں یہ ہے کہ اس کا مثل معرضِ وجود میں لا سکے۔اس کتاب میں کامل حسن اور کامل تعلیم اور کامل ہدایت پائی جاتی ہے۔اس بے مثل اور یگانہ ذات کے پرتَو نے اس کتاب کو بھی بے مثل کر دیا ہے۔اگر تم اس کتاب کی تعلیم پر عمل کرو گے تو تم بھی ایک واحد و یگانہ بے مثل قوم بن جاؤ گے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تم وہ اُمت ہو جس سے بہتر اُمت اس دنیا میں پیدا نہیں کی گئی تم وہ اُمت ہو جس سے زیادہ احسان، انسان پر کسی اُمت نے نہیں کیا۔پس پہلی خوبی اس کتاب کی اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتائی کہ اپنے کمال کے باعث یہ کتاب بے مثل ہے۔اور اپنی تعلیم کی وجہ سے یہ کتاب اُمتِ مسلمہ کو ایک بے مثل و بے مثال اُمت بنانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۳۳۳)

اے اُمتِ مسلمہ! اے وہ لوگو جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوتے ہو۔ چاہیے کہ تم میں سے ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہے جنہوں نے اپنی زندگی خدا اور اس کے دین کے لئے وقف کی ہو اور وہ خیر کی طرف بلانے والے ہوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے ہوں اور اس گروہ سے ہمارا یہ وعدہ ہے کہ اگر وہ وقف کی روح کو سمجھیں گے اور اس روح کے مطابق اپنی زندگیوں کو گزاریں گے۔تو بہت بڑی کامیابی ان کے نصیب میں ہوگی۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ان کو فلاح ملے گی کہ اس سے بڑی کامیابی اور کوئی متصور نہیں ہو سکتی۔

یہاں جس گروہ کا ذکر ہے۔اس کے نتیجہ میں انفرادی طور پر واقف کے لئے جو اپنے وقف میں اخلاص رکھنے والا اور خدا اور رسول کے لئے صدق و صفا رکھنے والا ہو ثباتِ قدم رکھنے والا ہو۔ایثار اور

قربانی کے جذبات رکھنے والا ہو۔ یہ وعدہ دیا گیا ہے کہ تمہیں حسبِ استطاعت اجر ملے گا۔

لیکن واقفین کے اس گروہ کے نتیجہ میں اُمتِ محمدیہ کا کوئی مقام متعیّن نہیں کیا گیا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ اسی سورۃ میں ایک دوسری جگہ یوں فرماتا ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کہ تمہاری اُمت جو اُمتِ مسلمہ کہلاتی ہے۔ تمام امتوں سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ تمہیں یہ سبق دیا گیا ہے اور تم اس سبق کو سمجھتے ہو اور جانتے ہو اور اس سبق کے مطابق اپنی زندگیوں کو گزارنے والے ہو تو تمہاری اُمت کو تمہارے فائدہ کے لئے نہیں بلکہ دنیا کے فائدہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تو خَيْرَ اُمَّةٍ تم اس وجہ سے ہو کہ تم اپنے نفسوں کو بھلا دیتے ہو اور دنیا کی بھلائی کا خیال رکھتے ہو۔

ان دو آیتوں پر جب ہم مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اُمتِ محمدیہ میں واضح طور پر دو جماعتیں نظر آتی ہیں۔ ایک وہ جماعت جنہوں نے اپنی زندگی خدا کی راہ میں وقف کی اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس عہد کو نباہا یہ وہ گروہ ہے جو امت محمدیہ کو خیر کی طرف بلانے والا ہے۔ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ جو اُمّتِ محمدیہ کی تربیت اس رنگ میں کرنے والا ہے کہ یہ اُمت بحیثیتِ اُمّت دنیا کی بہترین اُمّت بن جائے اور اس کے بدلے میں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ تعالیٰ پیار کا سلوک کرے گا۔

دوسری آیت میں یہ بتایا کہ خیرِ اُمت بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُمّت کی اکثریت ہر نکتہ کو سمجھنے والی ہو کہ انہوں نے اپنے نفس کو قربان کرنا اور غیر کے نفس کو فائدہ پہنچانا ہے۔ اپنے نفس کو تکلیف میں ڈالنا اور غیر کے نفس کو نارِ جہنم سے بچانے کی کوشش کرنا ہے۔ اپنے نفس پر مجاہدات طاری کرنے ہیں، قربانی اور ایثار کی راہوں کو اختیار کرنا ہے اس لئے کہ قرب کی راہیں پا لیں۔

(خطباتِ ناصر جلد دہم صفحہ ۲۹۹، ۳۰۰)

آیت ۱۳۲ تا ۱۴۰ وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۚ﴿۱۳۲﴾ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۚ﴿۱۳۳﴾ وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۱۳۴﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ

الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۳۵ وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ
فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۫ وَ لَمْ يُصِرُّوْا
عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۶ اُولٰٓىِٕكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ جَنّٰتٌ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝۱۳۷ قَدْ خَلَتْ
مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۳۸ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۱۳۹ وَ لَا تَهِنُوْا
وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۴۰

اور اس آگ سے ڈرو (نار جہنم سے) جو منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے اور اپنے رب کی طرف سے نازل ہونے والی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی قیمت آسمان اور زمین ہیں اور جو متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے بڑھو۔ وہ متقی جو خوشحالی میں بھی اور تنگ دستی میں بھی خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ محسنوں سے محبت کرتا ہے۔ ہاں ان لوگوں کے لئے جو کسی بُرا کام کرنے کی صورت میں یا اپنی جانوں پر ظلم کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں اور اللہ کے سوا کون قصور معاف کرسکتا ہے اور جو کچھ انہوں نے کیا ہوتا ہے اس پر دیدہ ودانستہ ضد نہیں کرتے۔ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی جزا ان کے رب کی طرف سے نازل ہونے والی مغفرت اور ایسے باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں بستے چلے جائیں گے اور کام کرنے والوں کا یہ بدلہ کیا ہی اچھا بدلہ ہے۔ تم سے پہلے کئی دستور العمل گزر چکے ہیں جن کے نتائج دیکھنے ہوں تو زمین میں پھرو اور دیکھو کہ ان قوانین کو جھٹلانے والوں کا کیسا بُرا انجام ہوا۔ هٰذَا بَيَانٌ یہ قرآن کریم جو ہے یہ ذکر لوگوں کے لئے بہت وضاحت کرنے والا ہے اور متقیوں کے لئے ہدایت اور نصیحت ہے اور تم کمزوری نہ دکھاؤ اور نہ غم کرو اور اگر تم مومن ہو تو تم ہی بالا رہو گے۔........

قرآن کریم نے متعدد جگہ مختلف طریق پر ہمیں خدا تعالیٰ کے غضب کی آگ سے بچنے کی تعلیم دی اور اس کی راہیں جو بیان کی ہیں ان آیات میں سے میں نے بعض کا انتخاب کیا ہے۔ جو میں نے ابھی پڑھی ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ اس آیت میں اوّل ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ کافروں کے لئے خدا تعالیٰ کے قہر کی آگ بھڑکائی گئی ہے، وہ کافر اور منکر جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتے، وہ مخالف ہیں خدا کے دین کے، جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کی اتباع نہیں کرتے۔ آپ سے پیار کا تعلق نہیں رکھتے، ان کافروں کے لئے ایک آگ تیار کی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اس آگ سے اپنا بچاؤ کرو وَ اتَّقُوا یہ بچاؤ تقویٰ کے ذریعہ سے کرو اور دوسرے یہ کہ خدا تعالیٰ کے قہر کی آگ سے بچنے کے سامان خدا کی پناہ میں آکر پیدا کرو۔ تیسرے یہ کہ اس کی راہ کیا ہے؟ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اس کے سب احکام کو ہمہ وقت بجالانے کے لئے ہر دم تیار رہو یعنی یہ نہیں کہ جس طرح جاہلیت کے زمانہ میں ''نسیء'' کے طریق پر حرمت والے مہینوں کو آگے پیچھے کر دیتے تھے تو ہماری زندگی کا ہر لحہ خدا تعالیٰ کے لئے وقف ہونا چاہیے۔ اس معنی میں کہ اس کی جو بے شمار دنیوی نعمتیں ہمارے اوپر نازل ہوئی ہیں ہم ان کو جائز طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کریں اور جائز طریقے پر ان کو خرچ کرنے والے ہوں تو اس آگ سے بچنے کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اس کے احکام ہر دم بجالانے کے لئے تیار رہو اور مجاہدہ اپنے نفس کے ساتھ کرو۔

چوتھے یہ کہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت کرو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ (یونس:۱۶) میں اس وحی کی اتباع کرتا ہوں جو میرے پر خدا تعالیٰ نے نازل کی۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اس معنی میں کہ تم بھی اس وحی کی اتباع کرو جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی۔ دوسرے قرآن کریم نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے انسانوں کے لئے، رہتی دنیا تک کے لئے، اُسوہ بنا کر ہمارے سامنے رکھا یعنی ہمیں آپ کے نقش قدم پر چلنا اور آپ کے اسوہ کے مطابق زندگی گزارنا خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کے پیار کو حاصل کرنا ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رنگ بننے کی کوشش کرو اور فرمایا کہ اس کا

نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم سے رحم کا سلوک کرے گا اور اس کی محبت اور اس کے پیار کے تم وارث ہو گے۔

چھٹے یہ کہ اللہ تعالیٰ جو رحم اور پیار کا سلوک کرے گا اس کی دو صورتیں یا دو شکلیں ان آیات میں بتائی گئی ہیں۔ آگے یہ ذکر ہے وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے رحم کی دو شکلیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک اس کی مغفرت، جب وہ اپنی مغفرت سے ڈھانپ لے تو انسان اس آگ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ جس سے یہاں ڈرایا گیا، جس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے اور یہ مغفرت رب کی طرف سے نازل ہونے والی بخشش ہے جس کے بغیر انسانی اعمال بے ثمر ہیں اور نارِ جہنم سے بچنا ناممکن ہے۔

ساتویں یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ایک ایسی جنت کی شکل میں انسان کے سامنے رکھی گئی ہے جس کی قیمت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اس کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ ہر آدمی یہ بات آسانی سے سمجھ نہیں سکتا۔ چنانچہ سورۃ لقمان میں فرمایا کہ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً (لقمان: ۲۱) اور سورۃ جاثیہ میں فرمایا وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیۃ: ۱۴) اس سے ہمیں پتا لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت اس شکل میں بھی آتی ہے (میں یہ ترتیب ذرا بدل دوں گا آپ کو سمجھانے کے لئے) کہ ایسی جنت ملتی ہے جس کی قیمت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے یعنی آسمانوں اور زمین میں ہر شے جو ہے تم اس کی جو بھی قیمت لگاؤ وہ خدا تعالیٰ کی موعودہ جنت کی قیمت ہے اور وہ اس طرح پر کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب میں انسان اسلام کی ہدایت کی روشنی میں اپنی سب طاقتوں اور استعدادوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ حکم یہ ہے انسان کو کہ جو تمہیں میں نے طاقتیں، قوتیں، صلاحیتیں اور استعدادیں دی ہیں وہ ساری میرے حضور پیش کر دو۔ میرے حکم کے مطابق، میری بتائی ہوئی تعلیم کے مطابق، میری رضا کے حصول کے لئے، میرے پیار کو پانے کے لئے تم ان کو خرچ کرو تو ''آسمانوں اور زمین کی ہر شے'' کے فقرہ میں نوعِ انسان کی وہ طاقتیں بھی شامل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیں اور یہ استعدادیں، یہ طاقتیں اتنی عظیم ہیں کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، کہ جن سے انسان خدمت نہ لے رہا ہو یا خدمت نہ لے سکتا ہو اور بعض جگہ بعض چیزیں پوشیدہ

ہیں۔ ابھی تک ہمارے علم میں نہیں انسان کو یہ طاقت دی کہ دنیا کی ہر شے سے خدمت لے سکتا ہے، اپنی بھلائی اور خوشحالی کے سامان پیدا کرسکتا ہے اس دنیا کی خوشحالی کے بھی اور مرنے کے بعد کی زندگی اُخروی زندگی کی خوشحالی کے بھی۔ کیونکہ فرمایا کہ جو اس دنیا میں اندھا ہوگا وہ اُخروی زندگی میں بھی اندھا ہوگا تو وہاں دیکھنے کی آنکھ یہاں حاصل کرنی پڑتی ہے۔ ان سامانوں کو استعمال کر کے قوتوں اور استعدادوں کی صحیح اور کامل نشوونما کر کے وہاں کے سامانوں سے استفادہ کرنے اور لذت حاصل کرنے کی طاقتیں اور احساسات حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب میں انسان اپنی سب طاقتوں اور استعدادوں کو بروئے کار لاتا اور آسمانوں اور زمین کی ہر شئے سے خدمت لیتا اور اسے خرچ کرتا ہے۔ انسان جب اپنی ساری کی ساری طاقتوں اور آسمانوں اور زمین کی ہر شے خرچ کر کے جنت کا سودا کرتا ہے تو جنت کی یہی قیمت ہوئی۔ یہ مراد ہے عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ سے۔

آٹھویں یہ کہ اس جنت کی اتنی بڑی قیمت ہے کہ تمہیں خدا تعالیٰ نے بہت طاقتیں دیں اور زمین وآسمان کو تمہاری خدمت پہ بھی لگا دیا تمہیں یہ طاقت دی کہ تم ان سے خدمت لے سکو اور یہ جنت جس کی اتنی بڑی قیمت ہے تقویٰ کی راہوں پر عمل کرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

نویں خلاصہ یہ کہ جس جنت کے حصول پر تمہاری ساری ہی قوتیں، تمہاری ساری ہی استعدادیں، تمہاری صلاحیتیں ایک طرف اور آسمانوں اور زمین سے تعلق رکھنے والی ہر شئے اور ظاہری اور باطنی اور آسمانی اور زمینی ہر نعمتِ باری دوسری طرف خرچ ہوئی ہے اس عظیم جنت کے پانے کے لئے آگے بڑھو (سَارِعُوْٓا) اور یہ ہے وہ عظیم جنت جو متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے اور جسے متقی مغفرت باری کے حصول کے بعد حاصل کریں گے اور پھر متقیوں کی کچھ بنیادی صفات بیان کی گئی ہیں۔

دسویں ان کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ فراخی اور خوشحالی کی حالت میں خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ مال دیتا ہے تو یہ منعم علیہ جنات کا علیحدہ رہنے والوں کا، عوام سے بے تعلقی اختیار کرنے والوں کا، ان کے مسائل سے بے توجہی برتنے والوں کا گروہ نہیں بن جاتے بلکہ جس وقت فراخی ہوتی ہے اور خوشحالی ان کے نصیب میں ہوتی ہے تو تکبر کی راہوں کو وہ اختیار نہیں کرتے بلکہ تکبر سے بچتے اور مستحقین سے غفلت نہیں برتتے بلکہ جو حق دار ہیں جو مستحق ہیں، جن کے حقوق اللہ تعالیٰ نے قائم کئے ہیں، جن سے اخوت کا رشتہ باندھا گیا ہے ان کے تمام حقوق خدا تعالیٰ کی منشا اور رضا کے

مطابق وہ ادا کرنے والے ہیں۔

گیارھویں فرمایا کہ ہمیشہ فراخی اور خوشحالی کی حالت ہر انسان کے لئے تو نہیں رہتی، تنگی بھی ہے تکلیفوں کا زمانہ بھی ہے، قحط کے آثار بھی ظاہر ہو جاتے ہیں اور قحط کے آثار میں بھی، طبقات طبقات میں فرق پڑ جاتا ہے، غریب کے لئے زیادہ مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ امیر کے لئے نسبتاً کم مشکلیں، تو فرمایا کہ وہ تکلیفوں اور تنگی کی حالت میں اور قحط کے دنوں میں سخاوت سے تنگ دل نہیں ہو جاتے وہ اپنے مقدور کے مطابق سخاوت کرتے چلے جاتے ہیں اور مخلوقِ خدا کی خدمت کے ذریعہ وہ اپنے پیدا کرنے والے رب کریم کے پیار کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جس موعودہ جنت کا یہاں ذکر ہے اس کے حق دار بننے کے لئے وہ ایک جہاد کر رہے ہوتے ہیں۔

بارھویں یہاں یہ بات بتائی کہ یہ متقی وہ ہیں جو غصّہ پی جاتے ہیں۔ غصّہ ایک جذباتی کیفیت ہے، غصّہ انسان کو پاگل کر دیتا ہے۔ غصّہ اور عقلِ سلیم ایک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے، غصّہ کرنے والے ہمیشہ بے وقوفی کی باتیں کرتے اور احمقانہ اعمال بجالاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا مومن غصّہ نہیں کرتا۔ متقی غصّہ پی جاتا ہے اس کے سب کام خدا کی رضا اور اس کی مخلوق کی بہبود کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ غصّے میں آ کر لوگوں کے اوپر ظلم کے لئے تیار نہیں ہو جاتا۔

پھر تیرھویں یہ بتایا کہ متقی وہ ہیں جو یاوہ گو اور ظالم طبع لوگوں کے حملہ کو معاف کر دیتے ہیں۔ بیہودگی کا بیہودگی سے جواب نہیں دیتے۔ بڑا وقار ہے متقی میں۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں یہ بات یاد رکھو کہ

> ’’قرآنی تعلیم یہ نہیں کہ خواہ نخواہ اور ہر جگہ شر کا مقابلہ نہ کیا جائے اور شریروں اور ظالموں کو سزا نہ دی جائے۔ بلکہ یہ تعلیم ہے کہ دیکھنا چاہیے کہ وہ محل اور موقعہ گناہ بخشنے کا ہے یا سزا دینے کا۔ پس مجرم کے حق اور نیز عامہ خلائق کے حق میں جو کچھ فی الواقع بہتر ہو وہی صورت اختیار کی جائے۔‘‘ (اسلامی اصول کی فلاسفی۔ روحانی خزائن جلد نمبر ۱۰ صفحہ ۳۵۱)

چودھویں بات ان آیات میں (اگلی آیت شروع ہوگئی ہے) یہ بتائی کہ ان متقیوں کے لئے یہ جنتیں بنائی گئی ہیں کہ جب وہ کسی بشری کمزوری کے نتیجہ میں بے حیائی کا کام کر بیٹھیں یا اپنی جانوں پر ظلم کریں اور پھر اللہ تعالیٰ کو یاد کریں یعنی ’’غلطی‘‘ بشری کمزوری سے ہو ہی جاتی ہے لیکن اس کمزوری

پہ اصرار نہ کریں بلکہ جب گناہ سرزد ہو تو وہ فوراً توبہ کریں۔ اگر بے حیائی کا، فحشاء کا کوئی فعل ان سے سرزد ہو جائے، ماہِ رمضان میں کوچۂ بازار میں لڑ پڑیں کسی سے یا اپنے نفسوں کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت برتیں یا دوسروں کے حقوق تلف کر کے اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اسی وقت توبہ کریں اور خدا سے کہیں کہ اے خدا! میں نے غلطی کی۔ میں کمزور انسان ہوں تو مالک ہے مجھے سزا بھی دے سکتا ہے لیکن تو بڑا پیار کرنے والا ہے اور معاف کرنے والا بھی ہے میری استدعا ہے کہ تو میرے گناہوں کو معاف کر دے جو میری غلطی اور گناہ ہے اس کے بداثرات سے، اپنے قہر کے جہنم سے، عذاب سے مجھے بچا لے، مغفرت کی چادر کے اندر مجھے ڈھانپ لے۔

اور پھر پندرھویں بتایا کہ بے حیائی کا کام کرنے اور جانوں پر ظلم کرنے کے بعد اپنے گناہوں پر اصرار نہیں کرتے۔ جو حالت اصرار کی ہے وہ زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک گناہ کرنا پھر اسی کو دوبارہ کرنا پھر اسی کو دوبارہ کرنا پھر اور دلیر ہو جانا، اگر کوئی توجہ بھی دلائے تو اس کے سامنے اکڑ جانا کہ تو بڑا متقی بنا ہوا ہے مجھے سمجھاتا ہے۔ سمجھانے والوں کو بھی چاہیے کہ علیحدگی میں سمجھائیں جہاں شیطان کے وار کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ پس اس میں یہ بتایا کہ متقی وہ ہیں جو اپنے گناہوں پر اصرار نہیں کرتے۔ بے حیائی ہو جاتی ہے، بشری کمزوری ہے۔ اپنی جانوں پر ظلم ہو جاتا ہے کمزور ہے انسان لیکن فوراً سنبھلتا ہے، اپنی طاقت کی طرف رجوع نہیں کرتا، اپنے پیدا کرنے والے رب کی طرف رجوع کرتا ہے اور خدا کو کہتا ہے کہ اے خدا تو بخش سکتا ہے، تو مجھے بخش دے، تو مغفرت کی چادر کے نیچے مجھے ڈھانپ سکتا ہے تو مجھے ڈھانپ لے، تجھی میں یہ طاقت ہے مجھ میں نہیں کہ میرے گناہ کے بداثرات جو ہیں ان سے میں محفوظ رہوں۔ اے خدا! تو مجھے میری بداعمالیوں، میرے گناہوں کے بداثرات سے محفوظ رکھ۔ تو ان کا خدا انہیں بخش دے گا۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا چونکہ بخش دے گا اس واسطے جو مرضی کرتے جاؤ۔ خدا مالک ہے، وہ بخشتا بھی ہے مالک کی حیثیت سے اور مالک کی حیثیت سے وہ سزا بھی دیتا ہے۔ خدا مالک ہے چاہے سزا دے چاہے گناہ بخش دے۔ اس واسطے انسان کو گناہ پر دلیر نہیں ہونا چاہیے لیکن انسان سے انسانی کمزوری، بشری کمزوری کے نتیجہ میں چھوٹی بڑی غفلتیں، گناہ، کوتاہیاں اور قصور ہو جاتے ہیں۔ انسان انسان میں فرق ہے۔ اس وقت انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے رب کی

طرف رجوع کرے اور اسی سے معافی مانگے اور بخشش طلب کرے اور اس کے پیار کو حاصل کرے۔ اس کے دامن کو پکڑے اور کہے کہ ہاتھ تو گندے ہیں اے میرے خدا! پر تیرے دامن کی پاکیزگی کو میرے گندے ہاتھ ناپاک نہیں کر سکتے۔ تیری پاکیزگی میرے ہاتھوں کو پاکیزہ بنا سکتی ہے۔ مجھے پاک بنا دے۔

سولھویں یہ بتایا کہ یہ متقی وہ لوگ ہیں جو اپنا سب کچھ خدا کے حضور پیش کرنے والے، اپنی تمام طاقتوں کو خدا کے لئے پرورش کرنے والے اور خرچ کرنے والے اور زمین و آسمان کی نعمتوں کو پھر اس کے حضور پیش کر دینے والے اور اس کی تعلیم کے مطابق اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ کے مطابق اپنی زندگی گزارنے والے ہیں۔ ان متقیوں کی جزا ان کے رب کی طرف سے نازل ہونے والی مغفرت ہے اور چار باتیں یہاں بیان ہوئی ہیں۔

(ا) ان کے رب کی طرف سے نازل ہونے والی مغفرت ایسے متقیوں کی جزا ہے۔ مغفرت کے معنی ہیں گناہ کو ڈھانپ لینا، گناہ کو معاف کر دینا، گناہ کی اصلاح کر دینا، آئندہ کے لئے گناہ کے دروازے کو بند کر دینا اور عذاب سے محفوظ کر لینا، حفاظت کرنا۔.......

تو یہاں اس آیت میں بتایا کہ متقیوں کے لئے یہ مغفرت ہے کہ عذاب سے حفاظت خدا تعالیٰ کہتا ہے نہ تمہیں جنت میں جانے سے پہلے میرا عذاب پہنچے گا نہ جنت میں جانے کے بعد میرا عذاب پہنچے گا۔ اس واسطے بہت سارے مذاہب کا بطلان یہاں ہو گیا کیونکہ مغفرت ان کا جواب ہے یعنی خدا تعالیٰ کی قوتِ مغفرت، اس کی صفتِ غفور جو ہے وہ ضامن ہے کہ انسان جنت میں جائے تو پھر باہر نہ نکلے۔

(ب) اور یہاں یہ بھی بتایا کہ وہ ایسے باغات ہیں جو ہمیشہ سرسبز رہنے والے اور ہمیشہ ہر آن ثمر آور رہنے والے ہیں۔ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ اس کی تھوڑی سی تفسیر ایک وقت میں پہلے بھی بتا چکا ہوں اور باغات بھی ہمیشہ سرسبز اور ثمر آور یعنی اس کی افادیت پوری کی پوری ہمیشہ رہنے والی ہے خدا تعالیٰ کے حکم اور اس کے فضل کے ساتھ۔

(ج) اور انسان کی جنتی زندگی بھی ابدی ہے وہ اس میں بستے چلے جائیں گے۔

(د) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو متقی میرے احکام پر عمل کر کے میرے بتائے ہوئے طریقے پر اعمالِ صالحہ بجا لائیں گے ان کے میں (دوسری جگہ آتا ہے کہ میں ان کے) اعمال کا پورا پورا بدلہ

بھی دوں گا اور پھر اور بھی دوں گا، فضل دوں گا، مغفرت خدا کے فضل کو کھینچنے والی ہے، جذب کرنے والی ہے۔

سترھویں اس سے ہمیں پتا لگا کہ وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ میں وَاتَّقُوا کے کیا معنی ہیں۔ یہ ساری تفصیل جو آئی ہے یہ وَاتَّقُوا کی وضاحت کر رہی ہے اور اس کو بیان کر رہی ہے۔

ان ساری تفاصیل کا خلاصہ یہ بنتا ہے کہ تم اپنے رب کریم کا دامن پکڑو تو کبھی چھوڑو نہ، وفا کا تعلق پیدا کرو تو بے وفائی کبھی نہ کرو، ثباتِ قدم رکھو، اور کامل توکل اس پہ رکھو، کامل بھروسہ اس پہ رکھو اس کو سب طاقتوں کا مالک بھی سمجھو اور انتہائی طور پر پیار کرنے والا، پوری جزا دینے والا بھی سمجھو۔ مغفرت میں ڈھانپ لینے والا اپنے فضل سے، تھوڑے کئے پر ابدی جنت کا مستحق بنا دینے والا یقین کرو۔ بڑا ہی فضل کرتا ہے۔ وہ مالک ہے، قادر ہے جو چاہے کرے۔

فرمایا اور سست مت ہو۔ اس دنیا میں جو خدا تعالیٰ کو مانتے ہیں ان کے اوپر تو اس دنیا کے حالات پیدا ہوئے ہیں نا۔ جب خدا تعالیٰ سے تعلق قائم ہو گیا ایک دفعہ سست مت ہو۔ جس کا مطلب ہے کہ اگر مخالف مقابلے پر اتر آئے تو مقابلہ سے ہمت مت ہارو۔ سست مت ہو مقابلہ سے، ہمت مت ہارو اور غم مت کرو اور کچھ اندیشہ مت کرو۔ کچھ اندیشہ دل میں نہ لاؤ۔ انجام کار غلبہ اس دنیا میں بھی تم ہی کو ہوگا مگر شرط یہی ہے کہ جو تمہیں کہا گیا کہ تقویٰ کی راہوں کو اختیار کر کے خدا تعالیٰ کے غضب سے اپنی حفاظت کرو، خدا تعالیٰ کے تقویٰ کی راہوں کو اختیار کرو اور اگر تم ایمان پر قائم رہو گے اور حقیقی اور واقعی مومن رہو گے تو تمہیں کوئی اندیشہ نہیں۔ آخر اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ہر شعبۂ زندگی میں فوقیت تمہیں حاصل رہے گی۔ اگر خدا تعالیٰ سے تمہارا تعلق پختہ اور حقیقی اور وفا اور ثباتِ قدم کا ہے اور اگر تم نے اس دامن کو پیار اور محبت اور ایثار سے پکڑا اور ایک لحظہ کے لئے بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تو ہر شعبۂ زندگی میں فوقیت تمہیں حاصل رہے گی۔ (خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۳۲۰ تا ۳۳۲)

مال یا اولاد کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کا آنا اس بات کی علامت نہیں ہے نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ کہ ہم ان کو نیکیوں میں جلد جلد بڑھا رہے ہیں اور ان کے اوپر یہ محض انعام کے طور پر فضل ہو رہا ہے کہ ان کے مالوں میں بھی برکت ڈالی جا رہی ہے اور ان کی اولاد میں بھی برکت ڈالی جا رہی ہے وہ سمجھے نہیں اور اس طرف متوجہ نہیں ہوتے کہ وہ جو يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ

نیکیوں کی طرف تیزی سے بڑھتے ہیں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق جو سورۃ آل عمران میں ہے وَ سَارِعُوْۤا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ (آل عمران: ۱۳۴) اور وہ جن میں مسابقت کی روح پائی جاتی ہے۔ ان میں چار علامتیں پائی جاتی ہیں۔

اوّل یہ کہ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ وہ خشیۃ اللہ سے لرزاں رہتے ہیں اور دوسری جگہ فرمایا وَ لَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (الاحزاب: ۴۰) کہ وہ اپنے دل کی اس کیفیت میں کسی اور کو اللہ کے سوا شریک نہیں بناتے۔ یعنی خشیۃ اللہ ہے اور صرف اللہ کی خشیت ہے کسی اور کی خشیت کو اس میں ملونی نہیں ہے یہاں اللہ نہیں کہا بلکہ اللہ تعالیٰ کی بنیادی اور اصولی صفات میں سے صفت ربّ کو منتخب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ وہ اپنے ربّ کی خشیۃ سے لرزاں رہتے ہیں۔ خشیۃ کے معنی ایسے خوف کے ہیں کہ جس سے خوف پیدا ہو اس کی ذات اور صفات کا علم بھی ہو اور وہ ذات ایسی ہو کہ جب اس کا علم انسان کو حاصل ہو جائے تو اس کی عظمت بھی دل میں پیدا ہو تو خشیۃ کے معنی یہ ہوئے کہ ایسا انسان اپنے ربّ سے یہ جانتے ہوئے کہ وہ تمام صفاتِ حسنہ سے متّصف ہے اور ربوبیت کی انتہائی اور آخری ذمہ داری اسی پر ہے۔ مشابہ بِرَبّ شاید اس دنیا میں بھی ملیں لیکن اللہ کے علاوہ جو بھی درجہ بدرجہ جسمانی یا روحانی ارتقا کا باعث بنتے ہیں وہ اسی کے اِذن اور اسی کی توفیق سے ایسا بنتے ہیں۔ حقیقی طور پر اب وہی واحد یگانہ ہے پس جن لوگوں میں اس معنی میں ربّ کی خشیت پائی جاتی ہو اور هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ وہ سمجھتے ہوں کہ قرآن عظیم کا نزول انسان کی جسمانی اور روحانی ترقیوں کے لئے ہے۔ آیات سے یہاں مراد ایک تو قرآن کریم ہے اور دوسرے وہ تمام آسمانی تائیدات ہیں جو قرآن کریم کی آیات کے ظلّ کے طور پر اس دنیا میں ہمیشہ نازل ہوتی ہیں اور نازل ہوتی رہیں گی۔ تو جو لوگ اپنے ربّ کی خشیت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں اور اس سے لرزاں اور ترساں رہتے ہیں اور وہ جو قرآن کریم پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور قرآن کریم کے فیوض کو جاری یقین کرتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابدی فیوض پر ایمان لاتے ہیں اور جو اس طرح پر شرک کے ہر پہلو سے محفوظ ہو گئے ہیں بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ خفیہ یا ظاہری شرک بڑا یا چھوٹا شرک کوئی بھی ان کے قریب پھٹکنے نہیں پاتا اور وہ لوگ جن کے دل اس بات سے وَجِلَةٌ خوف زدہ رہتے ہیں کہ ہم اپنی سمجھ کے مطابق اعمال صالحہ بجا تو لائے ہم نے صدقہ وخیرات بھی دیا دوسری نیکیاں کرنے کی بھی کوشش کی مگر

ہم نہیں جانتے کہ یہ ہمارے ربّ کو مقبول بھی ہوں گی یا نہیں ہم نے سوائے اس کے کسی اور کے سامنے جواب دہ نہیں ہونا اور جس کے سامنے ہم جواب دہ ہیں اس کے متعلق ہم کہہ نہیں سکتے کہ قبولیت کو ہماری نیکیاں پہنچی ہیں یا نہیں پس وہ لوگ نیکیاں تو قرآن کریم کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق ہر آن اور ہر وقت بجالاتے رہتے ہیں لیکن تمام نیکیاں بجالانے کے بعد بھی ان کے دلوں میں یہ خوف رہتا ہے کہ جس کے سامنے جواب دہ ہیں ہم نامعلوم اس نے ہماری نیکیوں کو قبول بھی کیا ہے یا نہیں۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن میں چار باتیں پائی جاتی ہیں وہ ہیں اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہمارے اس حکم کی تعمیل کی کہ وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ۔

اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے اندر مسابقت کی روح پیدا ہو سکتی ہے وہ جو اپنے ربّ کی خشیت کا احساس نہیں رکھتے وہ جو اپنے ربّ کی آیات عظیمہ (قرآن کریم) پر ایمان نہیں لاتے وہ جن کے دلوں میں شرک کی باریک معصیت پائی جاتی ہے اور وہ جو جب نیکی کرتے ہیں تکبر سے کام لیتے ہیں سمجھتے ہیں کہ ہم نے ایسے کام کئے ہیں کہ اب ہمارا ربّ مجبور ہے کہ ہماری ان باتوں کو قبول کرے اور ہمیں بہتر جزا دے وہ لوگ مُسَابَقَتْ فِي الْخَيْرَات اور يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ کے مصداق نہیں ہوا کرتے نہ ان میں مُسَابَقَتْ فِي الْخَيْرَات پائی جاتی ہے نہ وہ جلدی جلدی نیکیوں کی طرف متوجہ ہونے والے اور حرکت کرنے والے ہوتے ہیں۔

اس واسطے وہ لوگ جو صرف ہمارے دنیوی احسانوں کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انہوں نے سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ پر عمل کیا اور يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ کے گروہ میں شامل ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کو انہوں نے حاصل کیا حالانکہ ان کے اندر یہ چار خوبیاں پائی نہیں جاتیں۔ وہ غلطی پر ہیں لَا يَشْعُرُوْنَ مومنوں میں روح مسابقت کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہ افراد میں بھی ہوتی ہے اور جماعتوں میں بھی اور سب سے زیادہ اس کی طرف مرکز کو متوجہ ہونا چاہیے۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۸۳ تا ۸۵)

ایمان کا لفظ جو عام طور پر اور بڑی کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے اس کے ساتھ آگے تفصیل نہیں ہوتی یہ فرمایا ہے کہ ایمان لاؤ ایمان کا یہ فائدہ ہے ایمان کا یہ ثواب ہے ایمان سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا

ہے مگر وہاں یہ ذکر نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی بات ہو رہی ہے یا غیب پر ایمان لانے کی بات ہو رہی ہے یا رُسل پر ایمان لانے کی بات ہو رہی ہے یا حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی بات ہو رہی ہے یا قرآن کریم پر ایمان لانے کی بات ہو رہی ہے وغیرہ۔ غرض ایسی صورت میں تفصیل نہیں دی ہوتی اللہ تعالیٰ صرف یہ فرماتا ہے کہ ایمان لاؤ۔

دراصل جہاں کہیں بھی ایمان کے لفظ کو اس طریق پر استعمال کیا گیا ہے وہاں ایمان کے تمام تقاضے مراد ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ایمان کے جو بھی تقاضے مقرر فرمائے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تشریح کی ہے ان تقاضوں کو پورا کرنا مراد ہے مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر تم ایمان لانے والے ہو گے تو کوئی غیر تم پر غالب نہیں آئے گا۔ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

اب یہاں مومن کے لفظ کے ساتھ مُؤْمِنٌ بِاللّٰهِ یا مُؤْمِنٌ بِالْغَيْبِ یا مُؤْمِنٌ بِالْاٰخِرَةِ وغیرہ نہیں ہے بلکہ محض مومن کا لفظ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم ایمان کے سب تقاضوں کو پورا کرنے والے ہو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی نصرت تمہارے شاملِ حال ہو گی اور تم ہی غالب آؤ گے غیر تم پر غالب نہیں آئے گا۔

پس جب اللہ تعالیٰ کی ساری محبت اور ساری نُصرت اور ساری رحمت اور ساری برکت کو جذب کرنے اور اس کی رضا کو حاصل کرنے کے لئے ایمان کے سب تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ٹھہرا تو پھر ہمیں ایمان کے سب تقاضوں کا علم بھی ہونا چاہیے اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایمان کے جو مختلف تقاضے بیان فرمائے ہیں ان کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے سلسلہ وار کچھ بیان کروں گا۔

ایمان کا پہلا تقاضا اور وہی دراصل ایمان کی روح اور اسلام کی جان ہے وہ ایمان باللہ ہے پس جب میں نے کہا تھا کہ ایمان میں پختگی پیدا کرو تو میرا یہی مطلب تھا کہ ایمان کے جتنے پہلو اور جتنی شاخیں ہیں ہر پہلو اور شاخ کے متعلق اپنے ایمانوں میں پختگی پیدا کرو ایمان کے مضمون کے اندر جو بنیادی چیز ہے وہ ایمان باللہ ہے یعنی اللہ پر ایمان لانا۔ اللہ پر ایمان لانا اور لانے میں بڑا فرق ہے ایک شخص اللہ تعالیٰ کو جانتا ہی نہیں لیکن زبان سے کہتا ہے کہ میں اللہ پر ایمان لاتا ہوں اللہ پر حقیقی

ایمان لانے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں اس کی معرفت حاصل ہو اور جب پوری معرفت حاصل ہو جائے تو پھر سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ معرفت کے بغیر وہ چیز ہمیں مل نہیں سکتی جو اسلام ہمیں دینا چاہتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا۔

پس صرف زبان سے یہ کہہ دینا کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے خدا اور رسول کے نزدیک یہ کافی نہیں ہے اللہ تعالیٰ پر اس طرح ایمان لانا چاہیے جس طرح قرآن کریم کہتا ہے کہ ایمان لاؤ مثلاً اللہ تعالیٰ کو ہر حالت اور زندگی کے ہر موڑ پر قادر مطلق سمجھنا دنیا میں کسی قوم یا کسی انسان کی زندگی میں کوئی ایسا موقعہ نہیں آیا کہ جس وقت یہ کہا جائے کہ اب خدا بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ پس اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا یہ بھی ایک پہلو ہے.........

اللہ تعالیٰ اس قسم کی قدرت رکھنے والا ہے۔ اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَا تَقْنَطُوْا (الزّمر: ۵۴) کیونکہ مایوسی شرک ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے لئے ایک ضعف کا احتمال ہوتا ہے یہ ایمان باللہ نہیں ہے ہم اس قادر مطلق پر ایمان لاتے ہیں جو ایک ذرہ حقیر کے ذریعہ دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیتا ہے...... اللہ تعالیٰ پر رب ہونے کے لحاظ سے ایمان لاؤ کیونکہ ساری ربوبیتِ عالمین کا منبع اور سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ آپ دنیا کے ماحول پر نگاہ ڈالیں تو پتہ لگتا ہے کہ سارا کارخانۂ عالم اس کی اس صفت پر چل رہا ہے یعنی ایک تدریجی ارتقا ہے جو ربوبیت کا تقاضا کرتا ہے...... دوسرے لوگ تو دعا پر کامل ایمان ہی نہیں رکھتے قرآن کریم ایک ایسے خدا کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس نے اپنی ایک صفت یہ بتائی ہے کہ وہ دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور وہ تقدیر معلق کو بدل بھی دیتا ہے اور ایسی تقدیر جو مبرم سے ملتی جلتی ہو اور یہ ساری نسبتیں دراصل انسان کے فیصلہ پر منحصر ہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے تو ہر چیز واضح ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ۔ (النمل: ۶۳)

یعنی اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ جب انسان تضرع اور ابتہال کے ساتھ اس کے حضور جھکتا اور اپنے یا اپنوں کی تکلیفیں دور ہونے کے لئے دعائیں مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے..... پس ایمان باللہ محض یہ نہیں ہے جسے عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں بلکہ اللہ پر وہ ایمان لانا چاہیے جس کا اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے مثلاً وہ رب العالمین ہے اس کے سوا کوئی رب نہیں ہے وہ رحمان

ہے اس کے علاوہ کوئی بغیر استحقاق کے دینے والا نہیں اور وہ رحیم ہے وہ رحیمیت کی صفت کے نتیجہ میں بدلے کا حق پیدا کر دیتا ہے دراصل رحیمیت حق دلواتی نہیں بلکہ حق پیدا کرتی ہے.....

پس ایمان باللہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کہہ دیا کہ ہم اللہ پر ایمان لاتے ہیں ایمان باللہ کے بعد تو دوسری کوئی چیز ہی نہیں رہتی۔ ایمان باللہ کے بعد رشوت پر انحصار، ایمان باللہ کے بعد یہ غبن اور دوسری بدعنوانیوں کا سہارا لینا یہ باتیں ایمان کے ساتھ کیسے اکٹھی ہوسکتی ہیں۔ ایمان باللہ کے ساتھ کوئی چیز نہیں رہتی صرف اللہ ہی اللہ رہتا ہے یا وہ شخص ہوتا ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے فیض حاصل کرنا ہوتا ہے اور کچھ نہیں رہتا پس اس اللہ پر ایمان لانا ہے اور یہ بنیادی چیز ہے اس کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ دراصل اگر اس سارے کارخانہ پر تقریر کی جائے تو سارا اللہ ہی اللہ آجاتا ہے۔ چند باتیں میں نے بیان کر دی ہیں اور اللہ پر اس رنگ میں ایمان لانے کے نتیجہ ہی میں پھر ایمان بالآخرۃ، ایمان بالغیب اور ایمان بالرسل اور ایمان بالکتب وغیرہ جس کی قرآن کریم نے تفصیل بیان کی ہے جو دراصل ایمان کے مختلف شعبے اور شکلیں ہیں ان پر ایمان پختہ ہوتا ہے اس لئے اگر ایمان باللہ صحیح نہیں تو آگے کچھ نہیں۔ (خطباتِ ناصر جلد سوم صفحہ ۲۶۲ تا ۲۷۷)

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح نذیر ہیں کافر کے لئے اس طرح بشیر بھی ہیں کافر کے لئے اور یہ خیال بھی غلط ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کے لئے محض بشیر ہیں جو اعلان کرتا ہے کہ میں آپ پر ایمان لایا اور آپ کے رب پر ایمان لایا۔ آپ بشیر بھی ہیں اس کے لئے اور نذیر بھی ہیں اس کے لئے یعنی جس طرح کافر کے لئے نذیر اور بشیر ہیں اسی طرح مومن کے لئے بھی نذیر اور بشیر ہیں۔ قرآن کریم بھرا پڑا ہے اس مضمون کے ساتھ اور ایک آیت میں نے اٹھائی ہے جس میں صاف، بالکل وضاحت کے ساتھ یہ ہے کہ مومنوں کے لئے آپ نذیر بھی ہیں اور بشیر بھی ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (الاعراف:۱۸۹) کہ میں صرف نذیر اور بشیر ہوں مومن قوم کے لئے۔ تو یہ خیال کہ مومنوں کے لئے محض بشیر اور نذیر نہیں اور کافروں کے لئے محض نذیر اور بشیر نہیں یہ غلط ہے۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ ایک دفعہ ایمان کا دعویٰ کر دیا پھر بشارتیں ہی بشارتیں ہیں، پھر خیر ہی خیر ہے، پھر خوشحالی ہی خوشحالی ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی رضا ہی رضا ہے اور ہماری کوئی ذمہ داری

نہیں، ہمارے اوپر کوئی پابندیاں نہیں، گناہوں سے بچنے کے لئے ہم نے کوئی کوشش نہیں کرنی۔ نیکیاں کرنے کے لئے ہم نے ہر قسم کی جدوجہد اور سعی نہیں کرنی۔ یہ خیال غلط ہے۔

اصولی طور پر خدا تعالیٰ نے جو لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ مومن قوم کو جو بشارت دی وہ بڑی زبردست ہے وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ہر شعبۂ زندگی میں فوقیت تمہیں حاصل ہوگی۔ اعلیٰ کا لفظ بولا ہے نا۔ ہر شعبۂ زندگی میں فوقیت تمہیں حاصل ہوگی یہ بشارت ہے مگر اس کے ساتھ میں نے قرآن کریم پر بڑا غور کیا ہر بشارت کے ساتھ انذاری پہلو ساتھ لگا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ایک انذار ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اگر تم ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا نہیں کرو گے تو یہ بشارت تمہارے حق میں پوری نہیں ہو گی۔ اَلْاَعْلَوْنَ والی اور تیرہ چودہ سو سالہ اسلامی زندگی میں جو مسلمان ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ان کی آپ تاریخ دیکھیں اس کے دونوں پہلو انذار کے بھی اور تبشیر کے بھی بڑے زبردست طریقے پر پورے ہوئے۔ ایمان کے تقاضے جہاں بھی پورے کئے گئے، فوقیت بشارت کے مطابق لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ انہی کو حاصل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی وہ تو اس زمانے کا تو ہر لمحہ اس کی تائید کر رہا ہے کیونکہ آپ کی تربیت میں صحابہ رضی اللہ عنہم تھے وہ تقاضوں کو پورا کر رہے تھے ایمان کے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قیادت کر رہے تھے۔ ہر وقت ان کی رہنمائی تھی۔ جس وقت انتہائی دکھوں کی زندگی تھی ان دکھوں میں سے کامیاب نکلے۔ تیرہ سالہ زندگی کے دکھ اٹھا کے پھر چند سال میں سارے عرب پر غالب آ جانا یہ کوئی معمولی معجزہ نہیں ہے۔ ایسا معجزہ ہے جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی کہ کسی قوم کو تیرہ سال تک اس طرح پیسا گیا ہو مکی زندگی میں اور آٹھ سال تک حملہ آور ہو کر اس طرح کوشش کی گئی ہو ان کو نیست و نابود کرنے کی اور پھر بیس سالہ اس ظالمانہ کوشش کا نتیجہ اسلام کی موت نہیں بلکہ مسلمان کی زندگی کی شکل میں ظاہر ہوا۔

پھر ہم صحابہ رضی اللہ عنہم کا زمانہ لیتے ہیں۔ چھوٹی سی قوم ہے۔ غیر مہذب ہے۔ طاقت ان کے پاس کوئی نہیں۔ ہتھیار ان کے پاس اچھا نہیں۔ تجربہ کار یہ نہیں ہیں جنگ کے میدان میں اور مال و دولت ان کے پاس نہیں ہے پھر ہم کسریٰ کا یہ غرور دیکھتے ہیں۔ ساری دنیا کے خزانے لوٹے ہوئے تھے۔ اتنے ہیرے جواہرات تھے کہ ہمارے جرنیلوں کو تو شاید بیس روپے کی ٹوپی ملتی ہوگی پہننے کو اور ان کے کور کمانڈر ایک لاکھ کے ہیرے جڑے ہوتے تھے اس کی ٹوپی میں۔ یہ اس کا حکم تھا کہ ایک

لاکھ ہیرے اور اس زمانہ میں ایک لاکھ میں جو ہیرا ملتا تھا اب شاید دو کروڑ میں بھی نہ ملے۔ ان کو خیال پیدا ہوا کہ ہم مٹا دیں گے اور ہوا یہ کہ پہلے اس نے یہ ترکیب کی۔ یہ اس کا بڑا زبردست منصوبہ ہے۔ عام طور پر ہمارے جو مبلغ ہیں وہ اپنی تقریروں میں اس حصہ کو نہیں لیتے۔ یہ جو ارتداد کا فتنہ پیدا ہوا ہے عرب میں، یہ سارا منصوبہ ایران کے کورٹ میں یعنی بادشاہ نے خود چھ سو عرب سرداروں کو بلا کے یہ منصوبہ بنایا تھا اسلام کو مٹانے کے لئے۔ تو حملہ تو کر دیا اس نے جس وقت یہ ناکام ہوا منصوبہ اس کا تو چھیڑ چھاڑ اس نے اور دوسرے طریقے پر کی ہوگی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خالد بن ولید ابھی مدینہ نہیں پہنچے تھے ان کو پیغام بھیجا کہ یہ سرحدیں جو ہیں وہ محفوظ نہیں ہیں۔ فتنہ تو شروع ہو گیا تو چلے جاؤ۔ جو تمہارے پاس فوج ہے وہ بھی لے کے چلے جاؤ۔ اٹھارہ ہزار فوج ان کے پاس۔ چار ہزار گھوڑ سوار اور چودہ ہزار پیادہ اور کسریٰ کے مقابلے میں۔ انہوں نے پھر بعد میں ان کو حکم مل گیا تھا قیصر کے مقابلے میں جانے کا چار پانچ لڑائیاں لڑی ہیں۔ ہر لڑائی میں کسریٰ کی تازہ دم فوج ایک نئے کور کمانڈر کے ماتحت ساٹھ ستر ہزار سے لے کے ایک لاکھ کی تعداد میں آتی تھی اور یہ بیچارے وہی اٹھارہ ہزار کچھ شہید ہو گئے کچھ زخمی ہو گئے۔ تھکے ہوئے اور ان کا مقابلہ اس زمانے میں اس قسم کا تو نہیں تھا امریکہ سے بٹن دبایا اور گولہ برسا دیا کسی چھ ہزار سات ہزار میل پر۔ آمنے سامنے ہو کر لڑنا پڑتا تھا۔ فرق تعداد کا اتنا تھا کہ ہر آدھے گھنٹے، گھنٹے کے بعد اگلی صف لڑنے والی کسریٰ کی پیچھے چلی جاتی تھی اور تازہ دم آگے آجاتی تھی اور مسلمانوں کی ایک ہی صف اور وہ صبح سے لے کے شام تک لڑنے والے اور جیتتے چلے جاتے تھے۔ کیا چیز جتا رہی تھی ان کو؟ دنیا کا کوئی اصول تو نہیں ان کو جتا سکتا۔ یہ وعدہ تھا ان سے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ فوقیت تمہیں حاصل ہوگی۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ایمان کے تقاضے پورے کرتے چلے جاؤ اللہ تعالیٰ کی نعماء سے اپنی جھولیوں کو بھرتے چلے جاؤ۔

پھر جس وقت یہ جنگ جو تھی ایران کے خلاف یہ اپنے عروج کو پہنچی ہوئی تھی اس وقت قیصر نے سوچا پھنسا ہوا ہے عرب کا مسلمان۔ یہ موقع ہے ان کو پیچھے سے حملہ کر کے مٹا دو۔ دو محاذ کھل گئے۔ دونوں کی زبردست طاقتیں سامنے آ گئیں۔ اس وقت ان کو حکم ملا تھا کہ آدھی فوج لے کے تم اس محاذ پر چلے جاؤ یعنی وہاں چھوڑ دیئے تھے پیچھے صرف نو ہزار ہی کسریٰ کی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے لیکن اس وقت سر نہیں گنے جاتے تھے۔ اُس وقت تو اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ سامنے رکھ کے دلوں کی

حالت دیکھی جاتی تھی۔

اسی زمانے میں مختصراً میں بیان کر دوں۔حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، نے جنگ سے بھی پہلے خط لکھا پوری رپورٹ تفصیلی لکھ کر یہ ہوگا یہ نقشہ بنے گا۔اس طرح میرے مقابلہ میں تازہ دم فوجیں آئیں گی مجھے کمک بھیجیں۔ ہر نیا معرکہ کوئی دو دن بعد کوئی تین دن کے بعد ہوا ہے۔مہینوں کے وقفہ کے بعد نہیں، دنوں کے وقفہ کے بعد ہوئے ہیں۔تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کی کمک بھیج دی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق آیا ہے وہ کھڑے ہو گئے انہوں نے کہا یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔اتنی تفصیل سے ہمیں رپورٹ دی ہے یہ حالات ہیں اور آپ ایک آدمی کی کمک بھیج رہے ہیں۔اس خدا کے بندہ نے آرام سے یہ جواب دیا کہ جس فوج میں اس جیسا آدمی ہو وہ شکست نہیں کھایا کرتی۔اور پھر خیر وہ لمبا ایک واقعہ ہے اس نے بھی جا کے کارنامے جو دکھائے۔پھر یہاں جو ایک ہی جنگ کا میں ذکر کر دیتا ہوں۔ یرموک کی جنگ میں تین لاکھ فوج قیصر کی عیسائیوں کی اور اس کے مقابلے میں یہ کئی فوجوں کے مختلف جگہوں کے یونٹ اکٹھے کر دیئے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آ گیا ہے خلافت کا۔تو چالیس ہزار اندازہ ہے یعنی ہر ۷۵ ہزار کے مقابلے میں دس ہزار یہ وہی قریباً نسبت رہ گئی اور پانچ دن عملاً جنگ ہوئی۔ایک دن ان کے کہنے پر وقفہ ہو گیا تھا اور اس طرح بری طرح شکست کھائی انہوں نے کہ کوئی حد نہیں۔

اس میں ایک واقعہ اور ہوا جو میں ذکر کر دیتا ہوں کیونکہ وہ اصل مضمون میرا جو ہے اسی کے متعلق میں بیان کر رہا ہوں۔ یہ اس کی مثالیں دے رہا ہوں۔ پانچویں دن جس دن آخری معرکہ ہوا اور انہوں نے شکست کھائی اور کہتے ہیں کہنے والے وَاللّٰهُ اَعْلَمُ کہاں تک صحیح ہے کہ ستّر ہزار لاشیں میدان میں چھوڑ کے وہ تین لاکھ کی فوج بھاگی تھی چالیس ہزار کے مقابلے میں اور پہلے جو چار دن تھے ان میں پتا نہیں کتنے زخمی ہوئے۔کیا ہوا اس کا پتا نہیں۔ پانچویں دن خالدؓ بن ولید نے اپنے دوستوں کو جو سرداران مکہ کے بیٹے تھے جن میں عکرمہ بھی تھا ابوجہل کا بیٹا، ان کو بلایا اور کہا کہ دیکھو تم نے بڑا لمبا عرصہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دشمنی کے مظاہرے کئے اور جنگوں میں شامل ہوئے، اسلام کو مٹانے کی کوشش کی۔تمہارے چہروں پر ایسے داغ ہیں کہ تمہارے خون کے علاوہ کوئی چیز ان کو نہیں مٹا سکتی اور آج موقع ہے اپنے چہروں کے دھبے دھو ڈالو۔ایک سو چالیس دوست اکٹھے کئے

انہوں نے۔ ایک سو چالیس سے حملہ کروا دیا تین لاکھ کی فوج پر۔ کوئی کہے گا پاگل پن تھا۔ کوئی کہے گا خدا تعالیٰ کے پیار کا سمندر موجزن تھا۔ انہوں نے بھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں کی۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے ایسے دھبے ہیں جو صرف ہمارا خون دھوسکتا ہے اور آج ہم دھوڈالیں گے۔ ایک آدمی نہیں بچا ان میں سے۔ بچ ہی نہیں سکتا تھا۔ ۱۴۰ آدمی تین لاکھ پہ حملہ آور ہو جائے۔ بچنے کا سامان ہی نہیں۔ کہتے ہیں ایک زخمی زندہ بعد میں ملا ان کو جو چند گھنٹے کے بعد وہ بھی فوت ہو گیا لیکن باقیوں کی تو لاشیں ہی وہاں سے اٹھائی انہوں نے۔ ان میں عکرمہؓ بھی تھے۔

یہ کس برتے پر لڑ رہے تھے؟ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ کے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے ایک جگہ فوج کو جوش دلانے کے لئے انہوں نے کہا کہ فوجوں کی ہار اور جیت ان کی تعداد پر نہیں ہوا کرتی بلکہ خدا تعالیٰ کے اس فضل پہ ہوتی ہے جو انہیں حاصل ہوتا ہے۔ اس واسطے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

بتا میں یہ رہا ہوں کہ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ کے جب تقاضے پورے ہوں تو اس طرح بھی ہو جاتا ہے جیسا تاریخ نے ریکارڈ کیا اگر اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ کے تقاضے پورے نہ ہوں تو پھر ایسا بھی ہمیں نظر آتا ہے مختلف ملکوں میں کہ اس ملک میں جو جوتی بھی سر پر مارنے کے لئے اٹھائی جاتی ہے وہ مسلمان کے سر پہ پڑتی ہے۔ ایسے نظارے بھی تاریخ میں دیکھے۔

ایک دفعہ ایک صحافی نے مجھ سے پوچھ لیا تھا کہ ہم سے کوئی وعدے بھی ہیں؟ ہمیں کوئی بشارتیں بھی دی گئی ہیں؟ میں نے کہا کیوں نہیں بشارت بڑی زبردست ہے۔ میں بتا رہا ہوں یہ اصولی بشارت ہے۔ ہر شعبۂ زندگی میں فوقیت تمہیں رہے گی حاصل اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۔ میں نے کہا اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ کی بشارت ہے اور تمہیں کون سی بشارت چاہیے۔ ہر شعبۂ زندگی میں تمہاری فوقیت لیکن چھوٹی سی ایک شرط لگائی تھی ساتھ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۔ یہ جو شرط لگانا ہے یہ انذار ہے۔ اسی سے انذار پتا لگتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھو بشارت میں تمہیں بہت زبردست دے رہا ہوں اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ مگر ڈراتا بھی ہوں تمہیں۔ اگر تم نے ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا نہ کیا تو تمہارے حق میں یہ بشارت پوری نہیں ہوگی۔ (خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۲۰۲ تا ۲۰۷)

آیت ۱۴۷، ۱۴۸ وَ كَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ ۚ فَمَا

وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہمیشہ سے ہی ایسا ہوتا چلا آیا ہے کہ جولوگ انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں شامل ہوتے ہیں۔منکرین اور مخالفین انہیں دُکھ دینے اور ایذا پہنچانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔قرآن کریم میں اِس ایذا رسانی اور دُکھ دہی کے متعلق بڑی تفصیل اور وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ جماعت مومنین کو زبان سے بھی دُکھ پہنچایا جائے گا اور ہاتھ سے بھی تکلیف دینے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ایک جگہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:۔

اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ (الممتحنة:۳) یعنی اگر وہ تم پر کبھی قابو پالیں اور اُن کو موقع ملے تو وہ تمہاری تباہی کے لئے اپنے ہاتھ بھی استعمال کریں گے اور زبانیں بھی استعمال کریں گے۔

پھر ایک دوسری جگہ فرمایا وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِيْرًا (اٰل عمران:۱۸۷) فرمایا تم اہل کتاب سے بھی اور مشرکوں سے بھی کثرت سے ایذا پہنچانے والی اور دُکھ دینے والی باتیں سُنو گے۔

جہاں تک زبان سے دُکھ پہنچانے کا تعلق ہے، یہ بنیادی طور پر دو قسم کا ہوتا ہے۔ایک یہ کہ گندہ دہنی سے کام لینا یعنی گالیاں دینا اور دُوسرے یہ کہ افتراء کرتے ہوئے جھوٹے اتہام لگانا.......میں نے شروع میں جو دو آیات تلاوت کی ہیں ان میں سے پہلی آیت میں تین قسم کے خوف اور دوسری آیت میں ان کے علاج کی طرف توجہ دلائی گئی ہے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں تمہیں دُکھ اور تکلیف پہنچے گی مگر تمہارا یہ کام ہے کہ تم اپنے اندر وھن، ضعف اور استکانت پیدا نہ ہونے دو۔ مَیں سمجھتا ہوں یہ آیت ایک لحاظ سے ہمارے لئے خوشخبری کا باعث بھی ہے کہ ہمیں مالی نقصان بھی پہنچایا جائے گا، جذباتی اور روحانی نقصان بھی پہنچانے کی بھی کوشش کی جائے گی۔لیکن یہ نقصان ہمیں اس لئے نہیں پہنچایا جائے گا کہ ہم تباہ و برباد ہو جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے ہمیں مارنے کے لئے پیدا نہیں کیا

بلکہ ہمیں زندہ رکھنے اور ہمارے ذریعہ دوسروں کو زندہ کرنے کے لئے پیدا کیا ہے تاہم بشری کمزوریوں کی وجہ سے ایسے موقع پر تین قسم کے ردِعمل ممکن ہیں جن سے بچنے کی ضرورت ہے۔

پہلا وَهْنٌ ہے یعنی مفوضہ فرائض میں سستی کا پیدا ہو جانا اللہ تعالیٰ انبیاء اور ان کی جماعتوں کے متعلق فرماتا ہے۔

فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی وہ اس تکلیف کی وجہ سے جو انہیں اللہ کی راہ میں پہنچتی ہے۔ سست نہیں ہوتے۔ وھن کے معنے ضُعْفٌ فِي الْأَمْرِ وَالْعَمَلِ (المنجد زیر لفظ وَهَنَ) کے بھی ہوتے ہیں۔ ایک اجتماعی کوشش کے سلسلہ میں جو کام سپرد ہوا ہے اس میں کمزوری پیدا نہ ہو۔ ضُعْفٌ فِي الْأَمْرِ دراصل ضُعْفٌ فِي الْعَمَلِ کی بنیاد ہے۔ عمل میں جب قوت اور شدت پیدا ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ امر میں قوت اور شدت موجود ہے یعنی اس میں ایک قسم کا جھکاؤ، دلچسپی، بشاشت اور ایثار کا جذبہ پایا جاتا ہے جماعت احمدیہ اسی روحانی بشاشت، شوقِ عمل اور جذبۂ ایثار کا ایک حقیقی نمونہ ہے۔ خدا تعالیٰ نے اسے اس لئے قائم کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسلام کو ساری دُنیا میں غالب کرے۔ پس یہ وہ عظیم مقصد ہے جس کے مطابق ہم عمل کریں گے اور انشاء اللہ اسلام کو ساری دُنیا پر غالب کر کے دم لیں گے۔

غرض یہ جذبہ برقرار رہنا چاہیے یعنی دنیا خواہ اِدھر سے اُدھر ہو جائے یا ساری دنیا مل کر ہماری تباہی کے سامان پیدا کرنے کی کوشش کرے مگر ہم اس کی کوئی پرواہ نہیں کریں گے کیونکہ اس جذبہ میں جب کمزوری واقع ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں انسان اپنے عمل میں سست پڑ جائے تو اس کو وَهْنٌ کہتے ہیں یعنی مایوسی اور شبہ کے آثار پیدا ہو جائیں کہ پتہ نہیں اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے بھی ہوں گے یا نہیں پتہ کیسے نہیں! اگر وہ خدا تعالیٰ کے وعدے ہیں تو ضرور پورے ہوں گے۔

پس یہ ایک خطرہ ہے جو لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کی رو سے پیدا ہو سکتا ہے تاہم یہ خطرہ پیدا نہیں ہوتا کہ خدا کی جماعت ہلاک ہو جائے گی۔ ہلاکت تو درکنار اگر وھن، ضعف اور استکانت کی وجہ سے جماعت کا ایک حصہ چھوڑ بھی دے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

الٰہی مقصد و منشا بہرحال پورا ہوگا۔ خدا تعالیٰ ایک نئی قوم لے آئے گا جو صحیح طور پر قربانیاں دینے والی ہوگی۔ جسے اپنے مقصد سے پیار اور اس کی عظمت کا احساس ہوگا۔ جو خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس

کے جلال سے لرزاں وترساں رہے گی۔ وہ دُنیا کی ایذارسانی اور دُکھ دہی کی کوئی پرواہ نہیں کرے گی۔

غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جماعت الٰہیہ کو اس خطرہ سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے اور ان کے اندر وھن نہیں پیدا ہونا چاہیے کیونکہ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ وھن دراصل مومن کے جوش عمل اور جذبۂ جہاد میں کمزوری کی علامت ہے الٰہی جماعتوں کے اندر تو یہ جوش پایا جاتا ہے کہ ان کے ذمہ دین کا جو اہم کام ہے اسے انہوں نے بہرحال پورا کرنا اور خدا کے فضل اور اسی کی مہربانی سے اس میں کامیاب ہونا ہے۔ اسی لئے مومنین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس جوش اور جذبہ میں کسی وقت کمی نہ آئے اور اس میں ضعف پیدا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک جگہ وھن کے معنے بڑے حسین پیرایہ میں بیان فرمائے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ (النسآء:۱۰۵)

فرمایا تم دشمن قوم کی تلاش میں سستی نہ کرو۔ اب دشمن کی تلاش میں سستی کرنا۔ یہ ضعف فی العمل کی ایک شکل ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے کام میں ضعف نہیں پیدا ہونا چاہیے ورنہ رابطہ قائم نہیں رہے گا۔ فوج والوں نے ایک بڑا اچھا محاورہ ایجاد کیا ہے جب دشمن دُوبدُو لڑائی چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں دشمن سے CONTACT (کانٹیکٹ) یعنی تعلق نہ رہا یعنی جب لڑائی ہو رہی ہوتی ہے تو گویا لڑتے وقت دونوں فوجوں کا آپس میں ایک تعلق قائم ہوتا ہے لیکن جب کوئی شخص عین میدانِ جنگ سے کھسک جاتا ہے تو ایسی صورت میں کہتے ہیں اس کا دشمن سے تعلق (کانٹیکٹ) نہیں رہا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا دشمن اگر تمہیں نقصان پہنچا کر اتنا دور ہو جائے کہ تمہاری گرفت سے نکل جائے تو پھر ابتغاء القوم کے اس الٰہی ارشاد کی رُو سے اس کا پیچھا کرنا چاہیے ورنہ تمہاری یہ حالت وھن یعنی سستی کہلائے گی۔ اس لئے تمہیں اپنے دشمن سے کانٹیکٹ قائم رکھنا چاہیے۔ اس کی تلاش کرنی چاہیے۔ جہاں بھی ہو اور جس محاذ پر وہ جائے وہاں تک اس کا پیچھا کرنا چاہیے........

پس لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کی رو سے مسلمانوں کی فوج کو خدا کی راہ میں شہادت اور تھوڑے بہت زخموں کے نتیجہ میں جو دُکھ اور تکلیف پہنچی اور دنیا والوں کی نگاہ میں کمزوری پیدا ہوئی وہ خدا کے ان پاک اور محبوب بندوں کی نگاہ میں کمزوری نہیں ثابت ہوئی ان میں نہ وَهْنٌ فِي الْاَمْرِ کا کوئی شائبہ نظر آتا ہے اور نہ وَهْنٌ فِي الْعَمَلِ کی کوئی مثال ملتی ہے۔ وہ اسی جرأت کے ساتھ اسی

بہادری کے ساتھ خدا تعالیٰ پر اسی توکل کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں کو اسی طرح جذب کرتے ہوئے اگلے میدان میں چلے گئے۔ پھر اگلے میدان میں چلے گئے اور پھر اس سے اگلے میدان میں چلے گئے۔

پھر لِمَآ اَصَابَهُمْ کی رُو سے دوسری کمزوری جس کا خطرہ پیدا ہوتا ہے وہ ضعف کا پیدا ہونا ہے۔ غصے کی زیادتی کے نتیجے میں بھی ضعف پیدا ہو جاتا ہے ضعف کا لفظ یہاں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا میں نے اگلی آیت سے استدلال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہیں خدا کی راہ میں جو دکھ اور تکلیفیں پہنچتی ہیں اور تمہارے دل میں غصہ پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے تمہارے اندر ایک قسم کا ضعف پیدا ہو جاتا ہے مگر اس کے باوجود تم نے کسی پر زیادتی نہیں کرنی اسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے

گالیاں سُن کر دعا دو (درثمین صفحہ ۱۴۴)

جو شخص گالیاں سن کر دعا دینے کی بجائے گالیاں دیتا ہے وہ اپنے مجاہدانہ عمل میں ضعف پیدا کرتا ہے کیونکہ اس کی توجہ دوسری طرف پھر جاتی ہے پھر آپ نے فرمایا:۔

پا کے دکھ آرام دو (درثمین صفحہ ۱۴۴)

جو شخص دُکھ پاتا لیکن دُکھ سہتا نہیں بلکہ جوابی کارروائی کرتا ہے اور کہتا ہے مَیں تیری خبر لیتا ہوں، تم نے ایک چپیڑ لگائی ہے میں تجھے دو لگاؤں گا، اس سے ضعف پیدا ہو گیا کیونکہ اس نے زیادتی کی ہے حالانکہ اس کا اصل مقصد صراط مستقیم کو اختیار کرنا ہے۔ مگر ایک نے دائیں طرف توجہ پھیر لی اور دوسرے نے بائیں طرف پھیر لی اس لحاظ سے ضعف کا بڑا خطرہ ہے یعنی زیادتی ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے پاک اور محبوب بندے اس قسم کے ضعف میں مبتلا نہیں ہوتے وہ اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔ تیسرا خطرہ استکانت کا ہے کچھ کمزور لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے متعلق یہ خطرہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں تذلل نہ اختیار کر لیں اور دشمن کا اثر قبول کر کے اس کے پیچھے نہ لگ جائیں مگر وہ جماعت جسے خدا تعالیٰ نے دُنیا کا قائد بنایا ہوا سے نہ تو دشمن سے ڈرنا اور نہ اس کے پیچھے لگنا چاہیے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ خطرے بتا کر ان کے علاج کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

چنانچہ قرآن کریم کی اس دوسری آیت میں جس کی میں نے تلاوت کی ہے ان خطروں سے بچنے کی

دُعا سکھائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا منکرین اور مخالفین کے منہ سے تمہارے خلاف جو بات نکلتی ہے اس کے مقابلہ میں تمہارے منہ سے یہ دُعا نکلنی چاہیے۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا۔ یعنی انسان کمزور ہے دُنیوی معیار کے لحاظ سے اور فاتح بھی ہے اللہ کے فضلوں کے نتیجہ میں وہ گھر بھی جاتا ہے۔ ہر قسم کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں، دُشمن اُسے ذہنی، جسمانی اور مالی لحاظ سے نقصان پہنچاتا ہے لیکن وہ اس نقصان کو برداشت کر لیتا ہے اُس سہارے کی وجہ سے جو اسے حاصل ہے یہ سہارا کیا ہے ایک رسی ہے جو آسمان سے لٹکی ہوتی ہے۔ یہ حبل اللہ ہے۔ جسے وہ پکڑتا ہے اور دُعا کرتا ہے اس کے خلاف ہر قسم کے گند اچھالے جاتے ہیں مگر اس کے دل میں نہ کوئی شکوہ اور نہ کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے نہ گھبراہٹ میں باتیں ہوتی ہیں اور نہ مشورے ہوتے ہیں کہ کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کو پتہ ہے کہ کیا ہونا ہے۔ وہی ہونا ہے جو خدا تعالیٰ چاہے گا۔ اس کے منہ سے ان سارے دُکھ دہ حالات میں کچھ فرق نہیں نکلتا سوائے اس دُعا کے رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا اے ہمارے رب! ہماری کوتاہیوں کو معاف فرما۔ ہمارے اندر **وھن** پیدا نہ ہو کیونکہ **وھن** پیدا ہو جانے کا جو خطرہ ہے اس کا تعلق کوتاہیوں کے ساتھ ہے۔ بشر کمزور ہے جو کچھ اسے کرنا چاہیے وہ نہیں کر سکتا کیونکہ بعض دفعہ شیطان اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس پردہ کو سوائے خدا تعالیٰ کی رحمت کے اور کوئی اُٹھا نہیں سکتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مغفرت کے حقیقی معنوں پر بڑے حسین پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ وہ خطرات جو بشری کمزوریوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کے متعلق یہ دُعا کرتے رہنا چاہیے کہ اے خدا! میں انسان ہوں، بہرحال کمزور ہوں، ایسا نہ ہو کہ میری بشری کمزوریاں میری روحانی رفعتوں کے حصول میں روک بن جائیں۔ پس اے خدا! ایسا کر کہ مجھ سے کوتاہیاں سرزد نہ ہوں۔ پس **وھن** کا تعلق چونکہ کوتاہیوں سے تھا۔ اس لئے یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ اگر تم وہن سے بچنا چاہتے ہو تو تمہیں اپنی کوشش اور سعی کے نتیجہ میں تکبر نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے ایثار اور اخلاص کی وجہ سے غرور نہیں کرنا چاہیے۔ وھن سے بچنے کے لئے تمہیں اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنی پڑے گی اور اس مدد کے حصول کے لئے ہم تمہیں یہ دعا سکھا دیتے ہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اپنے زور سے **وھن** سے نہیں بچ سکتے۔ میری مدد سے بچ سکتے ہو اور میری مدد کے حصول کے لئے تمہیں یہ دعا کرتے رہنا چاہیے رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا کہ اے خدا! ہم

سے جو کوتاہیاں سرزد ہو گئی ہیں اُن کے بداثرات سے بھی ہمیں بچا اور ہمارے لئے ایسے سامان پیدا کر کہ ہمارے اندر بشری کمزوریوں کی وجہ سے جو کوتاہیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ بھی پیدا نہ ہوں۔ اگر تم یہ دعا کرو گے اور اللہ تعالیٰ جب اس دُعا کو قبول فرمائے گا تو تمہارے اندر وھن یعنی کمزوری پیدا نہیں ہو گی۔

دوسرا خطرہ ضعف کے پیدا ہو جانے کا ہے یعنی ضعف کے نتیجہ میں زیادتیاں نہ ہونے لگ جائیں۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا کہ اے ہمارے خدا! ہماری زیادتیاں معاف فرما میں نے بتایا کہ ضعف کی حالت میں مومن انسان بعض دفعہ زیادتی کا مرتکب ہو جاتا ہے مثلاً دیکھو ایذا کے مقابلے میں دُعا نہیں دیتا یا دُکھ پا کر سُکھ پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ دُکھ کے مقابلے میں دُکھ پہنچاتا اور گالی کے مقابلے میں گالی دیتا ہے۔ پس خدا کا بندہ جب اس قسم کے کام کرتا ہے تو یہ اس کی زیادتی متصوّر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس زیادتی سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دُعا سکھائی اور فرمایا کہ تم ہمیشہ یہ دُعا کرتے رہو۔ وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا ہمیں اس جدوجہد میں، اس مجاہدہ میں اور اس عظیم کوشش میں جو تیرے دین کے غلبہ کے لئے شروع کی گئی ہے۔ اس میں ہمیں اس بات سے بچا کہ ہم اسراف کے گناہ میں ملوث ہو جائیں۔

تیسرا خطرہ استکانت یعنی دُشمن کے سامنے تذلّل اختیار کرنا اور اس کا اثر قبول کر کے اس کے پیچھے لگنے کا خطرہ ہے۔ یہ کمزوریٔ ایمان کی علامت ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق قرآن کریم نے تفصیل سے بتایا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جی ہم نے انتظام کر لیا ہے ہم مسلمانوں کے ساتھ بھی ہیں اور منافقوں کے ساتھ بھی ہیں۔ ہم نے کفار، منکرین اور دشمنان اسلام سے بھی ساز باز کی ہوئی ہے اور ہر ایک سے کہتے ہیں کہ اگر تم کامیاب ہو گئے تو ہم تمہارے پیچھے چل پڑیں گے۔ میں اس کی تفصیل میں تو اس وقت نہیں جا سکتا۔ اصولاً بتا رہا ہوں کہ اس گناہ اور کمزوری سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم یہ دُعا کرتے رہا کرو وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا کہ اے خدا ہمارے قدموں کو مضبوطی عطا فرما۔ فرمایا تمہیں اپنی کوششوں سے ثباتِ قدم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے فضل سے حاصل ہو سکتا ہے اس لئے تم یہ دعا کرتے رہا کرو کہ ہمارے قدموں میں مضبوطی عطا ہو۔

پس جب ان کمزوریوں کا خدشہ باقی نہ رہے اور ابتغاء القوم کی قوت ہو اُن سے، کانٹیکٹ کرنے اور جنگ کرنے کے لحاظ سے اور پھر زیادتی بھی نہ ہو بلکہ صبر سے کام لیتے ہوئے انسان گالی

کے مقابلے میں دعائیں کرنے والا اور دُکھ سہنے کے مقابلے میں سکھ پہنچانے کی تدبیر کرنے والا بن جائے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کے نتیجہ میں خود کو دشمن کے سامنے ذلیل کر کے اس کی اطاعت قبول کرنے کی بجائے اس کے قول اور عمل میں ثباتِ قدم ہو۔ اللہ کے فضل اور رحمت کے نتیجہ میں وہ جس جگہ کھڑا ہو وہاں اس کے پاؤں میں کوئی لغزش نہ آئے تو وہ دشمنوں کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے اور ان کی کوئی پرواہ نہ کرے اور کہے تم تعداد میں زیادہ ہو تو ہوا کرو۔ تمہارے پاس اموال زیادہ ہیں تو ہوا کریں۔ اس سے میرے جذبۂ ایمان اور شوقِ عمل میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو خدا کا سپاہی ہوں جہاں کھڑا ہوں اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گا بلکہ آگے بڑھوں گا کیونکہ میں اس جماعت سے تعلق رکھتا ہوں جسے آگے بڑھنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ پس مومن کے عمل میں ثباتِ قدم ہوتا ہے۔ اس کے پاؤں میں کوئی لغزش نہیں آتی۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جاتے ہیں لیکن مومن کے قدم اپنی جگہ سے ٹلا نہیں کرتے۔ مومن پیچھے نہیں ہٹا کرتا وہ اپنے مقصد کے حصول میں آگے سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

جب یہ سب کچھ ہو جائے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھو تم ان خطرات سے بچنے کی دعا کے ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کرتے رہا کرو وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ کہ اے خدا! کافر لوگوں کے خلاف ہماری مدد فرما۔ میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ ان تینوں خطرات کے بعد ایک چوتھا خطرہ بھی پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ہے تکبر پیدا ہونے کا خطرہ یعنی انسان نے سب کچھ حاصل کیا اللہ کے فضل اور اس کے حضور عاجزانہ اور متضرعانہ دعاؤں کے نتیجہ میں مگر کامیابی کے وقت شیطان آ گیا اور اس نے کہہ دیا تم نے یہ کامیابی اپنی کوشش اپنی ہمت اور اپنی طاقت سے حاصل کی ہے۔ چنانچہ ایسی صورت میں باوجود پہلی دعاؤں کی قبولیت کے یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں پھر ناکامی اور ہلاکت کے سامان پیدا نہ ہو جائیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان دعاؤں کے بعد اور میرے فضلوں کو حاصل کرنے کے بعد یہ دعا بھی کیا کرو وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ کہ اے خدا! کافروں کے مقابلہ میں، دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں ہمیں فتح، تیری نصرت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہمیں یہ فتح ہماری کسی قوت، کسی طاقت اور ہمارے ثباتِ قدم یا کسی اخلاص یا ایثار کے نتیجہ میں نہیں مل سکتی۔ اس لئے اے خدا! تو خود ہماری مدد کو آ اور ہمارے اور اپنے دشمنوں کو ان کے منصوبوں میں ناکام کر۔ (خطباتِ ناصر جلد چہارم صفحہ ۴۷۹ تا ۴۹۳)

آیت ۱۵۵، ۱۵۸، ۱۶۰ تا ۱۶۲ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً
نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَ طَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ
بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ
قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ
لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ
لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَ لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ
صُدُوْرِكُمْ وَ لِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۵﴾ وَ
لَىِٕنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا
يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ
الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ
فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ اِنْ
يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ
مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ
وَ مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ
هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

اللہ تعالیٰ سورہ آل عمران میں ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جو یا تو منافق ہیں یا ایمان کے کمزور ہیں۔ (ایمان کی ہر کمزوری نفاق پر دلالت نہیں کرتی) تو وہ لوگ یا جو پورے منافق ہوں یا جن کے ایمان پر پختگی نہ ہو بلکہ ایمان کی کمزوری ان میں پائی جاتی ہو۔ ان کے متعلق آل عمران کی ۱۵۵ آیت میں یہ فرمایا ہے۔ ان کا قول نقل کرتے ہوئے کہ وہ کہتے ہیں کہ کیا اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو اہم امور فیصلہ ہوتے ہیں یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی عزم کرتے ہیں کہ ایسا ہونا چاہیے اس سلسلہ میں

ہمارا بھی کوئی دخل ہے۔؟؟ اور وہ یہ اعتراض کے طور پر اور طعنہ کرتے ہوئے ایسا منہ سے نکالتے ہیں کہ ہم سے مشورہ کے وقت مشورہ نہیں لیا جاتا اور جو مشورہ ہم دیں چاہے ہم نہایت ہی اقلیّت میں ہوں وہ سنا نہیں جاتا تو اس صورت میں ہم پر کوئی ذمہ واری نہیں آنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الۡاَمۡرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اَلۡاَمۡرُ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس کے اختیار میں اور اس کے تصرّف میں ہے۔ اس واسطے تمہارا جواب تو یہ ہے۔ ھَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ مِنۡ شَیۡءٍ کہ کیا ہمارا بھی ان معاملات میں کوئی دخل ہے؟ فرمایا نہیں!!! تمہارا کوئی دخل نہیں!! سب کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں اور اس نے آسمانوں پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسلام کو اس کے دو دوروں میں دنیا پر غالب کرے گا۔ اس کا فیصلہ بہرحال پورا ہوگا وہ جو چاہے گا جس رنگ میں چاہے گا کرے گا کسی کا کوئی حق اس سلسلہ میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا نہ کسی کا کوئی حق ہے کیونکہ اللہ کے خلاف کوئی شخص اپنا حق پیش نہیں کرسکتا جس نے پیدا کیا جس کے احسانوں کے نیچے انسان اس قدر دبا ہوا ہے کہ اس کے ایک ایک دن کے احسانوں کا ساری عمر میں شکر ادا نہیں کرسکتا اس کے مقابلہ میں کھڑا ہو کے یہ حق جتائے اِنَّ الۡاَمۡرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ لیکن اَلۡاَمۡرُ کُلَّہٗ لِلّٰہِ ہے اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ہم نے تجھے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور مومنوں کا بڑا خیال رکھنے والا ان کے احساسات کا بھی اور ان کی تربیت کا بھی۔ اس لئے اے نبی! ہم تجھے حکم دیتے ہیں کہ فَاعۡفُ عَنۡھُمۡ تربیتی کمزوری کے نتیجہ میں ان سے جو غلطیاں سرزد ہو جائیں ان سے درگزر کرو اور وَاسۡتَغۡفِرۡ لَھُمۡ اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں کرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بشری کمزوریوں کو دور کرے اور روحانی طاقت انہیں عطا کرے تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بہترین انعاموں کے وارث ہوں۔

وَشَاوِرۡھُمۡ فِی الۡاَمۡرِ اور ان کے دلوں پر بشاشت پیدا کرنے کے لئے اور دنیا میں ان کی عزت کو قائم کرنے کیلئے اَلۡاَمۡر میں ان سے مشورہ کیا کرو کام سب خدا نے کرنے تھے۔ فیصلے سب اللہ تعالیٰ کے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئے۔ لیکن چونکہ مخلصین ان مشوروں میں شامل ہوتے تھے۔ آج بھی ہم بڑی عزت سے ان کا نام لیتے اور بڑی عزت سے ان کی یاد اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔ تو فرمایا شَاوِرۡھُمۡ فِی الۡاَمۡرِ۔ اسلام کے اہم امور کے متعلق ان میں سے جن سے چاہو جن امور کے متعلق چاہو مشورہ کرلیا کرو۔ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ سب مشورے سننے کے بعد جب کسی نتیجہ

پر پہنچو اور پختہ ارادہ کرو کہ یوں ہونا چاہیے اور یوں نہیں ہونا چاہیے تو اس وقت کثرت کی طرف نظر نہ کرو۔ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھو اور یقین رکھو کہ حقیقتاً وہی کارساز ہے کیونکہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر ہی توکل رکھنے والے ہو گے تو تمہیں بشارت دی جاتی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ پر توکل رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے پیار اور محبت کا سلوک کرتا ہے اور مسلمانوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کی مدد اور نصرت کرتا ہے اور اسے کامیاب کرنا چاہے تو کوئی طاقت دنیا کی ایسے گروہ اور جماعت کو اور اُمت کو مغلوب نہیں کر سکتی نہ قانون کر سکتا ہے لیکن اگر اللہ مدد چھوڑ دے فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۔ تو کسی کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے تم کوئی کام کرو گے اور کامیابی کی امید رکھو گے۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ یعنی جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم محض اللہ پر توکل رکھنے والے ہیں اسی طرح آپ کی سنت کی اور آپ کے اسوہ کی اتباع کرتے ہوئے مومنوں کا یہ فرض ہے کہ وہ بھی صرف اللہ، صرف اللہ پر توکل کرنے والے ہوں۔......

اللہ تعالیٰ نے یہاں شَاوِرْ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے ارشاد فرمایا ہے کہ ان سے مشورہ لیا کرو۔ مشورہ لینے کا حق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے یا آپ کی نیابت میں آپ کے خلفاء کو اس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ نے ۱۹۳۰ء کی شوریٰ میں یہ فرمایا تھا۔

’’مشورہ لینے کا حق اسلام نے نبی کو اور اس کی نیابت میں خلیفہ کو دیا ہے مگر کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ نبی یا خلیفہ کے سامنے تجاویز پیش کرنے کا حق دوسروں کے لئے رکھا گیا ہے‘‘۔

اسی طرح آپ نے فرمایا ’’مجلس شوریٰ اپنی ذات میں کوئی حق نہیں رکھتی۔ وہ میرے بلانے پر آتی اور آکر مشورہ دیتی ہے اور ہمیشہ خلیفہ کے بلانے پر آئے گی، اسے مشورہ دے گی وہ اپنی ذات میں کوئی حق نہیں رکھتی کہ مشورہ دے‘‘۔

تو شَاوِرْ کے اوّل مخاطب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کی نیابت میں آپ کے خلفاء اس کے مخاطب ہیں تو مشورہ لینے کا حق نبی کو اور نیابت کے طور پر خلیفہ کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے پچھلے سال غالباً مجلس شوریٰ میں میں نے ایک اور زاویہ نگاہ سے بھی اس پر روشنی ڈالی تھی اور وہ یہ کہ اگر یہ سمجھا جائے کہ جماعت کا حق ہے خلیفہ وقت کا حق نہیں تو جس کا حق ہے اس کا یہ بھی حق ہوتا ہے کہ وہ اپنا حق چھوڑ دے اگر کسی سے زید نے ایک سَو روپیہ لینا ہو تو اسے یہ حق خدا نے بھی اور رسول نے بھی، اخلاق

نے بھی، شریعت نے بھی اور ملک کے قانون نے بھی دیا ہے کہ وہ کہے کہ میں اپنا یہ سَو روپیہ وصول نہیں کرتا اگر جماعت کو یا اس کے بعض گروہوں کو یا افراد جماعت کو بحیثیت افراد کے یہ حق دیا جاتا اور یہ ان کا حق تسلیم کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں وہ ہمارا حق ہے ہم اسے استعمال نہیں کرتے ہم خلیفہ وقت کو کوئی مشورہ نہیں دیں گے لیکن اس کے برعکس اگر مشورہ لینے کا حق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی نیابت میں آپ کے خلفاء کا ہے تو پھر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب مجھ سے مشورہ مانگا جائے مشورہ کیلئے مجھے بلایا جائے میری مرضی ہے جاؤں مشورہ دوں یا نہ دوں اس لئے کہ یہ حق خلیفہ وقت کا ہے اور جماعت پر یہ حق ہے خلیفہ وقت کا کہ جب جن لوگوں کو جن امور کے متعلق وہ مشورہ کیلئے بلائے وہ اس کے کہنے اور ہدایت کے مطابق اس کے سامنے اپنے مشورہ کو رکھیں۔

شَاوِرْھُمْ ان سے سوال پیدا ہوتا ہے کن سے؟؟؟ تو اس میں بھی ھُمْ کے فیصلہ کرنے کا حق خلیفہ وقت کو نبی اکرم کی نیابت میں ہے۔ اور کن سے مشورہ کرنا ہے اور جن سے مشورہ کرنا ہے اگر ان کا انتخاب ہونا ہو تو کس طریق سے ان کا انتخاب ہوگا یہ فیصلہ بھی خلیفہ وقت نے ہی کرنا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کے اُسوہ میں بھی ہمیں یہی نظر آتا ہے بعض مواقع پر جب مسلمان تھوڑے تھے اور قریباً بہت بھاری اکثریت مدینہ میں بھی رہتی تھی تو اس وقت مسلمانوں کا سوادِ اعظم مدینہ میں رہائش پذیر تھا اس وقت چند سَو جو تھے وہی سوادِ اعظم بن جاتا تھا تو آپ سب کو اکٹھا کر لیتے تھے اور ایک چھوٹی بے تکلف برادری تھی اس میں وہ اکٹھے ہوتے اور آپ کو مشورہ دیتے تھے جو آپ فیصلہ کرتے خدا کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر کے آپ کے فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے اور بعض دفعہ آپ نے صرف چند آدمیوں کو بُلا کے بھی مشورہ لیا ہے اور بعض دفعہ دوسروں کو صرف یہ پتہ لگا بعض قرائن سے کہ فلاں فلاں شخص مسجد میں مشورہ کے لئے روک لئے گئے۔ نہ خود آپ نے اعلان کیا کہ میں نے مشورہ کرنا ہے ایک موقع پر صرف دو آدمیوں کو کہا عشاء کے بعد کہ تم ٹھہرے رہو میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں کیا بات تھی؟ اس کا ہمیں آج تک نہیں پتہ تو مشورہ کا یہ طریق بھی ہوتا ہے۔ تو ھُمْ کا یہ فیصلہ کرنا ہاں جب مسلمان سارے عرب میں پھیل گئے تو اس کے بعد سوادِ اعظم سے مشورہ کرنے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ ساری دنیا میں پھیل گئے۔ آج بھی خدا کے فضل سے جماعت احمدیہ دنیا کے کونے کونے میں پائی جاتی ہے اور مشورہ کے لئے جماعت احمدیہ کی

تمام جماعتوں کو مرکز میں جمع کرنا قریباً ناممکن ہے اس لئے سب کو اکٹھا کر کے تو مشورہ نہیں لیا جا سکتا پھر کن سے مشورہ لیا جائے اور ان کا انتخاب کس رنگ میں ہو؟ یہ کام بھی جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت سے ظاہر ہوتا ہے خلیفہ وقت کا ہے چنانچہ یہ جو آل عمران ہی کی آیت کا ایک حصہ جو پہلے میں نے پڑھا تھا یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ اس سے بھی پتہ لگتا ہے کہ بعض لوگوں کو خاص طور پر مشورہ سے باہر رکھا جاتا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ نہ کہتے یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ تو بعض ایسے لوگ جن کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے تھے کہ ان میں نفاق پایا جاتا ہے یا یہ دل کے مریض ہیں روحانی طور پر اور معاملہ ایسا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے رکھا نہیں جانا چاہیے تو ان لوگوں کے سامنے وہ معاملہ نہیں رکھتے اور ان کا مشورہ بھی نہیں لیتے تھے گو اگر اس قسم کے امور نہ ہوں تو پھر کھلم کھلا جو منافق ہو بعض دفعہ ان سے بھی مشورہ لے لیا جاتا۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا کیونکہ فیصلہ تو بہر حال نبی نے یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں خلیفہ نے ہی کرنا ہے تو هُمْ جو کہا گیا ہے اس کا فیصلہ خلیفہ وقت نے کرنا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت بھی یہی ہے۔ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد بھی یہی ہے بعض لوگوں کو روکا جا سکتا ہے اور ان کی نمائندگی کو ردّ کر دیا جا سکتا ہے آپ شوریٰ کی ایک تقریر میں فرماتے ہیں۔

> ”جو لوگ لڑاکے اور فسادی ہوں، نمازوں کی پابندی کرنے والے نہ ہوں، جھوٹ بولنے والے ہوں، معاملات میں اچھے نہ ہوں، بلاوجہ ناجائز افتراء اور اعتراض کرنے والے ہوں یا منافق یا کمزور ایمان والے ہوں ان کو بطور نمائندہ انتخاب کرنا جماعت کی جڑ پر تبر رکھنا ہے۔
> ہمارے لئے وہی لوگ مبارک ہیں جن کے اندر دین اور تقویٰ ہے خواہ وہ اچھی طرح بول بھی نہ سکتے ہوں“......

فِی الْاَمْرِ مشورہ جن سے کرنا ہے وہ بھی خلیفہ وقت کو اختیار دیا گیا ہے اور جن معاملات میں کرنا ہے وہ بھی خلیفہ وقت نے کرنا ہے کہ اَلْاَمْرُ سے کیا مراد ہے اور وہ جو پہلے میں نے آیت پڑھی تھی اس کے اس ٹکڑہ سے یہ بھی استدلال ہوتا ہے وہاں دراصل دو استدلال ہوتے ہیں ایک یہ کہ ہم سے مشورہ نہیں لیا جاتا هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ کہ جن امور کے متعلق مشورہ لیتا ہے۔ نبی یا خلیفہ وقت اس کی نیابت میں اس کا فیصلہ ہم سے پوچھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ خود کر دیا جاتا ہے کہ اَلْاَمْرُ کیا ہے؟ اس کے

متعلق حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

’’میں نے تجاویز پیش کرنے کا جو طریق رکھا تھا وہ اس خیال سے رکھا تھا کہ تجاویز میرے پاس آئیں گی اور میں ان میں سے جو مفید سمجھوں گا وہ لے لوں گا مگر اب یہ صورت ہوگئی ہے کہ جس کی تجویز نہ لی جائے وہ سمجھتا ہے کہ اس کا حق مارا گیا‘‘۔ (رپورٹ مجلس شوریٰ ۱۹۳۰ء)

تو جن اہم امور کے متعلق مشورہ دینا ہے یہ امور ایسے ہونے چاہئیں جن کا تعلق نصوص قرآنیہ یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح جو ارشاد ہیں ان کا ان سے تعلق نہ ہو وہ تو ایک قانون ہے جس کو دنیا کی کوئی طاقت بدل نہیں سکتی اس میں انسان کی بہتری ہے اس رنگ کی جمہوریت جو آج کل مقبول ہو رہی ہے وہ نہ یہ کہ اسلام میں نہیں بلکہ اسلام اسے ناپسند کرتا ہے اور اسلام نے مسلمان کی آزادی قرآن کریم کی شریعت کے احاطہ کے اندر رکھی ہے اس سے باہر نہیں آج کی جمہوریت کا تو یہ حال ہے کہ انگلستان کی جمہوریت نے، عوام کے نمائندوں نے یہ قانون پاس کر دیا ہے کہ بداخلاقی جائز ہے اس قسم کی جمہوریت اسلام کیسے پسند کرسکتا ہے؟ اور اگر آج کی جمہوریت کے مطابق اسلام مسلمانوں کو آزادی دیتا تو کسی وقت میں اپنے تنزل کے زمانہ میں مسلمان بھی اس قسم کی باتیں کر لیتے۔ اگر اس قسم کی جمہوریت مسلمانوں میں ہوتی تو اکثریت نے تو کہہ دیا تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کہ زکوٰۃ لینے میں کچھ ڈھیل کر دی جائے مگر خدا کے اس پیارے بندے نے یہ کہا تھا کہ میں تمہارا نائب نہیں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب اور خلیفہ ہوں اور آپ کی نیابت میں جو میرے حقوق ہیں وہ حقوق تم سے منواؤں گا اور دین کے معاملہ میں تمہارے کسی مشورہ کو سننے کے لئے تیار نہیں ہوں کل (تو نہیں مجھے کہنا چاہیے لیکن گزشتہ کل جو گزر چکی تھی) جب اسلام ۱۸ویں صدی میں اپنے تنزل کی انتہائی گہرائیوں میں پڑا ہوا تھا اس وقت جب شاید ننانوے فی صدی یا اس سے بھی زائد مسلمان تارک الصلوٰۃ تھے اگر رائے عامہ کی جاتی تو بھاری اکثریت یہ کہتی کہ زمانہ بدل گیا اب اس قسم کی نمازیں پڑھنے کی ضرورت نہیں چلو نمازیں معاف، تو اس قسم کی جمہوریت جو ہے اسلام اس کا قائل نہیں اور جب تک خلفاء، نبی کے بعد اس کی نیابت میں اسلام کے کاموں کے ذمہ دار ٹھہرائے جاتے ہیں وہ ان باتوں کے متعلق کسی سے بھی مشورہ نہیں کرتے ہاں جب کوئی الجھن پیدا ہو جائے تو وہ اپنے ربّ کے حضور جھکتے اور اس سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں اور وہ ہمارا پیارا ربّ ایسے اوقات میں

راہنمائی کرتا ہے اور ہدایت کے رستوں کی نشان دہی کرتا ہے تو فِی الْاَمْرِ کا فیصلہ کرنا کہ وہ کون سے اہم امور ہیں کہ جن کے متعلق مشورہ لینا ہے یہ بھی خلیفہ وقت کا کام ہے اس واسطے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم جو کہتے ہیں ان امور پر مشاورت میں بات ہونی چاہیے مشاورت کے سامنے وہی امر جائے گا جس کی اجازت خلیفہ وقت دے گا اور جس کے متعلق وہ سمجھے گا کہ مجھے جماعت کے اہل الرائے احباب سے مشورہ لینا چاہیے۔

پھر فرمایا فَاِذَا عَزَمْتَ عزم کرنا اور فیصلے پر پہنچنا یہ بھی خلیفہ وقت کا کام ہے جماعت کا کام نہیں، مجلس شوریٰ کا کام نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تو عزم کرلے فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ پھر مسلمانوں کا خیال بھی تو رکھنا ہے ان سے نرمی اور پیار کا سلوک بھی کرنا ہے اور ان کی تربیت بھی کرنی ہے لیکن یہ نہیں دیکھنا کہ ننانوے فی صدی مشورہ دینے والوں کی اکثریت اس میرے فیصلے کے خلاف ہے کبھی کہیں کوئی خرابی پیدا نہ ہو جائے جب دیانتداری سے تم کسی فیصلہ پر پہنچو تو خدا کے سوا کسی اور پر نگاہ نہیں رکھنی فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ کیونکہ اسی میں کامیابی کا راز ہے۔ حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:۔

”مجلس شوریٰ کوئی فیصلہ نہیں کرتی مجلس شوریٰ خلیفہ وقت کے مطالبہ پر اپنا مشورہ پیش کرتی ہے پس مجلس مشاورت شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ کہ تو لوگوں سے مشورہ لے خلیفہ وقت لوگوں سے مشورہ مانگتا ہے اس پر لوگ مشورہ دیتے ہیں اور اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے خلیفہ وقت فیصلہ کرتا ہے کہ کون سی بات ہونی چاہیے اور کونسی نہیں“۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تم کسی نتیجہ پر پہنچ جاؤ تو اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اور پختہ یقین پر قائم ہوتے اور رہتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ہی کارساز ہے وہی ہماری مدد کرے تو ہم کامیاب ہو سکتے ہیں اگر وہ ہمارا ساتھ چھوڑ دے تو ہم ناکامی کا منہ دیکھیں گے خدا پر توکل رکھتے ہوئے اپنے فیصلہ کو جاری کر دو اور فَاِذَا عَزَمْتَ کے اوقات میں جب خلیفہ وقت اپنے فیصلے کا اعلان کرے مسلمانوں کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا۔ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (محمد:۲۲) کہ جب کسی کام کے کرنے کے متعلق خلیفہ (یہاں عزم جو کہا گیا ہے وہ دوسری جگہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوائے خلیفہ کے کسی نے عزم نہیں کرنا نبی کے بعد جب خلیفہ) کسی فیصلہ کو پہنچ جائے اور اپنے دل میں پختہ ارادہ کرلے کہ اگر یوں کیا جائے تو جماعت کو روحانی اور جسمانی فائدہ ہے اس لئے یوں کیا

جائے گا تو مسلمانوں کا کیا فرض ہے؟ مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ جو انہوں نے اپنے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ دے کر خدا اور خلیفہ وقت کے لئے عہد اطاعت باندھا تھا اس کو وہ پورا کریں اور کامل اطاعت کا نمونہ دکھاتے ہوئے خلیفہ وقت کے فیصلوں کی تعمیل میں لگ جائیں۔ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ دنیا کی بہتر سے بہتر جزا اور اُخروی زندگی میں اعلیٰ سے اعلیٰ ثواب انہیں ملے گا۔ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۸)

ایک آیت کا کچھ حصہ اور ایک پوری آیت میں نے اس وقت تلاوت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ فَاعْفُ عَنْهُمْ تو ان سے درگذر کر۔ عفو کے معنی یہ ہیں کہ ایسا برتاؤ کرنا ایسا سامان پیدا کرنا کہ جو کمزوریوں اور غفلتوں کے بدنتائج ہوں ان سے وہ شخص جس سے درگذر کیا جائے محفوظ رہے محض یہ معنے نہیں ہیں کہ معاف کر دیا بلکہ اس کے اندر یہ معنی بھی آجاتے ہیں کہ اس رنگ میں معاف کیا کہ اگلے کی اصلاح ہوگئی۔ محض معافی جو ہماری زبان میں معافی کہلاتی ہے عربی زبان میں عفو کے محض یہ معنے نہیں ہیں بلکہ عفو کے معنوں کے اندر یہ بات بھی آتی ہے کہ ایسے رنگ میں درگزر کیا جائے کہ اس شخص کی اصلاح ہو جائے اور توبہ کی اسے توفیق ملے کیونکہ توبہ ہی ایک ایسا دروازہ ہے جس سے انسان پچھلے گناہوں کے عذاب اور مضرتوں سے بچتا ہے۔

پس عفو کے یہ معنی ہوئے کہ ایسے رنگ میں معاف کیا جائے کہ اصلاح ہو اور توبہ کی توفیق ملے اور جو غلطیاں ہو چکی ہیں ان کے بدنتائج سے وہ شخص محفوظ ہو جائے۔ اسی مصدر سے عَافَاهُ بھی نکلا ہے جسکے معنے ہیں ''دَفَعَ عَنْهُ كُلَّ سُوْءٍ'' یعنی ہر قسم کی تکلیف اور دکھ کو اس سے دور کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے غلام نائبین کو یہ حکم دیا ہے کہ مومنوں کی جماعت سے اس طرح کا سلوک کیا جائے کہ درگذر بھی ہو اور اصلاح بھی ہو اور بدنتائج سے ان کی حفاظت بھی ہو۔

دوسرے فرمایا وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ اس کے معنی لغت کے لحاظ سے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ان کی کمزوریوں اور غفلتوں اور گناہوں کے بدنتائج اور عذاب سے ان کی حفاظت کرے یعنی خود بھی یہ کوشش کرو کہ جو غفلتیں ہوگئی ہیں ان کے بدنتائج سے وہ محفوظ ہو جائیں اور اپنی کوشش پر ہی بھروسہ نہیں کرنا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور جھک کر اس سے یہ بھی استدعا کرنی ہے کہ مومنوں

کی جماعت اگر بشری کمزوریوں کے نتیجہ میں باوجود مخلص اور فدائی ہونے کے غفلتیں کر جائیں تو اے خدا! تو ان کی مدد کو آ اور ان کی کمزوریوں، گناہوں اور غفلتوں کو اپنی مغفرت کی چادر میں ڈھانپ لے اور ایسے سامان پیدا کر دے کہ ان کی اصلاحِ احوال ہو جائے۔

پس صرف یہ معنے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو زبان سے توبہ کی توفیق دے کیونکہ مغفرت کے معنی میں قول اور فعل سے مغفرت طلب کرنا ہے غرض یہاں یہ دعا ہے کہ اے خدا! تو ان لوگوں کو یہ توفیق دے کہ اپنی زبان سے بھی تیرے حضور توبہ کرتے ہوئے عاجزانہ طور پر گر جائیں اور اپنے افعال کی بھی اس طرح اصلاح کریں کہ دنیا بھی یہ مشاہدہ کرے کہ ان لوگوں کی زندگیوں میں ایک تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔

اقرب میں ہے ''اَصۡلَحَہٗ بِمَا یَنۡبَغِیۡ اَنۡ یُّصۡلِحَ بِہٖ''۔ یہ بھی استغفار کے معنوں کے اندر ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے سامان پیدا کر دے یا انسان کو ایسے ذرائع میسر آ جائیں کہ جو اصلاح احوال کا سامان پیدا کر دیں پھر چونکہ اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ابدی زندگی عطا کی گئی ہے اور یہ ابدی زندگی دو رنگوں میں ہمارے سامنے آتی ہے ایک تو آپ کا افاضہ روحانی قیامت تک جاری ہے اور دوسرے آپ سے اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ (الکوثر: ۲) میں اور بعض دوسری جگہ بھی یہ وعدہ ہے کہ قیامت تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام اور بندے پیدا ہوتے رہیں گے جو آپ کے دین کی مدد کرنے والے ہونگے اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے والے ہونگے اور قرآن کریم کے ظاہر و باطن کی حفاظت کی فرشتوں کی طرح وہ بھی توفیق پائیں گے۔

پس فرمایا کہ ایک تو کوشش کرو کہ جماعت مومنین کی اصلاح ہو جائے دوسرے ان کے لئے بڑی دعائیں کرو کہ وہ اپنی غلطیوں کے بدنتائج اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے محفوظ رہیں اور اپنی زبان سے بھی توبہ کرنے والے ہوں اور ان کے اعمال بھی دُھلے ہوئے صاف شفاف کپڑے کی طرح ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی کرنیں ان کے وجود میں سے باہر آ رہی ہوں یہ کرنے کے بعد شَاوِرۡهُمۡ فِي الۡاَمۡرِ پھر یہ جماعت اس بات کی مستحق ہوگی کہ ان سے مشورہ کیا جائے۔

آج جب میرے ذہن کو اس طرف متوجہ کیا گیا کہ میں اس آیت پر خطبہ دوں تو میں نے پھر اقرب اور لغت کی بعض دوسری کتابیں دیکھیں چنانچہ ایک بڑی اور حسین چیز میرے سامنے آئی اور وہ

یہ کہ مشاورت جو ہے اس کا روٹ یعنی اس کا مخرج شَارَ الْعَسَلَ ہے یعنی شہد نکالنا۔ اور اس شَارَ الْعَسَلَ کے معنے ہوتے ہیں اِسْتَخْرَجَهٗ وَاجْتَنَاهُ جس طرح مکھی کا جو کام ہے نا پھول سے اپنی مرضی کے مطابق وہ چیز حاصل کرنا جس سے مکھی نے شہد بنانا ہے یعنی Nectar (نیکٹر) جو پھول سے لیتی ہے۔ شہد کی مکھی کے بارے میں اب جو نئی تحقیق ہوئی ہے اس سے یہ پتہ لگتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ایک پھول کا انتخاب کرتی ہے اور پھر اس پھول سے وہ شہد بناتی رہتی ہے یعنی پھول کا ایک حصہ لیتی ہے اور اپنے جسم کا ایک حصہ اس میں داخل کرتی ہے اس طرح پر شہد بنتا ہے۔ بہت سے دوستوں کو اس کا علم نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ شہد صرف پھولوں کے رس سے بنتا ہے۔ یہ درست نہیں ہے شہد میں قریباً پچاس فیصد پھول کے رس کا حصہ ہے اور قریباً پچاس فیصد مکھی کے اپنے غدود میں سے ایک چیز نکلتی ہے مختلف قسم کے Enzymes (انزائمز) اور مختلف قسم کی دوسری چیزیں وہ شہد میں ملاتی ہے یعنی وہ جو پھول کا حصہ ہے اس کے اندر ملاتی ہے تب جا کر شہد بنتا ہے۔

پس دونوں برابر کے حصے جا رہے ہیں جہاں تک اسکے معنے کا سوال ہے لیکن جہاں تک محنت اور کوشش کا سوال ہے حقیقت یہی ہے کہ پھول نے شہد بنانے کے لئے کوشش نہیں کی کبھی پھول نے بھی جا کر اپنے شہد کو مکھیوں کے چھتے تک پہنچایا ہے شہد کی مکھی جو ہے اس کی ساری کوشش شہد بنانے کی ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق وہ اپنے اس کام میں لگی ہوتی ہے۔

جن لوگوں نے شہد کی مکھیوں اور ان کے چھتوں پر تحقیق کی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ شہد کی مکھی کے چھتے کے نیچے کبھی کوئی مردہ مکھی نہیں ملے گی اور وہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ کام کرتے ہوئے کبھی پھول کے قریب، کبھی پھول اور اپنے چھتے کے درمیان مر کر گر جاتی ہے یعنی وہ اپنے کام کے لحاظ سے ایک قسم کی شہید ہی ہے کام کے اندر اسکی جان نکلتی ہے وہ آخری سانس تک کام کرتی رہتی ہے۔

مکھی پھول کے اندر سے اپنی مرضی سے انتخاب کر کے وہ حصہ جسے انگریزی میں Nectar (نیکٹر) کہتے ہیں تھوڑا سا پتلا مایہ ہوتا ہے جو شہد کی طرح کا قوّام نہیں رکھتا بلکہ شہد کی نسبت پھول میں اس چیز کی حالت پانی کے زیادہ قریب ہے لیکن مکھی پھر اسے وہاں سے لے کر آتی ہے پھر اسکو اپنی زبان پر رکھ کر خشک کرتی ہے اور ہزاروں لاکھوں دفعہ زبان باہر نکال کر اندر منہ میں لے جاتی ہے اور اس حرکت سے وہ اسے قوّام کی شکل دیتی ہے پھر اپنے Enzymes (انزائمز) بیچ میں ملاتی ہے

تب جا کر وہ شہد بنتا ہے تب ہمیں وہ شہد ملتا ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر کر کے شہد کے چھوٹے سے حصہ کو چاٹتے ہیں پورے احساس کے ساتھ کہ اگر یہ کام شہد کی مکھی کی بجائے انسان کے سپرد ہوتا تو شاید لاکھ دو لاکھ روپے کا ایک سیر شہد ملا کرتا اور یہ بات ایک عام انسان کی طاقت سے باہر ہوتی ہاں شیطان انسان جو ہے اس کی طاقت کے اندر ہوتی۔

پس اصل مشاورت کا مخرج شَارَ الْعَسَلَ کا جو عربی میں محاورہ ہے اس میں شوریٰ کا جو لفظ ہے وہ ہے اور اس سے پھر آگے مشاورت نکالی اور مشورہ اور شوریٰ کا مضمون اس مثال سے بہت واضح ہو جاتا ہے یعنی جو مضمون یہاں بیان ہوا اگر یہ مضمون سامنے نہ ہو تو بہت سے پہلو مخفی رہ جائیں۔

اس میں ایک تو یہ آ گیا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا کہ کن پھولوں کا شہد یا کن انسانوں کی آراء طلب کرنی ہیں یہ حضرت نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے نائبین کا کام ہے پھول کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ مکھی کو یہ کہے کہ تم گلاب کے پھول پر کیوں جا رہی ہو جب کہ تم سے زیادہ قریب شیشم کا پھول موجود ہے یہ پھول کا کام ہی نہیں اور نہ اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت دی ہے یہ مشاورت کرنے والے مشورہ لینے والے کا کام ہے کہ وہ کن لوگوں سے مشورہ لے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف شکلیں ہمیں حضرت نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آتی ہیں۔ آپ کے بعض ایسے مشیر بھی تھے کہ مجھے یہ شبہ ہے میری طبیعت پر یہ اثر ہے کہ شاید تاریخ نے بھی ان سب کے نام محفوظ نہیں رکھے کیونکہ آپ ان کو خفیہ طور پر بلا لیتے تھے اور جس معاملے کے متعلق مشورہ لینا ہوتا آپ ان سے مشورہ لے لیا کرتے تھے بعض کے نام آئے ہیں اس سے ہمیں پتہ لگ گیا کہ اس طرح بھی آپ مشورہ لیتے تھے اور بعض دفعہ آپ سب کو جمع کر لیتے تھے بعض دفعہ نمائندے آ جاتے تھے اور آپ کی یہ سنت تھی اور خلفائے راشدین کی بھی یہ سنت تھی اس وقت بھی یہ سنت تھی جس زمانے میں بھی یہ رہی ہے کہ نمائندگی کے طور پر ساری جماعت تو یہاں اکٹھی نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ مشورہ کے لئے ربوہ کے مکینوں کو اکٹھا کر لیا جائے چونکہ جماعت پھیل گئی اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل کیا ایک آواز جو ایک منہ سے نکلا کرتی تھی اب وہی آواز لاکھوں کروڑوں کے منہ سے نکل رہی ہے سارے اکٹھے ہو کر کس طرح رائے دے سکتے ہیں یا ان سے رائے لی جا سکتی ہے نمائندگی کا اصول ہمیں چلانا پڑے گا مگر جب ضرورت ہو تو دوسری طرح بھی مشورہ ہو جائے گا۔

پس شَاوِرۡهُمۡ میں بتایا گیا ہے کہ جس طرح شہد کی مکھی پھول سے شہد کا استخراج اور اجتنا کرتی ہے اسی طرح تم مومنین کی جماعت کی آراء کا استخراج کرو کیونکہ شَاوِرۡ کے معنے استخراج الرائے اور شَارَ الۡعَسَلَ کے معنے استخراج العسل یعنی شہد کا نکالنا مثال بالکل واضح ہوگئی ہے ایک فرمایا کہ جس طرح اور جن سے چاہو آراء لو۔

وہ جو دوسرا حصہ تھا کہ اپنی پیچ میں ملا کر اپنے جسم کی اپنی روح کی اور اپنے ذہن کی جب تک (اگر انسانی مثال ہو) ساتھ نہ ملائی جائے شہد نہیں بنتا وہ مشورہ درست نہیں رہتا اس واسطے فَاِذَا عَزَمۡتَ۔ وہ عزم جو ہے وہ مکھی والے Enzymes (انزائمز) کی آمیزش ہے کہ جب آراء لے لیں وہ سامنے آ گئیں پھر اپنے عزم اسکے اندر ملاؤ اور پھر وہ فیصلہ بنے گا ورنہ جب تک رسول یا نائب رسول کی اپنی رائے اپنا عزم اپنا فیصلہ اپنے Enzymes (انزائمز) (اس مثال کے لحاظ سے جو پھول سے حاصل کیا گیا اور مومنین کی جماعت سے یا ان کے نمائندوں سے آراء کی شکل میں حاصل کیا گیا) اسکے اندر شامل نہ ہوں۔ اس وقت تک نہ شہد بنے گا اور نہ وہ جو آراء دیں وہ پختہ بنیں گے اور مفید ہونگی اور نہ ایسی بنیں گی کہ جن کے اندر شفا ہو اور شفا میں بھی اللہ تعالیٰ نے دونوں کو برابر کر دیا۔ شہد کے اندر بھی کہہ دیا کہ اسکے اندر شفا ہے اور جس رنگ میں احکامِ الٰہی کا اجراء کرنا ہے اسکے متعلق یہ کہا کہ اس کے اندر شفا ہے۔

پس تیسری چیز یہ بتائی کہ شَاوِرۡهُمۡ خالی آراء کافی نہیں بلکہ خود دعا کر کے اور اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کر کے اور اپنی خداداد فراست کو استعمال کر کے (یہ کتنی قسم کی Enzymes (انزائمز) ہیں اگر ان کو بطور مثال Enzymes ہی کہا جائے) وہ ان آراء میں شامل کرو تب جا کر وہ چیز ایسا قوّام اختیار کرے گی کہ بنی نوع انسان کے لئے وہ شفا بن جائے گی تدبیر اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ یہاں تو فرمایا کہ تدبیر کرو جو اہم امور ہیں اُمتِ مسلمہ کے استحکام کے لئے اور تمکینِ دین کے لئے اور اصلاحِ انسانیت کے لئے اور تبلیغ واشاعت کے لئے بڑے امور ہیں تم پہلے تو ایک ایسی قوم تیار کرو کہ جو Nectar (نیکٹر) پیدا کر سکے یعنی بعض دفعہ ویسے تو اللہ تعالیٰ نے ہر پھول میں Nectar (نیکٹر) یعنی وہ چیز پیدا کی ہے جو شہد کا ایک حصہ بن جاتی ہے لیکن بعض دفعہ ایسا حادثہ ہوتا ہے کہ پھول نظر آتا ہے لیکن وہ حصہ غائب ہوتا ہے کوئی بیماری ایسی بھی آ جاتی ہے پس اگرچہ وہ پھول ہے اور عام

پھول میں Nectar (نیکٹر) بھی ہے جو شہد کا جز و بھی ہے لیکن اس حادثہ کی وجہ سے شہد نہیں بن سکتا اسلئے فرمایا کہ امتِ مسلمہ کو یا جماعت مومنین کو ایسا بناؤ کہ وہ صاحب الرائے ہوں اور ایسے ہوں کہ جن سے شہد کا ایک جز و Nectar (نیکٹر) جو ہے یا رائے کی اصابت جو ہے وہ ان سے حاصل کی جا سکے اور ان کا نفس بیچ میں نہ آئے۔ اب جو پھول ہے اس کا نفس بیچ میں نہیں آتا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ بیچارے پھول نے اپنا نچوڑ شہد کی مکھی کے حضور پیش کر دیا اور آپ وہاں کھڑا ہے تو اس کا نفس تو بیچ میں نہیں آیا اس نے تو اپنے نفس کی بہترین چیز تھی اس کو اس کے حضور پیش کر دیا جس کی طرف اللہ تعالیٰ کی وحی تھی یعنی شہد کی مکھی کہ تم نے شفا کے سامان پیدا کرنے ہیں ایک ایسی جماعت بنے جو تقویٰ اور طہارت کی بنیادوں پر اپنی زندگیوں کو گزارنے والی ہو اللہ تعالیٰ سے جن کا تعلق پیدا ہو جن کا دعاؤں پر زور ہو جو واقعہ میں اُمتِ مسلمہ ہو یعنی ان کا اپنا کچھ بھی باقی نہ رہے اپنا سب کچھ اپنا وجود بھی اپنا ذہن بھی اپنی فکر بھی اپنی ساری قوتیں اور طاقتیں اور زندگی اور موت سب خدا کے حضور پیش کر دیں۔ یہی اسلام ہے اسکے بغیر تو کوئی اسلام نہیں ہے۔

غرض فرمایا عفو اور استغفار کے ذریعہ ایک ایسی جماعت بناؤ جو صاحب الرائے ہو مغلوب الغضب نہ ہو دھیمی ہو فدائی ہو مشورہ دیتے وقت یہ نہ سوچے کہ پھر اسکے بعد ہم پر کتنی ذمہ داریاں عائد ہو جائیں گی مشورہ دیتے وقت صرف یہ سوچے کہ آج اسلام کی زندگی کی بقا اور احیا اور اشاعت اور اس کے استحکام کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ہمیں پیش کر دینی چاہئیں خواہ ہم بھوکے رہیں یا ہمارے بچے بھوکے رہیں یا ان کو کھانے کے لئے کچھ ملے۔ خواہ ہم زندہ رہیں یا ہمیں اپنی جانوں کی قربانی دینی پڑے ہمیں اپنا سب کچھ خدا کے حضور پیش کر دینا ہے۔ یہ جماعت جب پیدا ہو جائے پھر ان کا یہ حق بن جاتا ہے کہ وہ صاحب الرائے ہیں کیونکہ ان سے مشورہ لیا جاتا ہے شہد کا ایک جز و تیار ہو گیا۔ دوسرا جز و عزم کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور عزم انہوں نے نہیں کرنا۔ انہوں نے تو جو کچھ تھا پیش کر دیا تھا جس طرح چاہیں آپ اسکو استعمال کر سکتے ہیں۔ پھول زبان حال سے مکھی کو یہی کہتا ہے کہ میرا نچوڑ تیرے حضور پیش، تو اب جس طرح چاہے اسکو استعمال کر لے اور جس طرح چاہے وہ استعمال بھی کرتی ہے کیونکہ اس میں اپنے Enzymes (انزائمز) ملاتی ہے اس کو خشک کرتی ہے قوام بناتی ہے اپنے Enzymes (انزائمز) ملاتی ہے اور پھر وہ فیصلہ کرتی ہے (اس میں انسان کا بھی تھوڑا سا

دخل ہے) لیکن اصل اسی کا فیصلہ ہے کہ میں نے کچھ انسان کو دینا ہے اور بیچ میں سے بہت کچھ خود کھا لینا ہے اور اس طرح انسان کے ہاتھ میں شفا کی ایک چیز آجاتی ہے چنانچہ پھر یہ کہنا کہ صرف آراء کے اوپر نہیں چھوڑنی بات۔ اگر صرف رائے پر چھوڑنی ہو بات، تو کثرت رائے کی پابندی ضروری ہو جائے مگر ابھی تو شہد ہی نہیں بنا ابھی تو اس میں شفا ہی نہیں پیدا ہوئی کثرت رائے پر کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ پھر کہا کہ عزم اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ ہر قسم کی Enzymes (انزائمز) مثال کے طور پر اس Nectar (نیکٹر) میں، اُس پھول کے جزو میں تم شامل کرو اور پھر عزم جو ہے اسکے اندر دعا کا حصہ بھی آجاتا ہے کیونکہ عزم کے دو معنے ہیں ایک تو یہ عزم کرنا کہ یہ کام ہم نے ضرور کرنا ہے یہ بھی لغوی طور پر عزم کے معنے میں ہے کہ پھر اس کام کی سرانجام دہی کے لئے انتہائی کوشش کرنا۔ اور ''جَدَّ فِي الْاَمْرِ'' جو عربی میں اس کو کہا گیا ہے اسکے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں بتایا ہے کہ تدبیر دعا ہے اور دعا تدبیر ہے تو دعا کا پہلو بھی اسکے اندر آجاتا ہے۔ پس کہا کہ تم اپنا عزم اس رائے کے بیچ میں شامل کرو اور انتہائی دعاؤں کے ساتھ ایک ایسی چیز ایک ایسا شہد بناؤ ایک ایسا فیصلہ کرو جو اسلام کے استحکام کے لئے ضروری ہے اور جو کمزور ایمان والوں کے لئے شفا ہے اور جو Prophylactic (پرافیلیکٹک) کے طور پر بیماریوں سے محفوظ رکھنے والا ہے تربیت، علاج اور اصلاح دونوں چیزیں اس کے اندر آجاتی ہیں۔ پس تربیت تو Prophylactic (پرافیلیکٹک) یعنی بیماریوں سے بچانے کا کام ہے اور یہ ساری چیزیں اسکے اندر آجاتی ہیں۔

غرض فرمایا کہ جماعت تیار کرو اور پھر ان سے مشورہ لو اور یہ آگے جو مشورہ کا ہے اس کی مثال دے دی کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے شہد کی مکھی شہد بنا رہی ہو۔ آراء لو پھر اپنے عزم کو اپنی ہمت کو اپنی کوشش کو اپنی دعاؤں کو اس کے اندر شامل کرو اس مقام پر انسانی تدبیر اپنی انتہا کو پہنچ جائے گی لوگ اکٹھے ہوئے انہوں نے مشورہ دیا رسول یا نائب رسول نے اپنے عزم کی Enzymes (انزائمز) اس میں شامل کیں دعائیں بیچ میں شامل کیں اور تدبیر کو انتہا تک پہنچا دیا اور جس وقت تدبیر انتہا کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ تدبیر پر بھروسہ نہیں کرنا۔ یہ صحیح ہے کہ ہماری ہدایت کے مطابق تم نے اپنی تدبیر کو اس کی انتہا تک پہنچا دیا لیکن یہ بھی درست ہے کہ محض تدبیر پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جتنی بے وفائیاں دنیا کی تدابیر نے انسان سے کی ہیں ان کا کوئی شمار نہیں تدبیر پر کیسے بھروسہ کیا

جا سکتا ہے؟ ہم نے حکم دیا تھا تدبیر کو انتہا تک پہنچاؤ تم نے تدبیر کو انتہا تک پہنچا دیا اب ہم تمہیں کہتے ہیں کہ اپنی تدبیر کو انتہا تک پہنچانے کے بعد بھی تم نے تدبیر پر بھروسہ نہیں کرنا فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا ہے۔

پھر ایک اور دعا بھروسہ کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ پر توکل جو ہے اس کے ساتھ دوسری دعا جو ہے وہ شروع ہو جاتی ہے اور جو آراء لی تھیں اور کثرت رائے کے حق میں یا خلاف جو بھی شکل شہد کی بنی وہ بن گئی۔ پس یہاں محض یہ نہیں کہا کہ اے رسول! تمہارا عزم شامل ہو گیا۔ تم نے اللہ تعالیٰ کی تدبیر کو انتہا تک پہنچا دینے کے بعد تدبیر پر بھروسہ نہیں کرنا اللہ پر توکل کرنا ہے۔ مومنوں کو یہ کہا کہ تم یہ نہ سمجھنا تمہاری آراء کے ساتھ نائب نبوّت کا عزم اور ہمت اور کوشش اور دعا مل جانے سے تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ تم بھی یہ یاد رکھو اسکے باوجود تم بھی کامیاب نہیں ہو سکتے بلکہ تم کو اللہ پر بھروسہ رکھنا پڑے گا اور دوسری آیت میں فرمایا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ایک حکم دیا تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی وساطت سے آپ کے نائبین کو اور دوسرا حکم دیا جماعتِ مسلمین کو وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ میں اسی طرف اشارہ ہے اور اس میں جماعتِ مؤمنین کو مخاطب کر کے یہ کہا کہ یہ بات نہ بھولنا کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کو آ جائے تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں ناکام نہیں کر سکتی اور اگر اللہ تعالیٰ کی نصرت تمہیں سہارا نہ دے تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں کامیاب نہیں کر سکتی۔ (خطبات ناصر جلد سوم صفحہ ۸۷ تا ۸۶)

کہ جو مومن ہیں وہ جب بھی خود کو عاجز پائیں اور اور پر توکل کا موقعہ سمجھیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر توکل نہیں کیا کرتے۔

وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ غیر اللہ پر توکل نہیں کرنا یعنی اپنے علم پر بھروسہ نہیں رکھنا۔ اپنے اموال پر بھروسہ نہیں کرنا۔ اپنے جتھے اور برادری پر بھروسہ نہیں کرنا۔ اپنی قوت بازو پر بھروسہ نہیں کرنا۔ رشوت پر بھروسہ نہیں کرنا۔ جھوٹ پر بھروسہ نہیں کرنا۔ دھوکہ دہی پر بھروسہ نہیں کرنا کہ اس سے ہمارے کام بن جائیں گے۔ تو 'نہیں کرنے والا' ایک حصہ ہے اور دوسرا یہ کہ یہ یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ہمارا کارساز ہے اور اتنی قوت اور طاقت رکھتا ہے کہ ہمارے سارے کام کر سکتا ہے۔ ہم عاجز ہیں لیکن خدا عاجز نہیں ہے۔ دنیا میں دنیا دار جب دنیا والوں پر بھروسہ کرتے

ہیں وہ ایک عاجز پر بھروسہ کر رہا ہوتا ہے۔ جتنا عاجز ایک انسان ہے اتنا ہی عاجز دوسرا انسان ہے لیکن جب خدا کا بندہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر یا اپنی سمجھ اور عقل اور ایمان کے تقاضا سے ہر چیز میں خود کو عاجز سمجھتا اور پاتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے تو وہ ایک ایسی ذات پر توکل کرتا ہے جس میں کام کرنے کی ساری طاقتیں ہیں۔

تو توکل کا ایک پہلو یہ ہے کہ غیر اللہ کو اس قابل نہیں سمجھنا کہ وہ ہماری ضرورتوں کو پورا کر سکتے ہیں اور خود اپنے آپ کو بھی اس قابل نہیں سمجھنا اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو واقعی قادر سمجھنا اور واقعی اس بات کا اہل سمجھنا اسے صفات کا مالک سمجھنا کہ وہ ہماری ہر ضرورت کو پورا کر دے گا۔ اگر ہمیں مال کی ضرورت ہے تو یہ نہیں سمجھنا کہ دنیا والے ہمیں رزق دے دیں گے لیکن یہ ضرور سمجھنا ہے کہ ہمارا خدا رازق ہے اور ایسے رستوں سے بھی رزق دے دیتا ہے کہ انسان کی عقل میں بھی وہ نہیں ہوتا۔ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (البقرۃ:۲۶) (خطاباتِ ناصر جلد اوّل صفحہ ۲۵۴)

مجاہدہ کی ایک شکل ہمیں قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَحْمَةٌ یہاں صرف قتل کئے جانے کا ذکر ہے۔ ضروری نہیں کہ جنگ میں قتل ہو۔ اگر آپ تاریخ اسلام پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ مسلمان صرف میدان جنگ میں ہی شہید نہیں کئے گئے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ مجموعی طور پر ہزاروں لاکھوں مسلمان ایسا ہے جسے میدان جنگ میں نہیں بلکہ امن کی حالت میں کافروں نے بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کیا۔ جیسا کہ ہماری تاریخ میں صاحبزادہ عبد اللطیف صاحب شہیدؓ کو کابل میں پکڑا گیا۔ وہ بے گناہ، بے بس اور کمزور تھے۔ حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ حکومت نے خدا تعالیٰ کے فرمان کے خلاف، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو مول لیتے ہوئے ان کو پکڑا اور قتل کر دیا۔ اور بڑی بے دردی سے قتل کیا۔ تو ایک شکل مجاہدہ یا جہاد فی سبیل اللہ کی یہ ہے کہ انسان ایسے وقت میں اپنی جان قربان کر دیتا ہے اور کمزوری نہیں دکھاتا۔ صداقت سے منہ نہیں موڑتا۔ دشمن کہتے ہیں کہ تم توبہ کر لو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے وہ کہتا ہے کہ کس چیز سے توبہ؟؟ توبہ کر کے حق کو چھوڑ دوں!! صداقت سے منہ پھیروں!!! اور باطل کی طرف آ جاؤں!!!! ایسا مجھ سے نہیں ہو سکتا!! مرنا آج بھی ہے اور کل بھی۔ تمہارا جی چاہتا ہے تو مار دو۔ لیکن میں صداقت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ (خطباتِ ناصر جلد اول صفحہ ۴۴۶، ۴۴۷)

ایک اور خرابی جو دنیوی سہاروں میں پائی جاتی ہے اور کہیں نہیں پائی جاتی ہے یہ ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب دوسرے لوگ ان کو اپنا سہارا بنالیں ان کے ساتھ لگ جائیں ان کی خدمات کریں ان کی خوشامد کریں وغیرہ وغیرہ تو ان کو کچھ دنیوی فیض تو ان سے حاصل ہو جاتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ان کے دل میں ان کی محبت پیدا ہو اور جب تک محبت پیدا نہ ہو وہ ان کی پوری شفقت اور ان کے انعاموں میں سے پورا حصہ حاصل نہیں کر سکتے لیکن یہاں یہ بات نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ یعنی جو اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں وہ اس کے محبوب بن جاتے ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جائے اس کا کوئی دکھ باقی نہیں رہتا اس لئے فرمایا

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد اور نصرت کرنا چاہے تو کوئی اور طاقت یا ہستی تم پر غالب نہیں آسکتی لیکن اگر وہ تمہاری مدد اور نصرت چھوڑ دے تو خدا کو چھوڑ کر اور کون تمہاری مدد کرے گا اس لئے تمہیں چاہیے کہ اس پر کامل توکل کر کے اس کے محبوب بن جاؤ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ جب تم اس کے محبوب بن جاؤ گے تو اس کی نصرت کو تم حاصل کر لو گے اور تم ایسا نہیں کرو گے تو اس کی نصرت سے تم محروم ہو جاؤ گے اگر تم اس کے محبوب بن جاؤ گے تو تمہیں اس کی نصرت ملے گی اور تمہاری زندگی کا مقصد تمہیں حاصل ہو جائے گا۔ اس وقت سب سے بڑی تڑپ ایک احمدی کے دل میں یہ ہے کہ اسلام ساری دنیا میں غالب آئے اس کی یہ تڑپ اور خواہش پوری ہو جائے گی۔ (خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۳۹۲)

آیت ۱۶۳ تا ۱۶۵ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۶۳ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۶۴ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۶۵

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ

بِئْسَ الْمَصِيْرُ کہ وہ شخص جو اللہ کی رضا کے پیچھے چلتا ہے یعنی جو خدا چاہتا ہے وہ کرتا ہے کوئی ایسا کام نہیں کرتا کہ سمجھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگا، ہر وہ کام، سمجھتا ہے کہ اللہ خوش ہوگا اللہ کو خوش کرنے کے لئے وہ کام کرتا ہے۔ پھر میں سارے حصے نہیں لے رہا اس کے بعض چیزیں لے رہا ہوں آپ کو بات سمجھانے کے لئے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وہ جماعت وہ اُمتِ مسلمہ جو خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر خدا کی خواہش کے مطابق اس کی ہدایت کی اتباع میں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں، اعمال صالحہ بجالانے والے ہیں۔ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وہ ایک جیسے درجات رکھنے والے نہیں وہ مختلف درجات رکھنے والے لوگ نہیں اور وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ اور یہ جو چھوٹا درجے کا مومن خدا کا پیارا لیکن درجے میں بڑا کم اس سے ذرا اوپر، اس سے ذرا اوپر سب سے اوپر یہ جو ہے یہ اس لئے نہیں ہے کہ ویسے ہی فیصلہ کر لیا بغیر کسی حکمت اور دلیل کے بلکہ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ہر شخص نے اپنے اعمال کے مطابق ثواب حاصل کرنا اور ایک مقام کو، ایک رفعت کو حاصل کرنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ہے اور وہ عالم الغیب ہے وہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق، اس کے خلوص کے مطابق، اس کی نیت کے مطابق، ثواب دے گا اور اسی کے مطابق اس کا ایک درجہ ہوگا۔ سارے ایک درجہ کے نہیں ہیں بلکہ ترجیحات ہیں کچھ لوگ خدا کو بہت پیارے، کچھ لوگ اس سے کم پیارے، کچھ لوگ اس سے کم پیارے، لیکن سارے کے سارے ہی خدا کے پیار کی جنتوں میں جانے والے ہیں پھر فرمایا کہ اے وہ لوگوں جو ہمارے اس رسول پر ایمان لائے اور جس کے نتیجہ میں تم نے اپنے عقائد کو درست کیا اور اعمال صالحہ بجالائے اور وہ درجے درجے میں تقسیم ہوئے لیکن میری رضا کی جنتوں میں تم داخل ہوئے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ایسے مومنوں جنہوں نے اس طرح میرے پیار کو حاصل کیا ہے تم پر خدا کا احسان ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں ہدایت پانے کی خدا کا پیار حاصل کرنے کی خدا کی رضا کی جنتوں میں جانے کی توفیق عطا کی۔ تمہارا احسان نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے اور نہ خدا تعالیٰ پر ہے۔ ایک جگہ فرمایا خدا نے لَا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ (الحجرات:۱۸)۔ احسان نہ جتاؤ مجھ پر کہ ہم مسلمان ہو گئے اور مسلمان ہونے کے بعد جن قربانیوں کا اور جس شر کا اور جس تکلیف کو برداشت کرنے کا اور جس قسم کا جگرا تا کرنے کا اور دن کے اوقات میں روزے رکھنے کا اور بھوکے رہنے کے متعلق کئے گئے تھے یہ

ہم نے کسی پہ احسان کیا لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اور وہاں کہا لَا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ (الحجرات: ۱۸)۔

خدا کا احسان ہے تم پر اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ تم واقعہ میں مومن اور خدا کے پیار کو حاصل کرنے والے ہو تو خدا کا احسان ہے اپنے زور سے تم ایسا نہیں کہہ سکتے تھے کہ اگر یہ ہدایت نہ نازل ہوتی اور اگر اتنی عظیم تعلیم نہ آتی اگر اتنی بشارتیں ساتھ نہ لاتی اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ وعدے نہ دیئے جاتے کہ تیری اُمت کے وہ لوگ جو تیری اتباع کریں گے وہ میری محبت کو میرے پیار کو، حاصل کرلیں گے۔ تو پھر کہاں سے تم پاتے یہ سب چیزیں فرمایا لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ خدا تعالیٰ نے ان مومنوں پر احسان کیا اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ کہ جب ان میں ایک رسول بھیجا ہے جو انہی میں سے ہے يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وہی چار مقاصد آ گئے جو خدا تعالیٰ کی آیات ان کے اوپر پڑھتا ہے وہ کھول کے ان کے سامنے بیان کرتا ہے اور سمجھاتا ان لوگوں کی طبیعتوں پر اثر پیدا کرتا ہے خیرِ کل جو ہے اس کو وہ قبول کرو اور اس سے استفادہ کرے اور خالی یہ نہیں کہتا، کرو، بلکہ بتاتا ہے اگر ایسا کرو گے تمہیں فائدہ ہے وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اس میں ایک اور چیز بڑی زائد آ گئی کہ وہ باتیں بتاتا ہے جو تمہیں پہلے پتا نہیں تھیں۔ اگرچہ تم یقیناً کھلی کھلی گمراہی میں تھے پہلے، لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے آپ پر شریعت قرآنیہ نازل ہوئی ایک عظیم کتاب اور بحرِ بے کنار جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے اتنے علوم اس میں بھرے ہوئے ہیں آ گے ہی، کہ ہر ایک نے اپنی ہمت کے مطابق غوطے لگائے ہر ایک نے اپنی صلاحیت کے مطابق، اس سمندر کی تہہ سے بڑے قیمتی موتی اور جواہرات نکالے خدا کا احسان ہے اگر یہ نہ ہوتا تو تم خدا کے پیار کو حاصل نہ کر سکتے، اس کی ترتیب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں ترتیب یہ رکھی تھی تو ایسا رسول آئے جو ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے پہلے آیات وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ پھر کتاب کا ذکر وَالْحِكْمَةَ پھر حکمت کا ذکر اور اس کے بعد چوتھی بات حضرت ابراہیم کی دعا میں تزکیہ نفس کا ذکر لیکن جو قبولیت دعائے ابراہیمی ہے اس میں اس ترتیب کو بدل دیا گیا اور اس میں یہ کیا گیا کہ آیات پڑھ کے سنائے اور ان کا تزکیہ کرے۔ پھر کتاب سکھائے اور حکمت سکھائے اور اس میں علاوہ اور بہت سارے مضمون کے جن سے قرآن بھرا پڑا ہے ایک حکمت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو ترتیب اختیار کی اس وقت کی ہدایت،

آسمانی ہدایت اسی ترتیب کو چاہتی تھی اس وقت کی آسمانی ہدایت کیونکہ تزکیہ نفس پر ساری کوشش ختم ہو گئی ابدی ترقیات کا وعدہ نہیں تھا ان کو الکتاب کامل کتاب اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ ایک حصہ دیا گیا تھا۔ اس واسطے ان کی روحانی ترقیات اور دوسری خیر جو ان ہدائتوں کے ذریعے سے ان کو ملتی تھی وہ ایک جگہ پہ ختم ہو جاتی تھی ابدی طور پر نہ ختم ہونے والی ترقیات ہمیشہ بڑھتے رہنے والا ہر آن بڑھتے رہنے والا اللہ تعالیٰ کا پیار یہ وعدہ ان ہدایتوں ان شریعتوں میں نہیں دیا گیا تھا۔

(خطاباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۴۴۴ تا ۴۴۳)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں میں سے ایک ایسا رسول بھیج کر جو انہیں اس کے نشان پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے یقیناً ان پر احسان کیا ہے، اور وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس گمراہی میں سے نکالا اور اللہ تعالیٰ نے احسان کیا ان پر کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ بڑی ہی آسمانی نعمتیں لے کر آئے اور ایک گروہ انسانوں میں سے ایسا پیدا ہوا جنہوں نے قبول کیا اور فائدہ اٹھایا برکاتِ سماوی سے حصہ لیا اور خدا کی نگاہ میں وہ پاک ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے نشان ان کی زندگیوں میں اور ان سے ظاہر ہوئے تو (لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ) میں نے بتایا کہ ہر انسان پر آپ کا احسان ہے لیکن اس آیت میں ذکر ہے صرف مومنوں کا اور دو احسان (بڑے ہی پیارے ہیں وہ) جو اللہ تعالیٰ کے پیار کا اظہار کرتے ہیں مومنوں پر ہوئے، ان کا اس میں ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک تو اللہ تعالیٰ نے یہ احسان کیا جماعتِ مومنین پر کہ ان میں ایک اتنا عظیم رسول مبعوث ہوا جس کے طفیل ساری کی ساری اور پوری کی پوری آسمانی نعمتیں حاصل کی جاسکتی ہیں اور دوسرا یہ فضل ہوا مومنوں پر کہ جو ادھوری نعمتیں پہلوں پر نازل ہوئی تھیں اور اللہ تعالیٰ کے نسبتاً کم فضل کے وہ وارث ہوئے تھے اس کے مقابلہ میں اب ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جنہیں کامل نعمتیں حاصل ہوئیں اور خدا تعالیٰ کے وہ اس قدر پیارے ہوئے کہ اس سے پہلے بنی آدم میں کوئی قوم اتنی پیاری اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہیں ہوئی۔ تو ایک تو احسان ہے بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرا یہ احسان ہے کہ آپ عظیم تعلیم لے کر آئے۔ اس کو یہاں اللہ تعالیٰ نے چار شعبوں میں تقسیم کر کے بیان

کیا۔ یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِہٖ وہ آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ بات بڑی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں آیات کا لفظ یا ''اٰیَۃٌ'' کا لفظ جو اس کا مفرد ہے، مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ اٰیَۃٌ کے ایک معنی قرآن کریم کی اصطلاح میں یہ ہیں کہ جلوہ صفت باری کا، وہ جس کے نتیجہ میں مادی کائنات میں کوئی چیز پیدا ہوئی یا کسی چیز میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی یعنی صفاتِ باری کے وہ جلوے جن جلوؤں نے کائنات کو پیدا کیا۔ بے شمار مخلوق ہے اس قدر کہ انسانی عقل میں وہ آنہیں سکتی۔ انسان اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس کے متعلق انسان کو مخاطب کر کے فرمایا قرآن کریم میں کہ اے انسان! ہر چیز تیرے لئے پیدا کی گئی، اس قسم کا اعلان حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی نبی کی زبان سے نہیں کروایا گیا۔ اس لئے کہ ایک تو ان کے مخاطب صرف ایک جماعت تھی یا ایک قوم تھی، ایک چھوٹا سا زمانہ تھا لیکن حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب نوعِ انسانی تھی اور ہر نسل تھی جو آپ کی بعثت کے بعد قیامت تک اس دنیا میں پیدا ہونے والی تھی ابنائے آدم کی۔ تو فضل ہے نا اللہ تعالیٰ کا۔ جو اس کی معرفت رکھے گا وہ حمد باری تعالیٰ کرے گا، جو اس کی معرفت رکھے گا وہ علوم کے میدان میں ترقی کرے گا.........

تو ایک تو ایسا عظیم رسول (یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِہٖ) جو نعماء لے کے آیا ان میں سے پہلی نعمت ''آیات'' ہیں اور آیات میں سے صفاتِ باری کے وہ جلوے ہیں جو اس کائنات پر ظاہر ہوئے جس نے کائنات پیدا کی، جس نے کائنات میں وسعت پیدا کی (یہ بھی قرآن کریم میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ وسعت پیدا کر رہا ہے اس کائنات میں) جس نے کائنات کی ہر مخلوق کی صفات میں وسعت پیدا کی۔ جو علم قرآن کریم پر غور کرنے سے ہمیں حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ گندم کا دانہ جو دو سو سال پہلے پیدا ہوا تھا اس کی وہ صفات نہیں تھیں جو صفات اس دانے کی ہیں جو آج پیدا ہو رہا ہے۔ ہر وقت ہر آن خدا تعالیٰ کی صفات کے جلوے اپنی مخلوق کے ہر حصے پر ظاہر ہو رہے ہیں۔

تو ایک تو آیات کے یہ معنی ہیں اور دوسرے آیات کے معنی ہیں دعاؤں کا سننا اور قبول کرنا۔ عظیم انسان ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جنہوں نے بار بار ہمارے ذہن میں اور ہمارے دل میں یہ ڈالا کہ مایوس نہیں ہونا۔ دعا کرو خدا قبول کرے گا۔ یہ درست ہے کہ خدا تعالیٰ خالق اور مالک ہے قبول اس وقت کرے گا جب وہ چاہے گا لیکن یہ دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ کسی کی دعا ایک سیکنڈ میں قبول

ہو جاتی ہے۔ میرا اپنا تجربہ ہے۔ ابھی منہ سے الفاظ نہیں نکلتے کہ دعا قبول ہو جاتی ہے اور کوئی دعا قبول ہوتی ہے سال بعد دو سال بعد، تین سال بعد، چار سال بعد، جو دعا میں نے سپین کے ملک کے لئے کی کہ اللہ تعالیٰ اسے اسلام کی روشنی سے منور کرے، وہ قریباً نو ساڑھے نو سال بعد قبول ہوئی۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ جلدی قبول نہیں ہوگی، اپنے وقت پر پوری ہوگی۔ کتنا بڑا احسان ہے۔ جو شخص یہ یقین رکھتا ہو اور خدا تعالیٰ کی صفات کی معرفت کے بعد اس مقام پر کھڑا ہو کہ وہ قادر مطلق جس کے آگے کوئی چیز انہونی نہیں وہ میری دعا قبول کرے گا اگر چاہے گا۔ مقصد کے حصول کے لئے کوشش کرنی ہے دعا میں۔ دعا کو شرائط کے ساتھ کرنا ہے خدا تعالیٰ سے کبھی ناامید نہیں ہونا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دعا کی قبولیت کا نشان اُمتِ محمدیہ کے ہاتھ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پکڑا دیا۔

تیسرے معنی آیت کے ہیں، نشانات کا ظاہر ہونا۔ مثلاً خدا تعالیٰ نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بے شمار نشانات ظاہر کئے۔ نشانات یعنی اپنی قدرت کا نشان (بغیر دعا کے نشان ہے یہ) خدا تعالیٰ خود اپنے بندوں کی مدد کے لئے آتا ہے جب مدد کی ضرورت ہو۔ فراخی رزق کے لئے سامان پیدا کرتا ہے جب انہیں دشواری ہو، کھانے پینے کی چیزیں نہ مل رہی ہوں۔ اس وقت آسمان میں بادلوں کو حکم دیتا ہے موقع کے اوپر صحیح مقدار میں جا کے بارش برساؤ تا کہ میرے جو بندے ہیں، بھوکے نہ رہیں۔ اسے ہم نشان کہتے ہیں۔ معجزات یعنی انہونی باتیں بظاہر وحی کے ذریعے ان کی بشارت دی جاتی ہے اور وہ کام ہو جاتا ہے بالکل ناممکن کام لیکن بشارت دی جاتی ہے، کام ہو جاتے ہیں۔

تیسرے معنی آیات کے یہ ہیں یعنی معجزات اور معجزات کے ساتھ ہی میں چوتھے معنی کو بریکٹ کر دیتا ہوں اور وہ مبشرات ہیں خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں بڑی بشارتیں دیں ہیں مومنوں کو، جو ایک علیحدہ شعبہ ہے، روحانی زندگی کا۔ یہ دونوں میں نے معجزات اور مبشرات اس لئے اکٹھے کئے کہ مثلاً وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ (اٰلِ عمران: ۱۲۴) ایک تو یہ معجزہ تھا کہ تین سو تیرہ غریب بھوکے، کمزور ہوئے، ہوئے بھوک سے، مانگی ہوئی تلواریں پھر زنگ آلود نیزے کند تلواریں لے کر ایک عظیم لشکر (جس کی تعداد تین گنے سے بھی زیادہ تھی) کے مقابلہ میں آئے۔ سواریاں دشمن کے پاس تھیں، زرہیں ان کے پاس تھیں، اچھی تلواریں ان کے پاس تھیں۔ ہر طرح اچھے ہتھیاروں سے وہ لیس تھے اور اللہ تعالیٰ نے عظیم معجزہ دکھا دیا اس معجزے میں دعا بھی شامل تھی لیکن اگر کوئی دعا نہ ہوتی

تو بھی خدا تعالیٰ نے یہ معجزہ دکھانا تھا کیونکہ یہ وعدہ دیا گیا تھا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غالب آئیں گے اپنے مخالفوں پر۔ بشارت پہلے سے موجود تھی۔

اور پانچویں آیات کے معنی ہیں وہ آیاتِ قرآنی جن آیات میں شریعت اور ہدایت کا ذکر ہے مثلاً یہ کہ نماز پڑھو، ذکر الٰہی میں مشغول رہو........تو یہ جو آیات ہیں کئی سو جن میں احکامِ باری تعالیٰ ہیں، اوامر و نواہی، ان کو بھی قرآن کریم نے آیت کہا ہے........

دوسری چیز آپ یہ لے کے آئے وَ يُزَكِّيْهِمْ میں بہت سارا ابہام لوگوں نے پیدا کر لیا۔ ابہام کوئی نہیں۔ آپ ایسی تعلیم لے کے آئے جو طہارت اور پاکیزگی پیدا کرنے والی ہے۔ طہارت اور پاکیزگی کا معیار تسلیم کرنا یا مقرر کرنا یہ انسان کا کام نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اس واسطے صحیح معنی ہیں اور سچے طور پر مزکی پاک کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

آپ ایسی تعلیم لے کے آئے۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ یہ چار چیزیں ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اور شریعت کے اوپر جو عمل کرنا ہے اس کے نتیجے میں اُمتِ محمدیہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکے اور اُمتِ مسلمہ کے مومنین کی جو جماعت صدیوں میں پیدا ہوئی اور گزری ان کے لئے یہ ممکن کر دیا کہ خدا کی نگاہ میں وہ پاک اور مطہّر ہو جائیں اور سارے وعدے ان کے حق میں پورے ہوں جو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک مطہّر اور مزکی کے لئے دیئے ہیں۔ مثلاً ان میں سے ایک یہ ہے کہ خدا ہمکلام ہوگا۔ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعۃ:۸۰) قرآن کریم میں ایک وعدہ یہ دیا گیا ہے کہ قرآن کریم کے مخفی معانی جن کا ضرورت زمانہ یا خطۂ ارض کی ضرورت مطالبہ کر رہی ہے۔ وہ نئے نئے علوم پاک لوگوں کو سکھائے جائیں گے۔ قرآن کریم نے یہ وعدے کئے ہیں۔ بہت سارے وعدے ہیں۔ تفصیل میں جانا مشکل ہے۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے ایک جگہ اس طرح بیان کیا کہ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا تم میں سے کوئی کبھی بھی پاک اور مطہّر اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہ ٹھہر سکتا۔ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ (النّور:۲۲) لیکن خدا تعالیٰ جسے پسند کر لیتا ہے، اس کے اعمال کے نتیجہ میں، اس کے دل میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے نتیجہ میں، اس عرفان کے نتیجہ میں جو وہ خدا تعالیٰ کی صفات کا حاصل کر سکا، خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم کے نتیجہ میں،

اسے وہ مزکی قرار دیتا ہے۔ وَ اللّٰہُ سَمِیْعٌ دعاؤں کو سننے والا ہے اس واسطے جو مطہر بننا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ جو مزکی بنانے والا ہے اس سے یہ دعا کرے کہ اے خدا! ایسے اعمال صالحہ بجالانے کی ہمیں توفیق عطا کر کہ ہم تیری نگاہ میں پاک اور مطہّر بن جائیں اور عَلِیْمٌ (النّور:۲۲) کہہ کر یہ بتایا کہ انسانوں نے جو جائزے لئے اور اربعہ لگایا اور فیصلے کئے وہ تمہیں نہیں بنائیں گے مزکی، خدائے علیم جس کی نگاہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں جب اس کی نگاہ میں تم مزکی قرار دیئے جاؤ گے تو حقیقتاً تمہارے حق میں وہ بشارتیں پوری ہوں گی جو خدا تعالیٰ نے پاک اور مطہّر لوگوں کو دی ہیں۔ تزکیہ کے لفظ کے متعلق بڑا اچھا نوٹ مفردات راغب (جو قرآن کریم کی لغت ہے) میں امام راغبؒ نے دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ تزکیہ یہ ہے کہ اَنْ یَتَحَرَّی الْاِنْسَانُ مَا فِیْہِ تَطْہِیْرُہٗ کہ انسان اپنی طرف سے ایسے اعمال بجالانے کی کوشش کرے جن میں اس کے لئے پاکیزگی ہو جنہیں وہ اپنے لئے پاکیزہ سمجھے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں فاعل اللہ ہوتا ہے۔ اس لئے جو آیت میں نے پڑھی وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ اس کے متعلق وہ کہتے ہیں کبھی فاعل تزکیہ عطا کرنے کا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے لِکَوْنِہٖ فَاعِلٌ لِذٰلِکَ فِی الْحَقِیْقَۃِ کیونکہ حقیقی معنی میں خدا تعالیٰ ہی کسی کو پاک اور مطہّر بنا سکتا ہے اسی واسطے کہتے ہیں وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ پاکیزگی عطا کر سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کبھی فاعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے ہیں جو پہلی آیت میں نے پڑھی ہے اس میں بھی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیْہِمْ امام راغبؒ کہتے ہیں کہ جہاں یہ ذکر ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پاک اور مطہّر بناتے ہیں اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو حقیقی پاکیزگی خدا تعالیٰ عطا فرماتا ہے وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عطا کرتے ہیں۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ آپ پاکیزگی ان تک پہنچانے کا واسطہ بنتے ہیں کیونکہ آپ ایسی تعلیم لائے، ایسا نمونہ پیش کیا اور ایسی آیات لوگوں کے سامنے رکھیں۔ اس لئے بطور فاعل آپ ان آیتوں میں آجاتے ہیں واسطہ ہونے کی وجہ سے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے پاک بنایا یہاں یہ مطلب ہے کہ آپ کے واسطہ سے اور آپ کے طفیل لوگ پاکیزگی اور طہارت حاصل کرتے ہیں اور کبھی احکام اوامر و نواہی کے متعلق آتا ہے قرآن کریم میں کہ یہ کام جو ہیں، عبادات جو ہیں، احکام بجالانا جو ہے، یہ پاکیزگی پیدا کرتے ہیں۔ امام راغبؒ کہتے ہیں یہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ جب وہ اعمال مقبول

ہو جائیں تو ان کے ذریعہ سے انسان طہارت اور پاکیزگی خدا تعالیٰ سے حاصل کرتا ہے۔ حقیقی، مزکی جو ہے اللہ تعالیٰ کی ذات ہے لیکن مختلف معانی میں کبھی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا گیا ہے کہ آپ پاک کرتے ہیں، کبھی احکام کے متعلق یعنی قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ تعلیم پاک کرتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ حکم دیا ہے فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النجم : ۳۳) اپنے آپ کو پاک مت ٹھہرایا کرو۔ خوف اور خطرے کا مقام ہے کہ انسان اپنے آپ کو پاک قرار دے۔ اسی لئے خودکو پاکباز ٹھہرانے کی مذمت کی گئی ہے۔ مفرداتِ راغبؒ میں بھی یہ لکھا ہے۔

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ اس کے انہوں نے دو پہلو لئے ہیں کہ ایسا کرنا مذموم ہے اور یہ کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دونوں چیزیں اس کے اندر آجاتی ہیں۔ تو دو عظیم رحمتیں، رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ، اُمتِ مسلمہ کے لئے، نوعِ انسانی کے لئے عموماً اور جماعتِ مومنین کے لئے خصوصاً لے کر آئے جنہوں نے ان سے فائدہ اٹھایا۔

تیسری عظیم چیز آپ لے کے آئے الکتاب۔ قرآن کریم کو قرآن کریم میں الکتاب کہا گیا ہے اور اَلْکِتَاب کے شروع میں ہی ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (البقرۃ : ۳) کی آیت اَلْکِتَاب کے صحیح اور پورے معنی بتا رہی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ میں جو خدائے عالم الغیب ہوں، اس کتاب کو اتارنے والا ہوں تو اس کا سورس (Source) اور منبع جو ہے وہ عالم الغیب خدا کی ذات ہے یہ وہ کتاب ہے جس نے خدا تعالیٰ کے علم سے خلعتِ وجود پہنا۔ اس لئے یہ کتاب ہر ایک غلطی اور شک وشبہ سے پاک ہے اور اس لئے یہ کتاب کامل متقیوں کے لئے بھی ہدایت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی فطرت تدریجی ترقی کرتی ہے، جسمانی نشوونما میں بھی، اخلاقی نشوونما میں بھی اور روحانی نشوونما میں بھی۔ تو ایک متّقی جو ہدایت کی راہوں پر چل کے خواہ کتنا ہی بلند ہو جائے، مزید بلندیوں کے دروازے اس پر اس عظیم کتاب کے ذریعہ سے کھولے جاتے ہیں حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے ایک فقرے میں اس سارے مفہوم کو بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

’’یہ وہ کتاب ہے جو خدا تعالیٰ کے علم سے ظہور پذیر ہوئی ہے اور چونکہ اس کا علم جہل اور نسیان سے پاک ہے اس لئے یہ کتاب ہر ایک شک وشبہ سے خالی ہے اور چونکہ

خدا تعالیٰ کا علم انسانوں کی تکمیل کے لئے اپنے اندر ایک کامل طاقت رکھتا ہے اس لئے یہ کتاب متقین کے لئے ایک کامل ہدایت ہے اور ان کو اس مقام تک پہنچاتی ہے جو انسانی فطرت کی ترقیات کے لئے آخری مقام ہے (جہاں تک پہلے کوئی نہیں پہنچا)''

(حقیقۃ الوحی۔روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۳۶)

تو یہ تیسری عظیم چیز جو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے وہ الکتاب ہے جیسا کہ فرمایا وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ۔

اور چوتھی چیز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لائے وہ ہے حکمت۔اور حکمت کے معنی ہیں حقیقتِ کتاب اور حقیقتِ رسالت یعنی قرآن کریم کی اصطلاح کی رو سے جو اس کتاب کی حقیقت ہے اور جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی عظمت ہے اس کے دلائل پیش کرنا حکمت کے معنی میں شامل ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد نہم صفحہ ۲۱۸ تا ۲۲۶)

آیت ۱۷۶ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۶﴾

شیطان اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے۔جو لوگ شیطان کے دوست بن جاتے ہیں اور خدا کے دوست نہیں رہتے ان کے دل میں شیطان خوف پیدا کرتا ہے کہتا ہے دیکھو! دولت چلی گئی تو پھر پتہ نہیں تمہیں ملے یا نہ ملے اور وہ بیوقوف یہ نہیں سمجھتا کہ پہلے جو دولت آئی تھی وہ شیطان نے تو نہیں دی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس دولت کو پیدا کیا۔اور ان طاقتوں کو بھی پیدا کیا جن کی بدولت اسے وہ دولت ملی۔ اس کا اپنا تو کچھ نہیں۔

اسی طرح جو شخص صاحب اقتدار بن جاتا ہے سیاسی میدان میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے تو پھر وہ کہتا ہے اگر میں انصاف کروں تو شاید میرا اقتدار جاتا رہے کیونکہ صاحب اقتدار لوگوں سے بے انصافی کے تقاضے بھی کئے جاتے ہیں۔ان سے ظلم کے تقاضے بھی کئے جاتے ہیں۔آخر شیطان کو قیامت تک جو مہلت دی گئی ہے تو اس کا یہی مطلب تھا کہ شیطان کو قیامت تک دوست ملتے رہیں گے جن کو وہ ڈراتا اور خوف دلاتا رہے گا۔چنانچہ مطالبہ ہوتا ہے کہ فلاں حصہ ملک پر یا فلاں جماعت پر یا فلاں گروہ

پر ظلم کرو ورنہ ایجی ٹیشن ہوگی، ورنہ اقتدار تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

(خطباتِ ناصر جلد چہارم صفحہ ۳۹۶،۳۹۷)

آیت ۱۸۱، ۱۸۲ وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۱﴾ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۲﴾

اللہ تعالیٰ ان آیات میں فرماتا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں سب کچھ دیتا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی اس دین میں سے مالی قربانیاں پیش نہیں کرتے بلکہ بخل سے کام لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا اپنے اموال کو خدا کی راہ میں خرچ نہ کرنا دنیوی فوائد پر منتج ہو گا اور اسی میں ان کی بھلائی ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے اموال کو خرچ کریں گے تو انہیں نقصان ہوگا ان کا خدا کی راہ میں اموال خرچ کرنا ان کے لئے خیر کا موجب نہیں ہوگا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ خیال درست نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ (شَرٌّ لَّهُمْ) ایسا کرنا ان کے لئے بہتر نہیں بلکہ ان کے لئے ہلاکت اور بُرائی کا باعث بنے گا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو وہ مول لینے والے ہوں گے اس بخل کے دو قسم کے نتائج نکلیں گے ایک اس دنیا میں اور ایک اس دنیا میں جو شخص بخل سے کام لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کی راہ میں اپنے اموال کو خرچ نہیں کرتا وہ اس دنیا میں جہنم میں پھینکا جائے گا اور وہاں اسے ایک نشان دیا جائے گا جس سے سارے جہنمی سمجھ لیں گے کہ وہ اس لئے اس جہنم میں آیا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے اموال خرچ نہیں کیا کرتا تھا سَيُطَوَّقُوْنَ ان کے گلے میں ایک طوق ڈالا جائے گا اور وہ طوق تمثیلی زبان میں ان اموال کا ہوگا جو اس دنیا میں خدا کی راہ میں خرچ نہ کر کے وہ بچایا کرتے تھے اور اس طوق کی وجہ سے ہر وہ شخص جو جہنم میں پھینکا جائے گا جان لے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں کہا گیا تھا کہ اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اور خدا کو راضی کرنے کے

لئے اپنے اموال اس کے سامنے پیش کرو مگر انہوں نے اس کی آواز نہ سنی اور اس کے رسول کی آواز پر لبیک نہ کہا اور دنیا کے اموال کو اُخروی بھلائی پر ترجیح دی اور نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آج یہ جہنم میں ہیں اور ذلت کا عذاب انہیں دیا جا رہا ہے جہنم کے عذاب میں تو سارے شریک ہیں لیکن یہ طوق بتا رہا ہوگا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اموال کی تو حفاظت کیا کرتے تھے لیکن اپنی جانوں کی حفاظت نہیں کیا کرتے تھے اپنی ارواح کی حفاظت نہیں کیا کرتے تھے۔

ایک نتیجہ اس بخل کا اس دنیا میں نکلے گا اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کی ہر شے اللہ کی میراث ہے اور میراث کے ایک معنی لغت نے یہ بھی کئے ہیں کہ ایسی چیز جو بغیر کسی تکلیف کے حاصل ہو جائے پس اللہ تعالیٰ جو خالق ہے ربّ ہے اور جس کی قدرت میں اور طاقت میں ہر چیز ہے جس کے کُنۡ کہنے سے ساری خلق معرض وجود میں آئی ہے کسی چیز کے پیدا کرنے یا اس کے حاصل کرنے میں اسے کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی اور جب ہر چیز اللہ ہی کی میراث اور ملکیت ہے تو جو شخص بھی اللہ کو ناراض کرے گا وہ اس دنیا میں اموال کی برکت سے محروم ہو جائے گا یا کوئی اور دکھ اس کو پہنچایا جائے گا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ایک مثال دی اور وہ یہود کی مثال ہے کہ جب مسلمانوں کو یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں اپنے اموال کو خرچ کرو تو یہود میں سے بعض کہتے ہیں کہ اچھا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ ہوا فقیر اور ہم ہوئے بڑے امیر ہمارے اموال کی خدا کو ضرورت پڑ گئی ہے اس لئے وہ ہم سے مانگ رہا ہے اسی پر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا چونکہ بخل کے ساتھ ذات باری کا استہزا بھی شامل ہو گیا ہے اس لئے انہیں عذاب حریق یعنی ایک جلن والا عذاب دیا جائے گا اور ان لوگوں کو جنہوں نے اس قسم کے فقرے مسلمانوں کو ورغلانے اور بہکانے کے لئے کہے تھے اسی دنیا سے جلن کا عذاب شروع ہو گیا تھا۔ اسلام ترقی کرتا چلا گیا اور وہ لوگ جو غریب تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانیوں کو قبول کرتے ہوئے ساری دنیا کے اموال ان کے قدموں پر لا رکھے اور جو مخالف بھی خدا تعالیٰ کے ان فضلوں اور انعاموں کو دیکھتا تھا وہ اس بات کا مشاہدہ کرتا تھا کہ سچا ہے وہ جس نے کہا تھا کہ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور جو شخص مخالفت کو چھوڑنے کے لئے بھی تیار نہیں تھا اس کے دل میں ایک جلن پیدا ہوتی تھی یہ دیکھ کر کہ یہ لوگ غریب تھے ہمارے محتاج تھے ہم ہی ان کی ضرورتیں پوری کرتے تھے اور ہمارے

بغیر ان کی ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتی تھیں (ان دنوں جو یہود عرب میں آباد تھے وہ عربوں کو قرض دیا کرتے تھے) غرض انکے دلوں میں یہ دیکھ کر جلن پیدا ہوتی تھی کہ یہ بہت تھوڑے عرصہ میں یعنی چند سال کے اندر اندر اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانیوں کو قبول کر کے اس قسم کے نتائج نکالے ہیں کہ ساری دنیا کی دولت ان کے قدموں پر لا ڈالی ہے۔

(خطباتِ ناصر جلد ۲ صفحہ ۳۳۸ تا ۳۴۰)

آیت ۱۸۹، ۱۹۰ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۸۹ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۹۰

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یقین رکھو کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ نہیں ہیں جو اپنے کئے پر اتراتے ہیں۔ یہ کئے پر اترانے والے دنیادار بھی ہوتے ہیں اور مذہب کے نام پر اترانے والے بھی ہوتے ہیں۔ مذہبی گروہ اپنے جتھے پر اترانے لگ جاتے ہیں اپنے مال و دولت پر اترانے لگ جاتے ہیں، اپنی طاقت پر اترانے لگ جاتے ہیں، اپنی تنظیم پر اترانے لگ جاتے ہیں، اپنی فوجوں پر اترانے لگ جاتے ہیں۔ ہزاروں وجوہ ہیں اترانے کی۔ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی فوج کو اتنا مضبوط کر لیا، ہم نے اپنے نظام اقتصادیات کو ایسا بنا لیا، ہماری زراعت ایسی ہوگئی، ہم نے پانی کا یہ انتظام کر لیا، ہم نے ایٹم بم بنا لیا۔ (پہلے تو یہ مذہبی گروہ نے ہی بنایا تھا یعنی عیسائی دنیا نے جو کہ کیپٹلسٹ (Capitalist) کہلاتے ہیں) جو لوگ اپنے کئے پر اتراتے ہیں اور صرف اپنی ذات یا اپنے جتھے یا اپنی قوم یا اپنے ملک پر بھروسہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا زندہ تعلق نہیں ہوتا کہ جس کی طاقت پر وہ بھروسہ کرنے والے ہوں اور پھر انہوں نے جو کام نہیں کیا ہوتا وہ سمجھتے ہیں کہ اس پر بھی ان کی تعریف کی جائے حالانکہ انہوں نے کام نہیں کیا ہوتا لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ یہ نہ سمجھو کہ وہ خدا کے عذاب سے محفوظ ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے لیکن وہ گروہ اور وہ جماعت جو اللہ کا نام لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کو بلند کرنے کے لئے اور اسلامی تعلیم کو دنیا میں پھیلانے

کے لئے اپنی کمزوریوں کے باوجود کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ جو کچھ خدا کے حضور پیش کرتے ہیں ان کے اوپر بھی وہ اتراتے نہیں اور فخر نہیں کرتے اور جو کام انہوں نے نہیں کیا ہوتا اس کے متعلق تو شیخی مارنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ کے قہر کے عذاب سے محفوظ ہیں لیکن ان کا مدِّ مقابل اللہ تعالیٰ کی گرفت میں ہے اور قرآن کریم کی بشارتوں کے مطابق جو مسلمانوں کے حق میں دی گئی ہیں اور قرآن کریم کے انذار کے مطابق جو معاندین اسلام کے متعلق دیا گیا ہے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اپنے پر بھروسہ کرنے والے اور جو طاقت نہیں ہے اس کا بھی اعلان کرنے والے کامیاب نہیں ہوا کرتے۔ اخباریں پڑھنے والے اور دنیا کے حالات کا علم رکھنے والے دوست جانتے ہیں کہ آجکل سیاسی لیڈر وہ تعلّیاں مارتے رہتے ہیں کہ آدمی حیران ہوتا ہے مثلاً ہٹلر نے اپنے وقت وہ شور مچایا تھا کہ بس اس کے پاس ایسی طاقت ہے اور ایسے مخفی ہتھیار ہیں کہ وہ ساری دنیا کو کھا جائے گا حالانکہ وہ ہتھیار نکلے نہیں۔ وہ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا کے آیت کے ٹکڑے کے نیچے آ گیا نا کہ وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ ایسے ہتھیار بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں جو دنیا کو زیر کرنے کے لئے کافی ہیں اور ان کا مدِّ مقابل کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔ دنیا جو کرتی ہے اور دنیا جو نہیں کرتی اس کا یہاں ذکر ہے جو وہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جو ان کی طاقت ہے اس پر وہ فخر کرنے لگتے ہیں اور تکبر سے کام لیتے ہیں اور اپنے مفاد کی خاطر انسانوں کے حقوق کو پامال کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں وَ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا اور دوسروں کو ڈرانے کے لئے وہ بڑے مبالغہ آمیز بیانات دیتے ہیں یا بعض دفعہ اپنے ملک کو خوش کرنے کے لئے بھی سیاسی لیڈر ایسا کرتے ہیں۔ فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ یہ لوگ ناکامی کے عذاب سے محفوظ نہیں رہ سکتے اور جو لوگ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والے ہیں اور خدا تعالیٰ کی جماعت ہیں وہی خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ کامیاب ہوتے ہیں۔

خدا تعالیٰ تمام قدرتوں اور طاقتوں کا مالک ہے وہ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہے جس چیز کو چاہے اسے کر دیا کرتا ہے اور کوئی اسے ناکام کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ کائنات میں اسی کا حکم چلتا ہے اور اس کے منشا کے مطابق ہر کام ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اسلام کے غلبہ کے لئے اس زمانہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کا محبوب ترین روحانی فرزند مہدی پیدا ہو تو مہدی پیدا ہو گیا۔ اس نے چاہا کہ اس مہدی کی اس ظاہری اور مادّی دنیا میں اس قدر مخالفت ہو کہ اس کی کامیابی کا کوئی امکان

ظاہری آنکھ کو نظر نہ آئے تو وہ مخالفت پیدا ہوگئی اور پھر اس نے یہ چاہا کہ اس کے باوجود جو کچھ ظاہری آنکھ نے دیکھا تھا وہ نہیں ہوگا اور مہدی ناکام نہیں ہوگا۔ مہدی کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا ہے جیسا کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں مختلف میدانوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی جھنڈے تھے۔ کسریٰ کے مقابلہ میں مسلمان فوجوں کے جو سپہ سالار تھے ان کے ہاتھوں میں جو جھنڈے تھے یا قیصر کے مقابلہ میں شام کے میدانوں میں مسلمانوں کے سپہ سالاروں کے ہاتھوں میں جو جھنڈے تھے وہ ان کے اپنے تو نہیں تھے اور نہ خلفائے وقت کے تھے بلکہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تھے۔ اسی طرح آج اسی معنی میں محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کا جھنڈا مہدی کے ہاتھ میں ہے۔ خدا نے یہ چاہا کہ دنیا کی طاقتوں کو اس کے خلاف کھڑا کرے اور دنیا کو یہ بتائے کہ اگر تم سارے اکٹھے ہو کر بھی میری اس سکیم اور میرے اس منصوبہ کو ناکام کرنے کی کوشش کرو گے تو تم ناکام ہی ہو گے۔ (خطباتِ ناصر جلد ششم صفحہ ۴۰۹ تا ۴۱۱)

آیت ۱۹۱ تا ۱۹۶ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۱﴾ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ فَاٰمَنَّا ٭ۖ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ کَفِّرۡ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ ﴿۱۹۴﴾ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدۡتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَ لَا تُخۡزِنَا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اِنَّکَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ ﴿۱۹۵﴾ فَاسۡتَجَابَ لَہُمۡ رَبُّہُمۡ اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ۚ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَالَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا وَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ وَ اُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ قٰتَلُوۡا وَ قُتِلُوۡا لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَ لَاُدۡخِلَنَّہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا

الْاَنْھٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۶﴾

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے میں عقلمندوں کے لئے یقیناً کئی نشانات ہیں۔ وہ عقلمند جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بارہ میں غور وفکر سے کام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو نے اس عالم کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا۔ تو ایسے بے مقصد کام کرنے سے پاک ہے۔ پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا اور ہماری زندگی کو بے مقصد بننے سے بچالے۔ اے ہمارے رب جسے تو آگ میں داخل کرے گا اسے تو تو نے یقیناً ذلیل کر دیا اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا۔ اے ہمارے رب ہم نے یقیناً ایک ایسے پکارنے والے کی آواز جو ایمان دینے کے لئے بلاتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، سنی ہے پس ہم ایمان لے آئے اس لئے اے ہمارے ربّ! تو ہمارے قصور معاف کر اور ہماری بدیاں ہم سے مٹا دے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ ملا کر وفات دے۔ اور اے ہمارے رب! ہمیں وہ کچھ دے جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبان پر ہم سے وعدہ کیا ہے اور قیامت کے دن ہمیں ذلیل نہ کرنا تو اپنے وعدہ کے خلاف ہرگز نہیں کرتا۔ (ہم سے گناہ ہوجاتے ہیں ہمیں گناہوں سے بچا) چنانچہ ان کے رب نے یہ کہتے ہوئے ان کی دعا سن لی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو خواہ مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کروں گا۔ تم ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے ہو۔ پس جنہوں نے ہجرت کی اور انہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا اور میری راہ میں تکالیف دی گئیں اور انہوں نے جب دفاعی جنگیں کیں اور اپنی جانیں خدا کی راہ میں قربان کیں اور مارے گئے۔ میں ان کی بدیوں کے اثر کو ان کے جسم سے یقیناً مٹا دوں گا اور میں انہیں یقیناً ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ انعام اللہ تعالیٰ کی طرف سے بدلہ کے طور پر ملے گا اور اللہ تعالیٰ تو وہ ہے جس کے پاس بہترین جزا ہے۔

ان آیات میں ایک لمبا مضمون بیان ہوا ہے لیکن میں نے اس مضمون کا ایک حصہ آج کے خطبہ کے لئے منتخب کیا ہے۔ ویسے اس کی بھی شاید تفصیل میں میں نہ جا سکوں کیونکہ صبح سے پیٹ میں تکلیف کی وجہ سے مجھے ضعف کی شکایت ہے۔

پہلی بات ان آیات سے ہمیں یہ پتا لگتی ہے کہ آسمان اور زمین کی پیدائش یعنی کائنات کی ہر شے ایک آیت ایک نشان ہے۔ ایک ایسی چیز ہے جو ہمیں پتا بتاتی ہے حقائق کا۔ جو ہمیں پتا دیتی ہے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات اور اس کی عظمت اور اس کے جلال اور اس کی قدرت کا۔ ہر چیز ہماری راہنمائی کر رہی ہے ہمارے پیدا کرنے والے رب کی طرف اور صرف مادی اشیاء ہی نہیں بلکہ اس کائنات کو ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک تو مادی اشیاء ہیں جن کو آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے زمانہ ہے اور اس کو وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

زمانہ اپنے اثرات دکھاتا ہے ان جہانوں میں اور زمانہ سے پیدا ہونے والا ہر اثر ہمیں کوئی سبق دے رہا ہے۔ ہمیں کچھ سکھاتا ہے ہماری رہنمائی اور رہبری کرنے والا ہے تو یہاں یہ فرمایا کہ یہ کائنات جو ہے اس کے ہر دو حصے مادی حصہ بھی اور زمانہ بھی جو اپنی ذات میں ایک حقیقت ہے۔ زمانے کے اثرات مادی دنیا پر ہوتے ہیں مثلاً ان کا بڑا اور چھوٹا ہونا ہماری فصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بعض ایسے پودے ہیں جن کے لئے دنوں کا چھوٹا رہنا ضروری ہے۔ بعض ایسے پودے ہیں جن کے لئے چھوٹے دنوں کا اور لمبی راتوں کا ہونا ضروری ہے۔ بعض ایسے پودے ہیں جن کے لئے لمبے دنوں کا اور چھوٹی راتوں کا ہونا ضروری ہے۔ بعض ایسے پودے ہیں جن کیلئے سورج کی روشنی اور اندھیرے کی ایک جیسی لمبائی کا ہونا ضروری ہے۔ تو یہ زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ زمانہ ہر آن حرکت میں ہے اور فاصلے کی نسبتوں کو قائم کرنے والا ہے۔ کس قدر تیزی سے کوئی چیز چل رہی ہے یا کتنی دور ہے کوئی چیز۔ اس وقت اختصار کے ساتھ زمانہ کے متعلق اس حقیقت کو بیان کر دینا کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان کو ہم نے دو طاقتیں دی ہیں ایک ذکر کی اور ایک تفکّر کی اور جو عقل مند ہیں خالص اور صحیح عقل رکھنے والے عقل اور لُب میں یہ فرق ہے۔ عقل میں جب ہوائے نفس شامل ہو جائے اور وہ خالص نہ رہے تب بھی عربی زبان اسے عقل ہی کہتی ہے مثلاً آج کی مہذب دنیا جو دنیا میں ڈوب گئی اور خدا کو بھول گئی وہ بھی عربی زبان کے لحاظ سے عقلمند کہلائیں گے اگرچہ ان کی عقل میں ان کی ادنیٰ خواہشات اور میلانِ نفس کی بھی بڑی ملاوٹ آ گئی اور انہوں نے اپنی تسلی کے لئے گراوٹوں میں لذتیں محسوس کرنی شروع کر دیں اور اس کا جواز پیدا کر لیا اور اس حد تک چلے گئے یہ عقلمند کہ

انگلستان کی ملکہ کوسڈومی (Sodomy) بل پر دستخط کرنے پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ اس حد تک گراوٹ اور عقلمند بھی ہیں عربی زبان ان کے لئے عقل کا لفظ استعمال کرے گی لیکن عربی زبان ان کے لئے اُولُوا الْاَلْبَابِ کا لفظ نہیں استعمال کرے گی۔ اس واسطے کہ لُب کے معنے ہیں خالص عقل جو اپنی صفائی میں اور پیورٹی (Purity) میں انتہا کو پہنچ چکی ہو اس کو عربی زبان میں لُب کہتے ہیں تو یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے انسان کو خالص عقل دی تھی۔ اس نے اس کو اپنی نالائقیوں کی وجہ سے اور گری ہوئی خواہشات کے نتیجہ میں ناخالص بنادیا اور گدلا کر دیا لیکن وہ لوگ جنہوں نے خالص عقل کو قائم رکھا وہ اپنی ان دو طاقتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک ذکر سے ایک تفکّر سے۔ ذکر وہ کرتے ہیں ہر حالت میں یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ اور وہ تفکّر بھی کرتے ہیں تفکّر بھی وہ ہر حالت میں کرتے ہیں۔ اس آیت سے یہی واضح ہوتا ہے عربی میں (جیسا کہ مفسرین نے اس کی وضاحت کی ہے) ذکر اور تفکّر میں فرق ہے وہ کہتے ہیں کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ بدن اور روح سے۔ بدن سے تعلق رکھنے والی عبودیت کو ذکر کہتے ہیں اور قلب اور روح سے تعلق رکھنے والی عبودیت کو تفکّر کہتے ہیں اور کامل ذکر وہ ہے جو انسان کے تمام جوارح اور اعضا سے تعلق رکھتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں حکم دیا نماز پڑھنے کا اور نماز کے اندر قیام بھی ہے اور رکوع بھی ہے اور سجدہ بھی ہے اور قعدہ بھی ہے اور زبان کا ذکر بھی۔ یہ جسم کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ روزہ ہے اس کا ہمارے بدن کے ساتھ تعلق ہے۔ ہم اپنے جسم کو بھوکا رکھتے ہیں اور حج جو ہے اس کے جو ظاہری ارکانِ حج ہیں وہ ہمارے جسم سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ جس عبودیت کا تعلق بدن سے ہے اس کا نام ذکر ہے یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ اور جس عبودیت کا تعلق قلب اور روح کے ساتھ ہے اس کے متعلق کہا يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اور عبودیت کے ہر دو حصے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں یعنی جو ظاہری طور پر مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ اگر نماز میں دعا کرتے ہوئے رقت نہ پیدا ہو تو وہ مصنوعی طور پر رقت کی حالت پیدا کرے۔ آہستہ آہستہ اس کا دل بھی اس طرف حقیقی رقت کی طرف مائل ہو جائے گا اور جو قلب کی اور روح کی عبودیت ہے اس کے نتیجہ میں جسم جو ہے وہ بھی دل اور روح کے ساتھ خدا تعالیٰ کے سامنے جھکتا ہے اور اخلاص کے نتیجہ میں انسان کا جسم بھی اعمالِ صالحہ بجالاتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا ہے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ روایت منسوب ہوتی ہے تَفَکُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً کہ ایک گھڑی کا تفکّر ساٹھ سال کی عبادت ظاہری سے زیادہ بہتر ہے۔ظاہر ہے کہ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً یہاں اس عبادت کا ذکر ہے جس میں تفکّر نہیں۔قلب اور روح کا حصہ نہیں۔یعنی جس عبادت میں ہمارا دل شامل نہیں ہوا صرف ظاہر ہے، جس عبادت میں ہماری روح پگھل کے آستانۂ الٰہی پہ نہیں یہ بھی محض نمائش ہے اور ریا ہے آپ کو سمجھانے کے لئے سِتِّيْنَ سَنَةً کہہ دیا۔یعنی بلوغت کی ساری عمر کی کھوکھلی عبادت سے بھی زیادہ ہے کیونکہ وہ چھلکا ہے وہ تو کھوکھلی چیز ہے اس کے اندر تو کوئی حقیقت نہیں، کوئی اخلاص نہیں۔خدا تعالیٰ کے لئے کوئی پیار اور محبت نہیں، اس محبت کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ پر قربان ہونے کی کوئی خواہش نہیں۔خدا تعالیٰ کے لئے ہر چیز کو چھوڑ دینے کا کوئی عزم نہیں۔وہ عبادت تو خدا تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔

ان آیات کے بعد دعا کی تعلیم دی اور اس میں یہ ہمیں بتایا گیا کہ دعا کی قبولیت کے لئے کوئی وسیلہ ہونا چاہیے۔یعنی کوئی ایسی شکل ہونی چاہیے کہ دعا قبول ہو جائے۔ایسی دعا جو استحقاق پیدا کر رہی ہو خدا تعالیٰ کی نگاہ میں قبولیت کا اور یہاں جو پہلے بیان ہوا ہے وہ یہی ہے کہ ذکر اور فکر ہر دو سے تعلق رکھنے والی عبودیت کے جو تقاضے ہیں جب وہ پورے کئے جائیں تب دعا قبول ہوتی ہے۔اگر ایک شخص ساری رات جاگ کے دعا کرے اور ہر رات جاگ رہا ہو اپنی زندگی میں، لیکن عمل نہ کرے خدا تعالیٰ کے احکام پر اس کی دعا قبول نہیں ہوگی۔

دعا کی قبولیت کے لئے شرائط بیان کی گئی ہیں ان آیات میں اور یہی چیز میں اس وقت آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔بیان کی گئی ہیں یہ شرائط شروع میں بھی اور پھر آخر میں بھی۔پہلے تو یہ کہا کہ ذکر کرنے والے اور تفکّر کرنے والے جو ہیں وہ جسم کے لحاظ سے، بدن کے لحاظ سے بھی عبودیت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور قلب و روح کے لحاظ سے بھی عبودیت کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہیں اور یہاں جو ذکر اور فکر تھا اس کی روح یہ ہے کہ ہر وقت خدا کے ذکر میں مشغول رہنا اور خدا تعالیٰ کی جو مصنوعات ہیں جو خلق ہے اس سے دل کا، ذہن کا، روح کا صحیح استدلال قائم کرنا کیونکہ ہر چیز خدا تعالیٰ کی طرف پوائنٹ (Point) کر رہی ہے۔ایک نشان ہے جس طرح سڑکوں پر نشان ہوتا ہے۔''یہ راستہ جاتا ہے لاہور کی طرف۔'' خدا تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ہر شے جو ہے وہ نشان

ہے کہ یہ راستہ جاتا ہے خدا کو پہچاننے عرفان اور معرفتِ الٰہی کی طرف اور ذکر کرنا تفکر فی مصنوعات کرنا ربوبیتِ خداوندی کا اعتراف کرنا یہ شرائط قبولیت دعا ہیں۔ ذکر اللہ میں ہمیشہ مشغول رہنا۔ دل اور دماغ اور روح کے ساتھ تفکّر کرنا یعنی معرفت حاصل کر کے اور معرفت اور اس عرفان کا احساس دل اور روح میں بیدار رہنا۔ معرفت یہ نہیں ہے کہ کوئی چیز ملی اور جیب میں رکھ لی معرفت تو ایک احساس ہے جو روح میں پیدا ہوتا ہے جو احساس ہمیں یہ بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ بڑی عظمتوں والا خدا تعالیٰ بڑے جلال والا، خدا تعالیٰ بڑے حسن والا نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہے۔ ہر چیز پر وہ قادر ہے۔ کوئی چیز اس کے سامنے اَن ہونی نہیں۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے کوئی دنیا کی طاقت اس کے منصوبوں کو ناکام نہیں کر سکتی۔ وہ تمام صفاتِ باری جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنی بیان کی ہیں ان سب کو اپنے ذہن میں، اپنے دل میں، اپنے مائنڈ (Mind) میں، قلب میں حاضر رکھنا اور روح کا اس احساس سے لذّت حاصل کرنا یہ ہیں شرائط قبولیت دعا۔

تو ربوبیتِ خداوندی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی حمد و ثنا میں مشغول رہنا اور اس یقین پر قائم ہونا کہ خدا تعالیٰ کا کوئی فعل عبث اور باطل نہیں ہے۔ بے حکمت نہیں ہے۔ مصلحتوں سے خالی نہیں ہے۔ ہر چیز جو اس نے پیدا کی وہ کسی مصلحت کے نتیجہ میں پیدا کی اور انسان کو بھی اس نے کسی مصلحت کے لئے پیدا کیا جس کا ذکر قرآن کریم نے یہ کہہ کے کیا ہے کہ میں نے اس لئے پیدا کیا ہے اے انسان تجھے کہ تو خدا تعالیٰ کا عبد بننے کی کوشش کرے اور اپنی تمام طاقتوں پر اس کا رنگ چڑھا کے اس کے حسن میں سے حصہ لے جو تیرے دل نے اور تیری روح نے خدا کے وجود میں دیکھا اور مشاہدہ کیا اور پھر شرط لگائی ہجرت کی اور مجبور کر کے وطن سے بے وطن کئے جانے کی۔ اس کے ایک ظاہری معنی ہیں ایک صوفیا نے معنی کئے ہیں اور انہوں نے یہ معنی کئے ہیں کہ اپنے نفس سے دوری یعنی اپنے نفس کی خواہشات کو پورا نہ کرنا اپنے نفس کا ایک وطن ہے اس کی عادتیں ہیں جہاں وہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ ان کو چھوڑنا خدا کے لئے بے نفس ہو جانا جن چیزوں سے محبت اور پیار ہے ان کو ترک کر دینا۔ خدا تعالیٰ کے لئے ایذا کو برداشت کرنا اور ایذا کو ایذا نہ سمجھنا اور جو شیطانی وساوس کی یلغار ہو انسان پر اس کے خلاف جنگ لڑنا، دفاعی جنگیں کرنا۔

پس صوفیا اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ شیطانی وسوسوں کے خلاف جنگ کرنا کامیابی کے ساتھ اور

شیطان کو کسی صورت میں یہ اجازت نہ دینا کہ وہ جسے خدا نے اپنا بندہ بنانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسے شیطان اپنا بندہ بنادے اور خدا کی راہ میں قربان ہوجانا شہادت پانا اور ہر چیز قربان کر کے بھی خدا تعالیٰ کی ناراضگی مول نہ لینے کے سامان پیدا کرنا۔ یعنی یہ نہ برداشت کرنا کہ خدا ناراض ہوجائے۔ دنیا جائے، رشتہ دار جائیں، تعلقات ٹوٹیں اپنے بیگانے ہوجائیں، جو ہوسو ہولیکن انسان خدا تعالیٰ کے لئے اپنے نفس پر ایک موت وارد کرے۔ صوفیا اس کو شہادت کہتے ہیں اور ظاہری طور پر بھی پھر بسا اوقات بعض لوگوں کو خدا کے حضور جان پیش کرنی پڑ جاتی ہے۔

تو یہ دس شرائط یہاں قبولیت دعا کی بیان ہوئی ہیں جن کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں دعا کی قبولیت کا حق (اسی کے کہنے پر) پیدا کرلیتی ہے ورنہ انسان کا کوئی حق نہیں خدا پر۔ لیکن خدا کہتا ہے اگر یہ دس باتیں تم اپنے اندر پیدا کرو گے تو میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سارا دن خدا کو بھولے رہو۔ ساری راتیں اپنی غفلت میں بسر کرو اور پانچ منٹ خدا کے حضور دعا کرو اور سمجھو کہ خدا پر قرض ہوگیا کہ خدا تمہاری دعاؤں کو قبول کرے۔ اسے تمہاری حاجت نہیں تمہیں خدا کی حاجت ہے۔ سارے کا سارا خدا کا ہوجانا جسمانی لحاظ سے بھی، قلبی اور روحانی لحاظ سے بھی اور جیسا کہ ابھی میں نے بتایا ذکر اللہ میں مشغول رہنا قلب و روح کا مصنوعاتِ باری میں تفکر کرنے کے بعد صحیح نتائج نکالنا، ربوبیتِ خداوندی کا اعتراف کرتے ہوئے حمد وثنا میں مشغول رہنا، اللہ تعالیٰ کو ہر ایسی چیز سے پاک سمجھنا جو اس کی طرف عبث اور باطل چیز کو منسوب کرنے والی ہو، تا اس کی راہ میں ہجرت کرنا، بے وطنی کو قبول کرنا، ہر قسم کی اندرونی اور بیرونی ایذا کو برداشت کرنا، شیطانی حملوں کا کامیاب مقابلہ کرنا اور فنا کی حالت اپنے پر طاری کرلینا۔ خدا کہتا ہے میں ایسے بندوں کی دعائیں اپنے فضل سے سنتا ہوں اور قبول کرتا ہوں۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی بات منوائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا کے فضل سے ہی انسان جنت میں جاتا ہے اپنے کسی عمل سے نہیں۔ یہاں بھی خدا تعالیٰ نے جب دعا قبول کر کے ثواب دینے کا ذکر ہوا ہے تو وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فرمایا کہ میرے فضل سے جنتیں مل گئیں خدا کی رضا کی۔ یہ نہیں کہا تم نے دس شرائط پوری کیں اس لئے اس نے جنت میں بھیج دیا۔ یہ کہا ہے ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ یہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ثواب ہے۔ تمہارے اپنے عمل کا نتیجہ

پھر بھی وہ نہیں ہوگا۔لیکن تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ خدا تعالیٰ اگر چاہے تو تم سے پیار کرے۔

باقی جو خود ناپاک بنتا ہے خدا تعالیٰ جو پاکوں کا پاک ہے۔اس ناپاک سے کیسے پیار کرنے لگ جائے گا۔اس کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ہے یعنی دس شرائط پوری کرنے کے بعد دعا کا قبول ہونا اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا نزول ہونا وہ بھی انسان کے کسی اپنے فعل کے نتیجہ میں نہیں بلکہ محض ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب ہے جو اسے مل رہا ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس حقیقتِ زندگی کو سمجھنے کی توفیق عطا کرے اور ہم جیسے بھی ہیں کمزور و ناتواں اور غافل ہمیں توفیق دے کہ وہ ہم سے پیار کرنے لگ جائے اور جب ہم پر اس کا فضل ہو تو شیطان ہمارے دل میں اس وقت بھی یہ وسوسہ نہ پیدا کرے کہ گویا ہم یہ سمجھیں کہ خدا تعالیٰ کا پیار ہمیں اس لئے ملا کہ خدا تعالیٰ نے یہ چاہا کہ ہم پر فضل کرے اور ہم سے پیار کرے ورنہ نالائق مزدوروں سے زیادہ ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے خدا کے حضور۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا کرے۔

(خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۱۰۷ تا ۱۱۴)

جو چیز بھی اس کائنات میں، اس مادی دنیا میں اور جو غیر مادی ہے اس میں بھی ظہور پذیر ہوتی ہے جو عدم سے وجود میں ظاہر ہوتی ہے یعنی پہلے نہیں تھی ہوگئی، وہ آیت ہے اس کی ایک موٹی مثال ہے تو وہ چھپی ہوئی لیکن موٹی بھی ہے وہ دے دیتا ہوں جو فلکیات کے ماہر ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو پہلا آسمان ہے سات آسمانوں میں سے جس میں ستارے اور سورج وغیرہ ہیں یہ قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں ستارے، یعنی ان کے اندر اپنا ایک اجتماعی زندگی ہے ان کی، وہ ہر، ان کو انگریزی میں گلیکسی کہتے ہیں اور بے شمار سورج ایک ایک گلیکسی میں ہیں۔بے شمار سورج ایک گلیکسی میں اور ہر گلیکسی اپنے راستے پر حرکت میں ہے کسی نامعلوم طرز کی طرف اس کی حرکت ہے جہت کی طرف اس کی حرکت ہے لیکن گلیکسی اور گلیکسیز بے شمار ہیں ان کی بھی گنتی نہیں کر سکا انسان لیکن یہ حرکت پیرالل (Parallel) نہیں بلکہ اس طرح ہے یعنی ہر آن دو گلیکسیز کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور جب اتنا فاصلہ ہو جائے دو گلیکسی کے درمیان کہ غیر محدود بے حد و حساب سورج اس کے ایک، جس کے اندر ہوتے ہیں ناں ایک نئی گلیکسی وہاں سما سکے اتنا فاصلہ ہو جائے وہ تو کہتے ہیں وہاں وہ گلیکسی پیدا ہو جاتی ہے اب یہ جو پیدائش ہے یہ ہے خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ آیت نہیں عظیم نہیں نشان خدا تعالیٰ کی عظمتوں اور اس

کے جلال کی طرف راہنمائی نہیں کرتی یہ چیز۔ تو اس چیز کو بھی آیت قرآن کریم نے کہا اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ہاں یہ ضرور کہا ہے صاحب فراست ہونا چاہیے آدمی کو پتا لگ جائے گا کہ معمولی واقعات نہیں رونما ہونے والے بلکہ خدا تعالیٰ کی عظمتوں کے نشان ظاہر کرنے والے عظیم نشان ہیں اللہ تعالیٰ کے۔ اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے آیات قرآن کریم میں مَیں نے نوٹ تو کئے تھے بہت ساری آیات جو قرآن کریم نے سینکڑوں یہ ظاہری چیزیں ہیں پانی کا سمندروں سے بخارات کے ذریعے اٹھایا جانا قرآن کہتا ہے یہ آیات ہے پھر اس کو اس بخار کا سمٹ کے اور گاڑھا ہو جانا تھِک (Thick) ہو جانا پانی کا اکٹھا ہو جانا۔ جس میں سے قطرے بہہ سکیں اللہ تعالیٰ قرآن میں کہتا ہے یہ آیت ہے۔

پھر اس بادل کا کسی خاص جہت کی طرف چل پڑنا ہوا کا آنا اور اس کو اڑا کر لے جانا خدا کہتا ہے یہ آیت ہے، پھر کسی ایک جگہ جا کے ہوا کا رک جانا اور بادل کا ٹھہر جانا اور نہ برسنا۔ خدا کہتا ہے یہ آیت ہے یا برس جانا خدا کہتا ہے یہ آیت ہے۔ سینکڑوں ہزاروں تو شاید نہیں سینکڑوں تو یقیناً قرآن کریم میں اس کائنات سے مادی کائنات سے تعلق رکھنے والے اللہ تعالیٰ کے جو عظیم جلوے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ہر جلوہ ہی عظیم ہے ان کو آیت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

تو ایک تو خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ آیت ہوئی دوسرے زمانے کو وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ یہ زمانہ ہی ہے ناں۔ آپ کہہ دیتے ہیں کل جو گزر گیا دن کل کا دن اور پرسوں جو آنے والا دن ہے وہ پرسوں کا دن وہ زمانہ جو ہے وہ اپنی مستقل ایک حیثیت میں آپ کے ذہن میں آتا آپ کی زندگیوں میں آتا اور ایک ایک دن جس کو آپ ایک معمولی سی چیز سمجھ کے اس پر توجہ نہ کرتے ہوئے گزار دیتے ہیں اور ایک دن آپ کو پتا لگتا ہے کہ ایک ایک دن کر کے ۸۰ سال ہماری عمر گزر گئی اور بوڑھے ہو گئے کمریں جھک گئیں چلا نہیں جاتا کان جو ہیں ٹھیک طرح سن نہیں رہے آنکھیں ٹھیک طرح دیکھ نہیں رہیں وہ جو رعب اور دبدبہ خاندان کے اوپر تھا وہ بابے بڈھے کا رہا نہیں۔ اور بولا ایک ایک دن تھا۔ تو ایک دن بھی بڑا زبردست تھا اور واقعہ میں آیت تھا خدا کی۔

یہ بھی آیت ہے اور شقِّ قمر جو ہے وہ بھی آیت ہے قرآن کریم کی اصطلاح میں یعنی جو انبیاء علیہم السلام یا دوسرے برگزیدہ اولیاء کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ معجزات اور نشانات آسمانی دکھاتا ہے ان کو بھی

قرآنی اصطلاح میں آیت کہا جاتا ہے تو اس لحاظ سے دو بنیادی طور پر قسمیں ہیں آیات کی۔ایک وہ خدا تعالیٰ کی صفات کے جلوے جو اس کائنات میں ظاہر ہوتے اور عدم سے وجود میں اور وجود سے عدم میں تبدیلی پیدا کرتے چلے جاتے ہیں وہ جلوے اسی کائنات میں، مادی کائنات میں پیدا ہوتے ہیں اور حرکت پیدا کر دیتے ہیں عمر کو ایک دن بڑھا دیا ہر صبح سورج اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ہر صبح جو سورج چڑھا اس نے ایک دن آپ کی عمر کا بڑھا دیا اور یہ ہمارا محاورہ ہے لیکن موت کہتی ہے کہ تمہارا ایک دن زندگی کا کم کر دیا۔

موت نے اپنے نقطہ نگاہ سے دیکھنا ہے، ہم نے اپنے نقطہ نگاہ سے دیکھنا۔ہم کہتے ہیں ہمارا ایک دن بڑھا دیا، موت مسکرا کے کہتی ہے ایک دن تمہارا، عمر کا کم کر دیا اور اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ۔ وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (القمر:۲، ۳) اسی طرح کے الفاظ ہیں ذہن سے نکل گئے بہر حال ہر دو کو اللہ تعالیٰ نے آیات کہا ہے تو يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ کا مطلب یہ ہے کہ وہ نبی دنیا کو انسان کو ہر مرد کو ہر عورت کو امریکہ میں رہنے والے کو اور افریقہ کے جنگلوں میں رہنے والوں کو اور عربی بولنے والے علاقوں میں رہنے والوں کو اور رشیا میں رہنے والوں کو آیات بتائے گا پہلے کب یہ آیات بتائی گئی ہیں ہمیں، ہمیں کب کہا گیا کہ بے توجہگی سے گزر نہ جایا کرو آیات اللہ کے پاس سے بلکہ ہر ظہور ہر ایک چمکار خدا تعالیٰ کی صفت کی خدا تعالیٰ کی طرف نشاندھی کرنے والی ہے۔وہ تمہیں بلاتی ہے تمہارے پیدا کرنے والے ربّ کریم کی طرف اس کی طرف توجہ کرو اور اسی سے خیر مانگو خیر پاؤ۔ دوری کی راہوں کو اختیار نہ کرو اور اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم ایک ہی نبی ہیں جنہوں نے حیات جاودانی پائی ہے اپنے ربّ کریم سے ان کی قوت قدسیہ کے نتیجے میں جس طرح ہزاروں زبردست معجزات اور آیات اس زندگی نے جو ظاہری جسمانی زندگی تھی ظاہر ہوئے اسی طرح آخری زندگی میں ظاہر ہو رہے ہیں ہماری تاریخ بھری پڑی ہے بہت ساری کتابیں بدقسمتی سے ضائع ہو گئیں ہیں لیکن جن کو خدا تعالیٰ کی نگاہ نے ایک پاک اور مطہّر اور تزکیہ یافتہ پایا ان کو بغیر نشانوں کے نہیں چھوڑا يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ پھر دوسروں کے لئے محرم بنے انہوں نے کہا دیکھو تم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ایسا رسول ہے جو آیات تمہیں بتائے گا۔ہمارے پاس آؤ، ہماری زندگی کو دیکھو، ہمارے اردگرد دیکھو، آیات ہر قسم کی ظاہر ہو رہی ہیں۔ (خطاباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۴۴۴ تا ۴۴۷)

خدا تعالیٰ نے جو اس جہان کو پیدا کیا اس عالمین کو پیدا کیا اس کے مختلف پہلوؤں پر جب انسان نظر رکھتا ہے تو اس نتیجے پر پہنچتا ہے اور کہتا ہے علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہے کہ میرے رب نے کسی چیز کو بے مقصد نہیں پیدا کیا۔ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔ کہ تو پاک ذات ہے تو نے کوئی چیز بے مقصد نہیں بنائی۔ مومنوں پر الٰہی سلسلوں پر جو ابتلا آتے ہیں وہ بھی بے مقصد نہیں وہ ان کو مارنے کچلنے اور ہلاک کرنے کے لئے تو نہیں آیا کرتے، وہ ان کی شان ظاہر کرنے کے لئے وہ ان کی روحانی ترقیات کے لئے، وہ خدا تعالیٰ کے پیار کے زیادہ حصول کے سامان پیدا کرنے کے لئے آیا کرتے ہیں۔ وہ بے مقصد نہیں ہیں ان کا مقصد ہے اور بڑا عظیم مقصد ہے۔ بڑا حسین مقصد ہے۔ بڑا پیارا مقصد ہے۔ مومن یہ سوچے گا کہ ایٹم کی طاقت بے مقصد نہیں ہے اور خدا تعالیٰ نے مقصد اصولی طور پر قرآن کریم میں یہ بتایا ہے کہ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ:۱۴) کہ بلا استثنا ہر چیز کو انسان کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ایٹم کی طاقت کا بھی یہی مقصد ہے لیکن جنہوں نے ایٹم کی طاقت کو نکالا وہ اس کا استعمال کچھ حد تک صحیح بھی کر رہے ہیں اور بہت حد تک غلط بھی کر رہے ہیں یا کر سکتے ہیں۔ ایسے مہلک ہتھیار بنا لئے ہیں۔ ایک مومن کا دماغ کہے گا کہ ایٹم کا یہ مقصد تو نہیں کہ جو چیز انسان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے وہ اس کی گردن اڑا دے وہ تو انسان کے فائدے کے لئے ہی استعمال ہونی چاہیے۔

(خطباتِ ناصر جلد ہفتم صفحہ ۶۰)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تفسیر سورۃ النِّسَآءِ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آیت ۱ تا ۲ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۱

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْہَا زَوْجَہَا وَ بَثَّ مِنْہُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا ۲

قرآن کریم کی تین آیات عام طور پر خطبہ نکاح کے وقت پڑھی جاتی ہیں۔ پہلی آیت جو پڑھی جاتی ہے وہ یہ ہے۔ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا ہے کہ ہمارا اللہ ہمارا ربّ ہے۔ ربوبیت کی صحیح اور حقیقی ذمہ داری اس نے اپنے پر لی ہے۔

ربّ کے معنی ہیں پیدا کرنے والا۔ پیدائش کے بعد جو قوتیں اور استعدادیں اس نے مخلوق میں رکھی ہوں ان کے مطابق نشوونما کے سامان پیدا کرنے والا نشوونما کی توفیق دینے والا تا کہ اس کی مخلوق وہ حاصل کر لے جو اس نے اپنی مخلوق کے لئے مقرر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت ہی ترقیات کے لئے پیدا کیا ہے۔ جسمانی بھی اور روحانی بھی اور اللہ تعالیٰ یہاں یہ فرماتا ہے کہ میں نے اس ربوبیت کے نظام میں ازدواجی تعلقات بھی رکھے ہیں۔ ان ازدواجی تعلقات کے نتیجہ میں اگر تم خدا کی باتیں مانو دنیا کے رسم و رواج نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں درجہ بدرجہ ترقی دے کر ان مقامات تک تمہیں لے جائے گا۔ جن مقامات تک وہ تمہیں لے جانا چاہتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے

فرمایا کہ خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ (ترمذی ابواب المناقب)۔ اگر تمہارے اپنے اہل کے ساتھ اچھے تعلقات ہوں گے اچھا برتاؤ ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بھی تم اچھے بنو گے اور جہاں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم انسان کو ملتا ہے شیطان یہ کوشش کرتا ہے کہ انسان اس حکم پر عمل نہ کرے۔ اس مقصد کو حاصل نہ کرے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اسے حاصل ہو۔ ان ترقیات تک نہ پہنچے جہاں اللہ تعالیٰ اسے پہنچانا چاہتا ہے اور یہاں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا کہ ازدواجی تعلقات میں شیطانی رخنوں کا واقع ہو جانا بھی ممکن ہے۔ اس لئے جب تمہیں اس قسم کی الجھنیں پیدا ہوں تو تم اِتَّقُوْا رَبَّکُمْ اسی کو اپنی ڈھال بناؤ جس نے خود کو تمہارا ربّ بنایا ہے۔ ربّ ہونے کی ذمہ داری اس پر ہے۔ اگر تم اپنے خدا کو، اپنے اللہ کو، اپنے ربّ کو، اپنے خالق کو اپنی ڈھال بناؤ گے اور اس کے احکام کو توڑو گے نہیں اور گناہ سے اور معصیت سے اس لئے بچو گے کہ وہ تم سے راضی ہو جائے تو پھر تم شیطانی وسوسوں اور شیطانی رخنوں اور شیطانی حملوں سے محفوظ ہو جاؤ گے کیونکہ وہ تمہارا خالق ہے وہ تمہارا ربّ ہے اور وہی جانتا ہے کہ تم کس قسم کی استعدادیں اور قوتیں رکھتے ہو اور تم کس حد تک بلندیوں کو حاصل کر سکتے ہو۔ اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک موقع پر کہا اور اس کو قرآن کریم نے نقل کیا تا کہ ہمارے لئے وہ ہدایت کا موجب بنے اور وہ یہ کہ اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ (الشعرآء:۷۹) اور اس میں یہ مضمون بیان کیا کہ خالق ہی بتا سکتا ہے کہ کتنی طاقت اور قوت کسی چیز میں ہے۔ موٹی مثال اس کی ہے۔ لاریاں چلتی ہیں ہر روز اس پر چڑھتے ہیں موٹریں ہیں موٹر بنانے والے نے اس پر لکھا ہوا ہے کہ اس سے زیادہ تیز رفتار سے یہ موٹر نہیں چلے گی اگر لکھا نہ ہو تو پھر ناواقف انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنی تیز رفتار سے یہ موٹر چل سکتی ہے۔ انسان کو جس نے پیدا کیا وہی بتا سکتا ہے کہ اس میں کیا کچھ رکھا گیا ہے۔ (خطبات ناصر، جلد دہم صفحہ ۳۴۴، ۳۴۵)

یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ ۔ یہاں آیت میں اِتَّقُوا اللّٰہَ رَبَّکُمْ بھی ہے اور بہت سے کنٹیکسٹ (Context) میں تقویٰ کا ذکر ہے لیکن اس آیت میں جو نکاح کے موقع پر پڑھی جاتی ہے رب کا تقویٰ۔ اور یہ ربّ کا تقویٰ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ربوبیت کرنے والا ہے۔ تم دونوں کی ربوبیت کرنے والا ہے۔ اسی طرح تم پر بھی ربوبیت کی ذمہ داریاں کچھ نئی پڑنے والی ہیں اور اسی صورت میں تم ادا کر سکو گے جب تم حقیقی رب، اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو گے۔ (خطبات ناصر، جلد دہم صفحہ ۱۷۱)

جہاں تک آپ کی بعثت اور اس کی غرض وغایت کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے اس اعتبار سے مردوں اور عورتوں میں کوئی تفریق نہیں کی اس لئے قرآن مجید میں جتنے بھی احکام آئے ہیں۔(ماسوا چند احکام کے جن میں جسمانی تفاوت کی وجہ سے عورتوں کے بعض جداگانہ نوعیت کے حقوق وفرائض کا ذکر ہے) ان میں یکساں طور پر مردوں اور عورتوں دونوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور وہ یکساں طور پر دونوں پر عائد ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔

اے انسانو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے یہاں بھی النّاس کا لفظ استعمال کر کے مردوں اور عورتوں کو ایک ساتھ مخاطب کیا گیا ہے اور انہیں حکم دیا گیا ہے اور انہیں اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا اس حکم کے ذریعہ انہیں دراصل کہا یہ گیا ہے کہ وہ یکساں طور پر خدا تعالیٰ کا پیار حاصل کر کے اس کی نگاہ میں عزت کا مقام حاصل کریں۔اس سے ظاہر ہے کہ اسلام مردوں اور عورتوں دونوں کو عزت اور احترام کا مقام دلانا چاہتا ہے اور اس لحاظ سے ان میں کسی تفریق کا روادار نہیں ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۶۳۳، ۶۳۴)

آیت ۱۸ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۸﴾

فرمایا کہ قرآن کریم قَابِلِ التَّوْبِ خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے وہ تمہیں ان دروازوں تک لے جائے گی جو توبہ کے دروازے ہیں۔وہ تمہیں بتائے گی کہ ان دروازوں کو تم نے کس طرح کھٹکھٹانا ہے تا کہ وہ تم پر کھولے جائیں۔

پس اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہاں یہ بتایا کہ جب تمہارا دل اپنے پیدا کرنے والے کی طرف مائل ہو اور اس کی طرف جھکے لیکن تم سرگردان ہو، نہ جانتے ہو کہ کن راہوں سے تم اس کی جناب میں پہنچ سکتے ہو تو اس کتاب کی طرف رجوع کرو اور اس سے روشنی اور ہدایت حاصل کرو تا تمہاری مراد برآئے

اور تمہارا رب تم سے راضی ہو جائے اور اس کی نظر میں تم ایسے بن جاؤ کہ کبھی تم سے گناہ سرزد ہی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ توبہ کس طرح اور کن لوگوں کی اللہ تعالیٰ کے حضور مقبول ہوتی ہے اور وہ کون لوگ ہیں کہ جن کی توبہ ان کے منہ پر ماری جاتی ہے۔

یہ تو ایک مثال ہے جو اشارۃً میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ورنہ قرآن کریم بھرا پڑا ہے ایسی آیات سے جن سے ہمیں پتہ لگتا ہے کہ توبہ کا طریق کیا ہے، وہ کون لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کی صفت قَابِلِ التَّوْبِ کو اپنے حسن عمل سے خدا تعالیٰ اور قرآن مجید کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق جوش میں لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو توبہ قبول کرنے والا ہے ان لوگوں کیلئے توبہ کے دروازے کھول دیتا ہے۔ (خطبات ناصر جلد اول صفحہ ۳۳۵، ۳۳۶)

آیت ۲۴ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ؗ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ؗ وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾

جنسی تعلقات کے اوپر آداب کے لحاظ سے جو پابندی لگائی گئی ہے۔ عرب میں لوگ ماں سے شادی کرنے کو جائز سمجھتے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن کریم کی وحی کے نتیجہ میں حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ آپ میں سے کئی یہ آیت پڑھتے ہوں گے تو کہتے ہوں گے کیا انسان اپنی ماں سے بھی شادی کر سکتا ہے؟ لیکن عرب شادی کر رہا تھا اس لئے یہ کہنے کی ضرورت پڑی حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وحشی عرب ماں سے نکاح کو جائز قرار دیتا ہے اس لئے ایک ہم تمہیں یہ کہتے ہیں کہ اگر تم نے

انسان بنتا ہے تو ماں سے شادی نہیں کرو گے۔ نکاح کے سلسلہ میں اور بہت سارے قرآن کریم کے آداب سکھائے۔ یہ تو پرانے زمانے کی باتیں تھیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں ایک کتاب میں لکھا ہوا جب میں نے پڑھا تو میں حیران ہو گیا کہ عقلاً اس بات پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی ماں سے تعلقات رکھے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ یہ تو انسانیت کے خلاف ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے قرآن کریم کے صریح حکم کے خلاف ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ اس صریح حکم کے بعد اس قسم کے حوالے نظر آ جاتے ہیں اس دنیا میں جس میں میں اور آپ رہ رہے ہیں۔ (خطاباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹)

آیت ۲۹ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝۲۹

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کو ضعیف پیدا کیا گیا ہے۔

ضعیف اس معنے میں کہ خدا تعالیٰ نے جہاں اس کو نیکی کی بہت سی قوتیں اور طاقتیں عطا کی ہیں وہاں اس کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ وہ ان راہوں کو چھوڑ کر جو اس کے رب کی طرف لے جانے والی ہیں، ان راہوں کو اختیار کرے جن پر چل کر شیطانِ لعین سے وہ اپنا تعلق قائم کر لیتا ہے اور ضعیف اس معنی میں بھی کہ غیر محدود انعامات اس کے سامنے رکھے اور محدود عمل سے زیادہ کی اسے طاقت نہیں دی۔ کمزور ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ وہ تمہارے بوجھ ہلکے کرے۔ تمہارے لئے آسانی پیدا کرے۔

اسلامی شریعت کا گہرا مطالعہ ہمیں اس حقیقت کی طرف لے جاتا ہے اور اس صداقت پر قائم کرتا ہے کہ ہر حکم شریعت اسلامیہ کا ایسا حکم ہے جس میں آسانی کے پہلو کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔ اس وقت میں نے تین چار باتیں اصولی جو ہیں ان کو منتخب کیا ہے اس وقت کے خطبہ کے لئے۔

ایک یہ کہ انسان میں جو قوت اور طاقت ہے وہ اپنے نفس میں ایسی نہیں جو اسے خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتی۔ انسان کی ساری نیکی کی طاقتیں بھی اس کے لئے بدی بن سکتی ہیں۔ اس میں کبر پیدا کر کے، اُس میں نخوت پیدا کر کے، اس میں ریا پیدا کر کے، اس میں جذبۂ نمائش پیدا کر کے، اس میں اپنے نفس کی پوجا کر کے اور پرستش کے جذبات پیدا کر کے، اس کی نیکیاں جو ہیں ان کے اندر وہ خود شرک

کی ملاوٹ پیدا کرسکتا ہے۔اس لئے چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نیکی کی طاقتیں بھی دیں ان کا بھی وہ غلط استعمال کرسکتا تھا۔وہ انتہائی عاجزانہ نمازیں پڑھنے کے بعد بظاہر جو ہمیں نظر آتی تھیں خشوع اور تضرع کے ساتھ دعائیں کرنے والا لیکن اس کی روح اس میں غائب بھی ہوسکتی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس ضعف سے بچانے کے لئے اور آسانی کو پیدا کرنے کے لئے یہ انتظام کیا کہ اس کے لئے قبولیتِ دعا کے دروازے کھولے گئے اور اسے یہ حقیقت سمجھائی گئی کہ جو اعمالِ صالحہ بجالانے کی تمہیں طاقتیں عطا کی گئی ہیں ان کے ذریعہ سے محض تم خدا تعالیٰ کے پیار کو حاصل نہیں کرسکتے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ساری نیکیاں کرنے کے بعد بھی تم خدا تعالیٰ کے دربار سے دھتکار دیئے جاؤ سوائے اس کے کہ تم اپنی عاجزانہ دعاؤں سے خدا تعالیٰ کے فضل کو جذب کرنے والے ہو۔اگر تم اپنی نیکیوں کی قبولیت کے لئے عاجزانہ راہوں کو اختیار کرتے ہوئے دعاؤں کے ساتھ خدا تعالیٰ کے فضل کو جذب کرنے میں کامیاب ہوجاؤ گے اور یہ دروازہ تمہارے لئے کھلا ہے تو پھر تمہاری نیکیاں اس کے حضور قبول ہوں گی اور تم اس کے پیار کے مستحق ہوگے اور تمہیں اس کا ثواب ملے گا۔تو قبولیت دعا کے نتیجہ میں ہماری راہ کو اللہ تعالیٰ نے آسان کردیا۔ہمارے بوجھ کو ہلکا کردیا ورنہ یہ بوجھ ضعیف انسان کیسے اٹھا سکتا تھا کہ اپنے اعمال سے خدا تعالیٰ کو ثواب دینے اور پیار کرنے پر مجبور کرسکتا۔

تو پہلا اصول اس نے اس آسانی کے پیدا کرنے کا یہ بنایا کہ دعائیں کرو اور میرے فضل کو جذب کرو تا کہ میں تمہاری نیکیوں اور تمہارے اعمال صالحہ میں جو کمزوریاں اور خامیاں رہ گئی ہیں، انہیں مغفرت کی چادر میں ڈھانپ دوں اور تمہارے اعمال کو قبول کروں اور تم سے میں پیار کرنے لگوں۔

دوسری تخفیف جو ہے جو آسانی پیدا کی گئی ہے، وہ اسلام نے بڑے حسین پیرایہ میں اور بڑے عظیم طریق پر فرائض اور نوافل، عبادات کو اور حقوق کی ادائیگی کو ان دو حصوں میں منقسم کرکے پیدا کی ہے۔فرائض انسان پر نیکیوں کا کم سے کم بوجھ ڈالتے ہیں اتنی آسانی سے اس کے نتیجہ میں کہ انسان جب خدا تعالیٰ کے فضلوں پر غور کرتا اور اس کے پیار کو دیکھتا ہے تو دنگ رہ جاتا ہے۔

نماز، دن میں پانچ دفعہ دو، چار، چار، تین، چار رکعتیں پڑھنی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک باہر سے، دیہاتی علاقے سے مسلمان آئے اور انہوں نے کہا کہ کیا ہیں اسلام کے ارکان، نماز کے متعلق یہ فرائض آپ نے سارے فرائض بتائے۔اس نے کہا میں فرائض پورے کروں گا اس

سے زائد کچھ نہیں کروں گا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اگر یہ اپنی بات پر قائم رہا اور خدا تعالیٰ نے اس کی اسے توفیق بھی دی تو دَخَلَ الْجَنَّۃَ خدا اسے جنت میں بھیج دے گا۔ تو جنت میں داخل ہونے کے لئے فرائض ہمارے لئے رکھے۔ جنت میں داخل ہو کر جنت میں جو ارفع مقامات ہیں، مقامات محمودہ ان کے حصول کے لئے نوافل رکھ دیئے اور اس طرح اُمتِ مسلمہ کے لئے آسانی پیدا کر دی کیونکہ ہر شخص جو ہے نہ اس میں اتنی طاقت ہے نہ اس میں اتنا جذبہ ہے۔ ہر ایک کو کہا کہ کم از کم لے لو، کر لو تو خدا تعالیٰ کے پیار کو حاصل کر لو گے۔

روزے ہیں۔ بارہ مہینے میں سے ایک مہینے کے روزے رکھے۔ چوبیس گھنٹے میں سے کبھی بڑا ہوتا ہے کبھی چھوٹا میں اوسط لے لیتا ہوں۔ بارہ گھنٹے کا روزہ رکھ دیا یعنی بارہواں حصہ دنوں کے لحاظ سے اور پھر وہ جو صیام کے، رمضان کے ایام ہیں ان کا آدھا وقت کھانے کے لئے دے دیا اور آدھا خدا کی خاطر اور حقوق کی یاددہانی کے لئے اور روح کی پاکیزگی کے لئے اور معاشرہ میں محبت و اخوت پیدا کرنے کا سبق دینے کے لئے بہت ساری حکمتیں ہیں۔ آدھا وقت روزہ کے لئے اور آدھا وقت جو ہے وہ کھانے کے لئے دے دیا۔ اس سے مختلف ممالک میں مختلف رنگ میں مسلمان نے فائدہ اٹھایا۔ میں مصر میں بھی کچھ عرصہ رہا ہوں وہاں کا طریق میں نے یہ دیکھا کہ افطاری سے لے کر سحری کھانے تک ساری رات بیٹھ کے باتیں بھی کرتے تھے اور ساری رات کھاتے رہتے تھے اور سحری کا جب وقت ہوتا تھا سحری کھاتے تھے اور ان کا روزہ شروع ہو جاتا تھا پھر افطاری تک سورج غروب ہونے تک وہ روزہ دار تھے۔ تو کتنی آسانی پیدا کی۔

حج ہے۔ ساری عمر میں ایک حج فرض اور اس کی بھی بہت سی شرائط اور بنیادی ارکانِ اسلام میں سے ہے۔ تو بڑی سہولت اور آسانی پیدا کی لیکن جن کو خدا تعالیٰ توفیق عطا کرے اگر وہ ہر سال حج کر سکتے ہوں دوسروں کا حق مارے بغیر کیونکہ اب کوٹا سسٹم بن گیا ہے اس لئے یہ فقرہ بولا ہے تو ہر سال حج کریں لیکن فرض حج جو ہے وہ ایک ہے باقی نفلی حج ہوں گے اور سارا سال عمرہ کرتے رہیں۔ میں نے ایک جگہ کتاب میں پڑھا کہ جدّہ میں رہنے والے بہت سے لوگ روزانہ ہی شام کو مثلاً دکاندار ہے تو دکان بند کر کے مکہ مکرمہ چلے جاتے ہیں اور عمرہ کر کے آ جاتے ہیں تو وہ نوافل ہیں۔

زکوٰۃ ہے۔ نصاب کے ماتحت دینی ہے جو صاحبِ نصاب ہے وہی دے گا لیکن جو مال کے خرچ کرنے

کے نوافل ہیں وہ یہ ہیں کہ دنیا میں اگر ایک شخص مالی تنگی میں ہے تو اُمتِ مسلمہ اس کی ذمہ دار ہے۔
وَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىِٕلِ وَ الْمَحْرُوْمِ (الذّٰریٰت:۲۰) جب تک ایک سائل اور ایک محروم بھی ہے، ساری اُمتِ مسلمہ کا فرض ہے کہ اس کی ضرورت کو اس کی حاجت کو پورا کرے اور اس کی تکلیف کو رفع کرے۔ وہ نوافل میں آتا ہے لیکن صاحبِ نصاب، نصاب دیتا ہے اور مالی قربانی کا جو فرض ہے وہ پورا کرتا اور خدا تعالیٰ کے پیار کو حاصل کرتا ہے۔ جنت کا دروازہ جو زکوٰۃ نے کھولنا تھا وہ اس کے لئے کھول دیا گیا۔ جنت میں جو رفعتوں کے مقامات وہ حاصل کرسکتا ہے مالی قربانیوں کے نتیجہ میں وہ جتنا کرسکتا ہے، کرے۔ اس میں ہمیں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ بھی نظر آتے ہیں کہ ایک وقت میں اسلام کو مال کی ضرورت پڑی تو گھر سے ہر چیز اُٹھا کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دی۔ آپ نے پوچھا گھر میں کچھ چھوڑ کے آئے ہو تو انہوں نے کہا خدا اور اس کے رسول کا نام چھوڑ کے آیا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں اور ہمیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ جیسے آدمی بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے سوچا کہ آدھا گھر میں چھوڑ جاؤ آدھا لے جاؤ۔ کسی نے بہت کسی نے کم لیکن وہ نوافل کی دوڑ تھی۔ وہ فرائض کے بعد شروع ہوتی ہے تو یہ ایک ہمیں نظر آتی ہے۔
میں نے غور کیا کہ ایک بڑی عظیم سہولت مسلمان کو دی گئی ہے کہ اس کی عبادات کو اور اس کے ادائیگی حقوق انسانی کو یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں فرض اور نفل دو علیحدہ علیحدہ بنیادی قسم کی ہر میدان میں، ہر میدانِ قربانی میں علیحدہ علیحدہ حقوق کی ادائیگی کی شکلیں بنا دیں۔ ایک پاس ہونے کے لئے، ایک اگر مقبول ہوجائیں ویسے نہیں، اگر مقبول ہوجائیں فرائض تو جنت کے دروازے کھل گئے لیکن جنت میں بھی رفعتیں ہیں۔ جنت میں بھی بلند مقام ہیں۔ جنت میں بھی خدا کے پیار پیار میں فرق ہے۔ جنت میں بھی یہ سمجھنا کہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا پیار ملے گا ہر ایک کو ویسا ملے گا یہ تو ہماری عقل نہیں مان سکتی لیکن جنت میں ہر وقت دروازہ کھلا ہے ان رفعتوں کے حصول کا۔ جنت میں رفعتوں کے حصول کا دروازہ کھلا ہے اس دنیائے ابتلا اور امتحان میں نوافل کی ادائیگی کے ساتھ اور وہاں خدا تعالیٰ نے احادیث میں آتا ہے کچھ اور اصول بنائے ہیں وہ اس وقت میرے زیر بحث نہیں۔
تیسری سہولت ہمیں بنیادی سہولت جو ہر ہمارے عمل سے تعلق رکھتی ہے، وہ توازن کے اصول سے ہمیں سہولت عطا کی ہے یعنی ایک طرف پورا جھک جانا اور اس طاقت کو قریباً توڑ دینا اور دوسروں کو

نظر انداز کر دینا اس کی اجازت نہیں۔ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ حقوق العباد کو بھول کر چوبیس گھنٹے حقوق اللہ کو ادا کرتے رہو یا حقوق اللہ کے ان حصوں کو جن میں ذکر الٰہی ہے مثلاً گناہگار بن جاتا ہے آدمی، تو توازن کے اصول کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں قائم کر کے ایک نہایت حسین سہولت اور آسانی انسان کے لئے پیدا کی۔....... اسلامی تعلیم میں ایک توازن کا اصول ہے جس نے یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ کے ماتحت ہمارے لئے سہولت پیدا کی۔ یہی حالت عبادات کی ہے پہلے تو حقوق اللہ اور حقوق العباد میں روحانی ترقیات کو تقسیم کر دیا۔ حقوق العباد میں سینکڑوں باتیں آتی ہیں۔ جذبات کا خیال رکھنا ہے، ان کی صحتوں کا خیال رکھنا ہے، ان کی بھوک کا خیال رکھنا ہے، ان کے کپڑوں کی ضرورت پوری کرنی ہے کہ جو عناصر ہیں وہ ان کو دکھ نہ پہنچائیں ان کی تعلیم کا خیال رکھنا ہے، ان کی کفو میں شادیاں ہونے کا خیال رکھنا ہے۔ گنتے چلے جائیں سینکڑوں حکم ہیں اور سب میں ہر جگہ جب آپ دیکھیں گے وہ توازن آجاتا ہے۔ ایک تو پہلے حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن کر دیا۔ یہ کہا کہ تم حقوق اللہ کی ادائیگی میں اتنے محو نہ ہو کہ حقوق العباد کو بھول جاؤ۔ یہی توازن ہے نا توازن اسی کا نام ہے اور یہ کہا کہ تم حقوق العباد کی ادائیگی میں اتنے محو نہ ہو کہ حقوق اللہ کو بھول جاؤ۔ دونوں کے درمیان ایک توازن پیدا کر دیا۔ یہ مضمون خود جو ایک اصول ہے بڑی تفصیل چاہتا ہے۔ میں نے آپ کے سامنے کھانے کی ایک مثال پیش کی اور ساتھ آپ کو بعض روحانی باتوں کی طرف بھی توجہ دلا دی۔ اچھا اسی میں یہ جو اصولِ توازن ہے اس میں مثلاً صدقہ خیرات ہے، اس میں جب ہم نوافل میں آگئے تو نوافل میں توازن رکھو قائم۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اپنے اموال کو نیکیوں میں اس طرح خرچ نہ کرو کہ تمہاری اولاد کو بھیک مانگ کر روٹی کھانی پڑے۔ توازن قائم کر دیا نا۔

اور چوتھا اصولِ سہولت جو ہمیں اسلام میں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ امتداد زمانہ کے لحاظ سے دارالامتحان اور دارالابتلا کی زندگی انعام پانے والی اور اس کا نتیجہ حاصل کر کے زندگی جو انسان گزارے گا ان کے امتداد زمانہ کے لحاظ سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ اس دنیا کی زندگی بیس سال کی، تیس سال کی، پچاس سال کی، ساٹھ سال کی، اسّی سال کی، سو سال کی یا کچھ اور سال بیچ میں شامل ہو جائیں لیکن جو مرنے کے بعد کی زندگی ہے جنت کی زندگی، خدا تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو اپنی

رضا کی جنتوں میں لے کے جائے، وہ زمانہ اتنا لمبا اور وہ جزا اتنی ہے کہ اس کو غیر محدود کہنا غلط نہیں ہوگا۔ تو محدود اعمال ہیں ایک طرف پڑے ہوئے دارالابتلا میں اور ایک طرف ایسی زندگی ہے جس کی نعمتیں غیر محدود ہیں اس کا انتظام کر دینا محدود اعمال کی غیر محدود جزا کا اعلان کر دینا کتنی بڑی سہولت پیدا کر دی۔ اگر انسان کو یہ کہا جاتا کہ جتنے عمل کرو گے اتنے ہم سے انعام لے لینا تو وہ تو پھر بعض روحانی طور پر بعض بہکے ہوئے دماغوں کی طرح ان کو پھر دارالابتلا میں آنا پڑتا۔ پھر یہ مصیبتیں جھیلنی پڑتیں۔ پھر کچھ عرصہ جنتوں میں گزارنا پڑتا۔ پھر واپس آنا پڑتا اور اس دنیا کی جو نیکیاں ہیں میں تو سمجھتا ہوں کہ ساری عمر کی نیکیاں جو ہیں وہ خدا تعالیٰ کے پیار کے ایک جلوہ جو ہے اس کی قیمت بھی ادا نہیں کر سکتیں تو ستّر سال کی زندگی دارالابتلا اس دنیا میں اور اس کے مقابلے میں ایک سیکنڈ کی زندگی جنت میں اور پھر وہ واپس آ جائے یہاں ستّر سال گزارنے کے لئے پھر تو ایسا انتظام کرنا چاہیے تھا نا لیکن يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا انسان کو خدا تعالیٰ نے ضعیف اس جہت سے بھی بنایا کہ وہ اپنی محدود زندگی میں غیر محدود اعمال صالحہ بجا نہیں لا سکتا۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ہو گیا نا۔ انسان کو اتنی زندگی دی کہ اس کے اعمال جتنا مرضی زور لگا لیں اس کے اعمال صالحہ غیر محدود نہیں ہو سکتے۔ لیکن جو انعامات دیئے گئے جن کا وعدہ دیا گیا وہ غیر محدود ہیں تو یہ سہولت پیدا کر دی گئی انسان کے لئے۔ جو تم محدود عمل کرو گے اس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ اپنے پیار کا یہ جلوہ ظاہر کرے گا کہ غیر محدود انعامات کا تمہیں وارث بنا دے۔ لیکن میں نے بتایا ہے کہ یہ میں نے موٹے موٹے اصول چار جو مجھے نظر آئے وہ میں نے لئے ہیں ورنہ اسلام کا ہر حکم ہمیں یہ بتاتا ہے اور یہ حقیقت ہمارے اوپر کھولتا ہے کہ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ہمارے لئے سہولت کا سامان اور آسانی کا سامان پیدا کرے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ انسان ضعیف ہے اور وہ اس معیار کو نہیں پہنچ سکتا کہ جس کے اوپر یہ ہم کہہ سکیں کہ جو جنتیں ہیں وہ اس کے اعمال کے نتیجہ میں اس کو ملیں گی۔

(خطبات ناصر جلد ہشتم صفحہ ۱۲۹ تا ۱۳۶)

آیت ۳۵ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ

بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا ﴿۳۵﴾

ویسے تو قرآن کریم کی آیات کے بے شمار معانی ہوتے ہیں لیکن اس آیہ کریمہ میں لفظ قوام کے یہ معنے نہیں ہیں جیسا کہ بعض بیوقوف لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہمیں اختیار دے دیا گیا ہے کہ جس طرح مرضی بیویوں سے سلوک کریں۔ یہ غلط ہے دراصل اس رشتہ کو قائم رکھنے کی ذمہ واری خاوند پر ڈالی ہے یعنی بیوی کا قیام جسمانی لحاظ سے اس کا قیام ذہنی لحاظ سے اس کا قیام اخلاقی لحاظ سے اس کا قیام روحانی لحاظ سے خاوند کے ذمہ ہے بالفاظ دیگر ایک کنوارہ آدمی غلطی کرتا ہے تو اس اکیلے پر ذمہ واری ہے۔ ایک کنواری بچی سے غلطی ہو جائے تو اس لڑکی پر ذمہ واری ہے کسی مرد پر ذمہ واری نہیں ہے۔ لیکن اگر ایک بیاہی ہوئی بچی سے کوئی غلطی ہو جائے تو دو پر اس کی ذمہ واری عائد ہوتی ہے۔ ایک لڑکی پر اور دوسرے اس کے خاوند پر۔ اس کا کام تھا کہ دونوں اس طرح یک جان ہو جائیں کہ وہ اس قسم کی غلطی نہ کر سکے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ بعض لوگ اس آیت کے یہ معنے کرنے لگ جاتے ہیں کہ انہیں عورتوں پر سختی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اسلام نے کوئی سختی کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ (ابن ماجہ ابواب النکاح) خدا کی نگاہ میں تم میں سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل کے ساتھ اچھی طرح پیش آتا ہے اور حسن سلوک کرتا ہے اور اہل کے تعلق میں جو ذمہ واریاں ہیں انہیں ادا کرتا ہے دوسرے بیوی سے کہا کہ تم مرد کا لباس ہو۔ خاوند سے کہا بیوی تمہاری زینت کا باعث ہے۔ اسلامی معاشرہ میں بہت ساری چیزیں ہیں جو عورت اگر کرے تو خاوند کی زینت کا بھی باعث ہیں مثلاً پردہ بھی کرے اور اپنی ذمہ واریاں بھی نبا ہے۔ ایک مسلمان عورت بزدل اور کم ہمت نہیں ہوا کرتی۔ (خطباتِ ناصر جلد دہم صفحہ ۴۵۹، ۴۶۰)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ہم نے مرد کو عورت کا نگران

اور محافظ مقرر کیا ہے۔ کس چیز کی نگرانی کرنی ہے؟ اور کس چیز کی حفاظت کرنی ہے اس کے متعلق اسی آیت میں آگے چل کر ہمیں یہ بتایا کہ عورت کی جسمانی نشوونما اور تربیت اور صحت وغیرہ کی نگرانی کا کام مرد پر ڈالا گیا ہے۔ اس لئے ڈالا گیا ہے کہ عام طور پر معاشرہ انسانی میں مرد کمانے والا اور خرچ کرنے والا ہے۔ ہمیں بطور خاوند یا بطور باپ یا بعض اوقات بطور بڑے بھائی یا کسی بڑے رشتہ دار کی حیثیت سے یہ ذمہ داریاں نبھانی پڑتی ہیں کہ ان مستورات کو جو بیوی کی حیثیت میں یا جو بیٹی کی حیثیت میں یا جو چھوٹی بہن کی حیثیت میں ہمارے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور ہماری زیر نگرانی ہیں۔ ہماری حفاظت میں ہیں ان کی صحت کا ہم خیال رکھیں ان کی جسمانی نشوونما کا ہم خیال رکھیں کیونکہ ہم خرچ کرنے والے ہیں اور خرچ کی راہ بھی اس میں بتا دی کہ خرچ کرتے وقت فضولیات کی بجائے ضروری چیزوں کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ اس طرح اسلام ایک صحت مند معاشرہ کی بنیاد رکھتا ہے۔ (خطباتِ ناصر جلد دہم صفحہ ۲۸۸، ۲۸۹)

پس اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ فرمایا کہ ہم نے تمہیں (مردوں کو) معاشرہ میں کمانے والا حصہ بنایا ہے اور اس وجہ سے کہ تم خرچ کرتے ہو، ناجائز فائدہ نہ اٹھانا بلکہ یہ یاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں قوام بنایا ہے اور قوام کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں تم پر عائد ہوتی ہیں وہ تمہیں نبھانی چاہئیں۔ قوام کی دوسری شکل (روحانی) یہ بنتی ہے۔ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے رشتہ میں میاں بیوی، باپ اور ماں ہوں، یا بھائی اور بہن ہوں ان سب میں مرد کو مؤثر بنایا ہے۔ یعنی یہ اثر ڈالنے والا ہے اور عورت اثر قبول کرنے والی ہے۔ یہ ایک جزوی فضیلت اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر دی ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک بہت بڑی ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تمہیں یہ فضیلت دی ہے کہ تم اثر انداز ہو اور عورت چاہے بیوی ہو۔ چاہے بیٹی ہو۔ چاہے ماں ہو تمہارے اثر کو قبول کرتی ہے اور اس کے نتیجہ میں بہت سے ایسے اعمال بجالاتی ہے کہ اگر تمہارا اثر غلط ہوگا تو اس کے وہ اعمال بھی درست نہ ہوں گے۔

فرمایا چونکہ قوام اور مؤثر ہونے کا مقام تمہیں عطا کیا گیا ہے۔ اس لئے ہم تمہیں کہتے ہیں کہ تم اپنی

ذمہ داری کو اس وقت نبھانے والے ہو گے جب وہ عورتیں جو تمہارے اثر کے نیچے ہیں الصّٰلِحٰتُ ہوں، قٰنِتٰتٌ ہوں، حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ ہوں۔ اگر تمہارے اثر کے نیچے آنے والی عورت صالحہ نہیں۔ اگر وہ قانتہ نہیں۔ اگر وہ غیب کی حفاظت کرنے والی نہیں تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ تم پر جو قوّام کی ذمہ داری عائد کی گئی تھی، تم نے اسے نبھایا نہیں اور اس کے لئے تم ہمارے سامنے جواب دہ ہو گے۔ اس لئے ڈرتے ڈرتے اور بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی زندگی کو گزارو تا اللہ تعالیٰ کی تعلیم پر عمل کرنے والے ہو اور اس کی نعمتوں اور اس کے فضلوں اور اس کی برکات کو حاصل کرنے والے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن کریم کی تعلیم پر عمل کر کے ان تمام برکات اور نعمتوں کا وارث بنائے جن کا تعلق قرآن کریم کے ساتھ اور اس کی تعلیم کے ساتھ ہے۔ (خطبات ناصر جلد دہم صفحہ ۲۸۹ تا ۲۹۱)

آیت ۵۰، ۵۱ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝۵۰ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۱

کیا تجھے ان لوگوں کا حال معلوم نہیں جو اپنے آپ کو پاک قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ حق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے پسند کرتا ہے اسے پاک قرار دیتا ہے۔ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ کہ دیکھ وہ کس طرح اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہیں۔

جب وہ کسی کو پاک اور مطہّر قرار دیتے ہیں تو اس کا تو مطلب یہ ہے نا کہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں پاک اور مطہّر ہے وہ۔ خدا تعالیٰ کہتا ہے دیکھو۔ وہ کس طرح خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہیں اور یہ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا کھلا کھلا گناہ ہے۔ ایک دوسرے کو یا اپنے آپ کو متقی اور پرہیز گار قرار دینا، خدا تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا اِثْمٌ مُّبِيْنٌ ہے، ایک ایسا گناہ کرنا ہے جو چھپی ہوئی بات نہیں، کھلی بات ہے۔ اس واسطے کہ پاک اور متقی کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو خدا کی نگاہ میں پاک اور متقی ہو۔ پاک اور متقی کے معنی اسلامی تعلیم کی رو سے یہ نہیں کہ کوئی جماعت کسی دوسری جماعت کو پاک اور متقی قرار دے دے۔

پاک اور متقی کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی شخص پاک اور متقی ہے اور اللہ تعالیٰ کسی کو پاک اور متقی قرار نہیں دیتا اور ایک شخص یا ایک گروہ یا ایک علاقہ یا ساری دنیا مل کے کسی کو پاک اور متقی قرار دے تو وہ خدا تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا ہے اور کھلم کھلا گناہ ہے۔

بہت سی اور آیات ہیں جن میں اس مضمون کے بعض دوسرے پہلو بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے میں نے تین کو اٹھایا ہے۔ اس واسطے انسان کا جو کام ہے وہ انسان کو کرنا چاہیے اور انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیشہ عاجزانہ راہوں کو اختیار کرے کبھی تکبر نہ کرے۔ کبھی کسی سے خود کو بڑا نہ سمجھے۔ کبھی گھمنڈ اور فخر اس کے دل میں پیدا نہ ہو۔ نہ دنیوی برتریاں، جو دنیا کی نگاہوں میں ہیں ان کے نتیجہ میں، نہ دین میں جب دین خدا اسے عطا کرے، نا سمجھی کی راہوں کو اختیار کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کے فضلوں اور رحمتوں کی تلاش کرنے کی بجائے جو دعا کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے نتیجہ میں ہوتے ہیں خود ہی فیصلہ کرنا شروع کر دے کہ میں یا فلاں لوگ جو ہیں وہ پرہیزگار اور متقی ہیں۔

(خطباتِ ناصر جلد نہم صفحہ ۹۷، ۹۸)

قرآن کریم کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا مثلاً فرمایا کہ لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا کہ کھجور کی گٹھلی کے اوپر جو ایک لکیر سی ہوتی ہے بالکل معمولی سی وہ اتنا ظلم بھی نہیں کرتا۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ ظلام نہیں ہے یہ مبالغہ کا صیغہ ہے اور منفی اور مثبت ہر دو معنی میں مبالغہ کا مفہوم پیدا کرتا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ ذرہ بھر بھی ظلم کرنے والا نہیں اس تعلیم کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی فرد یا کسی گروہ کے متعلق رحمت سے محرومی کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ بھی رحمت کا ہی ایک جلوہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے بھی اس کا مقصود ان لوگوں کی یا اس فرد کی اصلاح ہوتی ہے اس وجہ سے اسلام نے ہمیں یہ بتایا کہ جہنم دائمی نہیں کیونکہ اصلی جہنم تو خدا تعالیٰ کی ناراضگی ہے اس میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی دائمی نہیں جب کسی کی اصلاح ہو جائے اس دنیا میں توبہ اور استغفار کے ذریعہ یا اس دنیا میں ایک وقت معینہ تک سزا بھگتنے کے نتیجہ میں تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے دروازے اس کے لئے کھولتا ہے اور جہنم کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ نکل جاؤ سارے یہاں سے اب جہنم میں کسی کو رکھنے کی ضرورت نہیں جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی وضاحت ہے۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۲۴۴، ۲۴۵)

آیت ۵۸ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ؗ وَّ نُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝۵۸

اس آیہ کریمہ میں ایک مضمون یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگ جو ایمان پر پختگی سے قائم رہتے ہیں اور ایسے اعمال صالحہ بجالاتے ہیں جن میں فساد کی کوئی ملونی نہیں ہوتی اور وہ لوگ جن کے سارے کام اور سارے اعمال اپنے خدا کی رضا کے حصول کے لئے ہوتے ہیں، جن کا نفس مر جاتا ہے اور اس فانی انسان میں خدائے ذوالجلال کی ایک تجلی کے نتیجہ میں ایک نئی روح پھونکی جاتی ہے اور اس نئی روح کے آرام اور آسائش کے لئے اس دنیا میں ایک جنت کو قائم کیا جاتا اور پیدا کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ جنت اس قوم کے لئے اور اس اُمت کے لئے ابدی ہے اس وجہ سے لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ کہ ان کی بیویاں جو مُطَهَّرَةٌ ہیں۔

مُطَهَّرَةٌ کے ایک معنی ہیں گناہ سے بچنے والیاں۔ مُطَهَّرَةٌ کے ایک دوسرے معنی ہیں اعمال صالحہ کو بجالانے والیاں یعنی ایسے اعمال جن میں کوئی فساد نہ ہو اور مُطَهَّرَةٌ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ عورتوں کا وہ گروہ جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس قسم کا ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے بدرسوم اور مشرکانہ بدعتوں سے محفوظ رکھا ہوا ہے اور ان کا وجود دنیا کے وجود سے بالکل علیحدہ کر دیا گیا ہے بلکہ اس دنیا میں رہتی ہوئی بھی وہ جنت کی حوروں کی مانند بن گئی ہیں یعنی وہ ہر اس گند سے اور شنیع اور قبیح فعل سے پاک ہیں کہ جن میں کافرات ملوث ہوتی ہیں۔ یہ وہ عورتیں ہیں کہ جن کے گھروں میں کسی قسم کی بدرسم نظر نہیں آتی یہ وہ عورتیں ہیں جو اپنے گھر اور اپنے ماحول سے مشرکانہ بدعتوں کو دور کرنے والی ہیں چونکہ یہ ازواج مطہرات ان لوگوں کو ملی ہیں اور چونکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق عطا کی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو توحید خالص کے ماحول میں تربیت کر سکیں اور ایک سچا اور پکا اور موحد مسلمان بنا سکیں اور اس لئے اگلی نسل شیطان سے محفوظ رکھنے میں یہ عورتیں کامیاب ہو جاتی ہیں اس لئے اس جنت کو دوام مل جاتا ہے اس لئے یہ جنت ایک نسل کے لئے نہیں ہوتی بلکہ اگلی نسل کے لئے اور پھر اس سے اگلی نسل کے لئے بھی یہ دنیا کی جنت قائم رہتی ہے اور جو بشارتیں ہمیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے

ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں ان بشارتوں کی روشنی میں یہ جنت ہمارے لئے صدیوں تک قائم رہنی چاہیے۔ اگر ہم اپنی ذمہ داری کو نباہنے والے ہوں ہم مرد بھی اور ہماری مائیں اور ہماری بیویاں اور ہماری بہنیں اور ہماری دوسری رشتہ دار عورتیں بھی تو اللہ تعالیٰ کا ہم سے یہ وعدہ ہے کہ وہ اس جنت کو اس دنیوی جنت کو بھی ہمارے لئے ایک قسم کی ابدی جنت بنا دے گا لیکن اس کے لئے شرط یہی ہے کہ عورت اپنے بچوں کی صحیح تربیت کی طرف پوری طرح متوجہ رہے۔ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ اس معنی میں مطہّرہ ہوں کہ کوئی بدرسم ان کے گھروں میں نہ ہو اور کسی مشرکانہ بدعت کے ساتھ ان کو کوئی تعلق باقی نہ رہے خالص توحید کا ماحول پیدا کرنے والی ہوں اور اس خالص توحید کے ماحول میں اپنے بچوں اور بچیوں کی تربیت کرنے والی ہوں۔ (خطبات ناصر جلد اول صفحہ ۵۹۴، ۵۹۵)

آیت ۵۹ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۵۹

دوسری ذمّہ داری جو ایک احمدی کی ہے اور جس کے متعلق شروع سے ہی جماعت کی تربیت کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ قانونِ ملکی کو کبھی اپنے ہاتھ میں نہیں لینا۔ ہمارے متعلق لاء ابائیڈنگ پیپل (Law Abiding People) کہا جا سکتا ہے کہ ہم قانون کی پابندی کرنے والے اور قانون کے مطابق اپنی زندگیوں کو گزارنے والے ہیں۔ آیت کا جو چھوٹا سا ٹکڑا میں نے سورۃ فاتحہ کے بعد پڑھا تھا اس میں اُولِي الْاَمْرِ کے لفظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ (تیسری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ بھی میں اس کے ساتھ ہی شامل کر لیتا ہوں) ایک تو ہم لاء ابائیڈنگ پیپل (Law Abiding People) یعنی قانون کے پابند اور قانون کی اطاعت کرنے والے لوگ ہیں اور دوسرے جن کو قانون صاحبِ اختیار بناتا ہے ہم اُن کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتے ہیں۔ یہ بھی اسی کے اندر آ جاتا ہے یعنی قانون کی اطاعت کرنا اور قانون شکنی سے بچنا ہی یہ تقاضا کرتا ہے کہ جن لوگوں کو قانون نے حکومت کا اختیار دیا ہے قانون کے اندر رہتے ہوئے اُن کی بھی اطاعت کی جائے۔ اُن کا یہ فرض ہے کہ وہ قانون کے خلاف کوئی کام نہ کریں اور قانون کے خلاف کوئی حکم نہ دیں اور ہر شہری کا یہ فرض

ہے اور ہر احمدی کا خصوصاً، جن کو میں اس وقت مخاطب کر رہا ہوں کہ وہ قانون شکنی نہ کریں اور قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔ (خطباتِ ناصر جلد ششم صفحہ ۴۶۵)

آیت ۹۵ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا١ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا١ٞ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ١ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا١ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۰۰۹۵

قرآن کریم نے اسلام اور مسلم کو دو مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ اس کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ جو تمہیں سلام کہتا ہے اُسے تم یہ نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔ وہ بالکل زبان کا ایک عام اقرار ہے۔ حقیقی اسلام یعنی نفس کو خدا کے حضور سونپ دینے کا مطلب نہیں ہے وہاں یہ مطلب ہے کہ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (النساء: ۹۵) کہ جو تمہیں السلام علیکم کہے تمہارا حق یہ نہیں کہ تم کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔ وہ ظاہری حکم ہے جو ظاہری فساد کو روکنے کے لئے دیا گیا ہے اور اس کے اندر بڑی حکمت ہے لیکن اسلام کا وہ مقام جس کے بعد خوف اور حزن باقی نہیں رہتا وہ وہ مقام ہے جہاں انسان اپنے وجود کو اعتقاداً اور عملاً اپنے رب کے حضور پیش کر دیتا ہے اور اسے سونپ دیتا ہے۔
(خطباتِ ناصر جلد پنجم صفحہ ۵۴)

دوسروں میں عیب تلاش کرنا، اپنا وقت ضائع کرنا اور خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ اس حد تک اس پر زور دیا کہ فرمایا جب ہم کہتے ہیں لَا تَجَسَّسُوْا تو ہماری مراد یہ ہے کہ جب کوئی شخص ایمان کے دعویٰ کے ساتھ (زبانِ قال سے یا زبان حال سے) تمہیں سلام کہے (کوئی شخص سفر کر رہا ہے، پیدل چل رہا ہے، رستے میں ایک شخص ملا اس نے سلام کیا) لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (النساء:۹۵) تمہیں تجسس کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے ایمان کا اظہار کرتے ہوئے سلام کیا ہے۔ تم اسے مومن سمجھو۔ تجسس کا نتیجہ تب نکلتا، اگر انسان عیوب کی سزا دینے کا اختیار رکھتا اور اس کی طاقت بھی ہوتی۔ تو جب نہ طاقت ہے نہ اختیار، تو بے نتیجہ ہے تجسس۔ جسے طاقت حاصل ہے اور جس کے اختیار میں ہے سزا دینا یا معاف کر دینا، وہ تو اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے، اس سے کوئی چیز چھپی

ہوئی نہیں ۔ جب تمہاری طاقت میں نہیں، جب تمہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسا اختیار نہیں دیا گیا تو تمہارا تجسس کرنا بے مقصد، بے نتیجہ، اپنے وقت کا ضیاع اور دنیا میں فساد اور بدامنی اور معاشرے میں الجھن پیدا کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ''نہ کرنے والی'' باتیں بالواسطہ یا بلاواسطہ لغو سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔

(خطباتِ ناصر جلد نہم صفحہ ۴۵۷)

چھٹی شکل اللہ تعالیٰ نے جو مجاہدہ فی سبیل کی بتائی ہے وہ ہے خدا کے دین کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے انسان سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرے۔ سفر میں بہرحال ویسا آرام نہیں مل سکتا جیسا کہ اپنے گھر میں ملتا ہے۔ بعض لوگ سفر سے گھبراتے ہیں۔ بعض لوگ بار بار سفر کرنے سے گھبراتے ہیں۔ تو ہمارے مربی، معلم اور انسپکٹر صاحبان کو جو سال کے چھ سات ماہ سفر میں رہتے ہیں خوش ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بھی اپنی راہ میں مجاہدہ قرار دیا ہے۔ اور اس کی جو برکات ایک مجاہد پر نازل ہوتی ہیں یہ لوگ بھی اس کے وارث ہیں۔ جیسا کہ فرمایا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اگرچہ اس آیت میں اپنی کانٹیکسٹ (Context) کے لحاظ سے یعنی اس مضمون کے لحاظ سے جو اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ یہ سفر جنگ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ لیکن جنگ کرنے کا ثواب علیحدہ ہے۔ اور اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کا ثواب علیحدہ یہاں بتایا گیا ہے۔ اسی طرح اِنْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (التوبة: ۳۸) ہے۔ تو بہت دفعہ خدا کی راہ میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً وقف عارضی میں وقف کرنے والوں کو میں نے یہی کہا تھا کہ تم بتاؤ کہ تم کتنا سفر کر سکتے ہو؟ اس کے جواب میں بعض دوستوں نے لکھا کہ ہم اپنے خرچ پر پندرہ بیس میل سفر کر سکتے ہیں بعض نے لکھا کہ ہم پچاس ساٹھ میل سفر کر سکتے ہیں۔ بعض نے لکھا کہ ہم سَو ڈیڑھ سَو میل سفر کر سکتے ہیں۔ بعض نے لکھا کہ سارے پاکستان میں جہاں آپ کی مرضی ہو بھجوا دیں۔ ہم سفر کرنے کے لئے تیار ہیں تو ایسے مومن بھی مجاہدین میں شامل ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کی راہ میں سفر کرنے کو بھی اللہ تعالیٰ نے مجاہدہ کی ایک قسم قرار دیا ہے۔

(خطباتِ ناصر جلد اوّل صفحہ ۴۴۷، ۴۴۸)

آیت ۱۱۱ تا ۱۱۴ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ

یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَ مَنْ یَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا یَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَ
كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۱۲﴾ وَ مَنْ یَّكْسِبْ خَطِیْٓـَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ
بَرِیْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا ﴿۱۱۳﴾ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ وَ
رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ یُّضِلُّوْكَ ؕ وَ مَا یُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ
مَا یَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَیْءٍ ؕ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا
لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا ﴿۱۱۴﴾

سورۃ نساء کی ان آیات میں گناہ کی حقیقت اور فلاسفی اور خدا تعالیٰ کی بعض صفات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص بھی کوئی بدی کرے گا یا اپنے نفس پر ظلم کرے گا اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا پائے گا۔ پھر فرماتا ہے کہ جو شخص کوئی بدی کرے اس کا فعل اسی پر الٹ کر پڑے گا اور اللہ تعالیٰ بہت جاننے والا اور حکمت والا ہے اور پھر فرماتا ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی غلطی کرے اور گناہ کا مرتکب ہو اور خود گناہ کا مرتکب ہے لیکن الزام لگاتا ہے کہ یہ گناہ میں نے نہیں کیا بلکہ فلاں نے کیا تو وہ بہتان بھی باندھتا ہے اور بہت بڑے گناہ، سب سے بڑے گناہ کا وہ مرتکب ہوتا ہے۔

پہلی آیت میں دو قسم کے حقوق کی ادائیگی نہ کرنے کا ذکر ہے۔ ایک حقوق العباد ایک حقوقِ نفس یعنی جو اللہ تعالیٰ نے حقوق انسانوں کے انسان پر قائم کئے ہیں ایک انسان ان حقوق کو توڑنے والا ہے۔ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا وہ بدی کرتا ہے اور یہ نتیجہ ہم اس لئے نکالتے ہیں، یہ معنی ہم اس لئے کرتے ہیں کہ اس کا دوسرا حصہ اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ کہا گیا ہے کہ خود اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور نفس کے حقوق کو بجا نہیں لاتا، تو اس سے ہمیں یہ پتا لگتا ہے، ویسے تو قرآن کریم کے بہت سے بطون ہیں ایک معنی ہم یہ کرتے ہیں کہ جو شخص غیروں کے حقوق کو پامال کرتا ہے وہ اپنے نفس کے حقوق کا بھی خیال نہیں کرتا اور اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔

یہ گناہ کا ارتکاب جو ہے خواہ وہ حقوق العباد کو تلف کرنے کے نتیجہ میں ہو یا حقوق نفس کے تلف

کرنے کے نتیجہ میں ہو یہ ایک تو بشری کمزوریوں کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی ہر انسان میں بعض کمزوریاں ہیں اور بڑی کمزوری جس کی وجہ سے وہ گناہ پر دلیر ہو جاتا ہے یہ ہے جو بڑی طاقت بھی ہے اس کی ایک نقطہ نگاہ سے اور دوسرے نقطہ نگاہ سے بہت کمزوری بھی ہے وہ ہے اس کا صاحب اختیار ہونا کہ خدا تعالیٰ نے اسے یہ اختیار دیا کہ چاہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر ایمان لائے اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالے اور اگر چاہے تو وہ خدا تعالیٰ کے احکام ماننے سے انکار کرے اور ظلم اور گناہ اور اثم کا مرتکب ہو۔ ایک پہلو سے بے انتہا فضلوں کا وہ وارث بنتا ہے بوجہ صاحبِ اختیار ہونے کے اور دوسری طرف اس کو یہ خدشہ بھی لگا رہتا ہے کہ وہ خدا کو ناراض کرنے والا اور اس کے غضب کے نیچے آنے والا نہ ہو جائے۔

انسان کو چونکہ ایک متمدن نوع بنایا گیا ہے مختلف الانواع ذمہ داریاں انسانی معاشرہ میں مجموعی طور پر انسان کو ادا کرنی پڑتی ہیں بعض ذمہ داریاں ہیں اس کے لئے بڑی کثیف اور کرخت قسم کی طبیعتوں کی ضرورت ہے۔ بعض ذمہ داریاں ہیں جن کی ادائیگی کے لئے بہت لطیف طبائع کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کے پیش نظر انسان انسان کی قوتوں اور استعدادوں میں فرق پیدا کیا اور مختلف الاقسام طبائع اس نے پیدا کر دیں کیونکہ ذمہ داریاں مختلف تھیں۔ بعض ذمہ داریاں ایسی ہیں کہ جن کے نتیجہ میں انسان جو ہے وہ زیادہ گناہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے لئے پناہ کا کوئی راستہ بچاؤ کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا، اللہ تعالیٰ اس کی رحمت کے سامان نہ کرتا تو وہ کہہ سکتا تھا کہ اے میرے خدا! تو نے مجھے اپنی مصلحتوں کے نتیجے میں اس قسم کے کثیف قویٰ دے دیئے اگر میں ان کے نتیجہ میں کوتاہی کروں کہاں جاؤں تیرے در پر نہ آؤں تو۔ تو اس وجہ سے بھی کمزوری پیدا ہوتی ہے، گناہ پیدا ہوتا ہے لغزش ہوتی ہے ارتکاب تلف حقوق ہوتا ہے تو اس کے لئے یہ دروازہ کھلا رکھا خدا تعالیٰ نے۔ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ پھر وہ توبہ کرتا ہے اور ندامت کے جذبات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ تو باوجود اس کے کہ اس قسم کی طبعی کمزوری کے نتیجہ میں بار بار وہ کمزوری کی طرف جھکے گا جب بھی جھکے گا اور اس کے بعد اس کے دل میں ندامت پیدا ہوگی۔ وہ ہمیشہ ہی بار بار خدا تعالیٰ کو غفور اور رحیم پائے گا۔ تو کمزوریوں کے دروازے بھی اس کے اوپر کھلے ہیں بڑے لیکن خدا تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی رحمت کے دروازے بھی بڑے کھلے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس آیت کی تفسیر میں جو باتیں فرماتے ہیں ان میں سے دو ایک یہ ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ

’’جیسے لغزش اور گناہ نفوس ناقصہ کا خاصہ ہے ...... خدا کا ازلی اور ابدی خاصہ مغفرت و رحم ہے ...... یعنی جب کبھی کوئی بشر بروقت صدورِ لغزش و گناہ بہ ندامت وتوبہ خدا کی طرف رجوع کرے تو وہ خدا کے نزدیک اس قابل ہو جاتا ہے کہ رحمت اور مغفرت کے ساتھ خدا تعالیٰ اس کی طرف رجوع کرے ...... یہ خدائے تعالیٰ کی ذات میں خاصہ دائمی ہے‘‘ (براہین احمدیہ۔ روحانی خزائن جلد اوّل صفحہ ۱۸۷ حاشیہ)

یعنی ایک ہزار بار بھی وہ غلطی اور گناہ کرتا ہے اور ایک ہزار بار اگر اس کے دل میں ندامت پیدا ہوتی ہے اور خدا کی طرف وہ رجوع کرتا ہے تو ایک ہزار بار وہ بخشا جاتا اور خدا کی مغفرت کے نیچے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس سلسلے میں جو مختلف قویٰ کے ساتھ مختلف انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے مثال آپ نے یہ دی ہے کہ طبائع انسانی جواہر کانی کی طرح مختلف الاقسام ہیں۔

کان معدنیات سے جو چیزیں نکلتی ہیں نا، وہ مختلف ہیں، ان کی طرح انسانی طبیعتیں بھی مختلف ہیں۔ یہ میں نے اب میرے الفاظ ہیں خلاصہ کیا ہے میں نے، بعض چاندی کی طرح روشن بعض گندھک کی طرح بدبودار اور جلد بھڑکنے والی اور جوش میں آنے والی، بعض پارے کی طرح بے ثبات اور بے قرار، بعض لوہے کی طرح سخت اور کثیف اور میں ساتھ یہ مثال بھی دیتا ہوں کہ بعض ہیرے کی طرح روحانی شعاعوں سے جگمگانے والی مختلف قسمیں ہیں اور اس کے بغیر انسانی تمدن اپنے عروج کو ارتقائی ادوار میں سے گذرتا ہوا پہنچ نہیں سکتا تھا۔ کثیف کاموں کے لئے کثیف طبیعتوں کی ضرورت ہے لطیف کاموں کے لئے لطیف طبیعتوں کی ضرورت ہے۔ بعض ایسے کام ہیں مثلاً اب تو کچھ انسان نے سہولتیں اور قسم کی پیدا کر لیں لیکن ایک خاص وقت میں غسل خانوں وغیرہ کی گلیوں کی نالیوں کی صفائی بعض خاص قسم کی طبیعتیں ہی کر سکتی تھیں ہر آدمی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک لطیف طبیعت کا آدمی گزرتے ہوئے ناک پر رومال ڈال کے گذرتا تھا ایک دوسرا آدمی اپنا ہاتھ بیچ میں ڈال کے نالی کو

صاف کر رہا ہے۔ طبیعتوں طبیعتوں میں بڑا فرق ہے۔ بے شمار قسمیں بن جاتی ہیں ان کو ہم گن نہیں سکتے لیکن ایک حقیقت اپنی جگہ محکم اور ثابت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی کمزوری انسان کی ایسی نہیں کہ اگر اس کے نتیجہ میں وہ خدا کو ناراض کرنے والا ہو جائے تو اس پر توبہ کا دروازہ بند ہو اور خدا تعالیٰ کی مغفرت اور رحم سے ہمیشہ کے لئے اسے محروم کر دیا جائے۔ نہیں بلکہ خدا تعالیٰ میں جو مغفرت اور رحم کی صفت ہے غفور اور رحیم ہونا اس کا، یہ ازلی ابدی صفت ہے اور ایک فرد واحد، میں نے تو ہزار دفعہ کہا تھا اگر لاکھ دفعہ کروڑ دفعہ بھی غلطی کرتا اور کروڑ دفعہ اپنے رب کریم کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے توبہ اور ندامت کے جذبات کے ساتھ تو ایک کروڑ دفعہ اس پر خدائے رب کریم کا دروازہ کھولا جائے گا۔

اس آیت میں ایک لوگوں کے حقوق کی ادئیگی کا اشارہ ہے یا عدم ادائیگی کی طرف یعنی ادائیگی ہوگی تو وہ ثواب ہے اور اگر نہیں ادائیگی کرے گا تو وہ سُوْٓءًا ہے، بدی ہے۔ ایک اپنے نفس کے حقوق کی ادائیگی ہے۔ اپنے نفس کے حقوق کو ادا کرنا، اس آیت سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے، اتنا ہی ضروری ہے جتنا غیروں کے حقوق کی ادائیگی اپنے نفس کے ساتھ۔ پھر ایک دائرہ آ جاتا ہے خاندان کا۔ جو حقوق خدا تعالیٰ نے کسی کے رشتہ داروں کے قائم کئے ہیں اگر ذمہ وار آدمی وہ حقوق ادا نہ کرے صرف اس لئے کہ اس کے اوپر کوئی اعتراض کرنے والا یہ اعتراض کر دے گا کہ چونکہ تمہارے ساتھ عزیز داری ہے اس لئے تم اس کی رعایت کر دو گے تو اسلام اس کو گناہ سمجھتا ہے اور اس شخص کے حق کو قائم کرنا اور اس کو ادا کرنا جو خدا تعالیٰ نے قائم کیا ہے اس کو ثواب اور جنت کا دروازہ کھولنے والا ایک عملِ صالح سمجھتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے۔ آپ کے ایک عزیز کا ایک دوسرے مسلمان کے ساتھ چشمے کا پانی تھا بہر حال ایک کنارہ تھا قدرتی، اس پانی کے اوپر ہوا جھگڑا۔ آپ کے عزیز کی زمین اوپر تھی پانی کی طرف۔ دوسرے مسلمان کی نیچے تھی۔ وہ آیا آپ کے پاس۔ آپ نے کہا اپنے عزیز کو کہ کھیتوں کو اپنے پانی دو بے شک لیکن اس کے لئے بھی چھوڑ دیا کرو پانی۔ وہ کہنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ اس لئے کہہ رہے ہیں کہ اس کی رشتے داری ہے آپ کے ساتھ۔ آپ تو احسان کر رہے تھے یعنی جو حق تھا اس سے زائد اس کو دے رہے تھے جب اس نے یہ کہا تو پھر آپ نے کہا الفاظ میں یا عمل سے کہ اچھا تم اسلامی تعلیم کے مطابق فیصلہ کروانا چاہتے ہو تو وہ یہ ہے کہ اپنے عزیز کو کہا تمہاری زمین اوپر ہے تم اپنے کھیت کو پانی پلاؤ۔ پھر پانی پلاؤ، پھر پانی پلاؤ اور

پوری طرح جب سیراب ہوجائے پھر پانی جو بچ جائے وہ اس کو چھوڑ دو، آپ ہی اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ تو نفس کے حقوق ہوں یا غیر کے حقوق ہوں، عزیز رشتے دار کے حقوق ہوں یا غیر مسلم کے حقوق ہوں حقوق کی ادائیگی تو اس لئے کرنی ہے کہ خدا کہتا ہے کہ میں نے یہ حق قائم کیا اس حق کو قائم کرو۔ اس لئے ہم نے ادا نہیں کرنا کہ ہم چاہتے ہیں ہم کسی پہ احسان کریں یا ہم چاہتے ہیں کہ کسی پہ احسان نہ کریں۔ جو حق خدا نے قائم کر دیا مثلاً جو حق خدا نے رب العالمین کی حیثیت سے قائم کر دیا کوئی دنیا میں انسان نہیں پیدا ہوا کہ جسے خدا نے یہ حق دیا ہو کہ وہ ان حقوق کو پامال کرے خواہ وہ حقدار جو ہیں وہ بت پرست اور مشرک ہی کیوں نہ ہوں خواہ وہ خدا تعالیٰ کو گالیاں دینے والے دہریہ کیوں نہ ہوں خواہ وہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم ہستی کی اندھی مخالفت کرنے والے کیوں نہ ہوں خواہ وہ ساری عمر آپ کو ایذا پہنچانے والے کیوں نہ ہوں۔ کسی کو کوئی حق نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا اسوہ جو ہمیں نظر آتا ہے یعنی نمونہ ہمارے لئے وہ یہ ہے کہ جس حق کو خدا نے قائم کیا بندے کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اس حق کو توڑے۔ خدا تعالیٰ نے جو حق قائم کئے ہیں وہ بنیادی طور پر صفتِ ربوبیت کے نتیجہ میں ہیں صفتِ رحمانیت کے نتیجہ میں ہیں صفتِ رحیمیت کے نتیجہ میں ہیں، صفتِ مالکیت یوم الدین کے نتیجہ میں ہیں، جس کا ایک دھندلا سا عکس اس ہماری زندگی میں آتا ہے وہ اپنا مضمون مستقل حیثیت کا ہے اس وقت نہیں ہمارے سامنے۔ تو حقوق العباد کو قائم کرنا ضروری ہے حقوقِ نفس کو ادا کرنا ضروری ہے جو نہیں کرتا، پھر توبہ کرتا اور استغفار کرتا، خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان کیا ہے اسے میں معاف کر دوں گا۔

اور دوسری آیت میں ہر قسم کے گناہ کا اِثْمًا میں ذکر ہے یعنی خواہ حقوقِ نفس ہوں یا حقوق العباد ہوں یا حقوق اللہ ہوں جو شخص بھی گناہ کرتا ہے وَ مَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا جو شخص بھی بدی کرتا ہے تو بدی کا پہلا اور جو پہلا اور آخری اثر میں کہوں گا، پہلا اور آخری اثر اس کا اس کے اپنے نفس پر ہے۔ فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ اس کا فعل اس پر الٹ کے پڑتا ہے مثلاً اگر وہ چوری کرتا ہے دوسرے کا مال لوٹتا ہے اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس کے اس گناہ نے اس کے دوسرے انسانی بھائی کو دکھ پہنچایا، اس کا گناہ کیا اس نے لیکن اس کا حقیقی اثر یہ ہے کہ اس شخص نے اپنے پر خدا کی رضا کی جنت کے دروازے بند کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا ہر حکم جو ہے خواہ وہ اوامر میں سے ہو یا نواہی میں سے ہو یعنی یہ

حکم ہو کہ ایسا کرو یا یہ حکم ہو کہ ایسا نہ کرو وہ ہماری قوتوں اور استعدادوں کی صحیح تربیت اور صحیح نشوونما کے لئے ہے اور جب ہم کسی حکم کو توڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کہنا نہیں مانتے تو اس کا نقصان ہمیں ہے کیونکہ پھر ہماری صحیح اور پوری اور پیاری نشوونما نہیں ہوسکتی، پھر ہمارے وجود کی وہ نشوونما نہیں ہوسکتی جس نشوونما کے بعد ہمارا نفس خدا کے پیار کو حاصل کر سکے۔ تو گناہ کا اثر دوسرے پہ بھی پڑتا ہے لیکن اصل وہ الٹ کے اسی شخص پہ گناہ کرنے والے پر آ کے پڑتا ہے اور یہ اس لئے کہا کہ خدا تعالیٰ عَلِيۡمًا خدا تعالیٰ کے علم سے کوئی باہر نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ نے انسانی فطرت کو پیدا کیا اور اس کی ساری قوتوں اور استعدادوں کا صحیح اور کامل علم رکھنے والا ہے۔ انسانی استعدادوں اور قوتوں اور صلاحیتوں کی کامل نشوونما کے لئے اور جس کے نتیجہ میں روحانی نشوونما اپنے کمال کو پہنچتی اپنے اپنے دائرۂ استعداد کے اندر اور خدا تعالیٰ کے زیادہ سے زیادہ پیار کو حاصل کرنے والی بن جاتی ہے۔ اس علیم نے، اس عظیم خدا نے سارا اس علم کے ماتحت ایک طرف اس عالمین کو پیدا کیا اور دوسری طرف انسان کو اور اس کی فطرتوں کو اور اس کی صلاحیتوں کو اور اس کے قویٰ کو پیدا کیا اور ہر چیز میں اس نے ایک حکمت رکھی اور ہر چیز کی حکمت اس نے قرآن میں بیان کی اور ہمیں سمجھایا کہ تمہارے اوپر کوئی بوجھ نہیں ڈال رہے تمہارے فائدے کے لئے ہر حکم ہے، تمہیں بلند کرنے کے لئے ہر حکم ہے۔ ایک جگہ کہا کہ ہم نے تو اس کو آسمانوں کی بلندیوں کی طرف لے جانا چاہا تھا لیکن وہ زمین کی طرف مائل ہو گیا اور خدا سے دور ہو گیا۔ ہر فعل خدا کا حکیمانہ ہے حکمت رکھتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا ہر حکم جو ہے وہ ایک دلیل ہمارے سامنے رکھتا ہے ہمیں حکمت بتاتا ہے کہ ایسا کیوں ہے اور کوچ مانج کے، حسین بنا کر، پاک اور مطہّر وجود بنا کر اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ جو سرچشمہ ہے پاکیزگی اور طہارت کا ہمارا رب، اس کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہوسکے۔ وہ جو پاکیزگی اور طہارت کا سرچشمہ ہے وہ ناپاک سے تو تعلق نہیں قائم کرسکتا، عقلاً نہیں کرسکتا۔ میں اور آپ بدبودار جگہ سے گزرتے ہیں اور اس سے گھن آتی ہے اور اس تعفّن کو ہم پسند نہیں کرتے، ہماری طبیعت متلا جاتی ہے بعض دفعہ۔ ہم عاجز بندوں کا یہ حال ہے تو وہ خدا جو محض پاکیزگی اور طہارت ہے اور ہر قسم کی پاکیزگی اور طہارت کا چشمہ جو ہے وہ اسی سے نکلتا اور ہم تک پہنچتا ہے وہ ناپاک کو کیسے پیار کرے گا۔ تو ہر حکم جو ہے وہ ہمیں پاک بنانے والا مطہّر بنانے والا ہمارے گند کو اور غلاظتوں کو دھونے والا، ہم پر نور چڑھانے والا اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (النّور:۳۶) اس نور کو،

ہمارا وہ نور جو خدا تعالیٰ سے ہمیں حاصل ہوتا ہے اس نور کو خدا پسند کرتا ہے۔ خدا اندھیروں کو پسند نہیں کرتا اندھیروں سے وہ نفرت کرے گا کیونکہ اندھیرا ہے خدا سے دوری کا نام جس طرح مادی ظلمت ہے نور سے دوری کا نام۔ دن کے وقت آپ کھڑکیاں اگر آپ کی لائٹ پروف ہوں یعنی کوئی سورج کی کرن اندر نہ جاسکے بند کر دیں گے تو دن کے باوجود سورج نصف النہار پر ہوگا آپ کے کمرے کے اندر اندھیرا ہو جائے گا۔ تو جو شخص اپنے گناہوں کے نتیجہ میں اپنے وجود کی ان کھڑکیوں کو جو خدا تعالیٰ کی طرف کھلنے والی ہیں بند کر دیتا ہے اور اپنے نفس میں اندھیرا پیدا کر دیتا ہے خدا کا نور وہاں کیسے داخل ہو سکتا ہے۔

تو یہاں دوسری آیت میں یہ بتایا کہ تم جو گناہ کرتے ہو دوسروں کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ حقیقی نقصان اس لئے نہیں کہ خدا تعالیٰ اس کا بدلہ ان کو دیتا ہے۔ تمہیں حقیقی نقصان ہے کیونکہ تم خدا سے دوری کی راہوں کو اختیار کر کے، اس نور سے دور ہٹ کے ظلمات کو اختیار کر کے، اس پاک سے جدائی اختیار کر کے گندگی کو اختیار کرتے، اس کی ناراضگی کی جہنم کو اپنے لئے پیدا کرتے ہو۔ خدا تعالیٰ کی رضا کی جنتوں کے وارث بننے کے لئے سامان پیدا نہیں کرتے۔

اور تیسرے قسم کا جو گناہ مرکب ہے کہ گناہ کیا اور تہمت دوسرے پہ لگا دی، یہ اس کا بھی آج کل فیشن ہوا ہوا ہے کہ ناکردہ گناہ پر گناہ کی تہمتیں لگائی جاتی ہیں اور پھر فخر بھی کیا جاتا ہے بعض حلقوں میں۔ اللہ تعالیٰ فضل کرے اور سمجھ دے ان لوگوں کو۔

تو یہاں تین باتیں بیان ہوئی ہیں۔ حقوق العباد کی ادائیگی کی طرف توجہ، حقوقِ نفس کی ادائیگی کی طرف توجہ، حقوق اللہ کی ادائیگی کی طرف توجہ اور انسان بشری کمزوری یا ضعف استعداد کے نتیجہ میں اگر گناہ کرے تو استغفار کا دروازہ اس کے لئے کھلا ہے اور غفور رحیم خدا ہر وقت اسے جب وہ اس کی طرف رجوع کرے رجوع برحمت اس کی طرف ہونے کے لئے تیار ہے اور پھر ہمیں یہ سمجھایا کہ تمہارے اوپر کوئی بوجھ نہیں ڈالا جارہا بلکہ ہر گناہ تمہارے لئے ابدی دکھ کا باعث بننے والا ہے اس سے بچانے کی کوشش کی جارہی ہے تمہیں۔ تمہارے اپنے فائدے کے لئے ہے۔ چوری کے مال کا نقصان جتنا اس مال کے مالک کو ہے اس سے زیادہ تمہیں ہے۔ اس کو تو ہزار روپے کا نقصان یا ایک بھینس چرا لیتے ہیں لوگ، جا کے رسّہ کھول لیتے ہیں رسّہ گیر۔ اس کو دو ہزار تین ہزار بہت اچھی بھینس

ہے تو پانچ دس ہزار کی اس کا اتنا نقصان ہے لیکن تم نے جنت کے دروازے اپنے اوپر بند کر لئے اس کا نقصان تو تمہارے نقصان کے مقابلے میں کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ تو اِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ہر گناہ جو ہے اس کا اصل وار جو ہے انسان کے، گناہگار کے اپنے نفس کے اوپر ہے اور ہر شخص کو یہ سوچنا چاہیے کہ ہر حکم جو دیا گیا وہ علیم وحکیم کی طرف سے دیا گیا ہے جو جانتا تھا کہ تمہارے فائدے کے لئے تم پہ حسن چڑھانے کے لئے، تمہیں منور کرنے کے لئے، تمہیں پاکیزہ اور مطہر بنانے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت تھی اس کے مطابق تمہیں ہدایت اور شریعت دی گئی، اس کے مطابق تمہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا ایک اسوہ دیا گیا اور تیسرے یہ کہ سب سے بڑا ظلم تو یہ ہے کہ انسان گناہ کرے اور تہمت دوسرے پہ لگا دے اس کو اپنی زیادہ فکر کرنی چاہیے۔ ہر ایک کو ہی توبہ اور استغفار کا جو دروازہ کھلا چھوڑا ہے خدا تعالیٰ خدائے غفور رحیم نے، گناہ ہوتے ہی خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا کرے اور ہمیں اس طرح صاف اور ستھرا اور سفید کر دے اس سے بھی زیادہ جتنا ایک دھوبی کپڑے کو پتھروں پہ مار مار کے شفاف پانی میں کرتا ہے۔ آجکل کے بعض گندے پانیوں میں بھی دھوبی دھو دیتے ہیں، شفاف پانی میں جو پہاڑی نالوں کا میٹھا شفاف پانی ہے اس کے اندر ایسے اجزا ہیں جو گند کو نکالنے والے ہیں کوئی گند باقی نہ رہے تا کہ وہ جو نور ہے ہماری ہلکی سی روشنی کو وہ پسند کرے اس کے نور کے مقابلے میں تو کچھ نہیں لیکن بہر حال اس سے مشابہت حاصل کرنے کی اس کی صفات کا مظہر بننے کی کوشش کی گئی اور ہمیں وہ پاک بننے کی اور مطہر بننے کی توفیق عطا کرے تا کہ ہمارا اس کے ساتھ ایک زندہ تعلق پیدا ہو جائے کہ ہم اسی زندگی میں اس کے پیار کی آواز سننے والے ہوں تا کہ ہماری ساری خوشیاں اس آواز پر بنیاد رکھنے والی ہوں کہ وہ ہمیں کہتا ہے کہ تم فکر نہ کرو تم گھبراؤ نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پھر اس کے بعد کسی اور چیز کی انسان کو ضرورت نہیں رہتی۔

(خطباتِ ناصر جلد ہشتم صفحہ ۱۳۹ تا ۱۴۷)

پھر ہم لوگ جو حقیقتِ محمدیہ کو پہچانتے ہیں جانتے ہیں کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام اخلاقِ فاضلہ کو اپنے وجود اور اسوہ میں جمع کرنے والے تھے جس کی جھلک ہمیں گزشتہ تمام انبیاء میں مختلف طور پر نظر آتی ہے۔ پس انبیائے ماسبق اور خدا تعالیٰ کے وہ پیارے جو بعد میں پیدا ہونے والے تھے ان سب کے اندر ہمیں اخلاقِ فاضلہ کی جو جھلک نظر آتی ہے جو متفرق طور پر آدم علیہ السلام سے

لے کر قیامت تک بنی نوع انسان میں پھیلی ہوئی ہے وہ تمام اخلاق ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں جمع نظر آتے ہیں۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے یہ فرمایا: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم:۵) پھر ہم جو اس علم پر علیٰ وجہ البصیرت قائم کئے گئے ہیں کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء اور ختم المرسلین ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں اور دنیا میں اس کی منادی کرتے ہیں کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی مجددِ اعظم ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ اظہار صداقت کے لئے آپ جیسا کوئی اور مجدد پیدا نہیں ہوا۔ سچائی کے اظہار کے لئے گم گشتہ سچائی کو دوبارہ دنیا میں لانے کے لئے آپؐ ہی سب سے بڑے مجدد ہیں۔ روحانیت کے قیام کے لئے حقیقتاً آپ ہی آدم ہیں کیونکہ آدمِ اول نے آپ ہی سے سچائی کو حاصل کیا اور آپ ہی کے طفیل اس سچائی اور صداقت کو وقت کے تقاضے اور پہلی نسل کی صلاحیت کے مطابق دنیا پر ظاہر کیا لیکن حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو مجدد اعظم ہیں آپ کے طفیل تمام انسانی فضائل اپنے کمال کو پہنچے۔ پہلے کسی وجود میں یہ چیز ہمیں نظر نہیں آتی۔ اس میں شک نہیں کہ انسان نے بعض پہلوؤں سے ترقی کی اور ایک حد تک کمال کو حاصل کیا لیکن یہ کہ ہر انسان اپنے تمام فضائل کو اپنے دائرہ استعداد کے اندر کمال تک پہنچانے کے قابل ہو سکے یہ صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہوا۔ آپ دنیا میں آئے اور اپنا کامل نمونہ دنیا میں پیش کیا اور ایک کامل تعلیم انسان کے ہاتھ میں دی جس کے نتیجہ میں انسانی فضائل اپنے کمال کو پہنچ سکنے کے قابل ہوئے۔ انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے جس قدر بھی تقاضے رکھے ہیں یا انسانی وجود کی جس قدر بھی شاخیں ہیں ان تمام کے لئے یہ سامان پیدا ہو گیا کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ سکے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ معلّمِ اعظم بھی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے ”وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا“ وہ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں عطا ہوا ہے جو تم بحیثیت ایک بشر کے اپنے زور سے خود بخود حاصل نہیں کر سکتے تھے اور فضل الٰہی سے فیضان الٰہی سب سے زیادہ آپ پر ہوا جس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت جس کو ہم معارفِ الٰہیہ بھی کہتے ہیں اور اسرار اور علومِ ربّانی جو ہیں ان کے جاننے میں آپ اعلم تھے یعنی آپ سے زیادہ ان کا عرفان رکھنے والا کوئی بھی نہیں ہوا اور جو زیادہ جانتا ہے جو سب سے زیادہ علم رکھتا ہے وہی سب سے زیادہ سکھا بھی سکتا ہے اگر آپ علم کی سو اکائیاں فرض کریں تو جس شخص کو پچاس اکائی کا علم ہے وہ ساٹھ اکائی نہیں سکھا سکتا۔

سو کی سَوا کائی وہی سکھا سکتا ہے جو خود سوا کائی کا علم رکھتا ہو۔ پس عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا میں اللہ تعالیٰ نے دنیا کو یہ بتایا کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر علم کے میدان میں (علم روحانی لیکن علم جسمانی کے اصول بھی اسی علم روحانی کے نیچے آتے ہیں) جتنا فضل حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا اتنا کسی اور پر نہیں ہوا۔ جس قدر انسان کو علم روحانی کی ضرورت تھی وہ سب آپ کو سکھایا گیا اور آپ کے طفیل نوعِ انسانی اس قابل ہوئی کہ اگر وہ کوشش اور ہمت سے کام لے تو اپنے اپنے ظرف کے مطابق اپنی علمی استعدادوں کو کمال تک پہنچا سکتی ہے۔

(خطبات ناصر جلد سوم صفحہ ۶۴ تا ۶۶)

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۙ﴿۱۴۶﴾

تیسرا ایک اور محاذ ہے جس کا ذکر شروع میں ہی اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور پھر مختلف صورتوں میں کافی لمبی بحث بھی اس مسئلہ پر قرآن کریم نے کی ہے اور وہ ہے نفاق کا محاذ، سورۃ بقرہ کے شروع میں ہی نفاق کے متعلق جب بحث ہوئی ہے تو بہت سی آیتوں میں زیادہ تفصیل سے بات کی گئی ہے کیونکہ نفاق ایک ایسی بیماری ہے جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا ملتی ہے اتنی بڑی سزا کسی اور گناہ کے نتیجہ میں نہیں ملتی۔ قرآن کریم نے کہا ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ یعنی جو سزا خدا کے حضور منافق کے لئے مقدر ہے وہ مشرک کے لئے بھی مقدر نہیں، کافر کے لئے بھی مقدر نہیں۔

(خطباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۳۵)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۱﴾

قرآن کریم نے یہ اعلان کیا۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ اور یہ بھی اعلان کیا فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ یعنی تمہیں اختیار تو ہے کہ تمہاری مرضی ہو تو ایمان لاؤ اور مرضی ہو تو نہ لاؤ لیکن یہ بھی تمہیں بتا دیا جاتا ہے کہ تمہاری

بھلائی اسی میں ہے کہ تم ایمان لے آؤ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّكُمْ۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے رسول حق لے کر تو آ گیا ہے تمہیں اجازت بھی دے دی گئی۔تمہاری مرضی ہے ایمان لاؤ یا نہ لاؤ لیکن تمہیں یہ بتا دینا ضروری ہے فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّكُمْ تم ایمان لاؤ گے تو اس میں تمہاری اپنی بھلائی ہے۔غرض خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو بڑے پیار سے سمجھاتا ہے کہ بنیادی طور پر مذہبی آزادی تو ہے لیکن حقیقی کامیابی اسی میں ہے کہ انسان خدا اور اس کے رسول پر ایمان لا کر اعمالِ صالحہ بجالائے جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔

(خطباتِ ناصر جلد ہفتم صفحہ ۲۲۲، ۲۲۳)

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ﴿۱۷۵﴾ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ یَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ﴿۱۷۶﴾

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے لوگو! قرآن ایک برہان ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے تم کو ملی ہے اور ایک کھلا کھلا نور ہے جو تمہاری طرف اتارا گیا ہے۔پس جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اس کے ذریعہ سے اپنا بچاؤ کیا ہے انہیں وہ ضرور اپنی ایک بڑی رحمت اور بڑے فضل میں داخل کرے گا اور انہیں اپنی طرف لے جانے والی ایک سیدھی راہ دکھلائے گا۔

قرآنِ عظیم جو اسلامی شریعت کی حامل کتاب ہے وہ ایک برہان ہے اور ایک نور ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے دل سے تصدیق بھی کر رہا ہو، جرأت سے اظہار بھی کر رہا ہو اور اپنے ان عقائد پر اپنے اعمالِ صالحہ سے مہر بھی لگا رہا ہو اور پھر وہ یہ سمجھتا ہو کہ اتنا کافی نہیں ہے بلکہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی خدا تعالیٰ کی حفاظت اور اس کی مدد اور اس کی رحمت اور اس کے فضل کی ضرورت ہے۔ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ اور وہ اللہ تعالیٰ کے ذریعہ سے، دعاؤں کے ساتھ اپنے بچاؤ کا اپنی حفاظت کا سامان کرے تا کہ اس کے عقائد کے اندر شیطانی وسوسے داخل نہ ہوسکیں اس کے

اعمال کے اندر کوئی شیطانی کیڑا گھن کی طرح نہ لگا ہوا ہو اور دلیری اور جرأت کے ساتھ اظہار کی اسے اللہ تعالیٰ سے توفیق ملتی رہے۔ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ میں جو حفاظت کا ذکر ہے عربی کے لحاظ سے اس کے یہ معنی کئے گئے ہیں کہ وہ یہ دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ ہماری استعدادوں میں نور پیدا کر کے، ہمارے جسم اور نفس کو فضائل سے مزین کر کے، اپنی نصرت ہمارے شاملِ حال کر کے ہمیں ثباتِ قدم عطا فرما کر ہم پر آسمانی سکینت نازل فرما کر، ہمارے قلب و ذہن کو شیطانی وساوس سے بچا کر، ہمیں اپنی اطاعت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں نیکیوں اور اعمالِ صالحہ بجالانے کی توفیق عطا کر کے ہماری حفاظت کرے۔ یہ عصمت کے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم صحیح عقائد رکھتے ہو گے اور اعمالِ صالحہ بجالاتے ہو گے اور دلیری سے اپنے ایمان پر قائم ہو گے اور دعاؤں سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت کو اور اس کی عصمت کو حاصل کرنے والے ہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور اس کے فضل تم پر نازل ہوں گے اور تمہیں ایک ایسی راہ دکھائے گا جو سیدھی اس کی طرف لے جانے والی ہے، صراطِ مستقیم ہے جو خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتی ہے اور اس کے بعد خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ صراطِ مستقیم جو خدا تعالیٰ کی طرف لے جانے والی ہے یہ دین اسلام ہے۔ اسی لئے دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کو بھیج کر، اسلامی تعلیم اور ہدایت کو بھیج کر میں خوش ہوں اور تمہارے لئے دین کے طور پر میں نے اسلام کو پسند کیا ہے۔ جب ہم اسلام پر یعنی قرآن کریم کی جو تعلیم ہے قرآن کریم کی جو ہدایت ہے قرآن کریم کا جو تفصیلی بیان ہے اس پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اسلام میں مندرجہ ذیل خصوصیات نظر آتی ہیں ان خصوصیات کو ہم تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلے نمبر پر اسلامی تعلیم، ہدایت اور شریعت کی وہ خصوصیات ہیں جن کا تعلق عرفان باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اسلام ایک ایسا مذہب اور ایک ایسی کامل تعلیم ہے جس نے ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی معرفت عطا کی ہے اور کھول کر بتایا ہے کہ اسلام کو بھیجنے والا اللہ اپنی ذات کے لحاظ سے اور اپنی صفات کے لحاظ سے کس قسم کا وجود ہے، بڑی وضاحت سے بتایا گیا ہے۔ توحیدِ باری تعالیٰ کے متعلق، اس کے قادر ہونے کے متعلق، اس کے عزیز اور حکیم ہونے کے متعلق، اس کی سزا اور اس کی

رحمت وغیرہ کے متعلق ایک جامع بیان ہمیں قرآن کریم نے دیا ہے اور جب ہم قرآن کریم کے اس بیان پر غور کرتے ہیں اور اس تعلیم کو مدِ نظر رکھتے ہیں کہ اس عظیم ہستی، اس صاحبِ عظمت وجلال ہستی کے ساتھ ہم عاجز بندے ہوتے ہوئے کیسے اپنا تعلق قائم کر سکتے ہیں تو ہمارے لئے وہ صراطِ مستقیم کھلتا ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف لے جانے والا ہے۔

اسلامی تعلیم ہدایت وشریعت کی خصوصیات کا دوسرا حصہ انسانوں کے حقوق سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں سب سے پہلے تو انسان کا اپنا نفس ہے اور سب سے مقدم اس کا اپنا نفس ہے۔ جہاں تک ہدایت پانے اور خدا تعالیٰ کے قہر سے محفوظ ہونے کا تعلق ہے ہر ایک کو اپنی فکر کرنی چاہیے۔ اس فکر کے بعد پھر اپنے ساتھیوں کی اپنے ہمسایوں کی اپنے خاندان کی اور دوسروں کی فکر کرنی چاہیے۔ جو شخص خود دوزخ میں جا رہا ہو وہ دوسروں کو جنت کی طرف تو نہیں لے جا سکتا۔ بڑی مفصل تعلیم اور بڑی حسین تعلیم ہمیں اسلام نے دی ہے اور ہمارے حقوق کو قائم کیا ہے۔ مثلاً قرآن کریم نے ایک جگہ فرمایا لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ (المآئدۃ:۱۰۶) کہ ہدایت پانے کے لحاظ سے تمہارا نفس تمہیں ہر دوسرے پر مقدم ہونا چاہیے۔ پہلے اپنے نفس کی فکر کرو اس کے بعد پھر دوسروں کی فکر کرنا۔ یہ تو میں نے ایک مثال دی ہے ورنہ قرآن کریم نے ہر شخص کے حقوق قائم کرنے کے بعد ان کی حفاظت کا سامان کیا ہے تو خصوصیات کے اس دوسرے گروہ میں نمبر ایک انسان کا اپنا نفس ہے۔

دوسرے نمبر پر ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اسلام نے عام طور پر انسانی چال چلن کے بارہ میں جو تعلیم دی ہے وہ نہایت حسین تعلیم ہے، ایسی کہ اسلام سے پہلے نہ کسی مذہب نے ایسی تعلیم دی اور نہ کسی فلاسفر اور حکیم نے ایک حد تک حکمت کی گہرائیوں میں جانے کے باوجود اس قسم کی تعلیم دنیا کے سامنے رکھی۔ عجیب تعلیم ہے، بڑی عظیم تعلیم ہے عام انسانی چال چلن کے متعلق کہ ایک انسان کا چال چلن کس قسم کا ہونا چاہیے۔

تیسری خصوصیت اسلام میں یہ ہے کہ کوئی ایسی تعلیم اس میں نظر نہیں آتی جو انسانی حقوق کے باہمی رشتہ کو توڑتی ہو بلکہ انسانی حقوق کے باہمی رشتہ کو جوڑنے والی تعلیم ہے، ان کو پختہ کرنے والی تعلیم ہے، ان میں پیار پیدا کرنے والی تعلیم ہے، ان میں حسن پیدا کرنے والی تعلیم ہے۔

خصوصیات کے اس گروپ میں سے چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام میں کوئی ایسی تعلیم نہیں جو

انسان کو دیوثی کی طرح کھینچتی ہو یا دیوثی اس کو مستلزم ہو بلکہ رذائل سے بچانے والی، گندگی سے نجات دلانے والی اور عزت کے مقام پر کھڑا کرنے والی تعلیم ہے جو برائیوں سے روکتی ہے۔ ایک کامل تعلیم منہیات کے متعلق ''نہ کر'' کے متعلق ہمیں اسلام میں نظر آتی ہے۔

پانچویں خصوصیت اسلامی تعلیم میں ہمیں یہ نظر آتی ہے کہ اس میں کوئی ایسی تعلیم نہیں جو فطرتی حیا اور شرم کے مخالف ہو۔ انسان کی فطرت میں شرم اور حیا ہے لیکن دنیا اپنی عادتوں کی وجہ سے یا دنیا اپنے ماحول کی وجہ سے بد قسمتی سے اس فطرتی حیا اور شرم کے مخالف عادات اپنے اندر پیدا کر لیتی اور ذلت کا چولہ پہن لیتی ہے اور فطرتی حیا اور شرم کو مار دیتی اور کچل دیتی ہے اور اس کا کوئی ذرہ بھی باقی نہیں رہنے دیتی لیکن اسلام میں کوئی ایسی تعلیم نہیں جو فطرتی حیا اور شرم کے مخالف ہو بلکہ اسلام کی ساری تعلیم فطرتی حیا اور شرم کے عین مطابق اور فطرتی حیا اور شرم کی تکمیل کے لئے صراطِ مستقیم دکھانے والی ہے۔

چھٹی خصوصیت اسلام میں یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسی تعلیم نہیں جو خدا تعالیٰ کے عام قانونِ قدرت کے مخالف پڑی ہو۔ قوانینِ قدرت اور انسانی فطرت میں، انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں اور استعدادیں اور صلاحیتیں رکھی ہیں ان میں کوئی تضاد نہیں ہے کوئی مخالفت نہیں ہے۔ قانونِ قدرت اور انسانی فطرت میں اسلام نے کامل مطابقت پیدا کی ہے اور اس کی بنیاد یہ رکھی کہ خدا تعالیٰ نے اسلام میں ہمیں یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کو وہ تمام طاقتیں دے دی ہیں جو اس کی تکمیل کے لئے ضروری تھیں۔ ''تکمیل'' اسلام میں دو معنی میں استعمال ہوئی ہے ایک نوعِ انسانی کی تکمیل، اس کی پیدائش کی غرض یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرے اور خدا تعالیٰ کے پیار کی جنتوں میں داخل ہو اور دوسرے ہر فرد واحد کی تکمیل، ہر فرد کا دائرۂ استعداد دوسرے سے مختلف ہے۔ غرض ہر فرد کی تکمیل بھی کی اور نوعِ انسانی کی تکمیل بھی کی یعنی اسلام نے فطرتِ انسانی کی تکمیل کی اور فطرتِ انسانی کی تکمیل کرنے کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا وجود بطور اسوہ کے ہمارے سامنے پیش کر دیا۔

ساتویں خصوصیت اسلام کی تعلیم میں یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسی تعلیم نہیں جس کی پابندی کرنا ممکن ہی نہ ہو یا جس کے نتیجہ میں خطرات کا امکان ہو مثلاً ہمیں پانچ وقت مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کا حکم ہے لیکن انسانی زندگی میں بیماری کی بعض ایسی حالتیں ہوتی ہیں کہ مسجد میں جا کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو

اسلام نے یہ نہیں کہا کہ بیمار ہو یا تندرست ہر حال میں مسجد میں جا کر نماز ادا کرو بلکہ فرمایا کہ اگر بیمار ہو تو اپنے گھر میں نماز پڑھ لیا کرو۔ پھر ہمیں حکم دیا کہ نماز اس طریق سے پڑھا کرو۔ اس میں قیام ہے، اس میں رکوع ہے، اس میں سجدہ ہے، اس میں قعدہ ہے، نماز میں اٹھنے بیٹھنے کی ایک ظاہری شکل ہے لیکن اسلام نے یہ نہیں کہا کہ ہر صورت میں تم ایسا کرو ورنہ گناہگار ہو جاؤ گے بلکہ اگر کوئی ایسی بیماری ہے کہ انسان گھر میں بھی کھڑا نہیں ہو سکتا اور اس طرح رکوع نہیں کر سکتا جیسے ہم مسجد میں نماز پڑھتے وقت کرتے ہیں تو اس کو اجازت دی کہ تو بیٹھ کر نماز پڑھ لیا کر جس میں قیام کی شکل بھی بدل گئی اور رکوع کی شکل بھی بدل گئی۔

دِیْنُ اللّٰہِ یُسْرٌ خدا تعالیٰ نے دینِ اسلام میں کوئی ایسی پابندی نہیں لگائی اور کوئی ایسی جبری تعلیم نہیں دی جو انسان کے لئے بحیثیت انسان ممکن نہیں ہے یا کسی فرد کے لئے بعض حالات میں ممکن نہ رہے اور اس کے لئے کوئی دوسرا جواز نہ پیدا کیا گیا ہو۔ پھر ایک تو یہ ہے کہ ممکن ہی نہیں اور ایک یہ ہے کہ اس میں خطرات کا امکان ہے۔ مثلاً ایک بیمار ہے ڈاکٹر اسے کہتا ہے کہ تیرے لئے ان دواؤں کا استعمال ضروری ہے یہ اس کا طبی مشورہ ہے اور ڈاکٹر کہتا ہے کہ اگر تو یہ دوائیں استعمال کرے گا تو لمبا عرصہ بھوکا رہنا تیرے لئے جسمانی طور پر خطرات کا باعث ہے، بعض دفعہ ایسے حالات میں موت بھی واقع ہو جاتی ہے تو اسلام نے یہ نہیں کہا کہ رمضان آ جائے تو ایسی حالت میں بھی روزہ رکھ بلکہ اس کو اجازت دی کہ اگر خطرات ہوں تو پھر تیرے لئے سہولت ہے۔

اس وقت میں مختصر طور پر مثال دے کر بتا رہا ہوں کہ میرا آج کا خطبہ ایک لمبے مضمون کی تمہید ہے اس کے بعد پھر میں ایک دو تین کر کے خصوصیات لوں گا اور انشاء اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے، اس نے زندگی دی تو پھر ان کی تفصیل میں جاؤں گا۔ غرض اسلام کے اندر کوئی ایسی تعلیم نہیں جس کی پابندی غیر ممکن ہو یا جس کے نتیجہ میں خطرات کا امکان ہو۔ یہ اسلام کی خصوصیت ہے۔

اور آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی تعلیم اور ہدایت سے کوئی ایسی تعلیم باہر نہیں رہی اور ترک نہیں کی گئی جو ہر قسم کے مفاسد کو روکنے کے لئے ضروری تھی یعنی کوئی ایسی بات کہ اگر اس کا حکم نہ دیا جائے تو انسانی معاشرہ کے اندر یا انسان کی ذاتی زندگی کے اندر یا اس کی گھریلو زندگی کے اندر یا اس کی خاندانی زندگی کے اندر مفاسد پیدا ہو سکتے تھے یا اس کے ماحول کے اندر پیدا ہو سکتے تھے یا اس

کے ملک کے اندر پیدا ہو سکتے تھے یا بین الاقوامی رشتوں کے اندر پیدا ہو سکتے تھے اس سے باہر نہیں رہی۔ اسلامی ہدایت سے کوئی ایسی تعلیم باہر نہیں رہی جو ہر قسم کے مفاسد کو روکنے کے لئے ضروری تھی اور کوئی ایسی تعلیم اسلام سے باہر نہیں رہی جس کے باہر رہنے سے کوئی چھوٹا یا بڑا افساد پیدا ہو سکتا تھا بلکہ ہر قسم کے شر اور فساد کو روکنے کی تعلیم اسلام کے اندر پائی جاتی ہے۔ یہ اسلامی تعلیم کی آٹھویں خصوصیت ہے۔

اور نویں خصوصیت یہ ہے کہ اسلام ایسے احکام سکھلاتا ہے کہ جو خدا تعالیٰ کو عظیم الشان محسن قرار دے کر اس کے ساتھ رشتۂ محبت کو محکم کرتے ہیں اور اس طرح پر اسلام انسان کو تاریکی سے نور کی طرف لے کر جاتا ہے اور اس طرح پر اسلام انسان کو غفلت سے حضور کی طرف کھینچتا ہے۔ تمام ایسے احکام اور ایسی تعلیمات جو خدا تعالیٰ کا پیار انسان کے دل میں پیدا کرنے والی ہو سکتی تھیں وہ قرآن کریم میں بیان کر دیں اور اس طرح پر اسلامی تعلیم نے ایک انسان کے لئے یہ ممکن بنا دیا کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے ربِّ کریم کے ساتھ ذاتی محبت کا رشتہ قائم کرے۔

محبت دو طرح سے ہی پیدا ہوتی ہے حسن سے یا احسان سے۔ سوائے خدا کے اور کوئی حسنِ کامل نہیں یا اس کے بعد انسانوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حسین نمونہ ہمارے لئے کامل ہے تاہم حسن جس شکل میں بھی انسان کے سامنے آئے مثلاً گلاب کا پھول سامنے آتا ہے تو انسان کے دل میں اس کے لئے ایک کشش پیدا ہوتی ہے پسندیدگی اور محبت پیدا ہوتی ہے یا احسان انسان کے دل میں پیار پیدا کرتا ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات کا تعلق ہے قرآن کریم نے اس تفصیل کے ساتھ خدا تعالیٰ کے حسن کو اور اس کے احسان کو بیان کیا ہے اور اس وسعت کے ساتھ اور اس حُسن کے ساتھ اس حُسن اور احسان کو بیان کیا ہے کہ اس تعلیم کو جاننے کے بعد ایک خوش قسمت انسان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں رہتا کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے رب کریم کے ساتھ ذاتی محبت کا رشتہ قائم کرنے میں غفلت برتے۔

اسلام کی خصوصیات کا تیسرا حصہ، پہلا حصہ تعلیم کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات سے تعلق رکھتا تھا، اور یہ تیسرا حصہ خدا تعالیٰ کے زندہ ہونے اور اس کے قادرانہ تصرف ہماری زندگیوں میں نظر آنے کے متعلق قرآن کریم کی اسلامی تعلیم کے بارہ میں ہے اور یہ اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ اسلام کا خدا فرضی خدا نہیں کہ بعض منطقی دلائل سن کر کوئی شخص ایمان لایا کہ کوئی خدا ہے۔ ایسا خدا

اسلام کا خدا نہیں ہے۔ اسلام کا خدا فرضی خدا نہیں ہے جو محض قصوں اور کہانیوں کے سہارے سے مانا جاتا ہو۔ یہ نہیں ہے کہ محض عقلی دلائل یا محض پرانے قصے ہوں کہ فلاں وقت میں یوں ہوا اور فلاں وقت میں خدا تعالیٰ نے اپنی عظمت کا یا اپنی زندگی کا یہ جلوہ ظاہر کیا اور آج میری زندگی میں خاموشی۔ پس اسلام کا خدا فرضی خدا نہیں ہے اور اسے کسی قصے یا کہانی کے سہارے کی ضرورت نہیں۔

پہلی بات یہ تھی کہ ہمارا خدا فرضی خدا نہیں ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اسلام کا خدا ایک زندہ خدا ہے۔ ہم اسے محض اپنی خوش عقیدگی کی وجہ سے قبول نہیں کرتے بلکہ اس لئے قبول کرتے ہیں کہ اس زندہ خدا کی زندہ قدرتیں ہماری زندگی کے اندر جلوہ دکھاتی ہیں اور اس کی زندہ طاقتوں کو ہم اپنے حواس سے محسوس کرتے ہیں۔ ہم اپنے جسمانی حواس سے بھی محسوس کرتے ہیں اور ہم اپنے روحانی حواس سے بھی محسوس کرتے ہیں۔ مختلف قسم کے حواس جو خدا تعالیٰ نے انسان کو دیئے ہیں ان کے ذریعے وہ ہمیں اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ یہ ہے اسلام کا خدا! ایک زندہ خدا، زندہ طاقتوں والا خدا! جس کی زندگی کی علامات ہماری اپنی زندگیوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔

میں نے پہلے بھی ایک دفعہ بتایا تھا بعض دفعہ انسان ناسمجھی کی باتیں کہہ دیتا ہے۔ خدا سے پیارے رنگ میں ایک چیز مانگتا ہے اور پھر خدا دے بھی دیتا ہے۔ ایک دن میں نے خدا تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ اے خدا! تو نے جسم کی جسمانی لذت کے لئے بہت سی چیزیں پیدا کی ہیں آدمی اچھا کھانا کھا رہا ہو تو وہ ایک لذت محسوس کرتا ہے۔ اچھے نظارے دیکھ کر ایک لذت محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ بے شمار چیزیں ہیں۔ میں تجھ سے یہ مانگتا ہوں کہ تیرے عام قانونِ قدرت کے مطابق جو انسان کو اچھی لگنے والی چیزیں ہیں جو اس کی طبیعت میں اور اس کی روح میں سرور پیدا کرتی ہیں کے بغیر مجھے تو سرور اور لذت دے اور چند منٹ نہیں گزرے تھے کہ میرا سارا جسم سر سے لے کر پاؤں تک ایک خاص قسم کی لذت اور سرور محسوس کرنے لگ گیا اور قریباً چوبیس گھنٹے تک یہی حالت رہی۔ یہ بظاہر چھوٹی سی بات ہے لیکن بڑی عظیم بات بھی ہے۔ پس ہمارے خدا کے سامنے کوئی چیز انہونی نہیں ہے۔ وہ زندہ خدا، زندہ قدرتوں والا خدا ہے۔ اس کی زندگی کی علامات ہمیں اپنے وجود کے اندر نظر آتی ہیں۔

زندہ خدا کی زندہ قدرتوں کے نظارے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہم اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ خدا تو غنی ہے، صمد ہے، اس کو کسی کی احتیاج نہیں نہ کسی انسان کی نہ سارے انسانوں کی اور نہ

بحیثیت مجموعی ساری کائنات کی۔ اس کو تو کوئی احتیاج نہیں لیکن ہمیں اس کی احتیاج ہے۔ ہمیں ہر آن اس حیّ و قیّوم خدا کی زندہ اور پیاری تجلیات کی ضرورت ہے اور احتیاج ہے۔ اسی واسطے میں نے اپنے خطبے کے شروع میں جو آیات پڑھی تھیں ان میں بتایا تھا کہ وَاعۡتَصَمُوۡا بِهٖ پس دعاؤں کے ذریعہ خدا تعالیٰ کے پیار کو حاصل کر کے اس کی زندہ قدرتوں کی تجلیات اپنی زندگیوں میں دیکھنے کے لئے جدوجہد کریں۔ اس کے لئے مجاہدہ کریں۔ اس کے لئے قربانیاں دیں۔ اس کی ناراضگی سے بچنے والے ہوں۔ اس کی خوشنودی کو حاصل کرنے والے ہوں۔ خدا کرے کہ ہم سارے کے سارے اپنے زندہ خدا سے زندہ تعلق رکھنے والے بن جائیں۔ (خطباتِ ناصر جلد ہفتم صفحہ ۱۹۵، ۲۰۲)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اگر میرے عذاب سے بچنا چاہتے ہو اگر میری ذلت سے بچنا چاہتے ہو تو تمہیں میرے پاس آنا پڑے گا کوئی اور تمہیں بچا نہیں سکتا اور اگر میری رحمت کے تم وارث ہو جاؤ تو دنیا کی طرف تمہیں نگاہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ دنیا تو ایک مرے ہوئے مچھر کے کیڑے سے بھی کم حقیقت رکھتی ہے پھر تمہیں ان کی کیا پرواہ ہے؟

یہ مضمون مختلف آیات میں اپنے Context (کنٹیکسٹ) میں بھی ہے اور جو میں نے ان آیات کی ترتیب دی ہے اس سے ایک اور مضمون ابھرتا ہے پہلی آیت میں یہ بتایا تھا کہ عذاب یا رحمت کا پہنچانا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے اس واسطے اس میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اگر تم اس کے عذاب سے بچنا اور اس کی رحمت سے حصہ لینا چاہتے ہو۔ سورۃ النساء کی اس دوسری آیات میں (جس کی میں نے تلاوت کی ہے) یہ کھول کر بتایا گیا ہے کہ اِعۡتَصَمُوۡا بِهٖ اللہ تعالیٰ کے ذریعہ سے شیطانی یلغار، نفس کی یلغار، دل کے بدخیالات ہیں ان کی یلغار، نفاق کی یلغار، مخالفت کی یلغار، انکار کی یلغار اور مخالفانہ منصوبوں کی یلغار اور سب لوگوں کے اکٹھے ہو کر مغلوب کر دینے کی یلغار سے اپنے بچاؤ کا انتظام کرو۔ جتنی بھی کوئی تصور میں لا سکتا ہے یا حقیقت میں پیدا ہو سکتی ہیں ان سے بچنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کو اپنا ذریعہ بناؤ اس کی طرف آؤ اور اس کا ذریعہ یہ ہے فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَاعۡتَصَمُوۡا بِهٖ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور ایمان کے تقاضوں کو پورا کرو تب تم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جاؤ گے اور جب تم اللہ کی پناہ میں آ جاؤ گے تو پھر دنیا تمہیں ذلت کے گڑھے میں پھینک نہیں سکے گی پھر دنیا تمہیں عذاب کے تندور کے اندر دھکیل نہیں سکے گی پھر دنیا تمہارے ناک

میں نکیل ڈال کر ذلیل کرنے کے لئے گلیوں میں پھرا نہیں سکے گی بلکہ پھر یہ ہوگا۔ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں تمہیں داخل کر دے گا اپنے فضل کے محلوں کے اندر تمہیں لے جائے گا اپنے سلامتی کے حصار میں تمہیں رکھے گا وَيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا اور جو اس نے قرآن کریم کے ذریعہ ایک سیدھا راستہ اپنی طرف پہنچانے کے لئے مہیا کیا ہے اس پر تمہاری انگلی پکڑے گا اور اس راستے پر تمہیں لے جائے گا اور تم کامیاب ہو جاؤ گے کیونکہ جو شخص صراط مستقیم پر اللہ تعالیٰ کی انگلی پکڑ کر چل رہا ہو اسکے ناکام ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(خطباتِ ناصر جلد سوم صفحہ ۲۸۵ تا ۲۸۶)